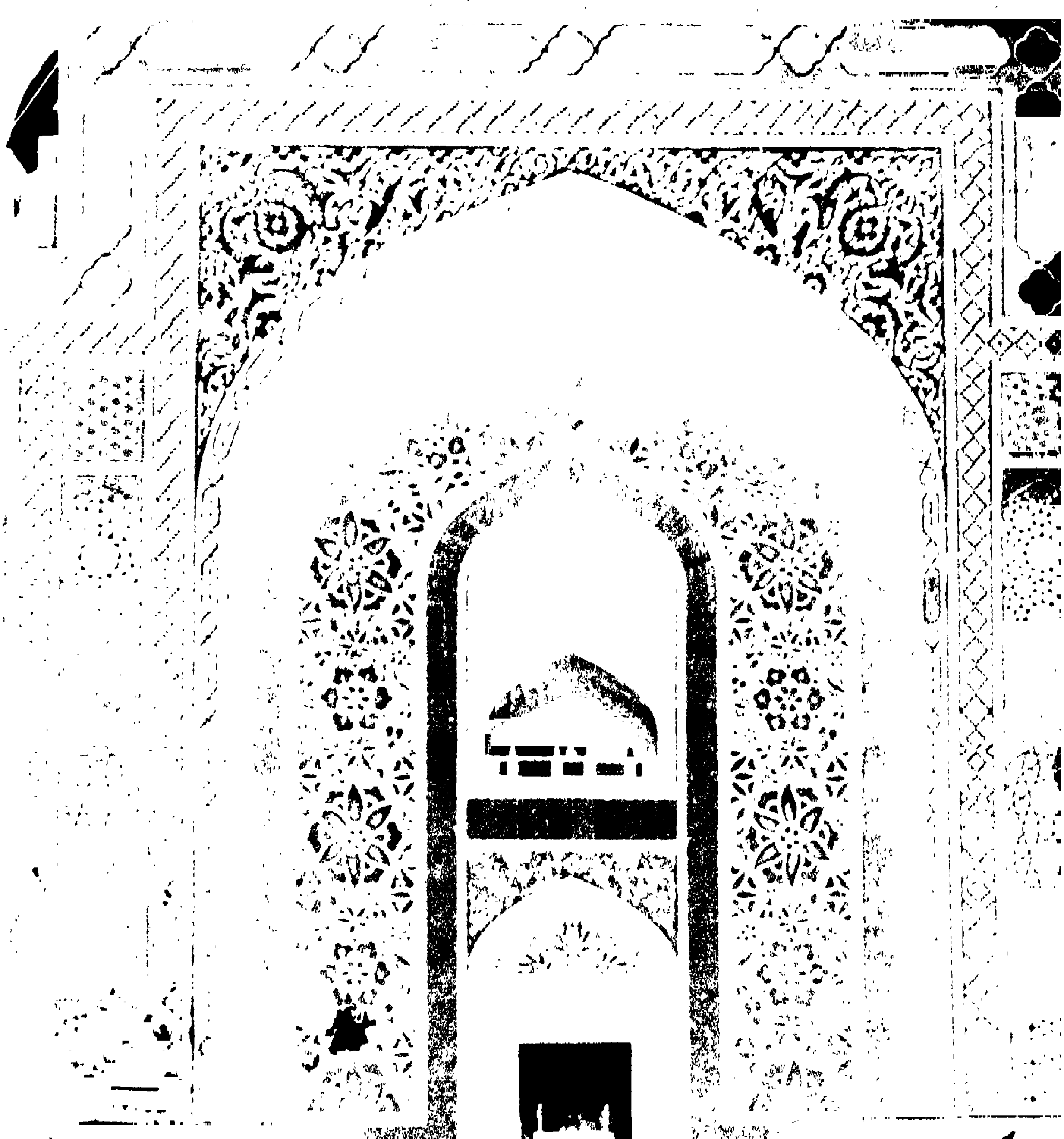
DUE DATE

Sl. No. ____________________ Acc. No. ____________________

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re. 1/- per day, Over night book Re. 1/- per day.

ایوانِ اردو

ماہنامہ دہلی



۵۰ر۳ روپے

اکتوبر ۶۹۲



مرسلہ : انصاری امتیاز احمد، بمبئی

اس تصویر کے لیے کوئی مناسب شعری یا نثری عنوان تجویز کیجیے۔ نثری عنوان کسی مشہور شاعر کی نظم یا افسانہ نگار کے افسانے کے عنوان سے مستعار ہو تو بہتر ہے۔ پسندیدہ عنوانات اگلے شمارے میں ارسال کنندگان کے شکریے کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ عنوان بھیجتے ہوئے شاعر یا افسانہ نگار کا نام لکھنا نہ بھولیں۔

اس صفحے کے لیے قارئین بھی ہمیں ایسی تصویریں بھیج سکتے ہیں جو ہندستان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو پیش کرتی ہوں۔ پسند آنے والی تصاویر بھیجنے والوں کے نام سے شائع ہوں گی

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۳۲۷۶۲۱۱، ۳۲۶۳۴۴۸

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:

پروفیسر اشتیاق عابدی، مخمور سعیدی

جلد: ۶ —— شمارہ: ۶	فی کاپی ۳/۵۰ روپے —— سالانہ قیمت ۳۷ روپے	اکتوبر ۱۹۹۲ء

خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، دہلی —— گھٹا مسجد روڈ،
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سرورق، عمل: ارشد علی خاں

پروفیسر اشتیاق عابدی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی ۲ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

نیا آغاز

حال ہی میں فراق گورکھپوری کے انٹرویوز کا ایک مجموعہ جو انگریزی میں ہے دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ انٹرویو جو لمبے لمبے وقفوں کے ساتھ کیے گئے ہیں جناب سمت پرکاش شوق نے مرتب کیے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ہر انٹرویو پر انھوں نے فراق صاحب کے دستخط لے لیے تھے تاکہ ان کے استن پر کوئی شک پیدا نہ ہو۔

ان انٹرویوز میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جنھیں پڑھ کر اُردو والوں کا ایک حلقہ چونک پڑا ہے لیکن جو لوگ فراق صاحب کے وہ انٹرویو بھی پڑھ چکے ہیں جو ان کی زندگی میں بعض انگریزی اخباروں میں شائع ہوتے تھے، انھیں اس کتاب میں فراق صاحب کا کوئی نیا روپ نظر نہیں آئے گا۔ جو انٹرویو اُن کی زندگی میں شائع ہوئے تھے ان میں بہ ظاہر تو ہمعصر ہندی شاعری کی بے مائیگی اور اس کے نمائندہ شعرا کی بے بضاعتی پر توجہ مبذول کرائی گئی تھی لیکن اُردو کی شعری روایت سے فراق صاحب کی بے اطمینانی اور بعض صورتوں میں بیزاری کا اظہار بھی ایک زیریں لہر کی طرح ان میں موجود تھا جس کی نشاندہی بھی بعض لوگوں نے کی تھی مگر اس پر اس وقت دھیان نہیں دیا گیا۔

اُردو شعرا سے فراق صاحب کو بنیادی شکایت یہ ہے کہ ان کے افکار و خیالات ہندستانیت کی بو باس سے عاری ہیں اور ان کا وجدان عظیم ہندستانی تہذیب کے سرچشموں سے اکتسابِ فیض کی بجائے عرب اور ایران سے آنے والی ہواؤں سے تحرک اور توانائی حاصل کرتا ہے۔

فراق صاحب کی یہ شکایت کس حد تک بجا ہے، اس کا جواب اُردو زبان و ادب کے علما ہم سے بہتر طور پر دے سکتے ہیں لیکن اُردو شعر و ادب پر اس طرح کے الزامات سُن کر ایک سوال ہمارے ذہن میں اکثر پیدا ہوا ہے۔ کیا ہندستانیت کی تعبیر صرف ان اعتقادات اور رسومات کے دائرے میں رہ کر ہی کی جانی چاہیے جو ہندستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں مروّج تھے؟ اگر ایسا ہے تو اس مشترکہ گنگا جمنی تہذیبی روایت کو ہم کیا نام دیں گے جس کے ہم اب تک گُن گاتے رہے ہیں؟ اس تہذیبی روایت کی تشکیل و تعمیر ہندستان ہی میں ہوئی ہے لیکن اس میں عرب اور ایران کے اثرات بھی شامل رہے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ یہاں پہنچے تھے اور اب ان اثرات کو اس روایت سے خارج کرنے کی کوشش ہمیں اسی بنیاد پرستی کی طرف لے جاسکتی ہے جس سے خود فراق صاحب نالاں نظر آتے ہیں۔

فراق صاحب ایک روشن خیال انسان اور باشعور شاعر تھے لیکن انھیں مفکر کا درجہ دینا شاید ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ مفکر ایک مربوط نظامِ فکر کا حامل ہوتا ہے، فراق صاحب کی شاعری ہو، ان کے تنقیدی مضامین ہوں یا ان کے انٹرویو، سب میں ان کی دانش مندی کی جھلکیاں تو نظر آتی ہیں لیکن یہ اس منطقی ربط سے عاری ہیں جو ایک باقاعدہ فکری نظام کا خاصہ ہوتا ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف ذہنی کیفیات کے زیرِ اثر وہ جو کچھ محسوس کرتے تھے، اس کا بے تکلف اظہار کر دیا کرتے تھے۔

فراق صاحب نے ہندی شاعری کو جو بُرا بھلا کہا ہے اس میں بھی غیر جانبدارانہ غور و فکر سے زیادہ ہندی کے کچھ ہمعصر شاعروں سے ان کی خفگی کا دخل ہے۔ فراق صاحب میں خود پسندی کچھ زیادہ ہی تھی اور جہاں جہاں ان کی یہ حس مجروح ہوتی وہ برہم ہو جایا کرتے اور اس برہمی کے اظہار کا کوئی نہ کوئی پیرایہ بھی ڈھونڈ نکالتے۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ "روپ" جوش ملیح آبادی سے ان کی خفگی کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آیا جو ایک نظم گو شاعر کے علاوہ رُباعی گو کی حیثیت سے بھی ممتاز تھے۔ اس "ہندستانیت" کی وکالت بھی فراق صاحب نے "روپ" کی اشاعت کے بعد ہی زیادہ زور شور سے شروع کی جس سے وہ دوسرے اُردو شعرا کو بے بہرہ قرار دیتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "اندازے" شائع ہو چکا تھا جس میں انھوں نے بہت سے ایسے اُردو شعرا کی تعریف و تحسین کی ہے جو اُن کی وضع کردہ ہندستانیت کی کسوٹی پر پورے نہیں اُترتے اور آپ غور کریں تو خود ان کا پورا غزلیہ کلام بھی اس کسوٹی پر پورا نہیں اُترے گا

ادارہ

غزلیں

مظہر امام

دمِ آفتاب وقت کا بھرنے لگی ہے شام
جو کام صبح کا ہے، وہ کرنے لگی ہے شام

رہ رہ کے اپنے آپ سے ڈرنے لگی ہے شام
کیوں آئینہ بدست گزرنے لگی ہے شام

اب تک فرازِ کوہ سے اُترا نہیں ہے دن
کن وادیوں میں جاکے سنورنے لگی ہے شام!

دو چار گام پر ہے مہِ شب کی پالکی
لمحوں کی سیڑھیوں سے اُترنے لگی ہے شام

کن مشکلوں سے دن کا سفر طے کیا ہے آج
وعدے سے لیکن اپنے مکرنے لگی ہے شام

اے طائرِ نگاہ! پروں کو سمیٹ لے
ریگِ رواں کی طرح بکھرنے لگی ہے شام

کیسا خیال! کس کا تصوّر! کہاں کی یاد!!
کن بے خیالیوں میں گزرنے لگی ہے شام

مظہر امام

۱۲۲- ڈی، پاکٹ ع۱، فیز I، میور وِہار، دہلی ۱۱۰۰۹۱

فضا ابنِ فیضی

شفق، چراغ، شگوفہ، صدف، ستارہ ہیں
جو تو ہے رمز مرا، تیرا استعارہ ہیں

مدیرِ عصر! اسے احتیاط خاص سے رکھ
ترے جریدے کا ہوں آخری شمارہ میں

حسابِ دفترِ امکاں، طلب کرو مجھ سے
ازل سے لکھتا رہا ہوں یہ گوشوارہ میں

ہوا تھی کیسی کہ جلتے ہی سرد ہوتے
خود اپنی راکھ میں ڈھونڈوں کوئی شرارہ میں

سرِ بساطِ نظر، خواب خواب منظر تو
پسِ غبارِ نظر، شورشِ نظارہ میں

دیے تھے کام و دہن کیا اسی لیے یارب!
ادھار لقموں پہ کرتا رہوں گزارہ میں

اب آنکھیں دوسرے چہروں پہ ہیں فضا اپنی
کبھی تھا وقت کے خوابوں کا گاہوارہ میں

جمال پورہ، مئو ناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱ (یو۔پی)

لطف الرحمٰن

اب وہ آئے تو ہر اک برگِ بدن لے جائے
میری آنکھوں سے یہ برسوں کی تھکن لے جائے

روشنی سہمی ہوئی بند ہے کمروں میں ابھی
دشتِ شب میں کوئی جگنو کی کرن لے جائے

پھر وہی آئے وہ دل دارِ ملنسار مرا
میری رگ رگ میں رواں ہے، جو چبھن لے جائے

بکھرے ٹوٹے ہوئے تاروں کی پگھلتی ہوئی شب
اک جنوں آئے یہ سب رنج و محن لے جائے

پھر وہی رت وہی یادوں کا سلگتا ہوا بن
پھر تری سمت مجھے دل کی لگن لے جائے

عشق کا ظرف تو دیکھئے کبھی آئے تو سہی
مشکِ جاں کیا کہ وہ چاہے تو ختن لے جائے

لطف الرحمٰن

تاتار پور، بھاگلپور ۸۱۲۰۰۲ (بہار)

مشرقی شعریات اور نیاز فتح پوری

رشید حسن خاں

ڈی سی/۹ ،گایر ہال، دہلی یونیورسٹی کیمپس، دہلی ،

مولانا شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے رقی شعریات کی روشنی میں شاعری کے محاسن رمعایب پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی۔ اُن کی ہانیف میں موازنۂ انیس و دبیر ایسی کتاب جس میں اِس طریقۂ کار کی بہت سی تفصیلات نوظ ہیں۔ شعریات کے مباحث قواعد کتابوں لکھے ہوئے تھے؛ شبلی نے پہلی بار اُن کو ری جائزے کی بُنیاد بناکر، اطلاقی طریق کار روشناس کرایا۔ اِس کتاب نے شعریات کی قی اہمیّت کو واضح کیا اور یہ بتایا کہ کلاسکی ری ادب میں بیان کی واقعی خوبیوں اور خامیو اس وقت تک صحیح طور پر نہیں سمجھا جاسکتا، نتک کہ شعریات کی روایت سے، یا یوں کہیے لوم بلاغت سے واقفیت نہ ہو۔ اِس لحاظ یہ کتاب آج بھی منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ کی ادب اور شعری تنقید کے اچھے طالب علموں لیے اِس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

مولانا شبلی کے بعد اِس سلسلے میں دوسرا نیاز فتح پوری کا سامنے آتا ہے۔ کچھ اور سے پہلے، دو تین باتوں کی طرف توجّہ دلانا ری ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ شبلی کا طریق کار جا صورت میں ہمارے سامنے ہے، یوں سانی کے ساتھ اُس کا جائزہ لے سکتے نیاز نے اِس ذیل میں جو کچھ لکھا ہے، وہ بکھرا ہوا ہے؛ یہ وجہ بھی ہے کہ اُس کی طرف نظر کم جاتی ہے اور اُس کی واقعی اہمیّت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہم نہیں کرپاتے۔

نیاز کی ایک مشکل اور بھی تھی۔ ایک طرف تو ادبی صحافت اور تجارت، اُن کے یہاں ایک ہی سکّے کے دو رُخ تھے اور اِس کی خاطر بھی وہ ایک نہ ایک ہنگامہ ساتھ لگائے رکھنا ضروری سمجھتے تھے، وہ ادبی ہو یا اعتقادی۔ دوسری طرف اُن کی تحریروں سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ بعض شاعروں سے وہ ناراض تھے؛ اِن میں اصغر اور جگر کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اِن دونوں کی شاعری کے متعلّق اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اُس میں تنقیدی تجزیہ نہ ہونے کے برابر ہے؛ نیز ان کے اشعار میں جو غلطیاں نکالی ہیں، اُن میں سے بیش تر کا تعلّق اُن کی شدید ناپسندیدگی اور ناراضی سے ہے۔ ایسے مقامات پر وہ اُس مولوی کی طرح نظر آتے ہیں، جس کو عمر بھر بُرا کہتے رہے تھے۔

اِن دونوں باتوں نے ایک طرف تو بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بٹھا دیا کہ وہ منصف مزاج نہیں تھے۔ دوسری طرف اُن کی ایسی ساری کاوشوں کو محض لفظی اعتراضات کہہ کر، یا فرض کرکے، نظر انداز کردینے کا رُجحان پیدا ہوا۔ اِس صورتِ حال کا ایک بُرا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف شاعروں کے کلام پر گفتگو کرتے ہوئے، اُنھوں نے جہاں واقعی محاسن یا معایب کو دکھایا ہے، وہ بھی نظروں سے اُوجھل رہے۔

جن لوگوں کو نیاز سے اختلاف رہا ہے، وہ بھی اِس بات کو تو مانتے تھے کہ اُن کا مطالعہ وسیع تھا اور یہ کہ وہ بہت ذہین تھے۔ اِس بات کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ بیان کی باریکیوں کو وہ خوب سمجھتے تھے اور یہ وہ مقام ہے جہاں تک اچھّے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی رسائی نہیں ہو پاتی، ہما شما کا کیا ذکر۔ آخر میں یہ بات بھی کہ وہ مدرسے کے پڑھے ہوئے تھے، جہاں اُس زمانے میں علومِ بلاغت بھی پڑھائے جاتے تھے اور پڑھانے والے "منتخبِ روزگار" ہوا کرتے تھے۔

باضابطہ تعلیم، خداداد ذہانت اور مزاجی مناسبت؛ اِن تینوں صفات نے مل کر، بیان کے محاسن اور معائب کی تفہیم کا قابلِ رشک ملکہ اُن کے اندر پیدا کردیا تھا۔ زبان اور پیرایۂ اظہار کے لحاظ سے سامنے کی باتوں پر تو بہتوں کی نظر پہنچ جاتی ہے؛ مگر بیان کی

باریکیوں تک کم نظریں پہنچ پاتی ہیں؛ نیاز کی ایسی تحریروں نے بلاغت کے نکات بہت سے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کیے اور اِس طرح مشرقی شعری روایت کے ایک خاص حصے سے روشناس کرایا۔ شبلی کے بعد یہ روایت کم زور ہو چلی تھی، نیاز نے اُس کو اپنے انداز سے متعارف کرایا اور اِس طرح اُس روایت کی توسیع کی۔

روایت کی توسیع کے سلسلے میں ایک یہ بات ضرور ذہن میں رہنا چاہیے کہ شبلی کا دائرۂ فکر و عمل وسیع ہے۔ انھوں نے اصولی مباحث کو چھیڑا ہے اور گہرائی کے ساتھ اُن سے متعلق تفصیلات پر گفتگو کی ہے۔ اِس کے مقابلے میں نیاز کی تحریریں، بہ طورِ عموم، زبان اور بیان کے جائزے تک محدود رہی ہیں مگر اِس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ نیاز کی تحریروں میں بیان کے نکات زیادہ وسعت اور تنوع کے ساتھ معرضِ بحث میں آئے ہیں۔ شبلی کی نگارشات سے بعض اصولی مباحث کا علم بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے اور نیاز کی تحریروں سے زبان اور بیان کی بہت سی باریکیاں سامنے آتی ہیں۔ یوں دیکھیے تو شعریات کی روایت کو سمجھنے کے لیے اِن دونوں کی تحریریں (اپنے اپنے دائرے میں) قابلِ قدر حیثیت رکھتی ہیں اور دونوں سے استفادہ ضروری ہے۔

بلاغت کے جو علوم اور جو مباحث ہیں، اُن سے یکسر ناآشنائی نے ہم میں سے اکثر اور بیش تر کو شعری روایت کے عرفان سے اور اُس کے نتیجے میں اظہار و بیان کے اسرار کا محرم بننے سے محروم رکھا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شبلی اور حالی کے بعد ہمارے یہاں اِس پایے کا کوئی نقاد سامنے نہیں آیا جو شعری سرمایے کا، مشرقی شعری روایت کی روشنی میں صحیح طور پر جائزہ لے سکتا۔ (یہ حقیقت ہے اور بہت تلخ حقیقت کہ ہماری جدید تنقید کا بیش تر حصہ ایسی تحریروں پر مشتمل ہے جنھیں انگریزی سے ترجمہ کیے گئے خیالات کا مجموعہ کہنا چاہیے اور یہ ترجمہ شدہ خیالات (مستثنیات سے قطعِ نظر) عموماً اُن حضرات کا عطیہ ہیں جو مغربی ادب سے جتنی بھی اور جیسی بھی واقفیت رکھتے ہوں، مشرقی شعری روایت سے کم سے کم شناسائی رکھتے ہیں)۔ شعر کا مفہوم سمجھ لینا یا لفظوں کے معنی معلوم کرلینا (یا پھر سیاسی اور سماجی پس منظر پر دیر تک تقریر کرلینا) ایک بات ہے، اور بیان کی باریکیوں کو سمجھنا دوسری بات ہے، اور اِس دوسری بات سے بہت سے لوگ بے خبر رہتے ہیں، خاص کر اِس بنا پر کہ وہ شعریات کی روایت سے باخبر نہیں ہوتے۔

فکشن کی تنقید پر جو کام ہوا ہے، شعری تنقید پر اُس پایے کا کام جدید تنقید میں نہیں ہو پایا۔ اِس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ فکشن خود جدید چیز ہے، جو مغربی اثرات کے تحت اُردو میں پروان چڑھی؛ اِس لیے مغربی تنقیدی روایتوں کے زیرِ اثر اُس کے جائزے کا کام بہتر طور پر ہو سکا ہے؛ جب کہ شعری روایت بہت قدیم ہے، جس کا سلسلۂ نسب فارسی کی شعری روایت سے جا ملتا ہے۔ اِس شعری روایت سے جب تک واقفیت نہ ہو، اُس وقت تک تنقید کا حق ادا ہونے سے رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اُردو تنقید میں شعری تنقید، فکشن کی تنقید کے درجے کی نہیں ملتی۔ مشرقی شعری روایت سے ناواقفیت یا ناتمام واقفیت، شعری تجزیوں کو ناتمام، یک رُخا اور بے تہ بنا دیتی ہے۔

بلاغت کی کتابوں میں معنی کو روح اور لفظ کو جسم سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، اِس کے ساتھ یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ روح تک ہم جسم کے واسطے سے پہنچ سکتے ہیں؛ یوں روح کی برتری کے باوجود جسم کی اہمیت کچھ کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علوم بلاغت میں بیش تر بحثیں اندازِ بیان سے متعلق ہوتی ہیں۔ اِس کی ایک ادنا درجے کی مثال یہ ہے کہ ہم معنی یا قریب المفہوم اشعار کے تقابل میں جب ہم ترجیح کا اظہار کرتے ہیں، تو اکثر صورتوں میں اُس کی بنیاد بیان کے محاسن پر ہوتی ہے۔

ضمنی طور پر ایک اور بات۔ اصلاحِ کلام کے مباحث سے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں (مثلاً صفدر مرزا پوری کی کتاب مشاطۂ سخن) اب ہم نے اُن کے مطالعے کو بھی غیر ضروری قرار دے رکھا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ انتخاب الفاظ کے متعلقات سے ذہن خالی ہوتے جاتے ہیں۔ اِن کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُن سب باتوں کو ماننا ضروری نہیں؛ لیکن اصلاحِ شعر سے متعلق ایسی تحریروں کا مطالعہ ضروری ہے، کیوں کہ اِس طرح شعر میں یک جا لفظوں کی معنوی نسبتوں کا اور برمحل الفاظ کے انتخاب کا شعور پیدا ہوتا ہے یا اُس پر جِلا ہوتی ہے۔

اِس بات سے ہم سب واقف ہیں کہ کسی اچھے شعر کا کوئی ایک لفظ ذہن سے نکل جائے اور موزوں طبیعتی کی مدد سے اُس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھ دیا جائے، تو محسوس یہی ہوتا ہے کہ بات اُس طرح بنی نہیں۔ اِس کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی شعر میں جس قدر

لفظ یک جا ہوتے ہیں، اُن میں خاص طرح کا اندرونی ربط پیدا ہو جاتا ہے اور معنوی نسبتیں کارفرما ہو جاتی ہیں اور اُس صورت میں ایک خاص لفظ کی جگہ دوسرا عام لفظ اُس نسبت اور ربط سے معرّا ہوتا ہے نکتہ سنج طبیعتیں اِس کے عرفان سے بے خبر نہیں ہوتیں۔ نکتہ سنجی کا یہ انداز بھی ہماری شعری روایت کا حصّہ رہا ہے۔ چوں کہ یہ گفتگو اِس مقام پر ضمنی حیثیت رکھتی ہے، اِس لیے محض اپنے مفہوم کی وضاحت کے لیے مرزا دبیرؔ کی ایک اصلاح بہ طورِ مثال پیش کرنے پر اکتفا کروں گا :

"میر واجد حسین مجھ سے ناقل تھے کہ ایک مرثیہ کسی شاگرد کا کہا ہوا، مجھے مرزا صاحب نے دیا کہ اِس کو صاف کر دو۔ حضرت عبّاسؓ کے حال کا مرثیہ تھا، اُس موقعے پر کہ جب حضرت عبّاسؓ خیمے سے برآمد ہوتے ہیں، مرزا صاحب نے اِصلاحاً یہ ٹیپ لکھی تھی :

آپ آتے ہیں، عورت نہ کوئی سامنے آئے
اقبال سے کہہ دو کہ عناں تھامنے آئے

مجھے جو شرارت سوجھی تو میں نے دوسرا مصرع یوں لکھ دیا : "ہاں فتح سے کہہ دو کہ عناں تھامنے آئے۔" میں گردن جھکائے لکھ رہا تھا کہ مرزا صاحب آہستہ آہستہ آکر پیچھے کھڑے ہوگئے، مجھے خبر نہ ہوئی۔ اِس ٹیپ کو پڑھ کر ہنسے اور فرمایا : واہ میر واجد حسین صاحب! آپ نے تو مجھے بھی اصلاح دے دی . . . میں چُپ۔ فرمایا : کیا "اقبال" سے آپ "فتح" کو اِس موقعے پر ترجیح دیتے ہیں ؟ میں نے عرض کی : جی نہیں، اِس وقت میرے خیال میں یوں ہی آگیا، میں اِس کو مٹائے دیتا ہوں . . . فرمایا : ذرا ٹھہرو، سمجھ تو لو کہ لفظِ "فتح" میں کیا بُرائی اور "اقبال" میں کیا خوبی ہے۔ "اقبال" اُردو میں مذکّر اور "فتح" مونّث ہے ؛ پس جب شاعر اچھّے شگون کے خیال سے یہ کہتا ہے کہ عورت کوئی سامنے نہ آئے، تو "فتح"، جو مونّث ہے، (اُس کا) سامنے آنا کب مناسب ہوگا۔ اِس کے سوا لفظِ "اقبال" کے لفظی معنے پر غور کرو۔ "اقبال" کے خود معنے آگے آنے کے ہیں، لفظِ "فتح" میں یہ بات کہاں۔"

(حیاتِ دبیر، جلد اوّل، ص ۵۴)

نیازؔ نے بہت سی نظموں کا جائزہ لیا ہے ؛ اِن جائزوں کو ذرا نظر جما کر پڑھا جائے، تو ایسے مقامات سامنے آئیں گے جہاں معنی و بیان کے لحاظ سے طرزِ اظہار کی خامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور ایسے مقامات بھی جہاں الفاظ کی باہمی معنوی نسبتوں یا استعارے میں وجہِ جامع کے بگڑ جانے یا ٹوٹ جانے پر اعتراض کیا گیا ہے۔ شعریات کی روایت کے اچھّے طالبِ علم کے لیے ایسے مقامات بہت اہمیّت رکھتے ہیں۔ اُس کے سامنے وہ باتیں آجاتی ہیں جن تک عام پڑھنے والوں کی نگاہیں نہیں پہنچتیں۔ اِس سے پہلے کہ بعض مثالیں پیش کی جائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس اندازِ نقد کے سلسلے میں نیازؔ کے نقطۂ نظر کو بھی پیش کر دیا جائے۔ سیمابؔ کے مجموعے کارِ امروز پر نیازؔ نے مفصّل تبصرہ کیا ہے، اُس کے شروع میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

"اغلاطِ شعر دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک تو وہ جن کا تعلّق عروض و قافیہ سے ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو ترکیبِ الفاظ اور فنِ معانی و بیان سے متعلّق ہیں۔ اُس قسم کی غلطیاں زیادہ تر نومشق شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں . . . لیکن دوسری قسم کی غلطیاں، جو زیادہ تر کہنہ مشق شعرا ہی کے یہاں نظر آتی ہیں، اِن کے کلام میں بھی موجود ہیں۔"

(انتقادیات، دوم، ص ۱۵۱)

اِسی کتاب میں نسبتاً وضاحت کے ساتھ دوسری جگہ اِسی بات کو یوں لکھا ہے :

"غزل ایسے متفرّق نقوش کا مجموعہ ہے، جنھیں نقّاش نے مختلف اوقات میں، مختلف کیفیات کے ساتھ کاغذ پر پیش کیا ہے اور ایک کا دوسرے سے کوئی تعلّق نہیں ؛ لیکن نظم ایک ایسی تصویر ہے جس میں مصوّر اُس کے پس منظر کی فضا، اُس کے خطوط کے اِنحنا، اُس کے سایوں کے اُتار چڑھاو اور اُس کے رنگوں کے امتزاج سے ایک ہی کیفیت کو پیش کرنا چاہتا ہے اور تمام ماحول کو اپنے اُسی مرکزِ خیال کی طرف کھینچ لانا چاہتا ہے جو نقش کی نہیں، نقّاش کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اِس لیے شاعر جس قدر غزل میں آزاد ہے، اُسی قدر نظم میں پابند ہے۔ اور ایک نقّاد اگر غزل کے ایک ایک شعر پر علاحدہ علاحدہ نقد کرنے کے لیے مجبور ہے، تو نظم میں شروع سے لے کر اخیر تک ایک ایک شعر کو مسلسل و مربوط کر کے دیکھنا پڑتا ہے کہ کہاں کیا نقص ہے اور کون لفظ بے محل استعمال کیا گیا ہے" (ص ۳۱۶)۔

اِن دو اقتباسات سے نیازؔ کا اندازِ نظر سامنے آجاتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مثالوں سے اِس کی وضاحت کی جائے۔ سیمابؔ کے مجموعۂ منظومات کارِ امروز کا آغاز اِس رباعی سے ہوتا ہے :

اے ربِ قدیم و کردگارِ امروز
وے نزہتِ ماضی و بہارِ امروز
دیروز رہینِ منّتِ رحمتِ تو
لطف و کرمت ضامنِ کارِ امروز

اس سے متعلق نیاز نے لکھا ہے:

"اس رباعی میں ہر جگہ ترکیبِ اضافی اختیار کی گئی ہے، مثلاً: کردگارِ امروز، نزہتِ ماضی، رہینِ منّت، ضامنِ کار؛ لیکن پہلا ٹکڑا "ربِ قدیم" صفت موصوف واقع ہوا ہے، جو علمِ معانی و بیان کی رو سے خلافِ فصاحت ہے۔ علاوہ اس کے "رب" کی صفت میں جب لفظ "قدیم" استعمال کیا جائے گا، تو اس کے مفہوم میں ازل و ابد دونوں شامل ہوں گے، حالاں کہ محل کا اقتضا یہ ہے کہ صرف عہدِ ماضی یا عہدِ گذشتہ سے اس کو متعلق کیا جائے۔ اگر بجائے "ربِ قدیم" کے "خالقِ دی" کہا جاتا، تو یہ نقص دور ہو جاتا۔" (انتقادیات، دوم، ص ۱۵۲)

سیماب کی ایک نظم ہے "نوائے تجدید"۔ نیاز کے الفاظ ہیں: "اس نظم کے ذریعے شاعر نے اس خیال کو ظاہر کرنا چاہا ہے کہ ہم بہ حالتِ موجودہ نہایت ہی پستی و ذلت کی حالت میں ہیں، لیکن ہمارا یہ زوال ہی اپنے اندر عروج کے اسباب پنہاں رکھتا ہے اور یہی وہ راز ہے جس کو شاعر "نوائے تجدید" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔" اس نظم کے پہلے بند میں یہ دو شعر بھی ہیں:

میری ہر اک جست سے پیدا ہیں لاکھوں بجلیاں
خرمنِ آتش زدہ کا شعلۂ جوّالہ ہوں
زندگی کی ڈھونڈتے ہو مجھ میں کیا چنگاریاں
اک حریمِ عشق کی خاکسترِ صد سالہ ہوں

نیاز نے لکھا ہے:

"پہلا مصرع اصل مفہوم کے بالکل منافی ہے، کیوں کہ ہر اک جست سے لاکھوں بجلیاں پیدا ہونا تو عروجِ عمل کا ثبوت ہے، نہ کہ انحطاط و زوال کا۔ اسی طرح دوسرے مصرعے میں "شعلۂ جوّالہ" مناسب نہیں، علی الخصوص اس حالت میں کہ اس کے بعد ہی دوسرے شعر میں شاعر نے اپنے آپ کو "خاکسترِ صد سالہ" اور زندگی کی چنگاریوں سے بالکل خالی کہا ہے۔" (ایضاً ص ۱۵۵)۔

سیماب کا ایک مصرع ہے: "بے خودی کے نام سے جب دورِ جامِ بادہ تھا" اس کے متعلق لکھا ہے: "دورِ جام کہنے کے بعد لفظِ "بادہ" کا اظہار بلاغت و فصاحت، دونوں کے منافی ہے" (ایضاً ص ۱۴۸)۔

جوش نے ایک نظم میں اپنی شریکِ زندگی سے خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے:

کیوں نہیں روتی، کہ دنیا دام میں آئی ہوئی
زر کے پیچھے دوڑتی پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے نیاز نے ایک ایسے نقص کی طرف متوجہ کیا ہے جو ویسے شاید بہتوں کے ذہن میں بھی نہ آپاتا، لکھتے ہیں:

"لفظِ "دام" کے معنی جال کے ہیں اور مجازاً اس کا استعمال مکر و فریب کے محل پر بھی ہوتا ہے؛ لیکن اصولِ معانی و بیان کے لحاظ سے مجازی معنی میں ایک لفظ ہمیشہ اس وقت استعمال کیا جائے گا جب اس کے بعد کوئی لفظ یا فقرہ ایسا نہ ہو جو لفظ کے اصل مفہوم کے متناقض ہو، دراں حالے کہ یہاں دوسرے مصرعے میں "دوڑتی پھرتی" کا فقرہ استعمال کیا گیا ہے، جو "دام" کے اصل معنی کے متناقض ہے۔ دام میں آنے کے بعد "دوڑتے پھرنا" کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے" (ایضاً ص ۲۸۴)۔

اسی اندازِ نکتہ سنجی کی ایک اور مثال۔ جوش کی نظم "ربودگی کی رات" پر تبصرہ کرتے ہوئے استعاراتی اندازِ بیان کے سلسلے میں ایک نکتے کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"اس نظم میں پہلے تو وہ یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ سڑکوں پر کامل خاموشی طاری ہے، لیکن آگے چل کر یہ بھی فرماتے ہیں:

لے رہی ہے سسکیاں روندی ہوئی سڑکوں کی گرد

اور یہ بھی:

کہہ رہے ہیں کتنی الجھی حسرتوں کی داستاں
راستوں پر گاڑیوں کے پیچ و خم کھاتے نشاں

ہر چند یہ سب استعارتاً بیان ہوا ہے، لیکن جوش صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسے استعاروں کا استعمال، جو کسی نہج سے جمعِ اضداد کی صورت پیدا کر سکیں، شاعری کا نقص ہے" (ایضاً ص ۳۰۷)۔ یہ واقعہ ہے کہ "سسکیاں لینا" اور "کہنا" (بہ طورِ استعارہ کیوں نہ ہو) کامل خاموشی کے منافی ہے۔ جوش کی نظم "ناخدا کہاں ہے" کا جائزہ لیتے ہوئے، ایسے ہی ایک اور نقص کی طرف ایک اور انداز سے توجہ منعطف کرائی ہے۔

اس نظم کے تیسرے بند کا پہلا شعر ہے:

ہواؤں کی سنسناہٹیں ہیں، سیاہ موجوں کے ہیں تھپیڑے
نہ آئے دریا کو وجد کیوں کر گھٹا جب اپنا رباب چھیڑے

نیاز نے بلاغت کی ایک باریکی کی طرف یوں توجہ دلائی ہے:

"دوسرا مصرع اس بند کا بالکل بدل دینے کے قابل ہے، کیوں کہ جس بند میں ہواؤں کی سنسناہٹ، موجوں کے تھپیڑوں، سیلاب کے تماچوں اور طوفان کے ڈڑبڑوں

کا ذکر کیا جائے، جو واقعی نہایت ہول ناک مناظر ہیں؛ اُس میں رباب چھیڑنے اور وجد میں آنے کی گنجایش کیوں کر نکل سکتی ہے۔ دفعتاً طوفان و سیلاب کا ذکر کرتے کرتے' محفلِ نشاط کا تلازمہ شروع کر دینا اور رزم سے بزم میں آجانا' فنِ بلاغت کے لحاظ سے نہایت سخت عیب ہے" (ایضاً ص ۳۲۹)۔

جوشؔ کی ایک نظم ہے "دخترانِ حوّا کا کورس" اُس کے چوتھے بند کا پہلا شعر ہے :

اپنے مکھڑوں میں نہ غلطاں ہو اگر موجِ گہر
لبِ گُل رنگ پہ کھیلے نہ تبسّم کا اثر

اِس میں ایک خامی کی طرف اِس طرح توجّہ دلائی ہے :

"پہلے مصرعے میں "میں" غلط ہے" "پہ" ہونا چاہیے؛ کیوں کہ "غلطانی" سطح چاہتی ہے اور سطح کے لیے "میں" کا استعمال درست نہیں"۔ (مالہ و ماعلیہ' ص ۳۷)

اِسی بات کو دوسری جگہ ایک اور انداز سے واضح کیا ہے۔ "تخلیقِ کائنات" سے متعلق جوشؔ کی مشہور نظم کا شعر ہے :

دُھندلی' اونچی فضاؤں میں غلطاں
زلفِ حوّا و دامنِ مریم

"اونچی فضا کے لحاظ سے "غلطاں" کی جگہ "پرّاں" ہونا چاہیے۔ "غلطاں" ہمیشہ نیچے لوٹنے والی چیز کی صفت میں استعمال ہوگا" (ایضاً ص ۲۲)۔

ماہرؔ القادری کا مصرع تھا: "میں نے ذرّوں سے تراشے ہیں ستاروں کے جہاں"، نیازؔ نے ایک نکتے کی طرف یوں متوجّہ کیا ہے :

"تراش کر کوئی چیز بنانا اِس کا مقتضی ہے کہ وہ چیز جسے ہم تراشتے ہیں' اُس سے چھوٹی ہو' جس سے وہ تراشی گئی ہے؛ لیکن اِس مصرعے میں ذرّوں سے ستارے تراشے گئے ہیں' حالاں کہ ستاروں کے مقابلے میں ذرّہ بہت چھوٹی چیز ہے؛ اِس لیے "تراشے ہیں" کی جگہ "بنائے ہیں" ہونا چاہیے" (ایضاً ص ۱۶۷)۔

جوشؔ کا ایک مصرع ہے :

ستارے دفن ہو جاتے ہیں جب آغوشِ ظلمت میں

نیازؔ نے لکھا ہے : "آغوش میں کوئی چیز دفن نہیں ہوتی' بلکہ چھپتی ہے" (انتقادیات' دوم' ص ۲۹۵)۔

"ظلمت" کو جب "آغوش" سے تعبیر کر لیا' تو پھر سارے تلازمے "آغوش" کی نسبت سے آئیں گے' یہ بیان کا مسلّمہ قاعدہ ہے۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ "قبر کی آغوش میں دفن ہوگئے" تو یہ اندازِ بیان صحیح نہیں ہوگا؛ "قبر کی آغوش میں چھپ گئے" جیسا پیرایۂ اظہار درست ہوگا۔ نیازؔ نے اِسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جوشؔ کا ایک اور مصرع ہے :

مکاں کے بام و در بجلی کی رو میں جب چمکتے ہیں

اِس سے متعلق لکھتے ہیں :

"شاعر کو "رو" اور چمک کا فرق معلوم نہیں۔ "رو" کرنٹ کو کہتے ہیں' جس میں خود کوئی چمک یا روشنی نہیں پائی جاتی اور نہ اُس کے انعکاس سے بام و در جھلک سکتے ہیں۔ بجائے "رو" کے "چمک" یا "تابش" استعمال کرنا چاہیے تھا" (ایضاً ص ۲۹۵)۔

لیننؔ سے متعلق سیمابؔ کی نظم میں یہ شعر بھی ہے :

بے کسی کے زرد چہرے پر خوشی کا نور تھا
افسرِ شاہی' بساطِ محفلِ مزدور تھا

""افسر" تاج کو کہتے ہیں اور تاج کو "بساط" کہنا غلط تعبیر ہے۔ "بساط" میں بسط یا پھیلاو کا مفہوم پنہاں ہے' اِس لیے "افسر" کو "بساط" کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی" (ایضاً ص ۱۶۶)۔

سیمابؔ کی نظم "فردوسِ گم شدہ" کے متعلق لکھتے ہیں : "اِس نظم کا دوسرا بند شاعر نے اِس دعوے کے ساتھ شروع کیا ہے کہ :

عالمِ ایجاد' اک مجموعۂ اضداد ہے
اختلافِ رنگ و بو سے انجمن آباد ہے

حالاں کہ "اختلافِ رنگ و بو" میں تضاد نہیں' بلکہ تنوّع ہے . . . پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :

رکھ لیے ہیں نام پھولوں کے ہمیں نے مختلف
فطرتِ گلشن مگر اِس قید سے آزاد ہے

اِس شعر نے اُس دعوے کو بالکل رد کر دیا جو شاعر نے پہلے شعر میں کیا تھا کہ : "عالمِ ایجاد اک مجموعۂ اضداد ہے" (ایضاً ص ۱۶۷)۔

سیمابؔ کی ایک نظم ہے "منافق"' اُس میں یہ دو شعر بھی ہیں :

دل اُس کا مزبلہ ہے اور گندہ ہے زباں اُس کی
کثافت سے ہیں آلودہ خیال آرائیاں اُس کی
زباں پر کچھ ہے' دل میں کچھ' نمونہ ہے دورنگی کا
خود اُس کا ہر عمل شاہد ہے اُس کی ظرف تنگی کا

اِس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے نیازؔ نے لکھا ہے :

"نہ صرف اِن دو شعروں بلکہ پوری نظم میں منافق کی تصویر کھینچ کر یہ ثابت کیا ہے کہ اُس کا ظاہر و باطن یکساں نہیں ہے اور جو دل میں ہے' وہ زبان پر نہیں ہے؛ لیکن اِس مصرعے میں: "دل اُس کا مزبلہ ہے اور گندہ

بے زباں اُس کی" بیان کا یہ التزام قائم نہ رہ سکا، کیوں کہ یہاں دل اور زبان، دونوں کو گندہ دکھایا۔ اگر اِس مفہوم کو یوں ادا کیا جاتا کہ گو زبان بظاہر صاف ہے، لیکن دل اُس کا مزبلہ ہے، تو بے شک درست ہوسکتا تھا" (ایضاً ص ۱۷۵)۔

سیماب ہی کی ایک نظم کا شعر ہے :

تغیرات اور علی التواتر تصرفات اور بے محابا
کمالِ حسن وجمال کیا ہے، زوالِ شیب و شباب کیا ہے

"دوسرے مصرعے میں "زوالِ شیب و شباب" لکھا گیا ہے، دراں حالے کہ "شیب" زوال کی صورت ہے۔ "زوالِ شباب" تو ٹھیک ہے، لیکن "زوالِ شیب" کے معنی تو از سرِ نو جوان ہو جانے کے ہیں" (ایضاً ص ۱۷۶)۔

جوشؔ کی نظم "محشرستانِ کان پور" کے شروع کے دو شعر ہیں :

اے سیہ رو، بے حیا، وحشی، کمینے، بدگماں
اے جبینِ ارض کے داغ، اے دنی ہندوستاں

تجھ کو عورت نے جنا ہے، جھوٹ ہے یہ اولعیں
آدمی کی نسل سے اور تو، نہیں، ہرگز نہیں

نیازؔ نے اپنے خاص انداز میں لکھا ہے :-

"پہلے شعر میں سرزمینِ ہندوستان سے خطاب ہے، جیسے "جبینِ ارض کا داغ" کہہ کر اور موثق کر دیا گیا ہے، لیکن دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ "تجھ کو عورت نے جنا ہے" دراں حالے کہ ہندوستان کی سرزمین کو عورت نے کبھی نہیں جنا اور نہ وہ آدمی کی نسل سے ہے۔ یہ نقصِ معانی و بیان کا ہے۔

اور ایک شعر ہے :

تیغِ بُرّاں اور عورت کا گلا، کیوں بدصفات!
چھوٹ جائیں تیری نبضیں، ٹوٹ جائیں تیرے ہاتھ

دوسرے مصرعے میں جو بددُعا دی گئی ہے، وہ غالباً اُسی عورت کی طرف سے دی گئی ہے، جس کا گلا تیغِ بُرّاں کی نذر ہوا ہے؛ ورنہ ظاہر ہے کہ ایسی پُر جوش نظم میں یہ نسائی بددُعا کیسی!" (ایضاً ص ۲۸۲)۔

جوشؔ کی نظم "بدمست رات" کا ایک شعر ہے :

نغموں کے تلاطم سے تھا جنبش میں لبِ لعل
موجوں کے تھپیڑوں میں تھا دریا کا کنارا

"نغموں کے تلاطم کو موجوں کا تھپیڑا اور لبِ معشوق کو دریا کا کنارہ کہنا؛ تشبیہہ نہیں، بلکہ پھبتی ہے۔"

اسی نظم کا یہ شعر ہے اور اس میں بھی ضعفِ تعبیر کی خرابی کو نمایاں کیا ہے :

ہر سانس میں اپنے ہی یہ پیچیدہ جوانی
ہر گام پہ لیتا ہوا زلفوں کا سہارا

"دونوں مصرعوں میں تضادِ مفہوم ہے۔ جو شخص اپنی قوت کے زعم میں ہر وقت اینٹھتا رہتا ہے، اُس کو فارسی محاورے میں "برخود پیچیدن" کہتے ہیں، چناں چہ فردوسی، سہراب کی قوت کا حال بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے :

تو گوئی کہ برخود بہ پیچد ہمی

اس لیے جیسا کہ شاعر نے پہلے مصرعے میں ظاہر کیا ہے، یہ ہوسکتا ہے کہ اُس کا محبوب اپنے جوشِ جوانی میں "پیچ و تاب" کھا رہا ہو؛ لیکن اسی کے ساتھ فوراً دوسرے مصرعے میں یہ کہنا کہ "ہر گام پہ لیتا ہوا زلفوں کا سہارا" اُس کے انتہائی ضعف و نقاہت کو ظاہر کرتا ہے۔ اِس کے علاوہ، زلفوں کا سہارا لینا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیا معشوق کی زلف کوئی عصائے پیری تھا، جس کا سہارا لیا جاسکتا ہے" (ایضاً ص ۲۹۷)۔

اِن متفرق مثالوں سے نیازؔ کا وہ طرزِ انتقاد سامنے آگیا ہوگا جس کی طرف آغازِ مضمون میں توجہ دلائی گئی ہے۔ اِس کی تکمیل کے لیے میں چاہتا ہوں کہ ایک مکمل نظم پر اُن کے اِس اندازِ تنقید کو پیش کیا جائے، اِس سے وضاحت کا حق بہتر طور پر ادا ہوسکے گا۔ انتقادیات (جلد دوم) میں جوشؔ کی بعض نظموں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مشکل سے جوشؔ کی کوئی ایسی نظم نظر آئے گی جس میں اس نوع کے نقائص نہ پائے جائیں۔ مثلاً ایک اور نظم ملاحظہ کیجیے، جس کا عنوان "التجا" ہے، اور جس کے ہر شعر میں بادِ صبا سے خطاب کیا گیا ہے :

اِدھر بھی بادِ صبا آ، بہار کی سوگند
شمیمِ طرۂ گیسوئے یار کی سوگند
کھلا دے میرے چمن میں بھی غنچۂ اُمید
خروشِ آمدِ فصلِ بہار کی سوگند
چھڑا دو رنگیِ اُمید و بیم سے دل کو
تبسمِ سحر و حُسنِ یار کی سوگند
مرے دماغ پہ بھی ڈال پرتوِ جاناں
تجھے شعاعِ سرِ کوہسار کی سوگند
جلا دے حُسن کے سینے میں آرزو کا چراغ
ضمیرِ سنگ میں روحِ شرار کی سوگند
بتا، بکھرتی ہے کس طرح زلف شانے پر
نزولِ رحمتِ پروردگار کی سوگند

سکھا جہان کو ایفائے عہد کا دستور
جلالِ صبحِ شبِ انتظار کی سوگند
سنا فسانۂ رفتارِ جاں فروزِ نگار
جوانِ خرامیِ ابرِ بہار کی سوگند
وفا کی دُکھتی ہوئی کروٹوں کو دے آرام
کنارِ یار و لبِ جوئبار کی سوگند
سنا دے جوشؔ کو بھی یارِ نازنیں کا سخن
فسونِ زمزمۂ آبشار کی سوگند

آپ اِس نظم کو پڑھنے کے بعد معلوم کریں گے کہ ہر شعر میں بادِ صبا سے خطاب کرکے، کسی نہ کسی چیز کی قسم اُس کو دلائی گئی ہے اور پھر اُس سے کسی نہ کسی خدمت کی التجا کی گئی ہے؛ اِس لیے ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ایسی ہونا چاہییں جن سے بادِ صبا کا قریب یا بعید کا کوئی تعلق ہونا چاہیے؛ ورنہ قسم اور التجا دونوں مہمل قرار پائیں گے . . .

پہلا شعر اِس لحاظ سے بالکل درست ہے کیوں کہ بادِ صبا کا شمیمِ طرّۂ یار سے بھی ایک نوع کا تعلق پایا جاتا ہے اور اُس کی روانی کے لحاظ سے 'بلانا' بھی نامناسب نہیں ہے۔ اِسی طرح دوسرا شعر بھی بے عیب ہے، کیوں کہ بادِ صبا کا تعلق فصلِ بہار اور غنچہ، دونوں سے ہے لیکن تیسرا شعر اِس لحاظ سے لغو ہے، کیوں کہ اُمید و بیم کی دورنگی کو چھڑانا بادِ صبا کا کام نہیں۔ اِسی طرح "حُسنِ یار" سے اُس کا کوئی تعلق نہیں، جو اُس کی قسم یاد دلائی جائے۔ "تبسّمِ سحر" تو ٹھیک ہے، لیکن اُس کے ساتھ حُسنِ یار کا اضافہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔

چوتھے شعر میں اُس سے التجا کی جاتی ہے کہ "مرے دماغ پہ بھی ڈال پر تو جاناں"، دراں حالے کہ بادِ صبا یا ہَوا کے خواص سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ پانچواں شعر پورے کا پورا اِس لحاظ سے بے معنی ہے، کیوں کہ نہ ضمیرِ سنگ میں روحِ شرار سے اُس کا کوئی واسطہ ہے اور نہ بادِ صبا چراغ جلا سکتی ہے، بلکہ وہ تو چراغ بُجھا دینے والی ہے۔

ساتویں شعر میں بھی یہی نقص ہے، کیوں کہ "ایفائے عہد کا دستور سکھانا" بادِ صبا کے فرائض میں شامل نہیں۔ اِسی طرح نویں شعر میں "کنارِ یار" بالکل بے محل استعمال کیا گیا ہے، کیوں کہ بادِ صبا "کنارِ یار" سے کوئی تعلق نہیں رکھتی" (انتقادیات، ص ۲۲۳)۔

آخر میں ایک اہم پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج میں ایک خاص بات یہ بھی ہوئی کہ کلاسکی ادبی روایت کو کم توجہی کی نذر کردیا گیا اور زبان و بیان پر گفتگو کرنا تو گویا بورژوا ہونے کا اعلان کرنا تھا۔ اُس پر ستم یہ ہوا کہ اُس تحریک کا شیرازہ بکھرنے کے بعد، جدیدیت کی جو لہر اُٹھی، اُس میں بھی سب سے زیادہ شامت آئی زبان و بیان کی۔ علامت نگاری اور تجریدیت کا ایسا شور اُٹھا کہ کچھ دنوں کے لیے دوسری آوازیں دب کر رہ گئیں۔ شعری روایت سے بے تعلقی ہی نہیں بیزاری بڑھنے لگی۔ ان سب محرّکات سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ پوری ایک نسل زبان کے نکات اور بیان کے محاسن کے عرفان سے محروم سی ہو کر رہ گئی۔ زبان کا جو رچا ہوا شعور ہونا چاہیے اور شعری روایت سے جس طرح شناسائی ہونا چاہیے، اُس سے محرومی نے بہت سے گُل کھلائے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب جدیدیت کے رہ نما، کلاسکی ادب کی طرف زیادہ توجہ مبذول کرنے لگے ہیں اور شعریات کی روایت کی اہمیت اور اُس سے شناسائی کی ضرورت پر زور دینے لگے ہیں؛ مگر اِس قدر تاخیر کے ساتھ کہ نئی نسل سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں ان روایتوں سے بے اعتنائی کا احساس جاگزیں ہوگیا۔ یہ بھی ایک المیہ ہے۔ کلاسکی ادبی روایتوں سے واقفیت کے بغیر اور زبان و بیان کے اسرار و نکات کا محرم ہوتے بغیر، کوئی اُستاد ادب کو سمجھنے کا حق ادا نہیں کرسکتا اور کوئی اچھا طالبِ علم اُس کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اِس کی ضرورت ہے اور بہت کہ زبان اور بیان کے مطالعے کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے اور شعری روایت کو سمجھنے کی اہمیت ذہن نشیں کی جائے۔ اِس سلسلے میں مشرقی شعریات کو اعلا درجات کے ادبی مطالعے کا حصّہ ماننا چاہیے۔ اِس مطالعے میں نیاز کی ایسی تحریروں کے منتخب اجزا کو بھی شامل کرنا ضروری قرار پائے گا۔ "منتخب اجزا" کی تخصیص اِس لیے کی گئی ہے کہ نیاز کی اِس نوع کی تحریروں میں سارے اعتراضات کی حیثیت یکساں نہیں، کچھ اعتراضات سے بہ آسانی (اور بجا طور پر) اختلاف کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اِس سے نیاز کی ایسی تحریروں کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ ہے کہ "منتخب اجزا" کا مطالعہ زبان و بیان کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔ یہ ایسے اجزا ہیں جن کا بدل دوسری جگہ نظر نہیں آئے گا۔

دوہے

کیا جانے کیا پی لیا، ماٹی نے اِس بار
دھرتی میں سر بوئیے اُگ آئے تلوار

گیان، سنبھلتا، شہرتیں، سب کی ایک سی لہر
پچیں تو امرت جانیے نہیں پچیں تو زہر

بچے باغی ہو گئے، گھر محفوظ نہ باٹ
اب ایشور بھی کیا کرے جو بویا سو کاٹ

جی چاہے بولا کرے، وہ سُکمار سُبودھ
سوندھے سوندھے شبد ہیں لہجہ کچا دودھ

ناچے بن چارہ نہیں، سمے نے دی ہے تال
کچھ تو پگ میں باندھ لے گھنگرو یا بھونچال

سمبندھی ہیں سب مرے، خوشبو، پودے، سائے
ہر پتے کی موت سے میرا کچھ کھو جائے

بھائی کی جو اَن سُنی، کچھ نہ رہے گا پاس
ہر لمحہ کچھ کان میں کہتا ہے اتہاس

بھوکی بھیڑ کے جسم میں بس سیپی بھر خون
چرواہے کو دودھ دے یا تاجر کو اُون

لے آتے بازار سے سُکھ کے لمحے چند
پیسوں سے ملتا کہیں جو من کا آنند

جیون! جو تجھ سے پڑھا، کیسے جائیں بھول
تجھ سا شکشک ہے کوئی نا تجھ سا اسکول

ظفر گورکھپوری
4/6-F، نیو میونسپل کالونی، دیونار، بمبئی ۴۰۰۰۴۳

گیت

سنسان سڑک ——
—— اور میں تنہا ——

آہٹ نہ کوئی پتّا کھڑکے
آندھی نہ کوئی بجلی کڑکے
اپنی ہی کسک
اور میں تنہا ——

سُورج نہ کوئی تارا میرا
تاریک فضاؤں نے گھیرا
اپنی ہی چمک
اور میں تنہا ——

منزل نہ کسی کو میں سمجھا
اِک دُھن میں بس چلتا ہی رہا
خوابوں کی دھنک
اور میں تنہا ——

ابراہیم اشک
۳۳۷، سائی نیواس، شانتی نگر، کُرلا (ویسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۷۰

چارمینار ـــــ چارسو سال

وحید انور
۱۴/۱، نیو آنند نگر، سانتا کروز ایسٹ، بمبئی ۴۰۰۰۵۵

حیدرآباد ـــــ شہرِ نگاراں!
قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے پیار
کا شہر!!
امن و آشتی کا گہوارہ جو اپنی گنگا جمنی
تہذیب کے لیے مشہور تھا۔ جو مختلف تہذیبوں
کا سنگم تھا اور جس کی شہرت سُن سُن کے
دُور دراز سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔
یہ شہر جو میرا وطن ہے جس نے مجھے
اپنی گودی میں کھلایا ہے ـــــ پروان چڑھایا
ہے۔ جس نے مجھے پالا پوسا ہے۔ جس کی
سوندھی سوندھی مٹی نے مجھے گوندھا ہے ـــــ
اور اس مٹی کی خوشبو میرے جسم میں رچی بسی
ہے۔
یہ شہر جس کا دیا میں نے کھایا ہے۔
جس کا میٹھا پانی میں نے پیا ہے۔ جس نے
میری زندگی کو سنوارا ہے۔ نکھارا ہے۔ اسے
جلا دی ہے۔
یہ شہر جس نے مجھے انسانوں سے پیار
کرنا سکھایا۔ اور ان کا دُکھ درد بانٹنے کا
درس دیا۔
یہ شہر جس کی گلیوں میں میں نے اپنی
زندگی کے بہترین اور سنہرے دن گزارے۔
لیکن یہ کیا۔ آج میں اپنے اس شہر
کو پہچان نہیں پا رہا ہوں ـــــ کتنا بدل گیا
ہے یہ شہر ـــــ سب کچھ اجنبی سا لگتا
ہے ـــــ یہاں کی گلیاں ـــــ یہاں کے لوگ
سب بدل گئے ہیں ـــــ آخر کہاں چلے گئے
وہ لوگ؟ ـــــ وہ جو پیار بانٹتے تھے ـــــ
ایک دوسرے کے دُکھ درد اور خوشیوں میں
برابر کے شریک تھے۔
شہر پھیلتا جا رہا ہے ـــــ لوگ
بڑھتے جا رہے ہیں ـــــ عمارتوں کا ایک
جال سا پھیل گیا ہے ـــــ تا حدِ نظر انسانوں
اور عمارتوں کا جنگل ہی جنگل نظر آتا ہے۔
میں انسانوں کے اس بے پناہ ہجوم
میں ـــــ عمارتوں کے پھیلے ہوئے اس جنگل
میں بھٹک رہا ہوں۔ کب سے میں اپنے اس شہر
کو ڈھونڈ رہا ہوں ـــــ اس کی پُرپیچ گلیوں
میں اپنے گھر کو تلاش کر رہا ہوں ـــــ "کہاں
ہے میرا گھر؟" ـــــ میں لوگوں سے پوچھتا ہوں۔
سب چُپ!
میں شہر سے پوچھتا ہوں ـــــ "بتاؤ
میرا گھر کہاں ہے؟" ـــــ شہر چُپ!
میں اکیلا ـــــ تنہا ـــــ بے یار و مددگار
کوئی ساتھی نہ شناسا ـــــ اجنبی شہر ـــــ
اجنبی لوگ! ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چلتے چلتے
تھک گیا ہوں ـــــ آدھی رات بیت
گئی ہے ـــــ
چلتے چلتے میرے قدم ایک چوراہے پر
آکر رُک گئے ہیں ـــــ میں سر اُٹھا کر اوپر کی
طرف دیکھتا ہوں ـــــ میرے سامنے چارمینار
چُپ چاپ کھڑا ہے ـــــ خاموش ـــــ
اُداس ـــــ
میں تھکن سے چور ہو گیا ہوں ـــــ
سوچتا ہوں۔ کچھ دیر چارمینار کے سائے میں
بیٹھ کے ذرا سستا لوں۔
سڑک پر مکمل سنّاٹا چھایا ہوا ہے۔
چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی ـــــ
اُداسی ہی اُداسی ـــــ کسی کے قدموں کی چاپ
تک سُنائی نہیں دیتی ہے۔
اب میں چارمینار کی سیڑھیوں پر بیٹھ
گیا ہوں۔ بیٹھے بیٹھے جیسے سوچ کے سمندر میں
غرق ہو گیا ہوں۔ کچھ لمحات ایسے ہی گزر جاتے
ہیں۔ اور پھر دھیرے دھیرے میری نگاہیں اوپر
چارمینار کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔
چارمینار! امن اور یک جہتی کی نشانی!
"کتنے موسم ـــــ کتنے انقلاب آئے
گئے۔ کتنے شاہوں کی شان و شوکت، اور
ان کے جاہ و جلال کو میری آنکھوں نے دیکھا
اور ان کا زوال بھی ـــــ چارسو سال سے
میں خاموش اسی جگہ کھڑا زمانے کے سرد و
گرم کو دیکھ رہا ہوں ـــــ میں کبھی سویا نہیں۔

ہمیشہ جاگتا رہا ہوں۔ ایک محافظ کی طرح میری نگاہیں اس شہر پر لگی رہی ہیں —"

کچھ دیر کے لیے فضا پر خاموشی چھا گئی — اور پھر آہستہ سے ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"کون ہو تم؟ — یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

"شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں! میں اسی شہر کا باسی ہوں — یہیں پیدا ہوا — پلا اور بڑھا۔ تمھاری گودی میں کھیلا ہوں — انھی سیڑھیوں پر تو میرا بچپن گزرا ہے — ایک طویل عرصے بعد اپنے وطن لوٹا ہوں — اپنے شہر آیا ہوں — لیکن یہاں تو ہر شے بدلی بدلی سی لگتی ہے — گلیاں — سڑکیں — اور لوگ۔ سب اجنبی لگتے ہیں — میں یہ سوچ کے تمھارے پاس آیا ہوں کہ یہ لوگ تو بدل گئے ہیں لیکن تم بدل نہیں جاؤ گے — تم ضرور مجھے پہچان لوگے — کیا تمھیں یاد نہیں۔ یہیں بیٹھ کے تو میں اپنی کہانیاں لکھتا تھا اور پھر تمھیں سُنایا کرتا تھا۔"

قدرے توقف کے بعد چارمینار کی آواز فضا میں اُبھری۔

"ہاں مجھے یاد آیا — میں نے تمھیں پہچان لیا — بہت سال پہلے کی بات ہے۔ یہیں — میری چھایا میں بیٹھ کے تم کچھ لکھا کرتے تھے — تم وہی کہانی کار ہونا؟"

"ہاں — میں وہی کہانی کار ہوں۔"

لیکن سُنو۔ اب یہاں تمھاری کہانی سننے والا کوئی نہیں۔ نہ جانے وہ سب لوگ کہاں چلے گئے جو پیار اور دوستی — امن اور شانتی — بھائی چارے اور یک جہتی کی کہانیاں شوق سے سُنا کرتے تھے۔ کب سے میں ان لوگوں کو ڈھونڈ رہا ہوں — کب سے پیار کے دو میٹھے بولوں کے لیے ترس رہا ہوں — لیکن کوئی بھی میرے پیار کا جواب نہیں دیتا — آج میں بھی تمھاری طرح اس شہر میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہوں — لوگوں نے مجھے بُھلا دیا ہے — میرے پیار کو ٹھکرا دیا ہے — چار سو سال سے میں اس چوراہے پر کھڑا لوگوں کو پیار بانٹتا آیا ہوں — انھیں امن اور آشتی کا درس دیتا آیا ہوں۔ اب میں کب سے اپنے ہاتھ میں خالی کاسہ لیے لوگوں سے بھیک مانگ رہا ہوں۔ اے پیارے لوگو! میرے خالی کاسے میں پیار کے دو بول پھینک دو — مجھے امن اور بھائی چارے کی بھیک دے دو — لیکن کوئی بھی نہیں سُنتا۔

چند مفاد پرست اور خود غرض لوگوں نے اس شہر کی پُر امن زندگی کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ دِلوں کے درمیان نفرت اور دُشمنی کی ایک دیوار کھڑی کر دی ہے انسان انسان کا دشمن ہو گیا ہے — بھائی بھائی کے خون کا پیاسا —!

جب شہر جل رہا تھا اور ہر طرف قتل و خون کا بازار گرم تھا تو اس شہر کے نیرو چین کی بنسری بجا رہے تھے۔

آدھی رات کے سنّاٹے میں آج بھی میں ان بے گناہوں کی چیخیں سُنتا ہوں — میں تڑپ اُٹھتا ہوں — کانپ اُٹھتا ہوں ان کی دردناک آوازیں سُن کے —

اشرار نے کتنے گھر اُجاڑ دیے — کتنی ماؤں کے لال اُن سے جُدا کر دیے کتنی عورتوں کے سہاگ لوٹ لیے — کتنے معصوم بچّوں کے ہونٹوں سے مسکراہٹیں چھین لیں۔ ان کو یتیم کر دیا — انھوں نے ان کمزور اور بے سہارا لوگوں کو نہیں مارا — انھوں نے مجھے چُھرا گھونپا ہے — انھوں نے میرے جسم کو لہولہان کیا ہے۔ میری روح کو لہولہان کیا ہے۔

آج میں زخموں سے تڑپ رہا ہوں — سِسک رہا ہوں — لیکن کوئی بھی میری طرف آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھتا۔

پھر فضا پر کچھ لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"کیا تم اس اُجڑے ہوئے شہر کو دیکھنا چاہتے ہو؟"

"ہاں — میں دیکھنا چاہتا ہوں — اس شہر کی سڑکوں، گلیوں اور بستیوں میں گھوم کے لوگوں کو دیکھنا چاہتا ہوں — ان سے ملنا چاہتا ہوں — میں ان کا دُکھ درد بانٹ لینا چاہتا ہوں — ان کے آنسو پونچھ لینا چاہتا ہوں۔"

"اچھا — تو آؤ — چلو میرے ساتھ۔ نفرتوں کے درمیان گھِرے ہوئے اس شہر کا چہرہ تمھیں دِکھانے کے لیے لے چلتا ہوں۔"

اور پھر میں چُپ چاپ چارمینار کے ساتھ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں چلنے لگا — چلتا گیا — چلتے چلتے وہ ایک جگہ رُک گیا۔

"یہ گھر دیکھ رہے ہو؟" چارمینار مجھ سے مخاطب ہوا۔ "غنڈوں نے اس گھر پر حملہ کر کے نہتّے بے گناہ لوگوں کو مارا۔"

"اس سڑک کو دیکھو۔ یہاں شرپسندوں نے محنت کش اور غریب لوگوں کے ٹھیلوں اور

ہاتھ گاڑیوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ ان کا مال لوٹ لیا۔"
پھر ہم ٹیڑھے میڑھے راستوں سے ہوتے ہوئے ایک تنگ سڑک پر چل پڑے ـــــ کچھ دُور چلنے کے بعد ہم ایک جگہ رُک گئے۔"اس جگہ کو اچھی طرح دیکھو۔ یہاں بہت ہی بھیانک اور دردناک واقعہ ہوا۔

"ایک نو بیاہتا جوڑا اس راستے سے موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ ان کی شادی ہوئے صرف ایک ماہ کا عرصہ گزرا تھا ـــــ لڑکی کے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ ابھی مٹا بھی نہیں تھا۔
ہتھیاروں سے لیس بلوائیوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ موٹر سائیکل سے دونوں کو اُتارا ـــــ وہ سہم گئے۔
"ہمیں نہ مارو ـــــ ہم بے قصور ہیں ـــــ بے گناہ ہیں۔" لڑکا گڑگڑانے لگا۔
"ہم نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ـــــ ہمیں چھوڑ دو ـــــ ہماری جان بخش دو۔ ابھی ابھی تو ہماری شادی ہوئی ہے۔"
لڑکی رونے لگی۔ وہ بلوائیوں کے پیروں پر گر گئی۔
مگر وہ قہقہوں کا ایک فوارہ سا فضا میں چھوٹا۔
"اچھا تو بھیا ـــــ اس بیچاری کو چھوڑ دو ـــــ جانے دو اسے۔" غنڈوں کے لیڈر نے کہا۔
اور پھر نوجوان پر تلواروں اور برچھوں کی بارش ہونے لگی۔ سڑک پر خون بہنے لگا ـــــ تازہ اور جوان خون۔
لڑکی بے تحاشا روتے ہوئے بھاگنے لگی
"بچاؤ ـــــ بچاؤ"
غنڈے لڑکی کے پیچھے دوڑے اور اسے پکڑ لیا۔ وہ اُسے لڑکے کی لاش کے پاس لے آئے ـــــ لڑکی خوف سے کانپنے لگی۔ اُس کی گھگھی بندھ گئی ـــــ اور پھر غنڈے لڑکی پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے ـــــ ایک وار ـــــ دو وار ـــــ اور پھر مسلسل کئی وار ـــــ لڑکی کے جسم سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے ـــــ بالآخر اُس نے تڑپ تڑپ کے جان دے دی۔

چار مینار جیسے اُداس ہو گیا تھا ـــــ وہ خاموش تھا ـــــ میں بھی خاموش تھا۔
ہم ایک نئے راستے پر چل پڑے تھے ـــــ اُداس اور خاموش۔
دیر تک ہم چلتے رہے۔
پھر ہم ایک جگہ رُک گئے۔ اس جگہ کو اچھی طرح دیکھو۔ یہاں ایک بوڑھی ماں اور اُس کی جوان حاملہ بیٹی کو انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا گیا ـــــ ماں اپنی بیٹی کو ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ اور اس کا معائنہ کروا کے لوٹ رہی تھی۔ غنڈوں نے دونوں ماں بیٹی کو گھیر لیا۔ وہ چیخنے چلّانے لگیں۔ لیکن کوئی بھی وہاں ان کی فریاد سُننے والا نہ تھا۔
چار سو سال میں ایسا خون خرابہ ـــــ ایسے بھیانک اور دردناک منظر میں نے نہیں دیکھے جو پچھلے دو سال میں میری ان بوڑھی آنکھوں نے دیکھے ہیں۔
ہسپتال میں کتنے ہی کمزور بوڑھوں، کتنی ہی مجبور عورتوں اور معصوم بچوں کو زخموں سے کراہتے، تڑپتے، بلبلاتے اور روتے دیکھ کے میں بھی ان کے ساتھ تڑپا ہوں۔ چلّایا ہوں اور رویا ہوں۔
ایک انسان سے اُس کی زندگی چھین لینا ـــــ اُس کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا بہت بڑا پاپ ہے۔ دُنیا میں اس سے بڑا گناہ کوئی نہیں۔
آج انسان اتنا سفاک، ظالم اور درندہ کیوں بن گیا ہے؟ کیوں اپنے ہی جیسے انسانوں کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے؟
نہ جانے کس کی نظر لگ گئی اس شہر کو!
اس دنگے اور فساد کا ذمّے دار کون ہے؟
میں ان سب کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کرتا ہوں ـــــ یہ سب گناہ گار ہیں!
مجرم ہیں ـــــ انسانیت کے مجرم!
اب کچھ لوگ اس شہر کا جشن منا رہے ہیں ـــــ
یہ جشن لاشوں کے ڈھیر پر منایا جا رہا ہے ـــــ جو مر گئے ہیں اور جو جیتے جی مر رہے ہیں ان کی لاشوں پر ـــــ
شہر سسک رہا ہے ـــــ اس کا جسم جگہ جگہ سے سڑ رہا ہے ـــــ اس کے رِستے ہوئے زخموں سے خون اور پیپ بہہ رہا ہے ـــــ اس کا چہرہ مسخ ہو گیا ہے ـــــ
شہر کے باسیوں کے گھر اُجڑ گئے ہیں۔
بے سہارا، بے روزگار لوگ ذلّت اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔
شہر کے گلی کوچوں میں گندگی اور غلاظت کے ڈھیر دِنوں پڑے رہتے ہیں۔
جگہ جگہ سڑکیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔
شہر کے اکثر محلّوں میں پانی نہیں ہے۔
کتنی ایسی گلیاں ہیں جہاں رات بھر اندھیرا رہتا ہے اور جہاں روشنی کا کوئی انتظام نہیں۔
جشن ـــــ!

جشن پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا جارہا ہے!

لیکن شہر کے جسم کے ناسوروں اور اس کے چہرے کے کوڑھ کے داغوں کو کون دُور کرے گا؟

میں نے چارمینار کی طرف سر اُٹھا کے دیکھا۔

چارمینار! — چارسو سال کی تہذیب اور کلچر کا سمبل!

آج بھی چارمینار شہر کی تہذیب اور کلچر کا جنازہ اپنے کندھوں پر اُٹھائے کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں خالی کاسہ ہے — اُس کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

"اے پیارے لوگو — مجھے امن کی بھیک دو — پیار کی بھیک دو — میں کب سے اپنے ہاتھ میں خالی کاسہ لیے اس چوراہے پر کھڑا ہوں — میرے خالی کاسے میں پیار کے دو بول پھینک دو۔ مجھے 'امن' آشتی اور بھائی چارے کی بھیک دو۔ مجھے تم سے کچھ اور نہیں چاہیے — کچھ اور نہیں..."

میں آہستہ سے چارمینار کی سیڑھیوں پر سے اٹھا۔ اور چپ چاپ ایک سمت کی طرف چل پڑا — اکا دکا آدمی سڑک پر چل رہے تھے۔ چلتے چلتے مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں بہت وزنی ہوگئے ہیں۔ میرے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے — پھر یکایک میرے قدم رُک گئے — میں نے پلٹ کر چارمینار کی طرف دیکھا — چارمینار چپ چاپ اور اداس کھڑا تھا — فضا دھواں دھواں سی تھی —

دور افق سے شفق کی لالی پھوٹ رہی تھی جیسے آسمان سے ایک نیا سویرا جھانک رہا تھا...

نظمیں

سفر خوابوں کا...

سفر خوابوں کا اچھا ہے
کلی کوئی مہکتی ہے
کوئی جگنو چمکتا ہے
کبھی تاروں کے جھرمٹ میں
کوئی مہتاب سا چہرہ
مجھے آواز دیتا ہے
جب اُس کے پاس جاتا ہوں
وہ مجھ سے دُور ہو جاتا ہے
اور ہنس ہنس کے کہتا ہے
سفر خوابوں کا اچّھا تھا
سفر خوابوں کا اچّھا ہے

حیات لکھنوی

۵- امامیہ ہال، پنچکوئیاں روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

آفریں

رات خوابوں میں کٹی
صبح سڑکوں پر آ گئی
دو پہر نے آگ برسائی بہت
شام سنولائی بہت
اک تماشا سا یہاں ہوتا رہا
نیلی، پیلی، سانولی آنکھیں جواں ہوتی رہیں
لمبی لمبی داستانیں اور افواہیں بیاں ہوتی رہیں
سانسیں دھواں ہوتی رہیں

بھاری بھرکم اور سنجیدہ سراپا کیا کریں
جال ہے اُس پار تک پھیلا ہوا
اُس کرنوں میں اُتر آئے تو کیا
یا س رنگوں میں سما جائے تو کیا
ہاتھ تو اُٹھنے ہی ہیں
پانو تو چلنے ہی ہیں

کانوں کو بھر جانا ہی ہے
جذبوں کو شرمانا ہی ہے

اِک وراثت، اِک امانت، اِک دیانت، اِک خیانت
سب کو ان الفاظ کے نرغے میں تو آنا ہی ہے
ننگ، بدنامی، حقارت، نیک نامی اور خوشی
ایک سمجھوتا کئی پرچھائیوں کے ساتھ ہے
ہر گریباں کے لیے اِک ہاتھ ہے
ہر ہاتھ کو تلوار ہے
اِک کرارا وار ہے
آفریں تجھ پر نوشتِ ماہ و سال
سایہ سایہ برسرِ پیکار ہے
اِک برہمی، اِک پیار ہے
اِک جیت ہے، اِک ہار ہے

شہپر رسول

۵۷- اے، کچہری روڈ، نزد پالیکا مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

وطنیت اور انسانیت کا شاعر

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

اختر بستوی

لیکچرر، شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور، یوپی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر بڑی ہی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی طبیعت کی شگفتگی اور ان کے دل کی کشادگی ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ سحر صاحب نے ایسی شگفتہ طبیعت پائی تھی کہ ان کے مزاج میں تلخی کا ہلکا سا عکس بھی کبھی محسوس نہیں ہوتا تھا اس خوبی نے ایک طرف تو انھیں ایسا باغ و بہار انسان بنا دیا تھا کہ ہر محفل ان کی موجودگی سے زعفران زار بن جاتی تھی اور دوسری طرف ان کی افتادِ طبع کو ایسے سانچے میں ڈھال دیا تھا کہ وہ ہمیشہ دوسرے انسانوں کے شاداب و شگفتہ پہلوؤں ہی پر نظر ڈالتے تھے۔ شگفتہ طبیعتی کے پہلو بہ پہلو ان کے دل کی ناپیدا کنار کشادگی سونے پر سہاگے کا کام کرتی تھی۔ اس صفت کی بنا پر وہ ہر چھوٹے بڑے انسان سے اتنی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے تھے کہ چند ہی لمحوں میں اجنبیت کا کوسوں پتا نہیں رہ جاتا تھا۔ سحر صاحب کی شخصیت کی یہ دو سب سے نمایاں خوبیاں ایک دوسرے سے شیر و شکر ہو کر انھیں انسان دوستی کا پیکر بنا دینے کا سبب بن گئی تھیں۔ موصوف کو صحیح معنوں میں انسان اور انسانیت سے پیار تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ سحر صاحب کا جذبۂ حب الوطنی بھی ان کا ایک انتہائی کشش انگیز وصف تھا۔ ذاتی گفتگو میں بھی اگر کبھی وطن کا ذکر آجاتا تھا تو ان کی زبان سے ایسے جملے بے ساختہ نکلنے لگتے تھے جو وطن کے عشق کی مسرور کن حرارت کے حامل ہوتے تھے۔ حالانکہ حب الوطنی ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق جذبات و افکار سے ہوتا ہے اور جو کسی کی شخصیت پر بالواسطہ تو اثر انداز ہو سکتی ہے لیکن جسے براہِ راست شخصیت کا عنصر قرار نہیں دیا جا سکتا، مگر سحر صاحب کے معاملے میں یہ ایک عجیب و غریب بات تھی کہ وطن کی محبت ان کے محسوسات و خیالات میں پوری طرح تحلیل ہو کر ان کے دل و دماغ کو بھرپور طور پر متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز طور پر جس طرح ان کی شخصیت کا جز بھی بن گئی تھی کہ ان سے ملنے والا ہر شخص اسے واضح طور پر محسوس کرتا تھا۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی شاعری ان کی شخصیت سے الگ کوئی چیز نہیں تھی۔ اس قسم کے لوگ جن کی شخصیتیں کھلی ہوئی کتاب کی طرح واضح ہوتی ہیں اگر شاعر ہوں تو ہمیشہ شاعری کی تصویر کے پردے میں بھی "عریاں" نکلتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح انسان دوستی اور حب الوطنی کے خمیر سے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی تعمیر ہوئی تھی اسی طرح احترام انسانیت اور عشق وطن کے تانے بانے سے سحر کی شاعری کا جامہ بھی تیار ہوا تھا۔ یہی سبب ہے کہ میں سحر صاحب کو وطنیت اور انسانیت کا شاعر سمجھتا ہوں۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی لیکن چوں کہ کسی شاعر کے خیالات و افکار غزلوں کی بہ نسبت نظموں میں زیادہ واضح طور پر سامنے آتے ہیں اس لیے موصوف کی شاعری کے فکری پہلو کا جائزہ لینے کے لیے پہلے ان کی نظموں پر نظر ڈالنا ہی مناسب ہوگا۔

سحر صاحب نے جتنی نظمیں کہی ہیں ان میں دو چار کو چھوڑ کر ساری کی ساری نظمیں ایسی ہیں جن کے موضوعات براہِ راست یا بالواسطہ وطن سے متعلق ہیں۔ وطن عزیز کی جدوجہدِ آزادی کے عظیم رہنما جواہر لال نہرو کی موت پر موصوف نے جو پُر درد مرثیہ کہا ہے وہ ایسے لوگوں کو بھی احساسِ غم سے ہمکنار کر سکتا ہے جو پتھر اور لوہے کا کلیجہ رکھتے ہوں۔ اس مرثیے میں دلوں کو کاٹ کر رکھ دینے والی یہ تاثیر صرف اس وجہ سے آسکی کہ اس کے پیچھے شاعر کے اپنے دل میں پلنے والا عشق وطن کارفرما ہے۔ نہرو کے مرنے پر شاعر کی آنکھیں خون کے آنسو اس لیے روئی ہیں کہ انھیں کھو کر سرزمینِ گنگ و جمن اپنے ایک سچے عاشق سے محروم ہو گئی:

یہ ترا کوہ ہمالہ یہ ترے گنگ و جمن
یہ ترے باغ یہ چشمے یہ ترے سرو سمن
یہ ترے کھیت یہ دہقاں یہ ترے دشت و دمن
سب میں رقصاں تھا ترا پیار ترا حبِ وطن
(مرثیۂ نہرو)

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو چونکہ بنیادی طور پر اپنے وطن سے پیار تھا اس لیے ان کے دل میں وطن کے ان تمام رہنماؤں کے لیے جذبۂ قدردانی موجود تھا جنھوں نے ہندستان کو غلامی کے اندھیروں سے نکال کر آزادی کے اجالوں تک پہنچانے کی جدوجہد کی اور پھر آزاد ہندستان میں تعمیر و ترقی کی نئی شمعیں روشن کیں۔ ان میں سے ہر ایک کی وفات پر ان کے قلب کو شدید صدمہ پہنچا تھا، جس کا اظہار انھوں نے اکثر مرثیوں اور حزنیہ نظموں کی صورت میں کیا ہے۔ مولانا آزاد کی رحلت کے بارے میں بھی موصوف کی ایک نظم ہے جس کے چند اشعار یہاں نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

ملک اور قوم کے عقیدت مند
یاد کرتے رہیں گے کام ترا
مرحبا اے ابوالکلام آزاد
تا قیامت رہے گا نام ترا

ملک و ملت کو ناز ہے تجھ پر
تا قیامت رہے گی تیری یاد
قید خانے میں خود رہا برسوں
ملک کو قید سے کیا آزاد
(آہ مولانا آزاد)

آزادی کے بعد ہمارے ملک نے سوشلزم اور سیکولرزم کے آدرشوں کو گلے لگایا اور ہر محبِ وطن کی طرح سحر صاحب بھی اس پر ایمان رکھتے تھے کہ ہندستان خوشحالی اور امن و امان کی نعمتیں انھیں آدرشوں کے وسیلے سے پا سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی نظموں میں جگہ جگہ ان کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا ہے۔ محترمہ اندرا گاندھی نے ملک کو "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ دیا تھا اور ہندستان کے کروڑوں باشندوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ غریبی کا بدنما داغ مادرِ ہند کے ماتھے سے مٹا کر رہیں گی۔ اندرا جی کی مختلف النوع سیاسی کامیابیوں پر متعدد شاعروں نے ان کی شان میں نظمیں لکھیں۔ سحر صاحب نے بھی یہ فرض ادا کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ موصوف کے وطن پرست دل میں ہندستان کے مفلوک الحال عوام کے لیے جو درد تھا اس سے مجبور ہو کر انھوں نے اندرا گاندھی کو غریبی ہٹانے کا ان کا وعدہ بھی یاد دلایا:

اپنے وعدوں کی وفا پر وا لبِ گفتار کر
پیٹ خالی سو رہے ہیں جو انھیں بیدار کر
باگ ڈور ان کی ترے ہاتھوں میں ہے جس سمت موڑ
تک رہے ہیں آس سے تیری طرف پچپن کروڑ
تن پہ کپڑا ہو، مکاں ہو سر چھپانے کے لیے
صرف دو روٹی ہو دونوں وقت کھانے کے لیے
جا بجا اسکول ہوں بچے پڑھانے کے لیے
ہے یہی کافی غریبوں کو اٹھانے کے لیے
کام اتنا ہی سا ہے لیکن اگر کر جائے گی
تو بھی نہرو کی طرح خود کو امر کر جائے گی
(تہنیت بخدمت دخترِ ہند اندرا گاندھی)

جس وقت ہند و پاک کی فضاؤں پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے اس نازک دور میں بھی سحر صاحب یہ بات دہرانا نہیں بھولے تھے کہ برِ صغیر کے سامنے اصل مسئلہ افلاس کا ہے، اس لیے اگر جنگ کرنی ہے تو غریبی اور اس کی پیدا کردہ مصیبتوں سے کرنی چاہیے:

جنگ کرنی ہے کریں ہم مل کے بیکاری سے جنگ
بغض سے کینہ سے نفرت سے دلآزاری سے جنگ
قحط سے سیلاب سے طوفاں سے بیماری سے جنگ
بھوک سے افلاس سے غربت سے ناداری سے جنگ
پوچھنا ہوگا یہ آخر ہند و پاکستان سے
پیٹ بھوکوں کا بھریں گے جنگ کے سامان سے؟
(ہند و پاکستان کے نمائندوں سے خطاب)

سیکولرزم کی راہ آزاد ہندستان نے اس لیے اپنائی ہے کہ یہاں بہت سے مذاہب کے ماننے والے آباد ہیں اور اگر اس ملک میں سیکولر طرزِ حکومت اور اندازِ فکر کو فروغ نہ دیا جائے تو اس کا اتحاد و اتفاق باقی نہیں رہ سکتا۔ وطن سے جس شخص کو بھی حقیقی محبت ہوگی وہ سیکولرزم کا قائل ہوگا۔ سیکولرزم مذہب کی نفی نہیں کرتا بلکہ ہر مذہب کے لیے رواداری کا جذبہ رکھتے ہوئے تمام مذاہب کا یکساں طور پر احترام کرنا سکھاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سیکولرزم مذہبیت کا نہیں بلکہ فرقہ پرستی کا مخالف ہے۔ سحر صاحب نے "فرقہ پرستی" کے عنوان سے ایک زوردار نظم کہی ہے جو ان کی مقبول ترین نظموں میں ہے۔ میں نے اکثر مشاعروں میں دیکھا ہے کہ موصوف جب اپنا کلام سنانے کے لیے مائکروفون کے سامنے جاتے تھے تو سامعین کی صفوں سے اس نظم کی فرمائش ہوتی تھی۔ ناموزوں نہ ہوگا اگر میں یہاں اس نظم کے چند اشعار نقل کرتا چلوں:

سبھی قوموں کو رہنا ہے یہاں یہ دیش ہے سب کا
کوئی لڑنے نہ پائے نام لے کر دین و مذہب کا
بڑا رتبہ دیا ہے خیر سے قرآں نے الفت کو
رکھا ہے گرنتھ نے گیتا نے بھی افضل محبت کو
رہی انجیل اس نے بھی سراہا ہے اخوت کو
ہوا دیتے ہیں یہ قسمت کے ہیٹے پھر بھی نفرت کو
نہ رہبر ہے نہ منزل ان کی یہ ایسے مسافر ہیں
کسی مذہب میں ہوں یہ لوگ ہر مذہب میں کافر ہیں
(فرقہ پرستی)

سحر صاحب کی مذکورہ نظم کا اختتامیہ درجِ ذیل شعر ایسا ہے کہ وہ ایک طرف تو حبِّ وطن میں ان کے یقینِ کامل کا غمّاز ہے اور دوسری طرف اسے ہم ہندستانی نقطۂ نظر سے سیکولرزم کی عمدہ تشریح قرار دے سکتے ہیں :

مے حبِّ وطن سے ہر بشر سرشار ہو جائے
ملیں گر کوثر و گنگا تو بیڑا پار ہو جائے

اسی نظریے کا سحر صاحب نے اور بھی کئی نظموں میں مختلف طریقوں سے اظہار کیا ہے ، مثلاً :

کوثر و گنگا سے لے کر بادۂ عرفاں کا جام
آؤ اِک دُنیا کو دے ڈالیں محبت کا پیغام
ہو یہی اپنا وطیرہ ہو یہی طرزِ کلام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام
(ہندو پاکستان کے نمائندوں سے خطاب)

وطن پرستی اور حبُّ الوطنی کے ساتھ ساتھ انسان دوستی اور احترامِ انسانیت کے مضامین بھی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی قریب قریب تمام نظموں میں اِس طرح نمایاں ہیں کہ انھیں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وطنیت کے نظریے میں ایک عیب یہ ہے کہ اس کی وجہ سے بعض اوقات اپنے وطن کا عشق اتنا بڑھ جاتا ہے کہ دوسروں کے وطن کا پاس و لحاظ باقی نہیں رہ جاتا اور اپنے ملک کے عوام سے لگاؤ اِس قدر شدید ہو جاتا ہے کہ دوسرے ممالک میں بسنے والے انسانوں کی فلاح و بہبود کی طرف نگاہ نہیں جاتی ۔ یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی تو حد سے بڑھی ہوئی وطنیت کے پرستار دیگر ممالک اور وہاں کے باشندوں کی زندگی کو جہنّم بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جرمنی کے نازیوں نے وطنیت کے شدّت پسندانہ تصوّر ہی کی وجہ سے ساری دُنیا کو جنگ کے شعلوں میں جُھلسایا تھا۔ لیکن اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وطن پرستی کے اِس روپ کو کسی بھی ملک کے صالح مفکروں نے کبھی اچھا نہیں سمجھا۔ خصوصاً ہندستان نے ہمیشہ حبُّ الوطنی پر زور دینے کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں کے وقار کا لحاظ رکھا ہے اور ساری دُنیا کے انسانوں کی خیر چاہی ہے۔ سحر صاحب ایک سچے ہندستانی تھے ۔ وطن کے عشق کے ساتھ ساتھ انھیں انسان سے بھی محبت تھی اور اس سلسلے میں وہ ممالک و اقوام کی تفریق نہیں کرتے تھے۔ جس زمانے میں ہندستان اور پاکستان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے سحر صاحب نے پاکستانی عوام سے اپنی محبت کا اعلان کیا :

مجھ کو پیارے ہیں دل و جاں سے تو تیرے عوام
ان کی ہمّت میں شجاعت میں نہیں کوئی کلام
وہ پھلیں پھولیں ہنسیں کھیلیں رہیں شاد مدام
ان کی خدمت میں بعد عجز سلام اور یہ پیام
ہر گلی کوچے میں ہر پیر و جواں تک پہنچے
"میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے"
(پاکستان سے خطاب)

اسی زمانے میں کہی ہوئی ایک دوسری نظم میں انھوں نے فرمایا :

بھائی سے بھائی خفا ہو جائے اچھا تو نہیں
گوشت ناخن سے جدا ہو جائے اچھا تو نہیں
(ہندو پاکستان کے نمائندوں سے خطاب)

سحر صاحب "انسان" کی دل سے قدر کرتے تھے اور اسے سب سے ارفع و اعلیٰ سمجھتے تھے۔ جواہر لال نہرو کی وفات پر انھوں نے جو نظم کہی ہے اس میں ایک جگہ نہرو کی عظمت یہ قرار دی ہے کہ وہ "انسان" تھے :

رند و زاہد کے لیے مرکزِ ایمان تھا وہ
وہ فرشتوں سے بھی بڑھ کر تھا کہ انسان تھا وہ
(مرثیۂ نہرو)

اپنے مذہبی پیشوا گرو نانک کی قدر و منزلت بھی ان کے دل میں اس وجہ سے تھی کہ انھوں نے آدمی ہو کر آدمی کا بول بالا کر دیا" :

نیّرِ تاباں نے عالم میں اُجالا کر دیا
آدمی نے آدمی کا بول بالا کر دیا
(گرو نانک)

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ سحر صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی ۔ ان کی نظموں میں "وطنیت" اور "انسانیت" کے موضوعات کس طرح غالب عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کی تفصیل میں پیش کر چکا۔ اب آیئے ذرا موصوف کی غزلوں پر بھی ایک سرسری سی نظر ڈالتے چلیں ۔ غزل اُردو شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جو ہیئت کے اعتبار سے بھی

روایت کی پابند ہے اور موضوعاتی طور پر بھی اس میں اکثر ایسے خیالات کا اظہار ہوتا ہے جو ذاتی کم اور روایتی زیادہ ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ غزل گوئی کے جدید انداز نے اس عیب کو کافی حد تک دُور کر دیا ہے، لیکن سحر صاحب نے چونکہ غزل میں "جدیدیت" کی روش نہیں اپنائی ہے اس لیے ان کی غزلوں کے اشعار میں روایتی موضوعات کی کثرت ہے، مگر جہاں کہیں بھی ان کے اپنے افکار کو نمایاں ہونے کا موقع ملا ہے، وطنیت اور انسانیت کے موضوعات سب سے زیادہ اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ کسی تشریح و تفصیل کے بغیر میں اُن کی غزلوں کے کچھ ایسے اشعار پیش کرتا ہوں، جن سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہ ہوگا کہ میری بات کس حد تک دُرست ہے:

قفس کی قید سے چھوٹے تو ہو تم اے چمن والو
کہیں پھر کھو نہ جانا اب اسیرِ آشیاں ہوکر

چمن پرست بنو گل کے پوجنے والو
یہ خار بھی ہیں نسیمِ بہار ہی کے پلے

پھول ہوں خار ہوں کہ غنچے ہوں
ہم کو سب سے نباہ کرنا ہے

ہم تھے فقط فرشتہ ہی بننے پہ مطمئن
یہ ہے خدا کی دین کہ انساں بنا دیا

بشر کی زد میں جنوں بھی ہے آگہی بھی ہے
یہ مشتِ خاک فرشتہ بھی آدمی بھی ہے

یوں تو انسان زمانے میں ہیں لاکھوں لیکن
وہی انساں ہے جو انسان کے کام آیا ہے

>>

غزل پارے

یہ کیا ہُوا کہ زیست سے رغبت نہیں رہی
یہ کیا ہُوا کہ موت میں ہیبت نہیں رہی

آنکھوں کو دیکھنے کے مواقع نہیں رہے
ذہنوں کو سوچنے کی اجازت نہیں رہی

سر پر فضیلتوں کا عمامہ نہیں رہا
ہاتھوں میں بھی ہُنر کی حفاظت نہیں رہی

کس نے چُرا لیے ہیں زبانوں کے ذائقے
بادام و سیب میں کوئی لذّت نہیں رہی

اب جو کسی کا عزمِ سفر ہی نہیں رہا
اب راستوں میں کوئی صعُوبت نہیں رہی

مصروف پستیوں نے ہمیں اِس طرح رکھا
خواب و خیال میں کوئی رِفعت نہیں رہی

بیتاب اب کے زور بہت برف کا رہا
اِمسال دُھوپ میں بھی حرارت نہیں رہی

پرِتپال سنگھ بیتاب

۹۔سی، گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں توی ۱۸۰۰۰۴

رند ساغری فتح گڑھی

بھٹک جاتے ہیں رستہ پوچھتے ہیں
یہ کس موسم کے پہلے قافلے ہیں

اندھیرے دَر پہ دستک دے رہے ہیں
دیے اُونچی منڈیروں پر جلے ہیں

شجر دل کا ہُوا پتّوں سے خالی
خزاں کی رُت کے سارے سلسلے ہیں

یہ مانا جسم تھک کر سو گیا ہے
مگر کچھ خواب اب بھی جاگتے ہیں

اُترتی رات کا پچھلا پہر ہے
جنابِ رند چلیے گھومتے ہیں

K-61، سیکٹر ۱۱، نوئیڈا (یوپی)

خود سے بیگانہ لوگوں میں اپنا چاہنے والا میں
بھیڑ میں شامل رہ کر بھی ہوں کتنا تنہا تنہا میں

میرا تمھارا رشتہ کیسا، اس کو کیا عنوان میں دوں
تازہ بہ تازہ تم ہو کہانی، بھُولا بسرا قصّا میں

مجھ میں کوئی ہلچل پیدا کرنا کچھ آسان نہیں
اپنی موجیں تہہ کے اندر رکھنے والا دریا میں

سب پر تیرا ابرِ رحمت یکساں برسے، سنتا ہوں
ذرّہ ذرّہ پیاس بجھائے، تو پھر کیوں ہوں پیاسا میں

بڑھتے بڑھتے بات نہ جانے کیا مفہوم اپنائے گی
تم نے کہنا کچھ چاہا تھا لیکن کچھ ہوں سمجھا میں

لمحہ لمحہ اس کے تیور بدلیں، میں خاموش رہوں
یار ذرا انصاف کی کہنا، کون بڑا ہے وہ یا میں

آپ کے اِک اِک پل کا ساتھی یعنی آپ کا سایا ہوں
چلیے، ساری دُنیا کھوٹی، ارشد صاحب! اچھا میں؟

رزّاق ارشد

نارش بک سینٹر، گھیر میر عالم خاں، اندرون نائب صاحب کی نال، ٹونک ۳۰۴۰۰۱

جُڑواں باتیں

یوسف ناظم

۱۹، الہلال، ۱۳۰، باندرہ ری کلیمیشن، بمبئی ۴۰۰۰۵۰

بچّوں پر باپ کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا کہ ماں کا ہوتا ہے اسی لیے جو بھی بچّہ پیدا ہوتا ہے روتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ یہ قدرت کا انتظام ہے۔ بچّے کو روتا سُن کر ماں خوش ہوتی ہے۔ دُنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔ ہماری اپنی خوشی کی بنیاد خود اپنی خوشی نہیں ہوتی دوسروں کے حال پر ہم خوش ہوتے ہیں۔ تاہم ولادتوں کے معاملے میں وجہِ مسرّت کچھ اور ہوتی ہے۔ بعض صورتوں میں رونے کی صرف ایک آواز کافی نہیں ہوتی اس لیے جُڑواں بچّے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ یا تو دو ہوسکتے ہیں یا دو سے زیادہ۔ چار کے آگے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ ان چار پانچ جُڑواں بچّوں کی ولادت اگر کسی میٹرنٹی ہوم میں پایۂ تکمیل کو پہنچے تو جو شخص راہداری میں بے ہوش پایا جائے وہی ان نومولود بچّوں کا وارث یعنی والد ہوتا ہے۔ بیچارہ۔ اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ شبہ کی اگر کوئی گنجائش ہوتی ہے تو بس اتنی کہ یہ شخص بے ہوشی کی منزل سے آگے تو نہیں چلا گیا۔ یہ کوما بھی ہوسکتا ہے۔ اسپتالوں میں یہ کیفیتیں عام ہیں۔ میٹرنٹی ہوم میں جب ان تازہ واردانِ بساط کو اہلِ نظر کے ملاحظے کے لیے ایک فِش پونڈ نما شیشے کے گھر میں سجا کر پیش کیا جاتا ہے تو مقامی پریس کے نمائندے اور فوٹو گرافر اپنی اپنی بیاضیں اور کیمرے لے کر موقعۂ واردات پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ بعض صورتوں میں تو انتظامیہ بھی حرکت میں آجاتا ہے اور یہ خود ایک اہم خبر ہوتی ہے۔ اس تقریب کے سلسلے میں جن لوگوں کو شہرت کے قابل سمجھا جاتا ہے اُن کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔ پہلے نمبر پر ماں بمعہ اطفال، دوسرے نمبر پر جائے واردات یعنی میٹرنٹی ہوم اور اُس کا یا اُس کی سربراہ۔ تیسرے پر لیڈی ڈاکٹر (سفید کوٹ اور اسٹیتھسکوپ کے ساتھ) اس کے بعد وہاں کا عملہ اور آخر میں کو دکانِ نو بہ نو کے والدِ ماجد۔ شہرت کے خانے میں والد کا نام آخر میں لکھے جانے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ آج کل یہی قاعدہ رائج ہے۔ مشاعرے کی فہرست ہو یا کسی فلم کا اشتہار۔ سب سے بڑا نام سب کے آخر میں دیا جاتا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ سارے ناموں کے بعد لفظ اور لکھا جائے اور اس کے بعد جلی حروف میں یہ نام۔ اسے حرفِ آخر سمجھنا چاہیے۔ ویسے سب جانتے ہیں کہ یہ کارنامہ ہے انھی کا۔

جُڑواں بچّوں کے ایک گروہ کی صورت میں دُنیا میں نمودار ہونے کے واقعات چونکہ اب تعداد میں زیادہ ہونے لگے ہیں اس لیے اب ان کی تشہیر اتنی نہیں ہوتی جتنی پہلے ہوتی تھی۔ اخباروں میں اس موضوع پر اداریے تک لکھے جاتے تھے۔ ایڈیٹر حضرات خوش ہوجاتے تھے کہ گھر بیٹھے اداریے کے لیے ایک دلچسپ موضوع ہاتھ آیا۔ ان اداریوں میں حفظانِ صحت، ملک کی آبادی کا مسئلہ، غذا کی صورتِ حال، سائنس کی ہمہ جہتی ترقّی کے ساتھ ساتھ اور کئی موضوعات پر جس کے جی میں جو آتا لکھ دیتا۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ اداریوں کے لیے اب موضوع بھی جُڑواں بچّوں کی طرح پیدا ہورہے ہیں اور ایڈیٹروں کی پریشانی یہ ہے کہ کس موضوع پر لکھیں اور کس پر نہ لکھیں۔

جُڑواں بچّے اب ہماری ہندستانی فلموں میں بھی نمودار ہونے لگے ہیں لیکن یہ بچّے ایک ساتھ یعنی ایک ہی چھت کے نیچے پرورش نہیں پاتے۔ حالات انھیں ایک دوسرے سے الگ کردیتے ہیں اور اُس وقت تک الگ رکھتے ہیں جب تک کہ دونوں بھائی اپنے اپنے طور پر جوان ہوکر معاشقوں کی عمر تک نہیں پہنچ جاتے۔ اِن میں سے ایک بھائی پولیس افسر اور ایک بھائی ڈاکو بن جاتا ہے۔ یہ فرق الگ الگ پرورش پانے کی وجہ سے ہوتا ہے دونوں ایک ساتھ پرورش پاتے تو دوسرا بھائی بھی ڈاکو بن سکتا تھا۔ لیکن فلموں کے اسکرپٹ میں ایسا نہیں ہوتا۔ حقیقی زندگی کی بات اور ہے۔ جیسے ہی اِن دونوں

کو یہ خبر ملتی ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں دونوں ایک دوسرے پر قربان ہونے کا موقعہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ ڈاکو سبقت لے جاتا ہے۔ یہ تو فلم ہے لیکن حقیقی زندگی میں بھی ڈاکو ہی ہر معاملے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ انھوں نے جنگلوں اور پہاڑوں کی رہائش بھی ترک کر دی ہے۔

جڑواں بچوں کی نفسیات ایک سی نہیں ایک ہی ہوتی ہے۔ ان کے سر میں دو الگ بھیجے ہوتے ہیں لیکن یہ دونوں سوچتے ایک ہی طرح ہیں اور ایک سیاسی جماعت کے دو علیحدہ علیحدہ ونگ کی طرح کام کرتے ہیں۔ مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ ویسے گھروں میں اگر دو چار بچے مختلف عمروں کے ہوں اور ان میں سے کسی ایک بچے کا جی رونے کو چاہے تو دوسرے بچے بھی اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ گھریلو یک جہتی ہوتی ہے تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ اس خانہ زاد یک جہتی کا مظاہرہ ہر موقعے پر ہو لیکن جڑواں بچوں کی حد تک ان کا ایک ہی وقت میں رونا ایک لازمی مضمون ہے۔ بھوک بھی دونوں کی ایک ہی وقت چمکنی چاہیے۔ یہ بچے، والدہ کے دائیں بائیں سوتے ہیں۔ نکیرین کی طرح کسی اور کو سوال جواب کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ ان میں کون بڑا کون چھوٹا ہے اس مسئلے پر بھی ہمارے قانون داں دانشوروں نے اور ان کے مشوروں پر گمراہ ہونے والی عدالتوں نے کافی اہم فیصلے صادر کیے ہیں تاہم عدالت جس بھائی کو چھوٹا قرار دیتی ہے وہ برادرِ خورد مباش کے مقولے کو غلط ثابت کرنے کے لیے ترکِ وطن کر کے کسی ایسے ملک کا گرین کارڈ حاصل کر لیتا ہے جہاں اس مخلوق کو انسان کے برابر کا درجہ دیا جاتا ہے۔ جو چھوٹا بھائی ترکِ وطن نہیں کر سکتا اپنے ہی وطن میں پولیس فورس کے ڈاگ اسکوئیڈ کا نگراں کار بن جاتا ہے۔ ویسے جڑواں ہونے کے معاملے میں جنس کی کوئی قید نہیں ہے جڑواں بہنیں بھی ہو سکتی ہیں اور جڑواں بھائی بہن بھی۔ جڑواں بہنیں زیادہ مسائل پیدا کرتی ہیں۔

بچوں کی پیدائش کے بعد پہلا مسئلہ پرورش کا اور دوسرا مسئلہ تربیت کا ہوتا ہے۔ باپ اپنے آپ کو ان مسائل سے دور رکھتا ہے۔ بچوں کی عافیت بھی اسی میں ہے۔ اب تو ماؤں کی بھی کوشش یہی ہوتی ہے کیوں کہ وہ سکریٹریٹ جانے لگی ہیں لیکن حالات انھیں مجبور کر دیتے ہیں۔ بہت سی ماؤں کو تو اب نہ چوٹی ڈالنی آتی ہے نہ روٹی ڈالنی۔ چوٹی کا مسئلہ تو یوں حل ہو جاتا ہے کہ یہ رکھی ہی نہ جائے اور روٹی کا مسئلہ یوں حل ہوتا جا رہا ہے کہ اب شہروں میں آدھے سے زیادہ گھروں میں روٹی نہیں ڈبل روٹی کھائی جاتی ہے۔ دن پاؤ کھانے سے شروع ہوتا ہے اور پاؤ بھاجی کھانے پر ختم ہوتا ہے۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ زندگی یوں تمام ہوتی ہے۔ ہماری زندگی ہیں۔ جی ہاں اسے زندگی ہی کہتے ہیں، یہ بیکری کب داخل ہوئی ابھی اس کی تاریخ مرتب نہیں ہوئی ہے لیکن قیاس کہتا ہے کہ بیکری اور اس کی پیداوار بیڈ ٹی کے ساتھ آئی ہوگی۔ یہ سب انگریزوں کا کیا دھرا ہے۔ کہا جاتا ہے جب ۱۸۷۶ء میں کوئن وکٹوریہ کو ہندستان کی ملکۂ معظمہ بنایا گیا اس وقت یہ بیکری ہمارے کلچر کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ بیکری سے انگریزوں کی دلچسپی اس حد تک ہے کہ بس یوں سمجھیے وہ بیکری میں پیدا نہیں ہوتے۔ بیکری گرم بہت ہوتی ہے لیکن وفورِ محبت میں یہ اپنا نام بیکر ضرور رکھ لیتے ہیں۔ برتھ ڈے کیک بھی انگریزوں ہی کا دیا ہوا تحفہ ہے ورنہ ہمارے کلچر میں لڈو سرِ فہرست تھے اور بچوں کی سالگرہ پر لڈو ہی بانٹے جاتے تھے اب لڈو نہیں بٹتے کیک کٹتے ہیں اور کیک کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھ کر لوگ تالیاں بجاتے ہیں۔ صرف کیک ہی نہیں کٹتے غبارے بھی پھٹتے ہیں۔ کلچر ہوا ہو گیا ہے۔ دو چار کیک ایک ہی وقت میں کٹیں تو یہ پارٹی برتھ ڈے پارٹی نہیں اچھا خاصا سمپوزیم ہو جاتی ہے۔

جڑواں بچوں کی پرورش تو جوں توں کر کے ہو جاتی ہے تربیت نہیں ہونے پاتی۔ ان میں برتری اور ہمسری کا جھگڑا رہتا ہے۔ ماں ان بچوں کو یہ نہیں سمجھا سکتی کہ کون کس کا احترام کرے اور کون کس کے ساتھ شفقت برتے۔ ایک بہن جب دوسری بہن سے کہتی ہے۔ چھوٹی ہو کر تم بڑی بہن سے اتنی بدتہذیبی سے بات کرتی ہو؟ تو دوسری بہن جواب دیتی ہے۔ اوہو۔ آپ بڑی بہن ہیں۔ دس منٹ پہلے کیا پیدا ہو گئیں بڑی بن گئیں اور یوں بھی بزرگی بہ عقل است۔ دونوں ایک دوسرے کی زلفیں کھینچنے لگتی ہیں وہ زلفیں جو کسی کے شانوں پر پریشان ہونے کے لیے محفوظ رکھی جانی چاہئیں گھر کے بند ماحول میں کھل کر بے وجہ لہرانے لگتی ہیں۔ سر چوٹی کانفرنس میں بالعموم یہی ہوتا ہے۔ ماں دونوں بہنوں کے درمیان ایک محترم فاصلہ قائم کرنے کی غرض و غایت سے، دیوارِ چین بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

اُس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ حلیف ہوں یا حریف ان کے درمیان ایک مناسب فاصلہ رہنا ہی چاہیے ۔ دونوں ایک دوسرے کی دست درازی سے محفوظ رہتے ہیں لیکن غریب ماں کو کیا پتا کہ برتری اور ہمسری کی خاطر جو مجادلے منعقد ہوتے ہیں ان میں کتابی مقولے کام نہیں آتے ۔ ہزیمت اور خفت ماں کو اُٹھانی پڑتی ہے ۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ صرف گھریلو ماؤں کا نہیں اکثر صورتوں میں مادرِ وطن کا بھی یہی حال ہوا ہے بھائی بہنوں کا جُڑواں ہونا ضروری نہیں اُن کا بھائی بہن ہونا کافی ہے ۔ تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ مسئلہ علاقائی نہیں عالمگیر ہے اور خاص طور پر بڑی طاقتوں میں بے حد مقبول ہے ۔ بڑی طاقتیں جُڑواں نہ ہونے کے باوجود ایک ہی بھیجے سے سوچتی ہیں ۔ ان میں خون کا رشتہ نہیں ہوتا لیکن طلب انھیں اسی کی ہوتی ہے ۔

بچّوں کی تربیت کس طرح کی جائے اس موضوع پر تو کتابیں مل جاتی ہیں یہ اُن لوگوں کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں جنھیں اس کا کوئی عملی تجربہ نہیں ہوتا بلکہ بعض مصنّفین کے بارے میں تو یہ تک مشہور ہے کہ وہ مجرّد تھے لیکن ہمارا خیال ہے مجرّد ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ مصنّف ناتجربہ کار بھی ہے ۔ یوں بھی بچّوں کی تخلیق اور کتاب کی تصنیف دو الگ الگ شعبۂ حیات ہیں ۔ ان مشاغل کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے ۔ ہم کہنا یہ چاہ رہے ہیں کہ جُڑواں بچّوں کی تربیت کے موضوع پر کوئی کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی اسی لیے ان بچّوں کی ماؤں کے چہرے پر عمر جلد بولنے لگتی ہے ۔ بچّے جُڑواں نہ ہوں تب بھی لڑتے ہیں اور بڑے ہو کر تو ایک دوسرے کے اعزاز میں عدالتی چارہ جوئی بھی فرماتے ہیں لیکن جُڑواں ہوں تو ان میں تبادلۂ خیال ذرا زیادہ ہوتا ہے ۔ برادرانہ اور خواہرانہ تعلّقات میں سُرخ ذرّات کا عمل دخل زیادہ ہو گیا ہے کہیں کہیں تو مادرِ علمیہ بھی حیران پریشان ہے ۔ خود اس کی عافیت خطرے میں پڑ جاتی ہے معلّمین اپنا مضمون کم پڑھاتے ہیں آزادیٔ تحریر اور آزادیٔ تقریر کے عنوان پر بیانات زیادہ دیتے ہیں ۔ بچّوں میں علم کی روشنی تو نہیں پھیلتی، انتشار ضرور پھیلتا ہے ۔ معلّموں کو انتشار پھیلانے کی الگ سے کوئی تنخواہ نہیں ملتی لیکن یہ کام وہ فلاح و بہبود کی خاطر کرتے ہیں اور اپنی اس نیکی کو دریا میں ڈال دیتے ہیں ۔ نیکی کو وہ دریا میں اس لیے ڈال دیتے ہیں تاکہ کسی کو پتا نہ چلے کہ یہ خدمت کس نے انجام دی ہے ۔ کتابوں میں آیا ہے کہ خلقِ خدا کو فائدہ پہنچانے کا ہر کام خفیہ طور پر کیا جانا چاہیے ۔

اس وقت آدمی بے حد مصروف ہو گیا ہے ۔ خود اپنے گھر کے ماحول پر اُسے توجہ کرنے کا وقت نہیں مل پا رہا ہے لیکن ماحولیات کے مسئلے پر وہ غور و خوض کر رہا ہے ۔ اُسے زمین کی بھی فکر ہو رہی ہے اور اُسے شاید یہ ڈر ہو رہا ہے کہ یہ زمین اُس کے پاؤں کے نیچے سے سرک نہ جائے ۔ کچھ لوگوں نے تو طے کر لیا ہے کہ وہ اب زمین پر نہیں رہیں گے خلا میں مکانات بنائیں گے ۔ یہ بہت اچھا ہے ۔ خلا میں مکانات بن جائیں تو اجناس کی قیمتیں آسمان پر نہیں پہنچ پائیں گی ۔ بھائیوں میں لڑائی کی دو ہی وجہیں ہوتی ہیں یا تو غذائی اجناس یا خود جنس ۔ لیکن دانشوروں کا کہنا ہے کہ لڑائی کے لیے کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں ہے ——— ان کا بھائی ہونا ہی کافی معقول وجہ ہے ۔

اخلاقیاتِ بھرتری ہری

(۱)

علم و دانش سے جب میں عاری تھا
خود پہ کتنا غرور تھا مجھ کو
جیسے اک فیل مست و آوارہ
ہوگئی تھی مجھے غلط فہمی
گویا "میں بھی ہوں ایک دانشور"
ہاں مگر جب میں ایک بار ملا
عقل مندوں سے، اہلِ دانش سے
ڈھل گیا اس طرح سے میرا غرور
جیسے بیمار کا بخار اُترے
اور پھر مجھ کو یہ ہوا معلوم
"میں حقیقت میں ایک جاہل ہوں"

(۲)

آدمی صف شکن بھی ہوتا ہے
شیر و اژدر کو مار لیتا ہے
بحرِ ذخّار کے تلاطم میں
تیر کر اس کے پار جاتا ہے
ہاں! مگر وہ بدل نہیں سکتا
مردِ ناداں کی فکر کا انداز

(۳)

آدمی کی زباں کا کیا کہنا
بے حسی نام ہے شرافت کا
زہد کو بھی فریب کہتے ہیں
نام معصومیت ریا کاری
اور شجاعت کا نام بے رحمی
نام رہبانیت ہے مکاری
اور تملّق ہے نام ہمدردی
خودسری عظمت و جلال کا نام
خوش بیانی کا نام ہے بکواس
اک وفا کیش آدمی نامرد!
کوئی ایسا ہے وصفِ انسانی
لوگ جس کو نہ متہم کردیں؟

(۴)

بوند پانی کی گرم لوہے پر
گر پڑے تو وجود کھو بیٹھے
برگِ گل پر اگر گرے اک بوند
اُس کو موتی کی آب و تاب ملے
اور وہی بوند گر صدف میں پڑے
جاکے بن جائے گوہرِ نایاب
اس طرح آدمی بھی صحبت سے
خود شریف و رذیل بنتا ہے

ترجمہ: عبدالستّار دلوی
صدر شعبۂ اُردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی ۴۰۰۰۹۸

مُرادوں کا شہر

قیصر اقبال
شاہ فیملی احاطہ، دلاور پور، مونگیر (بہار)

جب دن نکلا اور میں نے بچپن کا خمار اُترنے کے بعد اپنے اِرد گرد کے ماحول کو دیکھا تو سب کچھ ٹھیک ہی تو تھا۔ دادا جان باہر کی بیٹھک میں حسبِ معمول اپنے مُنشیوں کی مدد سے بٹائی داروں اور ٹھیکے پر کھیتی کرنے والے کسانوں سے غلّے، لگان اور مال گزاری کا حساب کتاب کر رہے تھے، اَبّا جان دیوان خانے میں صبح کی چائے نوش فرمانے کے بعد چچا مُراد بخش اور حکیم فضل الرحمٰن خاں بیدلؔ سے شعر و سخن پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ زنان خانے میں امّی جان تلاوتِ کلام پاک سے فارغ ہو کر چائے کا پیالہ مُنہ سے لگائے بیٹھی تھیں اور ننّھا شوکت انھیں ”حمدِ جنابِ باری رکھو زباں پہ جاری“ بطور سبق سُنا رہا تھا کریمن بُوا سامنے کی ڈیوڑھی میں جو باورچی خانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی، حویلی کی لگی بندھی نوکرانیوں سے ناشتہ تیار کروا رہی تھیں اور مُنشی رحیم گوداموں سے اجناس نکلوا نکلوا کر بالا خانے کی لمبی چوڑی چھت پر انھیں دھوپ دکھانے کا انتظام کروا رہے تھے۔ گرمیوں کی چھٹی میں کالج بند ہو جانے کی وجہ سے میں بھی گھر آجایا کرتا تھا جہاں مجھے حویلی کے دالانوں اور کشادہ راہ داریوں میں بڑی راحت ملتی تھی۔

میں جب بھی حویلی میں ہوتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میں نے اپنی زندگی کا کوئی لمحہ بھی نہیں گنوایا ہے اور میرے بچپن سے لے کر اب تک کا پورا وقت میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے میں اکثر بالا خانے میں آکر ڈولی اور محافے میں گھنٹوں بیٹھا رہتا اور اُن دنوں کو آنکھوں کے سامنے سے گزرتا دیکھتا جب میں' راشدہ' خالدہ اور شاکر بھری دوپہر میں سب سے چھُپ کر گڑیوں اور گڈّوں کی شادیاں کرتے اور انھیں اس ڈولی میں بٹھاتے۔ یہ وہی ڈولی تو تھی جس میں کبھی امّی جان دلہن بن کر حویلی آئی تھیں تب سے یہ ڈولی بالا خانے کی زینت بنی رہی اور پھر جیسے ڈولیوں کا چلن ہی ختم ہو گیا اور اُس کی جگہ بگھی اور ٹم ٹم میں شامیلنے چھپر کھٹ' جھالر اور پردے لگنے لگے جس میں حویلی کی بیبیاں ایک حویلی سے دوسری حویلی جانے لگیں۔

حویلی کا پائیں باغ بھی میری دلچسپیوں کا مرکز تھا جہاں دادا جان جاڑے کی دھوپ میں گدّے لگا کر ہونٹوں میں حُقّے کا نیچا دبائے زمینداری کے کاغذات کا بغور مطالعہ کرتے اور اسی بیچ کبھی کبھی دادی جان بھی اُن کے پاس آکر بیٹھ جاتیں اور اپنی حویلی سے لے کر پاس پڑوس کی تمام حویلیوں کے حالات سے انھیں باخبر کرتیں۔ اور جب میں کھیلتا کھیلتا اُن کی گود میں جاکر بیٹھ جاتا تو اُن کی باتوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا۔ حویلی کے صدر دروازے میں جو بڑی سی بیٹھک ہے وہاں اب بھی دادا جان کی تصویر آویزاں ہے اور اُس تصویر میں' میں اُن کی گود میں ہوں۔ اس بیٹھک میں دادا جان کی دوسری تصویریں بھی ہیں جن میں وہ کئی انگریز افسران کے ساتھ شکاری لباس میں مردہ شیر کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور ایک وہ تصویر بھی ہے جب انھیں گوروں کی سرکار سے خلعت اور خان بہادر کا خطاب ملا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ساری باتیں نقش بر آب بن گئیں اور اس لمبی چوڑی حویلی کے در و دیوار کا رنگ و روغن اترنے لگا۔ چھوٹے چچا جان ولایت سے بیرسٹر بن کر آئے تو انھیں یہ حویلی ایک ویران کھنڈر لگنے لگی اور وہ شہر کے مضافات میں ایک بڑی سی زمین پر کوٹھی بنا کر رہنے لگے۔ کوٹھی کے آہنی دروازے پر بگھی کے ساتھ موٹر کار بھی لگنے لگی مگر ابّا جان امّی جان کے ساتھ حویلی ہی میں رہ گئے اور . . . اب . . . .

جب میں حویلی کی دیواروں کو غور سے دیکھنے لگتا ہوں تو وہ مجھے ٹوٹتی' پھوٹتی اور جگہ جگہ سے دھنستی دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے ایک دن دیوار کے ایک حصّے میں انگلی گڑوئی تو وہ

بھر بھرا کر مسالہ چھوڑنے لگی اور اندر کی پتلی پتلی کتابی اینٹیں دانت دکھانے لگیں۔ امّی جان، جو قریب ہی بیٹھی تھیں، کہنے لگیں حویلی کی دیواروں کو اب نئے مسالے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے تجھے شاید شہر جانا ہوگا۔

جب میں حویلی سے نکل کر باہر آیا اور شہر کے ارادے سے چلنے لگا تو میں نے دیکھا کہ آس پاس کے بہت سے لوگ بھی شہر کی طرف بڑھ رہے ہیں مجھے لگا کہ شاید یہ لوگ بھی اپنی دیواروں کو بچانے کے لیے مسالے کی کھوج میں شہر جا رہے ہیں۔ شہر جانے والوں میں میرے اپنے بھی تھے۔ بہت سے ملنے ملانے والے اور بہتوں سے ایک ہی علاقے میں رہنے کا تعلّق تھا۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا مجھے ہر گلی کوچے سے لوگ نکلتے دکھائی دیے جس سے قافلے کی شکل بنتی گئی۔ یہاں تک کہ جب میں چلتا چلتا بڑی شاہ راہ پر آگیا تو میں نے دیکھا کہ لوگوں کا اژدہام ہے جو شہر کی جانب بڑھ رہا ہے۔ کچھ لوگ بند سواریوں میں بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ کون تھے یہ پتا تو نہیں چلا مگر شاید وہ جلد سے جلد شہر پہنچنا چاہتے تھے تاکہ وہاں کے میلوں میں انھیں اچھی جگہ مل جائے اور وہ شہر کے تماشوں کا پورا پورا لطف لے سکیں یا پھر بعد کے آنے والوں کو اپنا کوئی کرشمہ دکھا سکیں شہر کی جانب بڑھنے والوں میں وقفے وقفے سے کچھ علم بردار ٹولیاں بھی منظر پر ابھرتیں اور غائب ہو جاتیں کچھ علم بردار ایسے بھی تھے جو پکّی سڑک پر تو نہیں چل رہے تھے لیکن قافلے کے ساتھ ساتھ کچّی ڈگر پر آگے بڑھ رہے تھے اور پکّی سڑک پر چلنے والوں سے رابطہ بنائے ہوتے تھے۔

تارکول کی کالی، چکنی شاہراہ پر آگے بڑھتی ہوئی بھیڑ میں، میں اپنوں کو پہچان پہچان کر اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور انھیں اپنے بازوؤں میں جگہ دے رہا تھا۔ چلتے چلتے اچانک مجھے موتی نظر آیا جس کی ہمارے محلّے میں مٹھائی کی دُکان تھی اس کی گردن میں ایک چھوٹی سی ٹوکری جھول رہی تھی وہ مونگ پھلیاں بیچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا "تم مونگ پھلیاں کب سے بیچنے لگے؟" اس نے کہا "سرکار! قصبے کی حویلیاں خالی ہو چکی ہیں۔ اب وہاں مٹھائیاں کون خریدے۔ جو لوگ قصبے میں رہ گئے ہیں وہ ساگ، ستّو پر گزارا کرتے ہیں اس لیے میں راستے میں تھوڑی بہت کمائی کرتا ہوا شہر جا رہا ہوں۔" کچھ توقف کے بعد وہ پھر کہنے لگا "سُنا ہے شہر میں مٹھائی کی دُکانیں خوب چلتی ہیں... اگر میری بھی چل گئی، تو پھر... میں کئی دُکانیں کر لوں گا۔" موتی سے میری باتوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ بھولا کمہار، سر پر مٹّی کے کھلونے لیے ہوئے برابر سے گزرا۔ وہ اپنے سر پر وزن کے دباؤ سے بچنے کے لیے دوڑنے کے انداز میں چل رہا تھا اس نے آنکھیں گھما گھما کر مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی ہانپتی ہوئی آواز میں بولا "شہر کے میلے میں اچھی کمائی کی اُمید لے کر جا رہا ہوں، سُنا ہے شہر والے خوبصورت کھلونوں سے کھیلنا بہت پسند کرتے ہیں۔ اگر وہاں میرے سب کھلونے اچھے داموں میں بک گئے تو میں اور خوبصورت کھلونے بناؤں گا۔ اتنے خوبصورت کہ انھیں دیکھ کر سب حیران رہ جائیں گے۔"
اب میری رفتار سُست تھی یا بھولا کی رفتار تیز کہ وہ مجھ سے بہت آگے نکل گیا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو نئے نئے چہرے نظر آئے۔ شاید مجھ سے پیچھے چلنے والے سب کے سب آگے نکل گئے تھے۔ پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ قطار بکھرنے لگی ہے اور نئے چہرے شہر پہنچنے کی جلدی میں صفیں توڑ کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ تبھی پیچھے والوں کا دباؤ اتنا بڑھا کہ مجھے اور میرے ساتھ چلنے والوں کو سکڑ سکڑ کر، سمٹ سمٹ کر اُن کے لیے راستہ چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہمارے سکڑنے اور سمٹنے کا یہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا۔ ہزار کوششوں کے باوجود اب ہم ایک قطار میں نہیں چل پا رہے تھے۔ ہماری صفیں بار بار ٹوٹ رہی تھیں اور ہم انھیں بنائے رکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے پھر مایوس ہو کر ہم نے یہ کوشش بھی چھوڑ دی اور خود کو بھیڑ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ہم بار بار پیچھے دھکیل دیے جاتے اور پھر وہ فاصلہ طے کرنے لگتے جو پہلے طے کر چکے تھے۔ ہمارے آگے پیچھے سبھی سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے لیکن وہ علم بردار جو کبھی قافلے کے ساتھ ساتھ کچّی ڈگر پر چل رہے تھے، اب ایک بڑی سی ٹولی بنا کر ہمارے آگے بیچ سڑک پر آگئے تھے اور دوسرے چلنے والوں کو اپنا ہم خیال بنا بنا کر اپنی تعداد بڑھاتے جا رہے تھے۔ اسی طرح کچھ دور چلتے رہنے کے بعد اس پار آگے کی جانب سے ایک زور کا ریلا آیا اور پیچھے کی صفوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ موتی کی مونگ پھلیاں شاہ راہ پر بکھر گئیں۔ بھیڑ زمین کی بجائے آسمان کو تک رہی تھی اس لیے وہ مونگ پھلیوں کو روندتی ہوئی نکل گئی۔ بچی کھچی مونگ پھلیوں کو زمین سے اٹھانے میں، میں نے موتی کی مدد کی لیکن وہ کافی اداس ہو گیا تھا اور اس کا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا۔ ابھی ہم گری ہوئی

پھلیاں اٹھا ہی رہے تھے کہ پھر ایک شور
وا اور شہر کی طرف جاتی ہوئی بھیڑ میں
ڑی مچ گئی۔ اس بار بھولا کمہار بھی زد میں
ور اس کے سر سے مٹی کے خوبصورت
نے گر کر ٹوٹ پھوٹ گئے۔ اس حادثے کا
نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور سب آگے بڑھتے
لیکن بھولا خاموش کھڑا تھا اور اس کی
وں میں آنسو تھے۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے
"تم پھر ایک بار کوشش کرو — تمھیں
ارے ہنر کی قیمت ضرور ملے گی"۔ اس کے بعد
سب وقفے وقفے سے دھکّے کھاتے رہے اور چلتے
ہے۔ پیچھے ہوتے رہے پھر آگے بڑھتے رہے دھکّے
انے اور بار بار پیچھے ڈھکیلے جانے کا سلسلہ اس قدر
تر سے ہونے لگا کہ اب ہم نے اس کی پروا کرنی
وڑ دی اور شہر کی جانب بڑھتے رہنے کا عمل
اری رکھا۔

ایک لمبا فاصلہ طے کر چکنے کے بعد ایسا
لگا کہ اب ہماری منزل قریب آگئی ہے ہم لوگ
یک دوسرے کی آنکھوں میں خوش آئند امیدوں
کی چمک دیکھنے لگے۔ جیسے اندر کوئی اعتماد جاگ
گیا ہو اسی دوران کچھ علم بردار بڑی بڑی سینیوں
میں خوش نما خوان پوشوں سے ڈھک کر کچھ چیزیں
لیے ساری صفوں کو توڑتے ہوئے بڑی سرعت
سے آگے بڑھنے لگے۔ وہ پہلے بھی کئی بار اسی طرح
سب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے نکلتے رہے تھے
لیکن ان خوان پوشوں کے نیچے کیا چیز رہیں تھیں
یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ اس بار سرگوشیوں
میں یہ خبر پھیلنے لگی کہ ان خوان پوشوں کے نیچے
مرادوں کے موتی ہیں جنھیں شہر کے میلے میں عام
لوگوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا اور تب سبھی
بامراد ہو جائیں گے لیکن چونکہ طویل سفر سے

سب تھک چکے تھے اس لیے سب کے سب
علم برداروں کے گرد جمع ہو کر اُسی جگہ اپنی
اپنی مرادیں مانگنے لگے علم بردار مطالبوں کی
شدّت سے گھبرا گئے اور جب ان کے لیے بچ
نکلنے کی کوئی صورت نہ رہی تو وہ اچانک میری
اور میرے ساتھیوں کی جانب اشارے کرتے
ہوئے لوگوں سے کہنے لگے "پیارے بھائیو! پہلے
آپ ان ساتھ چلنے والوں سے ہوشیار ہو جائیں۔
بہتر ہے کہ انھیں یہیں روک لیں اور شہر تک
نہ جانے دیں ورنہ یہ ہماری تمام کوششوں کو
ناکام کر دیں گے"۔ لیکن جب ہم انھیں غور سے
دیکھنے لگے تو وہ ہم سے نظریں چُرا کر بولے "اگر
ان لوگوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہی ہے تو یہ
اُسی طرح چلیں جس طرح ہم چاہیں ورنہ کوئی
اور راستہ اختیار کر لیں اور ہم سے کسی قسم کا
سروکار نہ رکھیں"۔ تبھی علم برداروں کی ایک اور
ٹولی آئی اور اس نے کچھ دوسرے لوگوں کے
بارے میں اسی قسم کی باتیں کہیں۔ بڑھتے ہوئے
قدم یکایک رُک گئے۔ پھر آنکھوں آنکھوں میں
اشارے ہوئے اور آگے پیچھے چلنے والے ایک
دوسرے سے اُلجھ پڑے۔ پتھروں کی بارش ہونے
لگی اور راستے میں شعلوں کی دیواریں کھڑی
ہو گئیں۔ پھر جھلستی فضا میں دانشمندی کی ایک
آواز گونجی اور کچھ دیر کو ایسا لگا کہ یہ آواز سب
نے سن لی ہے سنگ باری کرتے ہاتھ شعلوں کی
دیواریں پار کر کے آگے بڑھے، انگلیاں انگلیوں
میں پیوست ہوئیں۔ اور ایک آہنی زنجیر
تیار ہو گئی جس نے نہ صرف سامنے سے آنے
والے ریلے کو روکا بلکہ پوری قوت سے ایک
ریلا سامنے کی جانب پھینکا پھر لگاتار کئی ریلے
پھینکے گئے جس نے آگے کی قطاروں میں موجود

علم برداروں کو تتر بتر کر دیا۔ اُن کے ہوش
اُڑ گئے اور وہ بدحواسی میں سینیوں کو لے کر
اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اب راستہ صاف
ہو چکا تھا اس لیے وہ سب دوڑنے لگے
اُن سب کے ساتھ میں اور میرے ساتھی
بھی دوڑے۔ دوڑتے دوڑتے ایسا محسوس
ہونے لگا کہ اب سب اپنے ہو گئے اور اپنے
سب۔ اس لیے بازوؤں اور ٹانگوں میں ایسی
قوت آئی کہ طویل فاصلہ مختصر ہو گیا اور تھوڑی
دیر بعد ہم سب دیوانہ وار شہر میں داخل
ہو گئے۔ اُسی شہر میں جہاں مُرادوں بھری
سینیاں ایک بار پھر ہمارے سامنے تھیں۔
قریب تھا کہ میں اُن سینیوں میں وہ مسالہ
ڈھونڈ لیتا جس کی مجھے تلاش تھی۔ مگر
دفعتاً کسی نے مجھے دھکا دیا پھر دائیں سے
بائیں اور بائیں سے دائیں زور دار دھکّے
پڑنے لگے یہاں تک کہ میں بے ہوش ہو گیا
اور جب میرے حواس لوٹے تو میں نے
اپنی نیم وا آنکھوں سے دیکھا کہ ہم سب اپنی
مرادوں کے کھنڈر میں پڑے ہیں جہاں
چھت کی جگہ کھلا آسمان ہمارے سروں پر
ہے جس کی وسعتوں میں علم بردار گدھ
دُور دُور تک منڈلا رہے ہیں۔

غزلیں

ں مجھ سے بڑا کوئی نہیں ہے
نہیں میں تو کوئی نہیں ہے
ں سرگرداں ہیں کس کی جستجو میں
یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے
د اپنے در پہ دی آواز میں نے
اور اندر سے کہا کوئی نہیں ہے
سب شہر والے جانتے ہیں
مگر پہچانتا کوئی نہیں ہے
ھر کو منہ اٹھا بس چل دیے ہم
ہمارا راستا کوئی نہیں ہے

شفاعت فہیم

شفاعت پونا، امروہہ ۲۴۴۲۲۱ (یو۔پی)

فکر و خواہش کے تصادم میں وہ سب ہار چلا
داخلی جنگ تھی انجام اسے مار چلا
رنگ کے سامنے خوشبو کا جو پندار چلا
پسِ منظر لیے اک منظرِ خوں بار چلا
گونگی زنجیر کے ہونٹوں پہ جہاں گیت آئے
ہوئی سرسبز صدا، سلسلۂ دار چلا
نئے ملبوس میں سجنے لگی شعروں کی دکاں
جب کبھی چھوڑ کے میں سوچ کا بازار چلا
شبِ تیرہ کے چھٹکتے ہی افق پار حنیف
پسِ افلاک کوئی نور کا مینار چلا

حنیف ترین

مُدیر مستوصف، الجدیدہ، عرعر (شمال) سعودی عرب

مری آنکھوں میں جب جب خواب جاگے
عداوت کے لیے احباب جاگے
ورق نے انگلیوں کا لمس پایا
کتابوں کے ادھورے باب جاگے
چھپا کر دل میں ذاتی رنجشوں کو
نئی تنقید کے قصّاب جاگے
مسلسل ٹوٹ کر برسا ہے پانی
ندی، نالے، زمیں تالاب جاگے
ڈبو دیں گے کسی دن ساری دنیا
اگر سوئے ہوئے سیلاب جاگے

ملک زادہ جاوید

معرفت ڈاکٹر رضیہ حامد ۴۵-بی بی ایچ ای ایل کالونی سیکٹر، نوائیڈا ۲۰۱۳۰۱

زمیں کے باسی کو وسعتِ کائنات کا انتخاب کم ہے
وجود کے امتحاں کو صحرائے درد و غم کا سراب کم ہے
صحیح ہے حوصلوں نے بڑھ کر ہزاروں رن سر کیے ہیں پھر بھی
تکلّفاتِ جہاں کے پروردہ خاک زادوں میں تاب کم ہے
تری کمی ہیں ہزار دلچسپیوں کی تخلیق کر رہا ہوں
فسانۂ زندگی میں پھر بھی کہیں کوئی ایک باب کم ہے
تموّلِ حسن کے بیاں کا بھلا میں کیا حق ادا کروں گا
تمھارے چہرے کی تاب و تب سے تمازتِ آفتاب کم ہے
سخن کے بے فیض حامیوں کی سخن شناسی میں مصلحت ہے
وگرنہ یاؔور کی شعر گوئی کا اس جہاں میں جواب کم ہے

یعقوب یاؔور

ڈپارٹمنٹ آف اردو، وسنت کالج فار وومن، راجگھاٹ فورٹ، وارانسی ۲۲۱۰۰۱

آوارگی کا آشنا

دلیپ سنگھ

۴/۵۹، راجندر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰

پچھلے سال جب ناروے کی راجدھانی اوسلو میں مقیم اُردو کے معروف افسانہ نگار ہرچرن چاولہ دِلّی آئے تو ازراہِ کرم مجھ سے دفتر میں ملنے آئے۔ جب رخصت ہونے لگے تو اچانک کہا "اچھّا اب آپ کو اوسلو میں دیکھیں گے۔" اُن کے کہنے کا انداز کچھ اس طرح کا تھا جیسے دریودھن ارجن سے کہہ رہا ہو کہ اب کوروکشیتر میں ملیں گے۔ میں بھی چونکہ کسی چیلنج سے ڈرنے والا آدمی نہیں ہوں فوراً جواب دیا "ٹھیک ہے، وہاں دیکھ لیں گے آپ کو۔" اور ہم دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

چاولہ صاحب کا "چیلنج" تو دریودھن کے چیلنج سے کہیں زیادہ معرکہ خیز نکلا۔ چند مہینوں بعد مجھے اُن کا ایک خط ملا۔ لکھا تھا:

"اوسلو کی ساہتیہ وِچار سبھا ایک سمینار کا اہتمام کر رہی ہے جس کا موضوع ہے 'ادب اور ثقافتی سرحدیں'۔ اس سمینار میں آپ کی شرکت ضروری ہے۔ اپنی منظوری بھجوایئے۔" ساہتیہ وِچار سبھا کے جھنڈے تلے ہونے والے اس سمینار کو کئی نارویجین ادارے تعاون دے رہے تھے جن میں نارویجین رائٹرز یونین اوسلو سرِفہرست تھی۔

ہندستان سے کچھ بہت ہی قابل شخص اس سمینار میں حصّہ لینے کے لیے مدعو کیے گئے تھے۔ ایک تھے پروفیسر یو۔ آر۔ اننتھامورتی۔ پروفیسر اننتھامورتی کنڑ لٹریچر میں ایک بڑا ہی معتبر نام ہے۔ ادبی شہرت تو اُن کی مسلم ہے ہی، اس کے علاوہ وہ بھارت سرکار کے معروف ادارے نیشنل بُک ٹرسٹ کے چیئرمین ہیں۔ دوسرا نام تھا پروفیسر اندرناتھ چوہدری کا، جو ساہتیہ اکادمی کے سیکریٹری ہیں اور تقابلی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں تیسرا نام اس خاکسار کا تھا۔ اور چونکہ میرا نام ان بڑے آدمیوں کے ساتھ آیا تھا، یقیناً مجھے بھی معتبر سمجھا گیا ہوگا۔

ساہتیہ وِچار سبھا کے دعوت نامے میں مجھے ڈرانے کے لیے کافی سامان تھا۔ ایک تو یہی کہ میرے ساتھی بڑے قابل آدمی تھے۔ دوسرے یہ کہ سمینار انگریزی زبان میں تھا۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں تھا کہ اپنی بات کو معتبر بنانے کے لیے جہاں ضرورت پڑے مرزا غالب کا شعر داغ دو۔ لیکن خوشی کی بات یہ تھی کہ میرے لیے جو موضوع تجویز کیا گیا تھا وہ نہ صرف میرے مزاج کے عین مطابق تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ سامعین مجھے خوشی خوشی برداشت کرلیں گے کیونکہ ہنسنا ہنسانا سب کو اچھا لگتا ہے خاص طور پر سمیناروں میں جہاں شریف سے شریف سامعین قابل سے قابل لیکچرار سے گھبرا کر چوری چوری گھڑیاں دیکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ میرا موضوع تھا "ادب میں طنز و مزاح"۔

چونکہ سمینار ہندستان سے باہر ہو رہا تھا اس لیے پیپر لکھنے سے زیادہ ضروری کام تھا سفری کاغذات تیار کرنا۔ میں کئی سالوں سے وزارتِ خارجہ کا ملازم ہوں اور میری سفارش پر سینکڑوں لوگوں کے پاسپورٹ بنے ہیں اور انھوں نے دُنیا دیکھی ہے۔ لیکن جب میرا اپنا مسئلہ سامنے آیا تو مجھے احساس ہوا کہ ڈاکٹر کتنا بھی تجربے کار اور قابل کیوں نہ ہو۔ بے شک اُس کے ہاتھوں سینکڑوں مریض شفا پا چکے ہوں لیکن جب وہ خود اپنا علاج کرتا ہے تو اُس کی سمجھ میں آتا ہے کہ بیماری کتنی پریشان کن ہوتی ہے۔

چنانچہ دس بارہ دن تو اسی دوڑ دھوپ میں لگ گئے۔ میں نے یہ جملہ محض ایک گھسے پٹے محاورے کو استعمال کرنے کے لیے نہیں لکھا۔ میں واقعی دس بارہ دن دھوپ میں دوڑتا رہا۔

جب طے ہو گیا کہ جانا ہی ہے تو مجھے خیال ہوا کہ ڈنمارک ناروے کے بالکل قریب ہے کیوں نہ اُس پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ یہ خیال اس لیے نہیں آیا کہ میں وہاں کی ننھی جل پری کے مجسّمے کو دیکھنے کے لیے بیتاب تھا بلکہ اس لیے

آیا کہ وہاں نصر ملک رہتا ہے۔ نصر ملک اُردو کا ایک جانا پہچانا افسانہ نگار اور شاعر ہے اور ریڈیو ڈنمارک کی اُردو سروس سے منسلک ہے۔ لیکن یہ بات میرے ڈنمارک کے سفر کے لیے اہم نہیں تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ نصر ملک میرے گاؤں کا ہے۔ پاکستان کے اُسی علاقے میں اُس کی پیدائش ہوئی جہاں میں پیدا ہوا تھا۔

نصر ملک سے میرا تعارف بڑے عجیب و غریب انداز میں ہوا تھا۔ کلکتہ کے ادبی ماہ نامہ "انشا" نے کچھ عرصہ پہلے مجھ پر ایک گوشہ شائع کیا تھا۔ اُس گوشے میں میرا بایوڈاٹا بمعہ میرے گاؤں کے نام کے شامل تھا۔ نصر ملک نے وہ پڑھا اور مجھے ڈنمارک سے فون کیا کہ میں بھی وہیں کا ہوں۔ مٹی کی کشش بھی ایک عجیب کشش ہے۔ میں اُس رات کو سو نہیں سکا۔ رات بھر میرے تصور میں بڑ کا وہ عظیم الشان درخت لہلہاتا رہا جس کی چھاؤں تلے میرا بچپن گزرا تھا۔ میں پیپل والے کنوئیں کے شفاف پانی سے سیر ہوتا رہا جس کی "گادھی" پر بیٹھ کر میں بولیاں گایا اور بنایا کرتا تھا۔ گاؤں کے پاس سے گزرتی ہوئی نہر میں ڈبکیاں لگاتا رہا جس میں میں نے تیرنا سیکھا تھا۔ اور گاؤں کی کچھ مٹیاروں کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتے رہے جو میرے لیے حسن کا معیار بن گئے تھے۔ ایسا معیار جس پر پھر کوئی چہرہ پورا نہیں اُترا۔

یہ سب سوچتے ہوئے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اب جب مجھے احساس ہوا کہ یہ سب کچھ نصر نے بھی دیکھا ہوگا تو مجھے اُس کے ساتھ ایک عجیب سی سانجھ محسوس ہونے لگی۔ میں اِس "ان دیکھے" ہم وطن کا تصور اُس طرح کرنے لگا جیسے میرا ایک چھوٹا بھائی ڈنمارک میں جا بسا ہو۔ اس واقعے کے بعد نصر سے باقاعدہ فون پر ملاقاتیں ہوتی رہیں جن کی وجہ سے دل میں یہ خواہش جڑ پکڑتی رہی کہ اس چھوٹے بھائی سے ملنا ضروری ہے۔

اب جب موقع نکلا تو میں نے نصر کو لکھا کہ مئی کے تیسرے ہفتے میں میں اوسلو میں ہوں گا۔ اگر تم اُن دنوں ڈنمارک سے باہر نہیں جا رہے تو تمھارے پاس آنا چاہوں گا۔ اُس نے فوراً جواب دیا "آجائیے" اور پھر جب میں نے پوچھا کہ اُس تک پہنچنے کے لیے مجھے کون سی سواری کا انتخاب کرنا ہوگا تو اُس نے جواب دیا "آپ ناروے آجائیے بھائی جی۔ آگے کا بندوبست میں کر دوں گا۔"

یورپ کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے وہاں کے موسم کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔ موسم وہاں ہندستان کی طرح مہینوں کے حساب سے نہیں بدلتے، گھنٹوں کے حساب سے بدلتے ہیں۔ بنیادی موسم وہاں سردیوں کا ہی ہوتا ہے۔ گرمیوں کے مہینے بھی آتے ہیں لیکن اُن مہینوں میں بھی سردیوں کا موسم چکر لگا جاتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے اپنی بیٹی کی آپ کے ساتھ شادی کرنے کے بعد آپ کی ساس کبھی کبھی اُسے دیکھنے آجاتی ہے۔ چنانچہ سمجھدار لوگ اپنی رضائی کبھی صندوق میں بند نہیں کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ موسم کوئی بھی ہو سوتے وہ لوگ رضائی میں ہی ہیں۔ سردیوں میں جو رضائی استعمال ہوتی ہے اُسے رضائی کہتے ہیں اور گرمیوں میں جو رضائی استعمال ہوتی ہے اُسے گرمیوں کی رضائی کہتے ہیں۔

یورپ کے موسم کے بارے میں میرا تجربہ مغربی یورپ تک محدود تھا۔ کہ وہاں میں چار سال گزار چکا تھا لیکن سکینڈے نیوین ملکوں کے بارے میں میرا تجربہ بس اتنا تھا کہ میں نے اُن کے نام سن رکھے تھے یا پھر پڑھ رکھا تھا کہ وہاں سردی بہت ہوتی ہے۔ لیکن مئی کے مہینے میں ہندستان میں بیٹھ کر یہ تصور کرنا کہ کہیں اور سردی پڑ رہی ہے آسان کام نہیں۔ چنانچہ میں نے سوچا کسی سمجھدار سے پوچھ لیا جائے۔

میرے علم میں تھا کہ مجھ سے پہلے میرے دو عزیز دوست مخمور سعیدی اور بمراج کومل ان ملکوں کی سیاحت کر چکے ہیں۔ مخمور کو فون کیا تو پتا چلا کہ ہندستان کے مختلف شہروں میں مشاعرے پڑھنے کے لیے نکل گئے ہیں۔ بلراج کومل دِلّی سے دُور کسی شہر میں اپنے بیمار سالے کی تیمارداری کے لیے گئے ہوئے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے دوست جان بوجھ کر دِلّی سے بھاگے نہیں تھے لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن میں بار بار اُردو کے وہ شعر ابھر رہے تھے جن کا نفس مضمون یہ ہے کہ جب بھی دوستوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ بے وفائی اختیار کر لیتے ہیں۔

جب یہ دو صورتیں نظر نہ آئیں تو پھر ایک ہی صورت رہ گئی کہ نصر ملک سے پوچھا جائے۔ نصر ملک نے بتایا کہ موسم تو یہاں گرمی کا ہی ہے لیکن احتیاطاً اپنے ساتھ ایک برساتی اور دو دستانے لیتے آئیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ گرمیوں میں برساتی اور دستانے ساتھ لے کر چلنا کچھ عجیب سا لگے گا۔ نصر ملک نے میرے لہجے میں ہچکچاہٹ محسوس کی تو کہنے لگا کہ اگر یہ چیزیں آپ کے پاس نہیں ہیں تو نہ سہی۔ یہاں سے

نتظام ہو جائے گا۔ اُس دن سے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اُردو کے ادیب کے ساتھ بات کرتے ہوئے ہچکچانا نہیں چاہیے ورنہ وہ آپ کو غریب اور نادار سمجھ لیتا ہے۔

اپنی عادت کے مطابق میں نے اپنے میزبانوں کے لیے کچھ تحفے خرید لیے۔ ہرچرن چاولہ اور نصر ملک سے البتہ میں نے اصرار کیا کہ وہ اپنی پسند کی کوئی چیز مجھ سے منگوالیں لیکن دونوں انکار کرتے رہے۔ میرے بہت زور دینے پر نصر نے کہا کہ میرے بیٹے کے لیے لکڑی کا ایک ہاتھی لے آنا کہ یہ اُسے بہت پسند ہے۔ مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ میرا بھتیجہ یورپ میں پیدا ہو کر بھی ہاتھی پسند کرتا ہے۔ اصلی نہیں تو لکڑی کا سہی۔ بڑے زمینداروں کی اولاد کی کچھ نشانیاں تو ہیں اُس میں۔

باقی تیاریاں مکمل ہو جانے کے بعد بھی میرے پاس دس دن بچ گئے تھے جن میں مجھے سمینار کے لیے صرف ایک پیپر لکھنا تھا۔ میں اس پیپر کا خاکہ اپنے ذہن میں تیار کر رہا تھا کہ نصر ملک کا فون آیا۔ اُس نے مجھے ایک موضوع دیا اور کہا کہ اس پر بھی ایک مضمون لکھ کر ساتھ لے آئیے۔ یہاں شاید ایک ڈینش اخبار خرید لے اور اگر ایسا ہو گیا تو آپ کو اڑھائی ہزار ڈینش کرونر معاوضہ مل جائے گا۔ میں نے جب حساب لگایا تو دس ہزار ہندستانی روپے بنے۔ معاوضے کی رقم سُن کر میں فوراً وہ مضمون لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ کمال یہ ہوا کہ اُس مضمون کے متعلق بہت سی باتیں بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ میرے ذہن میں آنے لگیں۔ پتا نہیں اُردو ادب میں معاوضے کا رواج کیوں نہیں۔ اگر ایسا ہو جاتے تو ہم سب کو لکھنے میں کتنی آسانی ہو جاتے!

معاوضے کی رقم سے مجھے یاد آیا کہ مرزا غالب نے مومن کا ایک شعر سُن کر کہا تھا "تم میرا پورا دیوان لے لو اور مجھے اپنا یہ شعر دے دو۔" اُس وقت میری سمجھ میں نہ آیا کہ مرزا غالب اپنا پورا دیوان ایک شعر کے عوض کیوں دے رہے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ مرزا کو خیال ہو گا کہ مومن کا یہ شعر شاید ڈنمارک میں بک جائے گا۔

یہ دو مضامین تو میرے ساتھ تھے ہی۔ میں نے احتیاطاً اپنے کچھ مضامین کے انگریزی ترجمے بھی ساتھ رکھ لیے کہ گاہک کا کیا پتا کہاں مل جائے۔

چنانچہ اس فائدے مند سامان سے لدا پھندا میں کے ایل ایم کے طیارے میں مئی اکیس کی رات کو اندرا گاندھی ایئر پورٹ سے سوئے اوسلو چل دیا۔

غزلیں

فکر و شعور، لوح و قلم کشمکش میں ہیں
اپنی بصیرتوں کے بھرم کشمکش میں ہیں
زخموں پہ پاؤں رکھ کے گزرتے نہیں ہیں کیوں
کیا آج والیانِ ستم کشمکش میں ہیں!
ماحول کا جمود ہے تہہ دار اس قدر
یہ کیسے آشکار ہو ہم کشمکش میں ہیں
کس راستے پہ ڈال دیا وقت نے ہمیں
منزل خموش اور قدم کشمکش میں ہیں
تپتی زمیں کی پیاس مبارک ہے ہر جگہ
برسیں کہاں کہ ابرِ کرم کشمکش میں ہیں

مبارک انصاری

محلہ تیرا پور، شہر گورکھپور ۲۷۳۰۰۱ (یو۔پی)

فضا میں ریت کے ذرّات بانٹے
بگولہ آپ اپنی ذات بانٹے
ہر اک پردے کے پیچھے کی صدا نے
دلوں کے درمیاں خدشات بانٹے
زیاں کا تجربہ بھی کارگر ہے
اگر ادراک کی سوغات بانٹے
گھروندا ریت کا بکھرا تو اس نے
ہوا کے نام الزامات بانٹے
وہی لمحہ ابھی تک سرخرو ہے
کہ جو بے رنگیِ اوقات بانٹے

اکرام آذر

۴۵/۱ے، شمس الہدا روڈ، ٹاپ فلور کلکتہ ۷۰۰۰۱۷

کشتی بیچ سمندر ہے
دل پر بھاری پتھر ہے
ہیرے، موتی، پتھر، ریت
سب پانی کے اندر ہے
بیجا وقت گنواتا ہے
بچّہ اپنی ضد پر ہے
رُوح کو زخمی کر دے گا
بات میں اُس کی نشتر ہے
میرے بھاگ جگائے گا
ہاتھ میں جادو منتر ہے

سعید منظر

اے ۳۴، مدار کالونی، بانسواڑہ ۳۲۷۰۰۱ (راجستھان)

ہوا ہونے لگی پاگل بچا کر اپنا گھر رکھیے
یہ موسم کا تقاضہ ہے خیالِ بام و در رکھیے
بلا سے راستہ پُرخار ہے، دشوار وادی ہے
اگر منزل کی خواہش ہے تو پھر عزمِ سفر رکھیے
قفس کو توڑ کر پرواز کر جانا نہیں مشکل
مگر یہ شرطِ اوّل ہے بچا کر بال و پر رکھیے
یہاں تو پتّھروں کی کاشت اب ہر سمت ہوتی ہے
یہاں محفوظ آخر کب تلک شیشے کا گھر رکھیے
حقیقت کو بیاں کرنا تو ایماں ہے، عبادت ہے
نہ غم کیجے صنم کوئی نہ دِل میں کوئی ڈر رکھیے

ممتاز صنم

۲/۳۲، اقبال پور لین، کلکتہ ۷۰۰۰۲۳

ادھوری تصویر

سورج پرکاش

ترجمہ: نانک چند

جی-۳۸، ریزرو بینک آفیسرز کوارٹرز،
پراگ، نورنگ پورہ، احمدآباد ۳۸۰۰۰۹

آپ نے مجھے بھاری سنکٹ میں ڈال دیا ہے انسپکٹر صاحب! لکھ سکوں گی کیا وہ سب؟ حالاں کہ سب کچھ آنکھوں کے آگے ہر وقت گھومتا رہتا ہے لیکن اُسے الفاظ میں بیان کرنا، اُس سب کچھ کو جیسے پھر سے جھیلنے جیسا ہے۔ بہت مشکل کام ہے سر۔ مگر آپ نے مُلک کا، ڈیوٹی کا، دھرم اور انسانیت کا واسطہ دے کر مجھے باندھ دیا ہے۔ آپ کا سوچنا بھی صحیح ہے، اگر میں کچھ نہیں بتاؤں گی تو تاریخ کا یہ ورق، جو ایک ساتھ اُجلا اور گھناؤنا ہے، کبھی سورج کی روشنی نہیں دیکھ پائے گا۔ بدقسمتی سے میں اکیلی ہی تو اُس حادثے کی واحد چشم دید گواہ بچی ہوں۔ اب مجھ پر ہی تو یہ ذمّے داری ہے کہ اُس حادثے کا پُورا لیکھا جوکھا سب کے سامنے رکھوں، تاکہ دُنیا جان سکے، کہ نہ تو اِس دُنیا سے انسانیت ختم ہوئی ہے اور نہ حیوانیت ——! اور پھر اُن قاتلوں کو پکڑوانے میں مَیں اکیلی ہی تو مدد کرسکتی ہوں۔ اتنے بڑے مقصد کے لیے خود کو ایک بار پھر تپانا ہی پڑے گا اُس آنچ میں، اُس لہو کی ندی کو ایک بار پھر سے تیر کر پار کرنا ہی پڑے گا۔

ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب، میں وہ سب کچھ لکھوں گی، قلم بند کروں گی جو میں نے دیکھا ہے، پوری شدّت کے ساتھ اپنی رگ رگ میں سانس سانس کے ساتھ محسوس کیا ہے، جھیلا ہے۔ اب مجھے لگنے لگا ہے، میں اس بوجھ سے تبھی نجات پاسکوں گی، جب اِس حادثے کے تجربات و احساسات کو کسی کے ساتھ بانٹ لُوں گی! آپ شاید یقین نہ کریں صاحب، کہ ان تین دِنوں میں ایک پل کے لیے بھی آرام سے سانس نہیں لے پائی۔ کھانا پینا تو درکنار، پلکیں تک نہیں جھپکی ہیں میری۔ بس خوفزدہ سی، ہر وقت سہمی سی بیٹھی رہتی ہوں۔ دُنیا بھر کے نامہ نِگار مجھ سے سیکڑوں سوالوں کے جواب مانگنے کے لیے گڑگڑا رہے ہیں لیکن میرا اِنجماد نہیں ٹوٹا ہے۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے، خود پر جھیلنے کے بعد بھی لگتا ہے، کاش، یہ سب کچھ ایک دردناک خواب ہوتا جو کم از کم نیند کُھلنے کے بعد تو ٹوٹ جاتا، لیکن یہ سب تو ——!

بتاتی ہوں سب، سلسلے وار، کڑی سے کڑی جوڑتے ہوئے، تاکہ آپ کو صحیح سُراغ مِل سکے اور آپ اُن قاتلوں کو جلد از جلد پکڑ سکیں۔ کوشش کروں گی خود پر قابو رکھنے کی۔ اِن الفاظ کے ذریعے جو کچھ سامنے آئے گا، وہی تو میری سچّی شردھانجلی ہوگی میرے اُن بے نام ہم سفروں کے لیے، جو ایک یک طرفہ لڑائی میں، بنا لڑے، بنا ہاتھ اُٹھائے شہید ہوگئے۔ جو اتہاس بن گئے۔ اُن کا اِتہاس لکھوں گی میں۔ تبھی مجھے چین ملے گا اور اُن سب کی آتماؤں کو شانتی مِلے گی۔

میں نے آپ کے سوالوں کو اچھّی طرح سمجھ لیا ہے، ہوسکتا ہے لکھتے وقت کچھ باتیں آگے پیچھے ہوجائیں یا کم زیادہ لفظوں میں لکھی جائیں۔ میں جس حالت میں یہ سب کچھ لکھ رہی ہوں اُس میں ایسا ہونا ممکن ہے۔ اسے کسی اور معنی میں نہ لیا جائے۔

میرا نام آدتی، عمر چونتیس، جنم ضلع سنگرُور، پڑھائی پہلے سنگرُور پھر چنڈی گڑھ۔ وہیں سے آرٹس میں ایم۔اے کی ڈگری —— پِتا سِکھ تھے، سُدرشن سِنگھ، وکیل تھے۔ ماں برہمن پریوار کی تھی، راج۔ میں ان کی اکلوتی اولاد۔ والد تین سال پہلے گزر گئے، ماں پچھلے سال۔ میری مادری زبان...؟ اوہ نہیں! معاف کیجیے سر، میری تو کوئی زبان ہی نہیں —— کیسی پاگل ہوں میں۔ گونگی ہوں میں، تبھی تو یہ سب بیان لِکھ کر دے رہی ہوں میں۔ پرماتما نے مجھے بولنے کے لیے کوئی زبان نہیں دی ہے لیکن اپنے

اظہار کے لیے، اپنی بات کہنے کے لیے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ مجھے پرماتما نے کلاکار کی اُنگلیاں دی ہیں۔ میں رنگوں کے ذریعے لکیروں کے ذریعے شاید بہتر طریقے سے اپنی بات کہہ پاتی ہوں۔ مجھے اُن پر بھروسہ جو ہے —— میرے ہاتھوں سے بننے والی تصویریں جھوٹ نہیں بولتیں —— سارے جھوٹ کی، ساری بُرائیوں کی جڑ یہ زبان ہی تو ہوتی ہے۔ ہمیں اپنوں سے دُور کرتی ہے۔ آج سارے جھگڑے ہی زبان کو لے کر ہیں۔ کئی بار سوچتی ہوں کتنی خوش نصیب ہوں میں ان پریشانیوں سے —— ریکھاؤں کے ذریعے سچ کو سچ کی طرح کہہ پاتی ہوں۔

بچپن سے دیواریں، آنگن اور کاپیاں رنگ رنگ کر اپنی دُنیا رچتی رہی، بڑی ہوتی رہی۔ ویسے بھی پورا بچپن اکیلے ہی گزارا ہے میں نے، بالکل تنہا —— کبھی کسی سے خود کو بانٹنے، کہنے سُننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی —— ایک بات بتاؤں آپ کو —— مجھے کیا چاہیے، کیا نہیں، میں کیا کہنا یا کرنا چاہتی ہوں یہ باتیں کبھی مجھے اپنی ماں سے نہیں کہنی پڑیں۔ ہم دونوں کے بیچ ہر وقت ٹیلی پیتھی کی ان گنت ترنگیں تیرتی رہتی تھیں۔ دوسرے کمرے میں ہونے کے باوجود ماں کو میرے عمل، ضرورت یا خواہش کا پورا پورا احساس رہتا تھا۔ میں تو خیر کیا بولتی، ماں بھی مجھے چھُو کر، آنکھوں اور چہرے کے اُتار چڑھاؤ کے ذریعے ہی مجھ سے بات کرتی تھی۔ ذرا بڑی ہونے پر مجھے یہی لگتا رہا، اگر میری زبان ہوتی بھی تو بھی اُس کا استعمال نہ کرتی —— شاید میں بہک رہی ہوں۔ خیر...... !

چنڈی گڑھ میں میرا اپنا سٹوڈیو اور آرٹ سکُول ہے۔ لڑکیوں کو رنگوں کی زبان سکھاتی ہوں۔ میری دن بھر کی مصروفیات، اُٹھنا بیٹھنا، پہننا اوڑھنا، سب کچھ اِس آرٹ کی نذر ہے۔ انجانا نام نہیں ہوں اِس فیلڈ میں۔ کئی انفرادی اور اجتماعی نمائشوں میں اپنی تصویروں کی نمائشیں کر چکی ہوں۔

دِلی میں ایک انفرادی نمائش کی بات چل رہی تھی۔ اُسی سلسلے میں کچھ پینٹنگز لے کر دِلّی جا رہی تھی جب یہ حادثہ ہوا۔ ایک ایسا حادثہ جس نے میرے اندر کے کلاکار کو بُری طرح جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ میری چیخیں اندر ہی گھُٹی رہ گئی ہیں۔ آنسو آنکھوں میں ہی سوکھ گئے ہیں۔ ماں بتاتی تھی بچپن میں بہت ہنستی تھی یا روتی تھی۔ لگتا ہے خود کو ہلکا کرنے کے یہ دونوں ذرائع مجھ سے چھین لیے گئے ہیں۔ اس بھیانک حادثے کے بعد اب نہ ہنسی رہی ہے میرے پاس نہ آنسو۔

اُس دن سوموار تھا۔ سات مارچ کی خوشنما صبح، سفر کے لیے معقول موسم، بس لگ بھگ فُل تھی۔ بس سٹارٹ کرتے ہی ڈرائیور نے گُوربانی کا کیسٹ لگا دیا تھا، اچھّا لگا تھا۔ شروع سے ماں باپ نے جو تربیت دی ہے، ماحول نے جو کچھ دیا ہے، اُس میں شبد کیرتن، گُوربانی، ہمیشہ کانوں میں امرت گھولتے ہیں۔ سر خود بخود عقیدت میں جُھک گیا اور آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ سارا دن اچھّا گزرے گا، ایسا سوچا تھا۔ دِن کی شروعات بھلا اس سے اچھّی اور کیسے ہو سکتی ہے۔ سواریاں ساتھ ساتھ گُنگنانے لگی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے، بس چلنے تک، سب الگ الگ سواریاں تھیں، جن کی منزلیں، مقام الگ الگ ہوتے ہیں۔ شبد کیرتن کے پوتر سُروں نے سب کو جوڑ دیا تھا جیسے سب کسی گُورو دوارے میں گُورو گرنتھ صاحب کے سامنے بیٹھے ہوں۔

مجھے سب سے آخری والی لائن میں سیٹ ملی تھی۔ بائیں کھڑکی سے دوسری کھڑکی کی طرف میرے ساتھ ایک بزرگ بیٹھے تھے، ہونٹوں ہی ہونٹوں میں گُوربانی کا پاٹھ کر رہے تھے کیسٹ کے ساتھ ساتھ۔ میری دائیں طرف ایک نوجوان سِکھ بیٹھا تھا، داڑھی تھوڑی کتری ہوئی، کپڑے، پگڑی سلیقے دار۔ کہیں ایگزیکیٹو ٹو یا آرمی آفیسر ہوگا۔ ڈی لکس بس تھی وہ۔ سیٹوں کی ٹیک اُونچی ہونے کی وجہ سے بنا اُچکے آگے بیٹھے لوگوں کو دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ بس پر چڑھتے وقت دیکھا تھا میں نے، کچھ بچّے اور زنانی سواریاں تھیں بس میں۔ ہماری لائن میں باقی تین سیٹوں پر ایک پریوار تھا، ماں، باپ اور نئی بیاہی لڑکی۔ اُس کا سُہاگ کا جوڑا، مہندی رچے ہاتھ اور چہرے کی رونق بتا رہے تھے ابھی اُس کی سُہاگ رات کی خماری بھی نہیں اُتری ہوگی۔ بس میں چڑھتے وقت ہی اُس سے آنکھیں ملی تھیں۔ ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک ہی اِشارے سے بہت کچھ کہہ سُن لیا تھا، بانٹ لیا تھا۔ میری مُسکراہٹ دیکھ کر اُس کا چہرہ قوسِ قزح میں بدل گیا تھا۔ وہ شاید پہلی بار اُسے سُسرال سے مائیکے لا رہے تھے، بے چارے ——

میرے پاس بیٹھے بانکے جوان نے

مجھ سے پوچھا تھا "کہاں تک جائیں گی آپ؟" میں نے اشارے سے بتا دیا تھا "بس کی منزل تک۔" وہ اور کچھ بھی پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اُسے موقع نہیں دیا تھا اور ایک میگزین کھول لی تھی۔ میں قطعی نہیں چاہتی تھی کہ اُسے میرے بے زبان ہونے کا پتا چلے۔ بہت ہی تکلیف دہ ہوتے ہیں وہ لمحے میرے لیے جب مجھے گونگی سمجھ لیا جاتا ہے۔ میں بے زبان ضرور ہوں۔ گونگی نہیں ہوں۔ اپنی بات تو کہہ ہی سکتی ہوں۔ میں خود اُسے بھی دُکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ صبح صبح اُسے ایک گونگی لڑکی کے لیے بے چارگی محسوس کرانے اور خود بے چاری بننے کا قطعی مُوڈ نہیں تھا۔ میں صاف محسوس کر رہی تھی وہ بیچ میں اکیلا پن محسوس کر رہا تھا۔ ایک طرف میں تھی جان بُوجھ کر میگزین میں آنکھیں گاڑھے اور دُوسری طرف دُلہن کی ماں مجھے اپنی حرکت پر کوفت بھی ہو رہی تھی مگر کوئی حل بھی نہ تھا۔

بس ڈیڑھ گھنٹے بعد کرنال کے بس اڈّے پر رُکی تھی۔ ڈرائیور نے دس منٹ کا وقت دیا تھا چاے اور پانی کے لیے۔ تب کسے پتا تھا کہ اُس کی اپنی اور ساری سواریوں کی بھی یہ آخری چاے تھی۔ میں بس سے نیچے نہیں اُتری تھی چاے کم پیتی ہوں، یوں بھی سفر میں کچھ کھاتی پیتی نہیں۔ بس جب چلنے کو تھی تبھی پانچ، سات نئی سواریاں آئی تھیں بس میں۔ وہ تینوں بھی وہیں سے چڑھے تھے۔ دو کے کندھوں پر سفری بیگ تھے اور ایک نے اپنے ہاتھ میں ویسا ہی بیگ لے رکھا تھا جیسا میڈیکل ایجنٹوں کے پاس ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے لیے سیٹیں تلاش کر لی تھیں۔ ایک ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر جم گیا تھا اور دو دروازے کے ٹھیک سامنے والی سیٹوں پر۔ اُس وقت فضا میں کہیں بھی خوف نہیں تھا، نہ ہی کسی دہشت کی بُو نے بس کو اپنی گرفت میں لیا تھا —— دراصل اُن تینوں نے آدمیّت کا جامہ ابھی تک اُتارا نہیں تھا۔ ڈرائیور، کنڈکٹر، سواریاں، میں خود پہلے ہی کی طرح اپنے اپنے میں مشغول تھے۔ بس کے اندر ایک دُنیا تھی، اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔ فلمی گانوں کے کیسٹ نے پھر سے ماحول کو موسیقی سے بھر دیا تھا۔

اور تبھی وہ سب کچھ ہوا تھا۔ کئی چیزیں ایک ساتھ واقع ہوئی تھیں۔ وہ تینوں ایک ساتھ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ بس کی دائیں طرف ایک جیپ اوورٹیک کر کے آ گئی تھی۔ جس میں بیٹھے ایک شخص نے اسٹین گن دکھا کر بس ڈرائیور کو بس آہستہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُن کے بیگوں میں سے بھی اسٹین گنیں نکل آئی تھیں۔ ایک جا کر ڈرائیور کے سر پر کھڑا ہو گیا تھا اور دو نے پوری سواریوں کو اپنی زد میں لے لیا تھا۔ بس کسی کچے راستے پر موڑ دی گئی تھی۔ سب کی گھگّی بندھ گئی تھی۔ دبی گھُٹی چیخوں، ہچکیوں اور دردمند نالوں سے فلمی کیسٹ کی آواز دب گئی تھی۔ شاید وہ بھی اس کیسٹ سے پریشان ہو رہے تھے۔ پہلی گولی سے اسٹیریو سسٹم کو ہی ٹھنڈا کیا گیا تھا۔ بس رُکی تھی اور ایک بھیانک قتلِ عام نے ایک سادھارن دِن کو تواریخ کا ایک دردناک دِن بنا دیا تھا۔ خون کی ایک اور یک طرفہ ہولی کھیلی گئی تھی اُس سنسان اُجاڑ پگڈنڈی پر۔ تھوڑی دیر پہلے ہنستی کھیلتی اپنی اپنی اُمیدوں میں جیتی منزل کی طرف رواں سواریوں کو بے رحمی سے لاشوں کے ڈھیر میں بدل دیا گیا تھا۔

اگلے دِن ہسپتال میں ہوش آنے پر مجھ سے ڈھیروں سوال پوچھے گئے تھے۔ میں بے حد خوفزدہ تھی۔ بدحواسی کی حالت میں کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ ذرا حالت سنبھلنے پر اخباروں میں حادثے کی الگ الگ خبریں پڑھی تھیں۔ سچ مچ کوئی بھی آدمی اِس گتھی کو سلجھا نہیں پا رہا تھا۔ بس یاتریوں کی اب تک کی ہتیاؤں سے بالکل الگ معاملہ تھا۔ سبھی اخبار والوں نے اپنے اپنے قیاس لڑائے تھے۔ پولیس حیران پریشان آخر یہ ہوا کیسے؟ ۔ ۔ ۔ کُل پچاس سواریاں، عورتیں، بچے، کُل سواریوں میں سترہ سکھ۔ سبھی کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ اگر یہ سکھ دہشت پسندوں کی کرتوت ہے تو سکھوں کو بھی کیوں نہیں بخشا گیا، اور اگر ہندوؤں نے یہ شرارت کی ہے تو ۳۳ ہندو کیوں مارے گئے؟ اخبار نویس، پولیس اور سرکار اس گتھی سے زیادہ اِس بات پر حیران ہیں کہ میں، صرف میں ہی اکیلی کیسے بچ گئی! میرے جسم پر ایک خراش تک نہیں پائی گئی تھی۔ سب سے الگ —— گینگ وے میں میں بے ہوش پائی گئی تھی۔ باقی سواریوں کو اُن کی سیٹوں پر ہی گہری نیند میں سُلا دیا گیا تھا۔ میرے ہوش میں آنے کے بعد لگاتار اِس بات کی کوشش جاری ہے کہ میں اس راز سے پردہ اُٹھاؤں۔ بیان کروں کہ سب کچھ کیسے ہوا۔ دہشت پسند اپنے پیچھے کوئی سُراغ چھوڑ کر نہیں گئے ہیں۔ ساری نگاہیں مجھ پر ہیں۔

سب کی اُلجھنیں صحیح ہیں انسپکٹر صاحب!

اس سارے معاملے سے پردہ بیں ہی ہٹا سکی ہوں۔ یہ پتا چلنے پر کہ میں بے زبان ہوں اور کلاکار ہوں، مجھ سے یہ مانگ کی گئی ہے کہ میں اپنا بیان لکھ کر دوں اور اپنی یاد داشت کے سہارے اُن بے رحم قاتلوں کی تصویریں بنانے کی کوشش کروں۔

بچپن میں ایک بہت اچھی کہانی پڑھی تھی۔ ایک نامور مُصوّر کی پُر زور خواہش تھی کہ وہ ایک ایسی تصویر بنائے جس کے دو چہرے ہوں۔ پہلا چہرہ دُنیا کے سب سے بھلے، معصوم اور اچھائیوں سے بھرپور آدمی کا ہو اور دوسرا چہرہ دُنیا کے سب سے خونخوار اور خراب آدمی کا۔

پھر وہ اپنی تصویر کے لیے ماڈلوں کی تلاش میں نکل پڑا۔ ایک جگہ اُسے بہت ہی معصوم اور پاک، ساری اچھائیوں سے بھرپور ایک بچّہ مِلا۔ اُسے لگا تصویر کے پہلے چہرے کے لیے اُسے ماڈل مِل گیا ہے۔ وہ اُسے اپنے ساتھ اسٹوڈیو میں لے آیا، اُسے کھلایا پلایا اور اُس کی ساری معصومیت کو اپنے رنگوں کے ذریعے کینوس پر اُتار لیا۔ اُس کا آدھا کام ہو گیا تھا۔ اب اُسے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی۔ جسے دیکھتے ہی یوں لگے جیسے دُنیا کی تمام تر بُرائیوں کی کھان ہے یہ آدمی ——

وہ بھٹکتا رہا ایسے خونخوار آدمی کی تلاش میں۔ بیسیوں سال بیت گئے۔ وہ بوڑھا ہو چلا تھا۔ لیکن اُسے حسب پسند ماڈل نہ مِلا جسے وہ سامنے بٹھا کر اپنی برسوں سے ادھوری پڑی تصویر کو مکمّل کر سکے۔ وہ مایوس ہو چکا تھا۔ تبھی اُس نے ایک دن جیل سے ایک آدمی کو [illegible] زندگی جس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ ایک دم ڈراؤنا۔ مُصوّر کو لگا آج اُس کی تلاش پوری ہوئی۔ یہی ہے میری ادھوری تصویر کا ماڈل۔ ساری عُمر گزار دی اِسی کھوج میں —— وہ قید سے چھوٹے اُس آدمی کو شراب وغیرہ کا لالچ دے کر اپنے اسٹوڈیو میں لے آیا۔ بڑی محنت کی تصویر پوری ہوئی۔ مُصوّر کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ زندگی کا بہترین شاہکار پُورا کیا تھا تبھی اُس قیدی نے زور کا قہقہہ لگایا۔ مُصوّر نے جب اِس کی وجہ پُوچھی تو وہ بولا "یہ بچّے کی جو تصویر ہے نہ، جو برسوں پہلے آپ نے بنائی تھی، وہ بھی میری ہی ہے۔"

آج میرے سامنے بھی وہی اُلجھن آن کھڑی ہوئی ہے صاحب! مجھ سے اُس خونخوار دہشت پسند اور اُس کے ساتھیوں کی تصویریں بنانے کے لیے کہا گیا ہے جس نے بھری بس کو پوری پچاس سواریوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا ڈالا ہے۔ میری بنائی ہوئی تصویر کے سہارے آپ اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو پکڑ سکیں گے۔ میں ایک کلاکار ہوں، تصویریں بنانا میرا کام ہے، سینکڑوں تصویریں بنائی ہیں میں نے —— یہ کام بھی میرے لیے قطعی مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ اُس کلاکار کو تو تصویر پوری ہونے کے بعد ہی پتا چلا تھا کہ اُس نے دُنیا کے سب سے اچھے اور سب سے خراب آدمی کا چہرہ بنانے کے لیے ایک ہی ماڈل کو دوبار اپنے سامنے بٹھایا تھا۔ اب میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ جس خونخوار دہشت پسند، سینکڑوں ہتیاؤں کے لیے ذمّے دار جسوِندر —— [illegible] کے لیے مجھ سے کہا جا رہا ہے، اُس کی ایک ادھوری تصویر اب بھی میرے کولیکشن میں میرے گھر کی نیم چھتی پر پڑی ہوئی۔ اُس کے بچپن کی تصویر، جو میں نے بنانی تو شروع کی تھی مگر کبھی پوری نہیں کر پائی تھی۔ جستی میرے پاس کئی دِن تک چکّر کاٹتا رہا تھا "دیدی میری تصویر کب پوری کروگی؟" مجھے کیا پتا تھا کہ اُس کی ادھوری تصویر پوری کرنے کے لیے مجھے یہ دِن دیکھنا پڑے گا! آج اِس مقصد کے لیے اُس کی تصویر پوری کرنی پڑے گی کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا۔

ہاں اِنسپکٹر صاحب، میں جستی کو جانتی تھی، بہت اچھی طرح۔ اتنی اچھی طرح جتنی کوئی بہن اپنے منہ بولے بھائی کو جانتی ہے۔ وہ میرے ہی محلّے کا ایک ہونہار اور آنے والا لڑکا تھا۔ اکثر اپنی بڑی بہن کی اُنگلی پکڑ ہمارے گھر آتا تھا۔ اُس کی بہن میری سہیلی تھی۔ جستی بڑا پیارا بچّہ تھا۔ نہایت معصوم۔ جسے دیکھتے ہی پیار کرنے کو جی چاہے۔ تبھی تو ایک دِن اُسے اپنے سامنے بٹھا کر اُس کی تصویر بنانی شروع کی تھی۔ دُنیا کے سب سے پیارے بچّے کی تصویر!

جب میں نے جستی کی تصویر بنانی شروع کی تھی وہ دہشت پسند نہیں تھا بھولا بھالا بچّہ تھا۔ آج کے دہشت پسند جسوِندر کی تصویر تو میں بنا دوں گی۔ لیکن جستی سے جسوِندر عُرف کرنل، عُرف جے کے عُرف پتا نہیں کیا کیا بننے کے دوران کی تصو[یر] کون بنائے گا انسپکٹر صاحب؟ —— اُس دن اُس کے چہرے پر کھرونچیں تھیں، چوٹ

کے نشان تھے ۔ وہ صرف کھرونچیں ہی تو نہیں رہی ہوں گی ۔ وہ تو آئس برگ (ICE BERG) رہے ہوں گے ۔ باطن تک چبھنے دینے والے زخموں، گھاؤں کے ظاہری نشان۔ اُن کھرونچوں کو تو میں بنادوں گی چہرے پر، مگر اندرونی زخموں اور ناسوروں کی تصویر؟ اگر کلاکار کے پاس یہ ہنر ہوتا کہ وہ بیرونی حالات کے تاثرات، ردِّعمل، ضرورتوں اور مجبوریوں کی تصویریں بھی کھینچ سکتا تو جنتی کو اپنی ادھوری تصویر پوری کرانے کے لیے آج کا جسونندر نہ بننا پڑتا۔ اُن تصویروں کے آئینے میں وہ خود کو بہت پہلے دیکھ چکا ہوتا۔ یہ ستم ظریفی ہی تو ہے کہ جسونندر کے محض چہرے کی تصویر بنانے سے آپ کا کام چل جائے گا انسپکٹر صاحب۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی تصویر کی مدد سے آپ ایک خونخوار قاتل کو پکڑ سکتے ہیں۔ جو دھرم کے نام پر، قوم اور جاتی کے نام پر بے قصور لوگوں کو مار رہا ہے۔ مگر ایک بات جاننا چاہوں گی سر۔ آج کے جسونندر کی تصویر تو میں بنادوں گی۔ مگر اُن سینکڑوں جسونندروں کی تصویریں کون بنائے گا جو آج پنجاب کے ہر گاؤں، ہر قصبے میں تیار ہو رہے ہیں۔ اُن کی تو بچپن کی ادھوری تصویر بھی شاید کسی ابھاگی بہن کے پاس نہ ہو، جس سے اُن کے اِس اندھیرے گمراہ اور تباہ کُن سفر کا اندازہ لگ سکے۔ انھیں آپ کیسے پکڑیں گے؟ کیا آپ کو نہیں لگتا کہیں کچھ غلط ہے۔ نہیں، گنتی کی غلطی نہیں۔ وہ تو ہے ہی۔ نہیں تو پولیس کے ہاتھوں سینکڑوں دہشت پسند مار ڈالے جانے اور پکڑے جانے کے بعد بھی اُن کی گنتی گھٹنے کی بجائے بڑھتی کیوں رہتی؟ ہر روز ایک نئی جگہ پر بے قصوروں کی ہتیاؤں سے تو یہی لگتا ہے کہ گڑبڑ کہیں اور ہے۔

مجھے پتا نہیں آپ کی پولیس اِس بارے میں کیا سوچتی ہے، مگر میرا کلاکار من تو یہی جانتا ہے کہ کوئی دہشت پسند پیدا نہیں ہوتا۔ پیدا تو کوئی عظیم بھی نہیں ہوتا۔ سب وقت کا پھیر ہوتا ہے۔ آس پاس کا ماحول کب کیسے نیچے گرادے، اُوپر اُٹھا دے خدا ہی جانتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ پوری قوم، پوری جاتی یا پورا دیس ایک نظریے سے نہیں سوچتا، سوچنا تو دو بھائیوں کا یا میاں بیوی کا بھی ایک جیسا نہیں ہوتا، مگر چند سر پھروں کی وجہ سے پوری قوم کو سزا دینا یا پوری قوم کو غلط ٹھہرانا ہماری بیمار ذہنیت کا ہی ردِّعمل ہے۔ مسئلہ صرف پنجاب کا نہیں ہے۔ بنیادی سوچ کا ہے۔ ہم کب تک دہشت پسند بناتے رہیں گے اور کب تک دہشت پسند تشدّد کی آگ میں ملک کو جلاتے رہیں گے۔ اِس مسئلے کی وجوہ ڈھونڈنا اور حل کرنا آپ لوگوں کا سماجی کارکنوں کا کام ہے۔ سیاست دانوں کا کام ہے۔ لیکن دِقّت تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو یہ سمسیا سلجھانی چاہیے تھی وہی دھرم گورو اور سیاسی لیڈر اِن دھاگوں کو اور اُلجھا رہے ہیں۔

شاید میں پھر بہک رہی ہوں۔ مگر آج کچھ بنا نہیں رہ پاؤں گی۔ میں ایک کلاکار ہوں، پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میرے رنگ جھوٹ نہیں بولتے، میری لکیریں سچ بولتی ہیں۔ غالباً جسونندر کی تصویر بناتے وقت میرے ہاتھ کانپیں گے، لکیریں لڑکھڑائیں گی، رنگ ساتھ نہیں دیں گے۔ میں اِس بات سے پوری طرح متفق ہوں کہ اُس نے جو ناقابلِ معافی گناہ کیا ہے اُس کی کڑی سے کڑی سزا اُسے ملنی ہی چاہیے۔ مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میں نے جس جنتی کی تصویر بنانی شروع کی تھی اُسے اُس رُوپ میں تو پرماتما نے بنایا تھا۔ مگر آج جس جسونندر کی تصویر میں بناؤں گی۔ وہ آج کے سماج آج کے معاشرے کی دین ہے۔ وہ اُس کی نہیں بلکہ آج کے سماج کی تصویر ہوگی۔

جنتی جیسے ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ بس میں چڑھا تھا میں نے اُسے پہچان لیا تھا۔ آخری بار اُسے اُس کی بہن کی شادی میں دیکھا تھا۔ سات آٹھ سال پہلے خاصا جوان نکل آیا تھا۔ کالج میں داخلہ لیا تھا اُسی سال اُس نے ـــ خوب خاطر کی تھی میری ـــــ اب اُسے پھر سے دیکھ کر اچھا لگا تھا۔ اُس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ دلّی میں ایک ساتھ ہی تو اُتریں گے، مل لوں گی۔ ویسے بھی پاس بُلاتی تو ایک تو پاس میں کوئی سیٹ خالی نہ تھی اور پھر چلتی بس میں اِشاروں سے کتنی باتیں کر پاتے؟ وہ تو اُس نے جب اپنی اسٹین گن نکالی اور پوری بس کو اپنی گرفت میں لے لیا تبھی میں جیسے آسمان سے گری تھی۔ جنتی اور اِس روپ میں! کیا ہوگیا ہے اِسے! اتنا پڑھا لکھا لڑکا اور اِس طرح بہکاوے میں آگیا۔ میں فوراً لپکی تھی اُس کی طرف!!

وہ مجھے دیکھ کر سٹپٹایا تھا ـــ ایک بار نظریں جھکی تھیں۔ مگر شاید وہ جس راہ پر بڑھ چکا تھا وہاں رشتے کوئی معنی

نہیں رکھتے۔ وہ پھر سے تن گیا تھا۔ بس روک دی گئی تھی اور اُس نے بس میں بیٹھے سبھی سکھوں اور اُن کے پریواروں کو نکل بھاگنے کا حکم دیا تھا۔ سب کی گھگھی بندھی ہوئی تھی اور نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر کندھے پکڑ کر سمجھا رہی تھی۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا، اپنا حکم دہراتا رہا۔ کوئی بھی سکھ اپنی سیٹ سے نہیں اُٹھا تھا۔ سکھ ڈرائیور نے بھی نیچے چھلانگ نہیں لگائی تھی۔ پوری بس کے مُسافروں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ جب کچھ سکھوں نے یہ جان لیا کہ میں گونگی ہوں اور دہشت پسند کی جانکار ہوں تو انھوں نے بھی اسے سمجھانا شروع کر دیا تھا۔

اُس وقت زندگی میں پہلی بار میں نے خود کو گونگا محسوس کیا تھا۔ مجھے پہلی بار زبان کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ میں بار بار ہاتھ جوڑ کر رب کا واسطہ دے کر سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ یہی کہتا "کسی ساڈے معاملے وِچ نہیں آؤ، سانوں اپنے حساب چُکان دیو" کون سے حساب اور کن سے چُکا رہا تھا وہ! میری سمجھ سے پرے تھا۔ میری کوششوں سے کچھ اور لوگوں کی ہمّت بڑھی تھی۔ وہ غرّایا تھا۔ سب کو خاموش کر دیا تھا اُس نے۔ سکھوں کو بس سے نکلنے کی آخری چیتاونی دی تھی اُس نے۔ میں بدحواس ہو گئی تھی۔ تن کر اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ تو لے چلا پہلی گولی مجھ پر! لیکن اِس کے بجائے اُس نے مجھے جھٹک کر نیچے گرا دیا تھا۔ شاید پُوری بس کے سکھ یاتریوں نے طے کر لیا تھا دہشت پسندوں کو یہ قتلِ عام نہیں کرنے دیں گے۔ خدا کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔ جنتی نے اپنے ساتھیوں کو اِشارہ کیا تھا اور اسٹین گنوں سے آگ کا ایک سیلاب نکلا تھا۔ اتہاس کا ایک اور ورق خون سے رنگتا چلا گیا تھا۔ گولیوں اور چیخوں کی پہلی آواز سے ہی میں بے ہوش ہو گئی تھی۔

ہسپتال میں ہوش آنے پر مجھے پتا چلا تھا کہ صرف میں بدقسمت ہی بچ گئی تھی۔ باقی سبھی مسافر بے رحمی سے اپنی اپنی سیٹوں پر بھون دیے گئے تھے۔ جن سکھ یاتریوں نے بس سے نیچے اُترنے سے اِنکار کر دیا تھا اُن میں سے بھی کسی کو نہیں بخشا گیا تھا۔ بس ڈرائیور کو بھی نہیں۔

اُف دُنیا کا سب سے پیارا بچّہ کتنا بڑا گناہ گار بن گیا تھا۔ کہاں چلا گیا وہ جنتی جو مجھ سے پوچھتا تھا کب پوری ہوگی میری تصویر دیدی؟ ۔ دیکھیں تو سہی آج اُس کی کون سی تصویر پوری کرنی ہے مجھے! وہ خود ہی میرے رنگوں کے سبھی خانوں میں ایک ہی رنگ ڈال گیا ہے۔ پچاس بے قصور بس یاتریوں کے خون کا رنگ۔ اِس رنگ سے تصویریں نہیں بنتیں۔ دیش کے مستقبل کا کینوس رنگا جاتا ہے۔

(ہندی سے)

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے
موصولہ عنوانات

ستمبر ۱۹۹۲ء کے "ایوانِ اُردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں ۔۔۔ "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔



پچھلے ماہ کی تصویر

شعری عنوانات

گیا شباب تو اُڑتی ہے خاک سی مُنہ پر
غبار چھوڑ گیا قافلہ جوانی کا (امیر مینائی)

مرسلہ: حکیم جی۔ ایم۔ خاں ٹونکی
گورنمنٹ یونانی دواخانہ، جگدیش چوک، اُودے پور

سلوٹیں ہیں مرے چہرے پہ تو حیرت کیوں ہے
زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا (احمد فراز)

مرسلہ: عرفان احمد معرفت مشتاق احمد، ۷۰۔ املی کھاٹ، اُودے پور ۳۱۳۰۰۱

ہم نے کاٹا عمر کا، کیسا یہ بن باس
یہ رامائن کون لکھے، کہاں ہیں تلسی داس (سید شکیل رضوی)

مرسلہ: معین الدین شمسی، گریڈیہہ

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا (شاد عظیم آبادی)

مرسلہ: محمد آفتاب عالم، پرتاپور

یوں تو ان آنکھوں نے دیکھا ہے بہت کچھ لیکن
اک نظر سوئے جہانِ گزراں اور سہی (کنور مہندر سنگھ بیدی سحر)

مرسلہ: قمر رضا نقوی، امروہہ
کندن لال گردھر، فرید کوٹ

مدّتیں ہوگئی ہیں چُپ رہتے
کوئی سنتا تو ہم بھی کچھ کہتے (محشر لکھنوی)

مرسلہ : قائد ، دہلی

ہر حال میں جینے کی دُعا دے کے گئے ہیں
کچھ لوگ ہمیں کیسی سزا دے کے گئے ہیں (نامعلوم)

مرسلہ : روبینہ سعید، دہلی

جوانی کو برسوں ہوئے رو چکے ہم
ملی تھی جو دولت اُسے کھو چکے ہم (حفیظ جونپوری)

مرسلہ : طفیل احمد انصاری، جونپور

پھل نہیں دے گا نہ دے، سایہ تو دے گا یہ تجھے
پیڑ بوڑھا ہی سہی گھر میں لگا رہنے دے (عبدالحق سحر)

مرسلہ : مشکور احمد قریشی، پالن پور

زمانہ آرزو کا جا چکا، اب آرزو کیسی ؟
خزاں سے دل لگا اے دل تلاشِ رنگ و بو کیسی (شاد)

مرسلہ : ایس۔ ایم۔ جوہر، گیا

سحر اب زیب دیتا ہے تجھے ترکِ مے و ساغر
جوانی ڈھل چکی ہے پارسا ہونے کا وقت آیا (کنور مہندر سنگھ بیدی سحر)

مرسلہ : غفران احمد قریشی، پالن پور

خدا رقص و رنگ و چنگ اگر ہے گوشِ ہوش میں
صدائے ساز میں شکستِ ساز کی صدا بھی ہے (نامعلوم)

مرسلہ : بدر الزماں، جمشید پور

میں وہ سورج ہوں جو گہنا کے بھی تابندہ رہا
گردِ غم ورنہ ہر اک رُخ کے لیے غازہ نہیں (عابد حشری)

مرسلہ : احمد نعیم، دہلی

آنسوؤں کو ترس گئیں آنکھیں
خشک سالی سی خشک سالی ہے (مختار ٹونکی)

مرسلہ : شادماں تبسم، ٹونک

میں غمِ جہاں سے نڈھال ہوں سراپا حزن و ملال ہوں
جو لکھے ہیں میرے نصیب میں وہ الم کسی کو خدا نہ دے (نامعلوم)

مرسلہ : محمد رحمت اللہ، فاضل پور

پہاڑ اپنی جگہ ساکت کھڑا ہے
مگر یہ جبر بھی کتنا بڑا ہے (فاطمہ حسن)

مرسلہ : ایس۔ ایف۔ رحمٰن نادر، کلمب

آپ اس پر جتنے چاہیں تبصرے کرتے رہیں
ریت پر تعمیر عالیشان گھر ہے زندگی (ظہیر غازی پوری)

مرسلہ : شوکت عظیم، رام گڑھ

مٹا سا حرف ہوں بگڑی ہوئی سی بات ہوں میں
جبینِ وقت پر اک نقش بے ثبات ہوں میں (سراج لکھنوی)

مرسلہ : ذکی نور عظیم، لکھنؤ

نثری عنوانات

"گزرا ہوا زمانہ" (سر سیّد احمد خاں کا مضمون)
مرسلہ : ذاکر خاں، سی۔ ۸۰،
جواہر کالونی، جھالاواڑ ۳۲۶۰۰۱

"جاتی ہوئی رُت" (کشمیری لال ذاکر کا ناول)
مرسلہ : سعید احمد فائد، دہلی

"آئینے توڑ دو" (حمیدہ جبیں کا ناول)
مرسلہ : انیس شہزاد، دہلی

"ڈوبتے سورج کا کرب" (عابد ضمیر کا افسانہ)
مرسلہ : معین الدین شمسی، گریڈیہہ

"سارے دن کا تھکا ہوا پُرش" (صلاح الدین پرویز کا ناول)
مرسلہ : ترنم نادر، کلمب

"تاریک سیّارہ" (اختر الایمان کا شعری مجموعہ)
مرسلہ : علقمہ فیصل، وارانسی

"رشتے ٹوٹنے کا موسم" (مصوّر سبزواری کا شعری مجموعہ)
مرسلہ : تمبض کیفی، گیا

"بہت بچھڑے کے مسافر" (مصوّر سبزواری کا ناول)
مرسلہ : سیّد توحید حسن، گیا

"بوڑھا درخت" (ڈاکٹر زرینہ ثانی کی کتاب)
مرسلہ : جابر صدیقی بستوی، بزری باغ

"بڑھاپا" (نظیر اکبر آبادی کی نظم)
مرسلہ : عبدالحمید ش گ ، دہلی

"صدیوں کا بیٹا" (ایم۔ اے۔ رحمت کا ناول)
مرسلہ : روبینہ سعید، دہلی

اُردو اکادمی، دہلی کو اپنے کُتب خانے کے لیے علمی اہمیت کی حامل قدیم کتابیں اور مخطوطے درکار ہیں۔ جو حضرات ایسی کتب اکادمی کو دینا چاہیں وہ درجِ ذیل پتے پر خط و کتابت کریں یا ملیں۔

سیکریٹری اُردو اکادمی، دہلی
گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

نئی مطبوعات

سیرۃ نبوی اور مستشرقین

مصنف : ڈاکٹر عبدالعلیم
قیمت : ۶۰ روپے
ناشر : نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ (یو۔پی)

زیر نظر تصنیف مرحوم ڈاکٹر عبدالعلیم کا وہ علمی کارنامہ ہے جو انھوں نے ۲۸-۱۹۲۷ء میں انجام دیا تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا عربی ترجمہ مصر سے اسی زمانے میں شائع ہوگیا تھا اور بعد میں انگریزی میں بھی شائع ہوا۔ یہ مقالہ دراصل ENCYCLOPEDIA OF BRI-TANICA VOL. IX میں شائع شدہ اس مضمون کا جواب ہے، جو ولہاوزن سے خاص طور سے حضورؐ کی سیرت مبارکہ پر لکھوایا گیا تھا اور جس میں نبوت، وحی نیز اسلامی عقائد پر بے بنیاد الزام تراشیاں کی گئی تھیں فاضل مصنف نے نہ صرف یہ کہ ان کا مثبت جواب قرآن و حدیث کی روشنی میں دیا بلکہ سچ اور جھوٹ کے بنیادی فرق کو بھی واضح کردیا۔

فاضل مصنف نے اپنے مقدمہ میں تحریر کیا ہے کہ "یہودی مصنف ولہاوزن کے اس مضمون کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ مصنف نے اس میں نہایت اختصار کے ساتھ ان تمام اعتراضات کو جمع کر دیا ہے جو مستشرقین عام طور سے سیرت نبوی پر وارد کرتے ہیں ان کے خیالات کا اندازہ کرنے کے لیے یہ مضمون بہت موزوں ہے۔ اس کے علاوہ ولہاوزن کا شمار مستشرقین کے طبقہ اولیٰ میں ہوتا ہے اور اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے اسے یورپ کے اہلِ علم بہت مستند اور قابلِ وثوق سمجھتے ہیں۔"

ولہاوزن کے علاوہ جن مستشرقین نے اس طرح کے مضامین لکھے ان میں ساخو، نولدیکی، پامر، گولیتھ، گبن اور ڈاکٹر اسپرنگر کے نام سرفہرست ہیں۔

دراصل یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور مسلمانوں کے اصول تنقیح میں بڑا فرق ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا ہے کہ راوی صادق ہے یا کاذب، اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں، حافظہ کیسا ہے؟ اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے، نہ ضروری ہے وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان، بجائے خود قرآن اور واقعات سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گردوپیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کرلی جائے گی۔ بخلاف اس کے مسلمان مورخ اور خصوصاً محدثین اس کی زیادہ پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حیثیت ہے بلکہ سب سے پہلے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اسمائے رجال کے دفتر تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں، اگر نہیں تو ان کے نزدیک اس کا بیان ناقابل اعتنا ہے۔

الغرض یورپ کے مذکورہ اصول کے موافق ولہاوزن کے اس مضمون کو بھی وہاں اہمیت دی گئی۔ ولہاوزن کے متعلق اہل یورپ کے اعتماد کی بڑی وجہ ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب بھی ہے۔ مستشرقین کے غلط اندیشوں میں بھی یہی تعصب کارفرما ہے۔ ایسے لوگوں کو مدلل اور مثبت جواب دینے کے لیے ہر دور میں اکابر علما سامنے آتے۔ ایسے اکابرین علامہ شبلی نعمانی کا نام سرفہرست ہے۔ مرحوم عبدالعلیم صاحب کی یہ کوشش اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ تصنیف اسلامیات سے متعلق مستشرقین کے خیالات جاننے کا ایک وسیلہ ہے۔ ہر لائبریری

میں یہ کتاب ضرور ہونا چاہیے تاکہ اہلِ علم حضرات اس سے استفادہ کر سکیں۔

—— غلام معین الدین

اسلامیہ ڈگری کالج، لکھنؤ

دوسرا کمرہ (پانچ طبع زاد ڈرامے)

مصنفہ : زاہدہ زیدی

قیمت : ۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے: (۱) ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ (یو۔پی)

(۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ڈرامے سے زاہدہ زیدی کی وابستگی خود ان کے الفاظ میں "دیرینہ، ہمہ جہت اور والہانہ رہی ہے۔" وہ نہ صرف ایک کامیاب ڈرامہ نگار ہیں بلکہ ڈرامے کی اُستاد، نقاد اور مترجم بھی ہیں۔ ساتھ ہی اداکاری اور ہدایت کاری سے بھی وابستہ رہی ہیں۔

"دوسرا کمرہ" زاہدہ زیدی کے پانچ طبع زاد ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ یہ سب ڈرامے اسٹیج کے لوازمات اور تقاضوں کو ذہن میں رکھ کر لکھے گئے ہیں اور ان میں ڈرامے کی "ہمہ جہت زبان" اور اسٹیج کے وسائل کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ڈرامے شاعری، موسیقی، مصوری، حسن بیانی اور فنکاری کا ایک دلکش سنگم ہیں۔

زیرِ نظر مجموعے کا پہلا ڈرامہ "چٹان" ہے اور یہ نام اس کے موضوع کا نشان ہے۔ اگرچہ ڈرامہ نگار نے اسے "ڈریم پلے" کہا ہے لیکن یہ اشاروں کی زبان میں زندگی کی سنگلاخ حقیقتوں کو سامنے لاتا ہے۔ اور اس میں جاوید کی تخلیقی کاوش کا خواب حقیقت کی سخت چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی یہ ڈرامہ اس بات کا اعادہ بھی کرتا ہے کہ اگرچہ زندگی کا کھیل ایک خاص وقت پر ختم ہو جاتا ہے لیکن تخلیقی ذہن ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ فانی اور جاوید ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں جس کا جسم فانی اور تخلیقی ذہن ابدیت کی سمت پرواز کے لیے کوشاں ہے۔ چٹان اور چشمہ، پہاڑیاں اور پانی، پتھر اور پگڈنڈی زندگی کے سفر میں شامل مختلف عناصر ہیں۔ موسیقی کی دھیمی اور تیز لے حالات کے اُتار چڑھاؤ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

دوسرے ڈرامے "دل ناصبور دارم" میں بھی راز اور ہمراز ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں۔ راز کی شخصیت میں روحانیت اور شعریت کے عناصر نمایاں ہیں اور ہمراز عملی زندگی اور جسمانی لذت کوشی کی طرف مائل ہے۔ یہ دونوں اپنے وژن کی تکمیل کے لیے ہمہ تن انتظار ہیں۔ روحی اور صبوحی جو ان کے وژن کی تجسیم ہیں ایک دوسرے کے لیے اسی طرح لازم و ملزوم ہیں جیسے راز اور ہمراز اور یہ دونوں بھی علامتی کردار ہیں۔ باقی کردار ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور خارجی دُنیا سے راز اور ہمراز کے تعلق کو پیش کرتے ہیں۔

اس مجموعے کا اگلا ڈرامہ "دوسرا کمرہ" جو اس کتاب کا عنوان بھی ہے ایک "المناک طربیہ" کہا گیا ہے۔ اس ڈرامے کا مجموعی تاثر المیہ ہے طربیہ نہیں۔ زاہدہ زیدی اس ڈرامے کو اسٹیج پر پیش کر چکی ہیں اور اس پیش کش میں بھی المیہ تاثر ہی حاوی رہا۔ ڈرامے کے ماحول میں اُداسی اور اُلجھن چھائی ہوئی ہے جو سورج اور سونیا کی ذہنی کشمکش، خشک زندگی اور احساسِ جرم کا نتیجہ ہے۔

پانچوں ڈراموں میں صرف یہی ڈرامہ موسیقی سے خالی ہے اور یہی تشنگی اور سناٹا کرداروں کی زندگی پر بھی طاری ہے۔ مینا کا خالی پنجرہ، دوسرے کمرے کی مہیب پراسراریت، بے زاری اور بے چینی کی کیفیت ایک پریشان کن وجودی تجربے کی ظاہری شکل ہے۔ ڈرامے کے اختتام پر دل بھاری بھاری رہتا ہے اور یہی کیفیت مصنفہ طاری کرنا چاہتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک کامیاب ڈرامہ ہے۔

زندگی کی گہما گہمی اور ایکشن سے بھرپور ڈرامہ "وہ صبح کبھی تو آئے گی" سماج میں عورت کے استحصال کی کہانی ہے جس میں جاندار مکالموں اور مقبول عام گانوں نے مزید جان ڈال دی ہے۔ ہر عمر اور ہر طبقے کے کرداروں کی موجودگی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا اس ڈرامے میں سمٹ آئی ہے۔ یہاں زاہدہ نے ایک مسئلے پر کئی زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ ایک طرف ایک مظلوم عورت کی حالت، دوسری طرف راہگیروں اور محلے والوں کا ردِ عمل جو عام طور سے منفی قسم کا ہے۔ تیسری طرف فلمی گانوں کا سلسلہ جو عورت کا بے حد رومینٹک تصور پیش کرتا ہے اور ایک طنز یہ پہلو ہے۔ چوتھی طرف بالکونی کے شیشے پر رقص کی دھن کے ساتھ تھرکتے ہوئے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے سائے جو ماحول کی بے تعلقی کا اشاریہ ہیں۔

مجموعے کا سب سے طویل ڈرامہ "اور جنگل جلتا رہا" ہے جو نو مناظر پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے کو بھی اسٹیج پر پیش کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اسٹیج پیش کش کو ہر جگہ مدِ نظر …

لیکن میرے خیال میں اسے اگر ایک ناول کی طرح پڑھا جائے تو اس کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔ اس ڈرامے کی وسعت، پس منظر، کردار نگاری اور مکالمے ایک مکمل ناول کے عناصر ہیں۔ یہاں زاہدہ زیدی نے جو چیخوف کی پرستار ہیں اپنے ڈرامے کو انتون چیخوف کے ڈرامائی اسلوب یعنی شاعرانہ حقیقت نگاری سے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ اس ڈرامے میں ایک ہی خاندان کی تین نسلوں کے آپسی رشتوں اور ذاتی مسائل پر بڑے پُر اثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ "جلتا ہوا جنگل" اس ڈرامے کی مرکزی علامت ہے جو ذاتی اور نجی زندگی کا رشتہ وسیع تر مسائل سے جوڑتی ہے۔ علامتی انداز اس ڈرامے کی حقیقت نگاری کا ایک اٹوٹ حصّہ ہے۔

زاہدہ زیدی کے ڈراموں کا یہ مجموعہ اُردو ڈرامے کے ارتقا میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ڈرامے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نئی راہوں اور نئے امکانات کی نشاندہی کرتا ہے۔

—— شہناز ہاشمی

۱۲ ذاکر باغ، علی گڑھ (یو۔پی)

تلامذۂ صفی اورنگ آبادی

مرتّب : محبوب علی خاں اخگر قادری
صفحات : ۲۴۰
قیمت : ۵۰ روپے
ملنے کا پتا : حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد

محمد بہار الدین بہبود علی صفی اورنگ آبادی کو سرزمینِ دکن کا نظیر اکبر آبادی کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ انھیں درباری حلقوں میں مقبولیت نہیں حاصل ہوئی۔ لیکن دکن کے عوام نے انھیں اپنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی عوام میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے گراموفون ریکارڈ بن گئے تھے اور قوال و اربابِ نشاط اُن کی غزلیں گاتے تھے۔ ایک مقامی امیر نواب معین الدولہ ان کے عاشقوں میں تھے اور حیدرآباد دکن کے عوامی حلقوں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ کیونکہ وہ جس زبان اور لہجے کے شاعر تھے وہ عوامی زبان تھی اور عوامی لہجہ تھا۔ صفی جاگیردارانہ دَور میں جی رہے تھے جہاں دولت اور افلاس دو متضاد دھارے بہہ رہے تھے۔ صفی نے افلاس کے دھارے کو اپنی شاعری سے جوڑا اور عوام نے انھیں اپنے احساسات کا ترجمان سمجھ کر انھیں گلے سے لگا لیا۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے مرتّب محبوب علی خاں اخگر قادری نے حضرت صفی کے چار سو شاگردوں میں سے ۸۶ شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔ اور کتاب کے صفحہ ۲۴۰ پر حضرت صفی کے اُن تلامذہ کی فہرست بھی دے دی ہے جو بقیدِ حیات ہیں۔ انھوں نے تلامذہ کے حالاتِ زندگی مثلاً کب پیدا ہوئے۔ کب وفات پائی۔ کہاں کے رہنے والے تھے۔ کیا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے وغیرہ وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور نمونۂ کلام بھی پیش کیا ہے۔ لیکن بہت کم شاگردوں کی پوری پوری غزل دی ہے۔ متفرق اشعار سے قاری کی تسلّی نہیں ہوتی اور اُس کی طلب میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کتاب تذکرہ نگاری کے باب میں ایک اضافہ ہے جس کے مطالعہ سے صفی اورنگ آبادی اور اُن کے تلامذہ کی شاعری ہی سے نہیں بلکہ اس دَور کی قدروں سے بھی قاری آگاہ ہو سکتا ہے۔

—— پروانہ ردولوی

۱۶۵، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی

سادہ ورق

مصنّف : ابراہیم اختر
صفحات : ۱۱۲
قیمت : ۲۵ روپے
ناشر : شالیمار پبلی کیشنز، نیا ملک پیٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۳۶

ابراہیم اختر ضلع پربھنی کے معروف ادیب، ناول نگار اور افسانہ نویس ہیں چند سال پہلے ان کا ایک ناولٹ "پیاسے دل" شائع ہوا تھا۔ ان کی دوسری تصنیف "ہندو فلسفہ —— ایک مطالعہ" تھی۔ اب ا[ن] کے اٹھارہ مختصر افسانوں کا مجموعہ "سادہ ورق" کے نام سے شالیمار پبلی کیشنز، حیدرآباد ک[ی] جانب سے شائع ہوا ہے۔ یہ ان کا پہلا افسانو[ی] مجموعہ ہے۔

ابراہیم اختر کے افسانوں میں مجھے کہا[نی] کی وہ چنگاریاں چمکتی نظر آئیں جو ۱۹۶۰ ء کے بعد جدیدیت کے رجحان کے تحت سر[د] پڑ گئی تھیں۔ ہندستان کے سیاسی وسما[جی] حالات، عوامی تہذیب، گھریلو الجھنیں، نف[سیاتی] پیچیدگیاں، جنس و عشق جیسے بے شمار مو[ضوعات] ان کے افسانوں میں نمایاں ہیں۔ تجریدی او[ر] علامتی افسانوں کی بھیڑ میں پلاٹ، کردار، واقعہ اور افسانویت کے حامل یہ افسانے قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔ بہر حال یہ عام قسم کی تفریحی کہانیاں نہیں ہیں۔ لیکن

ہیں سے ہر کہانی دلچسپی کا سامان رکھتی، اور متاثر کرتی ہے۔

ابراہیم اختر کا سماجی شعور نکھرا ہوا ہے۔ اس لیے ان کے افسانے سماجی معنویت حامل ہیں۔ بغیر رومانیت کی آمیزش کے حقائق کا بیان ان کے اصلی روپ میں کردیتے ہیں۔ چاہے کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں۔ انھوں اپنے افسانوں میں کرداروں کی زندگی اور ان شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا ہے۔ کرداروں کو کٹھ پتلی کی طرح اپنے اشاروں پر نہیں نچایا ہے۔ بلکہ ان کے اعمال عصر حاضر کے اخلاقی زوال کے پسِ منظر ان بڑے فطری معلوم ہوتے ہیں۔

——— افضل الدین اقبال

شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

یوگ (فطری علاج کا ذریعہ)

مؤلف : ڈاکٹر بدرالاسلام کیرانوی
صفحات : ۱۹۰
قیمت : ۶۰ روپے
ناشر : ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی انڈیا، ایم۔۱۶، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فی زمانہ اردو میں کسی غیر ادبی بلکہ سائنسی موضوع پر جب بھی کوئی کتاب سامنے آتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے بھیڑ میں کوئی خوبصورت سا چہرہ سامنے آجائے۔ معلوماتی کتابوں کی اشاعت اور ان کے مطالعے کا رواج اردو میں دن بدن کم ہوتا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں ڈاکٹر بدرالاسلام کیرانوی کی تالیف "یوگ" کا طبع ہونا بذات خود اہمیت کا حامل ہے۔

علمی اور معلوماتی کتابوں کے نام پر عام طور سے اتنی ادق اور ثقیل نثر سامنے آتی ہے جس کا سمجھنا ایک عام قاری کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے مگر اس کتاب کی معلوماتی افادیت تو اپنی جگہ جس پیرایے میں معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں وہ بھی خوب ہے۔ زبان آسان، سادہ اور روزمرہ کی بول چال سے قریب ہے۔ "یوگ" کی اصطلاحوں کو اردو کے علاوہ دیوناگری رسم الخط میں بھی لکھ دیا ہے جس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

اس کتاب کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب کے تحت اس مشق سے متعلق معلومات دی گئی ہیں۔

اس کتاب کی اہمیت اور افادیت اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ مصنف کی معلومات موضوع کے بارے میں صرف پڑھی پڑھائی نہیں ہیں بلکہ وہ خود عملی طور پر اس فن کے ماہر ہیں۔ اس لیے اس میں عملی تجربے کی خوبیاں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ تصویروں کے ذریعے بھی یوگ کے عمل کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے پہلے یوگ کے بارے میں ہمارا خیال ایک دوست کے تجربے پر مبنی تھا، ہمارے ان دوست کا کہنا تھا کہ "اپنی داہنی ٹانگ کو گردن کے پیچھے لے جاکر بائیں کاندھے پر رکھیے۔ بائیں ٹانگ کو اسی طرح داہنے کندھے پر رکھیے اور پھر کسی پڑوسی کو آواز دیجیے۔"

مگر کتاب کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوا کہ اگر ہمارے دوست اس کتاب کا مطالعہ کرلیں تو پھر مدد کے لیے کسی پڑوسی کو آواز دینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

یقین ہے کہ یہ کتاب نہ صرف یوگ سے مخصوص دلچسپی رکھنے والوں کو پسند آئے گی بلکہ اردو کے عام قاری کے لیے بھی مفید ہوگی۔

انجم عثمانی

مکان نمبر ۵۵، لکشمی بائی نگر، نئی دہلی

گُل و شبنم

شاعر : نارائن سنگھ غافل
صفحات : ۱۴۴
قیمت : ۵۰ روپے
ناشر : سیمانت پرکاشن، ۹۲۲۔ کوچہ روہیلا، تراہا بہرام، دریاگنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ اچھے شاعر کے لیے شریف النفس انسان ہونا بھی ضروری ہے۔ اس قول کی تائید نارائن سنگھ غافل کے مجموعۂ کلام کو پڑھ کر ہو جاتی ہے۔ غافل صاحب کی شرافتِ نفس، انسان دوستی اور خلوص کا مجھے پہلے بھی اندازہ تھا مگر ان کے کلام سے متعارف ہونے کا موقع "گُل و شبنم" کے مطالعے کے بعد ملا۔

غافل کا مزاج قومی یگانگت کا ہے۔ وہ اپنے مذہب پر اعتماد رکھتے ہیں مگر اسی کے ساتھ دوسرے مذاہب کا احترام کرنا بھی جانتے ہیں۔ وہ اس راز سے بھی واقف ہیں کہ تمام مذاہب ایک ہی حقیقت کا عکس ہیں:

ایک عزت، ایک طاقت، ایک اُپج ہے، ایک کام
چاہے غافل آبِ زمزم، چاہے گنگا جل کہو

رندِ خدا شناس کو دیر و حرم سے کیا
ساغر جہاں اُلٹ دیا کعبہ بنا لیا

غافل سادہ الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کرجاتے ہیں۔ ان کی سادگی میں دل آویزی بھی ہے۔ زندگی کے مسائل ہوں یا محبت کے معاملات، وہ ان کا بے تکلفانہ اظہار کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں غم کی کسک تو ہے مگر ان میں تلخی نہیں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آندھی کا جھونپڑی سے ہے رشتہ قریب کا
چولھا جلا تو گھر بھی جلے گا غریب کا

جو ہوش مند تھے وہ کھڑے دیکھتے رہے
دیوانے تجھ پہ مٹ گئے اور تجھ کو پالیا

تمھاری بے وفائی پر ہی دنیا جان دیتی ہے
خدا جانے اگر تم باوفا ہوتے تو کیا ہوتا

الفاظ کے جھروکوں سے باہر بھی جھانک لے
غافل وہ کہہ گیا ہے جو اس نے کہا نہیں

غافل کے اس مجموعے میں ذاتی زندگی کی جھلک کے ساتھ عصری مسائل کی بھی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ غافل کے کلام کا دل پر اثر ہوتا ہے۔ غافل غزل کے شاعر ہیں مگر اس مجموعے میں نظمیں اور قطعات بھی ہیں بعض نظموں میں حالاتِ حاضرہ پر طنز بھی ہے جس کو شاعر نے مزاح کے پیرائے میں بیان کر دیا ہے۔ آخر میں ہائیکو کے چند نمونے ہیں۔
مجھے امید ہے کہ اہلِ ادب اس مجموعے کی پذیرائی کریں گے۔

——ظہیر احمد صدیقی
شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۱۰۰۰۷

آب و ہوا

شاعر: مبارک شمیم
صفحات: ۱۴۴
قیمت: ۲۰ روپے
تقسیم کار: مکتبۂ طارق، اے۔۲۲۔سی، ڈی ڈی اے فلیٹس، مُنیر کا، نئی دہلی ۶۷

"آب و ہوا" جناب مبارک شمیم کا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کا ایک اور شعری مجموعہ "نقشِ نوا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ شمیم صاحب ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور گذشتہ ۵۳ برس سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اکثر اشعار میں روایتی عناصر کے ساتھ ترقی پسند اور جدید شاعری کی خصوصیات بھی ملتی ہیں۔ فی الواقع مبارک شمیم کی شاعری ایک آزاد ذہن کی شاعری ہے۔ وہ زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کو کلاسیکی نظم و ضبط کے ساتھ اپنی غزلوں میں پیش کرتے ہیں:

اکیلے ہم کبھی گھر سے نہیں نکلتے ہیں
ہمارے ساتھ نئے تجربے بھی چلتے ہیں

ایک اچھا شاعر آپ بیتی کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ وہ جگ بیتی دکھائی دے۔ مبارک شمیم کے بیشتر اشعار میں یہی انداز ملتا ہے۔ وہ ذاتی تجربے میں عمومیت پیدا کر دیتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

ہماری ذات کے اندر ہے ظلمتوں کا ہجوم
ہماری ذات کے باہر چراغ جلتے ہیں

جو دیکھیے تو بڑی قربتیں نظر آئیں
جو سوچیے تو بہت فاصلے نکلتے ہیں

مبارک شمیم اپنے عہد کے سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور نفسیاتی مسائل سے بخوبی آگاہ ہیں اور ان کی شاعری میں جبر و استبداد کے خلاف صدائے احتجاج بھی ملتی ہے۔ انھوں نے مادّی اور ذہنی تجربات کو اپنے روحانی تجربات میں جذب کر کے اشعار کے خوبصورت پیکر تراشے ہیں:

سُنا تو ہوگا وہ اعلان عام تم نے بھی
عزیز تر ہے جنھیں زندگی وہ لب سی لیں

پروفیسر عنوان چشتی نے بجا طور پر مبارک شمیم کو نو کلاسیکی شاعر قرار دیا ہے۔ مبارک صاحب اپنے بعض ہمعصروں کی طرح مشروط ذہن کے شاعر نہیں ہیں بلکہ آزاد ذہن اور آزاد گفتار کے حامل ہیں۔ مثلاً ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

کچھ لکھ رہا ہے دیر سے بجھتا ہوا چراغ
ہے دور تک فضا میں دھوئیں کی لکیر سی

مضطرب رکھتی ہے ہم کو ٹوٹے خوابوں کی چبھن
چشمِ دل سے ہم نے کرچوں کو نکالا ہی نہیں

مبارک شمیم کا یہ دوسرا مجموعہ "آب و ہوا" اُردو شعر و ادب کے شائقین کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے۔

اسد رضا
47/II-E، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی
۱۱۰۰۱۷

اُردو خبر نامہ

مشاعرہ جشنِ آزادی

۱۳؍ اگست کی شام کو دہلی اُردو اکادمی کی طرف سے نئی دہلی کے پیارے لال بھون میں مشاعرہ جشنِ آزادی منعقد کیا گیا۔ اکادمی کے اس سالانہ مشاعرے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف نظم گو شعرا شریک ہوتے ہیں۔ اس سال بیس شعرائے کرام نے شرکت کی اور مذہبی رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کے موضوعات پر اپنے تازہ کلام سے سامعین کو محظوظ اور مستفید کیا۔

شریک شعرا اور شاعرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں: علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، کرشن موہن، رفعت سروش، مظہر امام، بشر نواز، راج نرائن راز، زبیر رضوی، کمار پاشی، ساجدہ زیدی، شین کاف نظام، راہی شہابی، خداداد خاں مونس، ملکہ نسیم، حفیظ بنارسی، ف.س. اعجاز، ساغر خیامی، نسیم شاہجہانپوری، چندر بھان خیال اور شمیم امروہوی۔ مشاعرے کی صدارت مشہور مورّخ، مجاہدِ آزادی اور اڑیسہ کے سابق گورنر جناب بشمبر ناتھ پانڈے نے کی۔ انھوں نے ۱۹۱۶ء سے آج تک کے سیاسی اور سماجی حالات کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ جنگِ آزادی میں اُردو زبان و ادب کا جو حصّہ ہے، اتنا حصّہ کسی دوسری واحد زبان کا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ بحالاتِ موجودہ اُردو ایک سکڑتی سمٹتی زبان بن کر رہ گئی ہے لیکن مجھے امید ہے کہ یہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت



دائیں سے: جگن ناتھ آزاد، نسیم شاہجہانپوری، شین کاف نظام، صاحبِ صدر جناب بشمبر ناتھ پانڈے، راج نرائن راز، ف.س. اعجاز، کرشن موہن، حفیظ بنارسی اور مائک پر علی سردار جعفری



جناب بشمبر ناتھ پانڈے صدارتی تقریر کرتے ہوئے۔ ہمہ تن گوش ہیں زبیر رضوی، کمار پاشی اور پروفیسر اشتیاق عابدی

دوبارہ حاصل کرے گی اور ملک میں نیا شعور بیدار کرنے میں موثر کردار ادا کرے گی۔

مرکزی وزیر جناب سی۔ کے۔ جعفر شریف نے مشاعرے کے لیے پیغام بھیجا تھا جو اکادمی کے سیکریٹری پروفیسر اشتیاق عابدی نے پڑھ کر سنایا۔ پیغام میں کہا گیا تھا کہ جنگِ آزادی جن قدروں کے لیے لڑی گئی تھی ان قدروں کو آج شدید چیلنج کا سامنا ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگِ آزادی اب بھی جاری ہے۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض راہی شہابی نے انجام دیے۔ سامعین کی صفوں میں دہلی کی سربرآوردہ شخصیتوں کے علاوہ بعض سفارت خانوں کے محترم نمائندے بھی موجود تھے۔

اساتذہ کا مشاعرہ

ہر سال کی طرح اس سال بھی اکادمی نے ۵ ستمبر کو یومِ اساتذہ کے موقعے پر ایک مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں دہلی کی تینوں یونیورسٹیوں کے علاوہ مختلف اسکولوں اور مدرسوں کے شاعر اساتذہ نے اپنا کلام سنایا۔ مشاعرے کی صدارت مرکزی نائب وزیر محترمہ شیلجا کماری نے کی۔ انھوں نے کہا کہ ان کے والد اُردو جانتے تھے اور ہندی سے ناواقف تھے۔ وہ خود اُردو سے ناواقف ہیں مگر چاہتی ہیں کہ اُردو سیکھیں جو بچپن ہی سے وہ بولتی رہی ہیں۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب شکتی سنہا ڈائرکٹر تعلیمات دہلی انتظامیہ اور جناب ایچ۔ اے۔ عارفی ڈائرکٹر تعلیمات ایم سی ڈی نے شرکت کی۔

ابتدا میں اکادمی کے سیکریٹری پروفیسر اشتیاق عابدی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان اُردو اساتذہ کے مسئلے کا ذکر کیا جو اُردو اکادمی کی طرف سے مختلف اسکولوں میں پارٹ ٹائم ٹیچر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہماری یہ دلی خواہش ہے کہ ان اساتذہ کے باقاعدہ تقرّر کی گنجائش پیدا کی جائے تاکہ انھیں وہی گریڈ ملے جو دہلی کے سرکاری اور امداد یافتہ اسکولوں



سے : پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر ذکیہ انجم، محترمہ کماری شیلجا، اعجاز صاحب، جناب نشلتی سہنا، جناب ایچ۔ اے۔ عارفی، ڈاکٹر عتیق اللہ، مرغوب عابدی (مائک پر) سہیل صدیقی،
نذیر، اور پروفیسر اشتیاق عابدی (تصاویر : سید صدیقی)

...سرے اساتذہ کو حاصل ہے۔ مشاعرے ...امت جناب شمیم عثمانی نے کی۔ آخر میں ...سعیدی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا ...

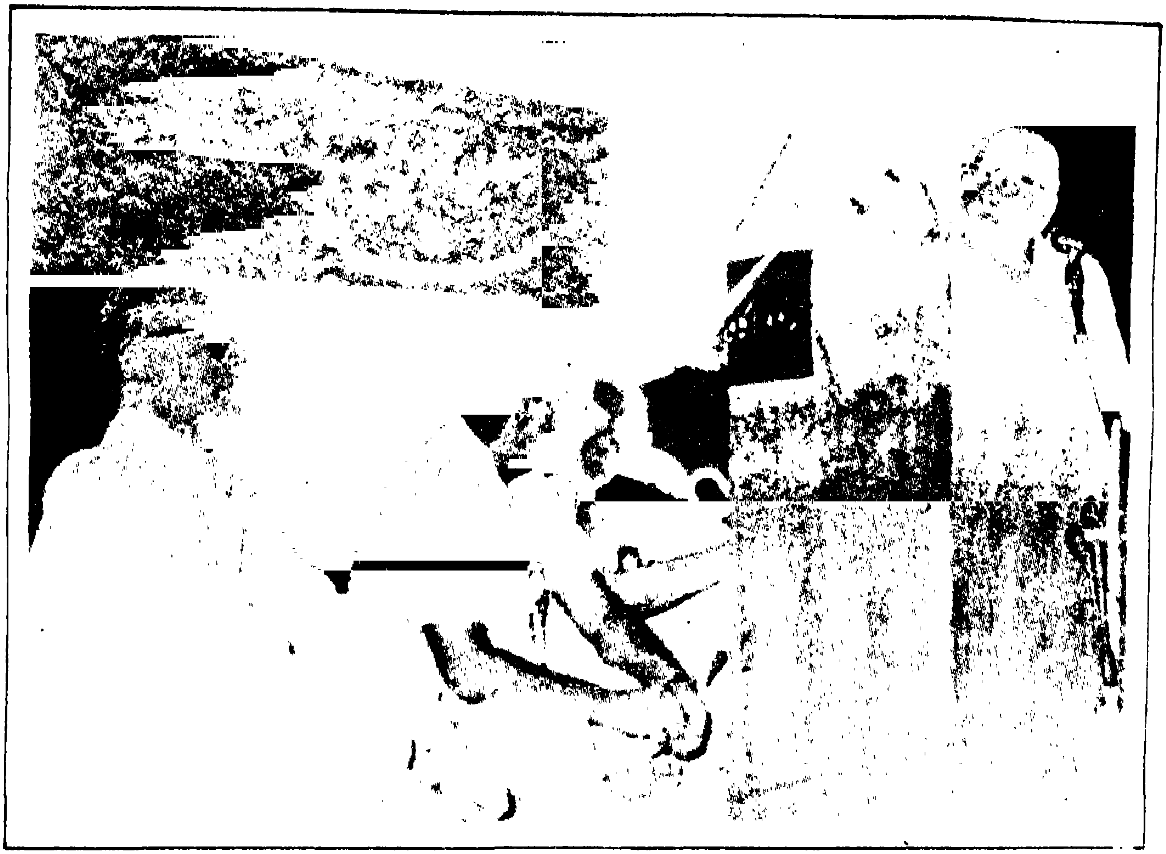
...وح سلطان پوری کو اقبال سمّان
تہنیتی جلسہ

مہاراشٹر ریاستی انجمن ترقی اردو کی ...سے برِ صغیر کے مشہور غزل گو جناب ...ح سلطان پوری کو اقبال سمّان ملنے پر ...ہنیتی جلسے کا اہتمام باندرہ اردو ہائی ...ں اور جونیئر کالج آف سائنس و کامرس، ...رہ میں کیا گیا۔ یوسف ناظم نے اپنے خاکے ...ں پر وقار نشست کا آغاز کیا انھوں نے ...روح صاحب سوچ سوچ کر شعر کہتے ہیں ...وچ سوچ کر نہیں بھی کہتے۔ ان کے بعد ...مومن صاحبہ نے مجروح صاحب کی غزل کے ساتھ پیش کی۔ صدر شعبۂ اردو مہاراشٹر کالج محترمہ رفیعہ شبنم عابدی نے مجروح صاحب کے فن پر مقالہ پیش کیا۔ محترمہ سلمیٰ صدیقی نے فرمایا کہ مجروح کو تناور درختوں کے سایے میں دیکھا اب خود وہ ایک تناور درخت بن گئے ہیں۔ اردو کے مشہور اسکالر اصغر علی انجینیئر نے اپنے نقطۂ نظر سے مجروح سلطان پوری کی شاعری پر تبصرہ کیا۔ صدارتی خطبے میں علی جواد زیدی صاحب نے کہا کہ مجروح کی شاعری پہلے بھی جوان تھی اب بھی ہے اور یہی غزل کی بزرگی ہے۔

آخر میں مجروح صاحب نے سامعین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ ایوارڈ میرے لیے اتنا اہم نہیں ہے جتنی آپ کی محبت، عزت افزائی



دائیں سے : مجروح سلطان پوری، اصغر علی انجینیئر اور (مائک پر) سلمیٰ صدیقی



جناب بشمبر ناتھ پانڈے صدارتی تقریر کرتے ہوئے۔ ہمہ تن گوش ہیں زبیر رضوی، کمار پاشی اور پروفیسر اشتیاق عابدی

دوبارہ حاصل کرے گی اور ملک میں نیا شعور بیدار کرنے میں موثر کردار ادا کرے گی۔

مرکزی وزیر جناب سی۔ کے۔ جعفر شریف نے مشاعرے کے لیے پیغام بھیجا تھا اکادمی کے سیکریٹری پروفیسر اشتیاق عابدی نے پڑھ کر سنایا۔ پیغام میں کہا گیا تھا کہ جنگ آزادی جن قدروں کے لیے لڑی گئی تھی، ان قدروں کو آج شدید چیلنج کا سامنا ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگِ آزادی اب بھی جاری ہے۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض راہی شہابی نے انجام دیے۔ سامعین کی صفوں میں دہلی کی سربرآوردہ شخصیتوں کے علاوہ بعض سفارت خانوں کے محترم نمائندے بھی موجود تھے۔

اساتذہ کا مشاعرہ

ہر سال کی طرح اس سال بھی اکادمی نے ۵ ستمبر کو یوم اساتذہ کے موقعے پر ایک مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں دہلی کی تینوں یونیورسٹیوں کے علاوہ مختلف اسکولوں اور مدرسوں کے شاعر اساتذہ نے اپنا کلام سنایا۔ مشاعرے کی صدارت مرکزی نائب وزیر محترمہ شیلجا کماری نے کی۔ انھوں نے کہا کہ ان کے والد اُردو جانتے تھے اور ہندی سے ناواقف تھے۔ وہ خود اُردو سے ناواقف ہیں مگر چاہتی ہیں کہ اُردو سیکھیں جو بچپن ہی سے وہ بولتی رہی ہیں۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب شکتی سنہا ڈائرکٹر تعلیمات دہلی انتظامیہ اور جناب ایچ۔ اے۔ عارفی ڈائرکٹر تعلیمات ایم سی ڈی نے شرکت کی۔

ابتدا میں اکادمی کے سیکریٹری پروفیسر اشتیاق عابدی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان اُردو اساتذہ کے مسئلے کا ذکر کیا جو اُردو اکادمی کی طرف سے مختلف اسکولوں میں پارٹ ٹائم ٹیچر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہماری یہ دلی خواہش ہے کہ ان اساتذہ کے باقاعدہ تقرر کی گنجائش پیدا کی جائے تاکہ انھیں وہی گریڈ ملے جو دہلی کے سرکاری اور امداد یافتہ اسکولوں



دائیں سے : پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر ذکیہ انجم، محترمہ کماری شیلجا، اعجاز صاحب، جناب شلنی سہنا، جناب ایچ۔ اے۔ عارف، ڈاکٹر عتیق اللہ، مرغوب عابدی (مائک پر) مبین صدیقی، شبانہ نذیر اور پروفیسر اشتیاق عابدی (تصاویر: ضیا قدسی)

کے دوسرے اساتذہ کو حاصل ہے۔ مشاعرے کی نظامت جناب شمیم عثمانی نے کی۔ آخر میں مخمور سعیدی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

مجروح سلطان پوری کو اقبال سمّان
تہنیتی جلسہ

مہاراشٹر ریاستی انجمن ترقّی اُردو کی جانب سے برِّصغیر کے مشہور غزل گو جناب مجروح سلطان پوری کو اقبال سمّان ملنے پر ایک تہنیتی جلسے کا اہتمام باندرہ اُردو ہائی اسکول اور جونیئر کالج آف سائنس و کامرس، باندرہ میں کیا گیا۔ یوسف ناظم نے اپنے خاکے سے اس پروقار نشست کا آغاز کیا انھوں نے کہا مجروح صاحب سوچ سوچ کر شعر کہتے ہیں اور سوچ سوچ کر نہیں بھی کہتے۔ ان کے بعد فریدہ مومن صاحبہ نے مجروح صاحب کی غزل ترنم کے ساتھ پیش کی۔ صدر شعبۂ اُردو مہاراشٹر کالج محترمہ رفیعہ شبنم عابدی نے مجروح صاحب کے فن پر مقالہ پیش کیا۔ محترمہ سلمیٰ صدّیقی نے فرمایا کہ مجروح کو تناور درختوں کے سایے میں دیکھا اب خود وہ ایک تناور درخت بن گئے ہیں۔ اُردو کے مشہور اسکالر اصغر علی انجینئر نے اپنے نقطۂ نظر سے مجروح سلطان پوری کی شاعری پر تبصرہ کیا۔ صدارتی خطبے میں علی جواد زیدی صاحب نے کہا کہ مجروح کی شاعری پہلے بھی جوان تھی اب بھی ہے اور یہی غزل کی بزرگی ہے۔

آخر میں مجروح صاحب نے سامعین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ ایوارڈ میرے لیے اتنا اہم نہیں ہے جتنی آپ کی محبت عزت فزائی



دائیں سے : مجروح سلطان پوری، اصغر علی انجینئر اور (مائک پر) سلمیٰ صدیقی

اور خلوص۔ انھوں نے دو غزلیں بھی سنائیں ایک تحت میں اور ایک ترنم سے۔ مظہر سلیم کے شکریے پر اس جلسے کا اختتام ہوا۔

(مشتاق مومن)

پروفیسر گوپی چند نارنگ لندن میں

پروفیسر گوپی چند نارنگ پچھلے دنوں لندن میں تھے جہاں انھوں نے اُردو سینٹر اور فیض اکیڈمی کی دعوت پر لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز میں "ادب کا بدلتا عالمی منظر نامہ" کے موضوع پر لیکچر دیا۔ دوسرے لیکچر کا موضوع "فیض کی شاعری" تھا۔ ان دونوں نشستوں کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ قرۃ العین حیدر ان میں مہمانِ خصوصی کے طور پر شریک ہوئیں۔

"ادب کا بدلتا عالمی منظر نامہ" پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ ہمارا عہد زبردست تاریخی اور نظریاتی تبدیلیوں کی زد میں ہے کرۂ ارض کا نقشہ اور اس کے خدوخال بدل رہے ہیں۔ جدید ہیئتی تنقید نے جس طرح ادب کا رشتہ سماجی آگہی سے کاٹ دیا تھا ساختیات، پس ساختیات، مظہریت اور ردِ تشکیل کے تحت ادب کو اس کی ثقافتی معنویت کے ساتھ دیکھنے پر زور بڑھ رہا ہے ان نئے فلسفوں نے مصنف کی ذات اور فن پارے کی خود کفالت کے تصور پر کاری ضرب لگائی ہے اور قرأت کی اہمیت اور قاری کے تفاعل کو اُجاگر کیا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ ان فلسفوں کے بعض خیالات انقلابی نوعیت کے ہیں ہم انھیں رد کریں یا قبول لیکن انہام وتفہیم ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ رومانیت نے مُصنّف کی ذات پر زور دیا تھا فارملزم (یا جدیدیت یا ہیئتی تنقید) فن پارے پر زور دیتی ہے اور مارکسیت (یا ترقی پسند تنقید) تاریخی سماجی تناظر پر۔ یہ ادب فہمی کی تین جہتیں ہیں ساختیات اور ردِ تشکیل نے دو جہتوں کا مزید اضافہ کیا ہے یا جہتیں تو موجود تھیں ان کے تفاعل کی ناگزیریت کو ثابت کرکے انھیں فلسفیانہ طور پر قائم کیا ہے یعنی جس طرح فن پارہ خلا میں وجود میں نہیں آتا اسی طرح فن پارہ مابعد لسانی نظام کے باہر نہیں۔ اصلاً ساختیاتی فکر کی بنیاد سوسیئر کے فلسفۂ لسان میں ہے سوسیئر کے تین اصول خاص ہیں اوّل یہ کہ زبان رضاکارانہ ہے اس میں کچھ فطری نہیں سب من مانا ہے۔ دوسرے یہ کہ زبان میں افتراق ہی افتراق ہے یعنی زبان کی ساخت تفریقی رشتوں سے عبارت ہے ان میں مثبت کچھ بھی نہیں اور تیسرے یہ کہ زبان میں ہر چیز تجریدی ذہنی نظام یعنی لانگ سے اخذ ہوتی ہے اور انفرادی کلام پارول ہے گویا ادب کی لانگ ہماری ادبی روایت اور اس کا مابعد شعریاتی نظام ہے اور ہر فن پارہ پارول کی مثال ہے۔ پروفیسر نارنگ نے مشرقی روایت کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ سوسیئر کے بہت سے خیالات ہندستانی فلسفۂ لسانیات اور بودھی فلسفے اپوہ سے ملتے جلتے ہیں اسی طرح زبان کے رضاکارانہ نظام کے بارے میں اس سے ملتی جلتی باتیں عرب مفکر عبدالقاہر جرجانی نے دلائل الاعجاز میں کہی ہیں۔ مابعد لسانی جہت کی اہمیت پر پروفیسر نارنگ نے سنسکرت قول شبدہ برہمہ کا بھی حوالہ دیا اور عربی قول تعرف الاشیا باضدادھا کی معنویت پر بھی روشنی ڈالی کہ سوسیئر کا نظریۂ افتراقیت اس سے بہت قریب ہے۔ آج دریدا ردِ تشکیل میں معنی کو بے مرکز کرنے یا بے دخل کرنے یا متن کی کثیر المعنویت پر جو زور دے رہے ہیں اسے بودھی نظریہ شونیہ کی روشنی میں نہایت آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے الغرض مشرقی روایت میں یہ بصیرتیں پہلے سے موجود ہیں فقط ان کے مضمرات پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر نارنگ کے فاضلانہ مقالے کے بعد سوال وجواب کے دَور کا آغاز کرتے ہوئے محترمہ قرۃ العین حیدر نے تین سوال اٹھائے انھوں نے سوال کیا کہ اگر روایت ہی فنکار سے لکھواتی ہے تو جیمز جوائس کی حیثیت کیا ہوگی؟ پھر یہ کہ اگر متن ہی سب کچھ ہے تو "اورل" روایت کا کیا مقام ہوگا؟ اور اگر دریدا کے مسلک کو مان لیا جائے تو کیا فن میں انارکی پیدا نہیں ہوگی پروفیسر نارنگ نے وضاحت کی کہ ادب میں انحراف واجتہاد سب جامع ادبی لانگ کے اندر ہی ہوتا ہے۔ جیمز جوائس ہوں یا بیکٹ، میرا جی ہوں یا راشد سب اپنی اپنی زبان کے کُلی ذہنی نظام کے اندر ہیں۔ تمام تجربے اور گریز ادبی روایت میں کسی نہ کسی مقام سے ہوتے ہیں ایسا نہ ہو تو تجربہ مجذوب کی بڑ بن جائے۔ دوسرے یہ کہ "اورل" روایت کو لیوی اسٹراس جیسے ساختیاتی بنیاد گزاروں نے بہت اہمیت دی ہے کیوں کہ متھ فکشن کا نقطۂ آغاز ہے اور اصلاً وہ بھی متن ہے۔ یوں تو پوری ثقافت اور کائنات متن ہے۔ متن سے لازماً تحریر مراد نہیں بلکہ ہر وہ چیز جس سے مستقلاً معنی خیزی ہوتی ہو۔ تیسرے یہ کہ دریدا پر یہ الزام واقعی لگایا گیا ہے کہ اس کے فلسفے سے انتشار پیدا ہوگا۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ معنی کی وحدت جو فرض

کرلی ہی ہے ایک فریب نظر ہے۔ زبان کا نظام ہی ایسا ہے کہ معنی کثیر المعنیت سے پیدا ہوتا ہے۔ جبر کی قوتیں معنی کے دوسرے پن کو دباتی اور وجدانی معنی پر اصرار کرتی ہیں۔ ردتشکیل کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ معنی کے دوسرے پن پر جسے جبر اور اقتدار کے کھیل میں دبا دیا گیا ہے، اس کو بھی بروئے کار لاتی ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے دوسرے خطبے کا موضوع تھا "فیض کا مقام" انھوں نے کہا فیض کی شاعری کی حیثیت مسلمہ ہے ان کی شاعری میں ایک ایسی قوت شفا، ایسی دلآسائی، دلآویزی، نرمی اور کشش ہے اور اس میں ایسا شبنمی لمس ہے کہ ان کی آواز انسانیت کی آواز بن جاتی ہے اس میں وہ سماجی و سیاسی آگہی بھی ہے کہ سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ فیض اب ہمارے درمیان نہیں ہیں انسان کے اٹھ جانے کے بعد اس کی شخصیت کا طلسم غائب ہو جاتا ہے۔ ایسے میں کیا فیض کی وہی اہمیت برقرار رہے گی بالخصوص جب آئیڈیالوجی پر بھی سوالیہ نشان لگ چکا ہے اُردو تنقید میں اب اس نقطۂ نظر کے حامیوں کی کمی نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ فیض روایتی استعاروں اور لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں سیاسی معنی تو ان کے عقیدت مندوں نے بھرے ہیں اور ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے فیض کی مبالغہ آمیز تعریف کی جاتی ہے۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ یہ دونوں نقطۂ ہائے نظر انتہا پسندانہ ہیں۔ اوّل تو یہ مان کر چلنا چاہیے کہ فیض کی شاعری میں سیاسی معنویت علی الاعلان ہے اور اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا (مثلاً بول، سیاسی لیڈر کے نام، صبح آزادی، لوح و قلم، [illegible] کم بیک افریقہ، آج بازار میں پابجولاں چلو، فلسطینی بچے کی لوری وغیرہ) اسی طرح فیض کے یہاں خالص موضوعی رومانی نظموں کی بھی کمی نہیں جن میں کوئی سیاسی معنی نہیں (مثلاً سرود شبانہ، موضوع سخن، یاد، پاس رہو، منظر وغیرہ) لیکن فیض کی شاعری کا 'کور' ایسی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے جہاں سیاسی معنویت اور جمالیات آنکھ مچولی کھیلتے ہیں (مثلاً مجھ سے پہلی سی محبت، تنہائی، نثار میں تیری گلیوں کے، زنداں کی ایک صبح، ملاقات، طوق و دار کا موسم، شیشوں کا مسیحا، دست تہ سنگ آمدہ اور بہت سی دوسری نظمیں اور غزلوں کا بیشتر سرمایہ) پروفیسر نارنگ نے مارکسیت میں تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ نہیں بھولنا چاہیے کہ فیض TRUE BELIEVER کبھی نہیں تھے اور نو مارکسی یا پس ساختیاتی تھیوری کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ شاعری جس آئیڈیالوجی سے پیدا ہوتی ہے اس سے آگے بھی جا سکتی ہے اور فیض کے یہاں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ فرانسیسی مارکسی مفکر لوئی آلتھیوسے نے آئیڈیالوجی کا جو نیا لوچدار تصور دیا ہے اور جمالیات کی خود مختاریت کے لیے جس طرح مارکسیت کے قلب میں جگہ نکالی ہے پروفیسر نارنگ نے اسے تنقید کی ایک نئی راہ بتاتے ہوئے کہا کہ تھیوری کے اس فریم ورک میں فیض کی آئندہ تحسین کے امکانات ہیں انھوں نے دستِ تہ سنگ آمدہ کا باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہوئے دکھایا کہ کس طرح سامنے کے معنی کی قرأت یعنی فیض کی خالص سیاسی قرأت ادھوری قرأت ہے اور فیض لفظوں کے چھپے ہوئے یا دبے ہوئے معنی کے بھی شاعر ہیں دوسری قرأتوں کی بھی گنجائش ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اس پر بھی زور دیا کہ فیض کی جمالیات مشرقی جمالیات ہے یعنی پردے کی اوٹ سے جھانکنے کی جمالیات فیض کے یہاں مارکسی آئیڈیولوجیکل پروجیکٹ جتنا اس جمالیات کو دباتا ہے یہ لاشعوری جمالیات اتنا دب کر ابھرتی ہے اور شاعری کے منظرنامے کو رنگین کر دیتی ہے فیض کی شاعری گویا جبر کے خلاف تو ہے ہی اس کو خود آئیڈیالوجی کے خلاف بھی پڑھا جا سکتا ہے یہی جدلیت اس کے حسن کی ضامن ہے وقت کے ساتھ ساتھ فیض کی شاعری کا چھلکا تو اتر جائے گا لیکن جمالیاتی فرد جدلیت کے باعث اس کا مرکزی حصہ روشن رہے گا اور اس کی اہمیت بھی کم نہیں ہوگی۔

سوالات کے وقفے میں رضا علی عابدی، یاور عباس، عبید صدیقی اور امین مغل نے چند اہم سوال کیے جن کا ایک بنیادی نکتہ فیض کی شاعری کی ابدیت کے بارے میں تھا۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ اس کے بارے میں پیش گوئی کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا لیکن چونکہ حق و باطل، انصاف اور ناانصافی کی جنگ ہمیشہ رہے گی اس لیے فیض کی شاعری کا بیشتر حصہ زندہ رہے گا۔

(روزنامہ "جنگ" لندن)

جشنِ جگن ناتھ آزاد

دُبئی عرب امارات کی فعال انجمن طلباء قدیم جامعہ کراچی (یونیکیرتنیز انٹرنیشنل) ۱۹۸۶ میں "یادِ فیض" کے نام سے پہلا عالمی مشاعرہ منعقد کرانے کے بعد اب تک برِ صغیر کے

ممتاز زندہ شعرا کی خدمات جلیلہ کے اعتراف
میں ان کے "جشن" منا چکی ہے۔

اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ۱۹۹۱ء میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا جشن منایا جا رہا ہے۔ اس موقع پر حسب روایت ایک مجلہ بھی شائع کیا جائے گا۔ جس میں جگن ناتھ آزاد کی شعری اور ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔ اہلِ قلم سے تعاون کی درخواست ہے۔

رابطہ: حاجی انیس دہلوی، رہبر منزل، کلاں مسجد، ترکمان گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ساحر ہوشیارپوری کی قدر افزائی

پنجاب سرکار کے بھاشا وبھاگ نے ساحر ہوشیارپوری کے مجموعۂ کلام "سحرِ خیال" کو ۹۰ء کی بہترین شعری تخلیق قرار دیتے ہوئے "ساحر لدھیانوی ایوارڈ" کے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ ایوارڈ پچیس سو روپے اور توصیفی سند پر مشتمل ہے جو بھاشا وبھاگ کی خصوصی تقریب میں پیش کیا جائے گا۔ "سحرِ خیال" ساحر صاحب کا چوتھا مجموعۂ کلام ہے۔

دوہے راجستھان کے

راجستھان کے تمام شعرا سے درخواست ہے کہ وہ اپنے ۲۰ منتخب "دوہے" مذکورہ بالا کتاب کے لیے درج ذیل پتے پر جلد روانہ فرمائیں۔ دوہوں پر مشتمل یہ مجموعہ راجستھان اردو اکادمی شائع کرے گی۔ یہ درخواست اُن شعرا سے بھی کی جا رہی ہے جن کا تعلق راجستھان سے ہے اور وہ ہندستان/پاکستان کے کسی دیگر علاقے میں مقیم ہیں۔

ڈاکٹر شاہد میر، صدر شعبۂ نباتات، گورنمنٹ کالج، بانسواڑہ ۳۲۷۰۰۱ (راجستھان)

تاریخ

زیب دہِ کُل ھند بہادر شاہ ظفر انعام

۱۹۹۲ء

جامع کمال، محقّق، نقّاد رشید حسن خاں صاحب

۱۹۹۲ء

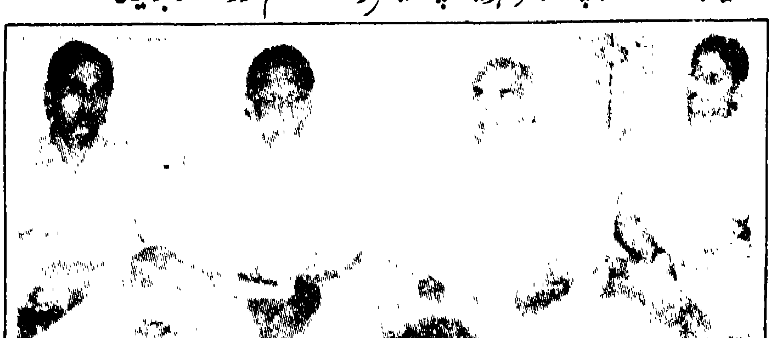
خدمتِ علم و ادب کا ہے صلہ یہ اعزاز
خاں صاحب! بصد اکرام مبارک باشد
اعتراف آپ کی عظمت کا ہے کُل ہند انعام
ہدیۂ نو ظفر! انعام مبارک باشد

۱۹۹۲ء

مغیث الدین فریدی



پچھلے دنوں اسعد بدایونی کے شعری مجموعے "جنون کنارا" کی رسم اجرا علی گڑھ میں ہوئی۔ جلسے کی صدارت پروفیسر شہریار نے کی اور کتاب کا اجرا پاکستان کے مشہور شاعر پروفیسر توصیف تبسم نے کیا۔ تصویر میں دائیں سے: پروفیسر شہریار، پروفیسر توصیف تبسم اور اسعد بدایونی۔



سہارنپور میں مفت اُردو کلاسیز کا افتتاح۔ سہارنپور یونانی میڈیکل کالج میں۔ (تصویر میں بائیں سے) ڈاکٹر ابراہیم، ڈاکٹر نازک شاہ اور محترمہ ڈوپل کرنوال۔ عثمان الحق صدیقی، ڈاکٹر انیس۔

انجمن محبانِ اُردو کی نئی انتظامیہ

پچھلے دنوں انجمن محبانِ اُردو ٹونک راجستھان کی نئی انتظامیہ کا انتخاب عمل میں آیا جس میں حسبِ ذیل عہدیداران و ممبران منتخب کیے گئے:

۱۔ شجاع الرحمٰن خاں فقفا عزیزی (صدر)

۲۔ سید ساجد علی ٹونکی (سیکریٹری) ۳۔ ذ۔ ر۔ خان (خازن) ۴۔ مفتی محمود احمد خاں ندیم قاسمی سرونجی (ممبر) ۵۔ مولوی مصباح الدین خاں شاہد (ممبر) ۶۔ امیر احمد خاں (ممبر) ۷۔ ایس۔ آر۔ خاں سیف عزیزی (ممبر) ۸۔ ضیاء الرحمٰن خاں ضیاء عزیزی (ممبر)۔

ایک نئے رسالے کا اجرا

دہلی سے اُردو کا ایک نیا ماہنامہ "بچوں کی نرالی دُنیا" کے نام سے نکل رہا ہے جس کے مُدیر تنویر احمد ہوں گے۔ ضروری معلومات اس پتے سے حاصل کی جاسکتی ہیں:

تنویر احمد، ۹۔۴۰۔ گلی پہاڑ والی چھتہ لال میاں، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ممتاز حسین کو خراجِ عقیدت

اُردو کے مشہور ناقد ممتاز حسین کے انتقال پر دہلی اُردو اکادمی کی طرف سے یکم ستمبر ۹۲ء کو اکادمی کے دفتر میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت بزرگ شاعر جناب غلام ربانی تاباں نے کی۔ جلسے کے پہلے مقرر پروفیسر قمر رئیس تھے۔ انھوں نے کہا کہ ممتاز حسین نے مشرق اور مغرب کے علوم سے استفادہ کیا اور ان علوم کی روشنی میں اُردو تنقید کو ایک نئی جہت دینے کی کوشش کی۔ پروفیسر محمد حسن نے کہا کہ ممتاز حسین کو کسی مخصوص دبستان کا نمائندہ سمجھنا مناسب نہیں، ان کے یہاں ایک پھیلاؤ کی کیفیت ہے۔ رشید حسن خاں نے کہا کہ ممتاز حسین کا مزاج بنیادی طور پر کلاسیکی تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا خیال تھا کہ ممتاز حسین کی تنقید کی بنیاد مارکسزم کے گہرے مطالعے پر ہے۔ ڈاکٹر شارب ردولوی نے انھیں ایک نظریہ ساز ناقد قرار دیا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کہا کہ مرحوم ایک متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے ان کی مشکل نویسی کا ذکر کیا۔ سید حامد نے کہا کہ وہ ایک منصف مزاج شخص تھے اور ناقد کے لیے منصف مزاجی پہلی شرط ہے۔ آخر میں صدرِ جلسہ کی طرف سے قراردادِ تعزیت پیش کی گئی جو مخمور سعیدی نے پڑھی۔ اس تعزیتی جلسے کی نظامت اکادمی کے سیکریٹری سید اشتیاق عابدی نے کی۔

قراردادِ تعزیت درج ذیل ہے:

"دہلی اُردو اکادمی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا یہ مشترکہ جلسہ اُردو کے مشہور نقاد پروفیسر ممتاز حسین کے انتقال پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی وفات کو اُردو زبان و ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان تصور کرتا ہے۔"

پروفیسر ممتاز حسین اُترپردیش کے ضلع غازی پور کے رہنے والے تھے۔ ان کی تعلیم بھی اُترپردیش ہی کی مختلف درس گاہوں میں ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے انھوں نے بی۔ اے کیا اور ۱۹۴۶ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ کی سند حاصل کی۔ ان کی ملازمت کا آغاز لکھنؤ کے ایک کالج سے ہوا پھر انھوں نے انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی میں دو سال تک ایم اے (اُردو) کی کلاسوں کو پڑھایا۔ ترکِ وطن کے بعد وہ کچھ مدت تک کراچی کے اخبارات کے لیے کام کرتے رہے پھر درس و تدریس ہی سے وابستہ ہو گئے اور ان کی یہ وابستگی آخر تک قائم رہی۔

پروفیسر ممتاز حسین مارکسی فکر سے متاثر تھے اور انھوں نے اپنی تنقیدی تحریروں میں ادب اور سماج کے باہمی رشتے پر زور دیا ہے۔ امیر خسرو، غالب اور حالی کے فکر و فن کا جائزہ انھوں نے ان شعرا کے تاریخی اور سماجی پس منظر میں بڑی جزرسی کے ساتھ لیا ہے۔ اور ان پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ انھوں نے اُردو نثر کی اہم ترین ابتدائی کتاب "باغ و بہار" کا تحقیقی ایڈیشن بھی اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا اور اس کی فرہنگ بھی مرتب کی۔ ان کی دوسری کتابوں میں "نقدِ حیات" "ادبی مسائل" "نئی قدریں" "ادب اور شعور" "میر تقی میر — حیات اور شاعری" ہیں جن سے اُردو تنقید نئی جہتوں سے آشنا ہوئی اور غور و فکر کی نئی راہیں سامنے آئیں۔

عملی تنقید کے علاوہ پروفیسر ممتاز حسین نے نظریاتی اور فکری مسائل پر نہایت دقتِ نظر سے اظہارِ خیال کیا ہے اور ادب میں جمالیات

اور شعریات کے نئے پہلوؤں پر فلسفیانہ انداز سے غور کیا ہے۔

اُردو کے ایک اُستاد کی حیثیت سے بھی انھوں نے کراچی کی اعلیٰ درسگاہوں میں کم و بیش ۲۲ سال تک درس و تدریس اور تحقیق کی نگرانی کا کام انجام دیا۔

یہ جلسہ مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے اور ان کی موت کے غم میں پوری اُردو دنیا کے ساتھ شریک ہے۔

سیّدہ شانِ معراج کو صدمہ

میرٹھ سے سیّد اختر الاسلام صاحب رقم طراز [illegible] ۲۲ اگست کو [illegible] شاعرہ سیّدہ شانِ [illegible] کے والد سیّد اشفاق حسن کا انتقال بعمر ۸۵ سال ہوگیا۔ مرحوم شہر کے بہترین شکاری تھے آخر عمر میں بہت دیندار ہوگئے تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں چار لڑکیاں ہیں جن میں بڑی سیّدہ شانِ معراج ہیں ہم ان سب کے غم میں شریک ہیں۔

اِک چراغ اور بُجھا

"ایوانِ اُردو" کی کاپیاں پریس جا چکی تھیں کہ ایک انتہائی اندوہناک خبر ملی۔ ۱۴ ستمبر کی شام کو جب وہ حیدرآباد کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے سفر کی تیاری میں تھے اور دفتر سے اُٹھ کر گھر جا رہے تھے تو راستے میں کمار پاشی پر دماغی فالج کا حملہ ہوا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ انھیں فوراً ہی ارون اسپتال میں جہاں وہ آفس سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے، داخل کیا گیا۔ ان کی پوری رات بے ہوشی میں گزری اور ۱۷ ستمبر کو صبح ۱/۲ ۷ بجے جدید اُردو شاعری کا یہ روشن چراغ گُل ہوگیا۔



کمار پاشی کی آواز جدید اُردو شاعری کی معتبر ترین آوازوں میں، ایک ایسی آواز تھی جو سب سے الگ پہچانی جاتی تھی۔ انھوں نے غزلیں اور رُباعیاں بھی کہی ہیں لیکن ان کی شاعرانہ پہچان ان کی نظموں سے قائم ہوئی۔ وہ تکنیکی سطح پر میرا جی سے متاثر تھے لیکن ان کے موضوعاتِ سخن نہ صرف یہ کہ میرا جی سے مختلف ہیں، بلکہ متنوّع بھی ہیں۔ ان کی شاعری کے چھ مجموعے شائع ہوئے جن کے نام ہیں: پرانے موسموں کی آواز۔ خواب تماشا۔ انتظار کی رات۔ رو بہ رو۔ اک موسم مرے دل کے اندر اک موسم مرے باہر۔ زوالِ شب کا منظر اور ایک طویل نظم ولاس یاترا۔ تازہ مجموعہ چاند چراغ کے نام سے انھوں نے ترتیب دے لیا تھا۔

کمار پاشی نے افسانے اور ڈرامے بھی لکھے اور ان اصناف میں بھی اپنی الگ راہ نکالی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "پہلے آسمان کا زوال" کے نام سے اور ڈراموں کا "جملوں کی بنیاد" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ انھوں نے "سطور" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ بھی نکالا تھا جو اب تک یاد کیا جاتا ہے۔

کمار پاشی جولائی ۱۹۳۵ء میں بھاولپور میں پیدا ہوئے تھے اور تقسیم ملک کے بعد ان کا خاندان کچھ دن جے پور میں رہ کر دہلی میں آبسا تھا۔ کمار پاشی کی تخلیقی سرگرمیاں دہلی ہی میں شروع ہوئیں اور اسی سرزمین پر انھوں نے زندگی کی آخری سانس لی۔ خدا ان کی روح کو سکون اور شانتی دے۔ ان کے پس ماندگان میں بیوہ اور پانچ بیٹیاں ہیں جن میں چار شادی شدہ ہیں۔ ہم ان کے غم میں شریک ہیں۔ —— ادارہ

گرامی نامے

▷ میرا ایک مضمون "اُردو ڈراما اور انار کلی" "ایوانِ اُردو" کے شمارے بابت جولائی ۹۲ء میں شائع ہوا ہے اس میں سہواً و کرم روشنی کے مترجم کا نام عزیز مرزا کے بجائے عزیز احمد لکھا گیا ہے۔ براہِ کرم قارئین اس کی تصحیح کرلیں۔

—— عالیہ خان، حیدرآباد

▷ اگست کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ آغاز سے ابھی تک پرچے کا معیار برقرار ہے۔ کیفی اعظمی کی نظم کے علاوہ غزلیں بھی پسند آئیں، رحمان شاہی کا افسانہ "لاوا" متاثر کرتا ہے۔

"حرفِ آغاز" میں زبان کے تحفظ و ترقی کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار آپ نے فرمایا ہے اُن سے میں متفق نہیں۔ یہ تو بالکل ویسی ہی بات ہوگئی کہ جہاز کے جس حصّے سے پانی اندر داخل ہو رہا ہے اسی حصّے والے لوگ فکر کریں۔ اس طرح باقی حصّے والے لوگ کب تک محفوظ رہیں گے؟ قاضی حسن رضا صاحب نے جس معاملے کا ذکر اپنے خط میں کیا ہے اگر ضلع اور صوبے کی انجمن ترقی اُردو کے عہدیداران اور دیگر مقامی اور صوبائی محبانِ اُردو بروقت اس میں دلچسپی لے لیتے تو معاملہ بآسانی سلجھ جاتا اور بات آپ تک نہ پہنچتی۔

—— بدر واسطی، بھوپال

▷ اگست کا شمارہ ہر لحاظ سے پُرکشش ہے۔ "حرفِ آغاز" میں قاضی حسن رضا صاحب کے حوالے سے جو بات کہی گئی ہے وہ قابلِ توجہ ہے اُردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ازالہ کرنے کے لیے اُردو قافلے کے ہر مسافر کو خود میں قائدانہ صفات پیدا کرنی چاہئیں۔

قیام نیّر صاحب کا افسانہ "دیوار" بہت پسند آیا۔ باپ، بیٹی اور داماد کے رشتے کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ قارئین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

—— س۔ آسی، مدھوبنی

▷ "ایوانِ اُردو" کی خوبصورتی و دلکشی کو دیکھ کر پندرہ روزہ "آواز" دہلی کی یاد آتی ہے۔ سرورق کی تصویر اور آخری صفحے کی غزل کا انتخاب آپ کے ذوقِ جمال اور حسنِ انتخاب کا عکاس اور اشاعت میں وقت کی پابندی، منتظمانہ صلاحیتوں کی مُظہر ہے۔ "اداریہ" مختصر ترین، جامع، حقیقت پر مبنی اور متاثر کن ہوتا ہے اور "خبرنامہ" کے تحت بڑی خوبصورتی سے منتخب ادبی و نیم ادبی خبروں کو تصاویر کی گود میں سجایا جاتا ہے۔ اہم ادبی شخصیت کی موت کے فوراً بعد "خصوصی گوشہ" نکال کر خراجِ عقیدت پیش کرنے کی روش بھی قابلِ تحسین ہے۔

اگست ۹۲ء کے مشمولات میں نثار احمد فاروقی کا مقالہ "مولانا عبدالماجد دریابادی" صغریٰ مہدی کا "اُردو ادب میں خواتین کے مسائل" اور غضنفر کا "مکان ـــ ٹوٹنے کے بعد کی کہانی" پسند آئے۔ کیفی اعظمی کی نظم "آزادی" عالم خورشید کی غزل اور "اداریہ" کے ان چبھتے جملوں نے متاثر کیا: "اپنی زبان کے تحفظ و ترقی کے لیے خود اپنے طور پر تو کچھ کرسکتے ہیں، کرتے رہیں اور اس میں ثابت قدمی کا ثبوت دیں۔ اُردو کا معاملہ نہ کسی خاص فرد کا معاملہ ہے نہ کسی جماعت کا یہ ان تمام افراد اور ان سے وابستہ اداروں سے متعلق ہے جو اُردو کو اپنی زبان سمجھتے ہیں۔"

—— شاہد جمیل، پٹنہ

▷ اگست کا "ایوانِ اُردو" پڑھا۔ قیام نیّر کا افسانہ "دیوار" اور وہاب قیصر کا مضمون "تیزابی بارش" پسند آئے۔

—— نغمہ تبسم، اورنگ آباد

▷ اگست کے شمارے میں مضامین کا حصّہ کافی وزنی ہے۔ نثار احمد فاروقی صاحب کا مضمون بغور پڑھا، پسند آیا۔ حضرت عبدالماجد دریابادی کی شخصیت ہشت پہل تھی۔ کاش کوئی ان کے اخیر زمانے کے حالات پر روشنی ڈالتا۔

رحمان شاہی کا افسانہ اچھا ہے اور

حقیقت سے قریب مرد آپ مضامین کی بھرمار کر دیتے ہیں اور انشائیہ غائب کر دیتے ہیں۔ پڑھنے والوں کے لیے ہر طرح کا سامان بہم کیجیے کیفی صاحب کی نظم حاصلِ شمارہ ہے۔

—— انوار انصاری، رانچی

▷ سابقہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے "ایوانِ اُردو" اگست ۹۲ء کا شمارہ تمام تر خوبیوں سے آراستہ ہم دست ہوا اور جیسے روح سرشار ہو اٹھی۔ افسانوی ادب کے ساتھ حصّہ شاعری اور مضامین خوب سے خوب تر ہیں۔

رحمان شاہی کا افسانہ "لاوا" ایک بہت ہی خوبصورت کاوش ہے خاص کر "لاوا" کے اہم کردار انو کی نفسیاتی جنگ کو رحمان شاہی نے بہت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ "دیوار" کے انجام میں قیام نیر نے بیٹی کی شخصیت کو کسی حد تک مجروح کر دیا ہے۔ ملکہ خورشید کی کہانی "شکست" ظاہر کرتی ہے کہ انھیں علامتی کہانی لکھنے پر عبور حاصل ہے۔

صغریٰ مہدی کا مضمون "اُردو ادب میں خواتین کے مسائل" ایک ادبی مضمون ہونے کے ساتھ معلوماتی بھی ہے۔ عزیز الحسن جعفری کا مضمون "فری لانس یا سیار صحافی" صحافت کے دلدادہ لوگوں کے لیے راہبر کا کام دے گا۔

—— سہیل انجم گوہر گیاوی، پٹنہ

▷ "ایوانِ اُردو" وقت پر مل رہا ہے۔ یوں تو میں بہت سے ادبی رسائل و جرائد کا مطالعہ کرتا ہوں لیکن جو بات اس میں پاتا ہوں اور کہیں نہیں۔ یہ میرا پسندیدہ رسالہ بن گیا ہے۔

ماہ اگست کے شمارے میں تمام افسانے بہت پسند آئے اور تمام غزلیں بھی قابلِ تعریف ہیں ساتھ ہی ساتھ آپ کا اداریہ بھی دلوں کو جھنجوڑ دیتا ہے۔

—— محمد رحمت اللہ، فاضل پور

▷ اگست کے شمارے میں "فری لانس یا سیّار صحافی" از عزیز الحسن جعفری "تیزابی بارش" از وہاب قیصر اچھے لگے اور افسانوں میں "دیوار" اور "شکست" ساتھ ہی دو سے اور غزلیں بھی اچھی لگیں۔

—— ایم۔ اے۔ انصاری، کلکتہ

▷ ستمبر ۹۲ء کا "ایوانِ اُردو" نظر نواز ہوا محترمہ ساجدہ زیدی صاحبہ کا مضمون "کیا تعلیم گاہیں تخلیقی فنکار پیدا کر سکتی ہیں" پڑھا۔ پورا مضمون مبہم ہے۔ دراصل "تخلیقی فنکار" کوئی صنعتی پیداوار نہیں جیسے کسی فیکٹری یا کارخانے میں ڈھالا جاسکے بلکہ تخلیقی ذہن ایک چھپا ہوا خزانہ ہے۔ ہماری درس گاہیں اسے تلاش کرنے اور جلا بخشنے میں مدد کرتی ہیں۔ محترمہ نے نفسیاتی تنقید کی عینک لگا کر مسئلے کا تجزیہ پیش کیا ہے جبکہ کسی بھی قسم کی تخلیق (چاہے ادبی ہو یا سائنسی) کی بنیادیں سائنٹفک تنقید پر قائم ہیں جس کا ڈھانچہ مطالعے، مشاہدے، تجربے اور نظریے کی مدد سے کھڑا ہوتا ہے۔ ادبی تخلیق کار کے لیے جن چیزوں کا جاننا ضروری ہے ان میں زبان کا علم، ادبی تاریخ، اصولِ تنقید، ادبی رجحانات اور عام معلومات شامل ہیں۔ اُردو داں حضرات غور کریں کہ ہمارے تعلیمی ادارے اُردو کی بنیادی تعلیم کے لیے کتنی کوششیں کر رہے ہیں۔ سائنس اور عام معلومات پر ہمارے پاس کتنا سرمایہ ہے؟ ایسی صورت میں ہمارے تعلیمی ادارے تخلیقی فنکار کہاں سے تلاش کر سکتے ہیں۔

—— سیّد ساجد علی، ٹونک

▷ "ایوانِ اُردو" ستمبر کے شمارے میں "گوشۂ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر" پسند آیا مگر تشنگی باقی رہی۔ غزلیں بھی اچھی رہیں اور افسانہ بھی کوئی متاثر کن نہیں تھا۔

"آپ کی رائے" میں علی گنج کے زبیر ظہیر صاحب نے شجاع خاور کی ایک غزل میں 'وِن' بمعنی 'اُن' کے استعمال پر اعتراض کیا ہے۔ انھوں نے اسے جہلا کی زبان لکھا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ کبھی کبھی 'جہلا کی زبان' کا ایک لفظ بھی بات میں وہ وزن' دلکشی اور اسٹائل پیدا کر دیتا ہے جو علماً کی زبان کے ہزاروں الفاظ نہیں کر سکتے۔ اور شجاع خاور اس فن سے بخوبی واقف ہیں۔ ویسے بھی اس قسم کے الفاظ میر، نظیر، انیس اور جوش وغیرہ کی شاعری میں جابجا ملتے ہیں۔

—— فخر عالم، مراد آباد

> **خریداروں اور ایجنسیوں سے درخواست**
>
> ہے کہ دفتر کو خط لکھتے ہوئے خریدار حضرات اپنا خریداری نمبر اور ایجنٹ حضرات اپنا ایجنسی نمبر ضرور لکھیں تاکہ ان کے خط پر فوری کارروائی کی جاسکے۔
>
> منیجر ایوانِ اُردو

فون نمبر: ۳۲۷۶۲۱۱، ۳۲۶۳۴۴۸

(ار)دو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:
پروفیسر اشتیاق عابدی، مخمور سعیدی

(جل)د: ۶ — شمارہ: ۷ | فی کاپی ۵۰ر۳ روپے — سالانہ قیمت ۳۷ روپے | نومبر ۱۹۹۲ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی
اردو اکادمی، دہلی — گھٹا مسجد روڈ،
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سرورق، عکس: ارشد علی خاں

(پرو)فیسر اشتیاق عابدی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے قمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی ۲ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ کے اس اعلان کا کہ حکومتِ ہند عنقریب ایک اُردو یونیورسٹی قائم کرے گی، اُردو والوں کی طرف سے عمومی طور پر خیر مقدم کیا گیا ہے۔ بعض حضرات نے کچھ سوال بھی اُٹھائے ہیں اور کچھ اندیشے بھی ظاہر کیے ہیں جن میں پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر محمد حسن اور پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے لوگ بھی ہیں جو زندگی بھر اُردو درس و تدریس سے متعلق رہے ہیں۔ بہر حال ان سوالوں اور اندیشوں کے باوجود اُردو یونیورسٹی کے قیام کا اعلان، ہمارے خیال میں اُردو کے حق میں ایک نیک شگون ہے اور ہماری تمنّا ہے کہ جلد ہی یہ اعلان عملی شکل اختیار کرلے۔

یونیورسٹی کے قیام کے اعلان کے بعد ہی حکومت کی طرف سے ایک ۱۲ رکنی کمیٹی کے قیام کا اعلان ہوا جسے چھ ماہ کی مدّت میں یونیورسٹی کے قیام سے متعلق اپنی سفارشات پیش کردینے کو کہا گیا ہے۔ کمیٹی کے سربراہ عزیز قریشی صاحب ہیں اور دیگر ارکان میں سیّد حامد، آلِ احمد سرور، مالک رام، گیان چند جین، جگن ناتھ آزاد، راج بہادر گوڑ، غلام رسول کار، شکیل احمد اور اے۔ یو۔ شیخ کے نام ہیں جن کی اُردو سے گہری وابستگی اور اس زبان کے تئیں خیر خواہی سے سبھی واقف ہیں۔ کمیٹی کا ممبر سیکریٹری وزارتِ تعلیم کے جوائنٹ سیکریٹری جناب پریہ درشی ٹھاکر خیال کو مقرر کیا گیا ہے جو نہ صرف اُردو کے ایک خوش فکر اور خوشگو شاعر ہیں، اُردو کی ترقی و ترویج کے بھی دل سے خواہاں ہیں۔ یہ کمیٹی جن امور پر غور کرے گی وہ یہ ہیں: یونیورسٹی کہاں قائم کی جائے؟ یونیورسٹی کے لیے مالی اور دیگر طویل مدتی وسائل کس طرح اور کہاں سے حاصل کیے جائیں؟ یونیورسٹی کا انتظامی ڈھانچہ اور تعلیمی نظام کیا ہو؟ یونیورسٹی کتنی مدّت میں قائم ہوسکتی ہے؟ دیگر متعلقہ امور

ہمیں امید ہے کہ کمیٹی مقرّرہ مدّت میں اپنی تجاویز حکومت کو پیش کردے گی اور جیسا کہ جناب ارجن سنگھ نے کہا ہے، حکومت کی طرف سے ان تجاویز پر عملدرآمد میں بھی غیر ضروری تاخیر نہیں ہوگی۔

یہاں ہم یہ یاد دلانا مناسب سمجھتے ہیں کہ اُردو یونیورسٹی کا ایک کامیاب تجربہ آزادی سے پہلے حیدرآباد میں ہو چکا ہے۔ حیدرآباد کی یہ یونیورسٹی وہاں کے آخری آصف جاہی فرماں روا میر عثمان علی خاں کے ایما پر قائم ہوئی تھی اور اسی نسبت سے اسے عثمانیہ یونیورسٹی کا نام دیا گیا تھا۔ اس یونیورسٹی کی کارکردگی کو ذہن میں تازہ کر لیا جائے تو اس طرح کے اندیشے کچھ کم ہوسکتے ہیں کہ اُردو میڈیم سے سائنس اور انجینیرنگ وغیرہ کی تعلیم میں دشواریاں پیش آئیں گی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے بے شمار فارغ التحصیل طلبہ نے سائنسی شعبوں میں بھی امتیازی حیثیت حاصل کی اور کارہائے نمایاں انجام دیے۔ تب میں اور اب میں ایک فرق ضرور پیدا ہوگیا ہے۔ اُن دنوں اُردو کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا بھی ایک موثر نظام موجود تھا جو اب باقی نہیں رہا ہے۔ اگر مجوزہ اُردو یونیورسٹی کو کامیاب ہونا ہے تو اس نظام کی بحالی بہت ضروری ہے۔ ہمیں علم نہیں کہ "دیگر متعلقہ امور" کے تحت کمیٹی کو اس مسئلے پر بھی غور کرنے اور اپنی سفارشات پیش کرنے کو کہا گیا ہے یا نہیں۔ ہمارے نزدیک اس مسئلے کو دوسرے تمام امور پر اوّلیت حاصل ہے۔

——— ادارہ

غزل پارہ

رفعت سروش

ب خواب ہوتے سب ہنگامے مگ بیتے بزم آرائی کو
ینے سے لگائے بیٹھا ہوں ویرانی کو' تنہائی کو

ہروں کے تپتے محلوں میں دل یاد کرے ہے رہ رہ کر
ہکی مہکی امرائی کو' بھیگی بھیگی پروائی کو

ہے عین سعادت میرے لیے ہو ذکر تمھارے ساتھ اگر
وش بختی سے تعبیر کروں میں اپنی اس رسوائی کو

حرا صحرا' گلشن گلشن' کانٹوں سے الجھا ہے دامن
خموں ہی کی سوغات ملی ہر پھولوں کے شیدائی کو

نزل نے فریب دیے کتنے یہ کہنا مشکل ہے شاید
لزام مگر دینا ہے سروش اپنی ہی شکستہ پائی کو

رفعت سروش
۲۔بی' پاکٹ سی' سدھارتھ ایکسٹینشن' نئی دہلی۔۱۴

عُنوان چشتی

باڑھ کا پانی بھیانک منظروں میں رہ گیا
جو اثاثہ تھا' وہ سب کچے گھروں میں رہ گیا

اک طلسمی رات کا منظر سروں میں رہ گیا
اُس گلی میں جو گیا' جادو گروں میں رہ گیا

یہ تماشہ بھی تو ہونا تھا فسادِ شہر میں
جو کوئی زندہ بچا' وہ ادھ مروں میں رہ گیا

زندہ باد اے قوم کی مُردہ پرستی زندہ باد
زندگی کا ہر تخیل مقبروں میں رہ گیا

اک بلا سی آئی اور سب کے سروں پر چھا گئی
گاؤں کا ہر اک سیانا مشوروں میں رہ گیا

بی ۔ ۱۱۷' (اُردو سماج)' جامعہ نگر' نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

وفا ملک پوری

وہی سودائے محبت وہی سر ہے اپنا
وہی دامن ہے وہی دیدۂ تر ہے اپنا

چھت ٹپکتی ہے تو اس کا نہیں شکوہ مجھ کو
شکر کرتا ہوں کہ جیسا بھی ہے گھر ہے اپنا

ہائے وہ دل کہ جو تھا قصرِ محبت کی فصیل
اب وہ اک مقبرۂ عشق' کھنڈر ہے اپنا

جو کسی اور کی چوکھٹ پہ جھکے تیرے سوا
نہ وہ دل ہے بخدا اور نہ وہ سر ہے اپنا

چاک کرنا تو کبھی چاکِ گریباں سینا
مشغلہ بس یہی اب' شام و سحر ہے اپنا

عشقِ سلطانِ نجف سجدۂ صناعِ ازل
یہی لے دے کے وفا' زادِ سفر ہے اپنا

وفا ملک پوری
کاشانۂ وفا' پورنیہ سٹی

ابوالکلام آزاد — غبارِ خاطر کے آئینے میں

سیّد احمد شمیم
صدر شعبۂ اُردو، کریم سٹی کالج، جمشید پور (بہار)

مولانا آزاد کی شخصیت امیر خسرو کے بعد مسلمانانِ ہند میں ایک الف لیلوی شخصیت گزری ہے کہ اُن سے وابستہ حقیقتیں کہانی معلوم ہوتی ہیں اور کہانیوں نے اُن سے منسوب ہوکر حقیقت کا بدن پہن لیا ہے۔

مولانا بے مثال عالم دین، سیاسی رہنما، فلسفی، مفکر، صحافی، مدبّر، مفسّر اور انشا پرداز تھے اور ان سب سے ماورا شاعری اور موسیقی سے بھی انھیں روحانی لگاؤ تھا گویا ایک شخصیت کے اندر کئی شخصیتوں کی جلوہ گری کا نام ابوالکلام آزاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کے علم وفضل اور اُن کے ادبی وسیاسی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے نقد ونظر کے تمام بنائے ہوئے معیارات بے معنی ہو جاتے ہیں اور مانی جانی ہوئی کسوٹیاں کام نہیں آتیں۔

لوگ جس عمر میں دیوارِ دبستاں پر لام الف لکھنے کی ابتدا کرتے ہیں مولانا ہست و بود کی بہت سی منزلوں سے گزر چکے تھے۔ ایک صاحبِ قلم ادیب اور انشا پرداز کی حیثیت سے انھوں نے اُردو نثر کو نئی سمتوں سے آشنا کیا۔ "المصباح" اور "لسان الصدق" "الندوہ" سے لے کر "الہلال" اور البلاغ تک اور خطباتِ آزاد" "تذکرہ" اور ترجمان القرآن سے لے کر "غبارِ خاطر" تک اُن کے قلم نے علم و ادب کے ہزارہا پھول کھلائے لیکن اپنے رنگ و خوشبو اور حسن و زیبائش میں یہ ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہی قلم سے اتنی رنگا رنگ گلکاریاں کیوں کر ممکن ہوتی ہیں؟ "لسان الصدق" اور "الندوہ" میں اُن کا اسلوب عالمانہ اور ناصحانہ ہے تو "تذکرہ" میں نقد ونظر کی چاندنی چمکتی ہے۔ "الہلال" کی تحریر میں برق و رعد کی کڑک اور شعلۂ جوالہ کا رقصِ مستانہ ہے۔ "البلاغ" میں پیغمبرانہ جلال بھی ہے اور جمال بھی جب کہ ترجمان القرآن اور دوسری مذہبی کتابوں میں اُن کا اسلوب حکیمانہ استدلالی، منطقی اور آئینہ کی طرح شفاف ہے اور "غبارِ خاطر" ان سب سے مختلف ہے۔ "غبارِ خاطر" کی نثر اُردو میں روحانی اور انائی نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ یہاں آزاد کے فکر و فلسفہ کا وہ نور ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور دل کا گوشہ گوشہ کیف و سرور سے معمور ہو جاتا ہے۔

"غبارِ خاطر" کو مکاتیب کا مجموعہ کہا گیا ہے۔ مگر یہاں مکتوب محض وسیلہ ہے۔ دراصل یہ مکاتیب نہیں ذاتی نوعیت کے اُردو میں منفرد انشائیے ہیں۔ جن میں مذہب، فلسفہ، اخلاق، سائنس، تہذیب، تاریخ، شاعری، موسیقی، حُسن، عشق اور تصوّف کے اسرار و رموز سے پردے اُٹھائے گئے ہیں۔ انھیں پڑھ کر مولانا کی عظمت و انفرادیت کے مختلف گوشے روشن ہوتے ہیں۔ مولانا نے کبھی کسی کی تقلید پسند نہیں کی۔ ہمیشہ دوسروں سے مختلف رہے۔ ہمیشہ خود کو اس بھری پُری دُنیا میں تنہا محسوس کیا اور اپنے آپ کو اپنے وطن میں بھی اجنبی محسوس کیا:

"افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا ہو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ تمھارے اس ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔"

"غبارِ خاطر" اسی عظیم شخصیت کا صنم کدہ ہے۔ جہاں اُس نے خود اپنے حُسن کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہر بڑا فنکار انانیت کا شکار اور اپنی ہی تنہائی کا گرفتار ہوتا ہے لیکن اس کا جینیئس زندگی کی کھردری حقیقتوں سے ٹکراتا ہے۔ تو وہ اپنی ہی لہولہان انا کا نوحہ بن جاتا ہے۔ مگر اُس کی زخمی انا عام کاروبارِ حیات سے سمجھوتہ نہیں کرتی وہ ہر حال اور ہر رنگ میں اپنے سالم وجود کے ساتھ زندہ رہتی ہے:

"جس جنس کی عام مانگ ہو وہ میری دُکان میں جگہ نہ پا سکی۔ ادب میں، سیاست میں فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی

نکلنا پڑا کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔"

مولانا عالم دین تھے اور جمیعت کے فرائض سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ سیاسی رہنما تھے اور انسانوں کی بھیڑ میں رہنا اُن کی مجبوری تھی لیکن بھیڑ کی اُس زندگی کو اُن کے اندرون نے کبھی پسند نہیں کیا:

"میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا، سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔"

تنہائی کی یہی طلب تھی کہ جب کبھی مولانا کو قید و بند کی سزا ہوئی مولانا نے اسے اپنے حوصلوں سے کم اور برطانوی سامراج کے ظرف سے زیادہ جانا:

"جب کبھی قید خانے میں سُنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی گئی تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی آدمی کے لیے سزا کیسے ہو سکتی ہے۔"

جن لوگوں نے مولانا کی کتاب حیات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے جانتے ہیں کہ مولانا اپنے خاص انداز میں جینے کے قائل تھے۔ اُن کا فلسفۂ سود و زیاں اُن کا تصوّر عیش و نشاط دوسروں سے مختلف تھا۔ وہ زندگی کا سارا عیش اپنی ذات کے اندر تلاش کرنے کے قائل تھے:

"انسان کا اصل عیش دماغ کا عیش ہے جسم کا نہیں۔ لذتیوں سے ان کا دماغ لے لیتا ہوں۔ جسم ان کے لیے چھوڑ دیتا ہوں غور سے دیکھیے تو یہ بھی ہمارے وہم کا ایک فریب ہے کہ سرو سامان کار ہمیشہ اپنے باہر ڈھونڈتے ہیں اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہمارے اندر ہے۔"

وہ جو اہلِ دل ہوتے ہیں دل کی زندگی کو زندگی مانتے ہیں۔ اگر دل زندہ ہے تو سب کچھ ہے دل مر گیا تو کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ خواجہ میر درد نے کہا ہے:

مجھے ہے ڈر دلِ زندہ کہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اور مولانا آزاد کہتے ہیں:

"ہم اپنے باہر ساری چیزیں ڈھونڈتے رہیں گے مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈیں گے۔ حالانکہ اگر اسے ڈھونڈ نکالیں تو عیش و مسرّت کا سارا سامان اسی کوٹھری کے اندر سمٹا ہوا مل جائے۔"

یہی وہ زاویۂ نگاہ اور معیار نظر ہے جس نے مولانا کو ہر جگہ اور ہر حال میں آسودۂ دل و دماغ رکھا۔ وہ مصائب سے گھبرائے اور نہ آزمائشوں سے متزلزل ہوئے قید خانوں کی سنگین دیواریں ہوں یا سیاسی ہنگاموں کا طوفان اپنوں کے سنگ ملامت ہوں یا غیروں کے طنز و طعن کبھی کسی چیز نے انھیں پل بھر کے لیے پریشان نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ مینارۂ عظمت کی طرح سربلند رہے:

"آدمی اپنے آپ کو احساسات کی عام سطح سے ذرا بھی اونچا کرلے تو جسم کی آسائشوں کا فقدان اسے پریشان نہیں کر سکے گا۔"

وہ لوگ جنھوں نے قید و بند کی زندگی کا ہلکا سا ذائقہ بھی چکھا ہوگا جانتے ہوں گے کہ قید و بند کی یہ زندگی بہت سی مسرّتوں سے محرومی کی زندگی ہوتی ہے مگر مولانا کے لبوں کو کسی حرف گلہ نے چھونے کی جرأت نہیں کی:

"زندگی کی مشغولیتوں کا وہ سامان جو اپنے وجود کے باہر تھا اگر چھن گیا تو کیا مضائقہ؟ وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا جسے کوئی نہیں چھین سکتا سینے کے اندر چھپائے ساتھ لایا ہوں۔"

مولانا کا یقین تھا کہ مسرّت و غم اور انبساط و کرب ہر آدمی کا مقدر ہے اور اس کارگہہ سود و زیاں میں کوئی دل نہیں جو درد سے خالی ہو اور کوئی مسرت نہیں جو غم میں بدل نہ جائے:

"اس کارگہہ سود و زیاں میں کوئی عشرت نہیں کہ کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو یہاں زُلال صافی کا کوئی جام نہیں بھر گیا کہ دردِ کدورت اپنی تہہ میں نہ رکھتا ہو"

مولانا کی سیرت لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ مولانا فطرتاً تنہائی پسند اور کم آمیز تھے لیکن ہم مشربوں اور ہم مذاقوں کے درمیان شگفتہ رُو اور شیریں سخن بھی تھے۔ وہ بند رہتے تھے مگر اپنوں کے بیچ کھلنا بھی جانتے تھے۔ غبارِ خاطر ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انھوں نے اپنے جلوؤں کو بے حجاب کیا ہے۔ مولانا کا خاندان عالی مرتبت تھا اور خود اُن کا اپنا علمی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور فکری مرتبہ بہتوں کے تصوّر سے بھی اونچا تھا۔ وہ عام سیاسی لیڈروں اور مناظراتی ملاؤں کی طرح ہجوم آشنا نہ تھے۔ انھوں نے اپنی انجمن اپنی ذات کے اندر سجائی تھی۔ لیکن اُن میں دانشورانہ خشک مزاجی یا ملایانہ تنگ نظری نہیں تھی۔ وہ اندر سے جمال پرست تھے کہ جانتے تھے "اللہُ جمیلٌ و محبُّ الجمال" اور حُسن جہاں کہیں بھی ہو اُن کی آنکھوں میں اُتر آتا تھا:

"حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں حسن ہے اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اس محروم ازلی پر جس کے بے حس دل نے اس مطالبے کا جواب دینا نہ سیکھا ہو۔"

اور مولانا کہ اپنے سینے میں دل زندہ رکھتے تھے۔ حسن کے مطالبے کا جواب دینا جانتے تھے:

"فطرت کی اس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو اور چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال سکتی ہو۔"

مولانا کی اسی جمال پرستی نے ان کی تحریر میں رومانیت اور جمالیت کی سنہری روپہلی دھوپ اور چاندنی چمکائی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ حسن کی یہ کشش انسان کی چال میں تھوڑی سی لڑکھڑاہٹ بھی پیدا کر دے تو یہ پچھتاوے کی نہیں طمانیت قلبِ انسانی کی بات ہے:

"غور کیجیے وہ زندگی ہی کیا جس کے دامن خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکی وہ چال ہی کیا جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہو۔"

غبارِ خاطر اگر شائع نہ ہوئی ہوتی تو بہت کم لوگ یہ جانتے کہ فقہ و حدیث کے اتنے بڑے ماہر کو فنِ موسیقی سے کتنا گہرا لگاؤ تھا۔ مولانا کا نہ صرف یہ کہ اس فنِ لطیف سے روحانی رشتہ تھا بلکہ وہ اس کے اسرار و رموز سے بھی واقف تھے اور موسیقی انھیں کتنی عزیز تھی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل سطروں سے لگایا جا سکتا ہے:

"میں زندگی کے احتیاجوں میں ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، کاہشوں کا مداوا اور زخم دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔"

مولانا کے والد انتہائی شفقت پدری کے باوجود سخت گیر تھے۔ پھر بھی مولانا نے مسیتا خان نامی شخص سے جو اُن کے والد کے مرید تھے موسیقی کا علم حاصل کیا تھا۔ اور مرزا ہادی رسوا سے بھی اس فن کے اسرار و رموز جانے تھے۔ انھوں نے موسیقی سے اپنی دلچسپی کے بارے میں لکھا ہے:

"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایک زمانے میں مجھے فنِ موسیقی کے مطالعہ اور مشق کا بھی شوق رہ چکا ہے اس کا اشتغال کئی سال تک جاری رہا تھا۔"

دراصل مولانا فطری طور پر ایک شاعر تھے۔ گرچہ انھوں نے کلام موزوں میں دلچسپیاں برائے نام لیں اور اپنی شاعری کو نثر کا لباس پہنا دیا۔ لیکن تھے وہ بہر حال شاعر اور شاعر کی ذات جب پھیلتی ہے تو کائنات بن جاتی ہے۔ اور کائنات سمٹتی ہے تو شاعر کا دل بنتی ہے۔ جب کبھی سیاسی مصروفیتوں اور مجلسی ہنگامہ آرائیوں سے انھیں نجات ملتی تو کائنات میں پھیلے ہوئے بے پناہ حسن میں وہ خود کو کھو دینا چاہتے تھے۔ لکھنے والوں نے لکھا ہے مولانا کو نینی تال، دار جلنگ اور کشمیر کے پُر فضا مقامات سے عشق سا تھا۔ انھیں صبح دوپہر، رات کے بوقلموں جلوے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ اور ان کے سیرِ نظارہ سے مولانا کی آنکھیں لطف و سرور حاصل کرتی تھیں۔ "غبارِ خاطر" کے اکثر مکاتیب میں روز و شب کی حسین و جمیل زرنگار تصویریں بکھری پڑی ہیں۔ "غبارِ خاطر" کا ہر خط سنانے صبح سے ابتدا کرتا ہے اور اُن کی صبح بھی ہماری اور آپ کی صبحوں سے مختلف ہوتی تھی۔ پچھلی رات کے ڈھلتے ہوئے آنچل پر آمد صبح کے روپہلے گوٹے جب لگتے ہیں تو مولانا کی صبح اپنی آنکھیں کھولتی تھی اور وہ اس کا استقبال سفیدِ چنبیلی کی لطیف خوشبوؤں سے کرتے تھے۔ مولانا نے اپنی عروسِ صبح کے چہرے سے نقاب یوں اُٹھائی ہے:

"کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی سامنے دیکھا تو سمندر اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا۔ صبحِ نسیم کے جھونکے احاطے کی روش پر پھولوں کی خوشبو چُن چُن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا رہے۔"

دوسرا منظر:

"صبح سے پہلے مورننگ گلوری نے اس خرابۂ بے رنگ کو اپنی گل شگفتیوں سے رنگین کیا جب صبح کے وقت آسمان پر سورج کی کرنیں مسکرانے لگتیں تو زمین پر مورننگ گلوری کی کلیاں کھلکھلا کر ہنسنا شروع کر دیتیں۔"

صبح کی کیف انگیزیوں اور نشاط بخشیوں کے ساتھ ساتھ مولانا کو دوپہر کی خاموش گھری پُر اسرار کیفیتوں سے بھی قلبی انس تھا:

"میرا دوسرا پُر کیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے یا زیادہ صحتِ یقین کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے... اس وقت آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب

درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کروں گا اور رواق دل کا ایک ایک دریچہ کھول دوں گا۔ گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں۔"

صبح اور دوپہر کی ان کیفیتوں کو جان لینے کے بعد رات کا منظر بھی دیکھتے چلیے کہ جمال شب کا بھی ان کی زندگی میں بڑا حصہ رہا ہے:

"رات کا سنّاٹا ستاروں کی چھاؤں اپریل کی بھیگی ہوئی رات چاروں طرف تاج کے مینارے سر اُٹھائے ہوئے کھڑے تھے۔ برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں بیچ میں چاندنی سے دُھلا ہوا مرمریں گنبد بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں۔"

اپریل کی بھیگی ہوئی رات کے ساتھ یاد آگیا کہ "غبارِ خاطر" میں کئی جگہ مختلف موسموں، ان کی رعنائیوں اور دل رُبائیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ گرمی سے مولانا کو وحشت ہوتی تھی لیکن موسم زمستان اور بہار اُن کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ برسات کے گھنے سیاہ بادل اُن پر جادو کرتے تھے:

"گرمی رخصت ہو رہی ہے اور بادلوں کے قافلے ہر طرف اُمڈنے لگے ہیں دُنیا میں اتنی تبدیلیاں ہو چکی ہیں مگر اپنے دل کو دیکھتا ہوں تو ایک دوسرا ہی عالم دکھائی دیتا ہے۔"

اور آمد بہار کا استقبال یوں کیا گیا ہے:

"فروری میں ابر و باد کی آمد و رفت سے موسم کا اُتار چڑھاؤ جاری رہا مگر جوں ہی مہینہ ختم ہونے پر آیا موسم بہار کا پیش خیمہ پہنچ گیا یعنی معتدل ہواؤں کے جھونکے چلنے لگے۔ پھر ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ خراماں خراماں چلتی ہوئی خود بہار بھی آموجود ہوئی اور جوانانِ چمن نے اس کی خوشی آمدید کا جشن منانا شروع کر دیا۔"

موسم زمستان کی یخ بستہ راتوں اور جلتے ہوئے آتش دان کی لذتوں کا ذکر مولانا نے ایک خاص والہانہ انداز میں کیا ہے:

"میں سردی کے موسم کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ ہی نہیں سکتا اگر آتش دان سلگ نہ رہا ہو اور آتشداں بھی وہی پُرانی وضع کا ہونا چاہیے جس میں لکڑی کے بڑے بڑے کندے جلائے جا سکتے ہوں ..... دراصل میں گرمی کے لیے آتشدان کا شیدائی نہیں مجھے شعلوں کا منظر چاہیے جب تک شعلے بھڑکتے نظر نہیں آتے دل کی پیاس نہیں بجھتی۔"

مولانا کے مزاج میں آگ اور پانی یکجا تھے۔ دہکتے ہوئے شعلوں سے اگر ان کی پیاس بجھتی تھی تو برف کی بے کراں پھیلی ہوئی سفیدی سے ان کی آنکھیں نور و سرور حاصل کرتی تھیں۔ موسم زمستاں کی برفیلی ہوائیں ان کے اندر آگ بھڑکاتی تھیں اور آمد بہار سے ان کا غنچۂ دل کھل اُٹھتا تھا:

"زمستاں کی برف باری اور پت جھڑ کے بعد جب موسم کا رُخ پلٹنے لگتا ہے اور بہار اپنی ساری رعنائیوں اور جلوہ فرشیوں کے ساتھ باغ و صحرا پر چھا جاتی ہے تو اس وقت برف کی بے رُخی سے ٹھٹھری ہوئی دنیا یکایک محسوس کرنے لگتی ہے کہ اب موت کی افسردگیوں کی جگہ زندگی کی سرگرمیوں کی ایک نئی دُنیا نمودار ہو گئی ... آج آنکھیں کھولیے تو حسن کی عشوہ طرازی ہے کان لگائیے تو نغمہ کی جاں نوازی ہے سونگھیے تو سرتاسر بو کی عطر بیزی ہے۔"

مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے "کوئی عشرت نہیں کہ حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔" مولانا کی زندگی کی بھی بہت سی آرزوئے عشرت غبارِ حسرت سے سنولاتی ہے اور اُن کے ذاتی غموں میں سب سے بڑا غم ان کی رفیقۂ حیات کا سانحہ ارتحال ہے۔ مولانا کی بیگم کا نام زلیخا تھا اور دونوں کا رشتہ بھی یوسف و زلیخا ہی جیسا تھا۔ دونوں ہی حسین و جمیل اور بے پناہ محبت کرنے والے تھے۔ بیگم زلیخا جب بیمار ہوئیں مولانا قلعہ احمد نگر میں نظر بند تھے۔ جیلر نے اشارہ کیا اور دوستوں نے سمجھایا کہ ذاتی درخواست پر رہائی مل سکتی ہے لیکن اس مرد غیور نے گوارا نہیں کیا کہ حکومت برطانیہ کے سامنے آزادی کی درخواست پیش کرے یہاں تک کہ بیگم کا انتقال ہو گیا۔ پنڈت نہرو کے نام سے منسوب روایت ہے کہ مولانا نے جب یہ خبر سنی تو اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور کسی نے نہیں جانا کہ ان کے دل پر کیا گزری صبح کو دروازہ کھلا تو چہرہ ہمیشہ کی طرح پُرسکون اور پُروقار تھا البتہ ادھ جلی سگریٹ کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے تھے گیارہ اپریل ۱۹۴۳ء کے مکتوب سے اس درد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جسے مولانا تنہا جھیل گئے:

"اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا اسے چھپانا نہیں چاہتا اس کو صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرنے میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔"

آخر کار صبر و ضبط کا یہ پیمانہ چھلک گیا۔ مولانا نے اپنی انا کا آئینہ خود اپنے ہاتھوں سے

چھوڑ کر دیا ۱۹؍ اپریل ۱۹۴۳ء کو لکھتے ہیں :

"ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔"

"غبارِ خاطر" کی زبان اور اسلوب پر اکثر اہلِ قلم نے سخت اعتراضات بھی کیے ہیں اور وجہ صرف یہ ہے کہ اسے بھی مکاتیبِ غالب قسم کی کوئی چیز سمجھ کر پڑھا گیا ہے اور یہیں نکتہ چینوں سے بنیادی غلطی بھی ہوئی ہے۔ اگر انھوں نے غبارِ خاطر کو مکاتیب کا مجموعہ سمجھنے کی بجائے تخلیقی انشا سمجھا ہوتا تو شاید اعتراض کی گنجائش بھی نہ نکلتی اور مولانا کی منفرد انشا کا دل کھول کر اعتراف کیا جاتا۔ دراصل مولانا نے رجب علی بیگ سرور کی مرصع کاری، محمد حسین آزاد کی رنگینی، شبلی کی جمالیت اور اپنی براہیمی اور آذری عقلیت اور جذبہ پروری کا کرب اور صبر ملا کر وہ رنگِ انشا ایجاد کیا جو انھیں کے ساتھ ختم ہو گیا اور صورتِ حال یہ ہے کہ نئی نسل اسے سمجھ تو کیا سکتی ہے صحیح صحیح پڑھنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتی۔ نیاز فتح پوری جیسے انانیت پرست انشا پرداز نے ایک جگہ لکھا ہے :

ہم نے مولانا کو اتنا جانا جتنا وہ چاہتے تھے کہ ہم جانیں اور اُن کی ہستی کے بہت سے امکانات دُنیا پر ظاہر نہ ہو سکے اور حقیقت ہے کہ "غبارِ خاطر" مولانا کے فکر و خیال کا وہ آئینہ ہے کہ غبارِ ایّام سے بے نیاز اہلِ دل و نظر کے لیے آج بھی چمکتا ہے۔ کل بھی چمکتا رہے گا :

کون ہوتا ہے حریفِ مَے مرد افگن عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غزلیں

نا بھی نگاہوں پہ نہ چھا جائے کوئی اور
ئینہ بھی دیکھیں، تو نظر آئے کوئی اور

ب شہر میں انصاف کی یہ رسم چلی ہے
و جرم کسی کا، تو سزا پائے کوئی اور

ہچا ہے تعلق، تو کبھی یوں بھی تو ہو جائے
و درد ہمارے، تو تڑپ جائے کوئی اور

نی تو ملے داد ہمیں، لغزشِ پا کی
رجائیں اگر ہم تو سنبھل جائے کوئی اور

ہ آخری پردہ بھی اٹھانے کو چلے ہو
یسا نہ ہو پردے میں نکل آئے کوئی اور

منظور ہاشمی

A-1، نذیر احمد روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یو پی)

عقیل شاداب

مرگِ مظلومین کتنی سہل ہے
صبر کی تلقین کتنی سہل ہے

سب کو ملتے ہیں برابر کے حقوق
یہ شقِ آئین کتنی سہل ہے

نفس کا ہے تزکیہ کتنا محال
جسم کی تسکین کتنی سہل ہے

جسم کی مٹی اسے درکار ہے
روح کی تکفین کتنی سہل ہے

آج کل شاداب ان کی بزم میں
آپ کی توہین کتنی سہل ہے

برج راجپورہ، کوٹہ ۳۲۴۰۰۷ (راجستھان)

نہ تو چونک میرے سوال پر
مجھے شک ہے تیرے کمال پر

مجھے زندگی کا سبق نہ دے
مجھے چھوڑ دے مرے حال پر

یونہی عمر ہم نے گزار دی
ترے ایک نقشِ خیال پر

مجھے کیوں بنا کے مٹا دیا
مجھے دکھ ہے میرے زوال پر

جنھیں دوریاں ہی عزیز تھیں
انھیں حسرتیں تھیں وصال پر

خلیل تنویر

گورنمنٹ میوزیم، اودے پور

مضبوط رشتہ

عبدالصمد

۱۷۳، پاٹلی پترا کالونی، پٹنہ ۱۳ (بہار)

اُس مجسمے میں کچھ ایسی بات تھی کہ پہلے پہل جو اُسے دیکھتا، زندہ سمجھ لیتا۔ مجسمہ ساز نے اپنا سارا کمال، سارا فن اور ساری محنت اُس پر لگا دی تھی اور تب کہیں جاکر وہ ایک عجوبے کی شکل اختیار کر سکا تھا۔

وہ اپنے خالق کا ایک شاہکار تھا۔

اُسے کسی چوراہے، موڑ یا کسی چوک پر نصب بلکہ شہر کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت باغ میں چار چاند لگانے کے لیے استعمال کر لیا گیا تھا۔ چاروں طرف رنگ برنگے پھولوں کی بہار تھی، ہری بھری گھاس کی خوبصورت کیاریاں تھیں، جگہ جگہ سبز قطعے تھے، دیواروں پر بڑے سلیقے سے پھولوں کی بیلیں چڑھائی گئی تھیں۔ چاروں طرف رنگ برنگے پھواروں والے فوارے کبھی کبھی شریر ہو کر آسمان کو چھونے کی کوشش کرتے۔ اس پس منظر میں مجسمہ یوں دکھائی دیتا جیسے قرونِ وسطیٰ کا کوئی شہزادہ اپنے محل کے بائیں باغ میں چہل قدمی کرنے نکلا اور کسی منظر نے اُسے ایسا مبہوت کر دیا کہ وہ وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا ـــــ اگر دَورِ جمہوری نہ ہوتا، چوبیس گھنٹے وہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہوتی اور وہ تفریح کا ایک مرکز نہ سمجھا جاتا تو شاید یہ بات تسلیم بھی کر لی جاتی۔ مجسمہ تو تفریح کی جان تھا اور اکثر لوگ صرف اسی کی خاطر وہاں آتے۔ خاص طور پر اُن لوگوں کے لیے تو یہ مجسمہ خاص کشش کا حامل تھا جو بیرونِ شہر سے آتے۔ ورنہ اس شہر میں کیا رکھا تھا، بس چند بے رحم اور پتھریلی سڑکوں، تاریک گندی گلیوں اور اُونچے ٹیڑھے میڑھے مکانوں کا مجموعہ ـــــ وہ تو مجسمہ تھا جس نے شہر کی ساری بدنما حقیقتوں کو چھپا لیا تھا اور دُور دراز کا کوئی فرد اس شہر کو یاد رکھتا تو محض مجسمہ کے کارن۔ مجسمہ ساز کتنا دور اندیش تھا کہ اُس نے اس کی شباہت میں کسی سیاسی لیڈر کا پرتو نسب آنے دیا تھا جس سے مجسمہ کوئی متنازعہ چیز نہیں رہا تھا۔ اُسے آج نہ پھول کی خوشی تھی نہ کل پتھر کا غم۔ اُس میں کسی ادیب یا شاعر کی جھلک بھی نہیں تھی کہ تنقید نگار اُس کے ایک ہاتھ میں سورج رکھ دیں اور دوسرے میں چاند۔ اُس میں کسی فلم اسٹار کی بو باس بھی نہیں تھی کہ اپنی پوجا کے لیے ایک خاص وقت اور خاص زمانے ہی کا وہ محتاج ہو۔ اُس میں کسی دیوتا کی شبیہہ بھی نہیں تھی کہ اُس کے نام پر کچھ لوگوں کو روٹی ملے اور کچھ کو موت۔ یہ مجسمہ ساز کا ایک کمال ہی تھا کہ اُس نے اپنے شاہکار کو کروڑوں اربوں انسانوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ سب سے بڑا اور سب سے چھوٹا آدمی مجسمہ سے ایک قربت محسوس کرتا، اُسے ایک نامعلوم سی کشش اُس کی طرف کھینچ کر لے جاتی۔ وہ مجسمہ کے چمکیلے پتھر میں اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کرتا۔

چمکیلے پتھر سے بنا تقریباً ۱۲ فٹ اونچا یہ مجسمہ ایک منفرد شخصیت کا مالک تھا۔ مجسمہ ساز کی طرف سے اُس کے جسم پر ایک عام سا پتھریلا لباس پہنایا گیا تھا اور اُس کے سر کے بال اُلجھے اُلجھے سے چھوڑ دیے گئے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک ویرانی سی تھی جو پتھر کی مناسبت سے اور اُبھر آئی تھی۔ دونوں ہاتھ نہ پھیلے ہوئے تھے نہ سکڑے ہوئے تھے جیسے اپنی قسمت پر صابر و شاکر ہوں، جیسے استقلال کے پہاڑ ہوں۔ اُس کے انداز میں اتنی بے ساختگی تھی کہ جو بھی اُسے دیکھتا، اُسے چھوئے بنا نہ رہتا۔ چھو کر اُسے مکمل طور پر محسوس بھی کیا جا سکتا تھا۔ اُس کے آس پاس ہر وقت ایک بھیڑ رہتی۔ چھوٹے بچے اُس کے سر اور کاندھے پر چڑھ جاتے اور بڑے فخر سے اپنے بالوں کی طرف دیکھتے جن کے سر اور کاندھوں میں طاقت بچی نہیں تھی۔ مجسمے پر اپنے بچوں کو کھیلتے دیکھ کر انھیں بچوں کے روشن مستقبل کی ایک جھلک سی نظر آجاتی اور وہ بڑے اطمینان سے آس پاس کی خوبصورت روشوں پر لیٹ جاتے۔

پارک میں آنے والا ہر شخص اپنے جسم

ح میں سکون کی ایک لہر سی محسوس کرتا، ان آکر مجسمے کے مہربان سائے میں وہ اپنی ھوں میں بسے سارے کرب بھول جاتا جنھیں ملانے کی کوشش میں نسل در نسل وہ اپنے آپ قربان کر رہا تھا اور یہ قربانیاں بھی رائگاں جا رہی تھیں۔ شہر کے سارے موسم کی سختیوں رجبر کو کچھ دیر کو بھلانے کے لیے لوگ پارک کا خ کرتے اور یہاں انھیں وہ سکون ملتا جس کا ن کے پاس اب صرف تصور ہی باقی رہ گیا تھا۔ ہ یہاں آکر اپنے آپ کو جیسے مجسمے کو سونپ یتے، بدلے میں مجسمہ انھیں سکون اور خوشی طا فرماتا۔ یہ چیز انھیں کہاں مل سکتی تھی۔

اُن کے اپنے گھروں میں تو بھوتوں نے بضہ کر رکھا تھا جنھوں نے بڑے جابرانہ انداز ں اُن کی خوشیوں اور سکون کو غارت کر رکھا ھا اور گویا انھیں اپنا غلام بنا ڈالا تھا، وہ وجیسے اپنے بھوتوں کی اجازت سے ہی پنے گھروں میں رہتے۔ اُن کی اجازت سے ہنستے، ان کی مرضی سے روتے، اُن کے اشارے پر اُٹھتے یٹھتے۔ اُن کی محنت تک اُن کے قبضے میں تھی۔ ہ جو کچھ کما کر لاتے، بھوت اُن پر قبضہ کر لیتے ور پھر اپنی مرضی سے انھیں جینے کی اجازت یتے۔ کیسی کٹھن زندگی تھی، نہ جینا اپنی مرضی سے، نہ مرنا اپنی مرضی سے۔

بھوتوں نے اُن کے اندر خوف و ہراس کی لہریں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھیں۔ اب تو انھیں اپنے سائے سے بھی ڈر لگتا، وہ اپنے پرائے سے ملتے تو اُن کی آنکھوں میں شک و شبہے کے ڈورے ناچتے رہتے۔ وہ اپنی بات — اپنے دل کی بات دوسروں سے کہتے ہوئے ڈرتے، وہ اپنے بچوں کو گھر سے باہر بھیجتے ہوئے بے حد خوف زدہ ہوتے اور انھیں جلد سے جلد گھر واپس آجانے کی ہدایت کرتے۔ ان کے بچوں کے چہرے بھی اداس رہتے اور وہ کھیل کود میں مصروف ہونے کی جگہ اپنے والدین کی فکروں میں پورے طور پر شریک رہتے۔ ایسے ماحول میں، اپنے گھروں میں خود اُن کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں بچی تھی۔ وہ ہر وقت اپنے گھروں سے بھاگنے کی کوشش میں لگے رہتے لیکن بھاگ کر جاتے بھی کہاں —؟

پارک اور اُس میں نصب مہربان مجسمہ اُن کی نجات کا سب سے بڑا مرکز تھا جہاں وہ کھلے آسمان، چمکتی دھوپ اور بہتی ہوئی ہواؤں میں، نرم نرم گھاس پر لیٹ کر اپنے سارے ڈر بھول جاتے، اُن کے بچے مجسمے کے کاندھوں، ٹانگوں، گردن اور سر سے یوں کھیلتے رہتے جیسے وہ اُن کے خاندان کا ایک بہت ہی شفیق، مہربان بزرگ ہو، وقت یوں دھیرے سے اُن کے پاس سے نکل جاتا کہ انھیں کانوں کان خبر نہ ہوتی اور جب وہ اونگھتے سایوں سے گھبرا کر اُٹھتے تب انھیں پتا چلتا کہ وہ تو انھیں چھوڑ کر بہت آگے نکل گیا۔

اچانک وہ ہو گیا جس کے بارے میں انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا، سوچنا تو بہت قبل تیاگ چکے تھے، پھر بھی یہ چیز ایک محاورے کے طور پر اُن کے پاس اب بھی موجود تھی جس سے وہ دل بہلا لیا کرتے۔

کیا ہوا تھا —؟

پارک کے آس پاس اور سارے شہر میں ایک ہل چل مچی تھی۔ پارک کا دروازہ بند تھا اور وہاں پر پولیس کا زبردست پہرا لگا تھا، لیکن پولیس والوں کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ انھیں بھی حفاظت کی ضرورت ہے۔ خوف و ہراس کی فضائیں چاروں طرف منڈلا رہی تھیں۔ جو لوگ گھروں کے اندر تھے، وہ اپنے جسم کے اندر کسی محفوظ گوشے کی تلاش میں تھے، جو گھر کے باہر تھے، وہ اپنے گھروں کے اندر گوشۂ عافیت کے تصور میں لرزاں تھے اور جو کہیں نہیں تھے، وہ کہیں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ نہ جانے کیا ہوا تھا —؟

بس یہ کہ کسی نے یہ بات ہوا میں اچھال دی تھی کہ ساکت و جامد مجسمے میں تھوڑی دیر کے لیے جان پڑ گئی، اُس کا ہمیشہ سے نیچے گرا ہوا ہاتھ ذرا دیر کے لیے اوپر اُٹھا، اُس کی بے جان اور بے نور آنکھوں میں چمک آئی، اُس کے ٹھہرے ہوئے قدموں میں ایک ذرا سی جنبش پیدا ہوئی اور اُس کی اکڑی ہوئی گردن میں ایک خم سا پیدا ہوا — ویسے کسی نے اُس کی ان حرکات و سکنات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا، کانوں سے دیکھا تھا اور یہ بات اس قدر پھیل گئی کہ کسی کو اس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

لوگ اپنے اپنے اندر بیٹھے اُن اوقات کو یاد کرتے جب مجسمے کے ہاتھوں اور کندھے پر اُن کے پیارے بچے دھما چوکڑی مچاتے — اگر وہ ہاتھ حرکت میں آجاتے تب —؟

اُن کے بچے مجسمے کی ٹانگوں سے لپٹے رہتے، اُسے سیڑھی کے طور پر استعمال کر کے بہت خوش ہوتے۔ اگر وہ ٹانگیں ذرا ہل جائیں تب —؟

مجسمہ صرف اس لیے انھیں عزیز نہیں تھا کہ اُن کے بچے اُس کے ساتھ کھیل کر بہت خوش ہوتے بلکہ اُس کی سرپرستی اور شفیق موجودگی میں، وہ بھی اپنے لیے راحت اور سکون خریدتے۔

مجسمہ اُن کی زندگی سے نکل جاتا تو بھی اُن کی زندگی میں کچھ بچتا ہی نہیں، اُن کے اندر اور باہر کی زندگیوں کا وہ ایک اٹوٹ حصّہ بن چکا تھا، ایسا حصّہ جس کے بغیر اُن کی زندگی نامکمل تھی ــــ

بات یہ ہے کہ جس مجسّمہ سے اُن کا رشتہ تھا، اُس کے ہاتھ پیر بے حس تھے، آنکھیں بے نور تھیں، اور پیر ساکت تھے، اُن کے دِلوں میں بسے ہوئے بُت کو توڑنے کی کوشش کی گئی تھی جس سے اُن کی جڑیں ہِل گئی تھیں اور جب جڑیں ہل رہی ہوں تو اپنے آپ پر کیوں کر قابو پایا جاسکتا ہے ــــ

اس وقت تمام لوگ دو گروہ میں منقسم ہوگئے۔ ایک کا کہنا تھا کہ جب اس واقعے کا کوئی چشم دید گواہ موجود نہیں تو پھر اس کی صداقت پر کیسے ایمان لایا جائے، جب کہ دوسرے کا خیال تھا کہ جہاں پر سو فی صد جھوٹ ہو وہاں ایک فی صد سچ کی آمیزش ضرور ہوتی ہے، آج تک دُنیا کے کسی مجسّمے کے بارے میں نہیں کہا گیا کہ اُس میں حرکت پیدا ہوگئی ہے، پھر آخر صرف اسی کے بارے میں ایسی بات کیوں اور کیسے اُٹھی ــــ؟

جب کسی چیز کے بارے میں اک ذرا سا شبہ ہوجائے تو اُس کی تصویر پر ایک ہلکی سی گرد آ ہی جاتی ہے۔ جو لوگ پہلے یقین و گمان کے درمیان تھے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ اس کے قائل ہوتے گئے کہ جھوٹ کبھی سو فی صد نہیں ہوتا، اُن کے یقین کے تنزل کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ جو کچھ انھوں نے یقین کیا، اُس پر عمل نہیں کیا، اُن کا یقین خود ہی سو فی صد کی سطح تک نہیں آسکا۔ اگر وہ آنکھوں کی گواہی کے متلاشی تھے تو انھیں مجسّمے کے پاس جانا چاہیے تھا، اس سے اپنے پُرانے رشتے کو برقرار رکھنا چاہیے تھا ــــ یوں بھی مجسّمے نے اُن کا کچھ بگاڑا تھا نہ اپنی حرکت سے کچھ بگاڑنے کا ارادہ کیا تھا۔

اس افواہ نے اُن کی زندگیوں پر بڑا دور رس اثر مرتّب کیا۔

وہ جو پہلے اپنے گھروں سے بھاگتے اور مجسّمہ کے سائے میں پناہ لیتے تھے، اب اُس سے بھاگ کر گھروں کی طرف آنے لگے۔

گھروں پر اُن کے اعتماد آہستہ آہستہ مضبوط ہونے شروع ہوئے۔

گھروں پر اُن کی توجّہ مبذول ہوئی تو اُن کے جالے بھی صاف ہوئے۔

اُن کی اکھڑی اکھڑی رنگت پر ایک نکھار آیا، اُن میں قہقہے گونجے اور اُن کی زندگیاں واپس ہوئیں۔

انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک طویل سفر طے کر کے واپس آئے ہیں، اس سفر نے انھیں بہت زیادہ تھکا دیا تھا۔

واپسی نے انھیں بتایا کہ گھر بھی رہنے کی جگہیں ہیں۔

مجسّمے سے بظاہر دھیرے دھیرے اُن کا رشتہ منقطع ہوتا گیا لیکن اُس کی یاد اُن کے دِلوں میں گھر کرتی رہی ــــ ایسی یاد جس میں اُس کے ہاتھ پیر تھے، اُس کی شفیق مُسکراہٹ تھی، اُس کی مہربان آنکھیں تھیں، اُس کا پُر سکون سایہ تھا۔

یہی وہ مجسّمہ تھا جس سے اُن کا بہت ہی گہرا رشتہ تھا۔

اور یہ رشتہ ہمیشہ رہنے والا تھا۔

▷▷

ولانا آزاد اور دعوت اصلاح

ہلال کی روشنی میں

محمد طارق صدری سلفی

شاہ پور بگھونی، سمستی پور ۸۴۸۱۳۱ (بہار)

ٹر طہٰ حسین لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت ان کی ں صحافت تھی جسے خود انھوں نے ایجاد کیا ا اور جو انھی کے ساتھ ختم ہوگئی"۔[1]

اس سے ملتی جلتی ایک تحریر نیاز فتحپوری بھی ملتی ہے:

"مولانا آزاد نے 'الہلال' جاری کیا اور ں شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا ذر ہمارے ذہن سے محو ہوگیا اور ہم سوچنے ، کہ کیا یہ آواز ہماری ہی دُنیا کے کسی انسان ہے، کیا یہ زبان ہمارے ہی ابنائے جنس میں سی فرد کی زبان ہے"۔[2]

یقیناً مولانا ماہر علوم و فنون، روشن فکر ر آتش مزاج صحافی تھے۔ ان کی شخصیت ا صفت سے متصف نہ تھی بلکہ ان کی شخصیت ں اوصاف و محاسن کا مجموعہ تھی۔ اتنے بڑے لم تھے کہ "امام الہند" کے لقب سے نوازے ے، تقریر و خطابت میں اتنا نام پیدا کیا کہ بوالکلام" کہلائے، سیاست کی وادی میں رم رکھا تو بہترین قائد ثابت ہوئے اور "آزاد" ے نام سے شہرت پائی۔

مولانا نے اُردو زبان و ادب کو "صحافت" ے ذریعے اسالیب عطا کیے ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے، یہ جواہر پارے رہتی دنیا تک تمام انسانیت کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گے اور ان کی روشنی بے شمار افراد کے دماغوں کو جلا بخشتی رہے گی۔ انھوں نے ہندستانی قوم کے افراد کو نئی راہوں سے روشناس کرایا، تاریک راستوں میں عزم و عمل کی شمعیں روشن کیں۔ لوگ انھیں "امام الہند" کہتے تھے مگر بقول عرش ملسیانی وہ درحقیقت "امام انسانیت" تھے۔ انھوں نے اپنی زبان، اپنے قلم اور اپنے عمل سے ہمیں بھائی چارے کا درس دیا۔ ہموطنوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا، اپنی خطیبانہ قوت سے لوگوں میں آزادی کی روح پھونکی۔ خود فرماتے ہیں:

"آہ! کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا اس ایک صدائے رعدِ غفلت شکن سے سرگشتگانِ خوابِ ذلّت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو! کیوں کہ بہت سو چکے اور بیدار ہو، کیوں کہ تمھارا خدا تمھیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو، پر اس کی نہیں سنتے، جو تمھیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلّت کی جگہ عزّت بخشتا ہے"۔[3]

صحافت کی وادی میں انھوں نے تجارت کی غرض سے قدم نہیں رکھا تھا۔ بلکہ اس کے ذریعے باطل اوہام کو دُور کرنے کا ایک جامع منصوبہ بنایا تھا جو "الہلال" کی صورت میں نمودار ہوا، ایک نئی روشن صبح کا آغاز کیا تھا، ان کے اس نقطۂ نظر کی نشاندہی خود ان کے الفاظ میں یوں ہوتی ہے:

"ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں، بلکہ تلاشِ زیاں و نقصان میں آئے ہیں، صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں، عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں"۔[4]

ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ صحافت سے ان کا مقصد تجارت اور منفعت نہیں ہے بلکہ تحریک اور دعوت ہے، قوم خفتہ کو بیدار کرنا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بلاشبہ میں نے پریس کھولا اور یقیناً میں نے ایک رسالہ جاری کیا، لیکن یہ صرف اس لیے کیا کہ اظہارِ خیال اور تبلیغ مقصد کا اس سے بہتر اور زود عمل طریق اور کوئی نہ تھا۔ اور میرے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ میں مفت چھاپ کر تقسیم کیا کرتا۔ بس میرے تمام کاموں کی بنیاد تبلیغ ہے نہ کہ تجارت، میری اخبار نویسی کو تم اخبار نویسی نہ قرار دو، کیونکہ میں نے اسے ضمناً اختیار کیا ہے اور وہ میرا اصل کام نہیں ہے"۔[5]

مجسمہ اُن کی زندگی سے نکل جاتا تو بھی اُن کی زندگی میں کچھ بچتا ہی نہیں، اُن کے اندر اور باہر کی زندگیوں کا وہ ایک اٹوٹ حصّہ بن چکا تھا، ایسا حصّہ جس کے بغیر اُن کی زندگی نامکمل تھی ——

بات یہ ہے کہ جس مجسّمہ سے اُن کا رشتہ تھا، اُس کے ہاتھ پیر بے حس تھے، آنکھیں بے نور تھیں، اور پیر ساکت تھے، اُن کے دلوں میں بسے ہوئے بُت کو توڑنے کی کوشش کی گئی تھی جس سے اُن کی جڑیں ہل گئی تھیں اور جب جڑیں ہل رہی ہوتی ہوں تو اپنے آپ پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے ——

اس وقت تمام لوگ دو گروہ میں منقسم ہوگئے۔ ایک کا کہنا تھا کہ جب اس واقعے کا کوئی چشم دید گواہ موجود نہیں تو پھر اس کی صداقت پر کیسے ایمان لایا جائے، جب کہ دوسرے کا خیال تھا کہ جہاں پر سو فی صد جھوٹ ہو وہاں ایک فی صد سچ کی آمیزش ضرور ہوتی ہے، آج تک دُنیا کے کسی مجسمے کے بارے میں نہیں کہا گیا کہ اُس میں حرکت پیدا ہوگئی ہے، پھر آخر صرف اسی کے بارے میں ایسی بات کیوں اور کیسے اُٹھی —— ؟

جب کسی چیز کے بارے میں اک ذرا سا شبہ ہو جائے تو اُس کی تصویر پر ایک ہلکی سی گرد آ ہی جاتی ہے۔ جو لوگ پہلے یقین و گمان کے درمیان تھے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ اس کے قائل ہوتے گئے کہ جھوٹ کبھی سو فی صد نہیں ہوتا، اُن کے یقین کے تنزل کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ جو کچھ انھوں نے یقین کیا، اُس پر عمل نہیں کیا، اُن کا یقین خود ہی سو فی صد کی سطح تک نہیں آسکا۔ اگر وہ آنکھوں کی گواہی

کے متلاشی تھے تو انھیں مجسمے کے پاس جانا چاہیے تھا، اس سے اپنے پرانے رشتے کو برقرار رکھنا چاہیے تھا —— یوں بھی مجسّمے نے اُن کا کچھ بگاڑا تھا نہ اپنی حرکت سے کچھ بگاڑنے کا ارادہ کیا تھا۔

اس افواہ نے اُن کی زندگیوں پر بڑا دور رس اثر مرتّب کیا۔

وہ جو پہلے اپنے گھروں سے بھاگتے اور مجسّمہ کے سائے میں پناہ لیتے تھے، اب اس سے بھاگ کر گھروں کی طرف آنے لگے۔ گھروں پر اُن کے اعتماد آہستہ آہستہ مضبوط ہونے شروع ہوئے۔

گھروں پر اُن کی توجّہ مبذول ہوئی تو اُن کے جالے بھی صاف ہوئے۔

اُن کی اکھڑی اکھڑی رنگت پر ایک نکھار آیا، اُن میں قہقہے گونجے اور اُن کی زندگیاں

واپس ہوئیں۔

انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک طویل سفر طے کرکے واپس آئے ہیں، اس سفر نے انھیں بہت زیادہ تھکا دیا تھا۔

واپسی نے انھیں بتایا کہ گھر بھی رہنے کی جگہیں ہیں۔

مجسّمے سے بظاہر دھیرے دھیرے اُن کا رشتہ منقطع ہوتا گیا لیکن اُس کی یاد اُن کے دلوں میں گھر کرتی رہی —— ایسی یاد جس میں اُس کے ہاتھ پیر تھے، اُس کی شفیق مسکراہٹ تھی، اُس کی مہربان آنکھیں تھیں اور سکون سایہ تھا۔

یہی وہ مجسّمہ تھا جس سے اُ
ہی گہرا رشتہ تھا۔

اور یہ رشتہ ہمیشہ رہنے و

مولانا آزاد اور دعوت اصلاح

الہلال کی روشنی میں

محمد طارق صدری سلفی

شاہ پور بگھونی، سمستی پور ۸۴۸۱۳۱ (بہار)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت ان کی اپنی صحافت تھی جسے خود انھوں نے ایجاد کیا تھا اور جو انھی کے ساتھ ختم ہو گئی۔"[1]

اس سے ملتی جلتی ایک تحریر نیاز فتح پوری کی بھی ملتی ہے:

"مولانا آزاد نے 'الہلال' جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا تصوّر ہمارے ذہن سے محو ہو گیا اور ہم سوچنے لگے کہ کیا یہ آواز ہماری ہی دُنیا کے کسی انسان کی ہے، کیا یہ زبان ہمارے ہی ابنائے جنس میں سے کسی فرد کی زبان ہے۔"[2]

یقیناً مولانا ماہر علوم و فنون، روشن فکر اور آتش مزاج صحافی تھے۔ ان کی شخصیت ایک صفت سے متصف نہ تھی بلکہ ان کی شخصیت کئی اوصاف و محاسن کا مجموعہ تھی۔ اتنے بڑے عالم تھے کہ "امام الہند" کے لقب سے نوازے گئے، تقریر و خطابت میں اتنا نام پیدا کیا کہ "ابوالکلام" کہلائے، سیاست کی وادی میں قدم رکھا تو بہترین قائد ثابت ہوئے اور "آزاد" کے نام سے شہرت پائی۔

مولانا نے اُردو زبان و ادب کو "صحافت" کے ذریعے اسالیب عطا کیے ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے، یہ جواہر پارے رہتی دنیا تک تمام انسانیت کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گے اور ان کی روشنی بے شمار افراد کے دماغوں کو جلا بخشتی رہے گی۔ انھوں نے ہندستانی قوم کے افراد کو نئی راہوں سے روشناس کرایا، تاریک رستوں میں عزم و عمل کی شمعیں روشن کیں۔ لوگ انھیں "امام الہند" کہتے تھے مگر بقول عرشی ملسیانی وہ درحقیقت "امام انسانیت" تھے۔ انھوں نے اپنی زبان، اپنے قلم اور اپنے عمل سے ہمیں بھائی چارے کا درس دیا۔ ہموطنوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا، اپنی خطیبانہ قوت سے لوگوں میں آزادی کی روح پھونکی۔ خود فرماتے ہیں:

"آہ! کاش مجھے وہ صورِ قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا اس ایک صدائے رعدِ غفلت شکن سے سرگشتگانِ خوابِ ذلّت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو! کیوں کہ بہت سو چکے اور بیدار ہو، کیوں کہ تمھارا خدا تمھیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو، پر اس کی نہیں سنتے، جو تمھیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلّت کی جگہ عزّت بخشتا ہے۔"[3]

صحافت کی وادی میں انھوں نے تجارت کی غرض سے قدم نہیں رکھا تھا۔ بلکہ اس کے ذریعے باطل اوہام کو دُور کرنے کا ایک جامع منصوبہ بنایا تھا جو "الہلال" کی صورت میں نمودار ہوا، ایک نئی روشن صبح کا آغاز کیا تھا، ان کے اس نقطۂ نظر کی نشاندہی خود ان کے الفاظ میں یوں ہوتی ہے:

"ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں، بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں، عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔"[4]

ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ صحافت کا مقصد تجارت اور منفعت نہیں ہے بلکہ خدمت اور دعوت ہے، قوم خفتہ کو بیدار کرنا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بلاشبہ میں نے پریس کھولا، یقیناً میں نے ایک رسالہ جاری کیا، لیکن اس لیے کیا کہ اظہارِ خیال اور تبلیغ مقاصد کا اس سے بہتر اور زود عمل طریق اور کوئی نہ تھا اور میرے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ میں چھاپ کر تقسیم کیا کرتا۔ بس میرے تمام کاموں کی بنیاد تبلیغ ہے نہ کہ تجارت، میری اخبار نویسی کو تم اخبار نویسی نہ قرار دو، کیونکہ میں نے اسے ضمناً اختیار کیا ہے اور وہ میرا اصل کام نہیں ہے۔"[5]

مجسمہ اُن کی زندگی سے نکل جاتا تو بھی اُن کی زندگی میں کچھ بچتا ہی نہیں، اُن کے اندر اور باہر کی زندگیوں کا وہ ایک اٹوٹ حصہ بن چکا تھا، ایسا حصہ جس کے بغیر اُن کی زندگی نامکمل تھی ——

بات یہ ہے کہ جس مجسمہ سے اُن کا رشتہ تھا، اُس کے ہاتھ پیر بے حس تھے، آنکھیں بے نور تھیں، اور پیر ساکت تھے، اُن کے دلوں میں بسے ہوئے بُت کو توڑنے کی کوشش کی گئی تھی جس سے اُن کی جڑیں ہل گئی تھیں اور جب جڑیں ہل رہی ہوں تو اپنے آپ پر کیوں کر قابو پایا جا سکتا ہے ——

اس وقت تمام لوگ دو گروہ میں منقسم ہوگئے۔ ایک کا کہنا تھا کہ جب اس واقعے کا کوئی چشم دید گواہ موجود نہیں تو پھر اس کی صداقت پر کیسے ایمان لایا جائے، جب کہ دوسرے کا خیال تھا کہ جہاں پر سو فی صد جھوٹ ہو وہاں ایک فی صد سچ کی آمیزش ضرور ہوتی ہے، آج تک دُنیا کے کسی مجسمے کے بارے میں نہیں کہا گیا کہ اُس میں حرکت پیدا ہوگئی ہے، پھر آخر صرف اسی کے بارے میں ایسی بات کیوں اور کیسے اٹھی —— ؟

جب کسی چیز کے بارے میں اک ذرا سا شبہ ہو جائے تو اُس کی تصویر پر ایک ہلکی سی گرد آ ہی جاتی ہے۔ جو لوگ پہلے یقین و گمان کے درمیان تھے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ اس کے قائل ہوتے گئے کہ جھوٹ کبھی سو فی صد نہیں ہوتا، اُن کے یقین کے تنزل کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ جو کچھ انھوں نے یقین کیا، اُس پر عمل نہیں کیا، اُن کا یقین خود ہی سو فی صد کی سطح تک نہیں آ سکا۔ اگر وہ آنکھوں کی گواہی کے متلاشی تھے تو انھیں مجسمے کے پاس جانا چاہیے تھا، اس سے اپنے پُرانے رشتے کو برقرار رکھنا چاہیے تھا —— یوں بھی مجسمے نے اُن کا کچھ بگاڑا تھا نہ اپنی حرکت سے کچھ بگاڑنے کا ارادہ کیا تھا۔

اس افواہ نے اُن کی زندگیوں پر بڑا دور رس اثر مرتب کیا۔

وہ جو پہلے اپنے گھروں سے بھاگتے اور مجسمہ کے سائے میں پناہ لیتے تھے، اب اُس سے بھاگ کر گھروں کی طرف آنے لگے۔

گھروں پر اُن کے اعتماد آہستہ آہستہ مضبوط ہونے شروع ہوئے۔

گھروں پر اُن کی توجہ مبذول ہوئی تو اُن کے جالے بھی صاف ہوئے۔

اُن کی اکھڑی اکھڑی رنگت پر ایک نکھار آیا، اُن میں قہقہے گونجے اور اُن کی زندگیاں واپس ہوئیں۔

انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک طو سفر طے کر کے واپس آئے ہیں، اس سفر نے انھ بہت زیادہ تھکا دیا تھا۔

واپسی نے انھیں بتایا کہ گھر بھی ر کی جگہیں ہیں۔

مجسمے سے بظاہر دھیرے دھیرے کا رشتہ منقطع ہوتا گیا لیکن اُس کی یاد اُن دلوں میں گھر کرتی رہی —— ایسی یاد جس اُس کے ہاتھ پیر تھے، اُس کی شفیق مسکرا تھی، اُس کی مہربان آنکھیں تھیں، اُس سکون سایہ تھا۔

یہی وہ مجسمہ تھا جس سے اُن کا ہی گہرا رشتہ تھا۔

اور یہ رشتہ ہمیشہ رہنے والا تھا

مولانا آزاد اور دعوت اصلاح

الہلال کی روشنی میں

محمد طارق صدری
شاہ پور بگھونی، سمستی پور ۸۴۸۱۰۱

ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت ان کی اپنی صحافت تھی جسے خود انھوں نے ایجاد کیا تھا اور جو انھی کے ساتھ ختم ہوگئی۔"[1]

اس سے ملتی جلتی ایک تحریر نیاز فتحپوری کی بھی ملتی ہے:

"مولانا آزاد نے 'الہلال' جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا تصور ہمارے ذہن سے محو ہوگیا اور ہم سوچنے لگے کہ کیا یہ آواز ہماری ہی دُنیا کے کسی انسان کی ہے، کیا یہ زبان ہمارے ہی ابنائے جنس میں سے کسی فرد کی زبان ہے۔"[2]

یقیناً مولانا ماہر علوم و فنون، روشن فکر اور آتش مزاج صحافی تھے۔ ان کی شخصیت ایک صفت سے متصف نہ تھی بلکہ ان کی شخصیت کئی اوصاف و محاسن کا مجموعہ تھی۔ اتنے بڑے عالم تھے کہ "امام الہند" کے لقب سے نوازے گئے، تقریر و خطابت میں اتنا نام پیدا کیا کہ "ابوالکلام" کہلائے، سیاست کی وادی میں قدم رکھا تو بہترین قائد ثابت ہوئے اور "آزاد" کے نام سے شہرت پائی۔

مولانا نے اُردو زبان و ادب کو "صحافت" کے ذریعے اسالیب عطا کیے ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے، یہ جواہر پارے رہتی دنیا تک تمام انسانیت کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گے اور ان کی روشنی بے شمار افراد کے دماغوں کو جلا بخشتی رہے گی۔ انھوں نے ہندستانی قوم کے افراد کو نئی راہوں سے روشناس کرایا، تاریک راستوں میں عزم و عمل کی شمعیں روشن کیں۔ لوگ انھیں "امام الہند" کہتے تھے مگر بقول عرش ملسیانی وہ درحقیقت "امام انسانیت" تھے۔ انھوں نے اپنی زبان، اپنے قلم اور اپنے عمل سے ہمیں بھائی چارے کا درس دیا۔ ہموطنوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا، اپنی خطیبانہ قوت سے لوگوں میں آزادی کی روح پھونکی۔ خود فرماتے ہیں:

"آہ! کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا اس ایک صدائے رعد غفلت شکن سے سرگشتگانِ خواب ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو! کیوں کہ بہت سوچکے اور بیدار ہو، کیوں کہ تمہارا خدا تمھیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو، پر اس کی نہیں سنتے، جو تمھیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشتا ہے۔"[3]

صحافت کی وادی میں انھوں نے تجارت کی غرض سے قدم نہیں رکھا تھا۔ بلکہ اس کے ذریعے باطل اوہام کو دُور کرنے کا ایک منصوبہ بنایا تھا جو "الہلال" کی صورت م ہوا، ایک نئی روشن صبح کا آغاز کیا تھا، اس نقطۂ نظر کی نشاندہی خود ان کے الف یوں ہوتی ہے:

"ہم اس بازار میں سودائے نف لیے نہیں، بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آ صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دش طلبگار ہیں، عیش کے پھول نہیں بلکہ خل اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔"[4]

ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ صحافت مقصد تجارت اور منفعت نہیں ہے بلکہ ت اور دعوت ہے، قوم خفتہ کو بیدار کر لکھتے ہیں:

"بلاشبہ میں نے پریس کھو یقیناً میں نے ایک رسالہ جاری کیا، لیکر اس لیے کیا کہ اظہار خیال اور تبلیغ مق اس سے بہتر اور زود عمل طریق اور کو اور میرے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ میں چھاپ کر تقسیم کیا کرتا۔ بس میرے تمام کی بنیاد تبلیغ ہے نہ کہ تجارت، میری اخبا کو تم اخبار نویسی نہ قرار دو، کیونکہ میں ضمناً اختیار کیا ہے اور وہ میرا اصل کا ہے۔"[5]

مجسّمہ اُن کی زندگی سے نکل جاتا تو بھی اُن کی زندگی میں کچھ بچتا ہی نہیں، اُن کے اندر اور باہر کی زندگیوں کا وہ ایک اٹوٹ حصّہ بن چکا تھا، ایسا حصّہ جس کے بغیر اُن کی زندگی نامکمل تھی ــــــ

بات یہ ہے کہ جس مجسّمہ سے اُن کا رشتہ تھا، اُس کے ہاتھ پیر بے حس تھے، آنکھیں بے نور تھیں، اور پیر ساکت تھے، اُن کے دِلوں میں بسے ہوئے بُت کو توڑنے کی کوشش کی گئی تھی جس سے اُن کی جڑیں ہِل گئی تھیں اور جب جڑیں ہِل رہی ہوں تو اپنے آپ پر کیوں کر قابو پایا جاسکتا ہے ــــــ

اس وقت تمام لوگ دو گروہ میں منقسم ہوگئے۔ ایک کا کہنا تھا کہ جب اس واقعے کا کوئی چشم دید گواہ موجود نہیں تو پھر اس کی صداقت پر کیسے ایمان لایا جائے، جبکہ دوسرے کا خیال تھا کہ جہاں پر سو فی صد جھوٹ ہو وہاں ایک فی صد سچ کی آمیزش ضرور ہوتی ہے، آج تک دُنیا کے کسی مجسمے کے بارے میں نہیں کہا گیا کہ اُس میں حرکت پیدا ہوگئی ہے، پھر آخر صرف اسی کے بارے میں ایسی بات کیوں اور کیسے اٹھی ــــــ؟

جب کسی چیز کے بارے میں اک ذرا سا شبہ ہوجائے تو اُس کی تصویر پر ایک ہلکی سی گرد آ ہی جاتی ہے۔ جو لوگ پہلے یقین و گمان کے درمیان تھے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ اس کے قائل ہوتے گئے کہ جھوٹ کبھی سو فی صد نہیں ہوتا، اُن کے یقین کے تنزل کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ جو کچھ انھوں نے یقین کیا، اُس پر عمل نہیں کیا، اُن کا یقین خود ہی سو فی صد کی سطح تک نہیں آسکا۔ اگر وہ آنکھوں کی گواہی کے متلاشی تھے تو انھیں مجسّمے کے پاس جانا چاہیے تھا، اس سے اپنے پُرانے رشتے کو برقرار رکھنا چاہیے تھا ــــــ یوں بھی مجسّمے نے اُن کا کچھ بگاڑا تھا نہ اپنی حرکت سے کچھ بگاڑنے کا ارادہ کیا تھا۔

اس افواہ نے اُن کی زندگیوں پر بڑا دور رس اثر مرتّب کیا۔

وہ جو پہلے اپنے گھروں سے بھاگتے اور مجسّمہ کے سائے میں پناہ لیتے تھے، اب اس سے بھاگ کر گھروں کی طرف آنے لگے۔

گھروں پر اُن کے اعتماد آہستہ آہستہ مضبوط ہونے شروع ہوئے۔

گھروں پر اُن کی توجّہ مبذول ہوئی تو اُن کے جالے بھی صاف ہوئے۔

اُن کی اکھڑی اکھڑی رنگت پر ایک نکھار آیا، اُن میں قہقہے گونجے اور اُن کی زندگیاں واپس ہوئیں۔

انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک طویل سفر طے کرکے واپس آئے ہیں، اس سفر نے انھیں بہت زیادہ تھکا دیا تھا۔

واپسی نے انھیں بتایا کہ گھر بھی رہنے کی جگہیں ہیں۔

مجسّمے سے بظاہر دھیرے دھیرے اُن کا رشتہ منقطع ہوتا گیا لیکن اُس کی یاد اُن کے دِلوں میں گھر کرتی رہی ــــــ ایسی یاد جس میں اُس کے ہاتھ پیر تھے، اُس کی شفیق مُسکراہٹ تھی، اُس کی مہربان آنکھیں تھیں، اُس کا ہر سکون سایہ تھا۔

یہی وہ مجسّمہ تھا جس سے اُن کا بہت ہی گہرا رشتہ تھا۔

اور یہ رشتہ ہمیشہ رہنے والا تھا۔

مولانا آزاد اور دعوت اصلاح

الہلال کی روشنی میں

محمد طارق صدری سلفی

شاہ پور بگھونی، سمستی پور ۸۴۸۱۳۱ (بہار)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں :

"مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت ان کی اپنی صحافت تھی جسے خود انھوں نے ایجاد کیا تھا اور جو انھی کے ساتھ ختم ہوگئی۔"[1]

اس سے ملتی جلتی ایک تحریر نیاز فتحپوری کی بھی ملتی ہے :

"مولانا آزاد نے 'الہلال' جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا تصوّر ہمارے ذہن سے محو ہوگیا اور ہم سوچنے لگے کہ کیا یہ آواز ہماری ہی دُنیا کے کسی انسان کی ہے، کیا یہ زبان ہمارے ہی ابنائے جنس میں سے کسی فرد کی زبان ہے۔"[2]

یقیناً مولانا ماہرِ علوم و فنون، روشن فکر اور آتش مزاج صحافی تھے۔ ان کی شخصیت ایک صفت سے متصف نہ تھی بلکہ ان کی شخصیت کئی اوصاف و محاسن کا مجموعہ تھی۔ اتنے بڑے عالم تھے کہ "امام الہند" کے لقب سے نوازے گئے، تقریر و خطابت میں اتنا نام پیدا کیا کہ "ابوالکلام" کہلائے، سیاست کی وادی میں قدم رکھا تو بہترین قائد ثابت ہوئے اور "آزاد" کے نام سے شہرت پائی۔

مولانا نے اُردو زبان و ادب کو "صحافت" کے ذریعے اسالیب عطا کیے ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے، یہ جواہر پارے رہتی دنیا تک تمام انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے اور ان کی روشنی بے شمار افراد کے دماغوں کو جلا بخشتی رہے گی۔ انھوں نے ہندستانی قوم کے افراد کو نئی راہوں سے روشناس کرایا، تاریک راستوں میں عزم و عمل کی شمعیں روشن کیں۔ لوگ انھیں "امام الہند" کہتے تھے مگر بقول عرش ملسیانی وہ درحقیقت "امام انسانیت" تھے۔ انھوں نے اپنی زبان، اپنے قلم اور اپنے عمل سے ہمیں بھائی چارے کا درس دیا۔ ہموطنوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا، اپنی خطیبانہ قوّت سے لوگوں میں آزادی کی روح پھونکی۔ خود فرماتے ہیں :

"آہ! کاش مجھے وہ صورِ قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا اس ایک صدائے رعدِ غفلت شکن سے سرگشتگانِ خوابِ ذلّت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو! کیوں کہ بہت سوچکے اور بیدار ہو، کیوں کہ تمھارا خدا تمھیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو، پر اس کی نہیں سنتے، جو تمھیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلّت کی جگہ عزّت بخشتا ہے۔"[3]

صحافت کی وادی میں انھوں نے تجارت کی غرض سے قدم نہیں رکھا تھا۔ بلکہ اس کے ذریعے باطل اوہام کو دُور کرنے کا ایک جامع منصوبہ بنایا تھا جو "الہلال" کی صورت میں نمودار ہوا، ایک نئی روشن صبح کا آغاز کیا تھا، ان کے اس نقطۂ نظر کی نشاندہی خود ان کے الفاظ میں یوں ہوتی ہے :

"ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں، بلکہ تلاشِ زیاں و نقصان میں آئے ہیں، صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں، عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔"[4]

ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ صحافت سے ان کا مقصد تجارت اور منفعت نہیں ہے بلکہ تحریک اور دعوت ہے، قوم خفتہ کو بیدار کرنا ہے۔ لکھتے ہیں :

"بلاشبہ میں نے پریس کھولا اور یقیناً میں نے ایک رسالہ جاری کیا، لیکن یہ صرف اس لیے کیا کہ اظہارِ خیال اور تبلیغ مقصد کا اس سے بہتر اور زود عمل طریق اور کوئی نہ تھا۔ اور میرے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ میں مفت چھاپ کر تقسیم کیا کرتا۔ بس میرے تمام کاموں کی بنیاد تبلیغ ہے نہ کہ تجارت، میری اخبار نویسی کو تم اخبار نویسی نہ قرار دو، کیونکہ میں نے اسے ضمناً اختیار کیا ہے اور وہ میرا اصل کام نہیں ہے۔"[5]

"الہلال" میں مولانا نے مسلمانوں کو ایک نئے انداز سے مخاطب کیا، صرف ان کے خیالات اور نقطۂ نظر میں ہی جدت نہ تھی بلکہ ان کی تحریروں کا رنگ بھی نیا تھا، ان کا اسلوب بیان دل کی گہرائیوں میں اتر کر اثر کرنے والا تھا۔ "الہلال" مسلمانوں میں مذہبی انقلاب کا داعی تھا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ بھی باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے ہم وطن ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر مغربی سامراج کو شکست دیں اور سارے مشرق کی آزادی کے لیے فضا ہموار کریں ——— نہرو جی DISCOVERY OF INDIA میں لکھتے ہیں :

"مولانا نے اپنے ہفتہ وار 'الہلال' سے مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا، یہ ایک ایسا اندازِ خطاب تھا جس سے ہندستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔ وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجے سے واقف تھے سرسیّد، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی کے انداز بیان کے علاوہ ہوا کا کوئی گرم جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا۔ "الہلال" مسلمانوں کے کسی بھی مکتبِ خیال سے اتفاق نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ ایک نئی دعوت ـــ اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔"[6]

جب کوئی داعی اپنی دعوت لوگوں تک لے کر جاتا ہے تو آپسی اختلاف و افتراق راہوں میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اس لیے مولانا کا خیال تھا کہ اگر ملک کو آزاد کرانا ہے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد ہو کر ایک دوسرے کے دوش بدوش چلنا ہوگا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۱۲ء کے "الہلال" میں مولانا نے لکھا ہے :

"ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حبّ الوطنی ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے ایک فرضِ دینی ہے اور داخل "جہاد فی سبیل اللہ" اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور بند و استبدادِ غلامی توڑنے کے لیے کی جائے۔"[7]

بقول مالک رام :

"الہلال" ایک دعوت تھا جس کا مقصد اس دین الٰہی کی تجدید اور اس کے بنیادی اصول "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کو زندہ کرنا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی کوئی قابل اعتراض بات دیکھتے، بے باکانہ اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کر دیتے۔"[8]

"الہلال" کی مقبولیت صرف عوام میں نہیں تھی بلکہ اس کی دعوت سے بڑے بڑے عالم اور لیڈران وطن بھی متاثر ہوتے تھے۔ عرش ملسیانی رقمطراز ہیں :

"مولانا محمود الحسن نے کہا کہ مولانا آزاد نے صحیح راہ دکھادی ہے، مولانا محمد علی نے "الہلال" کو خوش آمدید کہا، حکیم اجمل خاں اور حسرت موہانی اس کے گرویدہ ہوئے، مولانا حسین احمد مدنی نے اس پر جان چھڑکی اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے تو اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ "الہلال" کو پڑھنے کے بعد جو چنگاری دل میں بھڑکی تھی اس نے زندگی بھر ایک تند و تیز شعلے کی طرح انھیں سرگرم عمل رکھا ہے۔"

"الہلال" صدائے حق جتنی مقبول ہوتی گئی ایوانِ استبداد اتنا ہی متزلزل ہوتا گیا۔ مولانا کی صحافت نے عوامی ذہن کی تربیت میں جو غیر معمولی کامیابی حاصل کی اس کا اصل سبب ان کا شفّاف نقطۂ نظر اور صالح نصب العین ہی تھا۔ انھوں نے کالی گھٹاؤں کے پیچھے چمکتے ہوئے سورج کو گویا دیکھ لیا تھا، ان کی صحافت سیاسی سرگرمی سے زیادہ ایمان کی گرمی پھیلا رہی تھی۔ انھوں نے اندازِ فکر اور طرزِ عمل کا سخت احتساب کرتے ہوئے معاشرتی گمراہیوں کی اصلاح کی کاوش بھی کی ـــ ان کی صحافت نے ملک و ملّت کو جو پیغام دیا اس پر آج بھی عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات :

1. آج کل (آزاد نمبر) ۱۹۵۸ء
2. ایضاً
3. الہلال، شمارہ نمبر ۱
4. ایضاً
5. بحوالہ ابوالکلام آزاد : شخصیت اور کارنامے، مرتبہ خلیق انجم
6. ایضاً
7. بحوالہ ایوانِ اُردو (آزاد نمبر)
8. آج کل (مولانا آزاد نمبر) ۱۹۸۸ء
9. ابوالکلام آزاد، مصنفہ عرش ملسیانی۔ △

نظمیں

جنگل جلنے والا ہے

ہوائیں...
دُور تک
سنسان رستوں پر
تمھیں آواز دیتی ہیں
سمندر اب...
کناروں پر نہیں آتے
میں اپنے جسم کے اندر
بکھرتی ریت کو...
کب تک سمیٹوں گا
یہ منظر اب نہیں رُکنے کے
جنگل جلنے والا ہے
تمھاری منتظر آنکھوں کا سورج
ڈھلنے والا ہے
مگر تم کیوں نہیں سنتے
ہوائیں کیوں تمھیں آواز دیتی ہیں

شاہد عزیز
۱۷۹، ملاح ٹولی، اودے پور ۳۱۳۰۰۱ (راجستھان)

محرومی

اس کی آواز کے سہارے ہی
اس کی جانب قدم بڑھایا تھا
دور کچھ دور تک سفر کے بعد
ایک نقطے پہ رُک گیا تھا میں
ایک دیوار راہ میں حائل
میں نے تیشے سے ڈھا دیا اس کو
میں مگر تھک کے ہو گیا تھا چور
میری پلکیں تھیں نیند سے بوجھل
آخرش نیند آگئی تھی مجھے
جب کُھلی آنکھ تو یہ دیکھا تھا
ایستادہ تھی پھر وہی دیوار
وہ کسی طرح مل سکا نہ مجھے
اس کو پانے کی کوششیں بے کار!

اظہر نیّر
۱۵۹، سی مارکیٹ، سیکٹر ۶، بھلائی نگر، درگ ۴۹۰۰۰۶ (ایم پی)

آج پھر

آج پھر — خواب نے
سبز پریوں کا قصّہ سنایا مجھے
آج پھر — نیند آنے سے پہلے
کوئی آگیا
آج پھر — کھڑکیوں کی سلاخیں پگھلنے لگیں
آج پھر — گرم پروائیاں
برف کے جسم پر
دھیرے دھیرے
پھلنے لگیں
آج پھر — سُرخ آنچل کے تاروں نے
آنکھوں کے بھٹکے خلاباز کے سامنے
اپنی موجودگی کا
جواز اک نیا رکھ دیا
آج پھر — زندگی نے مرے جسم کا
سرخ گاڑھا لہو
ڈھیر سارا پیا
آج پھر نیند آنے سے پہلے کوئی آگیا!!

تسلیم نیازی
آزاد فلور مل، نزد جہانگیری محلہ مسجد، جی. ٹی. روڈ، آسنسول ۷۱۳۳۰۲

بسیرا

شام بارک پوری
بیچر پیلس، کھلنا (بنگلہ دیش)

موسمِ بہار گزر چکا تھا۔ موسمِ گرما کی آمد آمد تھی۔ ایک پُرانے کھلیان میں بہت سی ابابیلیں رہتی تھیں۔ وہ سمندر پار سے وہاں بسیرا کرنے آئی تھیں۔ انھوں نے جہاں اپنے گھونسلے چھوڑے تھے، وہاں بڑے ہی چین کی زندگی گزار رہی تھیں۔ خوشنما انڈوں کی موجودگی اور پیارے پیارے بچّوں کے چہچہانے سے فضا میں موسیقی سی بکھری رہتی تھی۔ سارے علاقے میں چین اور سکون بکھرا ہوا تھا، مگر اچانک طوفان نے اس علاقے کو آگھیرا اور ایسی آندھی چلی کہ بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اکھڑ گئے۔ ان کے گھونسلے بھی پانی سے گیلے ہو کر نیچے گر گئے۔ خوشنما انڈے ٹوٹ پھوٹ گئے۔ کچھ بچّے مر گئے اور کچھ بچّے پانی سے بھیگ کر فریاد کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر ابابیلوں کے دل خون کے آنسو رونے لگے۔ ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ اجڑے ہوئے گھونسلوں کے گرد اڑتی رہیں اور اپنے مردہ بچّوں کی یاد میں "چوں چوں" کرتی رہیں۔ انھوں نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔ اپنا گھر، اپنے چھوٹے چھوٹے بچّے اور دوسرے علاقوں میں بکھرے ہوئے اپنے رشتے دار بھی، لیکن انھوں نے ہمّت نہ ہاری اور گرمیوں میں وہاں سے رختِ سفر باندھ کر دوسرے علاقے میں آباد ہونے چلی گئیں۔

یہاں ابابیلیں نئے حوصلے کے ساتھ گھونسلے بنانے میں مصروف ہوگئیں وہ دور دراز سے چُن چُن کر تنکے لائیں اور اپنا گھونسلا شاندار طریقے سے تیّار کرنے میں مصروف ہوگئیں۔ وہ اس کام میں دن رات ایک کیے ہوئے تھیں۔

آخر کار چوبیس دنوں کی انتھک محنت سے ان کا کام مکمّل ہوگیا۔ گھونسلوں کی دیواریں مضبوط ہوگئیں۔ اب بچّوں کے لیے گرم گرم بستر بنانے کے لیے صرف نرم پَروں کی ضرورت تھی۔

ابابیلیں اپنے کام سے اتنی خوش ہوئیں کہ انھیں ایک جشن منانے کا خیال آیا۔ مکھّیاں جو ان کا من بھاتا کھاجا تھیں، انھیں شکار کرنے کے لیے اڑ گئیں۔

جب وہ اپنے گھروں کو لوٹیں تو ایک موٹے سے باز کو دروازے سے اپنے گھروں میں جھانکتے دیکھا۔

"جناب! میں معافی چاہتا ہوں"۔ ابابیلوں کے سردار نے کہا "شاید آپ سے غلطی ہوئی، یہ ہمارے گھر ہیں"۔

"آپ کے گھر— ! میں اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا"۔ باز بولا "میں نے یہ شاندار سجے سجائے گھر خالی پائے اور پھر یہ میرے لائق بھی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ہمارا علاقہ ہے۔ تمھیں یہاں بسیرا کرنے کی اجازت کس نے دی ہے؟"

"لیکن یہ جگہ تو بالکل ویران اور اجاڑ تھی۔ ہم نے اسے اپنی محنت سے سجایا سنوارا ہے یہ ہماری کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یہ جگہ گلزار نظر آرہی ہے"۔

"یہاں ہماری مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ ہم مختارِ کل ہیں۔ یہ سب ہماری ملکیت ہے"۔ باز نے اکڑ کر کہا۔

باز اپنے ساتھ اپنے خاندان والوں کو بھی لے آیا تھا۔ ان کی تعداد ابابیلوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ ابابیلوں کے سردار نے انھیں سمجھانے کی لاکھ کوششیں کیں مگر ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

اچانک آسمان پر عقاب منڈلانے لگے۔ اور باز ابابیلوں کے گھونسلوں میں دبک گئے۔ صرف گردن نکال نکال کر عقابوں کو دیکھتے اور ابابیلوں کو وہاں سے بھاگ جانے کی دھمکیاں دیتے۔ ابابیلوں نے دوبارہ وہاں سے اپنا بسیرا منتقل کر دیا۔ نئے ٹھکانے کی تلاش میں نئی جگہ پہنچ گئیں۔

اس علاقے میں ابابیلوں کے مختلف خاندان اکٹھے ہوگئے۔ گھونسلے بنانے کا کام

کبھی کبھی سُست پڑجاتا۔ لیکن وہ نیچے نہ بیٹھتیں۔ جب سورج چمکنے لگتا تو تمام ابابیلیں زور و شور سے گھونسلوں کی تعمیر میں لگ جاتیں۔ آخر کار ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی اور خوبصورت گھونسلوں سے بسا ہوا وہ علاقہ شاد و آباد نظر آنے لگا۔

لیکن ابابیلوں کو آج بھی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر انجانے میں ایک بار پھر بازوؤں نے اپنے قافلے کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے آشیانوں پر شب خون مارا تو انھیں ایک بار پھر بچھڑنے کے المیے سے گزرنا پڑے گا اور نئی زمینوں کی تلاش کرنا ہوگی۔

اوّلین تذکرۂ شاعراتِ اُردو

مجیب الاسلام

گلی کبابیان، جامع مسجد، دہلی ۶

۱۸۶۴ء میں میرٹھ شہر سے اُردو شاعری کی دو کتابیں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئیں۔ پہلی "بہارستانِ ناز" جس کے مؤلف حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی ہیں۔ اور دوسری "جواہرِ منظوم" انگریزی نظموں کا سب سے پہلا ترجمہ۔ مترجم محمد غلام مولیٰ قلقؔ میرٹھی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ "بہارستانِ ناز" کے مرتّب رنجؔ میرٹھی ۱۸۳۶ء میں سکندرآباد میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام محمد قمرالدین تھا جو سکندرآباد کو چھوڑ کے میرٹھ میں آباد ہو گئے۔ اس طرح رنجؔ والد کے ساتھ میرٹھ آئے اور رنجؔ میرٹھی کہلائے۔ ان کی تعلیم و تربیت ان کے ماموں حکیم نصیر اللہ صاحب کے ہاں میرٹھ میں ہوئی یہیں انھوں نے طب کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ان کے معاصرین میں داغؔ دہلوی، امیرؔ مینائی، حالیؔ اور محمد حسین آزادؔ تھے۔ شاعری میں غالبؔ کے شاگرد ہوئے۔ طبیب اور وہ بھی امراض النسأ کے غالباً اسی نسبت سے ان میں رنگین مزاجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خواتین کی تعلیم و تربیت سے خاص لگاؤ تھا۔ ۱۸۸۵ء میں عمر کی صرف ۴۹ بہاریں دیکھ کر ان کا انتقال ہو گیا۔ میرٹھ ہی میں دفن ہیں۔ آج اس خاندان کے مشہور طبیب حکیم سیف الدین صاحب ہیں جنھیں صدر جمہوریہ ہند کے طبیب خاص ہونے کا فخر بھی حاصل رہا ہے۔ اس خانوادے میں شعر و ادب کا ذوق اور خدمت کا جذبہ دونوں موجود ہیں۔

میرؔ کا نکات الشعرا غالباً اُردو شاعری کا اوّلین تذکرہ مانا گیا ہے میرؔ کی صاحبزادی خود شعر کہتی تھیں اس کے باوجود ان کا یا کسی اور شاعرہ کا حال میرؔ نے تذکرے میں نہیں لکھا۔ اس کی وجہ اس عہد کی تہذیبی روایات کا پاس تھا۔ ۱۸۳۸ء میں فرانسیسی عالم اور مشہور ماہرِ شرقیات پروفیسر گارساں دتاسی نے اُردو ہندی شاعروں اور مصنّفوں کا جو تذکرہ مرتّب کیا اس میں بھی کسی خاتون کا ذکر نہیں ہے۔

اُردو شاعرات کے جو تذکرے شائع ہوئے ہیں ان میں "بہارستان ناز" کے بعد ۱۸۷۸ء میں درگا پرشاد نادر کا تذکرہ "چمن انداز" شائع ہوا۔ درگا پرشاد دہلی کالج (موجودہ نام ذاکر حسین کالج) کے تعلیم یافتہ تھے انھوں نے "چمن انداز" میں ۴۴ اُردو شاعرات کے حالات اور کلام کا انتخاب پیش کیا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے رنجؔ کے تذکرے کے تین نسخوں کو سامنے رکھتے ہوئے چوتھا نسخہ مرتّب کیا اور اپنے مقدمے کے ساتھ مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیا۔ داؤدی رنجؔ اور نادر کے تذکروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"درگا پرشاد نادر کے تذکرے "بہارستان ناز" کی دو اشاعتوں کے بعد مرتّب ہوئے اس لیے درگا پرشاد نادر نے حکیم فصیح الدین رنجؔ کے تذکرے "بہارستان ناز" سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ جب رنجؔ نے "بہارستان ناز" کو تیسری مرتبہ طبع کرانے کے لیے ترتیب دیا تو اس وقت درگا پرشاد کا "چمن انداز" شائع ہو چکا تھا چنانچہ رنجؔ نے اپنے تذکرے میں مختلف موقعوں پر "چمن انداز" کے متعلق کلمات لکھے ہیں"۔

(ص ۶۶۔ بہارستانِ ناز مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی)

چند تذکرے اور بھی ہیں "گلشن بے خار" میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے چند شاعرات کا نہایت مختصر حال اور کلام کا نمونہ درج کیا ہے۔ عبدالغفور نسّاخ نے "سخن شعرا" میں ضمیمے کے طور پر شاعرات کا نہایت مختصر تذکرہ تحریر کیا۔ پھر عبدالباری آسی نے "تذکرۃ الخواتین" مرتّب اور شائع کیا۔ ۱۹۴۴ء میں محمد جمیل احمد بریلوی نے "شاعراتِ اُردو" کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتّب کی یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اوّل تو اس میں شاعرات کی تعداد بیشتر تذکروں کے مقابلے میں کافی زیادہ ہے دوم چند ایک شاعرات کی تصاویر پہلی مرتبہ ان کے کلام کے

ساتھ شائع کی گئی ہیں۔

"بہارستان ناز" کی اُردو دُنیا میں خوب خوب پذیرائی ہوئی۔ یہ عہد ایک تہذیب کے فنا ہونے اور نئی تہذیب کے قدم جمانے کا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی نثر اور غالب کے خطوط اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ دہلی کالج جو قدیم اور جدید کا سنگم تھا اپنی توانائیں شمالی ہندستان میں بکھیر رہا تھا سرسید تحریک ایک نشاۃ الثانیہ کا خاکہ تیار کر رہی تھی۔

"بہارستان ناز" حکیم صاحب کی حیات ہی میں تین مرتبہ حسن طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ طبع اوّل محمود و جاہت علی خاں کے اہتمام میں میرٹھ سے کتنی تعداد میں چھپی موٗلف نے اس بارے میں کچھ تحریر نہیں کیا۔ اس زمانے میں یہ رواج بھی نہیں تھا۔ کتاب دوسری مرتبہ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی۔ طبع ثانی کے دیباچے میں موٗلف نے لکھا ہے:

"پہلی مرتبہ ۱۸۶۴ء میں مطبع دارالعلوم میرٹھ میں چھپوایا غرض کہ مطبوع و مشہور ہوا۔ تذکرے کا تذکرہ دُور دُور ہوا اکثر دوستوں نے اپنی قدردانی سے قطعۂ تاریخ تحریر فرمائے خاتمہ پر خطبہ تحریر آتے مگر بہ سبب قلت فرصت و عجلت تالیف کے نوبت نظرِ ثانی نہ آئی اکثر جگہ طبع اوّل میں غلطی نظر آئی جابجا کاتب مطبع کی تحریف ہوئی کہیں کہیں سہو ترتیب و تالیف ہوئی۔"

(دیباچہ بہارستانِ ناز، طبع دوم)

طبع اوّل و دوم میں تعداد صفحات ۶۷ ہے، قیمت چھ آنے ہے۔ دونوں اشاعتوں میں شاعرات کی تعداد ستر ستر ہے۔ اس تذکرے کا تیسرا ایڈیشن ۱۸۸۲ء میں بہ اہتمام منشی علیم الدین خاں مطبع عثمانی میرٹھ سے چھپ کر منظرِ عام پر آیا جس میں شاعرات کی تعداد ۷۰ سے بڑھ کر ۱۷۴ ہو گئی اس میں ۴۹ شاعرات فارسی کی بھی شامل ہیں اور تین اُردو فارسی کی مشترکہ ان شاعرات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اوّل وہ جن کا تعلق حکمراں طبقہ سے تھا اس میں امرا رؤسا اور نوابین کی بیگمات کو شریک کیا گیا ہے۔ اس عہد میں شعر و سخن کی محفلیں امرا کے دیوان خانوں میں منعقد ہوتی تھیں۔ بیگمات بھی ادب اور شاعری کا ذوق رکھتی تھیں۔ بیگمات کے علاوہ ان کی خاص خاص کنیزیں بھی شعر گوئی کی طرف مائل رہتی تھیں مثال کے طور پر امانی زیب النسا کی خاص خدمت گزار تھی اور فارسی میں شعر کہتی تھی۔

"بہارستان ناز" میں جن بیگمات اور شہزادیوں کی شاعرانہ خدمات کو سراہا گیا ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱۔ اختر تخلص، نام اختر محل بیگم۔ یہ خاندان تیموریہ سے تھیں۔

۲۔ آقا بیگم تخلص یہی نام۔ میر ناصر علی جلامیر کی صاحبزادی سلطان احمد بادشاہ کی نسل سے۔ (فارسی)

۳۔ آرام تخلص، نام دل آرا بیگم، یہ شہنشاہ جہانگیر کی زوجہ تھیں۔ (فارسی)

۴۔ جینا تخلص، نام جینا بیگم بنت مرزا بابر، محل خاص مرزا جہاں دار شاہ۔

۵۔ حیات تخلص، نام حیات النسا بیگم۔ زوجۂ ثانی جہانگیر بادشاہ۔

۶۔ شوق تخلص، نام گنا بیگم۔ زوجۂ نواب عمادالملک غازی الدین خاں۔

۷۔ شیریں تخلص، نام رضیہ سلطان بیگم بنـ سلطان شمس الدین التمش۔ (فارسی)

۸۔ عصمتی تخلص، نام نواب جہاں آرا ایک بی بی محلات شاہ معزول اودھ۔

۹۔ عشرت تخلص، نام عشرت علی بیگـ شاہزادی صاحب فراست صاحب زبان۔ (فار

۱۰۔ فنا تخلص، نام مہتاب النسا بیگم زوجۂ سوم شہنشاہ جہانگیر۔

۱۱۔ مخفی تخلص، نام زیب النسا بیگم کلاں شاہ عالمگیر۔ (فارسی)

۱۲۔ نور جہاں نام۔ مہرالنسا نور محل نور جہاں کا خطاب۔ زوجۂ جہانگیر بادشاہ۔ (فار

اوپر صرف بارہ شاعرات کے نام دیے گئے ہیں ان میں چار شہنشاہ جہانگیر کی تھیں اور چاروں فارسی میں سخن گوئی تھیں۔ اُن میں نور جہاں کی پُرکشش شخصیـ نے اسے مغلیہ سلطنت کی تاریخ کا ایک باب بنا دیا پورے پندرہ سال تک یہ سے نمایاں اور با اقتدار ہستی رہی۔ صاحب جلوۂ خضر کا وہ بیان مستند نہیں جس نور جہاں کو اُردو کی اولین شاعرہ بتایا ہے۔ متذکرہ بالا شاعرات میں شاہز زیب النسا کا نام اُردو شاعری میں ایک روایت کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ یہ شہز اورنگ زیب عالمگیر کی سب سے پہلی صا تھیں۔ ابتدائی تعلیم حافظ مریم سے جو عہد کی تعلیم یافتہ محترم خاتون تھیں، حا کی۔ شاہزادی نے ان کی زیرِ نگرانی د کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا اس کے عربی فارسی کی تعلیم کے لیے ایرانی عالم ا

کے شاعر ملا سعید اشرف کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اکیس برس کی عمر میں شاہزادی اُردو اور فارسی زبانوں میں شعر کہنے لگی تھیں بعض تذکرہ نگاروں نے مخفی کے فارسی کلام کو ملا سعید اشرف سے منسوب کیا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ شاہزادی اپنے والد ماجد اورنگ زیب سے بے پناہ محبت اور عقیدت رکھتی تھی۔ خود اورنگ زیب بھی شہزادی سے بہت مانوس تھے اور سفر حضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے لیکن جب اورنگ زیب دکن کی مہم پر گئے تو شہزادی دہلی میں تھیں اسی دوران میں وہ اپنے خالق حقیقی سے جاملیں، دہلی میں ان کا انتقال ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق ان کو لاہور کے شاہی باغ میں دفن کیا گیا۔ یہ فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی شعر کہتی تھیں علم دوست اور فضل و کمال کی قدر دان تھیں۔ ان کی شاعری پر ناقدین میں اختلاف رائے ہے ایک طبقہ دیوان مخفی کو شہزادی کا دیوان تسلیم کرتا ہے دوسرا نہیں لیکن علامہ شبلی جیسے تاریخ داں اور ناقد انھیں شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ پروفیسر گارساں دتاسی کے مطابق مخفی کا اُردو کلام دستبرد زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہو چکا ہے۔

صف اوّل کی شاعرات کا کلام زیادہ تر فارسی میں ہے لیکن اُردو کا کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ "بہارستانِ ناز" سے اسے بھی پیش کیا جاتا ہے۔

نواب اختر محل بیگم:

اک آہ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا
لو آج ہم نے اس کا بھی جھگڑا مٹا دیا
تقصیرِ یار کی نہ قصورِ عدو ہے کچھ
اختر ہمارے دل نے ہمیں کو جلا دیا

عشرت تخلص، نام عشرت محل بیگم:

شعلۂ عشق لگا آگ نہ دل میں میرے
یہ تو اللہ کا گھر ہے کسی دشمن کا نہیں
گرمیٔ عشق مانع نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

شاعرات کا دوسرا طبقہ عام خواتین پر مشتمل تھا اس طبقے کی اکثر شاعرات۔ جن خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں ان میں بالخصوص اطبا اور ادبا تھے یہ دونوں شرفا کے زمرے میں شمار کیے جاتے تھے اگرچہ سب کی رسائی دربار تک نہیں ہوتی تھی درباروں میں صرف وہی آتے جاتے تھے جن کے اجداد کسی نہ کسی طور پر دربار سے وابستہ رہے تھے یا جو اپنے فن میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ جب بیگمات سخن گوئی اور سخن نوازی کی جانب مائل تھیں تو شرفا کے گھروں میں خواتین کا اس طرف راغب ہونا قدرتی بات تھی۔ ذیل میں ان شاعرات کے تخلص لکھے جاتے ہیں جن کا "بہارستانِ ناز" میں ذکر ہے:

امانی، بنو، بیدلی، بزرگی، بہو بیگم، پارسا، ثریا، ثنا، جعفری، حیدری، حیا، حجابی، خفی، خانزادی، رعنائی، سید بیگم، سلطان، شرم، ضرورت، حنا، عزت، عصمتی، غریب، قمر، کنیز، لطیف، عصری، نسائی، وزیر، ہمدمی، یاس، آرزوئی سمرقندی، آغا۔

متذکرہ بالا چونتیس شاعرات میں گیارہ فارسی کی ہیں اُردو شاعرات کی تعداد تئیس ہے۔ سب کے کلام کے نمونے بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ ذیل میں چند شاعرات کا کلام پیش کیا جا رہا ہے۔

جعفری تخلص۔ نام تحریر نہیں ہے:

محبت کے محل میں عاشق جاں باز رہتا ہے
نہیں خالہ کا گھر اس میں جو آئے جس کا جی چاہے
کہا منصور نے سولی پہ چڑھ کر عشق بازوں سے
یہ اس کے کام کا زینہ ہے آئے جس کا جی چاہے

آمرآؤ تخلص، نام حسینی بیگم:

باغِ عالم میں چھڑانا تھا اگر اپنوں سے
پہلے ہی سبزۂ بیگانہ بنایا ہوتا
گرچہ منظور نہ تھی خانہ نشینی میری
تو مجھے ساکنِ ویرانہ بنایا ہوتا

ثریا تخلص، نام بڑی بیگم:

بتا دیں ہم تمھاری کاکلِ شب گوں کو کیا سمجھے
سیہ بختی ہم اپنی یا اسے کالی بلا سمجھے
جدھر دیکھا اٹھا کر نیم بسمل کر دیا اس کو
تری مژگاں کو ہم سوفارِ پیکانِ قضا سمجھے

"بہارستانِ ناز" میں جن شاعرات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے اکثر تعلیم یافتہ تھیں۔ شریف اور متمدن گھرانوں کی خواتین۔ ان کے اشعار زیادہ تر پاکیزہ جذبات پر مبنی ہوا کرتے تھے طباعت کے لیے بھی بڑی مشکل سے اجازت ملتی تھی ایسے گھرانوں کی شاعرات کو اپنی شہرت سے زیادہ اپنا مقام و منصب عزیز تھا۔

تیسری قسم ان خواتین کی ہے جو ڈھکے چھپے یا کھلے عام شاہد بازاری تھیں۔ وہ سخن گو تھیں یا نہیں اس کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا البتہ سخن فہم ضرور ہوا کرتی تھیں یہ ان کی معاش کا تقاضہ بھی تھا۔ زیورِ تعلیم سے آراستہ رہیں ان کے بالاخانے تہذیب کے مرکز ہوا کرتے تھے۔ شرفا اہلِ فن اور اہلِ ہنر

ان کے ہاں جانا قطعی معیوب نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان سے وابستگی ان کی آن بان میں اضافہ کرتی تھی۔ شاعروں سے خاص تعلّق کی بدولت ان شاہدانِ بازاری کو شاعری سے آگاہی میسّر آئی اور بعض نے سخنوری کے میدان میں بھی قدم رکھا۔ انگریز حکمراں بھی ڈیرہ دار طوائفوں سے تعلّقات رکھتے تھے اس معاملے میں وہ ہندستانی شرفا کے نقشِ قدم پر چلنے لگے تھے۔ اس عہد میں تین دربار ہوتے تھے حکمراں کا دربار صوفیائے کرام کا آستانہ اور تیسرا دربار طوائف کا بالاخانہ۔ تینوں درباروں کے اوقات الگ الگ، خصوصیات مختلف اور نظام بھی جداگانہ ہوتا تھا۔

"بہارستانِ ناز" میں شاہدانِ بازاری کے جو تخلّص پیش کیے گئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

امراؤ، آتون، بسنتی، نسلی، زینت، زہرہ، شیریں، صاحب، صنوبر، فرحت، کمن، مشتری، نزاکت، نازنین، وزیر، یاسمین۔ یہ خواتین اپنے فن کی ماہر اس کی باریکیوں نزاکتوں سے کما حقہ واقف اور شعر و شاعری میں خاص دلچسپی رکھنے والی ہوتی تھیں۔ اس طبقے کی چند شاعرات کا نمونۂ کلام یہ ہے:

بدلاؔ تخلّص، بدلا جان نام:

بہار آتی ہے پھر رنگِ دلِ ناکام بدلا ہے
ہوا بدلی مزاجِ بادۂ گلفام بدلا ہے
سنا ہے خیر سے بدلی ہے قسمت کیا ہمارا بھی
کہیں اب کے مقدّر گردشِ ایام بدلا ہے

پریؔ تخلّص، بی میجو نام:

یہ کیوں بزم میں غیر آئے ہوئے ہیں
بتاؤ تو کس کے بلائے ہوئے ہیں
کہاں تھی یہ بلبل میں نغمہ سرائی
پری کے ہی سب رنگ اڑائے ہوئے ہیں

جانؔ تخلّص، صاحب جان نام:

جان جاتی ہے دل ترستا ہے
اس میں آ جا کہ مینہ برستا ہے
جان و دل بیچتے ہیں ہم اپنا
ایک بوسے پہ لے تو سستا ہے

دلبرؔ تخلّص، چھوٹی بیگم نام:

ہر روز جو تم اٹھتے ہی تیوری ہو بدلتے
بے جا تو ہمیں ناز اٹھانا نہیں آتا
قسمت میں ہماری نہ ہوا ہائے صد افسوس
ایک روز لپٹ کر شبِ مہتاب میں سونا

شاعرات کے کلام پر خاص توجہ ۱۹۴۷ء کے بعد دی گئی ہے جب برصغیر میں شاعرات ابھر کر سامنے آئیں یہ یوں کہ پہلا تذکرہ ہے اس لیے اس پر تبصرے یا تنقید کی گنجائش کم ہے۔

غزلیں

ہار کی مہک ہے سحر کی ہواؤں میں
ظوں کے تیرنے کا سماں ہے فضاؤں میں
ریک پیچ و خم کے اُدھر تھی کرن کی جھیل
منی تھی روشنی سی بدن کی گپھاؤں میں
نے لگی ہے سُرخ جوالا مُکھی پہ برف
وا ابھی بٹ کے سوکھ چکا دو دِشاؤں میں
م خامشی کی دھوپ میں صحرا نوردِ فکر
سودہ کیا رہیں گے صداؤں کی چھاؤں میں
لیل کر رہا ہوں خود، اپنی شناخت کی
ھ دو مرا بھی نام مرے آشناؤں میں
راہنِ قلم میں ہے رقصاں نگارِ درد
لکِ گہر فشاں ہے، کہ گھنگھرو ہیں پاؤں میں

عبدالاحد ساز

ریا مینور، چوتھا منزلہ، ۱۴۹۔ یوسف مہر علی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

جامِ شکستہ کاسۂ سر بن بھی آئے گا
تھا میکدے میں شور تو گھر میں بھی آئے گا
اونچا اگر اُڑا تو بنے گا شکار بھی
چھوڑے گا جب زمیں تو نظر میں بھی آئے گا
خیمہ جو تجربوں کا نصیحت نے بُن دیا
لے جائیے کہ کام سفر میں بھی آئے گا
درپیش جو دُعاؤں کو میرے لبوں پہ ہے
یہ مرحلہ تو بابِ اثر میں بھی آئے گا
بچّوں کے ساتھ فیضِ بزرگاں ہے جب نظامؔ
کچھ ذائقہ جڑوں کا ثمر میں بھی آئے گا

نظام الدین نظامؔ

۹۴/برکت علی دیرانی مارگ، تیسرا مالا، روم نمبر ۱۷، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

رات پُر اسرار تھی چاروں طرف
تیرگی بیدار تھی چاروں طرف
روشنی آتی تو آتی کس طرح
رات پہرہ دار تھی چاروں طرف
آبلے ہی آبلے تلووں میں تھے
راہ بھی پُر خار تھی چاروں طرف
کوئی میری چیخ سنتا کس طرح
تیغ کی جھنکار تھی چاروں طرف
کھا رہا تھا زخم بے چارہ ظفرؔ
اور زمیں گلنار تھی چاروں طرف

ظفر اقبال

۱۷۰، خیلدار، فتح پور ۲۱۲۶۰۱ (یو۔ پی)

خیالِ شاخ نہ کر، بڑھ کے آسمان کی سمت
کہ تیر مُڑ کے نہیں دیکھتا کمان کی سمت
پروں میں سر نہ چُھپا، پھڑ پھڑا کے جست لگا
کہ ہوگئی ہے معیّن تری اُڑان کی سمت
سویرا آکے ندی پر وضو کرے گا مگر
ابھی تو کان لگاتے رہو اذان کی سمت
میں جانتا ہوں ترے ساتھ بھی ہے مجبوری
تُو آبشار ہے کیسے مُڑے چٹان کی سمت
کٹھن ہے میرا سفر کس قدر خیال تو کر
میں دھوپ ہوں مجھے بڑھنا ہے سائبان کی سمت
ہوا نے موڑ دیا کچّے برتنوں کی طرف
میں سوچتا تھا برستا چلوں گا دھان کی سمت

ضمیر درویش

E - 5/- B، ریلوے کالونی (نارتھ) مراد آباد ۲۴۴۰۰۱

ہم تمھیں بھول چکے ہیں، منگرو

مشرف عالم ذوقی
مکان نمبر سی/۴۰۳، نندن نگر، نیئر پیٹک اکیڈمی، دہلی ۹۲

اِدھر صبح ہوتی، اُدھر چودھری صاحب کے کمرے سے، آدھی، حلق میں پھنسی آواز کی گونج ہوتی ...

"منگرو آیا کہ نہیں ... ؟"

اور جواب میں منگرو حاضر ہوتا ..."لو آگیا جی ..."

مُسکراتا ہوا چودھری صاحب کو سلام داغتا ..."سلاما لیکم ..."

چودھری صاحب کی جان میں جان آتی — "پانی رکھ دیا ؟"

منگرو کے ہونٹوں پر ایک دلنواز مسکراہٹ چھا جاتی ..."کتنی بار سمجھایا ہے صاحب جی ... اتنی صبح صبح مت بنایا کیجیے۔ اب بڑھاپا آگیا ہے۔"

چودھری صاحب پوپلے ہونٹوں سے بڑبڑاتے ..."چل ہٹ ... باتیں بہت بنانے لگ گیا ہے ..."

"اچھا صاحب جی ..." منگرو پھر ہنستا۔ یہاں زیادہ دیر تک کھڑا رہا تو پھر موانی کے کمرے سے ڈانٹ سنائی پڑے گی۔ کمبخت کیڑے پڑیں تیری قبر میں۔ جہاں گیا' سٹ گیا" ابھی پانی رکھتا ہوں، صاحب جی۔"

اِدھر صاحب کی نظر پھری اور ادھر منگرو غائب — صاحب جی من ہی من مسکراتے ... کتنی فکر رہتی ہے منگرو کو ... ایک دن منگرو نہ آئے تو جیسے گھر کا سارا کام ہی رُک جائے۔

چودھری صاحب کی بیوی جگ موانی تھیں۔ چودھری صاحب کے کمرے میں پانی پہنچا کر منگرو جھٹ سے موانی کے کمرے میں پہنچتا۔ جو صبح ہوتے ہی اس انتظار میں ہوتیں کہ منگرو آئے اور اُسے گالیوں کے تھال سے نوازا جائے۔

"کیوں رے کرم جلے۔ کم بخت ... اب فرصت ملی ہے ..."

"موانی —" منگرو ہنستا —"سب کچھ کہہ لو لیکن کرم جلا اور کم بخت مت کہو۔ کم بخت اور کرم جلا ہوتا تو آپ لوگوں کے یہاں پانی نہ بھر رہا ہوتا۔ قسمت سے تو آپ جیسے لوگ ملتے ہیں۔"

اچھا — اچھا —" موانی ہنستیں "دیر ہو جائے تو میٹھی میٹھی باتیں کرکے پھسلانا خوب جانتا ہے۔"

"دیری کیسی موانی۔ صاحب جی تو پرانی داستان لے کر بیٹھ گئے۔"

موانی کے دل سے ٹھنڈی آہ نکلتی — "اب اس گھر میں داستان کے سوا باقی ہی کیا ہے منگرو۔ جا تو پانی بھر —"

چودھری صاحب اور داستان کا تو جنم جنم کا ساتھ تھا۔ "کل کیا تھا" کے قصّے جتنے چاہیے اُن سے سُن لیجیے۔ کیسے باہر دروازے پر ہاتھی بندھتا تھا اور مہاوت ڈیوڑھی میں سر جھکائے حکم کے انتظار میں بیٹھا رہتا تھا۔ اناج سے کمرے کے کمرے بھرے ہوتے تھے۔ باسس اور ٹوپیاں اتنی چم چم کرتیں کہ نگاہ خیرہ ہو جاتی گھر سے باہر نکلنا ہوتا تو چودھری صاحب سلام کے اتنے توپ دغتے کہ جواب دیتے دیتے مُنہ تھک جائے۔

ہمیں اس کی زیادہ خبر نہیں کہ ایسا کچھ واقعی تھا یا نہیں۔ ممکن ہے، رہا ہو۔ لیکن اگر رہا بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے — یہ ٹوٹا پھوٹا گھر اب کوٹھی کے نام سے منسوب ہے۔ لیکن اتنا سچ ہے کہ ہاتھی کبھی نہیں بندھتا ہوگا۔ اس لیے کہ گھر کا دروازہ اتنا اونچا نہیں تھا کہ ہاتھی کا گزر ہو سکے۔ ہاں پہلے کے لوگ خوشحال ضرور رہے ہوں گے۔ ممکن ہے، تھوڑی بہت جاگیر بھی رہی ہوں۔ لیکن اب — پرانی آن بان شان کو ڈھونے والا اکیلا منگرو تھا — منگرو سے منگرو کا باپ بھی یہاں ملازم تھا۔ دادا پردادا بھی — وقت کے ساتھ گھروں میں ٹیوب ویل لگ گئے۔ پانی کی ٹنکی، موٹر آگئے لیکن یہاں والوں کا کارخانہ منگرو کے دم سے

اَم رہا۔ صبح ہوئی نہیں کہ ہر کمرے سے منگرو... نگرو آیا کہ نہیں، کی آوازیں آنے لگتیں۔ سب د نہانے اور پانی بھروانے کی جلدی ہوتی۔ گھر ں پانی کے نام پر اوسارے میں ایک، پرانے فتوں کا چاپا کل گڑا تھا۔ بس... جس کو لانے میں خاصی مشقّت کرنی پڑتی تھی۔ چودھری احب ہوں، موانی، عائشہ، ذوالقرنین، یا نید ـــــ صبح ہوتے ہی سب پانی پانی چلّانے لتے ـــــ جس کے کمرے میں پانی نہ رکھا ہوتا، وہ نہ بناتا یا منگرو میاں پر ناراض ہو جاتا۔

"منگرو میاں، یہ کیا بات ہوئی۔"

"میرے کمرے میں پانی کیوں نہیں کھا گیا۔"

کبھی کبھی عائشہ کا غصّہ دیکھنے کے ئق ہوتا۔ "آپ مذاق بہت کرنے لگے ہیں نگرو میاں۔ میرا کالج چھوٹ جائے گا۔"

"ابھی رکھتا ہوں، بی بی جی۔"

منگرو کی مسکراہٹ ہر وقت جاری رہتی۔ ینے کے بندھے بندھائے تھے ۲۵ روپے ـــــ پچیس روپے میں ہوتا ہی کیا ہے۔ یہ روپے ھی مہینے کی پانچ، دس تاریخوں تک دو، ایک نسط میں ملا کرتے۔ ظاہر ہے، اتنے پیسوں میں کیا ہونے والا تھا، سو منگرو نے آس پاس گھروں میں کام ڈھونڈ لیا تھا۔

برآمدے کے پاس جنید میاں اور ذوالقرنین یعنی چھوٹے بابو کا کمرہ ہے۔ دونوں کی عمر میں دو، ایک سال کا فرق ہے۔ دونوں ہی دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔

منگرو کو دیکھ کر ذوالقرنین جنید سے کہتا "اب ہے کیا، جاگیریں، نوابی سب تو چھن ئی ـــــ لیکن ہم آج بھی فیوڈل سسٹم سے الگ نہیں ہو سکے۔"

جنید کو گھر خاندان کا یہ مذاق اُڑانا بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ بگڑ کر کہتا "تیری یہی باتیں مجھے پسند نہیں ہیں۔"

ذوالقرنین قہقہہ لگاتا "اب منگرو کو ہی دیکھو ـــــ خاندان در خاندان غلامی ڈھوئے جا رہا ہے۔ اب کل والی بات تو ہے نہیں۔ اب اگر کسی کو کچھ چاہیے تو ہمیں چاہیے۔ شہر میں اگر واقعی کوئی حاجت مند ہے تو وہ یہ چودھری خاندان۔ بھوکوں مرنے کی نوبت آ جائے گی لیکن ہماری آرام طلبی میں کمی نہیں آئے گی۔"

"نہیں، وقت بدل چکا ہے۔"

ذوالقرنین ہنستا "منگرو کو دیکھ کر تو نہیں لگتا کہ وقت بدل چکا ہے۔"

منگرو کا جب کبھی اِدھر سے گزر ہوتا تو وہ دونوں کو سلام داغتا ـــــ "جنید میاں سلام علیکم، چھوٹے میاں سلام علیکم۔"

دونوں مسکرا کر ایک ساتھ جواب دیتے "وعلیکم السلام منگرو میاں۔"

ذوالقرنین منگرو سے کہتا "آپ کو کتنا سمجھاتا ہوں منگرو میاں۔ کیوں بھوکے مرتے ہیں آپ۔ ارے اس خاندانی پیشے کو چھوڑ کر کوئی ڈھنگ کا پیشہ اپنا لیجیے۔ ۲۵ روپے میں کیا ہونے والا ہے آج کی دُنیا میں ـــــ" بابو کی بات ـــــ منگرو میاں ہنستے ہوئے گھر کی راہ لیتے۔

گھر میں تھا ہی کون۔ ایک گھر والی تھی جو خالی وقت میں مُنہ سے خون تھوکتی تھی اور چولہے میں لکڑیاں جھونکتی ہوئی ہر وقت کھوں کھوں کرتی رہتی تھی۔ ایک لڑکا تھا، جس کے بارے میں منگرو نے بہت زیادہ نہیں سوچا تھا۔ بس اتنا کہ صاحب جی کے بڑے لڑکے نبّن سے کہہ کر کسی سرکاری محکمے میں چپراسی کی نوکری لگوا دیں گے۔ یا پھر چمڑے کا منشک اپنے جھولتے پیٹ سے نکال کر لڑکے کے جوان پٹھوں سے باندھ دیں گے۔ کہ اب یہ پشتینی وراثت تیرے حوالے... تو ہی مالک، تو ہی آقا... اب تو ہی سنبھال اسے۔ لڑکا دن بھر آوارہ گردی کرتا رہتا۔ یا تو باہر رد گلی کے آوارہ کتّوں کی دُمیں اینٹھتا، یا پھر چنّو منّو کے ساتھ گولیاں کھیلتا۔ منگرو مطمئن تھا کہ ابھی کمانے دھمانے کا وقت نہیں ہوا۔ کچھ پیسے جڑ جائیں تو شادی کر دیں گے۔ ابھی ذرا قد سے اور اونچا ہو لے تو نبّن بابو سے سفارش کر کے کہیں نوکری میں لگوا دیں۔

چودھری صاحب تو رجسٹرار بابو بن کے ریٹائر ہوئے۔ اب خالی کمرہ ہے اور یادیں۔ گھر نبّن بابو سے چلتا ہے۔ جو کہیں گاؤں میں ماسٹر ہیں۔ چودھری صاحب کی پنشن بچّوں کی گزر بسر اور پڑھائی کی فیس میں نکل جاتی ہے۔ تو نبّن بابو تنخواہ کا ایک چوتھائی حصّہ ابّا کو بھیج دیتے ہیں جو دوا، علاج اور دیگر ضرورتوں کے کام آتا ہے۔ نبّن بابو گاؤں میں ہی کرائے کا کمرہ لے کر بیوی اور بچّوں کے ساتھ بس گئے ہیں۔ سنیچر کے سنیچر آ جاتے ہیں اور اتوار کی شام پھر چلے جاتے ہیں۔

منگرو سب سے گھُلا مِلا ہے منگرو کو یہاں آنا اور ہنسنا بولنا اچھا لگتا ہے اُس دن نبّن بابو آئے تو منگرو نے بچوا کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

پہلے تو نبّن بابو سنتے رہے پھر بے دلی سے بولے:

"تم تو جانتے ہو منگرو کہ سرکاری نوکری

کا ملنا اب کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ ارے اب تو بڑے بڑے لوگ بھی چاہنے لگے ہیں کہ اپنے بچوں کو کم از کم چپراسی کی نوکری ہی دلوا دیں ... چپراسی کی نوکری میں بھی ہزاروں روپے کی رشوت دینی پڑتی ہے ...''

''وہ تو ہے ...''

''پھر بھی دیکھوں گا ... تم مزے میں تو ہو منگرو میاں۔''

''ہاں ——''

ایک دم سے منگرو کی باچھیں کھل جاتیں۔ اتنی دعا سلام بہت تھی اُس کے لیے۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔

ذوالقرنین اور جنید میاں کے لیے تو منگرو کسی فنتاسی کہانی کا ہیرو تھا۔ لمبا چوڑا ... ذوالقرنین ہنس کر کہتا ''بالکل واسکوڈی گاما لگتا ہے ...''

اوپر کا دھڑ ننگا —— نیچے گھٹنے تک تہبند باندھے ... کمر سے بندھا ہوا چمڑے کا پٹکا۔ اور اس سے جھولتا ہوا مشک۔ گھر میں لے دے کر ایک ذوالقرنین تھا جسے منگرو میاں پر رحم آتا ... وہ کہتا بھی تھا ——

''بے چارہ —— وہ کیا جانے کہ نہ اب ہاتھی ہے اور نہ ہاتھی پالنے والے۔ گھر کا خرچ کیسے پورا ہوتا ہے، یہ منگرو کو کون بتائے۔ ۲۵ روپے بھی کتنی مشکل سے دیے جاتے ہیں اسے، اور پھر وہی مسکراہٹ —— ہم خود کو فیوڈل سسٹم سے کبھی الگ نہیں کر پائیں گے۔ چودھری ہیں نا ... رگ رگ میں آرام طلبی بھری ہے۔

وہ مذاق اُڑاتا تو جنید بُرا مان جاتا۔

یہ سلسلہ حسبِ معمول چل رہا تھا کہ ایک دن —— اس معمول میں فرق آ گیا۔ منگرو بُری طرح ٹوٹ گیا۔ ہوا یوں کہ ایک شام گھر جاتے ہوئے وہ دیوار سے ٹکرا گیا اور گر پڑا۔ بوڑھا جسم۔ گلی میں گھر تھا اُس کا۔ اندھیرا ہونے کے بعد گلی میں کچھ بھی سُجھائی نہیں دیتا تھا۔ اور منگرو تو جیسے تیسے اپنا جانگر اٹھاتے چل رہا تھا۔ ورنہ اُس بے چارے کا کھان پان ہی کیا تھا۔ ہاں گرنے سے قبل کبھی بڑھاپے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ پہلی بار اُس کے مسکراتے چہرے پر وقت کے خونخوار دانتوں کے نشان دکھائی دیے ... اُس کا کیا ہوگا؟ چولہے کے پاس کھوں کھوں کرتی بیوی کا؟ بچے کا —— لے دے کر چودھری صاحب کا آسرا تھا۔ چودھری صاحب زندہ ہیں تو اُسے سڑک پر نہیں آنے دیں گے۔

بوڑھا جسم گر پڑے تو سنبھلنے میں وقت لگتا ہے ... اور یہ منگرو کے لیے دوسرا جھٹکا تھا۔

چودھری صاحب نے کمزور اور جھکے ہوئے سر والے منگرو کو دیکھ کر اپنی مجبوری ظاہر کر دی۔ ''یہاں بچنا ہی کیا ہے منگرو ...''

منگرو نے کانپتی نظریں اُٹھائیں ...

''صرف سو، سوا سو روپے کی بات ہے حضور ... دوا پانی نہیں ہوا تو ... مہینے سے کاٹ لیجیے گا ...'' پہلی بار اُس کی آواز میں بلا کا درد سمٹ آیا تھا۔

لیکن —— اُس کے اندر کا زخم کون دیکھتا۔

موانی —— وہاں بھی سناٹا تھا۔

نتن بابو —— اُن کا بھی مُنہ لٹکا ہوا تھا ... بچوں کے دودھ کے دام تک پورے نہیں پڑتے منگرو میاں۔''

ذوالقرنین ہنسا —— ''فیوڈل سسٹم کے اثرات ضرور باقی ہیں منگرو میاں لیکن ...'' اُس کی ہنسی بجھی ہوئی تھی۔ ''دوستوں کو چائے پلانے تک کے نام پر شرمندہ ہونا پڑتا ہے ...''

اور —— منگرو کو پہلی بار اندازہ ہوا زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے۔ اور وہ اس بھیڑ میں کتنا پیچھے چھوٹ چکا ہے ... کتنا تنہا رہ گیا ہے ...

منگرو گھر گیا۔ پھر واپس نہیں آیا۔ دوسرے دن وہاں انتظار ہو رہا تھا۔ منگرو آیا کہ نہیں۔ صبح تو بغیر منگرو کے ہوتی نہیں تھی۔ چودھری صاحب، موانی، عائشہ، جنید میاں، سب ناراض ہو رہے تھے —— لیکن منگرو نہیں آیا —— آیا، گھر سے اُس کا لڑکا خبر دینے —— منگرو مر گیا۔ ظہر بعد پہلی منزل ہے ...

منگرو مر گیا —— کچھ ٹھنڈی سانسیں چھوٹیں بس۔

بے چارہ —— چودھری صاحب بڑبڑائے —— چودھری خاندان کے وقار کا یہ تاج بھی گیا۔ اب سارے کام خود کرنے ہوں گے۔

نتن بابو نے چھوٹے بچے کو گود میں کھلاتے ہوئے سوچا —— چلو اب مہینے کے ۲۵ روپے کسی دوسرے کام میں آ جائیں گے۔

موانی بولیں" آخر وقت میں کم بخت،
معاف کرے، جانگ سے کمزور کتنا ہوگیا
ا۔"
کمرے میں، آمنے سامنے کتابوں میں سر
دیے ذوالقرنین اور جنید نے ایک دوسرے
کو دیکھا۔ جنید نے پوچھا "کیا منگرو کے نہیں
ہونے سے کچھ فرق پڑے گا۔"
ذوالقرنین کی آنکھوں میں آنسو کا ایک
قطرہ چمکا جسے وہ بڑی ہشیاری سے پی گیا۔
"ہمارے گھر کے فیوڈل سسٹم کی آخری کڑی
ٹوٹ گئی۔"

آوارگی کا آشنا

دلیپ سنگھ

۴/۵۹، راجندر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰

(دوسری قسط)

ہوائی جہاز کو بائیس مئی کی صبح ایک بجے اندرا گاندھی ایئر پورٹ سے روانہ ہونا تھا۔ میں چونکہ ایئر پورٹ گیارہ بجے پہنچ گیا تھا اس لیے میرے لیے صبح کا لفظ کچھ معنے نہیں رکھتا تھا۔ اکیس کی رات کہہ لیجیے یا بائیس کی صبح، میرے لیے تو یہ 'جگراتے' کی رات تھی۔

جہاز ایک کی بجائے تین بجے روانہ ہوا۔ میں نے جب ایک معتبر افسر سے پوچھا کہ دیر کیوں ہو رہی ہے تو کہنے لگا کہ ہوائی جہاز کے معاملوں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے کہا "دیر تو سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ سویر کیوں ہو جاتی ہے؟" وہ مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ خوش تھا کہ وہ ایک مسافر کو دیر کی صحیح وجہ بتلانے سے بچ گیا اور میں خوش تھا کہ آدھی رات کو بھی میں نے لطیفہ سنانے کے لیے ایک سامع پکڑ لیا۔

خیر صاحب تین بجے جہاز سوئے منزل روانہ ہو گیا۔

سفرنامے کی روایت کے مطابق مجھے اب آپ کو یہ بتانا چاہیے کہ جہاز میں جو ایئر ہوسٹس میری خدمت پہ مامور تھی، وہ کتنی حسین تھی۔ اُس کی مسکراہٹ نے مجھ پر کیا جادو کیا اور کس ادا سے اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے محبت کا پیغام دیا۔ ذکر تو تفصیل سے مجھے اُس ڈنر کا بھی کرنا چاہیے جو ایئر ہوسٹس نے مجھے بہت ہی پیار سے کھلایا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں سفرنامے کی اس روایت کو نبھا نہیں پاؤں گا۔ نیند کا مجھ پر اس قدر غلبہ تھا کہ میں نے جہاز میں بیٹھتے ہی اپنے اوپر کمبل ڈالا، بتی بجھائی، ایئر ہوسٹس سے گزارش کی کہ مجھے کھانے کے لیے نہ پوچھے' اور سو گیا۔

میں شرم سار ہوں کہ میں نے اپنے قارئین کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اُن کے ساتھ کوئی خاص زیادتی نہیں ہوئی۔ اگر میں ایئر ہوسٹس کے خدوخال اور قد و قامت کا ذکر چٹخارے لے کر کر بھی دیتا تو اس سے انھیں کچھ فائدہ نہیں ہونے والا تھا۔ کیوں کہ جب وہ میری تحریر کے جادو سے متاثر ہو کر کے ایل ایم کے اُسی طیارے میں سفر کرتے تو شاید وہ ایئر ہوسٹس اُس دن چھٹی پر ہوتی یا پھر شادی ہو جانے کی وجہ سے وہ ملازمت سے استعفےٰ دے چکی ہوتی۔ اتنا تو ہم سب جانتے ہی ہیں کہ خوبصورت لڑکیوں کی شادی بہت جلد ہو جاتی ہے اور اکثر ایسے آدمی سے ہوتی ہے کہ پھر انھیں ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

جہاز میں مجھے وہ نیند تو نہ آئی جو اُردو محاوروں کے مطابق خرگوش کو عام طور پر اور انسان کو گھوڑے بیچ کر آتی ہے لیکن جھپکیاں آتی رہیں۔ بیچ بیچ میں جب آنکھ کھلتی تو ٹی وی اسکرین پر نظر پڑتی۔ وہ لوگ بار بار یہ دکھا رہے تھے کہ کتنے کلومیٹر کی مسافت طے ہو چکی ہے اور کتنے باقی رہ گئے ہیں اور کہ ہم کس راستے سے ہو کر جا رہے ہیں۔ اور کب پہنچیں گے۔ مجھے ان باتوں میں کچھ دلچسپی نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ جہاز ہے کوئی بس نہیں ہے۔ منزل آ جائے گی تو یہ لوگ خود ہی ہمیں اُترنے کو کہہ دیں گے۔ باقی رہ گئی یہ بات کہ ہم کس راستے سے جا رہے تھے تو اس میں بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، حالاں کہ اس سلسلے میں ایک بار بُری طرح مار کھا چکا تھا۔ ایک بار نوکری کے سلسلے میں ایک انٹرویو میں مجھ سے پوچھا گیا کہ اگر آپ دلّی سے بمبئی بذریعہ ہوائی جہاز جائیں تو کس راستے سے جائیں گے۔ میں نے جواب دیا "پائلٹ کو راستے کا تو پتا ہی ہوگا۔ وہ جس طرف سے لے جائے گا، چلے جائیں گے۔" میرا جواب سُن کر انٹرویو بورڈ کے ممبر ہنس تو دیے لیکن ریزلٹ میں جب میرا نام نظر نہ آیا تو میری سمجھ میں آیا کہ وہ لوگ میرے جواب پر نہیں بلکہ مجھ پر ہنس رہے تھے۔

رات ختم ہو گئی اِس کا احساس مجھے اِس بات سے ہوا کہ جہاز میں ناشتہ دیا جا رہا تھا۔ میں نے بھی مُنہ ہاتھ دھویا اور ناشتے کے

لیے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ٹیلی ویژن کی اسکرین سے ہی مجھے پتا چلا کہ حالانکہ ہندستان میں بائیس مئی کا دن اور رات ختم ہو چکے ہیں، یورپ کی بائیس کا دن ابھی ابھی نکلا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ یورپ کے لوگ نہ صرف ہم سے نسلی امتیاز رکھنا چاہتے ہیں بلکہ اپنے شب و روز بھی ہم سے علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں کہ کہیں میلے نہ ہو جائیں۔

میں نے جہاز میں اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے ساہتیہ اکادمی کے اندر ناتھ چودھری نظر آئے۔ ناروے میں چونکہ اُن کے ساتھ رہنا تھا اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اُن سے باقاعدہ تعارف جہاز میں ہی کر لیا جائے۔ چنانچہ میں اُن کی سیٹ پر گیا۔ چودھری صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جو شکل و صورت سے ہی پڑھے لکھے آدمی لگتے ہیں، میری طرح نہیں کہ زبان کے زور سے منوانا پڑتا ہے کہ میں پڑھا لکھا آدمی ہوں۔

چودھری صاحب بڑی محبت سے پیش آئے۔ اُن سے مل کر مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اُن کے سامنے کوئی نازیبا حرکت کی تو ایک ضابطہ پسند ہیڈ ماسٹر کی طرح مجھے ڈانٹ دیں گے۔ ناروے میں البتہ اُن کے ساتھ پانچ دن گزارنے کے بعد مجھے لگا جیسے میں نے کسی حد تک انھیں اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ وہ نہ صرف میری نازیبا حرکتوں پر مجھے ڈانٹ نہیں رہے تھے بلکہ کئی نازیبا حرکتوں میں میرا ساتھ دے رہے تھے۔

اوسلو کے ایئرپورٹ پر سہر چرن چاولہ اور جمشید مسرور ہمارے استقبال کو کھڑے تھے۔ چاولہ صاحب سے تو خیر پرانی محبتیں تھیں، جمشید مسرور سے البتہ میری پہلی ملاقات تھی حالانکہ میں اُس کی شاعری سے بذریعہ ایوانِ اردو، دہلی، انشا، کلکتہ اور پاکستان کے کئی پرچوں سے خاصا متعارف تھا۔

چاولہ صاحب نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ راستے میں کہنے لگے "یہاں سے آپ کے ہوٹل چلیں گے۔ وہاں آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ اُس کے بعد جمشید مسرور کی طرف سے لنچ کی دعوت ہے۔ آپ کو منظور ہے نا؟" میں نے پوچھا "کیا جمشید مسرور کے ہاں کھانا اچھا نہیں پکتا؟"

"کیا مطلب؟" چاولہ صاحب بولے۔

میں نے کہا "اگر کھانا اچھا پکتا ہے تو پھر نامنظوری کیوں؟" چاولہ صاحب ہنس دیے۔

دونوں گاڑیاں سمندر کے ساحل کے قریب ایک بلڈنگ کے سامنے جا کر رُک گئیں۔ چاولہ صاحب کہنے لگے "آئیے آپ کو تھوڑا سا اوسلو دکھا دیں۔" میں نے کہا کہ اوسلو کی بجائے آپ ہمیں ہمارے ہوٹل کا کمرہ دکھا دیں تو بہتر ہوگا۔ چاولہ صاحب نے جواب دیا "اوسلو ہم آپ کو دکھا ہی اس لیے رہے ہیں کہ ہوٹل کا کمرہ ابھی خالی نہیں ہے، ہوٹل والوں نے کہہ دیا ہے کہ کمرہ بارہ بجے خالی ہوگا۔ اس لیے یہ سیر ضروری ہے۔"

چاولہ صاحب ہمیں ایک میوزیم میں لے گئے جہاں اُن جہازوں کے نمونے رکھے تھے جن میں قدیم زمانے میں نارویجین ملّاحوں نے سمندری سفر کیے تھے۔ ہم تب تک اس میوزیم میں دلچسپی لیتے رہے جب تک بارہ نہیں بج گئے۔ بارہ بجتے ہی باقی سیر کو ملتوی کر کے ہم لوگ ہوٹل کی طرف چل دیے۔

ہوٹل میں مجھے اور اندر ناتھ چودھری صاحب کو ایک مشترکہ کمرہ دیا گیا۔ کمرے میں دونوں پلنگ اس طرح جڑے ہوئے تھے کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل تھا۔ چودھری صاحب کو کمرہ پسند نہیں آیا۔ وجہ یہ بتا رہے تھے کہ "میں نے رات کو سیمینار میں پڑھنے کے لیے پیپر لکھنا ہے اور اس لیے دیر تک جاگوں گا۔ صبح اٹھ کر میں یوگا کرتا ہوں جس سے دلیپ پریشان ہوگا۔"

چاولہ صاحب نے پہلے تو بہانے سے ٹالنا چاہا کہ ہوٹل میں رش اتنا ہے کہ علیحدہ کمرہ ملنا مشکل ہے۔ لیکن جب چودھری صاحب کا اصرار بڑھتا گیا تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ اُن کے بجٹ میں علیحدہ کمروں کی گنجائش نہیں ہے۔

چودھری صاحب کی مشکل کا حل ہوٹل والوں نے ایک منٹ میں تلاش کر لیا۔ انھوں نے ہمیں ایک بڑا کمرہ الاٹ کر دیا جس میں چودھری صاحب اور میں نہ صرف یوگا کر سکتے تھے بلکہ کبڈی تک کھیل سکتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دونوں پلنگ نہ صرف ایک دوسرے سے علیحدہ تھے بلکہ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔

چودھری صاحب کو یکایک احساس ہوا کہ کہیں میں نے اُن کے علیحدہ کمرے کی خواہش کا مطلب یہ تو نہیں لیا کہ وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔ چنانچہ وضاحت کرنے لگے۔ میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ میں نے ہرگز بُرا نہیں مانا۔ بلکہ میں تو دل ہی دل میں دُعا کرتا رہا کہ اُن کا مطالبہ پورا ہو جائے کیوں کہ اس طرح میں بھی اُن کی رفاقت سے بچ جاتا۔ اس پر چودھری صاحب کھلکھلا کر ہنس دیے۔ وہ قہقہہ اس بات کی دلیل تھا کہ انھوں نے میرے وجود کو تسلیم کر لیا ہے۔ میں نے اگلے چار دن اُن کے ساتھ گزارے۔ ان چار دنوں میں ہمارے درمیان جو دوستی کا سلسلہ قائم ہوا، وہ ان شاء اللہ زندگی بھر چلے گا۔ انھوں نے مجھے یوگا کی تعلیم تو نہیں دی لیکن میری صحت کا خیال اس طرح رکھا کہ جیسے یہی اُن کے اوسلو آنے کا اصلی مقصد

ہو۔ ہر قسم کی دوائیاں اُن کے پاس تھیں جو وہ مجھے وقتاً فوقتاً کھلاتے رہے۔ صبح کی چائے بھی وہ مجھے خود بنا کر پلاتے تھے۔ اسی رفاقت کے دوران انھوں نے مجھے اچھا آدمی بننے کے مشورے بھی دیے جن پر میں نے عمل اس لیے نہیں کیا کہ باقی بچی تھوڑی سی زندگی کو بے لطف کیوں بناؤں۔

ایک بجا تو ہم لوگ جمشید مسرور کے گھر پر لنچ کے لیے چل دیے۔ اُسی وقت مجھے احساس ہوا کہ میری طبیعت پر ایک طرح کا بوجھ سا ہے اور شاید لنچ نہ کھانے سے میری حالت سدھر جائے لیکن پھر وہ لطیفہ یاد آگیا کہ ایک پنجابی گھر سے خودکشی کرنے کے ارادے سے ریلوے لائن کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں روٹی کا ڈبّہ بھی تھا۔ کسی نے پوچھا، جب خودکشی ہی کر رہے ہو تو پھر یہ ڈبّہ کس لیے؟ کہنے لگا گاڑی کا کیا پتا، شاید ہمیشہ کی طرح لیٹ ہو۔ میں مرنا تو چاہتا ہوں پر بھوکا نہیں مرنا چاہتا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے روٹی نہ کھانے سے میری طبیعت اور ناساز ہو جائے۔

جمشید مسرور کے گھر پہنچے تو اُن کی بیگم روبینہ اور بچے بہت محبت سے پیش آئے۔ کھانا میز پر رکھا تھا اس لیے سیدھے میز پر ہی جا بیٹھے۔ کیا پُرتکلف کھانا تھا! لیکن مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے اتارا تو میری طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔ شاید میری حالت میری صورت سے عیاں تھی۔ اس لیے سب نے مشورہ دیا کہ میں کھانا نہ کھاؤں بلکہ کچھ دیر آرام کروں۔ میری زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ اتنا لذیذ کھانا چھوڑ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے روبینہ سے کہا بھی کہ نیک بی بی اس میں سے کچھ کھانا میرے لیے بچا کر رکھ دینا، میں کل آ کر کھاؤں گا لیکن اُس نے میری بات کو مذاق سمجھ کر ٹال دیا۔

میری صحت کے ضامن اندر ناتھ چوہدری صاحب نے مشورہ دیا کہ میں ہوٹل جا کر سو جاؤں کہ شاید نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے میری یہ حالت ہوئی ہے۔ رات کی ایک دعوت میں بھی وہ مجھے نہیں لے گئے کہ اُن کے خیال میں نہ کھانا ہی میرا علاج تھا۔ ڈاکٹر سے کوئی الجھ بھی تو نہیں سکتا۔

شام چار بجے کا سویا ہوا میں دوسرے دن سویرے چھ بجے اُٹھا تو میری طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ اندر ناتھ چوہدری نہ صرف ادب کے ڈاکٹر ہیں بلکہ کئی انسانی بیماریوں کا علاج بھی جانتے ہیں۔ میں نے نہا دھو کر ہوٹل کے ریستوران میں ڈٹ کر ناشتہ کیا اور سیمینار میں حصّہ لینے کے لیے چل دیا۔

(باقی آئندہ)

غزل پارے

تمام رابطوں رشتوں سے کٹ کے دیکھ لیا
خود اپنے آپ میں ہم نے سمٹ کے دیکھ لیا
نہیں تھا غم کا تاثر کسی کے چہرے پر
یہ رنگ بھی دمِ رخصت پلٹ کے دیکھ لیا
عجیب کرب نے آنکھوں سے چھین لیں نیندیں
کبھی جو صفحۂ ماضی اُلٹ کے دیکھ لیا
تمام لفظ معانی سے ہو گئے عاری
غزل سے ہم نے ذرا دیر ہٹ کے دیکھ لیا
نہ کام آسکے غزنؔی یہ انکسار و خلوص
سبق یہ ہم نے کئی بار رٹ کے دیکھ لیا

غضنفر غزنؔی
۲۵، چوبٹہ تریان، خورجہ ۲۰۳۱۳۱، بلند شہر (یو.پی)

کس طرح چُور دل کا ترے آئینہ ہوا
کیا شہرِ آرزو میں کوئی حادثہ ہوا
اب خیمۂ سکوں کی طنابیں لرزتی ہیں
طوفانِ غم میں اس طرح میں ہوں گھرا ہوا
اس جانِ گلستاں کی ہیں مجھ پر عنایتیں
کانٹوں سے میرا دامنِ دل ہے بھرا ہوا
کتنی مصیبتوں کا رہا سامنا مگر
پھر بھی نہ پست دل کا مرے حوصلہ ہوا
پھولوں بھری ڈگر پہ میں جب بھی چلا ولی
تلووں کو ہر قدم پہ عطا آبلہ ہوا

ولؔی مدنی
لکھمینا، بیگوسرائے ۸۵۱۲۱۱ (بہار)

کچّی دیوار پر مکان کا بوجھ
بوڑھے کاندھے پہ آسمان کا بوجھ
ایک ذرّہ لگے پہاڑ کبھی
کبھی ہلکا لگے چٹان کا بوجھ
دُھوپ کے ہاتھ نے اُتار لیے
نہ رہا سر پہ سائبان کا بوجھ
دیکھیں کب چاند پر اُترتا ہے
وہ پرندہ لیے اُڑان کا بوجھ
میں ہوں کاغذ کی ایک ناؤ فراقؔ
مجھ پہ بھاری ہے بادبان کا بوجھ

فراقؔ جلال پوری
محلہ قاضی پورہ، پوسٹ جلال پور، ضلع فیض آباد ۲۲۴۱۴۹

رکھّا بھی اُس کو میں نے سدا اپنے دھیان میں
مصروف بھی رہا ہوں میں کارِ جہان میں
اِک راستہ مِلا تو کئی راستے کُھلے
کِتنے نشان پا لیے ہیں اِک نشان میں
اب تُو بھی بچ نِکلنے کی صورت تلاش کر
تیرا بھی نام آئے گا اُس کے بیان میں
زنداں کی سمت آئے گی بادِ صبا ضرور
کب سے اسیر ہوں اِسی وہم و گمان میں
کردار سارے آ کے جہاں قتل ہو گئے
یہ کیسا موڑ آ گیا ہے داستان میں

فاروؔق انجینیر
ڈی۔۳، سترمل کالونی، کوٹہ ۳۲۴۰۰۸ (راجستھان)

توانائی — مستقبل میں

انور میناتی

الامین ایجوکیشنل کامپلکس ہوسور روڈ ۱۰۱ — بی کرناٹک

سائنس دان، مادہ اور توانائی سے متعلق زیادہ جانکاری حاصل کرنے میں سرگرداں ہیں۔ وہ مستقبل میں مزید عناصر (تاحال ۱۰۹ عناصر دریافت کیے جاچکے ہیں) کی دریافت کی اُمید نہیں رکھتے۔ غالباً مادے کی چند خاصیتوں میں تغیر عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ سائنس دانوں کو اُن طریقوں کی جستجو ہے جن کے ذریعے کچھ مادے نرم یا سخت بنائے جاسکتے ہیں۔ مستقبل میں نئے طریقوں کی مدد سے کیمیا گردں کا جوہروں (ATOMS) کو آپس میں متحد کرنا یقینی دکھائی دیتا ہے۔ غالباً نئی چیزوں کے نئے سالمے بنائے جائیں گے۔

توانائی ہی ایک ایسا موضوع ہے جس میں سائنس دانوں کو کافی ترقی کے امکانات نظر آرہے ہیں۔ وہ توانائی (جس کا ہمیں علم ہے) کے نئے طریقہ استعمال کی سمت اپنی نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ وہ ایک نوع کی توانائی کو دوسری قسم کی توانائی میں تبدیل کرنے کے لیے نئے طریقوں کی جستجو میں لگے ہیں۔ مستقبل کی سب سے بڑی کامیابی، شاید خلائی سفر ہوگی۔ خلائی سفر کے ذریعے خلائی اڈے تعمیر کرنے کے لیے راکٹوں کی ضرورت ہوگی۔ راکٹ میں جلتے ہوئے ایندھن کی کیمیائی توانائی، میکانیکی توانائی میں تبدیل ہوجاتی ہے، جو راکٹ کو حرکت میں لاتی ہے۔ سائنس دانوں کو توقع ہے کہ نئے اور زیادہ فعال راکٹ ایجاد کیے جائیں گے۔

ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ حرارت کی توانائی کے نئے طریقے دریافت کیے جائیں۔ موجودہ عہد میں حرارتی توانائی حاصل کرنے کا اہم طریقہ جلتے ہوئے ایندھن کی کیمیائی توانائی کا استعمال ہے۔ مستقبل میں کوئلہ اور تیل کے وسائل ختم ہوسکتے ہیں۔ ایندھن کی ممکنہ کمی کو پورا کرنے کے لیے جوہری توانائی کو حرارتی توانائی میں تبدیل کرنا لازمی ہوگا۔

آج کل یہ عمل جوہری تابکار (NUCL-EAR REACTOR) میں انشقاق (FISSION) کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ جوہروں کے مرکزوں کی توڑ پھوڑ سے کافی حرارتی توانائی خارج ہوتی ہے جو پانی کو بخارات میں بدلنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور اس کی مدد سے ٹربائین چلائے جاتے ہیں۔ یہ ٹربائین برقی جنریٹرس کو حرکت میں لاتے ہیں، جو ہمیں برقی رَو مہیا کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم مستقبل میں قابلِ قدر جوہری تابکاری کی توقع کرسکتے ہیں۔

فیوژن یا پگھلاؤ کے ذریعے بھی جوہری توانائی سے حرارت حاصل کی جاسکتی ہے۔ دو یا زائد ہلکے جوہروں کو باہمی طور پر پگھلا کر نیا وزنی مرکزہ حاصل کیا جاتا ہے مگر اس کا وزن تعامل پذیر مرکزوں کے وزن سے کم ہوتا ہے۔ کیوں کہ کچھ زیرِ تعامل مادہ اشعاعی توانائی میں تبدیل ہوجاتا ہے ——— سورج اپنے عناصر کے باہمی پگھلاؤ سے انتہائی اشعاعی توانائی حاصل کرتا ہے۔ سمندروں سے بھی توانائی اخذ کی جاسکتی ہے مگر یہ طریقہ خاص قسم کی ہائیڈروجن کے استعمال پر منحصر ہے۔ سمندروں سے اس قسم کی ہائیڈروجن کی بے انتہا فراہمی ہوسکتی ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو پھر ایندھن کی کمی کا خطرہ ٹل جائے گا۔ بدقسمتی سے پگھلاؤ (FUSION) کے طریقے کے لیے انتہائی حرارت (ملینوں ڈگری) درکار ہے۔ ابتداءً ہائیڈروجن بم میں انشقاقی قسم کے جوہری بم کا دھماکہ کیا جاتا ہے۔ وافر کثیر مقدار میں حرارت حاصل کی جاتی ہے، جس کے ذریعے ہائیڈروجن کے مرکزوں کو پگھلایا جاتا ہے۔ آج کل یہی طریقہ رائج ہے۔ سائنس داں اس جستجو میں منہمک ہیں کہ پگھلاؤ کے ضبط سے کس طرح فائدے مند کام لیے جاسکتے ہیں۔ انھیں مستقبل میں کامیابی کی اُمید ہے۔ فی الوقت برقی رو پیدا کرنے کا طریقہ ناکافی ہے۔ برقی رو پیدا کرنے سے پہلے توانائی کی ہمہ قسم کی تبدیلیوں کو عمل میں لانا ہوگا۔ اس طرح کچھ توانائی رائیگاں

ہو جائے گی۔ برقی رو پیدا کرنے کا موثر طریقہ حرارت یا جوہری توانائی کو براہِ راست برقی توانائی میں تبدیل کرنا ہے۔ مگر اس طرح پیدا شدہ برقی رَو کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔ کیونکہ توانائی کی تبدیلی کے طریقے خود اپنے آپ میں ناقص ہیں۔ مگر سائنس دانوں کا ایقان ہے کہ مستقبل میں ان طریقوں کو مکمل طور پر درست کرلیا جائے گا۔

آج کل سورج کی بے انتہا اشعاعی توانائی کا بیشتر حصہ جو زمین حاصل کرتی ہے وہ برباد ہو جاتا ہے۔ مگر اس توانائی کے کچھ مصرف کی ابتدا ہو چکی ہے، جو کھانے کی تیاری، اور گھروں کو حرارت بخشنے کے لیے مختص ہے مگر اس ضمن میں مزید تحقیق لازمی ہے۔

جب کسی محدب عدسے کی مدد سے ہم سورج کی شعاعوں کو ہاتھ کے پچھلے حصے پر مرتکز کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ روشنی حرارت پیدا کرتی ہے۔ اس طرح جب شعاعیں چھوٹے رقبے پر مرتکز کی جاتی ہیں تو توانائی کا ارتکاز مناسب حرارت پیدا کرتا ہے ـــــــ ماہرینِ طبیعات، لیزر آلے کی مدد سے، روشنی کی شعاعوں کو اک خاص نوعیت کی روشنی جس کو مربوط روشنی (WHERANT LIGHT) کہتے ہیں، تبدیل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ یہ روشنی عام روشنی سے کئی گُنا زیادہ سود مند ہے۔ خاص عدسوں کے ذریعے اسے بالکل چھوٹی جگہ پر مرتکز کیا جاتا ہے۔ اور مربوط روشنی کے ارتکاز سے وافر مقدار میں حرارت حاصل کی جاتی ہے۔

آج کل مربوط روشنی کی حرارت سے کچھ قسم کے آلات کی ویلڈنگ کی جاتی ہے ڈاکٹر اس روشنی کی حرارت کو "تیز چاقو" کے طور پر نازک آپریشن کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ریڈیو لہروں کے عوض مربوط روشنی کو خبر رسانی اور ٹی۔وی تصاویر کی ترسیل کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے ـــــــ ریڈیو لہر سے زیادہ اطلاعات کو سفید روشنی کی اک شعاع کے ذریعے روانہ کیا جا سکتا ہے۔ سائنس دانوں کو یہ یقین ہے کہ وہ مربوط روشنی کے مزید استعمالات کے امکانات کو مستقبل میں روشن کر سکتے ہیں ـــــــ توانائی کے دیگر ذرائع بھی ہیں جنھیں دریافت کرنے کی سعی کی جا رہی ہے مثلاً بے انتہا میکانکی توانائی، سمندر کی لہروں کے جوار بھاٹے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ زمین کی تہہ میں وافر مقدار میں حرارت پیدا ہوتی ہے جس کے استعمال کے طریقے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ سائنس دانوں کو نہ صرف زیادہ توانائی کے ذرائع دریافت کرنے کی فکر ہے بلکہ نامعلوم توانائی کے ذخائر کی بھی انھیں تلاش ہے۔

کاغذی ہے پیرہن

مشتاق انجم
آئی۔ ڈبلو۔ ڈپارٹمنٹ، رائٹرز بلڈنگ، کلکتہ۔ ا

"مُسکراہٹ بھی عجیب شے ہے۔ لبوں کو ہلکی سی جنبش ہوتی ہے اور سارے وجود کو ایک فرحت بخش تازگی دے جاتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ بازار میں دستیاب نہیں، ورنہ کم از کم اِسے خریدنے کی کوشش تو کی جا سکتی تھی۔"

کہانی کار کافی ہاؤس میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔

"کسی زمانے میں یوں بھی ہوتا تھا کہ لوگ جب تھک ہار کر اپنے گھروں کو لوٹتے تھے تو وہاں گھر کی چہار دیواری میں بیوی بچّوں، بھائی بہنوں اور والدین کے درمیان مسکراہٹیں اُن کا استقبال کرتی تھیں۔ مگر آج..." یکایک اُس کی نظر اُنگلی میں پھنسے سگریٹ پر گئی جو اب بُجھ چکا تھا۔ اُس نے کچھ سوچ کر بجھے سگریٹ کو ایش ٹرے میں ڈال دیا لیکن خود کو... اُس نے دوسرا سگریٹ سُلگایا اور مُنہ سے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتا ہوا اپنے ذہنی سفر پر چل پڑا۔

تمام دن مختلف فائیلوں میں یوں سر کھپانا جیسے کوئی ٹیچر کسی انتہائی کُند ذہن شاگرد کے پیچھے زبردستی سر کھپاتا ہے تاکہ مہینے کے اختتام پر اُس کی جیب کی گرمی اُسے ایک آدھ مُسکراہٹ دے جائے۔ شام کو ٹراموں اور بسوں میں دھکّے کھاتے ہوئے پریشان چہرہ لیے گھر پہنچنا۔ وہاں بچّوں کی دھینگا مشتی، بیوی کی کبھی نہ ختم ہونے والی شکایتیں اور بیمار ماں کی سسکیوں کے درمیان کوئی کب تک زندہ رہے۔ ضعیف باپ کی آنکھیں یتیم ہوگئی ہیں۔ عینک کا فریم ٹوٹ گیا۔ اُسے اگلے مہینے تنخواہ ملتے ہی بنوانا ہے ورنہ ریٹائرڈ باپ کے دل میں خدانخواستہ کہیں یہ بات سما گئی کہ اُسے نوکری سے چھٹّی ملتے ہی بیٹا اُس سے بیزار ہوگیا ہے تو... آنے والی بھولی بھٹکی مسکراہٹوں کے درمیان فاصلے اور بڑھیں گے۔

اُس نے ایک بار اپنا سر جھٹکا اور اِرد گرد بیٹھے لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ جا بجا کالج کے لڑکے لڑکیاں کرسیوں پر بیٹھے ایک دوسرے پر جھکے ہوئے یوں سرگوشیاں کر رہے تھے جیسے انھیں خوف ہو کہ ان کی گفتگو اُن کے والدین نہ سُن لیں۔ وہ سوچنے لگا۔ اُن کے والدین کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ اپنے بچّوں کی سرگوشیوں سے پیدا ہونے والی چیخ پکار سُنیں۔ انھیں اپنے آپ کو سننے کی مہلت نہیں۔

سامنے میز پر بیٹھی لڑکی کبھی اپنے وی شیپ بلاؤز سے جھانکتے ہوئے طوفان کو دیکھتی اور کبھی روبرو بیٹھے اپنے دوست کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے لگتی۔ مگر اُس کا ساتھی بجائے کچھ کہنے کے ہاتھ کے اشارے سے اُس سے کچھ مانگ رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے بے چینی ٹپک رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد نوجوان لڑکی نے اپنے بیگ سے ایک ٹکیہ نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ لڑکا نہایت سُرعت سے ٹکیہ پھانک گیا۔ چند لمحوں بعد وہ نارمل ہوگیا اور ہنس ہنس کر اپنی دوست سے باتیں کرنے لگا۔ لڑکی کے لبوں پر بھی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ دونوں کی مسکراہٹوں کا لمس جب کہانی کار نے اپنے ہونٹوں پر محسوس کیا تو اُسے بھی ہلکی سی تازگی کا احساس ہوا۔ اُس نے سوچا ہاتھ بڑھا کر وہ بھی لڑکی سے ایک ٹکیہ مانگ لے مگر پھر... اُس مُسکراہٹ کے بدلے میں ملنے والی بے شمار بے چینیوں کا خیال آتے ہی وہ سہم گیا۔

"نہیں، ایسی مسکراہٹ کس کام کی؟"

وہ بُدبُدایا۔

اُسے یاد آرہا تھا۔ ایک دفعہ بچپن

میں ٹیچر نے کلاس میں اول آنے پر اُسے شاباشی دیتے ہوئے کہا تھا۔ "تم ایک دن بہت بڑے آدمی بنوگے۔ اپنی تحریروں سے ساری دُنیا کو مسکراہٹیں بانٹو گے۔" اِس وقت مسکراہٹیں بانٹنے کا مفہوم وہ نہیں سمجھ پایا تھا۔ مگر ٹیچر کی زبان سے تعریفی کلمات سُن کر اُس نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کا لمس ضرور محسوس کیا تھا۔

مگر آج وہ ۔۔۔ اپنی تحریریں لیے زندگی کے چوراہے پر کھڑا تھا لیکن اُس کی کوئی نہیں سُنتا تھا۔ وہ اپنی تمام کہانیاں بیچ کر بھی ایک مُسکراہٹ نہیں خرید پا رہا تھا۔

اُس کی بیوی کہتی ہے "آفس میں اوپر کی آمدنی پر توجہ دو۔ ورنہ جہیز کی ساری چیزیں ایک ایک کرکے بِک جائیں گی اور مسکراہٹیں دُور کھڑی مُنہ چڑھاتی رہیں گی۔ زندگی میں کچھ کرنے کے لیے پیسہ بہت ضروری ہے۔"

لیکن جن کے پاس دولت کی فراوانی ہے اُن کے ہونٹوں پر بھی آج کل مسکراہٹوں کا رنگ کہاں چڑھ پا رہا ہے۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد رات کو انھیں نیند ہی نہیں آتی۔ بھلا ہو اُس کیمسٹ (CHEMIST) کا جس نے خواب آور گولیاں تیار کیں۔ ورنہ اُن بے چارے امیرزادوں کا کیا حشر ہوتا۔

پھر اُسے اپنے آفس کے بڑے بابو کا چہرہ نظر آیا۔ ماشاء اللہ اُن کی اوپر کی آمدنی اُن کی تنخواہ سے دُگنی ہے ۔۔۔ بڑے بابو ۔۔۔ جن کی توند باہر کو نکلی ہوئی مگر آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ چہرے پر ہوس کی پرچھائیاں ریگستان کے سنّاٹے کی طرح چھائی رہتی ہیں۔ اُن کی زندگی ایک مشین کی طرح ہے۔ اُن کا مقصد زیادہ سے زیادہ کمانا اور بیوی بچّوں پر خرچ کرنا ۔۔۔ اور اِس اسٹیریو ٹائپ 'کام' میں وہ اِس طرح دن رات سرگرداں رہتے ہیں کہ انھیں مسکرانے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔

کہانی کار نے ایک نظر انگلیوں میں پھنسے ہوئے سگریٹ پر ڈالی۔ جو اُس کی بے توجہی کے سبب اب بُجھنے ہی والا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی دو تین کش کھینچے۔ سگریٹ پھر سے جل اُٹھا۔ اُس نے سلگتے ہوئے سگریٹ کو دیکھا۔ ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا' دو اُنگلیوں کے درمیان اٹکا ہوا ایک بے بس سگریٹ۔ جس کی قسمت میں سُلگنا تھا جیسے زمین و آسمان کے بیچ سلگتی ہوئی بے بس نسلِ آدم۔ جس کی تقدیر ہے سلگنا اور خاموش رہنا۔ وہ کبھی وقت سے پہلے بُجھنا چاہتا ہے تو حالات پھونک مار مار کر اُسے سُلگا دیتے ہیں کہ ٹیس کی شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اِس میں نالہ و فریاد کی سکت باقی نہیں' اُس نے دُنیا میں آکر اور کچھ سیکھا ہو یا نہیں پر حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا ہے۔

یکایک کہانی کار کی نظر استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھی اُس شوخ حسینہ پر پڑی جس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کے ساتھ ایک پُر لطف مسکراہٹ بھی چپکی ہوئی تھی۔

"آرڈر پلیز" ویٹر اُس کے سامنے آدھمکا۔ اُسے ایسا لگا کہ ویٹر زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہا ہے اور اِس کوشش میں اُسے جس قدر تکلیف ہو رہی تھی اُس کے اثرات اُس کے چہرے پر عیاں تھے۔ پانچ سو روپے ماہوار پلنے والا کافی ہاؤس کا ایک معمولی ویٹر زبردستی مُسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ خود ۔۔۔؟

"ایک کافی دے جاؤ" کہانی کار نے ویٹر کو زبردستی مُسکرانے کی زحمت سے نجات دینے کی غرض سے کہا۔

ویٹر تھوڑی دیر بعد کافی دے گیا۔

وہ آہستہ آہستہ کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ اُس نے ایک بار پھر استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی حسبِ معمول اندر آنے والوں کا مسکرا مسکرا استقبال کر رہی تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اُس شوخ حسینہ کی طرف لپکا۔

"یس پلیز" وہ دلآویز انداز مُسکرائی۔

"ایک سوال؟"

"فرمائیے۔"

"آپ کی مُسکراہٹ کا راز؟"

"آپ کسی ADVERTISING AGENCY میں کام کرتے ہیں" وہ اب مسکرا رہی تھی۔

"جی نہیں ــــ میں ایک کہانی کار ہوں۔"

"اچھا . . . بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں؟" ہونٹوں کی مسکراہٹ بدستور روشن تھی۔

"آپ کی مسکراہٹ کا راز؟" اس نے اپنا سوال دُہرایا۔

"مار کھائیے کہانی کار صاحب" وہ بولی ــــ اور ایک لمحے کے لیے اس کی مسکراہٹ کہیں کھوگئی، چشم زدن میں ایک بجلی لہرائی۔ اور اُس ایک پل کی روشنی میں کہانی کار نے لڑکی کے چہرے پر اُداسیوں کا لامتناہی سلسلہ دیکھا۔

"میڈم ــــ" کسی نے لڑکی کو مخاطب کیا۔

"یس پلیز ــــ" ہونٹوں کی مسکراہٹ دوبارہ زندہ ہوگئی۔

اور کہانی کار اپنی اُنگلیوں میں بجھے ہوئے سگریٹ کو دیکھنے لگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد

شخصیت اور کارنامے

بیسویں صدی کے عظیم مذہبی، فکری، سیاسی پیشوا مولانا ابوالکلام آزاد کی برگزیدہ شخصیت اور ان کے علمی، عملی کارناموں پر اہم دستاویز۔

مولانا کی شخصیت اور کارناموں سے مکمل آگاہی کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل مولانا کے مکمل سوانح حیات درج کیے گئے ہیں اور مولانا کی تاریخی اور اہم ترین تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔

مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم   صفحات: ۵۰۲   قیمت: ۴۸ روپے

حواشی ابوالکلام آزاد

یہ کتاب اُن حواشی کا مجموعہ ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد نے دورانِ مطالعہ مختلف کتابوں پر لکھے ہیں۔ یہ کتابیں مختلف زبانوں کی ہیں اور مختلف علوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولانا نے جب وہ حکومت ہند کے وزیر تعلیمات تھے، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا اور اپنا ذاتی کتب خانہ جو کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا، اس ادارے کو دے کر ایک لائبریری قائم کردی تھی۔ سید مسیح الحسن صاحب نے، جو برسوں تک اس لائبریری میں کام کرتے رہے ہیں، ان تمام کتابوں کو غائر نظر سے دیکھا ہے اور ان پر مولانا کے قلم سے جو حواشی درج ہیں وہ اس کتاب میں یکجا کردیے ہیں۔ اور جن کتابوں پر یہ حواشی درج تھے، ان کے بارے میں بھی تمام ضروری معلومات فراہم کردی ہیں۔

مصنف: مولانا ابوالکلام آزاد   مرتب: سید مسیح الحسن

صفحات: ۵۷۹   قیمت: ۶۲ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں



گوشۂ

کمار پاشی

نام : شنکر دت

ولادت : ۴ جولائی ۱۹۳۵ء، بمقام بہاولپور

شاعری کے مجموعے : (۱) پرانے موسموں کی آواز، ۱۹۶۶ء (۲) خواب تماشا، ۱۹۶۸ء (۳) ولاس یاترا، ایک لمبی کویتا، ۱۹۷۲ء (۴) انتظار کی رات، ۱۹۷۳ء (۵) رو بہ رو، ۱۹۷۶ء (۶) اِک موسم مرے دل کے اندر، اِک موسم مرے باہر، ۱۹۷۹ء (۷) زوالِ شب کا منظر، ۱۹۸۴ء (۸) اردھانگنی کے نام، دیوناگری لپی میں، ۱۹۸۶ء (۹) چاند چراغ، زیرِ طبع

کہانیوں کا مجموعہ : پہلے آسمان کا زوال، ۱۹۷۲ء

ڈراموں کے مجموعے : (۱) جملوں کی بنیاد، ۱۹۷۳ء (۲) زوال کے قیدی، ۱۹۸۰ء

تالیفات : (۱) ۱۹۶۷ء کی منتخب شاعری، ۱۹۶۸ء (۲) ۱۹۶۸ء کی منتخب شاعری، ۱۹۶۹ء (۳) ۱۹۶۹ء کی منتخب شاعری، ۱۹۷۰ء (۴) ۱۹۷۰ء کی منتخب شاعری، ۱۹۷۱ء (۵) ۱۹۷۱ء کی منتخب شاعری، ۱۹۷۲ء (۶) دھوپ اور سمندر، افسانوں کا انتخاب، ۱۹۷۲ء (۷) محمد علوی، ایک مطالعہ، ۱۹۷۸ء (۸) میرا جی، فن اور شخصیت، ۱۹۸۰ء (۹) گوپال متّل، فن اور شخصیت، ۱۹۸۳ء

انعامات : اُتر پردیش اُردو اکادمی کی طرف سے "ولاس یاترا"، "رو بہ رو" اور "اک موسم مرے دل کے اندر اک موسم مرے باہر" پر
محکمۂ تعلیم حکومتِ اُتر پردیش کی طرف سے "پہلے آسمان کا زوال" پر
دہلی اُردو اکادمی کی طرف سے "زوالِ شب کا منظر" پر

جلد باز

(کمار پاشی کی اچانک موت پر)

سفر ہو یا حضر ہو، جلد بازی اُس کی عادت تھی
سدا عجلت میں رہتا تھا
ہواؤں کی طرح اپنی فضاؤں میں وہ بہتا تھا
مجھے معلوم ہیں سب عادتیں اُس کی
لپکتا پیار تھا اُس کا تو اُڑتی نفرتیں اُس کی
بڑی عجلت سے بانٹیں اس نے دُنیا کو یہ سوغاتیں

وہ شاید اک قلندر تھا
قلندر سے بھی بڑھ کر تھا
خدا سے بھی خفا اُس کی خدائی سے بھی کچھ ناخوش
خدا کے نیک بندوں سے مگر اُس کو محبت تھی
عقیدت تھی
کہیں وہ کرشن کا بندہ کہیں گوتم کا دلدادہ
ابھی عیسیٰ کا سودائی، ابھی نانک کا مستانہ
محمدؐ کا بھی دیوانہ
نہیں جوڑے کسی سے دیر پا کچھ رابطے اُس نے
بہت ہی جلد بازی میں کیے سب فیصلے اُس نے

وہ اپنے ہر قدم پر اِک نئی بنیاد رکھتا تھا
مزہ اَن دیکھی راہوں پر سفر کرنے کا چکھتا تھا
نئی طرزِ سخن اس کی
انوکھا تھا کلام اُس کا
الگ تھی اُس کی اک دُنیا
الگ تھا اِک نظام اس کا
وہ اپنے ایک اِک پل میں کئی عالم بناتا تھا
ہزاروں کائناتیں ایک لمحے میں
بناتا تھا، مٹاتا تھا

وہ سچ مچ اِک قلندر تھا
قلندر سے بھی بڑھ کر تھا
سمجھتا تھا کہ جو کچھ دیکھتے ہیں ہم
فقط نظروں کا دھوکا ہے
کہ جو کچھ سن رہے ہیں ہم
سماعت کا چھلاوا ہے

اُسے دھن تھی کہ یہ جھوٹے تماشے چھوڑ دے پیچھے
کسی سچ کے تعاقب میں
کہیں آگے، بہت آگے نکل جائے
اسی دھن میں وہ رہتا تھا
ہوا کے ساتھ بہتا تھا
اسی دھن میں خود اِک جھوٹا تماشا کر گیا پاشی
کوئی باور نہ کر لینا کہ یارو مر گیا پاشی

مخمور سعیدی

رزّاق ارشد
نازش بک سینٹر، گھیر میر عالم خاں، امیر گنج، ٹونک ۳۰۴۰۰۱

کمار پاشی کی یاد میں

جنوں اس کا مثالی بن گیا تھا — وہ خوابوں کا تماشا دیکھتا تھا
اُسے اندر کا موسم لے کے ڈوبا — جسے باہر کا موسم ڈس رہا تھا
وہ تھا جملوں کی بنیادوں سے واقف — وہ لفظوں کو برتنا جانتا تھا
رہا تھا منتظر راتوں کو جس کا — اسی کی کھوج میں گھر سے چلا تھا
اچانک یوں ہی گُم ہونا تھا اس کو — پُرانے موسموں کی وہ صدا تھا
چراغ اک چاند کا دل میں جلا کر — زوالِ شب کا منظر دیکھتا تھا
کوئی بھی روبرو ٹھہرا نہ اس کے — سطور ایسی ہی کچھ وہ لکھ رہا تھا
بلندی پر رہی پرواز اس کی — زوالِ آسماں اس نے کیا تھا

ولاست یاترا کو چھوڑ، ارشد
وہ انتم یاترا پر چل پڑا تھا

ایک شعر میں پاشی صاحب کے رسالے سطور کا حوالہ ہے باقی تمام اشعار میں ان کی کسی کتاب کے نام کی طرف اشارہ ہے

کمار پاشی

متھرا

متھرا، متھرا ——
تم میری کیا لگتی ہو؟
تم سے میرا کیا رشتہ ہے؟
گوکل کی گلیوں سے پوچھو،
اور بتاؤ:
پہلا حرف کہاں گونجا تھا؟
وہ پہلی آواز
سُنا تھا
جس کو اس برہمانڈ نے
لاکھوں صدیوں پہلے

دیکھ رہا ہوں:
دُور کدم کے
سبز، سہانے پیڑ ہی پیڑ نظر آتے ہیں
شام سمے
گیتوں کے سنگ گوالے جیسے گھر آتے ہیں
صدیاں گزریں
لیکن اب بھی گوالا اپنے گھر نہیں آیا
رادھا کا دلبر نہیں آیا

ہر دہلیز پہ آج یشودھا
اُس کا رستہ دیکھ رہی ہے
صدیوں بعد بھی
دُور سے جیسے
اُس کو آتا دیکھ رہی ہے

وہ ہے ایک اکیلا
اُس کے روپ ہزاروں
دُنیا میں جتنے بھی ہیں
سب نام ہیں اس کے
سب آغاز ہیں اس کے
سب انجام ہیں اس کے
یہ بحر و بر اس کے
سحر و شام ہیں اس کے

یہ پربت یہ جنگل اس کے
آسمان پر بادل اس کے
یہ لہروں کے آنچل اس کے
سب ظاہر، سب اوجھل اس کے
وہی نہیں اِک
لیکن اس کا رچا
یہ سب سنسار وہی ہے
ہر منظر اس پار وہی، اُس پار وہی ہے
قدم قدم پر
آج بھی اتیاچار وہی ہے
سوئے ہوئے ہیں سب
لیکن کہتے ہیں:
اس سارے برہمانڈ میں
آج بھی اِک بیدار وہی ہے
آج بھی اس کی بنسی کی دُھن
صبح کی میٹھی کرنوں سے
چھن کر آتی ہے
آج بھی ہم کو اندھیاروں کی
فوج سے لڑنا سکھلاتی ہے

(زیرِ طبع مجموعے "چاند چراغ" سے)

کمار پاشی

نظمیں

کل یگ

دل میں ایک شجر ہوتا تھا
گھنا سا : سایہ دار شجر
جس کے سبز سہانے
پتّوں میں چھپ کر
چڑیاں نغمے گاتی تھیں
مجھ کو وجد میں لاتی تھیں

دل میں اک دریا ہوتا تھا
ہولے ہولے بہتا ہوا
اور اپنی موجوں کی زباں میں
میرے ہرے بھرے ماضی کی
کوئی کہانی کہتا ہوا
لیکن اب اس دل میں
کوئی شجر، نہ کوئی دریا ہے
چار طرف اک صحرا ہے
تیز ہوائیں دور تلک
ہر دم گرد اُڑاتی ہیں
اک اک کر کے
مجھ سے میرے
سارے سندر موسم چھینے جاتی ہیں

سب دروازے

میں نے اپنے گھر کی ساری کھڑکیاں سب دروازے
کھول دیے ہیں
سُرخ، سنہری گوؤں سنگ اوشا بھی آئے
کچے دودھ سے مُنہ دھو کر چندا بھی آئے
تیز نکیلی دھوپ بھی جھانکے
نرم، سہانی ہوا بھی آئے
تازہ کھلے ہوئے پھولوں کی
مَن موہن خوشبو بھی آئے
دیس دیس کی خاک چھانتا ہوا کوئی سادھو بھی آئے
اور کبھی بھولے سے
شاید
تو بھی آئے
یگوں یگوں سے
مَیں نے
اپنے دل کی ساری کھڑکیاں، سب دروازے
کھول رکھے ہیں!

گنگا کے نام

گنگا!
مَیں صدیوں صدیوں کا تھکا ہوا ہوں
گنگا!
لے اب تو مَیں ترے کنارے آکر بیٹھ گیا ہوں
گنگا!
شاید کل تک مَیں پتّھر بن جاؤں
شاید تجھ کو چھو نہ سکوں میں
گنگا!
لہروں والے اپنے ہاتھ بڑھا کر
گود میں مجھے اُٹھا لے جانا
گنگا!
ساتھ بہا لے جانا ——

("چاند چراغ" سے)

غزل پیرا

کمار پاشی

سال یہ اچھا نہیں گیا ہے
مجھے بھی سوچا نہیں گیا ہے

اُس منزل پر پہنچو جس تک!
کوئی بھی رستا نہیں گیا ہے

کبھی کبھی میں وہ پڑھتا ہوں
جس کو لکھا نہیں گیا ہے

تم خوشبو ہو جب تک تم کو
شاخ سے توڑا نہیں گیا ہے

اس گھر کے بارے میں سوچو
جہاں اُجالا نہیں گیا ہے

یوں تو سب اچھے ہیں لیکن
کسی کو پرکھا نہیں گیا ہے

رُک جا پاشی اس رستے سے
کوئی دوبارا نہیں گیا ہے

ہیں سارے انکشاف اپنے ہیں سارے ممکنات اپنے
ہم اس دنیا کا سارا علم لے جائیں گے ساتھ اپنے

چمک ویسی نہ ماتھے پر، دمک ویسی نہ چہرے پر
ستارے کس کے گھر جانے لٹا آئی ہے رات اپنے

نہ ہوگی دل کشی دنیا میں، اک دن وہ بھی آئے گا
کہ سارے راز اُگل دے گی کسی دن کائنات اپنے

نہیں گر دیکھ سکتی موت سے لڑتے ہوئے مجھ کو
تو پھر اے زندگی لے جا تُو سارے التفات اپنے

کُھلا ہے عمر کی شامِ حزیں میں راز یہ پاشی
کہ ہر دم موت کو بھی ساتھ رکھتی ہے حیات اپنے

ایک کہانی ختم ہوئی ہے ایک کہانی باقی ہے
میں بے شک مسمار ہوں لیکن میرا ثانی باقی ہے

وحشتِ جنوں کی خاک اُڑانے والوں کی ہمت دیکھو
ٹوٹ چکے ہیں اندر سے لیکن من مانی باقی ہے

ہاتھ مرے پتوار بنے اور لہریں کشتی میری
زور ہوا کا قائم ہے دریا کی روانی باقی ہے

لگتا ہے گلتا ہے اب بھی چلے جاتے ہیں ہم اس کوچے میں
ذہن بزرگی اوڑھ چکا دل کی نادانی باقی ہے

کچھ غزلیں ان زلفوں پر ہیں، کچھ غزلیں ان آنکھوں پر
جانے والے دوست کی اب اک یہی نشانی باقی ہے

نئی نئی آوازیں اُبھریں پاشی اور پھر ڈوب گئیں
شہرِ سخن میں لیکن اک آواز پرانی باقی ہے

("چاند چراغ" سے)

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

اکتوبر ۱۹۹۲ء کے "ایوانِ اُردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جارہے ہیں ——— "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جارہے ہیں۔



پچھلے ماہ کی تصویر

شعری عنوانات

او میرے مصروف خدا
اپنی دُنیا دیکھ ذرا (ناصر کاظمی)
مرسلہ: ریشما شہری، رسول منزل،
محلہ مُلّا علیم، دربھنگہ (بہار)

نلوں کے پانی میں وہ لطف اور مٹھاس کہاں
مجھے تو گاؤں کے پنگھٹ کی یاد آتی ہے (مختار ٹونکی)
مرسلہ: شادماں تبسم، ٹونک

نہ کوئی خواب ہمارا ہے، نہ تعبیریں ہیں
ہم تو پانی پہ بنائی ہوئی تصویریں ہیں (نامعلوم)
مرسلہ: اطہر فاطمہ قمر مرزا، بیڑ

کھِلے رہتے ہیں کنول اور جھیل میں پانی نہیں
اب یہ منظر دیکھ کر بھی مجھ کو حیرانی نہیں (نامعلوم)
مرسلہ: اسعد حافظی غلام جیلانی، گورکھپور

ماحول کا جمود ہے تہہ دار اس قدر
یہ کیسے آشکار ہو ہم کشمکش میں ہیں (مبارک انصاری)
مرسلہ: ظہیر افراز محمد حسین، برہان پور

روایتوں کے حجاب اب اٹھاؤ چہرے سے
جھلک اُٹھے نئے جلوے نئے دریچے سے (ظہیر غازی پوری)
مرسلہ: قمر جہاں، ہزاری باغ

دل اپنے آپ کھنچتا ہی جاتا ہے جس کی سمت
کچھ ایسا دل پذیر سا منظر ہے سامنے (منشاء الرحمٰن خاں منشا)
مرسلہ: سیّد خالد علی رضوی، علی گڑھ

جانے کب ٹوٹے گا یہ چوبیس گھنٹوں کا حصار
کام بڑھتے جا رہے ہیں وقت بڑھتا ہی نہیں (فرحت قادری)
مرسلہ: نفیس شیراز، نئی دہلی
معین الدین شمسی، گر بڈیہہ
پرویز عالم خاں، نوایدہ

نثری عنوانات

"خدا کی بستی" (شوکت صدیقی)
مرسلہ: روشنی شہباز،
پورب سرائے، مونگیر (بہار)

"روزمرّہ" (شوکت حیات کا افسانہ)
مرسلہ: سہیل عظیم،
صدر گلی، پٹنہ سٹی، پٹنہ (بہار)

"خاتونِ مشرق" (اُردو ماہنامہ، دہلی)
مرسلہ: رفیق بانو غفار، علی گڑھ

"یوں بھی جیا کرتے ہیں" (فاطمہ ترمذی کا افسا[نہ])
مرسلہ: محمد ظفر ادیب، جمشید[پور]

"دھرتی سدا سہاگن" (کشمیری لال ذاکر کا ناول)
مرسلہ: ممتاز علی، بھاگ[لپور]

"لگن" (بُشریٰ رحمٰن کا ناول)
مرسلہ: ایس۔ خالد رضوی، علی[گڑھ]

"تین چہرے ایک سوال" (کشمیری لال ذاکر کا افسا[نہ])
مرسلہ: معین الدین شمسی، گر[بڈیہہ]
نوشابہ پروین، بھاگلپ[ور]

"محنت و مشقت" (علامہ اقبال کی نظم)
مرسلہ: ارشد یونس، بیگوسرا[ئے]

>

لال قلعے کی ایک جھلک

آخری مغل بادشاہوں کے زمانے کی دلی اور لال قلعے کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کی روشن جھلکیاں اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں۔ کتاب کے شروع میں لال قلعے اور بہادر شاہ ظفر کے کچھ حالات ظفر کے زمانے محل کے باورچی خانے کی بکاول خانم کی زبانی بیان کیے گئے ہیں۔ خانم بہادر شاہ ظفر سے بہت قریب تھیں اس لیے انھوں نے ظفر کی زندگی اور ان کے عادات و اطوار کے بارے میں ایسی اہم معلومات فراہم کی ہیں جو کہیں اور سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔

مصنف : حکیم خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی	صفحات : ۱۰۶
مرتب : ڈاکٹر انتظار مرزا	قیمت : ۱۹ روپے

دہلی کا آخری دیدار

جس دلی کا یہ کتاب قصہ سُناتی ہے وہ صرف ایک شہر ہی نہ تھی، ایک تہذیب کا نشان، ایک تمدن کا گہوارہ، علم و ادب کا مرکز اور ایک ایسی گزرگاہ فکر تھی جہاں علم و فن، تعلیم و تربیت، اخلاق و مذہب، حکومت و سیاست کے سانچے صدیوں تک ڈھلے تھے۔

مصنف : سید وزیر حسن دہلوی	صفحات : ۶۴
مرتب : سید ضمیر حسن دہلوی	قیمت : ۱۷ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

نئی مطبوعات

پروفیسر مسعود حسین خاں

(علمی، لسانی اور ادبی خدمات)

مرتب : ایم۔ حبیب خاں

صفحات : ۱۰۰

قیمت : ۴۵ روپے

تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

پروفیسر مسعود حسین خاں اُردو کے ممتاز محقق نقّاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ گزشتہ سال ماہنامہ 'کتاب نما' دہلی نے مسعود صاحب پر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا تھا جس کے مرتب ایم۔ حبیب خاں صاحب تھے۔

اسی شمارے کے مضامین کو ترمیم و اضافہ کے ساتھ اب کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے جس میں مختلف حضرات کے چودہ مضامین شامل ہیں جن میں مالک رام، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر ظہیر احمد صدّیقی، ڈاکٹر کمال احمد صدّیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، پروفیسر عبدالمغنی اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ وغیرہ کے نام شامل ہیں اور آخر میں مسعود صاحب کا سوانحی خاکہ، ان کے مضامین کا اشاریہ اور کتابوں کی فہرست اور چند خطوط ہیں یہ ایسا مواد ہے جو عام طور پر کہیں یکجا دستیاب نہیں ہوتا ہے۔

یہ مضامین چونکہ ایک رسالے کے لیے لکھوائے گئے ہیں اس لیے اس میں بیشتر مضامین مختصر اور تاثراتی ہیں لیکن مسعود صاحب کی شخصیت اور سیرت کے کسی نہ کسی پہلو کو ضرور سامنے لاتے ہیں۔ مالک رام صاحب نے اپنے مضمون میں اگر مسعود صاحب کی حق گوئی اور بے باکی کا ذکر کیا ہے تو جگن ناتھ آزاد صاحب نے مسعود صاحب کے ساتھ اپنے سفر کے چند واقعات اور مشاہدات بیان کیے ہیں۔ اس میں بادام کے اس پیکٹ کا واقعہ بھی درج ہے جو آزاد صاحب ان کے کمرے سے اٹھالے گئے تھے اور مسعود صاحب جسے جھپٹ کر واپس لے گئے تھے۔ یہ واقعہ اگرچہ معمولی سا ہے لیکن اس سے مسعود صاحب کی اخلاقی جرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ایک ایسا کردار جو اپنے حقوق کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔ ڈاکٹر کمال احمد صدّیقی نے اپنے مضمون میں مسعود صاحب کے اُردو سے تعلّق اور خدمات کا ذکر کیا ہے تو ڈاکٹر خلیل بیگ اور سیّد عارف لکھنوی کے مضامین مسعود صاحب کی اہم تصنیف "مقدمۂ تاریخ زبان اُردو" پر تنقید اور تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مضمون "مسعود حسین خاں — بہ حیثیت نقاد" کو اگرچہ اقبال کی نظری و عملی شعریات تک محدود رکھا ہے لیکن مختصر ہونے کے باوجود یہ مضمون اسلوبیاتی تنقید کے بارے میں بعض اہم مباحث کو سامنے لاتا ہے۔

مسعود صاحب شاعر بھی ہیں ان کا شعری مجموعہ "دونیم" ۱۹۵۶ء میں شائع ہوچکا ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنے مضمون "دونیم — ایک تنقیدی مطالعہ" میں مسعود صاحب کی شاعرانہ حیثیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے گوڑ صاحب کا یہ مضمون خاصا طویل اور دلچسپ ہے اور مسعود صاحب کی شاعری کے محاسن اور تخلیقی قوتوں کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

ریحانہ سلطانہ حیدرآباد میں ریسرچ اسکالر ہیں مسعود صاحب کے مرتّب کردہ ابراہیم نامہ از عبدل پر ان کا مضمون خاصی محنت اور دیدہ ریزی نیز ادبی و تحقیقی ذوق کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اس مجموعے میں انجمن ترقی اُردو، اور جامعہ اُردو سے مسعود صاحب کے تعلّق اور ہماری زبان میں شائع ہونے والے اداریوں پر ایم۔ حبیب خاں کا مضمون شامل ہے۔ کاش کہ ایم۔ حبیب خاں صاحب نے زیادہ تفصیل سے کام لیا ہوتا تاکہ اس کی روشنی میں اُردو تحریک کے ایک باب کا تجزیہ کیا جاسکتا۔

یہ کتاب اگرچہ پروفیسر مسعود حسین خاں

کی شخصیت و سیرت اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا بھرپور تجزیہ پیش نہیں کرتی لیکن ان کے بارے میں کچھ جاننے اور سمجھنے میں ضرور معاون ثابت ہوسکتی ہے جس کی ترتیب و اشاعت کے لیے ایم۔ حبیب خاں اور ماہنامہ کتاب نما کے ایڈیٹر شاہد علی خاں صاحب قابلِ مبارکباد ہیں۔

کتاب کے سرورق پر مسعود صاحب کی تصویر دی گئی ہے۔ کاغذ سفید اور چکنا ہے۔ کتابت اور طباعت بھی معیاری ہے۔ البتہ حجم کو دیکھتے ہوئے کتاب کی قیمت کسی قدر زیادہ ہے۔

—— عظیم الشان صدیقی

۲۰۰۲، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

حسرت موہانی

مصنف : پروفیسر مظفر حنفی

قیمت : ۱۳۰ر۵۰ روپے

ناشر : نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی

مظفر حنفی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ حسرت موہانی پر پچھلے کئی برسوں سے ان کے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ اور اب ان کی نئی کتاب حسرت موہانی کا شائع ہونا اس کی دلیل ہے کہ حسرت موہانی مظفر حنفی کی پسندیدہ شخصیت کا نام ہے۔

حسرت موہانی تحریکِ آزادی کے ایک بڑے مجاہد تھے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے قومی رہنماؤں میں ان کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ممتاز سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ حسرت موہانی اُردو کے بہت اہم شاعر بھی تھے۔ حسرت موہانی کی شخصیت اور شاعری پر بہت سی کتابیں ملتی ہیں مگر آج تک ان کی سیاسی حیثیت کا تعین بجا طور پر نہیں ہوسکا ہے اور زیادہ زور ان کی شاعری پر ہی دیا گیا ہے۔ مظفر حنفی نے اس کتاب میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حسرت موہانی ایک اعلیٰ درجے کے شاعر کے ساتھ ساتھ بہت بڑے سیاست داں اور جنگِ آزادی کے اہم رہنما تھے۔ "حرفِ آغاز" میں لکھتے ہیں:

"مولانا فضل الحسن حسرت موہانی تحریکِ آزادی کے ایک سرفروش مجاہد، مخلص اور راست باز سیاستداں ایک صاحبِ عمل اشتراکی، خدا رسیدہ صوفی، کھرے اور بےباک صحافی، ممتاز شاعر، مشرقی طرزِ فکر کے نقاد، عروض داں، تذکرہ نگار، تدوین کار، شارحِ غالب، الغرض انتہائی پہلودار شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی سیاسی خدمات کا اعتراف مہاتما گاندھی اور صفِ اوّل کے قومی رہنماؤں نے کیا ہے۔ حسرت کے ادبی کارناموں پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں لیکن تاحال عام قاری کے لیے ایسی کوئی کتاب اُردو میں دستیاب نہیں ہے جو اس ممتاز ترین مجاہدِ آزادی کی سوانحِ حیات کا مکمل احاطہ کرتی ہو۔"

۱۱۲ صفحات کی اس کتاب میں مظفر حنفی نے حسرت موہانی کے تمام کارناموں کو اُجاگر کر دیا ہے۔ بےشک حسرت موہانی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ہم اس کتاب کو خرید کر پڑھیں۔

—— ایم۔ فیروز جامعی

ڈی۔۴۰، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

الہام

شاعر : ابراہیم اشک

قیمت : ۴۰ روپے

ناشر : تکمیل پبلی کیشنز، بمبئی

تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

"الہام" ابراہیم اشک کا شعری نقش ہے۔ یہ میراث انھیں دبستانِ لکھنؤ سے ملی ہے ان کا بیان ہے کہ میر انیس، ان کے پردادا کے استاد تھے۔

"الہام" میں غزلوں کے علاوہ سات نظمیں اور ایک سانیٹ شامل ہے۔ میری سخت نگاہِ انتخاب کا حاصل دو نظمیں ہیں۔ (۱) "کچھ لکھو یارو" میرے نزدیک یہ نظم اس مصرعے، ختم ہونی چاہیے تھی:

"یہ آسمان کے پردوں پہ تم کو لکھنا ہے"

جزئیات، تسلسل اور نظم کے ارتقائی افق کا تقاضا یہی ہے۔ اس کے بعد دو شعروں کا اضافہ محلِ نظر ہے۔ (۲) "فن کار" اس نظم میں فن کار کے تابناک کردار اور اس کی عظمت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اور سوسائٹی کے -ON -SUMER CULTURE کی گراوٹ کا نقشہ پیش کیا ہے۔

ابراہیم اشک کی غزلوں میں اہلِ نظر کو زیادہ تر شعری محاسن ملیں گے۔ کسی کو بعض مقامات پر حرف گیری کا موقع بھی مل سکتا ہے، جیسے:

"ہاٹ کے ڈیرے تمبو اُٹھے
چل تو بھی دوکان اُٹھ

فظ دُکان ــــ فصیح ــــ رائج ــــ
ابراہیم اشک کے یہاں حُسنِ فطرت اور
حُسن' دونوں کی رنگینی اور جلوہ سامانی
شاعر نے انسانی حُسن کو اوّلیت کا درجہ
ے۔ ذاتی تجربات کی روشنی بھی ہے۔ پیرایۂ
میں متوازن اور سہل لہجہ اختیار کیا ہے۔
خرابیوں کی نہایت جسارت سے تنقیص
مگر لب ولہجے میں جھلاہٹ نہیں' بلکہ
پن ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ موسیقی اور
ی کی سماجی اہمیت ہے۔ اب چند اشعار
:

ی خوشبو سے مہک کر پھول بن جاتا ہے دل
قل کی طرح آتا ہے وہ جاتا ہے وہ

ن لوگوں سے جب ملنا پڑا
بھی ہم تو اکیلے ہو گئے

خدا کے نام پہ کچھ بھی نہ ہو سکا
ے خدا کے نام پہ سجدے بہت ہوئے

ــــ سیفی پریمی
نگارستان' ذاکر نگر' نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

شم دید
صنف : حیدر بیابانی
مت : ۲۰ روپے
بطہ : حیدر بیابانی' بسیرا' اچل پور شہر'
ضلع امراوتی

حیدر بیابانی نے جن کیفیتوں کو جھیلا'
' محسوس کیا' انھیں' انھوں نے غزل' گیت'
' ہزل و دیگر اصناف سخن میں من وعن لکھ
دیا' چھاپ دیا۔ ایک نہیں ان کی پانچ کتابوں نے شرفِ قبولیت پایا۔ نتیجے میں وہ صاحبِ کتاب' صاحبِ نصاب کے ساتھ ساتھ شاملِ نصاب بھی ہوئے۔ پھر منظومات و محسوسات کے چکر ویوہ سے نکل کر وہ دیکھنے دکھانے کے چکر میں پڑے اور "چشم دید" طنزیہ و مزاحیہ مضامین کی کتاب انھوں نے اہلِ اُردو کی بالغ بصیرت کے زیرِ چشم رکھ دی۔ ان کی قطار در قطار کتابیں دیکھ کر ان کے قلم کو بارہ ماسی کہنا ہی پڑتا ہے کیوں کہ کلینڈر اور ان کی کتابیں گذشتہ کئی برس سے باہم محو سفر ہیں۔

اپنی گرہ ڈھیلی کیے بغیر جہاں انھوں نے اپنی ذہنی عرق ریزیوں اور قلم کی جولانیوں کو متعدد کتب میں ڈھالا ہے وہیں فخرالدین علی احمد میموریل اور مہاراشٹر اُردو اکادمی کی مالی اعانتیں بھی حق بہ حقدار رسید کے مصداق ٹھکانے لگیں۔ شعری مجموعوں "کھٹی میٹھی باتیں"، "ننھی منی باتیں" اور "الٹی سیدھی باتیں" ان تمام باتوں کی گردان سے قطع نظر ہم "چشم دید" پر بجائے ٹیڑھی ترچھی اور سیدھی کے اچٹتی نظر ڈالیں گے۔ چشم دید کے مضامین میں حیدر بیابانی نے روزمرّہ زندگی کے واقعات کو مشاہدات کی باریک چھلنی میں چھانا ہے۔ ان مضامین میں طنز کے تیر و تبر مزاح کے شگوفے زبان کے چٹخارے لیے کے پٹارے سب کچھ ہیں۔ سماج میں پنپتی برائیوں کو طنز کی دھار سے کاٹ پھینکنے کی کوشش ان مضامین میں ہوئی ہے۔ کامیاب طنز و مزاح نگار کے لیے (سماج سے اور سماجی برائیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے) یہ ضروری ہے کہ اس کے پاس دو ہاتھ ہونے چاہئیں تاکہ اس کے ایک ہاتھ میں طنز کی تلوار ہو تو دوسرے ہاتھ میں مزاح کا FIRST AID BOX بھی رہے۔ یہ دونوں کیفیتیں چشم دید میں ساتھ ساتھ شانہ بہ شانہ چلی ہیں" چشم دید" کے مضامین میں طنز کے کٹیلے تیر و نشتر کی ٹیسیں اور چبھن دے کر مصنّف' قاری کو درد میں بلکتا تڑپتا نہیں چھوڑتا بلکہ وہ طنز کی چوٹوں پر مزاح کا لیپ چڑھا کر درد چُننے کی حکیمانہ تدبیریں بھی کرتا ہے۔

ــــ بابو آر۔ کے
آزاد الکٹریکلس' اچل پور شہر ۴۴۴۸۰۶

تنہا تنہا (شعری مجموعہ)
مُصنّف : سیّد شکیل دسنوی
صفحات : ۱۵۲
قیمت : ۴۰ روپے
ملنے کا پتا : حسن منزل' اُڑیہ بازار'
کٹک ۷۵۳۰۰۱ (اُڑیسہ)

غزل لفظ "غزال" سے مشتق ہے۔ عرب میں ایک شہزادہ جس کا نام "غزال" تھا اُس نے محبوب کی یاد میں جو کلمات قلمبند کیے' غزل کہلاتے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ "غزال" کے لغوی معنی ہرن کے ہیں۔ قدیم زمانے میں جب ہرن کا شکار کیا جاتا تھا اور شکاری کا تیر ہرن کے سینے میں پیوست ہوتا تھا تو ہرن کی تڑپ سے لوگ لطف اندوز ہوا کرتے تھے اسی طرح جب حالات کے تیر تخلیق کار کے سینے میں پیوست ہوتے ہیں تو اضطراری کیفیت میں جو کلمات خود بخود موزوں ہو کر صفحۂ قرطاس پر آتے ہیں وہ

غزل کہلاتے ہیں۔

سیّد شکیل دسنوی بھی "زندگی اے زندگی" سے لے کر "تنہا تنہا" تک حالات کا شکار رہے ہیں وہ "زندگی اے زندگی!" پکارتے ہیں لیکن پھر بھی "تنہا تنہا" ہیں۔

سیّد شکیل حقیقت میں وصال کا نہیں، ہجر کا شاعر ہے' ۱۹۶۰ء کے بعد اُردو غزل میں کچھ نئے ازم داخل ہوتے ہیں جیسے دادا ازم' فیوچرزم' کیوبزم' ریلزم' سرریلزم' سمبالزم اور امیجزم وغیرہ۔ دسنوی کی شاعری میں رومانٹی سیزم اور امیجزم کا استعمال ہوا ہے۔ اُن کی بیشتر غزلوں میں یہ استعمال بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے شکیل کی شاعری کا سفر ذات سے کائنات کا سفر ہے۔ جو انھیں ساقی فاروقی' باقی' مخمور سعیدی' افتخار عارف' شجاع خاور' ممتاز راشد' احتشام اختر' وغیرہ کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔

اُن کے ہاں تغزل کی چاشنی نئے ذائقے کے ساتھ ملتی ہے۔ ہندستانی دیومالا' اساطیر' پیکر نگاری سے اُن کا اسلوب مرکب ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

تجھ سے ٹوٹا ربط تو بکھرا اور کیا رہ جائے گا
انتشارِ ذات کا اِک سلسلہ رہ جائے گا

وہ سراپا گلاب جیسا تھا
اِک حقیقت تھا خواب جیسا تھا

تم سے بچھڑے تجربے ہوں گے عجیب سے
دیکھوں گا دوریوں کو بہت ہی قریب سے

میں تم سے بچھڑ کے یوں تنہا کھڑا ہوں
سرِ راہ جیسے شجر تنہا تنہا

سیّد شکیل دسنوی کا مجموعہ "تنہا تنہا" شعری مجموعوں کے انبار میں لائق توجہ ہے جس کا مطالعہ قاری کو مایوس نہیں کرے گا۔

—— رفعت اختر
شعبۂ اُردو گورنمنٹ پی۔ جی۔ کالج' ٹونک ۳۰۴۰۰۱ (راج)

اُردو خبرنامہ

کل ہند سہ روزہ تقریباتِ حالیؔ

۱۸، ۱۹، اور ۲۰ ستمبر ۱۹۹۲ء کو دہلی اردو اکادمی، ہریانہ اُردو اکادمی، راجستھان اردو اکادمی اور انجمن ترقی اُردو ہند کے اشتراک اور تعاون سے پانی پت اور دہلی میں سہ روزہ تقریباتِ حالی کا انعقاد ہوا۔ ۱۸ کو افتتاحی جلسہ پانی پت میں ہوا جس میں دو صوبائی وزرا کے علاوہ ملک بھر سے آئے ہوئے ادبا اور شعرا شریک ہوئے۔ اس موقعے پر ہریانہ اُردو اکادمی کی تین کتابوں "حالی اور سرزمینِ حالی" "نقوشِ داغ" اور "مٹی، ریت، چٹان" کا اجرا بھی عمل میں آیا اور ایک مشاعرہ ہوا جو رات ڈھائی بجے تک جاری رہا۔

۱۹ ستمبر کو نئی دہلی کے اُردو گھر میں حالیؔ کی حیات اور خدمات پر سمینار کا پہلا اجلاس صبح دس بجے شروع ہوا۔ دوسرا اجلاس لنچ کے وقفے کے بعد ڈھائی بجے شروع ہوا۔ ۲۰ ستمبر کو بھی دو اجلاس ہوئے۔ دونوں دنوں کے اجلاس بہت کامیاب رہے اور حالیؔ کی شخصیت، ان کی شاعری، ان کی نثر نگاری کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل مضامین پڑھے گئے۔



پروفیسر اشتیاق عابدی شرکائے اجلاس سے مخاطب ہیں۔ کرسیوں پر ہیں جناب انعام الحق، راجستھان کے سیکریٹری تعلیمات جناب آئی سی۔ شریواستو اور پروفیسر شمیم حنفی



دائیں سے : مخمور سعیدی، جناب انعام الحق، سید حامد صاحب، پروفیسر اشتیاق عابدی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور ڈاکٹر اسلم پرویز

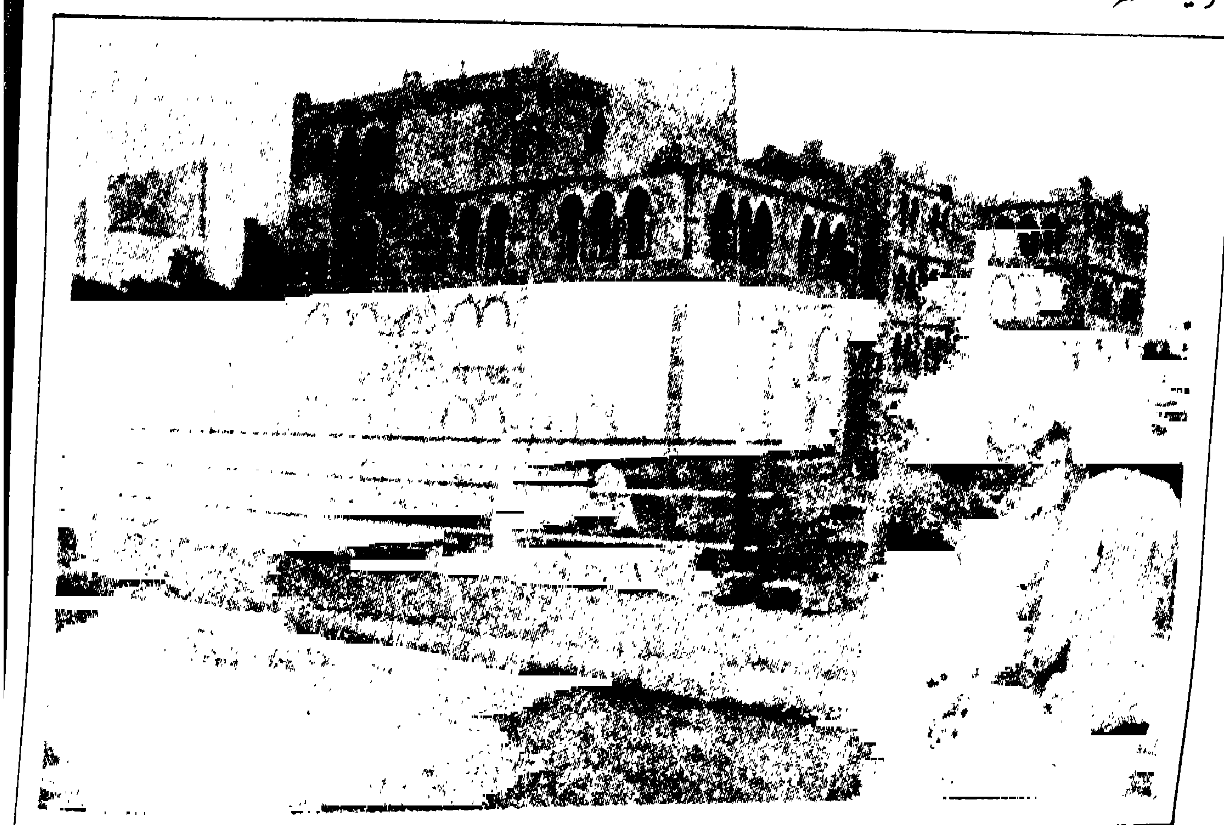
خوش آمدید

پچھلے دنوں دو محترم پاکستانی شعرا امجد الاسلام امجد اور ناصر زیدی دہلی تشریف لائے تو دہلی اردو اکادمی نے ۱۵ ستمبر کو ان کے اعزاز میں ایک محفل کا اہتمام کیا —— نیچے تصویر میں امجد الاسلام امجد کلام سناتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں، کرسیوں پر تشریف فرما ہیں پروفیسر قمر رئیس، جناب ناصر زیدی اور پروفیسر اشتیاق عابدی۔ جلسے کی صدارت مشہور افسانہ نگار جناب جوگندر پال نے کی، پروفیسر قمر رئیس نے مہمانوں کے فکر و فن پر روشنی ڈالی۔ اکادمی کی طرف سے دونوں مہمانوں کو کتابوں کے تحفے اور گلدستے پیش کیے گئے۔





گذشتہ دنوں عزت مآب
نکر دیال شرما صاحب
ریذیڈنٹ آف انڈیا نے کنور
ہندر سنگھ بیدی سحر کے مجموعۂ
لام "کلیاتِ سحر" کا اجرا
شٹرپتی بھون میں کیا ساتھ
یں دیکھے جاسکتے ہیں۔ پروفیسر
وپی چند نارنگ، "کلیاتِ سحر"
کے مرتب کے۔ ایل۔ ساقی نارنگ،
مسز بیدی اور ساگر سوری۔



بھوپال کا نو تعمیر "ایوانِ اُردو" جسے "سنسکرتی بھون" میں تبدیل کیے جانے پر اُردو حلقوں میں بڑی بے چینی محسوس کی جا رہی ہے۔

آنند نرائن مُلّا کو اعزازی ڈگری

اُردو تحریک کے بزرگ ترین مجاہد اور ممتاز شاعر پنڈت آنند نرائن مُلّا کو جن کی عمر ۹۲ برس سے زیادہ ہے اور جو اِن دِنوں شدید طور پر علیل ہیں، ان کی خدمات کے اعتراف میں میسور یونیورسٹی نے اپنے حالیہ کنونشن میں اعزازی ڈاکٹریٹ آف لیٹرز (ڈی لٹ) کی ڈگری سے نوازا ہے۔ کنونشن کی صدارت گورنر کرناٹک مسٹر خورشید عالم خاں نے بہ حیثیت چانسلر یونیورسٹی کے فرمائی۔ پنڈت آنند نرائن مُلّا علالت کے سبب میسور نہیں جاسکے ڈاکٹریٹ کا توصیف نا ان کی غیر موجودگی میں پڑھا گیا اور ڈگری

اقامت گاہ پر خصوصی ذریعے سے ارسال
دی گئی۔ میسور یونیورسٹی کے اس اقدام کو
دو دُنیا میں بنظر استحسان دیکھا جا رہا ہے۔

وجاہت علی سندیلوی کو مجاہدِ آزادی قرار دیا گیا

حکومت اُتر پردیش نے معروف ادیب رصحافی چودھری وجاہت علی سندیلوی کو اہد آزادی قرار دیتے ہوئے انھیں ۲۰ ہزار پے نقد انعام دینے کا اعلان کیا۔ چودھری حب جن کی عمر تقریباً ۷۵ سال ہے اس ت بھی اپنے پیشے وکالت اور سماجی خدمت جوانوں جیسی پھرتی اور مستعدی سے سرگرم ں۔

چودھری صاحب کو یہ اعزاز دیے نے پر مقامی انجمن ترقی اُردو نے اپنے ایک وصی جلسے میں اطمینان اور مسرت کا اظہار ہے اور اس سلسلے میں ایک تہنیتی قرار داد ر کرکے چودھری صاحب کو بھیجی ہے۔

رفتید ولے نہ از دلِ ما

آگرے میں اُردو کے مشہور ادیب، اتر پردیش اکادمی کے سابق وائس چیرمین، بنارس نیورسٹی کے سابق پروفیسر اور صدر دو ڈاکٹر حکم چند نیر کا انتقال ہوگیا۔ ب چند ماہ سے کینسر کے موذی و جاں کاہ مبتلا تھے اور آج کل آگرے میں مقیم ں ۱۶/ ۱۷ ستمبر کی درمیانی شب ں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ انتقال کے وقت ہائی اسکول سرٹیفیکٹ کے مطابق ان کی عمر ۷۱ سال ۷ ماہ اور ۸ دن تھی۔

ڈاکٹر حکم چند نیر کا جنم ۸ فروری ۱۹۲۳ء کو ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی تھی درجۂ پنجم سے اسکولی زندگی کا آغاز ہوا۔ آپ کے والد کا نام تارا چند تھا۔ نیر صاحب نے اپنے والد سے گھر پر ہی فارسی کی تعلیم حاصل کی اور گلستاں بوستاں وغیرہ پڑھیں۔ وہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں ایم۔ اے اور اُردو میں بنارس ہندو یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والے پہلے اسکالر تھے۔

نیر صاحب نے ڈگری سطح کی تدریسی زندگی کی شروعات دیال سنگھ کالج، دہلی سے کی تھی۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں وہ بنارس آگئے اور یہیں سے لگ بھگ ایک برس پہلے ۱۹۹۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ ستمبر ۱۹۶۳ء میں انھوں نے امریکا کا سفر بھی کیا تھا۔

حکم چند نیر اُردو کے بے لوث خادم تھے۔ استاد کی حیثیت سے شاگردوں اور رفیقان کار کی نظروں میں محبوب و محترم رہے۔ ریاست کی متعدد ادبی انجمنوں اور اداروں سے وابستہ رہے۔ اُردو اکادمی کی مجلسِ انتظامیہ کے مدت دراز تک رکن رہنے کے علاوہ ۱۸ فروری ۱۹۸۱ء سے ۲۵ اگست ۱۹۸۳ء تک اوّلین وائس چیرمین بھی رہے۔

نیر صاحب کی متعدد کتابیں مثلاً انتخاب مضامین چکبست، گنج شائگاں، نوائے سرور، سرور جہان آبادی، حیات اور شاعری، اُردو مسائل، ابتدائی اُردو وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔

●

۳۰ ستمبر کو بمبئی میں عزیز قیسی نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان کا آبائی شہر حیدرآباد تھا جہاں وہ یکم جولائی ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں وہ مستقلاً بمبئی منتقل ہو گئے اور زندگی کی آخری سانس اسی سرزمین پر لی۔

عزیز قیسی شاعر بھی تھے، افسانہ نگار بھی اور ناقد بھی۔ انھوں نے فلموں کے لیے مکالمے بھی لکھے لیکن مکالمہ نگاری کو انھوں نے محض وسیلۂ معاش کے طور پر اختیار کیا تھا۔ شاعری میں اور افسانہ نگاری میں وہ اپنی ایک پہچان رکھتے تھے اور ان کے کئی تنقیدی مضامین بھی یاد رکھے جائیں گے۔ اگست کے ایوانِ اُردو میں حسرت موہانی کی شخصیت اور شاعری پر ان کا جو مضمون شائع ہوا تھا اس میں کئی ایسے نکات شامل ہیں جن پر قبل ازیں اس طرح غور نہیں کیا گیا تھا۔ ان کے تنقیدی مضامین کا نمایاں وصف ان کی حق گوئی اور بے باکی ہے۔ ان کی شاعری کلاسیکی در و بست کی حامل ہے اور انھوں نے متعدد اصنافِ سخن میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھاتے ہیں۔

عزیز قیسی گزشتہ دو ڈھائی سال سے بیمار تھے لیکن ان کی بیماری کی تشخیص بہت بعد میں ہوئی۔ ابتداءً کچھ اور امراض کا علاج ہوتا رہا پھر پتہ چلا کہ وہ کینسر میں مبتلا ہیں۔ اس وقت تک یہ نامراد بیماری ان کے پورے جسم میں پھیل چکی تھی۔ ان کے آخری کچھ مہینے بڑی اذیت میں گزرے مگر ان کا صبر و استقامت بے مثال تھا۔ مزے لے لے کر اپنی تکلیفوں کا ذکر کرتے تھے اور ہنستے تھے۔ آخری سانسوں تک ان کی یہ کیفیتِ مزاج باقی رہی۔

●

۶ اکتوبر کو اُردو اور ہندی کے مشہور ناول نگار دت بھارتی کا دہلی میں انتقال ہوگیا۔ وہ کچھ عرصے سے بیمار تھے۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ انھوں نے اُردو اور ہندی میں ۱۰۰ سے زائد کتابیں لکھیں۔ ان کی کتابوں کے تراجم بھی بہت سی ہندستانی زبانوں میں ہوئے۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ان کا پہلا ناول "چوٹ" شائع ہوا تھا اور اسی نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی تھی۔

گرامی نامے

ستمبر ۹۲ء کے شمارے میں خاور فاروق صاحب کی تحریر علامہ میکش اکبرآبادی مرحوم کے خطوط سے متعلق نظر سے گزری۔ علی گڑھ اپنی تہذیبی معاشرتی نیز ادبی روایتوں کے لیے برِصغیر میں مشہور ہے لیکن خاور صاحب نے روایتی تہذیب سے انحراف کرتے ہوئے میکش صاحب کی تخلیق کو بطخ کے بچے کے پیدا ہوتے ہی تیرنے کی جبلّی مہارت سے تشبیہہ دے کر اُن کے بے تعداد مداحوں اور مریدوں کا دل دُکھایا ہے۔ میکش صاحب آٹھ یا نو برس کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے، اور تین چار سال کی عمر میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے خاندانی سجّادے کی زینت بن گئے تھے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مرحوم نے علم و ادب اور متصوفانہ مسلک کی تقریباً اسّی سال خدمت کی۔

اُردو ادب کی تاریخی کتب میں اکثر اس قسم کے جملے ملتے ہیں کہ فلاں شاعر نے تمام عمر عروسِ غزل کی مشاطگی کی۔ 'تمام عمر' سے مراد سنِ شعور سے تا دمِ آخر ہوتی ہے اور ماقبلِ شعور کا حصہ محذوف سمجھا جاتا ہے۔ اگر عنوان صاحب نے سہواً ۸۹ برس کا عرصہ اُن کی پیدائش سے ہی جوڑ دیا تو یہ کوئی ایسی غلطی نہیں ہے کہ جس سے برِصغیر کے دریاؤں کا پانی خشک ہو جائے اور نہ اس سے مضمون کا متن مجروح و مسخ ہوتا ہے۔ ذی علم قاری ایسی اغلاط سے صرفِ نظر کرتے رہے ہیں۔

موصوف کے کہنے کے مطابق عنوان صاحب نے مکاتیبِ میکش کی اہمیت پر صرف اس لیے زور دیا ہے کہ ان میں عنوان صاحب کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ یہ اعتراض چونکہ ایک مفروضے پر مبنی ہے اس لیے قابلِ اعتنا نہیں۔ فرض کیجیے اگر عنوان صاحب ایک ثقہ اور معتبر ہم عصر — جو عالم بھی ہے اور شاعر بھی، مضمون نگار بھی ہے اور محقق بھی اور جو صوفی بھی ہے اور میکش بھی۔ کی رائے کو اپنے لیے باعثِ خیر و برکت سمجھتے ہیں تو اس میں انسانی نفسیات کے خلاف کیا ہے؟ اگر آلِ احمد سرور خاور صاحب کے اندازِ تحریر کو پسند کریں تو کیا وہ اس پر فخر نہیں کریں گے؟ خطوط کی اہمیت پر خامہ فرسائی سے اس لیے گریز کر رہا ہوں کہ کہیں اس میں 'درسیت' کا عنصر پیدا نہ ہو جائے اور جو نازک طبائع پر گراں گزرے۔

خاور صاحب کے اس متشککانہ تفتیشی سوال — بقیہ غیر مطبوعہ خطوط جو میکش نے لکھے ہیں وہ کہاں ہیں، اور کن کن شعرا و ادبا کے نام ہیں۔ کا جواب صرف وہ حضرات ہی دے سکتے ہیں جن ادبی ہستیوں کے مکتوب الیہ میکش صاحب تھے یقیناً وہی ہستیاں جواباً میکش صاحب کی بھی مکتوب الیہ رہی ہوں گی۔ میکش صاحب خطوط کا جواب بڑی پابندی سے دیتے تھے اس لیے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ میکش صاحب جیسے اصولی اور وضعدار انسان سے کسی کی بھی خط و کتابت یک طرفہ عمل نہیں رہی ہوگی۔ اس سلسلے میں اتنا عرض کرنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے جملہ مشہور معاصرین کے مکتوب الیہ تھے۔ میں نے بچشمِ خود ان خطوط کو پڑھا ہے۔ یہ جملہ خطوط ان کے صاحبزادے سیّد حیدر علی شاہ (سیب کا بازار، میوہ کٹرہ، آگرہ۔۳) کے پاس محفوظ ہیں۔ اس سلسلے میں راقم کا ایک خط قومی آواز (۴ اراگست ۹۲ء) میں بہ عنوان "ظ۔ انصاری کے خطوط" شائع ہو چکا ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ کسی ادبی رسالے کے جملہ مضامین عالمانہ، محققانہ اور مورّخانہ ہی ہوں۔ سلیقے سے لکھے ہوئے درسی مضامین کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ ہر ادبی رسالے میں ایک درسی نوعیت کا مضمون ضرور ہونا چاہیے تاکہ یونیورسٹی کے طلبہ اس سے مستفیض ہو سکیں۔ عالیہ خان کے مضمون (انارکلی اور اُردو ڈراما) کو درسی مضمون کہنا ہمت شکنی کے مترادف ہے جو موجودہ سیاق و سباق کے پیشِ نظر مناسب نہیں۔

کیا خاور صاحب مذکورالصدر نازیبا تشبیہہ کے سلسلے میں اظہارِ افسوس کرکے

علی گڑھ کی تہذیبی روایت کا احیا کرسکیں گے۔

——— آفاق احمد عرفانی، آگرہ

◁ ماہنامہ "ایوانِ اُردو" (ستمبر ۹۲ء) کی اشاعت میں "آپ کی رائے" کالم میں علی گڑھ کے خاور فاروق صاحب کا خط شائع ہوا ہے۔ خط پڑھ کر افسوس ہوا خاور فاروق صاحب نے علامہ میکش صاحب اکبرآبادی مرحوم کی بلند قامت شخصیت کا قطعی احترام نہ کرتے ہوئے گستاخی سے پُر لہجہ اختیار کیا ہے۔ میں "بیسویں صدی میں اُردو کا مکتوباتی ادب" پر پی ایچ ڈی کر رہا ہوں۔ علامہ میکش مرحوم سے میری مراسلت رہی ہے۔ میرے نام تقریباً ۲۵ خطوط پر مشتمل ایک مضمون اشاعت کے لیے تیار ہے۔ عنوان صاحب چشتی کے مضمون "میکش اکبرآبادی کے خطوط" سے مجھے کافی مفید اور اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ایوانِ اُردو کے قارئین سے گزارش ہے کہ مجھے علامہ میکش اکبرآبادی مرحوم کے خطوط فراہم فرمائیں۔ میں اُن کا ممنون رہوں گا۔

——— محمد خالد عابدی

مکتبہ عابدیہ ۵۳ - دلآرام ہاؤس، ہوامحل روڈ، بھوپال ۴۶۲۰۰۱

◁ ستمبر کے شمارے میں ساجدہ زیدی کا مضمون پسند آیا۔ بچوں میں تخلیقی صلاحیت اور ندرتِ فکر کی شناخت کرکے ان کی حوصلہ افزائی کرنا۔ اور قدرت اُن سے بنی نوع انسان کی جو خدمت لینا چاہتی ہے اس کے لائق بنانے میں معاون ہونا اساتذہ کا فرض ہے۔ اور بچے کے معاملے میں لفظ "استاذ" بھی صرف درس گاہ میں تعلیم دینے والے مدرّس تک ہی محدود نہیں ہے۔ اپنے وسیع تر معنی میں یہ لفظ ان سبھی افراد پر محیط ہے جو بچے کی پیدائش سے لے کر بڑے ہونے تک کسی نہ کسی شکل میں اس کی شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

گوشۂ "کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ" قلیل مدت میں ترتیب دیا گیا ایسا گوشہ ہے جس کے لیے عموماً پانچ چھ ماہ کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اس طرح یہ بھی آپ کی کامیاب ادارت کا ثبوت ہے۔ مرحوم کے اشعار کا انتخاب بھی بہت اچھا ہے۔

میرے مضمون "راجستھان میں اُردو زبان کی ابتدا اور پرتھوی راج راسو" میں صفحہ ۱۶، کالم ۱ میں لفظ پارنی چھپا ہے۔ یہ لفظ ہے "پانِنی" (पाणिनि)۔ اسی طرح صفحہ ۱۷، کالم تین کے پہلے پیرا گراف کا آخری جملہ یوں چھپا ہے "گھوتم رو پانتر میں ابواب کو تقسیم نہیں کیا گیا ہے" جبکہ جملہ یوں ہونا چاہیے تھا "گھوتم رو پانتر کو ابواب میں تقسیم نہیں کیا گیا ہے"۔ برائے مہربانی اگلے شمارے میں میری یہ وضاحت شائع کر دیں۔

——— صابر حسن رئیس، ٹونک

◁ ستمبر ۹۲ء کا "ایوانِ اُردو" کافی تاخیر سے موصول ہوا۔ مونگیر پوسٹ آفس میں ڈاک کی تقسیم کا نظام بالکل گڑبڑا گیا ہے۔ خطوط اور رسالے غائب ہو رہے ہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ کہیں سنوائی نہیں۔

گوشۂ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ مختصر مگر جامع ہے جس سے اس عظیم شخص اور عظیم شاعر کی حیات اور فن کے تقریباً تمام گوشے روشن ہو گئے ہیں۔

ساجدہ زیدی نے اپنے مضمون میں جن نکات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ نہ صرف استادوں اور طالب علموں کے لیے کارآمد ہیں بلکہ تخلیقی ادب پیش کرنے والوں کے لیے بھی بہت اہم ہیں۔

اقبال متین کا افسانہ "کھوج زندگی کی" متاثر کر گیا۔ اکثر یہ سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ آج کا افسانہ کیسا ہونا چاہیے۔ اقبال متین کا افسانہ اس سوال کا جواب ہے۔ انجم عثمانی کا افسانہ "پیر بھائی" پرانے موضوع پر ایک معمولی افسانہ ہے۔

——— اقبال حسن آزاد، مونگیر

◁ ستمبر کا "ایوانِ اُردو" پڑھا۔ کنور صاحب پر گوشہ بے حد تشنہ ہے۔ بہرحال غنیمت ہے۔ اتنی توفیق بھی کس کو ہوئی ہے۔

انجم عثمانی کی کہانی "پیر بھائی" بہت عمدہ ہے۔ یہ کہانی پڑھ کر منٹو کا افسانہ "کھول دو" کی یاد آ گئی۔ اس میں جسمانی ایکسپلائٹیشن حد سے گزر گیا تھا اور اس میں روحانی ایکسپلائٹیشن حد سے گزر گیا ہے۔ اور ظاہر ہے اس صورت میں یا تو آدمی مر جائے گا۔ یا پاگل ہو جائے گا۔ کہانی اوّل تا آخر بہت ہی بھرپور ہے۔

——— پرویز اختر، بجنور

◁ ستمبر کے شمارے میں ساجدہ زیدی اور علی عباس ازل کے مضمون پسند آئے۔ افسانے بھی اچھے لگے۔ شعری حصے میں جناب کرشن موہن، آشا پربھات اور عابد کرہانی کی تخلیقات پسند آئیں۔

آپ نے کنور صاحب پر گوشہ شائع کیا ہے مگر ہم کنور صاحب پر "ایوانِ اُردو" کے خاص نمبر کی توقع کرتے ہیں۔

——— توحید جوہر، بکارو

◁ ستمبر کا شمارہ مجھے پہلی ہی ستمبر کو بک اسٹال سے دستیاب ہو گیا۔ یوں تو

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے انتقال پر ملال
کی خبریں ٹی وی اور ریڈیو سے سُن چکا تھا
مگر "ایوانِ اُردو" میں خصوصی گوشہ دیکھ کر آپ
کی ادارتی صلاحیت کا قائل ہونا پڑا۔ آپ
نے ۲۳ صفحوں میں نہایت ہی جامع گوشہ
شائع فرمایا ہے۔ سحر صاحب کا ایک شعر میں
اکثر گنگناتا رہتا ہوں:

اے قافلے والو تمھیں منزل ہو مبارک
میں بہرِ سفر اور سفر میرے لیے ہے

ساجدہ زیدی صاحبہ کا مقالہ پسند آیا۔ موصوفہ کے خیال سے میں متفق ہوں کہ آج کل سستی، سطحی، سنسنی خیز تفریحوں کا بازار گرم ہے۔ اس لیے بچّے اور نوجوان تخلیقی صلاحیتوں سے غافل ہو رہے ہیں۔ اقبال متین کی کہانی سے کچھ تاثر نہیں اُبھرتا۔ کرشن موہن اور انور مینائی کی نظمیں پسند آئیں۔

—— انوار انصاری، رانچی

▷ مضمون "کیا تعلیم گاہیں تخلیقی فنکار پیدا کرسکتی ہیں" اور افسانہ "کھوج زندگی کی" بہت پسند آیا۔ "انجانے عقیدے" میں علی عبّاس اَزل نے عقیدے کی تشکیل اور ان کے اقسام پر تو بحث کی ہے لیکن عقیدے کے مثبت پہلوؤں کی طرف رُخ کرنے سے گریز کیا ہے۔ عقیدہ بے شک ایک نفسیاتی عمل ہے جو مختلف طریقوں سے حیاتِ انسانی کو متاثر کرتا ہے لیکن بعض عقیدے ایسے بھی ہیں جن میں ہمارا کوئی نفسیاتی عمل دخل نہیں رکھتا۔

گوشۂ سحر آپ کے اعلان کو شرمندۂ تعبیر ضرور کرتا ہے لیکن سحر صاحب کی شخصیت یا فن کا حق ادا نہیں کر پاتا ہے اس لیے میری رائے ہے کہ مستقبل میں ان پر خاص نمبر نکالیں۔

—— مسرور قیصر، مونگیر

▷ "ایوانِ اُردو" ملا۔ گوشۂ سحر بہت ہی خوب ہی ہے۔ اس گوشے کے مطالعے سے ان کی حیات اور شاعری کے کئی پہلو روشن ہوتے ہیں۔

ساجدہ زیدی کے مضمون نے کافی متاثر کیا۔ انھوں نے روایتی اندازِ تدریس کی جن خامیوں کو اُجاگر کیا ہے وہ واقعی ہمارے لیے ایک سلگتا سوال ہیں۔ موجودہ حالات کے تناظر میں ایک ایسے نصاب کی سخت ضرورت ہے جو طالب علموں کے اندر تخلیقی مزاج اور امنگ پیدا کرسکے۔ اس ضمن میں مقالہ نگار کے مشوروں پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

"اشاریہ ایوانِ اُردو" میں افسانوں کی فہرست میں "بازو کی قوت" (نومبر ۹۰ء، ص ۱۹) کے افسانہ نگار کا نام قیصر اقبال کے بجائے قیصر جمال درج ہے۔ اشاریہ مرتب کرنا ایک ایسا میکانیکی عمل ہے جو جزئیات پر گہری نظر کا تقاضا کرتا ہے۔ فاروق انصاری صاحب سے گزارش ہے کہ آئندہ احتیاط سے کام لیں۔

—— آفتاب احمد، مونگیر

▷ اُردو میں شائع ہونے والے گنتی کے چند پرچے ہیں جن کا شدّت سے انتظار رہتا ہے ان میں "ایوانِ اُردو" بھی ہے۔ ستمبر کے شمارے میں شامل دونوں افسانے "کھوج زندگی کی" اور "پیر بھائی" پسند آئے۔ گوشۂ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر بھی پسند آیا۔

—— مستحق الزماں خاں، سوپائی

▷ ستمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ ساجدہ زیدی کا مضمون "کیا تعلیم گاہیں تخلیقی فنکار پیدا کرسکتی ہیں؟" اقبال متین کا افسانہ "کھوج زندگی کی" اور نظمیں اچھی لگیں۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر پر خاص گوشہ دے کر آپ نے ایک مستحسن کام انجام دیا ہے۔ جو ان کی شعری اور ادبی خوبیوں کا احاطہ کیے ہوتے ہے۔

—— زین اللہ صدیقی، بستی

▷ "گوشۂ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر" کے ذریعے آپ نے کنور صاحب کی شخصیت کے بارے میں کافی معلومات یکجا کر دی ہیں لیکن ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایک خاص شمارہ ان پر نکلتا۔ انجم عثمانی کا افسانہ "پیر بھائی" اور نور تقی نور کی نظم "ستارے" بہت پسند آئی۔ اقبال متین کی کہانی بھی لائقِ تحسین ہے۔ ساجدہ زیدی اور علی عبّاس ازل کے مضامین قابلِ تعریف ہیں۔ انھوں نے بہت اچھی باتیں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

—— منتشر عالم حاجی سبحان، مونگیر

▷ ستمبر ۹۲ء کا شمارہ "گوشۂ سحر" کی بنا پر "مجھے محفوظ کرلو" کا حکم دے رہا ہے۔ واقعی آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اُردو کے ایک عظیم شاعر کو آپ نے یہ لاجواب خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

—— محمد یحییٰ جمیل، ناگپور

▷ آپ حضرات نئی چیزیں، نئے موضوعات کو شائع کرنے میں دلچسپی کیوں نہیں لیتے؟ وہی گھسے پٹے مضامین اور مجہول سی غزلیں۔ اُردو والوں کو دوسروں سے سیکھنے کا بھی موقع دیں۔ ورنہ وہ عمر بھر گلہ کرتے رہ جائیں گے جو تحریک فرانس اور انگلینڈ میں ۱۹۴۰ء میں چلی اس کی خبر وہ بھی اُڑتی پڑتی ہمیں ۱۹۹۰ء میں ملی۔ اس کی مثالیں آج بھی تابندہ ہیں۔ ساختیات کو ہی لے لیجیے۔ اب اُدھر اس کی قبر کا پتا بھی نہیں چلتا اور یہاں فصلِ نو کے طور پر ساختیات کی سڑی نارنگیاں شائع میرا

مفہوم ہے تقسیم ہو رہی ہیں۔

—— ارشد مسعود ہاشمی، کمرا، مظفر پور

▷ ستمبر ۹۲ء کا شمارہ وقت پر دستیاب ہوگیا۔ مجھے گوشۂ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر بہت ہی عمدہ لگا۔ آپ نے سحر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے ہر پہلو کو اُجاگر کیا ہے۔ اُردو کا یہ پہلا رسالہ ہے جس نے سحر صاحب پر گوشہ اتنی جلدی شائع کیا۔ علی عبّاس ازل کے انجانے عقیدے بھی پسند آیا۔ انجم عثمانی کے افسانے میں کلائمکس کی کمی ہے۔ انور مینائی کی نظم پسند آئی۔ عابد کرہانی کی غزل بھی عمدہ ہے۔

—— شازیہ جبیں، رانچی

▷ ستمبر ۹۲ء کا "ایوانِ اُردو" نظر نواز ہوا۔ ہر اعتبار سے پُرکشش ہے۔ افسانہ "پیرچھائی" پسند آیا۔ ارشد کمال اور عابد کرہانی کی غزلیں بھی داد و تحسین کی مستحق ہیں۔

—— م۔م۔ حسن، بلیا

▷ ستمبر ۹۲ء کے "حرفِ آغاز" میں آپ نے قومی یک جہتی کے لیے سیاسی جماعتوں سے جو اپیل کی ہے وہ اہم ہے۔ میں حرف بہ حرف متفق ہوں۔ سیاسی پارٹیاں اس بات کو سمجھیں کہ ہمارا ملک گلدستے کے مانند ہے جس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بودھ، جین سبھی پھولوں کی طرح ہیں۔ ہر پھول اپنی قیمت رکھتا ہے۔ ان سب کے میل جول پر ہی اس گلدستے کی خوبصورتی منحصر ہے۔ آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ملک کی سلامتی، اس کے جمہوری اداروں کا تحفظ اور اس کی مشترک تہذیبی روایتوں کی بقا آج کا اہم ترین فریضہ ہے جس کی ادائیگی میں ہم سب کی شرکت ضروری ہے۔

اس شمارے میں ایک گوشہ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ اُن کا ذکر جتنا بھی ہو اتنا ہی کم ہے۔ وہ تو قافلہ چھوڑ کر چلے گئے اور جاتے جاتے کہہ گئے:

اے قافلے والو تمھیں منزل ہو مبارک
میں ہر سفر اور سفر میرے لیے ہے

—— وشنو سروپ سری واستو، ستنا

▷ "ایوانِ اُردو" ستمبر ۹۲ء سرسری طور پر دیکھا لیکن جب گوشۂ بیدی پر نظر گئی تو پڑھے بغیر نہ رہ سکا۔ مجموعی طور پر اچھا گوشہ ہے لیکن اس سے کام نہیں چل سکے گا۔ اگر ان کی حیات پر ایک مکمّل شمارہ بطور نمبر شائع کیا جائے تو بہتر ہے۔

—— محمد طارق صدری سلفی، بستی پور

▷ اکتوبر کا شمارہ پڑھا۔ "حرفِ آغاز" میں فراق سے متعلق آپ نے بڑی سچّی سچّی باتیں لکھ دی ہیں ——— اِس بار "ادھوری تصویر" کو چھوڑ کر افسانے کمزور ہیں۔ نانک چند نے افسانے کو بُنا اچھے ڈھنگ سے ہے اور زبان بھی اچھی لکھی ہے۔ شعری حصّہ اس بار بطور خاص پسند آیا۔ مظہر امام، فضا ابنِ فیضی، پرتپال سنگھ بیتاب کی غزلیں بہت اچھی ہیں۔ ظفر گورکھپوری کے دوہے بھی اچھے ہیں۔ رشید حسن خاں صاحب کا مضمون بہت معلوماتی ہے۔ شمارے میں کم سے کم تین افسانے ہونے ضروری ہیں جیسے اس بار ہیں، کبھی کبھی دو ہی ہوتے ہیں۔

—— شاہد اختر، کانپور

▷ اکتوبر کے شمارے میں مضامین کا حصہ قدرے کمزور ہونے کے باوجود شعری حصّہ اور طنز و مزاح کا حصہ عمدہ ہے۔ غزلوں میں خاص طور پر لطف الرحمٰن کی غزل بہت اچھی ہے اور نظمیں حیات لکھنوی اور شہپر رسول کی۔

—— قاصر مجیبی، گیا

▷ اکتوبر کے شمارے کی ابھی ورق گردانی کر ہی رہے تھے کہ اچانک صفحہ ۵۶ پر نظر رُک گئی۔ کمار پاشی کے بارے میں پڑھ کر بہت شاک لگا۔ خدا ان کی آتما کو شانتی دے۔ ہماری دنیائے شاعری کا ایک چراغ یوں بُجھ جائے گا۔ اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ ہم ان کے اہلِ و عیال کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

—— محمد حسین صندی، رضیہ بانو صندی

▷ اُردو دُنیا دو عظیم حادثوں سے دوچار ہوئی ہے ان پر صبر کرنا آسان نہیں! ابھی محترم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے انتقال سے ادبی دُنیا سوگوار تھی کہ دوسری خبر جناب کمار پاشی کے حادثۂ ارتحال کی سُنی۔ کنور بیدی اور کمار پاشی ایسی عظیم ادبی شخصیتوں کے اُٹھ جانے سے جو ادبی نقصان ہوا ہے مدتوں اس کی تلافی ممکن نظر نہیں آتی۔ کنور صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ کمار پاشی کی علمی و ادبی خدمات تشنگانِ علم و ادب کو ہمیشہ سیراب کرتی رہیں گی۔ ان کی شاعری میں عہدِ جدید کی دھڑکن ملتی ہے اور معاشرے کے حالات نے جو عدمِ اطمینان اور بے چینی پیدا کی ہے اس کا اظہار بھی ہے۔

ہم مرحومین کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے غم میں سوگوار ہیں۔

—— اظہر نیّر، بھلائی نگر

▷ سالوں پہلے آپ ہی نے مرحوم کمار پاشی سے میری پہلی ملاقات کرائی تھی۔ اخبار

سے اُن کے گزرنے کی خبر نے دل ہلا کر رکھ دیا ہے ایک ہی وقت میں قدرت نے انھیں کس قدر صفات سے نوازا کر قدرت کی فیاضی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ ایک اہم مدیر، ایک بیباک ناقد، ایک خوبصورت شاعر، ایک زندہ جاوید کہانی کار اور ایک محبوب انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی مخصوص عنایات سے نوازے۔

—— نور تقی نور، میرٹھ

▷ چند روز قبل ٹی وی سے خبر ملی کہ کمار پاشی صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس خبر سے بے حد قلق پہنچا۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن سچ بہر حال سچ ہوتا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ آپ کی جائے قیام (ترکمان گیٹ) اور آصف علی روڈ کی کتنی یادیں تازہ ہو گئیں۔ مرحوم کی دلکش باتیں اب کہاں سننے کو ملیں گی؟ میرا خیال ہے کہ لال قلعے کے مشاعرے (جنوری ۱۹۹۱ء) کے دوران ان سے آخری بار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی سرسری طور پر۔ پاشی نے جدید شاعری میں اپنا ایک بلند مقام بنا لیا تھا۔ انھیں ادب کا کوئی بھی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

—— کرامت علی کرامت، کٹک

▷ سنا ہے کہ کمار پاشی چل بسا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اگر ہاں، تو "ولاس یاترا" کے بعد یہ کون سی یاترا ہے؟ پچھلے دنوں ۲۵ اپریل کے مشاعرے میں آپ کے ہمراہ آیا تھا تو صرف میرے مرحوم جوان سال بیٹے کو یاد کرتا رہا اور آہ آہ کرتا رہا۔ اس نے کچھ کہا بھی نہیں اور یاترا پر روانہ ہو گیا۔ میرا بہت پرانا دوست، میرا بھائی۔ میں کس کو پرسہ دوں۔ ایک مرتبہ دلّی قیام کے دوران بڑی محبت سے اپنے گھر لے گیا تھا۔ مجھے اس کے گھر کا پتا یاد نہیں، بھابھی اور بچوں سے جا کر کہہ دیجیے کہ دور افتادہ بھائی اس غم میں برابر کا شریک ہے:

اُس کے دم سے کیسی کیسی محفلیں آباد تھیں
ساتھ اپنے کتنی یادوں کے نشاں لیتا گیا

—— شمیم فاروقی، رانچی

▷ آخر یہ کیسے ہو گیا اور کیوں ہو گیا؟ ۲۵ اپریل کو بیتے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ اس ملاقات کی تو ابھی ایک ایک بات یاد ہے۔ اس کا ہر MOVEMENT اور ہر GESTURE یاد ہے۔ اس کی DIYNIFIED سنجیدگی یاد ہے؟ ریلوے پلیٹ فارم پر جب تمام لوگ چہلیں کر رہے تھے۔ وہ کتنی متانت لیے ہوئے خاموش سا تھا۔ ڈاکٹر پروفیسر سید وہاب اشرفی کے یہاں بھی اس کی سنجیدگی نمایاں تھی۔ مگر اس سنجیدگی میں کشش بھی تھی، بڑی پیاری سی۔ ادب کے ناطے سے میرے اس سے تعلقات ایک ربع صدی سے زیادہ پر پھیلے ہوتے ہیں۔ جب بھی کوئی مناسب موقع آیا مجھے اُس نے میری حیثیت سے کہیں زیادہ وقعت دی۔

گزشتہ رات ۹ بجے سے میں کیا محسوس کر رہا ہوں اور کس حد تک محسوس کر رہا ہوں۔ اسے رقم کرنا مشکل ہے۔ مجھے اپنے غم میں برابر کا شریک سمجھیے۔ آپ واقعی تنہا ہو گئے۔ آپ دونوں کی باہمی دوستی قابلِ رشک تھی۔ آپ دونوں ایک ہی تصویر کے دو پہلو تھے۔ لہٰذا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آپ پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اور تاعمر گزرتی رہے گی۔ لوگ بساطِ زیست سے اُٹھتے ہی رہتے ہیں۔ ہمارے درمیان سے حالیہ برسوں میں کتنی ہی صورتیں گم ہو گئیں مگر پاشی کی مفارقت مجھے سُن کر گئی ہے۔

خدا آپ کو صبر اور ہمّت دے اور اُس کی روح کو چین۔ جب بھی طبیعت راست پر آئے مجھے حالات سے اور حادثے کی تفصیلات سے ضرور آگاہ کیجیے۔

—— پرکاش فکری، رانچی

▷▷

اُردو اکادمی، دہلی کو اپنے کُتب خانے کے لیے علمی اہمیت کی حامل قدیم کتابیں اور مخطوطے درکار ہیں۔ جو حضرات ایسی کتب اکادمی کو دینا چاہیں وہ درجِ ذیل پتے پر خط و کتابت کریں یا ملیں۔

سیکریٹری اُردو اکادمی، دہلی
گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر : ۳۲۷۶۲۱۰ ، ۳۲۶۴۴۳

ایوانِ اردو دہلی

ادارت

ایس۔ اشتیاق عابدی، مخمور سعیدی

جلد : ۶ —— شمارہ : ۸ | فی کاپی ۵۰ر۳ روپے —— سالانہ قیمت ۳۷ روپے | دسمبر ۱۹۹۲ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی
اردو اکادمی، دہلی —— گھٹا مسجد روڈ،
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس : تنویر احمد

سرورق، عمل : ارشد علی خاں

ایس۔ اشتیاق عابدی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی ۲ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

آغاز

اختر شیرانی اُردو کے پہلے رومانی شاعر ہیں۔ انھوں نے ایک پورے عہد کو متاثر کیا اور ان کی شاعری کی سحر انگیزی آج بھی برقرار ہے۔ اختر کی شاعرانہ خود اعتمادی کا کچھ اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جب لاہور میں ان کی شعر گوئی کا غلغلہ بلند ہوا تو وہاں اقبال جیسا قدآور شاعر موجود تھا۔ اختر شیرانی نے ان کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور اسی شہر میں رہ کر اپنے جداگانہ رنگ و آہنگ کا لوہا منوایا۔

بعض لوگوں نے اختر شیرانی کی شاعری کو انگریزی ادب کی رومانوی تحریک کے پس منظر میں سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر یونس حسنی اختر شیرانی کے ہموطن ہیں۔ انھوں نے پی ایچ ڈی کے لیے اپنا تحقیقی مقالہ اختر شیرانی پر لکھا جو اب کتابی صورت میں کراچی سے شائع ہوگیا ہے۔ یہ کتاب ہماری نظر سے گزری ہے۔ ڈاکٹر یونس حسنی نے بھی ان کی شاعری کی تعبیر وتفہیم کے لیے یہی طریق کار اختیار کیا ہے۔

یہ درست ہے کہ اختر شیرانی کے عہد میں انگریزی ادب کی رومانوی تحریک کے کچھ اثرات ہندستان پہنچ چکے تھے لیکن یہ سمجھنا کہ خود ان کی شاعری انھی اثرات کی پیداوار ہے، شاید زیادہ صحیح نہیں۔ اختر شیرانی انگریزی زبان وادب سے زیادہ آشنا نہیں تھے۔ ان کے ذہن وذوق کی تربیت فارسی اور عربی کی ادبی روایات کے زیرِ اثر ہوئی تھی اس لیے ہمیں ان کی شاعرانہ شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان روایات کے اثرات پر بھی غور کرنا چاہیے۔ ہمارے خیال میں اولاً تو وہ اپنی افتادِ طبع کے لحاظ ہی سے رومانی واقع ہوتے تھے، ثانیاً ان کے اس میلان کو عربی شاعری کے مطالعے نے تقویت بخشی۔ وہ اپنی شاعری میں صحرائی مناظر کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ ان مناظر کی کشش انھیں بار بار اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور ان کی شاعرانہ حس کی بیداری کا سبب بنتی ہے۔ ان کی بیشتر نظموں کی تشکیل وتعمیر میں صحرائی پس منظر کی غالب کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو ان کے گرد وپیش کے ماحول کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ راجستھان کے ایک شہر ٹونک سے وطنی نسبت رکھتے تھے جہاں یہ مناظر ان کے چاروں طرف بکھرے ہوتے تھے دوسرا سبب ریگستانِ عرب کے قدیم شعرا کے مطالعے ہی میں تلاش کیا جاسکتا ہے کہ ان کے ہاں ان مناظر کی بڑی دلکش تصویریں نظر آتی ہیں۔

اختر شیرانی سے پہلے اُردو شاعری میں محبوب کا ذکر بہ صیغۂ تذکیر ہوتا رہا ہے۔ وہ اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے محبوب کے لیے صیغۂ تانیث کا استعمال کیا۔ ان کے ہمعصروں میں جوش جیسا باغی شاعر بھی یہ اخلاقی جرأت نہیں دکھا سکا تھا۔ اختر شیرانی اس سے بھی آگے گئے ہیں اور انھوں نے اپنی محبوباؤں کا نام بہ نام ذکر کرنے کی جسارت بھی کی ہے۔ یہ نام اصلی ہیں یا فرضی اس سے قطع نظر اگر ان کی اس جسارت کا کوئی خارجی محرک تلاش کرنا ضروری ہو تو ہمارا دھیان عربی شاعری کی طرف بھی جانا چاہیے جہاں محبوب مرد نہیں، عورت ہے اور یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت کے عربی شعرا اپنی عاشقانہ شاعری میں بے باکانہ اپنی معشوقاؤں کے ناموں کا اعلان کردیا کرتے تھے۔

اختر شیرانی کی ایک مشہور غزلِ مسلسل ہے جسے انھوں نے ایک عنوان بھی دیا ہے: "اف ری جوانی ہائے زمانے"۔ اس کا ایک شعر ہے:

گھر کی مقدس پاک فضائیں بوئے حنا سے مست ہوائیں
صحن میں بنتِ عم کی صدائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

"بنتِ عم" اختر شیرانی کی شاعری میں اور بھی کئی مقامات پر اپنی جھلک دکھاتی ہے اور عربی کے اکثر شعرا بھی اس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر نظر آتے ہیں جبکہ انگریزی شاعری بلکہ انگریزی معاشرے میں بھی اس کے اس روپ کی نشاندہی مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔

——— ادارہ

ڈپٹی نذیر احمد خاں اور حیدرآباد

رؤف خ
۱۹/۲۰۲-۱۰-۹، بیت الخیر، رسالہ بازار، گولکنڈہ، حیدرآباد ۰۸

حیدرآباد دکن وہ سرزمین ہے جس نے بڑے بڑے لوگوں کی پذیرائی کی ہے بعض قلم کاروں نے بے فکری کے ساتھ اپنے علمی مشاغل جاری رکھنے کے لیے صرف وظیفہ کی درخواستیں دیں اور خسرو دکن نے انھیں مایوس نہیں کیا۔ بعض اولوالعزم فن کاروں نے خدمت کا موقع مانگا اور اس سرزمین نے انھیں خدمت کا موقع اور اس کا بھرپور صلہ بھی دیا۔ کچھ مشاہیر ادب نے تو یہاں بار پانے کے لیے مختلف جتن کیے، قصیدے لکھے، سفارشی چٹھیاں لائے حتیٰ کہ رسول اللہ کو دکن جانے کی تلقین فرماتے ہوئے خواب تک دیکھ ڈالے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اس سرزمین پر سارے ملک سے بہترین دماغ جمع ہونے لگے یوں بھی دہلی اور لکھنو کی بچی کھچی ساکھ بھی دم توڑ رہی تھی۔ جو کبھی آنکھوں کا سرمہ تھے: انھی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں۔ والا معاملہ تھا۔ شمالی ہند میں سیاسی و معاشی اعتبار سے حالات اس قدر خراب تھے کہ نابغۂ روزگار کو روزگار کی تلاش کے لیے حیدرآباد بہتر کوئی اور مقام اور والیِ دکن سے اچھا قدر داں کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کچھ یہاں کی ضرورت اور مرعوب ذہنیت بھی ان کے لیے راہ ہموار کر رہی تھی۔ دکن انگریزی سامراج کی GOOD BOOK میں تھا اور شمالی ہند کے فن کاروں، دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں پر دہلی کی زمین تنگ ہو رہی تھی ڈپٹی نذیر احمد یوں بھی پیسے کی بڑی قدر کرنے والے تھے اور دکن میں پیسہ بہت تھا۔ صلاحیتوں کا منہ مانگا صلہ دیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ جب سر سالار جنگ نے سرسید احمد خاں سے معقول مشاہرے پر بعض اہم اور کارآمد لوگ طلب کیے تو سرسید نے پانچ چھ آدمی بھیج دیے جن میں سرسید کے خاص معتمد محسن الملک مولوی مہدی علی بھی تھے انھی کے ذریعہ ڈپٹی نذیر احمد کو دعوت ملی کہ اگر وہ حیدرآباد آجائیں تو ایک معزز عہدہ ان کا منتظر ہے۔ مشاہرہ آٹھ سو روپے جو بعد میں ایک ہزار روپے ماہانہ ہو جائے گا، دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ڈپٹی نذیر احمد ایک خط میں اپنے بیٹے میاں بشیر الدین احمد کو لکھتے ہیں:

"دربار حیدرآباد ان دنوں بہت ممدوح ہے۔ اختیارات وسیع۔ عہدہ معزز۔ مجھ کو وہاں کے زیادہ حالات معلوم نہیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ ادھر کے اور انگریزی عمل داری کے ہزارہا بندگانِ خدا وہاں ہیں۔ سیکڑوں آدمی تو دلی کے وہاں ہیں"

یہ نہیں کھلتا کہ ڈپٹی نذیر احمد نے حیدرآباد آنے کے لیے اپنی سرکاری ملازمت سے پنشن لے لی کہ رخصت لے لی تھی کیونکہ ۲۸ فروری ۱۸۷۷ء کے ایک خط میں وہ اپنے بیٹے
ہیں:

"تین مہینے کی رخصت لے کر
نے بھی سفارش کر دی ہے لیکن حیدرآباد
برس دو برس کی فرلوینی ہو گی (کذا)
تو اس کے لیے میں نے دریافت کیا ہے
حیدرآباد سے خط آنے شروع ہوئے
کے علاوہ دو سو روپے ماہوار دوام
بھی ہے۔ اب میں صرف دو باتوں کا
ایک تو رخصت کی منظوری۔ دوسرے
مولوی مہدی علی صاحب کو لکھا ہے
جواب۔ اگر حیدرآباد میں پاؤں جم
نصیب میں ہے تو سر منزل حج و زیارت
شریفین قریب ہے۔"

ایک اور خط میں ڈپٹی نذیر احمد اپنے
دہلی میں زیر تعلیم ہے اور جو حیدرآباد
ہے، لکھتے ہیں:

"تم حیدرآباد جانے کے متقاضی
میں تمھاری عمر دوں میں تھا تو مجھ کو عرش
تھی:

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا
اب صرف اتنی گدگدی دل میں ہے کہ
نہیں کیا۔ اگر ابتداءً بارہ سو دیں گے

ے لیے سامان کر دینے کا وعدہ فرمائیں گے
نشاءاللہ جاؤں گا۔"

خط کے اگلے جملوں میں انھوں نے اپنی
داری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے:

"...... لیکن مجھ کو ایسا احمق مت سمجھو کہ
ت دنیا جمع کرنے کو زندگی کا ماحصل سمجھوں
ر ـــــ دنیا کو تو خوب دیکھا۔ غریب
اج تھا، خدا نے مال دار غنی کیا۔ اولاد ہوئی۔
دمت کے مزے اڑائے۔ نام وری اور شہرت
بھی بے نصیب نہیں رہا۔ لیکن انجام ان
یزوں کا کیا ہے؟ آخر فنا آخر فنا۔ اب خداوند
الیٰ ایسی توفیق عطا کرے کہ کچھ وہاں کے لیے
ی کروں

کیا وہ دنیا جس میں کوشش ہو نہ دیں کے واسطے
واسطے واں کے بھی کچھ یا سب یہیں کے واسطے

(خط مورخہ ۲۳ فروری ۱۸۷۷ء)

حیدرآباد کو وہ کوئی مقام مقدس
سمجھ کر زیارت کے لیے تو بہرحال نہیں آرہے
تھے صرف جلب منفعت ہی کے لیے تشریف لا
رہے تھے چنانچہ وہ اپنے ایک خط مورخہ ۶ مارچ
۱۸۷۷ء میں اپنے بیٹے کو یہ خوش خبری سناتے ہیں:

"نواب سر سالار جنگ بہادر نے منظور
فرمایا کہ میری انگریزی نوکری وہاں کی خدمت
میں مجرا و محسوب ہو کر پنشن دی جائے گی۔"

"ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی
کچھ میری زبانی" میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے
اپنے استاد شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کی بڑی
دلچسپ تصویر کھینچی ہے۔ عربی کے ایک شعر کا
مطلب سمجھاتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی
ابتدائی عسرت کی زندگی کی کہانی سنائی اور کہا تھا
کہ بچپن میں وہ دہلی کی ایک مسجد میں ہمہ وقتی
خادم کی طرح رہا کرتے تھے ہر شام محلے بھر کے
گھروں سے روٹیاں بٹور کر لاتے، خود کھاتے
اور امام مسجد کو کھلاتے بعد میں ان کی شادی
اسی لڑکی سے ہوئی جو ان سے سیر دو سیر کے
مصالحے پسوائے بغیر روٹی نہیں دیا کرتی تھی۔
وہ اپنے بُرے دنوں کو بھولے نہیں تھے۔ پیسے
کی قدر کرتے تھے۔ قوم کے ہمدرد بھی تھے۔
ان کی خواہش تھی کہ مسلمان تجارت میں زیادہ
سے زیادہ حصہ لیں اس کے لیے وہ مالی مدد
کرنے کے لیے بھی آمادہ رہا کرتے تھے۔

حیدرآباد آجانے اور حیدرآباد میں ان
کی قدر و منزلت کے بارے میں تفصیل سے یوں
لکھتے ہیں:

"جہاں اب ہوں حقیقت میں ایک
نئی دنیا ہے۔ میں حیدرآباد میں ۲۷ اپریل کو
پہنچ گیا تھا۔ دو مرتبہ ہز اکسیلنسی نواب سر
سالار جنگ بہادر سے ملا۔ مدارالمہام، مختارالملک،
نواب صاحب اور سرکار عبارت ہے سر
سالار جنگ بہادر سے اور حضور اور بندگان
عالی (سے مراد) حضور نظام۔ میں اتنا کہہ سکتا
ہوں کہ یہاں کے ساز و سامان اور تزک و احتشام
دیکھ کر خدا یاد آتا ہے[1] دہلی و لکھنؤ میں اس کا
عشر عشیر بھی نہ ہوگا شہر میں جا کر دیکھو تو تل رکھنے
کی بھی جگہ نہیں۔ اور پھر ہجوم بھی قلی، مزدوروں
بھیک مانگنے والوں کا نہیں بلکہ نوابوں اور سرکاروں
کا جن کی اردلی میں پلٹنیں، رسالے اور ہاتھی دوڑتے
ہیں سرکار (سالار جنگ) کے محلوں میں جا کر
ہکا بکا سا ہو جاتا ہوں اور یہ تموّل اس حالت میں
ہے کہ عمل داری میں اچھا انتظام نہیں۔ شاید
قریب نصف عین المال سرکار (اصل خزانہ)
نمک حرام نوکر خرد برد کرتے ہیں اور اگر خدا نوکروں
کو توفیق خیر خواہی دے تو یہ ملک بجائے خود دودھ
کا ہو گنا ہے اور زمین بعض اطراف میں بلا مبالغہ
تین سو روپے بیگھہ تک کی موجود ہے شوخ چشمی
کی وجہ یہ ہے کہ موقوفی کا دستور نہیں۔ جرمانہ
کرنے کا قاعدہ نہیں۔ سرکار نے مجھ کو یکم اپریل
یعنی روز روانگی اعظم گڑھ سے بارہ سو روپے
کے حساب سے تنخواہ دی جس میں ہزار روپیہ
تنخواہ ہے اور دو سو روپے بھتہ دوامی۔ دہلی
سے حیدرآباد تک میرا اول درجے کا اور میرے
دو ساتھیوں کا سوم درجے کا کرایہ ریل دیا...
بہ ایمائے سرکار عالی دورے پر ہوں اور جب
تک موسم اجازت دے، دورے میں رہوں گا
گرمی تو یہاں ہے مگر نہ وہاں کی سی یعنی اگرچہ
دھوپ میں ہے مگر وہ تپش نہیں کہ آدمی بے چین
ہو جائے۔ موسم یہاں معتدل سے رہتے ہیں۔
جاڑے میں لحاف کی ضرورت نہیں۔ گرانی ہے
اور بوجہ خشک سالی ان دنوں اور زیادہ ہے
لیکن لوگ ایسے خوش حال ہیں کہ کبھی کوئی گرانی
کا نام بھی نہیں لیتا۔ جس خدمت پر میں ہوں
بڑی معزز ہے۔ الحمدللہ علی نعمائہ
والائہ۔

دیار اجنبی میں ہوں۔ دن بھر کوئی نہ
کوئی نئی بات سیکھتا ہوں۔ یہاں کی زبانیں
جو مفصلات میں بولی جاتی ہیں مرہٹی، تلنگی،
کنڑی، اردو ہیں" (اڑیا)

(خط مورخہ ۲۵ ربیع الثانی ۱۲۹۴ھ)

---

[1] "خدا یاد آتا" ڈپٹی نذیر احمد نے یہاں بے محل استعمال کیا ہے۔ حالانکہ وہ لکھتے ہی محاورے لکھنے کے لیے تھے اور زبان دانی کا دعویٰ بھی بہت رکھتے تھے۔ خیر

حیدر آباد آکر ڈپٹی نذیر احمد کی مصروفیت
بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کا سبب کچھ تو نئے
مقام پر زیادہ سے زیادہ کام کی نوعیت
سے واقفیت اور کچھ اپنی کارکردگی کا سکہ
بٹھانا مقصود ہوگا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے فرزند میاں بشیر الدین
دہلی میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے اور
باپ کی خواہش تھی کہ بیٹا پڑھ لکھ کر قابل
نکلے۔ وہ اپنے بیٹے کو انگریزی سیکھنے کی ہر
خط میں تلقین کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کا
بیٹا انھیں خطوط لکھے تاکہ وہ اس کی انگریزی
دانی کی صلاحیتوں سے واقف ہو سکیں وہ
اپنے بیٹے کی آسائشوں کا پورا پورا خیال رکھتے
ہیں اسے سونے کی وہ گھڑی بھی دے دیتے
ہیں جو انھیں انڈین پینل کوڈ INDIAN PENAL CODE کا اردو ترجمہ
کرنے پر انگریز سرکار سے ۱۹۶۰ء کے قریب
بطور انعام ملی تھی۔ اس وقت اس کی قیمت
پانچ سو روپے تھی گھڑی کے ساتھ اس کے
استعمال و احتیاط کے سلسلے میں جو "ہدایت نامہ"
وہ اپنے لڑکے کو لکھتے ہیں وہ بے حد دلچسپ
ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد ہر مقام سے بیٹے کو
پابندی سے خط لکھا کرتے تھے اور اپنے
معمولات کی ایک ایک بات انھیں بتایا کرتے
تھے۔ یہ تمام خطوط "مواعظ حسنہ" پر مشتمل ہیں۔

نذیر احمد نے نلگنڈہ سے اپنے دورے
کی رپورٹ سر سالار جنگ کو بھیجی تھی محسن الملک
مولوی مہدی علی صاحب نے نواب سر
سالار جنگ کے اشارے سے ان کو لکھا کہ
قسمت شرقی EAST WING کی صدر
تعلقہ داری یعنی کمشنری ان کے لیے تجویز ہوئی
ہے اور فوراً تنخواہ بارہ سو روپے کر دی جائے
گی (بھتے کے علاوہ) اور اس قسمت کا
بندوبست بھی اُن سے متعلق رہے گا۔ نظام کی سلطنت
میں باعتبار اختیارات صدر تعلقہ داری کا
عہدہ بہت بڑا عہدہ تھا جو نسبت
مدار المہام کو تمام ریاست سے تھی وہی
نسبت صدر تعلقہ دار کو اپنی قسمت (AREA)
سے ہوتی تھی۔ پس جتنے صیغے مال، عدالت، تعلیمات،
تعمیرات وغیرہ کے ہیں صدر تعلقہ دار کل
صیغوں میں حاکم اکبر ہوتا تھا لیکن وہ مدار المہام
اور صدر المہام اور سب کے معتمدین
SECRETARIES کا ماتحت ہوتا
تھا گویا صدر تعلقہ دار DIVISIONAL
COMMISSIONER ڈویژنل کمشنر ہوتا تھا
جو بورڈ اور گورنمنٹ کا تابع ہوتا تھا وہ ایک
خط میں بیٹے کو لکھتے ہیں:

"میں حیدرآباد پہنچ کر شاید صرف ایک
ہفتہ مقیم رہا۔ اس اثنا میں دو مرتبہ نواب صاحب
(سالار جنگ) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ارشاد
ہوا کہ سیروا فی الارض (زمین میں سیر کرو)
اور خود بھی ناواقفیت کی وجہ سے گھبراتا تھا
غرض حیدرآباد میں جلسۂ تبلیغی کر کے (یعنی دو
خطبوں کے درمیان بیٹھنے کے وقفے کے برابر
رک کر۔ تیر) دورے کو نکل کھڑا ہوا۔ حکم تو یہ
تھا کہ ناگر کرنول اور نلگنڈہ اور دو ضلع ملک
تلنگانہ کے دیکھ آؤ لیکن جب میں ضلع ناگر
کرنول کے صدر مقام محبوب نگر میں پہنچا تو ایک
انگریزی ضلع کرنول قریب تھا۔ بے اختیار جی
چاہا کہ وہاں کا طرز انتظام بھی دیکھوں، چنانچہ
اکیلا کرنول چلا گیا۔ ایک ہفتہ وہاں تھا پھر
ناگر کرنول آگیا اور پھر دورے کی عملی شروع
ہوئی۔ یہاں تک کہ نلگنڈہ پہنچا اس دورے
میں مجھ کو یہ علم تھا کہ کل دفاتر کی تنقیح کروں"

(۲۰ ربیع الثانی ۱۲۹۳ھ [illegible])

[illegible]

ڈپٹی نذیر احمد نے بڑی محنت سے تمام
دفاتر کی جانچ پڑتال کی اور سالار جنگ کو ایسی
رپورٹ بھیج دی۔ اس تفصیلی تنقیح و اس کی
تفتیشوں (REMARKS) کو پڑھ کر سالار جنگ
پر بڑا اچھا اثر ہوا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ
ڈپٹی نذیر احمد تو بڑے کام کے آدمی ہیں حالانکہ
ڈپٹی نذیر احمد کے لیے یہ ساری کاروائیاں
یکلخت نئی تھیں۔ یہاں تلگو، مرہٹی، کنڑی
اور پھر اردو بھی دکنی لہجے میں بولی جاتی تھی
جس کی وجہ سے نذیر احمد کو پہلے پہل بات
سمجھنے میں کافی دشواری بھی ہوا کرتی تھی
اس کے علاوہ دفتری زبان پر فارسی کا تسلط
تھا جبکہ ڈپٹی نذیر احمد نے زندگی میں کبھی فارسی
نہیں لکھی تھی (اس کا اعتراف خود انھوں نے
اپنے ایک خط میں کیا ہے) وہ عربی کے
استاد تھے مگر یہاں فارسی میں دفتری امور
انجام دینے پڑ رہے تھے۔ بہرحال اپنے کام
انھوں نے اس سلیقے سے انجام دیا کہ سرکار
نے ان کا لوہا مان لیا۔ نواب سر سالار جنگ
انھیں ملاقات کا حکم بھیجا۔ تمام دفاتر میں
خامیاں اور کوتاہیاں دکھائی دیں اس
تفصیل بھی چونکہ نذیر احمد نے بلا کم و کاست
لکھ بھیجی تھی اس لیے انھیں خوف ہو رہا
کہ شاید ان رپورٹس نے کچھ اچھا اثر نہ
ڈالا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے لکھا تھا کہ نلگنڈہ

۱۰۱ [illegible]

کا ایک بڑا حصہ ویران پڑا ہے۔ آدمی اتنے نہیں کہ انھیں جوت سکیں۔ اس کے بندوبست کے لیے وقت اور روپیہ بہت درکار ہے ایک ضلع کے لیے کم سے کم سات برس اور اس پر خرچ کرنے کے لیے پندرہ لاکھ روپیہ چاہیے اور سرکار نظام میں اتنی سکت نہیں کہ اتنے زیادہ مصارف کی متحمل ہو سکے۔ ان کا خیال تھا کہ سرکاری بندولست کرکے اور نظری رواروی پیمائش کرکے دس سالہ قول پر کاشت کاروں کے حوالے کردی جائے اور اور چونکہ ناظم بندولبست ہو کر انھوں نے اس قسم کی منفی رائے دی تھی اس لیے انھیں ڈر تھا کہ کہیں نواب صاحب کو یہ رپورٹ کھل نہ گئی ہو مگر انھوں نے جو کچھ محسوس کیا وہ ایمان داری کے ساتھ لکھ دیا تھا۔ انھوں نے اضلاع کے عہدہ داروں کی بےضابطگیاں بھی بہت پکڑی تھیں۔ جب وہ تعمیل حکم میں سر سالار جنگ سے ملے تو انھیں اپنا گرویدہ پایا۔ سالار جنگ نے ان کی رپورٹ بہت پسند فرمائی تھی۔ سالار جنگ مدارالمہام تھے ان کے اختیارات گورنر کے اختیارات کے مساوی تھے ان کے تحت چار صدرالمہام تھے

۱۔ صدرالمہام مال گزاری (MINISTER (FOR REVENUE

۲۔ صدرالمہام کوتوالی (INSPECTOR (GENERAL OF POLICE

۳۔ صدرالمہام عدالت (غالباً CHIEF (JUSTICE OF HIGH COURT

۴۔ صدرالمہام متفرقات یعنی تعلیمات، ڈاک، صحت، تعمیرات وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح سالار جنگ بہت اہم اور کلیدی حیثیت کے مالک تھے۔ سلطنت پر نظام کے بعد کوئی اگر صاحب اختیار شخصیت تھی تو وہ یہی سالار جنگ تھے۔ چونکہ ڈپٹی نذیر احمد صیغۂ مال (REVENUE DEPART-MENT) کے اہم عہدے پر فائز تھے اس لیے وہ راست صدرالمہام مال گزاری نواب مکرم الدولہ بہادر کے ماتحت تھے جو سالار جنگ کے بھانجے اور داماد تھے۔

نواب سر سالار جنگ نے ڈپٹی نذیر احمد سے فرمایا کہ وہ صدر تعلقہ دار کے عہدے کے لیے بے حد مناسب شخصیت ہیں۔ صدر تعلقہ دار کا مطلب تھا تمام محکموں کا حاکم۔ یہ بڑی ذمہ داری کا معاملہ تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے عذر کیا کہ وہ اتنی بڑی خدمت کے اہل نہیں دراصل وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ چار چار صدرالمہاموں کو جواب دہ ٹھہریں گے جو ایک عذاب سے کم نہ ہوگا۔ چونکہ ان کی کارکردگی سے سالار جنگ بہت خوش تھے اس لیے اصرار کیا کہ وہ صدر تعلقہ دار کا منصب قبول کرلیں اور یہ کہ ان کی تنخواہ میں مزید دو سو روپیوں کا اضافہ کر دیا جائے گا گویا اب انھیں بارہ سو روپے ماہوار ملا کریں گے۔ اس وقت سب سے زیادہ تنخواہ یہی ہوا کرتی تھی۔ اس پر بھی ڈپٹی نذیر احمد نے یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا تو نواب سالار جنگ نے فرمایا کہ اس سے زیادہ تنخواہ کا دستور نہیں۔ اور اگر اس سے زیادہ رقم خاص طور پر نذیر احمد کے لیے مقرر کردی جائے تو دیگر صدر تعلقہ داروں کو شکایت ہوگی۔ البتہ سالار جنگ نے ان کے لیے ایک خاص رعایت یہ فرمائی کہ ایک صدر مددگار مال کا نیا عہدہ قائم کیا جس پر ڈپٹی نذیر احمد کو اجازت تھی کہ اپنے کسی عزیز کا تقرر کریں تاکہ وہ اُن کا ہاتھ بٹا سکے۔ اب ڈپٹی نذیر احمد کے لیے سوائے تسلیم کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ یہ سوء ادب ٹھہرتا اور انھوں نے صدر تعلقہ دار کا منصب جلیلہ قبول کرلیا مگر اس ہوشیاری کے ساتھ کہ ان کا اصل عہدہ یعنی ناظم بندوبست بھی باقی رہے اور ساتھ ہی منضم صدر تعلقہ دار بھی وہ رہیں۔ اس میں یہ مصلحت تھی کہ ناظم بندولبست کا بھتہ (ALLOWANCE) بھی دو سو روپیہ ماہوار ملتا رہے۔ ڈپٹی نذیر احمد روپے پیسے کے بارے میں ذرا زیادہ ہی سوچنے والے تھے اس طرح دو تین سال سے بھی کم عرصے میں تنخواہ کے HIGHEST SCALE پر پہنچ گئے اور نئے عہدے پر اپنے ایک عزیز کا اپنے مددگار کے طور پر ماہانہ چار سو روپئے پر تقرر بھی کرلیا۔

نواب سالار جنگ کے بارے میں اپنے بیٹے بشیرالدین احمد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ہمارے نواب صاحب اس طرح کے سخی اور سیر چشم آدمی ہیں کہ جو مانگو سو لو مثل اکثر دوسرے ہندوستانی رئیسوں کے احمق اور لایعقل نہیں ہیں۔ اپنے وقت کا یہ شخص ارسطو و افلاطون ہے۔ کریم النفسی اور مروت اس درجہ ہے کہ لا، نہیں اور نو (NO) منہ سے نہیں نکلتا..... بشیر یہ بڑا عمدہ اصول ہے من لم یشکر الناس فلم یشکر اللہ تم نواب صاحب کے احسانوں پر نظر کرو۔ روز روانگی اعظم گڑھ سے مجھے تنخواہ دی کرایہ ریل مع ہمراہیان دیا۔ دورے میں فیل خانۂ خاص سے ایک ہاتھی سرکاری طور پر ساتھ کر دیا میری ترقی کر دی۔"

(خط مورخہ ۲۰ رجمادی الثانیہ ۱۲۹۴ھ)

وہ اپنے بیٹے کو ایک خط لکھتے ہوئے حیدر آباد کی صورتِ حال کے بارے میں بتاتے ہیں کہ:

"ہمارے یہاں تاریخوں کا بڑا اغلط مبحث ہے۔ تنخواہ تو فارسی مہینوں کے حساب سے ملتی ہے۔ اس میں فائدہ یہ سوچا گیا ہے کہ انگریزی مہینوں کی طرح ہر مہینے کے دن مقرر ہیں۔ انگریزی میں اکتیس دن کا مہینہ بڑا نامبارک سمجھتے تھے (کذا) یہاں خدا کے فضل سے بتیس دن کا مہینہ بھی ہے۔ دوسرے صدر سے لے کر مفصل تک کل دفتروں میں عربی مہینے مستعمل ہیں۔ تیسرے، انگریزی مہینے کہ بے ان کے تم نہیں سمجھتے اور نہ ریذیڈنسی کے معاملات چلتے ہیں یہاں کا سکہ بھی تمھاری گورنمنٹ کے روپے سے کم ہے عموماً تین بٹہ (۴/۳) لگتا ہے مگر بازار کے بھاؤ سے کم و بیش بھی ہوتا رہتا ہے جیسے روپیہ اور پاؤنڈ شلنگ کا ایکسچینج (EXCHANGE) بدلتا رہتا ہے یہاں حالی اور کمپنی کا نرخ یکساں نہیں رہتا۔"

(خط مورخہ ۷، جولائی ۱۸۷۷ء)

ایک اور خط میں اپنی مزید مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھ کو سرکار سے سمت شمالی کی صدر تعلق داری کا چارج لینے کا حکم مل چکا۔ کل پرسوں تک انشاء اللہ پٹن چرو جاتا ہوں جو کہ مستقر سمت ہے۔ حیدر آباد سے پٹن چرو نو کوس ہے اور لنگم پلی اسٹیشن سے پانچ میل ہمارے یہاں ڈاک کو ٹپہ کہتے ہیں اور یہاں کے ٹکٹ علیحدہ ہیں"

(خط مورخہ ۱۱ جولائی ۱۸۷۷ء)

ڈپٹی نذیر احمد ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھے اور ان کو غالباً پورا پورا اندازہ تھا کہ ان کے خطوط سنسر (CENSOR) بھی ہوتے ہوں گے اس لیے اپنے نجی خطوط میں وہ دل کھول کر سر سالار جنگ اور نظام کی حکومت کی تعریف بھی کیا کرتے تھے تاکہ ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو پتہ نہیں ان کے فرزند بشیر الدین احمد نے واقعی کچھ اعتراض بھی کیا تھا کہ انھوں نے خود اپنی طرف سے ہی لکھ دیا۔

"تم نے ہماری سلطنت کو اتنا ذلیل کیوں سمجھ لیا ہے۔ وہ جو یہاں سے وہاں نہیں (عزت، آبرو، بلیش قرار تنخواہ) اور وہ جو وہاں ہے یہاں نہیں۔ (قاعدہ قانون اور کامل اطمینان) باقی جو وہاں سو یہاں۔ جو یہاں سو وہاں۔ دلّی میں برائے نام ایک بادشاہ تھے جن کو برائے نام لاکھ روپیہ مہینہ پنشن کے طور پر ملتا تھا۔ تم نے ان کو بھی نہیں دیکھا۔ میں نے یہاں ایک سلطنت دیکھی کہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ لاکھ سالانہ کے جاگیردار ہیں۔ غرض مسلمانوں کی سلطنت کی ایک یادگار ہے۔ خدا اس کو باقی رکھے۔ آمین"

(خط مورخہ ۱۳، اگست ۱۸۷۷ء)

ڈپٹی نذیر احمد کو ریذیڈنٹ کی تقریبی چٹھیوں (RECOMMENDATORY LETTERS) کے ساتھ سالار جنگ نے مدراس و میسور بھیجا تاکہ وہ وہاں کے طریقۂ بندوبست سے آگہی حاصل کر کے آئیں ۲۵ مئی ۱۸۷۷ء کو وہ مدراس پہنچے اور سیٹھ اسماعیل کی کوٹھی پر قیام کیا۔ ان کا پُر تپاک استقبال مدراس میں ہوا۔ مدراس کی بڑی اہم شخصیت یعنی سیٹھ اسماعیل نے ان کے رہنے سہنے کا بندوبست کیا۔

وہ اس تمام عرصے میں حیدر آباد اور سرکاری ذمّہ داریوں میں اس قدر مصروف رہے کہ گھر کی خبر ہی نہ لی اپنی بیوی کے نام ایک نجی خط میں وہ یہاں کی اندرونی ریشہ دوانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میں نے رخصت کی درخواست کی تھی۔ بڑی حجت کے بعد منظور ہوئی لیکن پھر جو غور کیا تو جانا کچھ مناسب سا نہیں معلوم ہوتا۔ ہر چند رخصت پر جانے میں میرا ذاتی چنداں نقصان نہیں مگر ساتھ والوں کی بڑی خرابی ہے۔ تم ایسے مطمئن ملک میں رہتی ہو کہ تم یہاں کے حالات مشکل سے سمجھو گی۔ ہندوستانی ریاست ہے اور ہم چند جلیل القدر ہندوستانیوں کا یہ حال ہے کہ در و دیوار دشمن ہو رہا ہے اور وجہ عداوت یہ ہے کہ ہم لوگ بڑے بڑے عہدوں میں اور بڑے اختیار رکھتے ہیں۔

..... ہندوستان میں تو ردّی کا ٹھکانا نہیں ساری خلقت یہیں ٹوٹ پڑی ہے۔ خاص کر ہمارے ہم وطن ہی ہمارے سخت دشمن ہیں۔ دیکھ کر جلتے اور بیخ کنی میں لگے رہتے ہیں ایسی حالت میں ایک دم کے لیے بھی نوکر سے جدا ہونا مصلحت نہیں معلوم ہوتا یہاں ایک دن میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔"

(۱۸۷۷ء)

(اس خط پر تاریخ اور مہینہ درج نہیں ہے صرف سن درج ہے)

فانی بدایونی نے اہلِ دکن پر کبھی یہ کہہ کر چوٹ کی تھی کہ:

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

مگر اس خط سے معلوم ہوا کہ ڈپٹی نذیر احمد خود بھی شمالی ہند کو "ہندوستان" کے نام سے اور شمالی ہند کے رہنے والوں کو ہندستانی کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ مگر دکن کی سلطنت کو بھی انھوں نے "ہندوستانی ریاست" کا نام دیا۔

آخر آخر ڈپٹی نذیر احمد اپنے عہدے اور اس کی ذمہ داریوں سے ادب گئے تھے بہرحال دیگر مشاہیر کی طرح ڈپٹی نذیر احمد نے بھی دکن کو بنانے سنوارنے میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بڑا اہم رول ادا کیا۔ اور اہلِ دکن نے بھی انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا سب سے بڑا اعزاز تو ان کے لیے یہی تھا کہ وہ نظام دکن کے اتالیق مقرر تھے اور ظاہر ہے یہ خدمت وہ فی سبیل اللہ نہیں کرتے تھے۔

غزلیں

کمال احمد صدیقی

ل سے نین، نہ چشمِ غزال ــــ کون ہو تم ؟
ا ہے تم پہ نزولِ جمال ــــ کون ہو تم ؟

ھر ہیں سجدے میں جابر کے پاؤں پر شاعر
ر انقلاب تمھارا سوال! ــــ کون ہو تم ؟

یلے ظلم کی تکذیب کر رہے ہو تم ــ !
یں ہے کوئی تمھاری مثال، کون ہو تم ؟

جانتے ہو، کرتا ہے دوسروں سے قتل
ا رہے ہو اُسے اشتعال! کون ہو تم ؟

لیب و دار سے بھی تم کو ڈر نہیں لگتا!
بان کھولتے ہو! یہ مجال! کون ہو تم

رایک لفظ تمھاری زباں پہ شعلہ ہے
نفتگو میں ہو شیریں مقال! کون ہو تم ؟

ال! ــ کون ہے وہ شاعر کمال! کون ہو تم
یب سے ہیں تمھارے سوال! کون ہو تم

کمال احمد صدیقی

ــ ۔د۔ د، لاجپت نگر، صاحب آباد (غازی آباد) ۲۰۱۰۰۵

اختر بستوی

دنیا میں ہُوا کیا حالِ وفا، ہم کیا کہتے تم کیا سنتے
دونوں کو خود اپنا ہوش نہ تھا، ہم کیا کہتے تم کیا سنتے

ہم کو نہ شکایت کی عادت، تم کو نہ گلے سے دلچسپی
برتاؤ رہا کس کا کیسا، ہم کیا کہتے تم کیا سنتے

کہنے کے لیے، سننے کے لیے، کچھ کم نہ مسائل آج کے تھے
گزرے ہوئے لمحوں کا دُکھڑا ہم کیا کہتے تم کیا سنتے

ہر شخص کی خواہش تھی کہ فقط ذہنوں کے دکھوں کی باتیں ہوں
ایسے میں دلوں کا درد بھلا ہم کیا کہتے تم کیا سنتے

ہم کہہ کے بھی پچھتاتے اخترؔ، تم سن کے بھی ہوتے شرمندہ
نظروں نے کہاں کب کیا دیکھا ہم کیا کہتے تم کیا سنتے

شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف گورکھپور، گورکھپور (یوپی)

امیر قزلباش

لہو میں ڈوب گئیں اب تو انگلیاں لکھوں
نہ لکھ سکا جسے کوئی وہ داستاں لکھوں

ہر اک خیال کو پہناؤں روشنی کی قبا
ہر ایک لفظ ستاروں کے درمیاں لکھوں

جدھر بھی جاؤں وہ سایہ فگن رہے مجھ پر
قدم قدم پہ مگر خود کو بے اماں لکھوں

وہی ہے کل کی طرح آس پاس کا منظر
پھر آج حدِ نظر تک اداسیاں لکھوں

ہر اک جہت سے سنوں اک صدائے گم گشتہ
ہر اک زباں کا مقدر خموشیاں لکھوں

وہی علم مرے ہاتھوں میں ہو قریبِ فرات
قلم ہوں ہاتھ مگر حالِ تشنگاں لکھوں

پھر استوار کروں رشتۂ جنوں تجھ سے
میں جان اپنی گنواؤں ترا زیاں لکھوں

امیر قزلباش

۴۹۴، صادق نگر، ٹائپ II، پارٹ ۲، نئی دہلی

نظمیں

ایک برس کی سپنا بیٹی

خود بلا حرکت زمیں پر ایستادہ ہیں، مگر یہ
سیڑھیاں کیسے چڑھی جاتی ہیں اوپر، اور اوپر
آسماں تک ؟

موم بتی کی یہ لو کتنی ملائم لگ رہی ہے
پھر بھلا کیوں اس کو چھونے سے مری انگلی میں چھالا
پڑ گیا ہے ؟

شام کو کیوں گھر سے باہر جھاڑیوں میں اُڑتی اُڑتی
جلتی بجھتی روشنی کے کچھ شرارے "آ مجھے چھو"
کھیلتے ہیں ؟

جب ہوا چلتی ہے تو پیڑوں کی شاخیں سر جھٹک کر
کیا کہا کرتی ہیں خود سے، یا ہوا سے، یا پڑوسی
ڈالیوں سے ؟

تتلیاں جب اُڑتے اُڑتے بیٹھ جاتی ہیں سنہرے پھول پر تو
پھول ان کو کیا بتاتا ہے جو ہنس پڑتی ہیں ساری
کھلکھلا کر ؟

سینکڑوں ایسی تعجب خیز باتیں اس کے دل میں
روز اٹھتی ہیں، مگر وہ کیسے پوچھے، اک برس کی
ہے ابھی تو سپنا بیٹی، اور سیکھا ہی نہیں ہے بولنا اس
کی زباں نے ——

ستیہ پال آنند

1387, NORTH GATE SQUARE
RESTON. VA. 22090 U.S.A.

مظاہرہ

1

آزادی اور مساوات کے لیے
افلاس اور غربت کے خلاف
پھریروں اور نعروں کے درمیاں
سنسان گلیوں میں احتجاج/مظاہرے

ویران دروں اور
مقفل کھڑکیوں کے سامنے
حالیہ روغن ہوئی سفید دیواروں کے خلاف
کان پھاڑتی چیخ پکار

ان سب کے پیچھے
بے سبب شان و شوکت میں گھرے
عالیشان مکانوں میں
ڈرے، سہمے سے لوگ، جو
گونگے اور بہرے ہیں
اور جن کے پاس آنکھیں ہیں، کان ہیں
دیکھنے اور سننے کو
اور جن کے پاس روٹی ہے
ان کی ضرورتوں سے زیادہ .

۲

صرف ایک لاش ؛ فقط ایک

اس بڑے شہر میں

فقط ایک

جسے کسی نے نہیں کھویا

فقط ایک

جو کسی کی گفتگو کا مرکز نہیں

فقط ایک

جسے کوئی نہیں جانتا

فقط ایک

جس نے ایسا ہی چاہا

صرف ایک لاش

تو کیا ہوا

یہ تو ہر روز ہوتا ہے

کلاؤس فلمانگ

ارشد مسعود ہاشمی

23, CIRCUS ROW, CALCUTTA 17

ٹام جیفرسن کے پنجرے

الیاس احمد گدی

گدی محلہ، دھوسار روڈ، جھریا ۱۲۸ (بہار)

نوجوان لڑکا طوطے کو گالی سکھا رہا تھا۔

"بول مٹھو... سالا... !"

سالا... سالا... سالا...

طوطا خوش دلی سے دہرانے لگا ـــــ

بڈھے ٹام نے گردن موڑ کر لڑکے کو دیکھا۔

"کیا کرتے ہو ـــــ؟ میرے بچوں کو خراب کر رہے ہو ـــــ؟"

نوجوان ٹام کی بات نظر انداز کر کے اور اس کی طرف شوخی سے دیکھ کر پھر طوطے کو سکھانے لگا۔

"بول مٹھو حرامی... حرامی..."

طوطا جیسے لڑکے کو خوش کرنے پر آمادہ تھا۔ زور سے چیخا:

"حرامی ـــــ!"

بڈھے ٹام نے چھڑی اٹھائی ـــــ "تم بھاگو کے کہ نہیں، میں ابھی تمھارے باپ کے پاس جاتا ہوں۔"

اس کے چھڑی اٹھانے پر بڑے پنجرے میں بند بندروں کے پریوار کا مکھیا کھسیایا۔ بڈھے ٹام نے اس کو ڈانٹا:

"حرامی کی اولاد، تم کیوں دانت کس رہے ہو۔ میں تو اس لڑکے کو پیٹنے جا رہا ہوں جس نے میرے تمام بچوں کی عادتیں خراب کر دی ہیں۔"

لڑکا برآمدے میں طوطے کے پاس کھڑا تھا۔ بڈھے ٹام کو چھڑی لے کر آتا دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا اور بھاگتے ہوئے بولا:

"انکل! تمھارے بچے میرے دوست ہیں۔ وہ تم سے زیادہ میری بات مانتے ہیں۔"

ایک بندر اور ایک بندریا تھی اور اس کے دو بچے تھے۔ آٹھ خرگوش تھے۔ سفید براق ریشم جیسے۔ ان کی لال لال خوبصورت آنکھوں میں خوف ہمیشہ جھانکا کرتا۔ وہ ذرا سی آواز پر چونک پڑتے۔ ایک لمحہ کے لیے پلٹ کر دیکھتے پھر بھاگ جاتے۔ پنجرے ان کے بھی تھے مگر وہ زیادہ تر کھلے رہتے۔ لڑکے دوڑاتے تو بھاگنے کی بجائے جھٹ زمین پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ اس سے لڑکوں کو انھیں پکڑنے میں آسانی ہوتی۔ پھر وہ انھیں اپنی گود میں لیے پھرتے۔ ان کو چھوڑتے دوڑاتے، پھر پکڑتے، پھر چھوڑ دیتے۔ کبھی کبھی بیٹھ کر اپنی جانگھوں پر رکھ کر ان کی پشت سہلاتے تو وہ اپنی سرخ خوبصورت آنکھوں کو بند کر کے آنند کی کسی دوسری دنیا میں کھو جاتے۔

عورتوں کو زیادہ دلچسپی بندروں سے تھی۔ وہ جب ایک دوسرے کی جوئیں نکال نکال کر کھاتے تو عورتیں بہت ہنستیں۔ کبھی کبھی کوئی ذرا زیادہ جرأت مند عورت اپنا سر اُن کے حوالے کر دیتی تو وہ نہایت مستعدی سے اس کی جوئیں نکالنا شروع کر دیتے۔ وہ عورت دینے کو تو اپنا سر دے دیتی مگر بے انتہا خائف رہتی کیوں کہ ایک بار ایک عورت نے سر دینے کے بعد فوراً ڈر سے سر ہٹانا چاہا تھا تو بندر نے ایک تھپڑ جڑ دیا تھا۔ دوسری عورتیں بندر کے غصہ ہونے اور بندریا کے خوف کھانے سے کافی محظوظ ہوئیں۔ ان کا ایک خاندان میں مل کر رہنا بھی دلچسپ تھا۔ بندر کے دونوں بچوں کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں باپ کا بار بار کھونکھیانا اور ماں کی ممتا یہ سب پتہ بل ملا کر ایک دم گھریلو سا ہو جاتا۔

عورتیں ان بندروں کے لیے مونگ پھلیاں اور پھل بھی لاتیں۔ دن کا بچا کھچا کھانا اور باسی سوکھی ہوئی روٹیاں بھی بوڑھے ٹام کے ان بے زبان بچوں کے لیے بھیج دی جاتیں۔ فصلوں کے موقعے پر اناج باندھ دیا گیا تھا۔ مرد بھی کبھی بوڑھے ٹام کی پیسوں سے مدد کر دیا کرتے تھے۔

ٹام کا گھر قصبے کا چڑیا گھر تھا۔ قصبے کے بھولے بھالے معصوم لوگ عام طور پر شام کو بیوی بچوں کے ساتھ گھومنے بڈھے ٹام کے گھر آ جاتے۔ بڈھا ٹام ہر آدمی کا استقبال ٹوپی سر سے اٹھا کر کیا کرتا جس کو وہ پتا نہیں کب سے پہنتا آ رہا تھا۔ گھر تو چھوٹا تھا مگر سامنے کھلی ہوئی کافی زمین تھی جس کے گرد مہندی کی باڑھ کھڑی

کرکے احاطہ بنا دیا تھا۔ اس کھلی جگہ میں بیٹھنے کے لیے بنچ وغیرہ نہیں تھے۔ مگر فرش پر ہمیشہ نرم ملائم دوب کا قالین بچھا رہتا جس پر مرد اور عورتیں بلا تکلف بیٹھ جاتے۔ لڑکے دوڑیں لگاتے۔ گھاس پر لڑھکتے اور ادھر ادھر بھاگ رہے خرگوشوں کو پکڑتے۔

ٹام انھیں خوش خرم ہنستا ہوتا دیکھ کر یک دم آسودہ ہو جاتا جیسے اس سے آگے زندگی میں اور کچھ نہ ہو۔

ٹام کی زندگی میں تو واقعی اس سے آگے کچھ نہیں تھا۔ چوالیس سال پہلے جنگ کی ہولناکیوں سے جوجھتا بارود کے دھوئیں میں کھانستا دشمنوں کے لہو میں شرابور وہ یہاں پہنچا تھا۔ برما کے محاذ پر ٹریگر پر انگلیاں رکھے رکھے اور بندوق کا گھوڑا دباتے دباتے اس کی انگلیاں زخمی ہوئی تھیں۔ انھیں انگلیوں کے علاج کے لیے اسے ایسٹرن کمانڈ کے ہیڈ آفس رانچی کے مضافات میں ایک آرمی ہسپتال میں لایا گیا تھا۔

لوگ کہتے ہیں ہندستان کی ہوائیں بڑی ساحر ہیں آدمی کا مت مار دیتی ہیں۔ سبزے سے ڈھکی ہوئی وادی کا جادو نیلے حد پر سکون نرم رو زندگی کا جادو، بھولے بھالے معصوم بے ریا آدی واسیوں کی چاہتوں کا جادو، وہ کتنے جادوؤں سے اپنے آپ کو آزاد کرتا، سو وہ بے بس ہو گیا، موہ میں آ گیا۔

جنگ ختم ہوئی۔ اپنی دو انگلیاں گنوا کر وہ انگلینڈ چلا گیا۔ کتنا زمانہ بیت گیا، اس وقت کے بچے جوان ہو گئے کہ اچانک ایک دن وہ اپنا بوسیدہ جنگی تھیلا پیٹھ پر لٹکائے اسی وادی میں لوٹ آیا۔ جنگ اس نے جیت لی تھی مگر دل ہار گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑے ہو کر اس نے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی بے پناہ حسین وادی کو دیکھا۔

ہواؤں کی آغوش میں مچلتی سبزے کی خوشبو کو اپنے اندر اتر جانے دیا۔ اور تب اس نے جانا کہ دھوئیں اور بارود کی شامہ کو مجروح کر دینے والی مہک کے علاوہ بھی کوئی خوشبو ہے۔ جو صرف پھیپھڑوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ رگ و پے میں اتر جاتی ہے، سرشار کر دیتی ہے، اور بتاتی ہے کہ زندہ رہنے کے لیے پر شور، تیز رفتار اور آسائشوں سے پُر زندگی ضروری نہیں ہے۔ اگر مہاتما بدھ کو یہیں کہیں نروان ملا تھا تو اسے بھی یہیں پہلی بار زندہ رہنے کا مطلب سمجھ میں آیا۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ٹام جیفرسن کی مائی گریشن کے پیچھے دراصل ایک کالی لڑکی ہے۔ جن دنوں وہ آرمی ہسپتال میں زیر علاج تھا اس کی ملاقات ایک آدی باسی لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ اسپتال کی سوئیپر تھی۔ اور بہت چپکے سے مشرق نے مغرب کے دل کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ اور جب مغرب نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے مشرق کے بے پناہ حسن کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ اے بلیک روز، اے پلیس آف بلیک ٹونیل . . .

اگر ٹام جیفرسن سے اس سلسلے میں کوئی بات کرتا ہے تو وہ ہنستا ہے اور ایک الگ کہانی سناتا ہے۔

میں روبوٹوں کے بیچ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں انسان تھا انسانوں کے بیچ رہنا چاہتا تھا۔ زندہ اور گرم انسانوں کے بیچ۔ وہاں ہر انسانی آواز مشینوں میں کھو گئی ہے، آدمی کا ہنسنا آدمی کا رونا، آدمی کا بولنا، آدمی کا چیخنا سب مشینوں کے شور میں غائب ہو گیا ہے، سارے انسانی رشتے ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں، سرد بے حس مشینوں کی طرح جسم لمس کی لذت سے محروم ہو گئے ہیں۔ آدمی صرف اپنی پہچان نہیں کھو رہا ہے، اپنا وجود کھو رہا ہے اور ایک روبوٹ کی طرح جی رہا ہے۔

اس قصبے میں اس کی بات سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے لوگ اس کو جھکی سمجھتے ہیں ٹھیک بات ہے، اگر وہ جھکی نہیں ہے تو اپنا اتنا بڑا خوبصورت دیش چھوڑ کر اس جنگل میں کیوں آ بسا ہے، جانوروں کے بیچ اس کا یہ پاگل پن بستی والوں کے لیے بہت اہم ہے۔ اسی لیے وہ اس کو اپنے سے بہت اونچا کوئی مافوق الفطرت شخص مانتے ہیں۔ اسی لیے اس کی عزت بھی کرتے ہیں۔

مگر طوطا اس کی ایک نہیں سنتا۔ وہ ایک دم شوخ ہو گیا ہے۔ جب ٹام کو اس کی خوراک دینے میں دیر ہو جاتی ہے تب وہ گالی بکنا شروع کرتا ہے۔

بیٹا، بیٹا بیٹا . . . !

حرامی، حرامی . . . !

سالا . . . !

اس کو یہ گالیاں مالکم کجور کے بیٹے جو کجور نے سکھائی ہیں۔ جوکھیم بستی کا سب سے بدمعاش لڑکا ہے مگر سب سے تیز بھی ہے رانچی کے کسی مشن اسکول میں پڑھتا ہے۔ اس کے باپ نے اس کو ایک سائیکل خرید دی ہے اسی سائیکل پر وہ روزانہ اسکول جاتا ہے۔ اور روزانہ اسکول جاتے ہوئے اور اسکول سے واپس آتے ہوئے سائیکل کی گھنٹی زور زور سے بجاتا ہے۔ طوطا گھنٹی کی ہر آواز پر ایک گالی اچھالتا ہے۔ اور ٹام اپنی چھڑی لہرا کر طوطے کو دھمکاتا ہے۔ طوطا اس سے نہیں ڈرتا جیسے جوکھیم نہیں ڈرتا۔

جس دن اسکول میں چھٹی ہوتی ہے اس دن جوکھیم سارا دن ٹام کا بھیجا چاٹتا ہے۔

"آپ کو اکیلے ڈر نہیں لگتا ___؟"

"میں اکیلا کب رہتا ہوں یہ جو میرے ساتھ رہتے ہیں ـــ!" وہ جانوروں کی طرف اشارہ کرتا۔

"یہ آدمی ہیں ـــ؟" وہ تعجب سے پوچھتا۔

"یہ آدمیوں سے اچھے ہیں ـــ!"

"مگر آدمی کو آدمیوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔" لڑکا عقلمندی کا اظہار کرتا۔

"آدمی جب روبوٹ ہو جائیں تو یہ جانور ہی بھلے ـــ!"

جوکھیم دسویں کا طالب علم ہے، وہ روبوٹ کے معنی جانتا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ آدمی کب روبوٹ بن جاتا ہے۔ اس لیے وہ ٹام کو اگر پورا نہیں تو آدھا پاگل ضرور سمجھتا ہے۔ پھر وہ اپنی بات پلٹتا ہے۔

"تمھیں تمھارا گھر نہیں یاد آتا ـــ؟ تمھارے بچے۔۔۔؟"

ٹام کو کیا یاد آتا ہے کیا یاد نہیں آتا یہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ کسی کو بتاتا بھی نہیں۔ اس سے بارہا یہ سوال کیا گیا ہے بارہا لوگوں نے وہ وجہ جاننے کی بھی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنا ملک چھوڑا۔ لوگ یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ کیا وہ یہاں خوش ہے ـــ وہ سارے سوالوں کے جواب دے سکتا ہے مگر دیتا نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ اس سلسلے میں کچھ بولے گا تو لوگ اس کو اور پاگل سمجھیں گے۔ مگر جوکھیم کو وہ بہت خوش دلی سے بتاتا ہے۔

"میرا گھر یہیں ہے۔ میں پچھلے جنم میں یہیں پیدا ہوا تھا ـــ!"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ پچھلے جنم میں یہیں پیدا ہوئے تھے ـــ؟"

"مجھے معلوم ہے۔ یہاں ہمارا گھر تھا ایک چھوٹا سا، مٹی کا۔ اور اس میں تمھاری آنٹی رہتی تھی ـــ!"

"آنٹی ـــ؟" جوکھیم تعجب سے پوچھتا "آنٹی بھی کیا آپ ہی کی طرح گوری تھی ـــ؟"

وہ خوب ہنستا پھر بتاتا:

"نہیں کالی تھی، ایک دم کالی، جیسے تم لوگ ہو ـــ بلیک بیوٹی ۔۔۔"

"پھر ـــ؟" وہ آگے جاننے کے لیے بے چین ہو جاتا۔

"پھر آگے مجھے کچھ یاد نہیں آتا ـــ۔"

جوکھیم پوچھ پوچھ کر مایوس ہو جاتا تو طوطے کے پاس چلا جاتا۔

"بول مٹھو آنٹی کالی تھی ـــ"

طوطا پورا جملہ نہیں بول سکتا اس لیے بار بار دہراتا ہے۔

"کالی تھی ۔۔۔ کالی تھی ۔۔۔ کالی تھی ۔۔۔"

ٹام بہت پیار سے طوطے کو اور پھر اسی پیار سے جوکھیم کو دیکھتا ہے۔ کہیں اندر تاریک گوشوں سے روشنی کی پھوار سی گرنے لگتی ہے۔

رانچی شہر کے مضافات میں بسا ہوا یہ ایک آدی باسی قصبہ اتنا پُرسکون ہے کہ لگتا ہے اس دور کی تہذیب کے مکّار ہاتھوں نے اسے ابھی چھوا تک نہیں ہے۔ حالانکہ شہر سے فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ بہت سے مرد شہر میں کام کرتے ہیں۔ بہت سی عورتیں بھی اپنی روزی روٹی اسی شہر سے حاصل کرتی ہیں۔ کتنے ہی بچے شہر کے اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ آنا جانا لگا رہتا ہے۔ کبھی کبھی کیتھولک چرچ کے پادری بھی وعظ دینے آ جاتے ہیں۔ مگر جیسے ہر موج چڑھتی ہے اور اُتر جاتی ہے، نہ کچھ دے جاتی ہے نہ کچھ لے جاتی ہے، سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ تہواروں میں لوگ چاول سے کشید کی جانے والی شراب "راسی" پیتے ہیں۔ عورتیں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر تھیہ ناچ ناچتی ہیں۔ ڈھول اور مردنگ بجتے ہیں۔ عام طور پر یہ سب کچھ ٹام صاحب کے حاطے میں ہوتا ہے۔ اس دن ٹام صاحب اپنا کھوٹا سوٹ نکال کر پہنتا ہے جو دعوتی ور پریس نہ ہونے کی وجہ سے یک دم بدرنگ اور بدوضع ہو گیا ہے۔ اس دن وہ چاول سے کشید کی جانے والی شراب بھی پیتا ہے اور ناچ کے دوران اور لوگوں کے ساتھ ساتھ تالی بھی پیٹتا ہے۔ زندگی یہاں ایک ندی کی طرح پرشور نہیں بلکہ ایک جھیل کی طرح پُرسکون ہے، پرسکون، گہری اور ناقابل تبدیل۔

مگر یہ ٹام صاحب کا وہم تھا کہ یہاں کچھ بھی تبدیل نہیں ہوتا۔ بہت آہستہ آہستہ بہت زیریں سطح میں ایک تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ لوگوں کی بات چیت میں، فضاؤں میں، گاؤں کے بول میں، لباس میں اور خیالوں میں بھی۔ ٹام جیفرسن جو اپنے حاطے سے کبھی باہر نہیں نکلتا اس کو کیا معلوم کہ سارا آدی واسی علاقہ آہستہ آہستہ کروٹ لے رہا ہے، جاگ نہیں ہے مگر نیند ٹوٹنے کی وہ کیفیت جب رفتہ رفتہ حواس مجتمع ہونا شروع ہوتے ہیں اور دھیرے دھیرے ادراک پیدا ہونے لگتا ہے، تقریباً صاف دکھائی دے رہا ہے۔

اس بات کا احساس ٹام جیفرسن کو اس دن ہو جس دن قصبے سے شہر کام کرنے گئی تین لڑکیوں کا اغوا کر لیا گیا۔ جب اندھیرا ہونے کے بعد بھی لڑکیاں واپس نہیں آئیں تو گاؤں میں عام بے چینی پھیل گئی۔ لوگ جو اندھیرا گہرانے کے فوراً بعد اپنے گھروں میں بند ہو جانے کے عادی تھے باہر جگہ جگہ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں جمع ہو کر باتیں کرنے لگے۔ پھر نوجوانوں کی ایک ٹولی شہر پتا لگانے کے لیے بھیجی گئی۔ ساری رات بستی میں کوئی نہیں سویا۔

صبح کو معلوم ہوا کہ تین لڑکیوں میں ایک کا قتل ہوگیا ہے۔ دو لڑکیاں بے ہوش پائی گئیں۔ ڈاکٹری جانچ کے مطابق ان تینوں لڑکیوں کے ساتھ کئی آدمیوں نے ریپ کیا تھا۔ ریپ کرنے والے کون تھے اس کا بھی ایک حد تک پتا چل گیا۔ یہ شہر کے کچھ ایسے بااثر لوگ تھے جن پر ہاتھ ڈالنے میں پولیس آنا کانی کر رہی تھی۔ ایسی کوشش کی جا رہی تھی کہ معاملہ کو رفع دفع کر دیا جائے۔ تبھی کالج کے آدی باسی لڑکوں نے تھانے کا گھیراؤ کر لیا۔ اور مشتعل ہوکر پتھر برسانے لگے۔ جواب میں پولیس نے لاٹھی چارج کیا جس میں کئی لڑکوں کو چوٹیں آئیں۔

یہ ساری خبریں بستی والوں کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھیں۔ پہلے تو کسی کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا ہوا۔ پھر جیسے دھیرے دھیرے آگ سلگنے لگی۔ دھواں اٹھنے لگا گرمی بڑھنے لگی۔ لوگوں کے دل و دماغ دھڑکنے لگے۔ سائیکلیں اور موٹر سائیکلیں قصبے سے شہر اور شہر سے قصبے دوڑنے لگیں۔

دوسرے دن سارا رانچی شہر بند ہوگیا۔ بند کا اعلان جھارکھنڈ اسٹوڈینٹ فیڈریشن نے کیا تھا۔ طے ہوا کہ اسی دن قصبے سے ایک جلوس نکال کر رانچی ڈپٹی کمشنر کے اجلاس میں احتجاج کے لیے لے جایا جائے۔ صبح سے آس پاس کے دیہاتوں سے، بلکہ دور دراز کی بستیوں سے پیدل اور بیل گاڑیوں میں لوگ آنا شروع ہوئے۔ جنگل کے انتہائی اندرونی علاقوں سے بھی لوگ پہنچے تھے۔ شانوں پر کمان سجائے، پیچھے پشت پر ٹنگے بانس کے ترکش میں تیروں کا گچھا لیے، ڈھول بجاتے، نگاڑے پیٹتے۔

دوپہر سے پہلے پہلے ساری بستی اجنبی انجان لوگوں کی بھیڑ سے بھر گئی تھی۔ کہیں ذرا سی جگہ نہیں بچی تھی۔ ٹام جیفرسن کا احاطہ کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ پھر جیپوں اور کرائے کی ٹیکسیوں پر لیڈروں کی آمد شروع ہوئی۔ نعروں کی گرج سے جیسے سارا ارض و سما بھر گیا۔

جھارکھنڈ راج ——— زندہ باد، زندہ باد

خون کا بدلہ ——— خون سے لیں گے

ہتیاروں کو ——— پھانسی دو، پھانسی دو

پھر ساری بھیڑ قصبے سے نکلنے والے راستے پر یوں بہنے لگی جیسے پانی کسی جھیل کا کنارہ توڑ کر بہ نکلا ہو۔

جب جلوس دور چلا گیا اور سارا قصبہ تقریباً خالی ہوگیا تب ٹام جیفرسن نے بند دروازے سے جھانک کر، کر اس نے ایک دم ویران احاطے کو دیکھا۔ سنسان قصبے پر نظر ڈالی اور پہلی بار گالی دی۔

"حرامی ———!"

طوطا زور زور سے چیخنے لگا۔

"حرامی، حرامی، حرامی . . ."

بندر تیز آواز میں کھوکھیائے۔ ان کے بچوں نے بھی دانت نکوسے۔ ٹام کو سالہا سال کے بعد پہلی بار غصہ آیا۔ اس نے چھڑی اٹھائی اور بیچ بیچ بندروں پر برسانے لگا۔ بندر جو اس فن کے ماہر ہوتے ہیں، ہر وار بچا جاتے۔ جب وہ تھک کر پسینے پسینے ہوگیا تو اس نے چھڑی پھینک دی۔

"سالے حرام زادے . . ."

طوطا چلانے لگا:

"سالے، سالے، سالے . . ."

ٹام اس کی طرف لپکا ——— "آج میں تمھاری گردن مروڑ دوں گا ———" طوطا سہم کر پنجرے کے آخری سرے میں سمٹ گیا۔

وہ برآمدے سے نیچے اترا۔ احاطے میں بہت سی غیر ضروری چیزیں پڑی تھیں۔ پکوڑیاں کھا کر پھینکے گئے پتے، پاؤ روٹی کا رنگین ریپر، سگریٹ کا ایک آدھ خالی پیکٹ، اینٹیں اور چھوٹے پتھر جن کو لوگوں نے بیٹھنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ روندی ہوئی گھاس اور ایک خاموش پُر اسرار سناٹا۔ وہ لٹالٹا کھڑا رہا۔

برسوں بیت گئے اسی طرح کے ہنگاموں میں، قصبے کی آہستہ خرام زندگی اچانک اتنی تیز ہوگئی کہ رفتار کی رو میں آس پاس کی چیزیں دکھائی بھی نہ دیتیں۔ ایسی ہی قریب کی چیزوں میں ٹام جیفرسن کا احاطہ بھی تھا۔ اب اس احاطے میں محفلیں نہیں جمتی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کی ٹولیاں اب اتوار کے دن بھی اس کے جانوروں کے ساتھ چہلیں کرنے نہ آتیں۔ عورتوں نے بچے ہوئے کھانے اور مردوں نے وقتاً فوقتاً کی جانے والی مالی مدد بھی بند کر دی تھی۔ اب انھیں پارٹی کے لیے طرح طرح کے چندے دینے پڑتے تھے۔

جوکھیم کجور کو ایک دن اچانک خیال آیا کہ اس کو ٹام جیفرسن کے پاس چلنا چاہیے۔ اس کو شہر میں، ایک لاٹھی چارج میں چوٹ لگی تھی پاؤں کی ہڈی ٹوٹی تو نہیں تھی مگر اس چوٹ نے اس کو ہفتوں کے لیے بیکار کر دیا تھا۔ انھی بیکاری کے دنوں میں ایک دن وہ چھڑی ٹیکتا ہوا ٹام کے احاطے میں جا پہنچا۔

اس کو یہ دیکھ کر افسوس سا ہوا کہ احاطے کی رونق ہی ختم ہوگئی ہے، اس نے سب سے پہلے طوطے کا پنجرہ ہلایا۔

"بول مٹھو حرامی . . ."

طوطا کچھ بولنے کی بجائے ایک طرف کو سمٹ گیا اور خائف نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا اس کو بڑی حیرت ہوئی پھر اس نے بندروں اور

گوشوں کے پنجروں پر نظر کی تو چونک گیا۔ بندر دونوں بچے غائب تھے اور خرگوشوں میں صرف خرگوش تھے اور وہ بھی پنجرے میں بند' جبکہ بشہ کھلے رہتے تھے۔

"بندر کیا ہوئے انکل ——؟" اس نے م سے پوچھا جو اس کو دیکھ کر اندر سے باہر نکل آ تھا۔

"بیچ دیے —— !"

"بیچ دیے —— ؟ کیوں —— ؟"

"کیا کرتا' کہاں سے کھلاتا انھیں؟ لوگوں یہاں آنا بند کر دیا۔ کوئی پیسوں کی مدد بھی یں کرتا۔ لوگوں کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہ گئی۔ اب وہ لیڈری کرتے ہیں۔ نعرے لگاتے ں۔ بندوں کا اہوان اور جگہ جگہ مظاہرے ر احتجاج۔ وہ چھوٹا ناگپور کی آزادی لیں گے۔ ارکھنڈ۔۔۔"

ٹام جیفرسن کے الفاظ میں نہیں لہجے ں کچھ تھا۔ حقارت' یا کوئی ایسی چیز جس نے یم کو برافروختہ کر دیا شاید وہ الجھ پڑتا۔ اب وہ بڑا ہو گیا تھا۔ کالج میں پڑھتا تھا۔ یخ کی کتابوں نے اس کی عمر ہزاروں سال ں کر دی ہے۔ چنانچہ وہ خوش دلی سے بولا:

"آزادی —— ؟ یہ لفظ تو ہم نے چھوٹا ور کے جنگلی درختوں کے ایک ایک پتے پر لکھ ا ہے۔"

ٹام جیفرسن کی نیلی آنکھیں ایک دم چھوٹی یں۔ ہونٹ کھنچ گئے۔ اس نے ایسے پوچھا جیسے لینڈ ہندستان سے پوچھ رہا ہو:

"تم آزادی کا مطلب جانتے ہو —؟"۔

جوکھیم نے مسکرا کر جواب دیا — "ہم آزادی مطلب جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں مگر غلامی کا مطلب ضرور جانتے ہیں۔ ان کی طرح ——!" اس نے پنجروں کے جانوروں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ غلام ہیں —؟ میں برسوں سے مختلف خطرات سے بچاتے ہوئے ان کی پرورش کر رہا ہوں۔ یہ تو میرے بچے ہیں ——!" جوکھیم ہنس دیا "اس طرح کے جملے تاریخ میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔ میری پرجا۔۔۔ میری رعایا۔۔۔ میری اولاد۔۔۔ مگر ان سب کے پیچھے ہمیشہ ایک جذبۂ حکمرانی پوشیدہ رہا یا پھر خوف۔ سب کچھ تیاگ کر جنگل میں آبسنے والا سنت بھی اس جذبے کو نکار نہ سکا —!"

"تمھارا مطلب ہے۔۔۔؟"

"ہاں وہی مطلب ہے میرا۔۔۔"

تھوڑی دیر کے لیے ایک دل آزار خاموشی چھا گئی۔ جوکھیم اٹھا' جانے کی اجازت چاہی پھر جاتے جاتے پلٹ کر بولا:

"جب طوطے بولنا چھوڑ دیں' بندر کھو کھیانا بند کر دیں اور خرگوش بھاگنا تو سمجھنا چاہیے کہ۔۔۔"

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور چھڑی کے سہارے لنگڑاتا ہوا قدم قدم چل کر احاطے کے باہر ہو گیا۔

چار دنوں کے بعد یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ ٹام جیفرسن مر گیا ہے۔ جب جوکھیم وہاں لنگڑاتا ہوا پہنچا تو اس سے پہلے بہت سے لوگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ ٹام جیفرسن کی لاش کو فرش سے اٹھا کر اس کی ٹیم کھاٹ پر لٹا دیا گیا تھا اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ جوکھیم کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ٹام جیفرسن کے پنجروں کے سارے پٹ کھلے تھے اور سارے جانور غائب۔۔۔

اب یہ کہنا مشکل ہے کہ ٹام جیفرسن نے ان پنجروں کے پٹ کھول دیے تھے' یا خود جانور نکل بھاگے۔

غزلیں

عشرت دھولپوری

تصور ہم سفر کا ذہن پر طاری رہا برسوں
سرِ منزل پہنچ کر بھی سفر جاری رہا برسوں

مری آنکھوں میں اس کا خواب پل بھر کے لیے جاگا
مگر بے خوابیوں کا سلسلہ جاری رہا برسوں

خود اپنی ذات کے کردار کو پہچانتا کیسے
وہ بے چارا تو مصروفِ اداکاری رہا برسوں

کوئی زیرِ پردہ سازش بھی تھی میرے قتل میں ورنہ
ستم گاروں کا شیوہ تو ستمگاری رہا برسوں

میں خود کو بھول جانے پر بھی اُس کو یاد رکھتا ہوں
مرے دیوانہ پن کا نام ہشیاری رہا برسوں

اسی کے ہاتھ میں ہے کاروبارِ گلستاں عشرت
جو تاجر پھول کا، خوشبو کا بیوپاری رہا برسوں

عشرت دھولپوری

۱۰۱، ۱۰ ملویہ نگر، جے پور (راجستھان)

شاھد ماھلی

مزاجِ گلشن و صحرا الگ ہے
ہمارا آپ کا رستا الگ ہے

جُدا ہے آسماں حرص و ہوس کا
اُمید و بیم کی دُنیا الگ ہے

نہ جانے تم نے کیا سمجھا ہے مجھ کو
زمانے نے مگر سمجھا الگ ہے

کسی کے پانو میں چھالے جُدا ہیں
کسی سر میں کوئی سودا الگ ہے

جُدا کچھ تلخیِ ماضی ہے شاہد
تقاضائے غمِ فردا الگ ہے

۲۰۱۷-سی، شیخ سرائے، فیز II، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۷

گھر میں کیسا سناٹا ہے کیسی یہ تنہائی ہے
ویرانی نے دل کے اوپر اور قیامت ڈھائی ہے

اُس کے بعد بھی اُس کی رفاقت ساتھ رہی میرے
اُس کے بدن کی خوشبو میری سانسوں میں در آئی ہے

مجھ پر کیا کیا بیت رہی ہے اس کو کچھ معلوم نہیں
اس نے تو اب اپنی نگری ایسی سمت بسائی ہے

کمرے میں تصویر سے اس کی اکثر باتیں کرتی ہوں
لیکن اس کی خاموشی نے اور قیامت ڈھائی ہے

جب مجھ سے رشتہ ہی نہیں کچھ ترکِ تعلق کر ڈالا
پھر اس نے کیوں خواب میں آ کر میری نیند اُڑائی ہے

یوں تیرے اب غم کرنے سے کیا وہ تجھ کو مل جائے گا
کچھ تو سوچ حیات اب تو نے کیسی شکل بنائی ہے

مسعودہ حیات

۲۶/۱۶۱، سیکٹر III، آر۔ کے۔ آشرم مارگ، گول مارکیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

کمار پاشی ——— ایک مطالعہ

بلراج کومل

ای - ۱۳۵، کالکاجی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

ہر اچھے شاعر کی تخلیقی ہستی کا ایک فعّال دائرہ اظہار ہوتا ہے جس کا ایک مخصوص منظرنامہ ہر بار قاری کو دعوتِ توجہ اور دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ کمار پاشی کے دائرۂ اظہار کا مخصوص اور منفرد منظرنامہ بھی انھیں خصوصیات کا حامل ہے۔ ان کا کلام پڑھتے ہوئے جو تصویریں ذہن میں ابھرتی ہیں۔ وہ زوالِ اقدار کے تواتر کی تصویریں ہیں۔ ان کے زندہ کردار وہ مرد، عورتیں، بچے اور وہ اساطیری موجودگیاں ہیں جو اپنے گوشت پوست کے ساتھ جہانِ رنگ و بو میں بھی سرگرمِ عمل ہیں اور ماورائی کیفیات سے بھی وابستہ ہیں۔ کمار پاشی اپنے پورے تخلیقی سفر میں موضوعاتی حد بندیوں سے کم و بیش آزاد نظر آتے ہیں۔ نظموں کے اور کتابوں کے ناموں کے اعتبار سے، اصنافِ سخن کی ترجیحات کے اعتبار سے اور نظموں کی تشکیلی صورتِ حال کے اعتبار سے بھی وہ شروع سے آخر تک آزاد ہیں۔

کمار پاشی کی شاعری میں ابھرنے والے دو کردار 'میں' اور 'تو' محض کردار نہیں ہیں۔ ان کی شاعری کا 'میں' ایک ایسے راوی کی طرح ہے جو روزمرہ زندگی کے واقعات سے لے کر ماورائے زمان و مکاں کیفیات میں شامل بھی ہے اور ان کا ایک معروضی ناظر اور راقم بھی۔ ان کی شاعری کا 'تم' یا 'تو' اکثر و بیشتر یا تو ایک 'نسائی' پراسرار موجودگی ہے جو حیاتِ دعوت کے طلسم اور ارضی اور ماورائی حسن کی علامت ہے یا پھر ایک ایسا سماجی کردار ہے جو اگرچہ پابندِ سلاسل ہے لیکن آزادی کے لیے مضطرب اور بے قرار ہے۔ کمار پاشی کا 'میں' یعنی راوی چونکہ راوی اور راقم ہے اس لیے ناگزیر طور پر ہر جگہ موجود ہے وہ اگرچہ قلبِ ماہیئت کے تجربے سے بار بار گزرتا ہے لیکن بہر حال 'راوی' کے حاوی انداز کے شعوری رویے سے آزاد نہیں ہے۔

کمار پاشی کی شاعری کی پُراسرار نسائی موجودگی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس کی ایک صورت شام ہے جو جب اپنی بھنچی ہوئی مٹھیاں کھول دیتی ہے تو پلک جھپکنے میں منظر بدل جاتا ہے:

اک عجب چاندنی سی چٹکنے لگی
اور فضاؤں میں جگنو سے لہرا گئے
اس کا سنولایا چہرہ دمکنے لگا
اس کی آنکھوں کے ساغر چھلکنے لگے
اس کے ماتھے کی بندی چمکنے لگی
(شام)

یہی نسائی موجودگی جو 'دیوداسی' کا روپ اختیار کر لیتی ہے تو نسائیت کی تکمیل کے لیے کمار پاشی کے 'میں' یعنی راوی اور شاملِ عمل کردار کے ان الفاظ کو اپنے کانوں میں اترتا ہوا محسوس کرتی ہے:

آؤ میرے چوڑے سینے پر سر رکھ کر سو جاؤ ذرا
تم کو ہنسنا سکھلا دوں
زلفیں بکھرانا سکھلا دوں
آؤ میں تم کو بوندوں کے اس ساز پہ گانا سکھلا دوں
(دیوداسی)

کمار پاشی 'لمحۂ موجود'، 'لمحۂ ماضی' اور 'لمحۂ مستقبل' ——— تینوں سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ لمحۂ ماضی ان کے ہاں اساطیری معنویت اور اساطیری وسعت کی روشنیاں لے کر لمحۂ موجود کے غیر یقینی لیکن مسلسل سرگرمِ عمل خاک دخموں کے منظرنامے کی زیرِ زمیں موجوں سے ابھرتا ہے اور پھر نہ صرف لمحۂ موجود کو روشن کر دیتا ہے بلکہ لمحۂ مستقبل پر بھی اس کی چوٹ پڑنے لگتی ہے۔ لمحۂ موجود کا منظرنامہ کمار پاشی کے ہاں جب زوال کے منظرنامے کی صورت میں ابھرتا ہے تو یہ زندگی کی سنگلاخ حقیقت کا وہ روپ ہوتا ہے جو بتدریج سنگین تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس منظرنامے میں بعض اوقات مقامیت کے جانے پہچانے نقوش بھی ہوتے ہیں اور بعض اوقات یہ منظرنامہ اساطیری یا گاتھک یا پھر ماورائی آبادیوں، بستیوں اور خرابوں کی آوازوں، خوشبوؤں، بدبوؤں، سناٹوں، اور پُر افسوں آوازوں کی باہم دگر کیفیات کا میدانِ کارزار

جاتا ہے:

یہ آگ اور خوں کے سمندر میں گھرتا ہوا شہر میرا نہیں ہے
ہوا سے الجھتا ہوا میں چلا جا رہا ہوں اندھیرا ہے گھرا گھنا بے اماں
رات کے دشت میں تیرے، میرے مکاں
دور ہوتے چلے جا رہے ہیں
لہو کے جالے بھی معدوم ہیں
اور تاریک گنبد میں معصوم روحوں کے کہرام میں
بے صدا آسماں کی طرف
خوں میں لتھڑے ہوئے ہاتھ اٹھتے ہیں تحلیل ہو جاتے ہیں
اور کہیں دور اپنی فصیلوں کے اندر بکھرتی ہوئی نامرادوں کی بستی کے اوپر
ہوا سے الجھتا ہوا میں اڑا جا رہا ہوں اندھیرا ہے گہرا گھنا بے اماں!

(یہ گھرتا ہوا شہر میرا نہیں ہے)

کمار پاشی اشیا یعنی مظاہر زندگی کی عارضی نوعیت کے بارے میں بھی اکثر اشارہ کرتے ہیں۔ 'نقشہ' 'خانہ بدوش' دو قابلِ ذکر مثالیں ہیں:

میری نٹ کھٹ بچی نے
اجلے کاغذ پر کھینچا
رنگ برنگا اک نقشہ
نقشہ — ساری دنیا کا
جنبہ جنبہ پر دکھلائے
اس نے ساگر اور پہاڑ
سارے ملک اور سارے شہر
ندی، نالے، جنگل، کھیت
بحر و بر
اور بولی، دیکھو پپا
یہ دلی ہے اب اس میں
کہاں دکھاؤں میں اپنی گڑیا کا گھر

اتنے میں اڑتا آیا
تیز ہوا کا اک جھونکا
نقشہ اس کے ہاتھوں سے
چھوٹ گیا
دور خلا میں ڈوب گیا

(نقشہ)

کمار پاشی کی نظموں میں خدشات کا ذکر بھی ملتا ہے — وہ جہانِ حسن جو کمار پاشی کے ذہن میں حسیات کی ماورائی کیفیات سے گزرتے ہوئے اکثر ابھرتا ہے۔ وہ خدشات کی زد میں بھی ہے اور غیر متوقع تصادموں کی یلغار میں بھی:

ہوا بس رواں ہے
اسے سدھ کہاں ہے
گرا کس سے کندھا
گرا کس کا آنچل
اسے کس نے غصے کی نظروں سے دیکھا
اسے کیا اگر راکھ ہو جائے دھرتی ہماری
اسے کیا جو سورج کا گولا پھٹے
چاند کا گھر جلے
ایک پل میں بھسم ہو کے رہ جائیں سارے مناظر
یہ پربت، یہ ساگر
اسے کیا
اسے کیا

(خانہ بدوش)

'واس یاترا' تک پہنچتے پہنچتے کمار پاشی کا راوی 'گیان اور چیتنا' علم و شعور کی اس منزل سے سرفراز ہو گیا ہے اور انسانی صورتِ حال کے لمحۂ موجود کے دُکھ اور کرب کو' اور اقدار کے زوال' رشتوں کی تذلیل کو وسیع اساطیری کائناتی تناظر میں اس انداز سے دیکھنے لگا ہے کہ اب یہ دُکھ اور کرب' اور زوال کا یہ سلسلہ خالصتاً ایک بنیادی وجودی اور بظاہر ماورائی لیکن حصولِ شعور کی کوشش کی نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ 'واس یاترا' فی الواقع اردو زبان کی اہم طویل نظموں میں سے ایک ہے۔

کمار پاشی نہ فلسفی ہیں' نہ اصول ساز' نہ محتسب۔ خالص حواس کے تجربات سے لے کر اصنافِ سخن کے انتخاب — غزل' نظم' رباعی' طوی[ل] نظم — اور سادہ طریقِ اظہار غیر آرائشی' فارسی اثرات سے آزاد الفاظ کی تلاش اور فنکارانہ اسلو[ب] پہنچتے ہوئے کمار پاشی نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ ارد[و] کے نام کی نظموں میں انھوں نے عورت کے سار[ے] روپ اگرچہ ایک عورت یعنی اپنی اردھانگنی' رفی[قۂ] حیات کے حوالے سے پیش کیے ہیں لیکن اسے ایک ایسا جذباتی ارتفاع عطا کیا ہے جو اساطیری نوعیتوں سے منور ہے۔ کمار پاشی کی انفرادیت' پہچان ان کے جہانِ تخلیق کی وہ فضا ہے ج[و] بیک وقت ارضی اور ماورائی خصائص لیے ہو[ئے] ہیں۔ اس میں چاسنالہ کا المیہ بھی' ماورایت کی آرزو بھی اور بندشوں کی یلغار کے باوجود ا[یک] ایسا انسانی جذبہ ہے جو ایک با اثر انداز سے منزلِ اظہار تک پہنچتا ہے۔ وہ اگرچہ ساحلو[ں] تک لوٹ کر نہیں آنا چاہتے اور ردِ عمل کا بھرپو[ر] تجربہ سمندر کے بیچ بیچ میں یا میدان کارزار میں رقم کرنا چاہتے ہیں لیکن بہر حال وہ اگر اپنی ذات نفی بھی کرتے ہیں۔ تو حیاتِ نو کے احترام میں:

دکھا ابھرتی ہوئی نو بہ نو زمینوں کو
اور اپنے آپ کو اک ڈوبتا جزیرہ لکھ

حیاتِ نو کے نام ان کا انتساب ان الفاظ میں ہے:

تمھارے نام لکھتا ہوں' ستارے تتلیاں جگنو
تمھارے راستے سیدھے نہیں
سائے ہوں ان پر جگمگاتے آسمانوں کے
کھلیں تم پر سہانے راز ان دیکھے جہانوں کے
کہ آنکھوں میں تمھارے خواب ہوں اونچی اڑانوں کے

(تمھارے نام لکھتا ہوں)

کمار پاشی کی اردھانگنی کے نام لکھی گئی نظموں کی اُردو زبان کی شاعری کی روایت کے مناظر میں ایک منفرد نوعیت ہے۔ اُردو زبان کا شاعر جس عورت کو مرکزِ سخن بناتا ہے، وہ شاذ و نادر ہی اس کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتی ہے وہ اُردو شاعری کی 'محبوبہ' یا پھر 'پری وش' تذکیر و تانیث سے ماورا ہونے کے باوجود انگریزی زبان کی وہ OTHER WOMAN یعنی دوسری عورت ہوتی ہے جس کا دوسری عورت ہونا ہی اس کو انتہا انگیز نوعیت عطا کرتا ہے۔ کمار پاشی کی اردھانگنی کے نام نظموں میں یہ عورت بیوی ہونے کے باوجود بیک وقت ماں، بیٹی اور پھر بیٹی کی بیٹی کے روپ میں ایک حیاتیاتی تسلسل کی علامت صرف ماں کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

جب تو
اپنی ماں کی ساڑی میں ہوتی ہے
بالکل
اپنی ماں جیسی لگتی ہے

جب جب
بیٹی بھی
میکے میں
تیری ساڑی میں ہوتی ہے
بالکل تجھ جیسی لگتی ہے

جگیاسا بھی
بڑی ہو کر جب
بیٹی کی ساڑی میں ہوگی
بالکل بیٹی جیسی ہوگی

یعنی تیرے اسی روپ کو
آگے آنے والے یُگ میں
جگیاسا زندہ رکھے گی
تجھے کبھی مرنے نہیں دے گی

پُرشکوہ فارسی زدہ اسلوب کی شاعری اُردو زبان کی مادی روایت کی شاعری ہے۔ اس شعری رویے میں ہمارے دور میں بھی کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا اکثر و بیشتر شعرا اپنے آپ کو اقبال اور جوش اور ہمارے دُور تک پہنچتے پہنچتے فیض اور راشد کے اثر سے آزاد نہیں کر سکے۔ جدید شاعری کے پورے حلقہ شعرا میں بہت کم ایسے شعرا منظرِ عام پر آئے ہیں جو ان شعرا کے اثر سے آزاد غیر آرائشی سادہ اسلوب کے کامیاب استعمال کے ثبوت فراہم کر سکے ہیں۔ (میں کمار پاشی کی شاعری کے اس وصف کے بارے میں ذکر اس مضمون کے کسی حصے میں پہلے بھی کر چکا ہوں)۔ کمار پاشی بلا شبہ ان خوش قسمت شعرا میں سے ایک ہیں۔ اس امتیازی وصف کے علاوہ کمار پاشی کی شاعری کی ایک اور امتیازی خصوصیت ایک ارفع فکری، جذباتی روحانی بہجت اور امکان کی بشارت ہے جو ان کی 'چاند چراغ' کی نظموں اور غزلوں میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۹۲ء کو ان کی اچانک اور بے وقت موت نے کمار پاشی کو ہم سے چھین لیا لیکن 'چاند چراغ' میں انھوں نے ایسا روشن اور منور جہانِ معانی ایجاد کیا ہے جو تہذیبی اور تخلیقی مناظر میں منفرد ہے۔ اس جہانِ معانی میں احساسِ زیاں شدید ہے لیکن بہر حال جزوی ہے۔ کمار پاشی کے روحانی اور جذباتی تجربے کا جوہر وہ خوش آئند کشادگی ہے جو بالآخر احساسِ زیاں پر حاوی ہونے کی استعداد سے سرفراز ہے۔ احساسِ زیاں کا اظہار کرتے ہوئے بھی وہ اس کشادگی کی زندہ موجودگی کا اقرار کرتے ہیں۔ وہ دریا، شجر اور سمندر جن کی طرف وہ 'کل یُگ' کے سلسلے کی نظموں میں اشارہ کرتے ہیں۔ اسی کشادگی کی زندہ موجودگی کے مظہر ہیں:

دل میں اک دریا ہوتا تھا
ہولے ہولے بہتا ہوا
اور اپنی موجوں کی زباں میں
میرے بہرے بھرے ماضی کی
کوئی کہانی کہتا ہوا!
لیکن اب اس دل میں
کوئی شجر نہ کوئی دریا ہے
چار طرف اک صحرا ہے
تیز ہوائیں دُور دُور تک
ہر دم گرد اڑاتی ہیں
اک اک کر کے
مجھ سے میرے
سارے سندر موسم چھینے جاتی ہیں
(کل یُگ)

کمار پاشی کو دریا، شجر اور سمندر چھن جانے کا گہرا دکھ ہے لیکن وہ اپنے آپ کو عناصر اور زندگی کے مظاہر سے اس بے ساختہ انداز میں منسلک کرتے ہیں کہ سارے موسم سارے تغیرات ایک سمفنی کے روپ میں ان کے وجود کا حصہ بن جاتے ہیں:

میں نے اپنے گھر کی ساری کھڑکیاں سب دروازے کھول دیے ہیں
سرخ، سنہری گوؤں سنگ اوشا بھی آئے
کچے دودھ سے مُنہ دھو کر چندا بھی آئے
تیز نوکیلی دھوپ بھی جھانکے
نرم، سہانی ہوا بھی آئے
تازہ کھلے ہوئے پھولوں کی
من موہن خوشبو بھی آئے
دیس دیس کی خاک چھانتا ہوا کوئی سادھو بھی آئے

اور کبھی بھولے سے
شاید
تو بھی آتے
یگوں یگوں سے
میں نے
اپنے دل کی ساری کھڑکیاں، سب دروازے کھول رکھے ہیں!

(سب دروازے)

'گنگا' کمار پاشی کے ہاں کائنات کے تسلسل کی علامت کے طور پر مخصوص تہذیبی اور ثقافتی انسلاکات کے ساتھ ابھری ہے۔ انسان اسیر سلاسل ہے واماندگی، علیحدگی، بے مائیگی کم مائیگی کی جان لیوا پابستگیوں کے درمیان زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ایک بار پھر جوئے رواں میں مدغم ہو جانے کی آرزو کرتا ہے۔ یہ مکمل زندگی کا مثبت ادراک ہے اور مکمل زندگی کی توثیق کا اقرار ہے:

گنگا!
میں صدیوں صدیوں کا تھکا ہوا ہوں
گنگا!
لے اب میں ترے کنارے آکر بیٹھ گیا ہوں
گنگا!
شاید کل تک میں پتھر بن جاؤں
شاید تجھ کو چھو نہ سکوں میں
گنگا!
لہروں والے اپنے ہاتھ بڑھا کر
گود میں مجھے اٹھا لے جانا
گنگا!
ساتھ بہا لے جانا

(گنگا کے نام)

یہ واماندگی تھی، یا موت کا پیشگی احساس، یا زندگی کے تسلسل کا ارفع ادراک — خدا جانے کون سا جذبہ تھا جس نے کمار پاشی سے یہ نظم کہلوائی: 'گنگا کے نام' — کمار پاشی کی وہ نظم ہے جسے لکھنے کے بعد وہ ناگزیر طور پر گنگا کی موجوں سے جا ملے اور تسلسل کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ گنگا نے بالآخر اپنا ہاتھ بڑھا کر انھیں گود میں اٹھا لیا اور اپنے ساتھ بہا کر لے گئی۔

▷▷

نظمیں

یوکلپٹس

دریا انڈیل دیں
یا یوریا کے کارخانوں کے مُنہ کھول دیں
فصل اُگنے والی نہیں ہے
جب تک کھیتوں کی منڈیروں پر یوکلپٹس کھڑے ہیں
یہ پیڑ کٹیں گے بھی نہیں
کہ انھیں ابھی اور توانا ہونا ہے
اور یوں بھی ان کے کٹنے کے اِمکانات کم ہیں
کہ پیڑوں کے کاٹنے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے
شاید آندھیاں کچھ کر سکیں
لیکن وہ تو گہری نیند سو رہی ہیں
اور ان کے سرہانے
لوریاں جاگ رہی ہیں

غضنفر

اُردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر، سیروَن، سولن (ہماچل پردیش)

کوئی گالی کبھی گالی نہیں دیتی

میں اِک اُونچی حویلی کی نہایت صاف ستھری، مہنگے رنگوں سے پُتی دیوار پر لکھی ہوئی موٹی سی گالی ہوں۔
محلّے کے سبھی پیر و جواں جو اِس طرف آتے ہیں، ہنستے ہیں، حقارت سے مجھے پڑھتے ہیں، میرے باپ کو اک گالی دیتے ہیں اور اپنی راہ لیتے ہیں۔
حویلی ان کی اس گالی پہ چُپ رہتی ہے لیکن مجھ سے کہتی ہے کہ میں دیوار سے اُتروں اور اپنی ماں کی بستی میں چلا جاؤں۔
حویلی والے مجھ کو اپنے دروازے کے باہر سے بھی باہر بھیجنے کی فکر میں ہر پل لگے رہتے ہیں اور مہنگائی سے مہنگے، ہر اک گہرائی سے گہرے، سجل رنگوں کے نیچے دفن کرنے کا کوئی حربہ، کوئی موقع، سُنہرے ہاتھوں سے جانے نہیں دیتے۔
بنا ہولی، دیوالی اپنی دیواروں پہ رنگوں کے ورق چڑھواتے رہتے ہیں، مجھے مٹواتے رہتے ہیں، پریشاں ہیں کہ میرے خال و خط کو کاروانِ وقت کے پیروں سے اُڑتی دھول بھی دھندلا نہیں سکتی، مجھے جھٹلا نہیں سکتی۔
بظاہر اس حویلی کے سُنہرے ہاتھوں کی ناکامیوں سے میں بہت خوش ہوں مگر اندر سے گاہے گاہے اک آواز آتی ہے مجھے اُکسا کے کہتی ہے کہ میں دیوار سے اُتروں زمیں پر پاؤں رکھوں اور سارے شہر کی آنکھوں پہ ہنستا روندتا، اُونچی حویلی میں چلا جاؤں۔
پھر اپنے باپ کی مانند، اپنے ذہن کی سب گالیاں کمروں میں رکھی خوب رو گڑیوں کی پیٹھوں سے لگے پیٹوں میں رکھ آؤں ..... مگر مشکل یہ ہے کہ گالیاں انسان دیتے ہیں ..... کوئی گالی کبھی گالی نہیں دیتی۔

ارشد عبدالحمید

لیکچرر اِن اُردو، گورنمنٹ میرا گرلز کالج، اُودے پور ۳۱۳۰۰۱

عرفان کی اُور...

عشرت ظہیر

نیا ٹولہ، گیا ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

بھکشو کی آنکھوں سے اگر چہ ستیہ اشٹانگک مارگ اور سداچار کے نیم کے پالن کرنے کی ساری علامتیں ہویدا تھیں لیکن انتم تلاش پراپتی ابھی باقی تھی۔ اس پیاس نے ہی تو اُسے کامنی اور کنچن، بھوگ اور کپٹ سے دور رکھا تھا۔

لیکن اس حادثے کی اُسے [illegible] خبر تھی۔

اُس کی آنکھیں کھلی تھیں اور دیکھا تھا بودھ گیا [illegible] سمندر کی طرح لیکن کہنا مشکل تھا کہ سمندر سے طوفان گزر چکا تھا [illegible]

[illegible] بھکشو [illegible] کی طرف [illegible] دھیرے سے کہا کچھ دیر خاموش رہا [illegible] کی [illegible] سامنے [illegible] دھیرے [illegible] کا [illegible]

"طوفان یہاں سے [illegible]؟"

"ہاں بابا آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہاں طوفان ہے اور آگ بھی۔"

"پہاڑوں اور سمندر [illegible] سمندر کے بھیتر سے طوفان اٹھتا ہے اور اسی میں سما جاتا ہے، تمہیں پتا ہے؟" بھکشو نے کہا "سمندر میں آگ کو ٹھنڈا کرنے کی بڑی شکتی ہے۔"

"نہیں، بابا ـــــ یہ آگ ٹھنڈی نہیں ہوگی اور نہ ہی یہ طوفان رُکے گا۔ یہ ہمارے اندر سمٹ نہیں سکتا، تھم نہیں سکتا نہیں۔ ہرگز نہیں۔ سمندر کا کھارا پانی کون پی سکتا ہے۔ یہ پیغام اجل ہے۔" نیکر پہنے ہوئے فرشتہ صورت نوجوان نے رُک رُک کر متانت سے کہا:

"لیکن جان لو، بڑھاپا، بیماری اور موت تمہیں جلد ہی آگھیریں گے۔ یہ تمہاری طرف بڑھ رہے ہیں۔" بھکشو نے کہا "جوانی [illegible] اور جسم دکھ دینے والے ہیں اور نشٹ ہونا ان کے [illegible]"

"تم بالکل ٹھیک کہتے ہیں بابا آپ [illegible] جیسے [illegible] کی [illegible] دہرا کر بیٹھے [illegible] معصوم [illegible] نوجوان نے کہا [illegible] سمندر [illegible] یہاں سے وہاں تک [illegible] ویرانی ہے [illegible] ویرانے میں ہم لڑتے رہیں گے اس وقت تک جب تک زندہ ہیں۔ ہمارے بعد ہماری جنگ دوسرے لڑیں گے اور یہ سلسلہ کئی دہائیوں تک چلے گا، اس وقت تک جب تک ہم لوگ جیت نہ جائیں... کیونکہ ہمیں... ہمارے سماج و الہام جو [illegible] کر..."

"الہام ـــــ!"

بھکشو نے دھیرے سے دہرایا اور سوچا، ساری تدبیریں تپسیا کرنے کے بعد اب وہ خود بھی تو نروان کی پراپتی ہی چاہتا ہے۔ نروان، جسم اور مرتیو کے چکر سے مکتی! مکتی اُسے کہاں ملے گی؟ اس سمندری طوفان اور آگ کے دریا کے پار وہ ہو سکے گا کیا؟

اچانک اس نے اپنے تھیلے میں [illegible] اور مہاتما بودھ کی ایک چھوٹی سی مورتی نکالی۔ چند ساعتوں تک اُسے دیکھتا رہا، پھر انھیں دکھا کر بولا:

"بھگوان بودھ ـــــ ان کے چہرے پر [illegible] ہے۔ یہ [illegible] اور [illegible] درودی ہے"

"ہم [illegible] کے لیے پریشان نہیں ہیں بابا۔ بھگوان بودھ کی اور یہاں ہم ساتویں صدی عیسوی [illegible] رہے ہیں۔ ان کے پیروکاروں کے ورودھی کے خلاف یہ جنگ لڑی جا رہی ہے۔" نیکر پہنے ہوئے ننگے پاؤں والے نوجوان نے کہا۔

"بھگوان کرے تم ستیہ مارگ پر چلو لیکن مجھے لگتا ہے یہ ایک بے معنی جنگ ہے" بھکشو نے کہا اور ان بھنوں معصوم صورت اور چیتے کی سی آنکھوں والے نوجوانوں کو دیکھا، اور اپنا تھیلا سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے جاتے اُن کی طرف مڑا اور پھر بولا۔۔

"سنو، منشیہ اچھے کرموں اور

سدا چار سے بڑا ہوتا ہے۔" پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

بودھ بھکشو کا ان فرشتہ صورت معصوم نوجوانوں کے پاس بیٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، جنھوں نے لنگی اور نیکر پہن رکھے تھے اور جن کی قلب ماہیئت از خود ہو چکی تھی اور جو ننگے پاؤں زندگی کی سنگلاخ اور کانٹوں بھری دھرتی پر بے خطر اتر پڑے تھے۔ لیکن اچانک اُسے یاد آیا کہ ایک دن بازار کی دکانیں بند کر دی گئی تھیں، اور کاروبار ٹھپ ہو گیا تھا، اور آمد و رفت تھم گئی تھی اور ... اور اس دن بھکشا کے لیے اس نے دُور دُور کا سفر کیا، اور چاروں اور کی سیاہی اور اندھیرا سمیٹ کر اپنی کٹیا میں لوٹ آیا۔ اُسے یاد آئی وہ مچھیرن اور اس کا سُتا ہوا چہرہ، جس کی ٹوکریاں مچھلیوں سے بھری پڑی تھیں، لیکن جنھیں فروخت کرنے کے سارے راستے مسدود تھے۔ نہ بازار، نہ شہر، نہ سواری، نہ کوئی اور سبیل ——!

گھر پر دودھ نہیں ہے اور بچّے بلک رہے ہیں، اور مچھلیوں سے بھری ٹوکریاں پڑی ہیں۔

دوا کے لیے پیسے نہیں ہیں، ور ٹوکریوں میں مچھلیاں سڑ رہی ہیں۔

مچھلیاں سڑ رہی ہیں۔

اور زندگی رُک سی گئی ہے۔

اس لیے بھکشو نے ان کے پاس بیٹھنے اور ان سے باتیں کرنے کا نشچے کیا تھا!

بھکشو نے سوچا ——

"میں نشچت سمئے پر سوتا ہوں، اور نشچت سمئے پر اُٹھتا ہوں۔ بھگوان بودھ کی وینا سنتا ہوں۔ بھکشا مانگ کر کھاتا ہوں اور شکشا کا پرچار کرتا ہوں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھیک ہو رہا ہے۔ بالکل ٹھیک۔ مگر مچھلیوں کو سڑنے سے بچانے کا کام کون کرے گا۔ کون؟ ان معصوم نوجوانوں کی، جن کی قلب ماہیئت از خود ہو چکی ہے، ایک بار پھر سے قلب ماہیئت کی ضرورت ہے۔ مجھے کوشش تو کرنی ہی چاہیے تھی!

بھکشو ناریل کے پیڑ کے سیسوں کے درمیان چند جار با تھا اور سوچ رہا تھا میں نے کوشش تو کی، لیکن معلوم نہیں قلب ماہیئت ہوئی بھی کہ نہیں ——

مجھے پری نام سے کیا؟ میں نے پریتن تو کیا تھا ——!

پری نام سے کیا؟

بازاروں اور شہروں کو پری نام سے کیا؟

مچھلیوں کو پری نام سے کیا؟

دودھ اور دوا ... اور سانسیں

پری نام ہیں ——!

اچانک اس کا دل دہل گیا۔ کیا اس کی تپسیا بھنگ ہوئی۔ آتم نکشن کی پرتیں ہیں یہ پری نام اور پریتن یا دھکے ہیں کیا؟

اچانک اُسے لگا۔ دُور بہت دُور سے عورتوں کے گیت گانے کی آوازیں آرہی ہیں:

وینا کے تاروں کو
بہت ڈھیلا نہ کرو
کیونکہ
تب وہ نہ بجیں گے
اور
انھیں اتنا نہ کھینچو
کہ وہ ٹوٹ ہی جائیں ——

اس نے سوچا، پریتن اور پری نام کے بیچ کی راہ مجھے اپنانی ہوگی۔ رتھ؟ میں ٹھیک راہ پر چل رہا ہوں۔ ان کے پاس مجھے جتنی دیر رکنا چاہیے تھا، رکا۔ وہی کیا جو گیان اور دھرم کے انوروپ تھا۔ انھیں چھوڑ کر آگے بڑھنا ہی بہتر تھا۔ آگے ... لیکن ان تینوں نوجوانوں میں ایسا کچھ تھا ضرور کہ وہ اُسے اپنی اور کھینچے جا رہے تھے ... اور وہ آگے بڑھ گیا ——

شام ہوتے ہوتے وہ ایک گاؤں کے قریب پہنچا، اور اس نے دیکھا۔

عورتیں اپنے بچوں کو سینے سے چپکائے سراسیمہ اور متوحش ایک ندی سے نکل نکل سامنے کھڑے ٹرک میں سوار ہو رہی ہیں، ان کے ساتھ ہی لنگی پہنے بدحواس مرد بھی ٹرک پر سوار ہو رہے ہیں۔

"تم کہاں جا رہے ہو۔ تم بھاگ رہے ہو۔ اپنی دھرتی کو چھوڑ کر؟"

"زندگی تنگ ہے یہاں اور جینے کے سادھن ناپید۔ ہم کیا کریں بابا، کیسا وقت پڑا ہے ہم پر ——!"

"سنسار میں دکھ ہی دکھ ہیں۔ دکھ کا کارن ترشنا ہے۔"

"ترشنا ——!"

"یہ کہاں کہاں اور کس کس روپ میں ہے۔ کون پہچان پائے گا اسے کون؟"

قتل و غارت گری ترشنا ہے، شرنارتھی کا کسی پڑوسی کے حدود میں داخل ہونا ترشنا ہے، شہر کی گھیرا بندی ترشنا ہے، یا ہوائی جہاز سے مدد پہنچانا؟ چندہ جمع کرنا ترشنا ہے یا امداد کا ایک بڑا حصہ حاصل کر لینا؟ ٹرین، بس اور پلین روکنا ترشنا ہے کیا؟

ہے بھگوان یہ کیا ہے؟
مدھم مارگ کہاں ہے؟
دیکھتے ہی دیکھتے ٹرک لوگوں سے بھر گیا اور روانہ ہوکر آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ پھر دھیرے دھیرے سناٹا اور ویرانی اور سیاہی بڑھنے اور پھیلنے لگی۔ بودھ بھکشو نے اسی غار میں پناہ لی جس سے نکل کر مرد اور عورتیں ٹرک میں سوار ہوکر گئے تھے۔ وہ دکھی مرد اور وہ دکھی عورتیں! کیا دکھ یہاں اسی غار میں خیمہ زن ہیں؟ کیا وہ دکھوں کو یہاں چھوڑ کر نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگئے؟

لیکن میں اس غار میں کیا کر رہا ہوں؟
مجھے اس غار سے کیا، یہاں کے دکھوں سے کیا؟ میں سنسار تیاگ چکا ہوں، میں ترشنا اور دکھوں کا ناش کر چکا ہوں ——!

اس رات ہلکی غذا لینے کے بعد بھکشو جب غار کے ایک کونے میں اپنے تھکے سے سونے کے لیے لیٹا تو اس کا من بوجھل تھا اور آنکھوں کی واماندگی کے باوجود نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کے سامنے وہ تینوں معصوم صورت اور کم عمر نوجوان کھڑے تھے جن سے اس نے آج گفتگو کی تھی۔ اس نے دیکھا، ان نوجوانوں اور خود اس کے بیچ ایک کھائی حائل ہے جس سے آگ کی اونچی اونچی لپٹیں اٹھ رہی ہیں۔ اس نے سوچا، آگ کی لپٹیں کیا ان کے لیے ہیں؟ یا ہمارے لیے؟ ہی اسے کوئی چنتا نہ تھی کیوں کر جیون بھر اس نے اپنے بارے میں سوچنا سیکھا ہی نہ تھا۔ لیکن یہ نوجوان جن کے سامنے ایک لمبی اور طویل زندگی ہے، اور دنیا ہے۔ کیا انھیں وہ ختم ہو جانے دے؟ ہرگز نہیں۔ اس نے سوچا، میرا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ اہنسا کا پرچار ابھی باقی ہے۔ ان نوجوانوں کی قلب ماہیئت ضروری ہے۔ میں کل پھر ان سے ملوں گا۔ اوشیہ ملوں گا۔ اس کام کے پورا ہونے کے بعد ہی میں اتم نکش کی پراپتی کا سفر کروں گا۔

دوسرے دن ٹھیک وقت سے اٹھنے کے بعد اس نے اپنا سارا کام معمول کے مطابق انجام دیا اور اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ آدھ گھنٹہ کی مسافت کے بعد جب ناریل کے درختوں کا سلسلہ شروع ہوا، اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی اداس اور ملول ایک پیڑ کے نیچے بیٹھا ہے۔ اس کی افسردگی اور بڑھاپے کو دیکھ کر اس نے سوچا، یہ وہی لاچاری اور بے بسی ہے، جس نے سدھارتھ کو کپل وستو تیاگنے پر مجبور کیا تھا۔ کپل وستو کتنا سندر تھا اور اُرُوِیلا کا جنگل کتنا ویران اور تنہا ——! اور یہاں؟ یہاں سمندر کی شانتی بھی ہے اور ان کا شور بھی۔ کپل وستو کی سی سندرتا بھی ہے اور جنگلوں کا ویرانہ بھی۔

مدھم مارگ، اتم مارگ ہے لیکن لوگوں نے شانتی اور اشانتی، سندرتا اور ویرانہ الگ الگ کرکے بانٹ لیا ہے۔ اس بوڑھے کے حصے میں کیا آیا؟ بڑھاپا اور بے بضاعتی ——!
بھکشو دھیرے دھیرے چلتا ہوا، بوڑھے آدمی کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔
بوڑھا چونک پڑا۔ اس نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں اور بولا:
"میرے پاس کچھ نہیں، بھد بابا - پچھلے دو دن ہوئے ناریل سے بھرا ایک ٹرک مار والا گیا تھا۔ خبر نہیں پہنچا بھی یا نہیں۔ کچھ نہیں۔"
"ہماری چینتا نہیں، صحیح ہوں تو سب ٹھیک رہے گا" بھکشو نے کہا۔

"ہم نے لابھ کی پراپتی کے لیے برا پریتن نہیں کیا،" بوڑھے نے ترشی سے کہا۔
"ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ پرنتو میں نے آپ کے لیے نہیں منشیہ جاتی کے لیے کہا تھا،" بھکشو نے کہا "آپ اتنے چنتت کیوں ہیں؟ سنسار میں دکھ ہی دکھ ہیں۔ اور یہ دکھ اور یہ چنتا ترشنا کے کارن ہے۔"
"ہماری آجیویکا کا سادھن یوتر اور صحیح ہے، اسے آپ ترشنا کہتے ہیں؟" بوڑھے نے تلخی سے کہا۔
"نہیں۔ میں نے ایسا نہیں کہا۔ ترشنا شبد کا پریوگ، میں نے آپ کے لیے نہیں بلکہ ان کے لیے کیا ہے، جن کے کارن آپ کا ناریل سے بھرا ٹرک لاپتہ ہوگیا۔" بھکشو نے رک کر پھر کہا "کسی کو خبر لانے بھیج کیوں نہیں دیتے کوئی نہیں ہے کیا؟ کوئی بیٹا، کوئی سنتان۔"
"اب تو کوئی نہیں [illegible] تھے" بوڑھے نے افسردگی کے ساتھ کہا۔
"کیا ہوا؟" بھکشو نے بے ساختہ پوچھا۔ اور پوچھنے کے بعد آپ ہی رکا، یہ سوال بے تکی اور لایعنی ہے کیوں، شاید اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔
"ہونا کیا تھا، نم نصیبی ... میرے بیٹے سماج سیوک تھے۔ کار سیوک تھا ... اچانک کیا ہوا کہ دن قیدی بنا لیے گئے ... اور پھر ایک دن قیدیوں کو جیل میں قتل کر دیا گیا۔ کیسی زندگی تھی یہ ——! اور اس کے بعد سے میرے پریوار میں اور شاید سارے ملک میں انتہائی بے چینی اور بے یقینی کی صورت حال پیدا ہوگئی۔ کوئی نہیں جانتا کہ کس سمت سے حملہ ہوگا ... یا ہر سمت میں خطرہ ہے ..

یہاں کے محافظوں کو بھی خطرہ ہے... اس دھرتی کی... اِنچ اِنچ زمین سے... بارودی سرنگوں کا خطرہ... ان خطروں کے بیچ آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں... جائیے بابا... یہاں ہر قدم موت کا ڈر رہتا ہے... جائیے بابا، جائیے۔"

بھکشو نے بوڑھے کی آواز میں اس ناتواں بڑھے کی آواز میں بلا کی سختی اور درد محسوس کیا اور بغیر کچھ کہے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اُسے تو پہلے اُن تینوں نوجوانوں سے ملنا تھا... جن کی آنکھوں اور چہروں میں ایک اجنبی فاصلہ تھا... اور ان کی تلاش باقی تھی...

چودہ نوجوانوں میں سب سے پہلے اس کی نظر ان تینوں پر پڑی اور اٹک گئی۔ اُف... یہ کیا ہوا ہے درد و الم کی ایک عجیب اور اذیت ناک لہر اُسے اپنے جسم میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سدھارتھ نے تو کسی ایک میت دیکھی ہوئی تھی یہاں تو چودہ نوجوانوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اور ان میں وہ تینوں بھی تھے۔ بھکشو نے دیکھا وہ سبھی خون میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کسی کا جگر، کسی کی لنگی، کسی کی قمیص... کسی کا چہرہ، کسی کے ہاتھ، کسی کے پاؤں، کسی کا سارا جسم... خون آلود تھا۔ بھکشو نے گھبرا کر اپنی نظر ان پر سے ہٹالی۔ آتے جاتے ہوئے لوگ ایک سیدھ میں ترتیب سے رکھے ہوئے بے جان جسموں کو دیکھتے ہیں۔ اور ان کی آنکھیں یکلخت ڈبڈبا اٹھیں۔ اچانک ہی وہ آنکھیں چیتے کی سی آنکھوں میں منقلب ہو جاتی ہیں۔ بھکشو نے داہنی طرف دیکھا۔ پھر معصوم چہرے والے جیکٹ اور پتلون پہنے ہوئے، جیکٹ پہنے ہوئے اور ننگے پاؤں والے، بالکل مردہ لوگوں کی شکل کے سے نوجوان کھڑے ہیں۔ ان کے چہرے پر معصومیت ہے اور آنکھوں میں... اسے یاد آیا لنگی کو دُہرا کر پہنے ہوئے نوجوان نے کہا تھا... ہمارے بعد ہماری جگہ دوسرے لیں گے، اور یہ جنگ کئی دہائیوں تک چلے گی۔ بھکشو نے ایک بار پھر اپنے داہنے کھڑے ہوئے نوجوانوں کو دیکھا، ان کی آنکھوں کو دیکھا، اور ان کے کندھوں میں لٹکی ہوئی رائفلوں اور ان کے ہاتھوں میں اسٹین گن کو دیکھا اور سوچا — یہ لڑائی کئی دہائیوں تک نہیں، شاید صدیوں تک چلے... کیونکہ ظلم کے مارے جاگ اُٹھتے ہیں اور ایک حشر بپا کرنے کے لیے آمادہ ہیں...

بھکشو نے دیکھا۔ تھوڑی ہی دور کھڑی کچھ عورتیں آہ و بکا کر رہی ہیں۔ ان کے دونوں ہاتھ آسمان کی اور اُٹھے ہیں اور ان کے چہرے درد و کرب سے کریہہ المنظر ہو گئے ہیں۔ بھکشو کو لگا، ان کے نالے آسمان کی پہنائیوں کو تھرتھرا رہے ہیں... اس نے ایک بار پھر ان چودہ لاشوں کی طرف نظر گھمائی، اور اس کی نظر ایک ایک کو غور سے دیکھنے لگی... اس نے سدھارتھ کی طرح محض ایک ارتھی نہیں دیکھی تھی، بلکہ بہتیری ارتھیوں اور مردہ افراد اور مرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا تھا لیکن ایسی لاشیں... ایسے مرے ہوئے لوگ، اس نے کبھی نہیں دیکھے... ان میں کسی کے چہرے پر تنفر تھا... کسی کی صورت پر سکون اور اطمینان... کسی چہرے پر درد و اضطراب کا سایہ تھا... کسی کی آنکھیں روشن اور جاگتی ہوئی سی، کسی کی آنکھیں محض شیشے کی گولی کی مانند ٹھہری سی اور بے جان... کوئی عزم اور حوصلہ کا نمونہ، کوئی حسرت و یاس کی تصویر... زندگی کے سارے درد کو سمیٹ کر منسا اور اہنسا کے یہ امین ہو چکے تھے!

اچانک بھکشو نے خود کو بے حد کمزور محسوس کیا۔ اُسے لگا اس کے اندر کوئی چیز تیزی سے ٹوٹ رہی ہے —— وہ وہاں سے چل پڑا۔ کسی پڑاؤ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں کئی گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک جگہ اس نے اپنے پڑاؤ کے لیے منتخب کی اور بے سہارا آدمی کی طرح زمین پر گر پڑا —— اس نے سوچا، شاید مجھے چنتن کرنے کی ضرورت ہے۔ شاید مجھے یہاں سے کہیں اور نکل جانا چاہیے۔ سمجھو کہ تم نکشر کی پراپتی سے قبل کا پہر دہ... مجھے نروان کی اور ہی لے جائے... کوئی راہ... کوئی کرن... آشا کی کوئی تجلی...!

بودھ بھکشو کب تک چنتن کی مدرا میں رہا۔ کتنے سے وہ سویا، وہ سو پایا بھی یا نہیں اس بارے میں کوئی رائے قائم کرنی مشکل ہے کیونکہ جب امن دستے جو کہ دو ڈویژن کے بیس ہزار جوان پر مشتمل امن قائم کرنے کے لیے بڑھے تو ان کے سامنے انچ انچ زمین بارودی سرنگ سے پٹی پڑی اور قدم قدم پر چیتوں کے مانند تھے، لہٰذا انھوں نے گن شپ ہیلی کاپٹر کا بھی استعمال کیا اور بالآخر ڈھائی ہزار چیتوں کو دبوچنے میں کامیاب ہو گئے —— کہنا تو یہ بھی مشکل کہ امن بحال ہوا یا نہیں، لیکن دیکھنے والوں نے یہ ضرور دیکھا کہ بھکشو کے قریب ہی اس کا تھیلا پڑا ہے جس سے مہاتما بدھ کی مورتی نکل کر ایک طرف پڑی گویا نرتیہ کر رہی ہے ——

غزلیں

جس دن سے وہ جدا ہوا ہے
میں نے جسم نہیں پہنا ہے
اب تو موت کا ڈر ہی شاید
میری حفاظت کر سکتا ہے
مجھ کو راہ دکھاتا ہے وہ
یا اپنا گھر ڈھونڈ رہا ہے
کوئی درار نہیں ہے شب میں
پھر یہ اُجالا سا کیسا ہے
یوں انجان بنا رہتا ہوں
جیسے سب کچھ جان لیا ہے

شارق کیفی
مکان نمبر ۱۳۲، مغربی، راؤ پیٹر سنگھ، بریلی (یو۔پی)

ایسا بھی ایک وقت بہت جلد آئے گا
انسان اپنے سائے سے دامن بچائے گا
میں صبح سے ہی بیٹھا ہوں اس انتظار میں
دروازہ میرا آج کوئی کھٹکھٹائے گا
پردیس جا رہے ہو تو اتنا رہے خیال
بے چین دل رہے گا اگر خط نہ آئے گا
وہ شخص جانتا ہے جو مندر کی عظمتیں
کچھ بھی ہو اپنے ہاتھوں سے مسجد نہ ڈھائے گا
دلکش غزل میں رنگِ تغزل نہیں رہا
کس طرح کوئی شعر ترے گنگنائے گا

دلکش غازی پوری
[illegible] ۲۲۳/۸۶، [illegible] (یو۔پی)

گلوں کی چاہ میں برسے ہیں اس قدر پتھر
جدھر بھی دیکھتا ہوں آتے ہیں نظر پتھر
چلے بھی آؤ اندھیرا قریب ہے مجھ سے
کہ انتظار میں ہونے لگی نظر پتھر
کریہہ شکل دکھانے لگا تھا وہ میری
میں مطمئن ہوا دریا میں پھینک کر پتھر
یہ سچ ہے میں نے مسخر کیے ہیں کون و مکاں
پڑا جو وقت تو باندھے ہیں پیٹ پر پتھر
مرا رفیق یہ ہر دور میں رہا نجمی
خیال یہ مجھے آتا ہے دیکھ کر پتھر

عرفان نجمی
۱۱۱/۱۰۰، [illegible] گنج، کانپور (یو۔پی)

دُکھ میں ہنسنا اگر نہ آئے گا
زندگی کا ہنر نہ آئے گا
پھینک دو اپنے ہاتھ کے پتھر
پھل ابھی شاخ پر نہ آئے گا
تم اندھیروں میں مطمئن رہنا
کوئی سورج اِدھر نہ آئے گا
تیر تھا، جو کمان سے نکلا
لوٹ کر اب وہ گھر نہ آئے گا
دو قدم تم بھی ساتھ چلو
یوں تو لطفِ سفر نہ آئے گا
ہاتھ کو اب عصا بنا لو کلیم
راستہ یوں نظر نہ آئے گا

مسعود کلیم
ادبی سرکل، مئو ناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱ (یو۔پی)

سستا انصاف

نصرت ظہیر
۵/۴ ... نئی دہلی ۱۱۰۰۰۹

پچھلے دنوں ججوں کی ایک کانفرنس میں یہ کہا گیا کہ عام آدمی کے لیے انصاف بہت مہنگا ہو گیا ہے لہٰذا موجودہ عدالتی نظام میں کچھ ایسی تبدیلیاں ہونی چاہئیں کہ انصاف حاصل کرنے کا طریقہ آسان اور سستا ہو جائے۔

سستا انصاف وہ شے ہے جو ... نادر و نایاب ... کسی بھی زمانے میں آسانی سے حاصل نہیں ہو ... بلکہ ... معاملوں میں تو مشکل سے بھی حاصل نہیں ہو ... تمام قوموں کی تاریخیں اس کی گواہ ہیں جنھیں ... نہیں ہوتا ہے ... کہ ... مرغ کے انڈے کے برابر ہوتی ... حاصل نہیں رہا ہو کہ بننا قاضی شہر سے انصاف ...

... بہت ... دنوں سے ... ہماری زندگی ... انصاف بہت مہنگا ہو گیا ہے تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ انصاف تو جناب ہمیشہ سے مہنگا رہا ہے ... تجویز بھی نئی نہیں ہے ... انصاف کو سستا کر دیا جائے تاکہ ہر ... کو انصاف مل سکے۔ ماضی میں بہت ... نے یہ کوشش کر چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے ... کامیاب کوئی نہ ہو سکا۔

کہتے ہیں مغل بادشاہ جہانگیر کو بھی ایک مرتبہ بیٹھے بٹھائے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ انصاف کو سستا اور عام کر دیا جائے۔ بس یہ خیال آتے ہی ایک زنجیر اس نے اپنے محل کے دروازے پر لٹکا دی اور ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جو کوئی بھی اس زنجیر کو ہلائے گا اس کے ساتھ انصاف کر دیا جائے گا۔ کئی مورخ اُف دی ریکارڈ بتاتے ہیں کہ اس ... عدل ... اور جاگیرداروں میں کھلبلی مچ گئی۔ انھوں نے محل میں اپنے خاص ... درباریوں سے جا کر فریاد کی کہ اگر ہمارے مزارعوں نے یہ زنجیر ہلا دی تو انھیں انصاف مل جائے گا اور ہم برباد ہو جائیں گے۔ لہٰذا ہمارے ساتھ فوراً انصاف کیا جائے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ بیش قیمت نذرانے اور قیمتی تحائف لے کر گئے تھے جنھیں دیکھ کر درباریوں کے دل پسیج گئے۔ چنانچہ انھوں نے انصاف کر دیا اور محل کے پہرے داروں سے معاملہ طے کر کے انھیں ہدایت دے دی کہ ... ہماری اجازت کے بغیر کسی کو زنجیر ہلانے کی اجازت نہ دی جائے۔ پہرے داروں نے اس خوبی سے ہدایت پر عمل کیا کہ مزید کئی برسوں تک کسی کو انصاف نہ ملا۔

ادھر زنجیر نہ ہلنے سے جہانگیر بہت پریشان ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اس نے کسی کا انصاف نہ کیا تو مورخین اس کے بارے میں کیا سوچیں گے ... بادشاہ نے جس میں انصاف کرنے کی ... نہیں۔ اس نے درباریوں سے زنجیر نہ ہلنے کا سبب دریافت کیا۔ درباریوں نے کہا حضور سلطنت میں تمام رعایا کے ساتھ انصاف ہو رہا ہے۔ اس لیے زنجیر کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بادشاہ مطمئن نہ ہوا۔ اس نے ٹھان لی کہ کسی نہ کسی سے انصاف ضرور کرنا ہے۔ لہٰذا اس نے صوبے داروں اور جاگیرداروں کو خفیہ ہدایات جاری کیں کہ رعایا کے ساتھ تجربے کے طور پر سخت ناانصافی شروع کر دی جائے۔ بادشاہ کو خیال تھا کہ اب کوئی نہ کوئی ضرور زنجیر ہلانے آئے گا ... زنجیر ہلانے آتے بھی ... پہرے دار بڑے پکے تھے۔ زنجیر نہ ہلنی تھی نہ ہلی۔

آخر جب جہانگیر نے دیکھا کہ اس کی زنجیر کو بلاوجہ زنگ لگ رہا ہے تو ایک رات اس نے اپنی بیوی نورجہاں کو ... کی فلم "پکار" کا بالکل نیا پرنٹ ... اور کہا کہ اے خدا کی بندی ــــــ تو ہی کچھ کر ...

نورجہاں جو کہ بڑی ذہین اور ... عورت تھی اور سابق شوہر شیر افگن ...

چکی تھی' کمال امروہوی کے ڈائلاگ سُن کر بے حد متاثر ہوئی اور بادشاہ کا اشارہ سمجھ گئی۔ چنانچہ اگلے روز اس نے فلم کے مطابق عمل کیا اور بالآخر جہانگیر کو ایک تاریخی انصاف کرنے کا موقع دلا دیا جس سے عدل جہانگیری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مشہور ہو گیا۔ کہتے ہیں' اس واقعہ کے بعد جہانگیر نے زنجیر اُتروا دی اور انصاف سے تائب ہو کر عمر بھر چین کی بنسی بجاتا رہا جو چین کے بادشاہ نے اسے بطور تحفہ بھیجی تھی۔

ایک اور بادشاہ نادر شاہ کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ بڑا ہی منصف مزاج بادشاہ تھا۔ اس نے انصاف کے ایسے ایسے سستے اور عام ڈھنگ اپنائے کہ مورخ آج تک حیران پریشان ہیں۔ کس کا ذکر کریں اور کس کا نہ کریں۔ ایران سے وہ چند روز کے لیے دہلی آیا تھا مگر اس قلیل مدت میں ہی اس نے دہلی والوں کے ساتھ عام پیمانے پر ایسا انصاف کیا کہ لوگ آج تک یاد کرتے اور سر دھنتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے لیے عوام الناس کو اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ کرنا نہیں پڑا۔ دہلی کے کئی پکے راگیوں کو آج بھی اس بادشاہ کی تعریف میں "نادر دھن نا نادر دھن نا" کی گردان کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے محمد رفیع صاحب نے بھی فلم 'کوہ نور' میں اس بادشاہ کی تعریف میں ایک گیت اس راگ پر گایا تھا۔

اس راگ کا قصہ بھی عجیب ہے۔ مورخ کہتے ہیں کہ نادر شاہ نے دہلی میں قتل عام کا حکم کسی بغاوت کی وجہ سے دیا تھا۔ لیکن دہلی کے ایک پرانے خاندانی رئیس نے بتایا کہ ان کے جدِ امجد اس دربار میں موجود تھے جس میں قتلِ عام کا حکم جاری کیا گیا تھا۔ ان کے بقول اصل وجہ اس حکم کی یہ تھی کہ دربار میں ایک گویا نادر شاہ کو خوش کرنے کے لیے راگ کے آخری حصے میں اس قدر جوش میں آ گیا کہ "نادر دھن نا" کی تان لگانے لگا۔ اپنا نام سنتے ہی بادشاہ کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے پوچھا یہ شخص ہمارا نام کیوں لیتا ہے۔ ایک درباری نے عرض کیا کہ حضور یہ شخص آپ کی تعریف میں ایک راگ گا رہا ہے۔ ادھر گویا گائے جا رہا تھا۔ ہر تان پر وہ عجیب انداز سے لہراتا تھا' کبھی اس کا منہ ٹیڑھا ہو جاتا کبھی وہ کان پر ہاتھ رکھ کر چلاتا اور کبھی دونوں ہاتھ رانوں پر مار کر نادر دھنا نادر دھنا دوم دوم کی گردان شروع کر دیتا۔ بادشاہ نے قریب ہی کھڑے ہوئے اپنے خادم خاص سے پوچھا " اگر یہ شخص ہماری تعریف کر رہا ہے تو اسے تکلیف کس بات کی ہے ؟" خادم نے کہا : "حضور ہندستان میں اچھے گانے والے اسی طرح گاتے ہیں۔" بادشاہ نے پوچھا " اچھا ذرا غور سے سُن کر یہ بتاؤ کہ یہ کہہ کیا رہا ہے۔ اس کا تو ایک بھی لفظ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔"

خادم نے کان لگا کر سُنا اور بولا "حضور یہ کہہ رہا ہے۔ نادر گرتا پڑتا پہنچا دہرہ دون!" یہ سنتے ہی بادشاہ کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا اور اس نے ایک گویے کی گستاخی کی پاداش میں تمام دہلی والوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا اور اپنی دانست میں ان کا انصاف کر دیا۔

افسوس ایران واپس جاتے وقت اس کے ایک ملازم کی رگ انصاف ایسی پھڑکی کہ اس نے اپنے بادشاہ کے ساتھ ہی انصاف کر دیا اور سارا کھیل ختم ہو گیا۔ مورخین یعنی کئی مورخوں کا کہنا ہے کہ یہ لاجواب بادشاہ اپنی پوری عمر زندہ رہتا تو انصاف اور بھی کئی نادر مثالیں قائم کر جاتا۔

خیر بات ہو رہی تھی دہلی میں ججوں کانفرنس کی۔ اس میں ججوں نے یہ تو کہہ د انصاف کو سستا کرنا ضروری ہے لیکن سو یہ ہے کہ انصاف کو سستا کیسے کیا جائے۔ ا بارے میں چونکہ ججوں نے کوئی واضح تجویز نہیں کی اس لیے یہ فریضہ ہم انجام دے ر ہیں۔ انصاف کو سستا کرنے کے لیے ایک نہ کئی تجویزیں ہمارے پاس ہیں۔ اگر ان سے ایک بھی امپلیمنٹ کر دی جائے تو دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انصاف صرف سستا ہو جائے گا بلکہ جلدی بھی لگے گا۔

تجویز نمبر ایک ـــــ یہ ہے کہ وکیل کو بیچ میں سے ہٹا دیا جائے۔ نہ رہے بانسری نہ بجے گا بانس۔ جیسے ہی مدعی اور ا کے درمیان حائل یہ دیوار ہٹے گی لوگوں دھڑا دھڑ انصاف ملنے لگے گا۔

اگر یہ ممکن نہ ہو تو تجویز نمبر دو یہ وکیلوں کی پرائیویٹ پریکٹس ختم کر دی جا اور تمام وکیلوں کو مع ان کے منشیوں قومیا لیا جائے اور ان کی ماہانہ تنخواہ مقرر جائے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ قومیانے کا رواج ملک میں پندرہ برس سے ختم ہو گیا ہے نتیجہ کا یہ ہے کہ پوری قوم بے لگام ہو گئی ہے اور قوم کو ہی قومیانے کی ضرورت پیش آ گئی ہے

لہٰذا تیسری تجویز یہ ہے کہ مقدمے نوعیت کے لحاظ سے وکیلوں کی فیس مقرر جائے۔ مثلاً قتل ۱۰۰ روپے فی پیشی۔ دو قتل ڈیڑھ سو روپے فی پیشی، تین قتل کر

۱۰۰ روپے کے اسپیشل ری بیٹ کے ساتھ ۲۰۰ روپے فی پیشی ۔ اسی طرح مکان سے بے دخلی، دوسرے کی زمین پر ناجائز قبضہ، قائم کرایے دارو کرایے داری، غبن، جعل سازی اور چوری وغیرہ کے ریٹ بھی مقرر کیے جاسکتے ہیں۔

اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو عدالتوں کی طبقاتی درجہ بندی کر دینی چاہیے۔ جس طرح ہوائی جہازوں اور ٹرینوں میں فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس ہوتی ہے اسی طرح دولت مند طبقے کے لیے فرسٹ کلاس درمیانہ طبقے کے لیے سیکنڈ کلاس اور او بی سی کے لیے تھرڈ کلاس عدالتیں بنائی جاسکتی ہیں۔ اگر اس پر کسی کو اعتراض ہو تو آمدنی کے لحاظ سے بھی درجہ بندی ہوسکتی ہے جیسے ڈی ڈی اے میں ہوتی ہے۔ اس کے مطابق ایل آئی جی عدالتیں، ایم آئی جی عدالتیں، جنتا عدالتیں اور ایس ایف ایس یعنی سیلف فائنس اسکیم کی عدالتیں تشکیل دی جاسکتی ہیں۔

اگر یہ درجہ بندی بھی قبول نہ ہو تو راشن کی دکانوں کی طرح سستی دروں کی عدالتیں کھولی جاسکتی ہیں۔ تاہم سستی دروں کی ان عدالتوں پر کافی سخت نگرانی رکھنی پڑے گی اور ہفتے میں ایک دو مرتبہ ان کا معائنہ کرکے انصاف کے نمونے بھرنے ہوں گے تاکہ گیہوں کی طرح اس میں بھی ملاوٹ نہ شروع ہو جائے اور عدالت کا منتظم بڑھیا انصاف بلیک میں نہ بیچنے لگے۔

بالفرض محال یہ تجویز بھی قابل عمل نہ ہو تو عدالتوں کو پرائیویٹ سیکٹر میں دے دیا جائے۔ وہ اپنے آپ مسئلہ حل کرلیں گے۔ لاٹھی اور بھینس کا قدیم ترین اور برسہا برس کا آزمودہ فارمولہ رائج ہوگا تو عام آدمی کے لیے انصاف کی ضرورت ہی ختم ہو جائے گی! نہ انصاف رہے گا نہ عام آدمی!

اور اگر خدانخواستہ یہ بھی نہ ہوسکے تو انصاف جائے بھاڑ میں! جیسا چل رہا ہے چلنے دیجیے۔ قاضی جی دبلے کیوں شہر کا اندیشہ؟

غزل پارے

زندگی رہتی ہے جینے کے مُنہ تک محدود
روح اور جسم کا رشتہ ہے سفر تک محدود
روز سورج یہی پیغام سُناتا ہے ہمیں
روشنی بس ہے ستاروں کی سحر تک محدود
چاہے جتنی تو زمیں گھیر لے دیواروں سے
تیری دنیا تو ہے گی ترے گھر تک محدود
میں کہ جیتا ہوں مگر رشتۂ جاں سے بھی پرے
دستِ قاتل کی پہنچ ہے مرے سر تک محدود
عشق عرفان کی منزل سے گزر جاتا ہے
دائرۂ حُسن کا رہتا ہے نظر تک محدود
بس اُسی حُسنِ ازل کا ہے پجاری احسن
جو نہیں ہوتا کبھی عقلِ بشر تک محدود

نواب احسن

۲۲۶، بخشی بازار، الٰہ آباد۔

گری ہیں اتنی عداوت کی بجلیاں اب کے
جُھلس گئی ہیں محبت کی بستیاں اب کے
تمھاری یاد کے جھونکے میں ایسی خوشبو تھی
مہک اُٹھیں مرے خوابوں کی وادیاں اب کے
بھٹک رہا ہوں میں محرومیوں کے صحرا میں
شکستہ پر ہیں مقدر کی تتلیاں اب کے
رفیقِ راہ مری کج روی سے ڈرتے ہیں
کٹیں گی کیسے مسافت کی سختیاں اب کے
چُنی ہیں رات کے خوابوں کی کرچیاں طارق
لہولہان ہوئیں اپنی اُنگلیاں اب کے

طارق متین

سمنیاں۔ ۸۵۱۲۱۱، بیگوسرائے، بہار

رابطہ ٹوٹا ہوا ہے میٹھی میٹھی نیند سے
جھیل سی آنکھوں نے کر لی بے وفائی نیند سے
گونگے رستوں سے سفر کی منزلیں مٹتی رہیں
پچھلی شب بھر بے قراری خوب جھگڑی نیند سے
ذہن پر دستک تمھاری یاد نے جس وقت دی
اٹھ لگے اپنی دل کی ہر اک چوٹ جاگی نیند سے
پاس کے مانوس منظر کر رہے تھے چھیڑ چھاڑ
اک اچھوتا لمس پا کر ریت چونکی نیند سے
تم بھی اپنی آنکھ گروی رکھ چکے راشد میاں
کس لیے شکوے شکایت اب نگوڑی نیند سے

راشد انور راشد

۲۶۴۔ کاویری ہوسٹل۔ جے این یو۔ نئی دہلی۔ ۶۷

سمجھائے ہمیں کوئی کہ ہم ہیں کہ نہیں ہیں
کہنے کو تو جیتے ہیں مگر زیرِ زمیں ہیں
خیرات میں دینے سے تو بہتر ہے کہ مت دو
طالب ہیں محبت کے بھکاری تو نہیں ہیں
تم شیشۂ دل میں تو کبھی جھانک کے دیکھو
ہر گوشے میں دھندلائے ہوئے عکس حسیں ہیں
ہم روزِ ازل سے ترے خوابوں میں بسے ہیں
ہم چھپ کے ترے دیدۂ حیراں میں مکیں ہیں
ہم گوہرِ نایاب ہیں خود اپنی نظر میں
دنیا کو سمجھنے دو کہ ہم خاک نشیں ہیں

قدسیہ انور

معرفت پروفیسر انور صدیقی، ۹۱۔ ذاکر باغ، نئی دلّی۔ ۱۱۰۰۲۵

ڈو جادوگر

شبیہ جیت رہے

خالدہ حسینی
معرفت قاسمی دواخانہ، ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ ۳)

"پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ" سرپتی نے ٹرنک گننا ختم کیا اور اپنے اسسٹنٹ کی طرف مڑا۔ "ٹھیک ہے۔" اس نے کہا "ان کو بیرک وین میں لدوا دو۔ صرف پچیس منٹ رہ گئے ہیں۔"

"میں نے آپ کا ریزرویشن چیک کرلیا ہے سر۔" انل نے کہا "کوپے ملا ہے۔ دونوں برتھ آپ کے نام ریزرو ہیں۔ یہ بہت اچھا رہے گا۔" پھر وہ ذرا مسکرایا اور کہا "گارڈ آپ کا مداح ہے۔ اس نے نیو امپائر میں آپ کا شو دیکھا ہے۔ ادھر سر! ادھر آیئے!"

گارڈ بیرن بخشی چہرے پر مسکراہٹ لیے اور اپنا ایک ہاتھ بڑھائے ہوئے آگے آگیا۔ "مجھے اجازت دیجئے کہ اس مشہور ہاتھ سے ہاتھ ملالوں جس نے اپنے جادو کے کھیل دکھا کر مجھے مسحور کر دیا تھا۔ میرے لیے تو یہ عزت کی بات ہے!"

سرپتی منڈل کون ہے، یہ جاننے کے لیے اس کے کسی ایک ٹرنک پر نظر ڈالنا کافی تھا۔ اس کے گیارہ ٹرنکوں پر دونوں طرف اور ڈھکن پر بڑے بڑے حرفوں میں منڈل میراکلس (MONDOL MIRACLES) لکھا ہوا تھا۔ اسے مزید تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا آخری شو صرف دو مہینے پہلے کلکتے کے نیو امپائر تھیٹر میں ہوا تھا، جہاں بہت بڑی تعداد میں حاضرین نے اس کے جادو کے تماشوں پر فریفتہ ہوکر بار بار تالیوں کی گونج سے اس کی قدردانی کی تھی۔ اخبارات نے بھی اس کی تعریف میں بڑے شاندار تبصرے شائع کیے تھے۔ اور ہفتے بھر کا شو عوام کے مطالبے پر چار ہفتے تک جاری رکھنا پڑا تھا ـــــ اس پر بھی سرپتی کی جان اس وقت چھوٹی تھی جب اس نے کرسمس کے موقع پر کلکتہ میں دوسرا شو کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

"اگر آپ کو کوئی ضرورت ہو تو بتا دیجیے۔" سرپتی کو کوپے کے اندر جاتے ہوئے گارڈ نے کہا۔ سرپتی نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔ اسے یہ چھوٹا سا کمپارٹمنٹ پسند تھا۔

"اچھا تو ٹھیک ہے سر! اب مجھے اجازت دیجیے۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

گارڈ رخصت ہوگیا۔ سرپتی کھڑکی کے پاس بیٹھا اور سگریٹ کا ڈبہ نکالا۔ یہ سفر اس کی کامیابی کا آغاز تھا۔ دلی، آگرہ، الٰہ آباد، بنارس، لکھنؤ، نہ جانے اور کتنے شہروں کا، کتنی ساری جگہوں کا دورہ کرنا تھا اسے۔ ایک پوری دنیا اس کی منتظر تھی۔ وہ غیر ملکوں کا بھی سفر کرے گا اور ان لوگوں کو دکھا دے گا کہ بنگال کا ایک نوجوان دنیا میں کسی جگہ بھی کس طرح کامیاب ہوسکتا ہے۔ حتیٰ امریکہ میں بھی جب ان ہاؤڈینی جیسا مشہور جادوگر پیدا ہوا تھا۔ ہاں وہ ان سب کو دکھائے گا۔ یہ تو ابھی آغاز ہے۔

انل ہانپتا ہوا آیا "ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے۔" اس نے کہا۔

"تم نے تالے چیک کرلیے؟"

"جی سر۔"

"بہت اچھا۔"

"میں آپ کے ڈبے سے تیسرے نمبر کی بوگی میں رہوں گا۔"

"لائن کلیر کا سگنل ہوگیا ہے؟"

"سگنل ہونے ہی والا ہے، اب میں چلتا ہوں سر۔ کیا آپ بردوان میں چائے پئیں گے؟"

"ہاں وہاں چائے ٹھیک رہے گی۔"

"میں لے آؤں گا۔"

انل چلا گیا۔ سرپتی نے اپنی سگریٹ سلگائی اور کھڑکی کے باہر کھوئے ہوئے انداز میں دیکھنے لگا۔

لوگوں کی ریل پیل، قلیوں کی بھاگ دوڑ، اور پھیری والوں کی آواز، سارے مناظر جلد ہی غائب ہوگئے۔ اس کے ذہن میں اپنے بچپن کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔ اب وہ ۳۳ سال کا ہوچکا ہے، لیکن اس وقت اس کی عمر آٹھ سال سے زیادہ نہیں رہی ہوگی، جب

اس کے چھوٹے سے گاؤں میں سڑک کے کنارے ٹاٹ کا ایک تھیلا اپنے سامنے رکھے ہوئے ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ کھڑی ہوئی تھی ——

اس بڑھیا کی کتنی عمر ہوگی؟ ساٹھ یا نوے؟ کچھ بھی رہی ہو۔ اس کی عمر سے کیا لینا تھا۔ اہمیت ان تماشوں کی تھی جو اپنے ہاتھوں سے کرکے وہ دکھا رہی تھی۔ وہ ہاتھ سے کوئی چیز اٹھاتی —— چاہے وہ کوئی سکہ ہو یا کوئی یا لٹو، یا ڈبی یا کوئی امرود ہی —— ہر چیز آناً فاناً لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جاتی۔ مگر بڑھیا لگاتار بولے جاتی، جب تک وہ چیز دوبارہ ظاہر نہ ہو جاتی۔ اس نے کالو کاکا سے ایک روپیہ لیا اور وہ غائب ہو گیا۔ کالو کاکا بہت پریشان ہوئے اور برا بھلا کہنے لگے۔ بڑھیا ہنستی رہی اور واہ رے کمال، روپیہ پھر سب کے سامنے حاضر تھا! کالو کاکا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

سرپتی اس دن کے بعد سے کسی کام میں بھی پوری توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ اس نے نہ تو اس بڑھیا کو دیکھا اور نہ کسی دوسری جگہ جادو کے ایسے حیرت انگیز کھیل دیکھے۔

وہ سولہ سال کا تھا کہ مزید تعلیم کے لیے کلکتے چلا آیا۔ یہاں آنے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ جادو اور میجک سے متعلق ڈھیر ساری کتابیں لیں اور ان میں جتنے گر بتائے گئے تھے، ان کے مطابق مشق کرنے لگا۔ وہ تاش کی کئی کئی گڈیاں لے کر گھنٹوں مشق کرتا، جلد ہی اس نے سب میں مہارت حاصل کر لی اور چھوٹی چھوٹی محفلوں اور دوستوں کی دی ہوئی پارٹیوں میں اپنے کھیل دکھانے لگا۔

جب شرپتی کالج میں سیکنڈ ایئر میں تھا تو اس کے ایک دوست گوتم نے اپنی بہن کی شادی میں اسے بلایا۔ وہ شام جادوگری کی ٹریننگ کے سلسلے میں شرپتی کے لیے بعد میں سب سے یادگار شام ثابت ہوئی کیونکہ اسی دن ترپورا بابو سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

سوئن ہو اسٹریٹ کے ایک مکان کے پیچھے بڑا شامیانہ لگا ہوا تھا۔ ترپورا چرن ملک اس کے نیچے بیٹھے تھے اور شادی کے مہمانوں کے ایک گروہ نے انھیں گھیر رکھا تھا۔ پہلی نظر میں وہ بالکل عام آدمی معلوم ہوتے تھے، تقریباً اڑتالیس سال کی عمر، گھنگھریالے بال، ترچھی مانگ نکلی ہوئی، ہونٹوں پر مسکراہٹ، ہونٹ کے دونوں گوشوں پر پان کی لالی پھیلی ہوئی۔ روزانہ نظر آنے والے ہزاروں آدمیوں میں اور ترپورا بابو میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن ان کے سامنے بچھی ہوئی چٹائی پر جو کچھ ہو رہا تھا بغور دیکھنے پر وہ ان کے بارے میں فوراً رائے بدلنے کے لیے کافی تھا۔ سرپتی کو پہلے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ایک چاندی کا سکہ اپنے آپ چکر کھاتے ہوئے تقریباً ایک گز دور سونے کی انگوٹھی کی طرف گیا اور انگوٹھی کے پاس جا کر رک گیا اور پھر دونوں لڑھکتے ہوئے ترپورا بابو کے پاس آ گئے۔ اس سے پہلے کہ شرپتی سکتے کے عالم سے نکلتا، گوتم کے چچا کے ہاتھ سے چھوٹ کر اچانک ایک ماچس کی ڈبیا زمین پر گر گئی اور اس کے اندر کی تمام تیلیاں بکھر گئیں۔

"پریشان مت ہوئیے۔ تیلیاں اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" ترپورا بابو نے کہا۔ "میں خود اٹھا دیتا ہوں۔" اپنے ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے سمیٹ کر تیلیوں کا ڈھیر انھوں نے سامنے کر لیا۔ اور بائیں ہاتھ میں ماچس کی خالی ڈبیا لے کر تیلیوں کو بلانے لگے "آجاؤ تیلیو، آجاؤ!" تیلیاں ایک ایک کرکے اوپر اٹھیں اور ماچس کی خالی ڈبیا میں اس طرح واپس چلی گئیں جیسے پالتو جانور اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کرتے ہوں۔

شرپتی کھانے کے بعد سیدھا ان کے پاس گیا۔ ترپورا بابو کو اس کی دلچسپی پر حیرت ہوئی "میں نے کسی کو میجک سیکھنے میں دلچسپی لیتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ زیادہ تر لوگ تماشہ دیکھ کر ہی خوش ہو جاتے ہیں اور بس!" انھوں نے کہا۔

شرپتی دو دن کے بعد اُن کے گھر گیا۔ گھر کیا تھا ایک خستہ حال بورڈنگ ہاؤس کا ایک کمرہ تھا جس میں ترپورا بابو رہتے تھے۔ اس کمرے کے کونے کونے سے غربت جھانک رہی تھی۔ وہ اپنے ہر شو کے پچاس روپے لیتے تھے، لیکن انھیں شو کی دعوتیں زیادہ نہیں ملتی تھیں۔ اس کی وجہ شرپتی کی سمجھ میں فوراً آ گئی۔ وجہ یہ تھی کہ ترپورا بابو میں کام کرنے کا جوش نہیں تھا۔ سرپتی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس قدر صلاحیت رکھنے کے باوجود بھی کوئی شخص اپنی ترقی کی طرف سے بے نیاز کس طرح ہو سکتا ہے۔ جب اس نے اس کا ذکر کیا تو ترپورا بابو نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا "زیادہ کوشش کا کیا فائدہ؟ کتنے لوگوں کو دلچسپی ہوگی ہے؟ کتنے لوگ سچے فن کار کی صلاحیت کی قدر کرتے ہیں؟ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ شادی میں کھانے کا اعلان ہوتے ہی کتنے لوگ دوڑ پڑے؟ تمھارے سوا کیا کوئی میرے پاس واپس آیا؟"

اس کے بعد سرپتی نے اپنے دوستوں سے بات کی اور چند شوز کا انتظام کیا۔ ترپورا بابو اپنا فن سکھانے کے لیے راضی ہو گئے۔ ممکن ہے اس میں احسان مندی کا جذبہ شامل ہو ویسے اُن کے دل میں شرپتی کے لیے جگہ پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے زور دے کر کہا "میں

اس کے لیے کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ مجھے تو اس قدر خوشی ہے کہ میرے فن کو کوئی جاری رکھے گا۔ لیکن یاد رکھو ——— تمھیں صبر سے کام لینا ہوگا۔ عجلت میں کچھ نہیں سیکھا جا سکتا۔ اگر تم اچھی طرح سیکھ لو تو خود دیکھو گے کہ تخلیق میں کتنی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ایسی امید نہ باندھو کہ ڈھیروں کامیابی یا شہرت تمھیں آناً فاناً ہی مل جائے گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم زندگی میں مجھ سے بہتر کارنامے انجام دو گے کیونکہ تمھارے پاس وہ چیز ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے یعنی ترقی کی خواہش......"

بے تابی سے سرپتی نے پوچھا "کیا آپ مجھے وہ سب کچھ سکھائیں گے جو آپ جانتے ہیں؟ سکّے اور انگوٹھی کا میجک بھی؟" ترپورا بابو نے ہنستے ہوئے کہا "تمھیں قدم بہ قدم سب کچھ سیکھنا ہوگا۔ صبر اور محنت اس طرح کے فن میں سب سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ یہ فن اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب لوگوں کی قوتِ ارادی اور یکسوئی آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ آج کے انسان کے لیے وہاں تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ تم نہیں جانتے کہ مجھے کتنی کوشش کرنی پڑی تھی!"

سرپتی پابندی سے ترپورا بابو کے پاس جانے لگا لیکن تقریباً چھ مہینے بعد کچھ ایسا واقعہ ہوا جس نے اس کی زندگی کو یکسر بدل دیا۔

ایک دن کالج جاتے ہوئے سرپتی نے چورنگی کی دیواروں پر بہت سے رنگین پوسٹر دیکھے جن میں بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا ——— "شیفالو دی گریٹ"۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ شیفالو ایک اطالوی جادوگر ہے اور وہ اپنی اسسٹنٹ مادام پلازمو کے ساتھ کلکتہ آرہا ہے۔

ان لوگوں کا شو نیو امپائر میں ہوا۔ سرپتی ایک روپیہ والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور انتہائی مسحور ہوکر ہر آئٹم کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان آئٹموں کے بارے میں صرف کتابوں میں پڑھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آدمی دھوئیں کے بادل میں غائب ہوئے اور پھر اسی دھوئیں سے الٰہ دین کے جن کی طرح دوبارہ نمودار ہوئے۔ ایک لڑکی کو لکڑی کے ایک صندوق میں لٹایا گیا شیفالو نے بیچوں بیچ کاٹ کر اس صندوق کے دو ٹکڑے کر دیے۔ لیکن لڑکی مسکراتی ہوئی دوسرے صندوق سے نکل آئی۔ اس کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا۔ اس رات سرپتی کی ہتھیلیوں میں بار بار تالی بجانے کی وجہ سے ٹیسیں اٹھتی رہیں۔

اس نے شیفالو کا بغور جائزہ لیا۔ شیفالو جتنا اچھا جادوگر تھا اتنا ہی اچھا اداکار بھی تھا۔ وہ چمک دار سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک جادوئی چھڑی تھی اور اس کے سر پر ایک اونچی ٹوپی تھی۔ اس ٹوپی میں سے لگاتار چیزیں نکل رہی تھیں۔ اس نے ایک بار اپنا ہاتھ اس کے اندر ڈالا اور کان پکڑ کر ایک خرگوش نکالا۔ ابھی اس نے اپنے کان ہلانے بند نہیں کیے تھے کہ یکے بعد دیگرے کبوتر نکلنے لگے۔ ایک، دو، تین، چار۔ سب اسٹیج پر اپنے پر پھڑپھڑانے لگے۔ اسی درمیان شیفالو نے اپنی ٹوپی سے ڈھیر سی چاکلیٹیں نکالیں اور ناظرین کی طرف پھینکنے لگا۔

سرپتی نے شیفالو میں ایک بات اور دیکھی وہ یہ کہ شیفالو اپنے کھیل دکھانے کے دوران ایک لمحہ بھی بولنا نہیں بند کرتا تھا۔ سامعین اس کی لچھے دار باتوں میں کھوئے رہتے تھے اور وہ اپنے کرتب دکھاتا جاتا تھا کبھی ہاتھ کی صفائی سے کام لیتا کبھی کسی اور چیز سے۔

لیکن مادام پلازمو اس سے مختلف تھی۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بولتی تھی تب وہ کسی کو کیسے دھوکہ دے سکتی تھی۔ سرپتی کی سمجھ میں یہ بات بعد میں آئی۔ بعض آئٹم ایسے ہیں جنھیں اسٹیج پر دکھانے کے لیے جادوگر کو اپنے ہاتھوں سے کام لینا نہیں پڑتا۔ بلکہ ایسے موقعوں پر اعلیٰ درجے کے میکانکی آلات استعمال کیے جاتے ہیں لیکن یہ آلات سب کے سامنے نہیں ہوتے بلکہ سیاہ پردے کے پیچھے چھپا کر لوگ ان سے کام لیتے ہیں۔ آدمی کو دھوئیں میں غائب کر دینا اور لڑکی کے دو ٹکڑے کر دینا دونوں اس طرح کے کرتب تھے جن کا انحصار مکمل طور پر ان آلات پر تھا۔ جس کے پاس کافی روپے ہوں وہ اس طرح کے سازوسامان خرید کر اسٹیج پر اپنے کرتب دکھا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی کھیل پیش کرنے کا فن سیکھنا ضروری ہے۔ کس موقع پر کون سی بات کہی جائے اور کس انداز میں اپنا آئٹم پیش کیا جائے کہ سامعین مبہوت رہ جائیں۔ یہ سب کے بس کی بات نہیں۔ ہر شخص یہ کام نہیں کر سکتا۔

سرپتی کے خیالات کا سلسلہ اچانک ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ ٹرین جھٹکے کے ساتھ اسٹیشن سے باہر نکل رہی تھی کہ ایک آدمی باہر

سے اس کے ڈبّے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ شرہتی اسے ٹوکنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر آدمی کے چہرے پر پڑی اور وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ خدا بھلا کرے ——— یہ ترپورا بابو تھے! ترپورا چرن ملک!

ماضی میں بھی شرہتی کو اس طرح کے تجربے ہوئے تھے۔ کسی ملاقاتی کے بارے میں سوچو اور وہ جاگتا جاگتا اچانک سامنے آجائے۔ اس طرح کا واقعہ شرہتی کے ساتھ پہلے بھی ہوا تھا۔ لیکن ترپورا بابو کا اس طرح کے ڈبے میں اچانک آجانا ایسا واقعہ تھا جس کے آگے پچھلے تمام واقعے ماند پڑ گئے تھے۔

شرہتی کے منہ سے کچھ نہیں نکلا۔ ترپورا بابو نے اپنی دھوتی کے کنارے سے اپنی پیشانی پونچھی، اپنی چھوٹی سی گٹھری سامنے والی برتھ پر رکھی اور بیٹھ گئے۔ پھر انھوں نے شرہتی کی طرف دیکھا اور مسکرائے: "تم حیران ہو؟"

شرہتی کے خشک گلے سے آواز نکلی،

"میں ——— ہاں میں حیران ہوں۔ واقعی مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ ابھی زندہ ہیں!"

"سچ؟"

ہاں ——— کالج کی پڑھائی ختم کرنے کے فوراً بعد میں آپ کے بورڈنگ ہاؤس گیا تھا۔ آپ کے کمرے میں تالا لگا ہوا تھا۔ منیجر نے بتایا کہ آپ کار سے چلے گئے ......"

ترپورا بابو ہنسے۔ "ایسا ہوتا تو بڑی اچھی بات ہوتی۔ کم سے کم میں اپنی تمام الجھنوں اور پریشانیوں سے تو بچ جاتا۔"

"شرہتی نے کہا" دوسری بات یہ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے میں آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"اچھا؟" ترپورہ بابو کے چہرے سے ایک سایہ سا گزرا۔ "تم واقعی میرے بارے میں سوچ رہے تھے؟ تمھارا مطلب ہے کہ تم اب بھی مجھے یاد کرتے ہو؟ بڑی حیرت کی بات ہے!"

شرہتی کو دھچکا سا لگا "ایسا نہ کہیے ترپورا بابو! آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں؟ آپ ہی تو میرے پہلے استاد ہیں۔ میں آپ کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ میں بنگال سے باہر اپنے کھیل دکھانے جا رہا ہوں۔ میں اب ایک پیشہ ور جادوگر ہوں ——— کیا آپ کو اس کا علم تھا؟"

ترپورا بابو نے اپنا سر ہلایا۔ "ہاں میں تمھارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تم سے ملنے آیا ہوں۔ گزشتہ بارہ سال سے میری نظر تمھارے کیریئر پر ہے۔ جب نیو امپائر میں تمھارا شو تھا، میں پہلے ہی دن وہاں شو دیکھنے گیا تھا اور آخری قطار میں بیٹھا تھا۔ یہ شخص کو تالیاں بجاتے دیکھ کر مجھے بڑا فخر محسوس ہوا لیکن ———"

وہ رک گئے۔ شرہتی کے پاس الفاظ نہیں تھے کہ وہ کچھ بھی کہہ سکے۔ ویسے کہنے کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے ترپورہ بابو کو دھچکا لگا ہو اور اپنے پیچھے رہ جانے کا احساس ہوا ہو۔ لیکن اس کے لیے انھیں کوئی قصوروار نہیں ٹھہرا سکتا۔ کچھ بھی ہو اگر انھوں نے شروع میں شرہتی کی مدد نہ کی ہوتی تو آج وہ اس مقام پر نہ پہنچتا جس پر وہ آج ہے لیکن اس کے بدلے میں اس نے ترپورا بابو کے لیے کیا کیا ہے؟ کچھ نہیں۔ الٹے ترپورا بابو اور ان کے ساتھ کے دنوں کی یاد اس کے ذہن میں دھندلا گئی ہے۔ اسی طرح اس کے دل میں احسان مندی کا جذبہ بھی ماند پڑ گیا ہے۔

ترپورا بابو نے پھر بولنا شروع کیا،

"ہاں اس دن مجھے تمھاری کامیابی پر بہت فخر ہوا۔ لیکن تھوڑا افسوس بھی! جانتے ہو کیوں؟ وہ اس لیے کہ تم نے جو راستہ چن لیا ہے وہ ایک سچّے جادوگر کے لیے صحیح راستہ نہیں ہے۔ تم اپنے ناظرین کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کر سکتے ہو اور اپنے آلات وغیرہ استعمال کر کے انھیں متاثر بھی کر سکتے ہو۔ لیکن یہ کامیابی تمھاری اپنی کامیابی نہیں ہوگی۔ کیا تمھیں میرا جادو یاد ہے؟"

شرہتی بھولا نہیں تھا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ جب اپنے بہترین گر سکھانے کی بات آئی تھی تو ترپورا بابو کیسے جھجکے تھے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے "تمھیں کچھ اور وقت لگے گا۔" لیکن بہترین گر سکھانے کا وقت نہیں آیا۔ شیفالو اس کے فوراً ہی بعد پہنچ گیا۔ اور اس کے دو مہینے بعد خود ترپورا بابو غائب ہوگئے۔

ترپورا بابو جہاں رہتے تھے انھیں وہاں نہ پاکر شرہتی بہت حیران اور مایوس ہوا تھا۔ لیکن اس کے یہ سارے احساسات جلد ہی ختم ہو گئے۔ اس کا ذہن شیفالو اور خود اپنے مستقبل کے خوابوں سے اس قدر بھر گیا تھا کہ کسی دوسرے خیال کی گنجائش ہی نہیں تھی وہ صرف یہی خواب دیکھا کرتا تھا کہ وہ ہر جگہ کا سفر کرے گا، ہر جگہ اپنا شو دکھائے گا ہر جگہ اس کی شہرت ہوگی اور جہاں کہیں جائے گا۔ اسے تالیاں اور تعریفیں سننے کو ملیں گی۔

تر پیورا بابو کھڑکی کے باہر دیکھ رہے تھے اور اپنے خیالات میں گم تھے۔ شربتی نے انھیں غور سے دیکھا۔ انھیں دیکھ کر لگ رہا تھا ــــــ انھوں نے بڑے سخت دن گزارے ہیں۔ ان کے بال بالکل سفید ہو گئے تھے۔ ان کی جلد پر جھرّیاں نمودار ہو گئی تھیں ان کی آنکھیں اپنے حلقوں کے بہت اندر گھس گئی تھیں۔ لیکن کیا ان میں چمکنے والی نظر بھی دھندلا گئی تھی؟ نہیں! وہ نظر تو اب بھی حیرت انگیز طور پر دل میں پیوست ہو جانے والی تھی۔ انھوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا۔ میں جانتا ہوں کہ تم کس بات پر یقین کرتے ہو۔ اس کے لیے ایک حد تک میں خود ذمہ دار ہوں۔ تم سوچتے ہو کہ سادگی کو صلہ نہیں ملتا اور اسٹیج پر کھیل دکھانے میں کچھ گلیمر اور کچھ تڑک بھڑک کی ضرورت پڑتی ہے۔ ضرورت پڑتی ہے نا؟"

شربتی نے اس سے اختلاف نہیں کیا، کیونکہ شیفالو کے شو نے اس بات کا یقین دلایا تھا کہ واقعی کھیل میں تھوڑا سا گلیمر شامل کر لینے میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ آخر شادیوں میں سیدھے سادے شو کر کے آدمی کتنا کما سکتا ہے اگر آدمی بھوکوں مرتا رہے تو کس طرح اپنے کامیاب ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ شربتی کے دل میں ایسے میجک کی قدر بہت تھی جس میں کسی طرح کی کاٹ چھانٹ یا تصنع نہ ہو، لیکن اس قسم کے میجک کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ شربتی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔ اسی لیے اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔

اس نے یہ باتیں تر پیورا بابو سے کہہ دیں

تر پیورا بابو اچانک برہم ہو گئے۔ وہ پیر پر پیر چڑھا کر بیٹھے تھے۔ طیش میں آگے جھک کر انھوں نے کہا "سنو شربتی! اگر تم جانتے کہ اصلی میجک کیا ہے، تو تم نقلی کے پیچھے نہ بھاگتے۔ میجک ہاتھ کی صفائی کا نام نہیں ہے، حالانکہ اس کے لیے بھی مشق کی ضرورت پڑتی ہے۔ میجک میں ہاتھ کی صفائی کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ہیں ان میں سے ایک ہے ہپناٹزم یعنی آنکھوں کی جادوئی قوت! ذرا اس کے بارے میں تو سوچو ــــــ تم اپنی صرف ایک نظر سے کسی کو پورے طور پر اپنے قابو میں کر سکتے ہو۔ پھر علم غیب ہے، اشراق ہے اور دوسروں کے خیالات پڑھ لینے کا فن ہے۔ یہ سب حقیقی میجک میں کام آتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو دوسرے کے خیالات میں داخل ہو سکتے ہو۔ کسی شخص کی صرف نبض دیکھ کر تم بتا سکتے ہو کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور اگر تم اس فن پر عبور حاصل کر لو تو تمھیں کسی کو چھونے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم صرف ایک منٹ غور سے اسے دیکھو گے اور بتا دو گے کہ اس کے ذہن میں کیا باتیں ہیں یہی سب سے بڑا میجک ہے۔ اس فن میں ساز و سامان اور آلات کی ضرورت نہیں ہے اس میں صرف لگن، محنت اور شدید یکسوئی کی ضرورت پڑتی ہے۔"

تر پیورا بابو سانس لینے کے لیے رُکے پھر شربتی کی طرف اور کھسک کر بولنے لگے، میں تمھیں یہ ساری چیزیں سکھانا چاہتا تھا لیکن تم نے صبر سے کام نہیں لیا۔ غیر ملک سے ایک جعل ساز نے آکر تمھیں بہکا دیا اور تم صحیح راستہ چھوڑ کر بھٹک گئے صرف اس لیے کہ تم تڑک بھڑک اور دکھاوے کی دنیا میں جھٹ پٹ روپے کمانا چاہتے تھے؟

شربتی خاموش رہا۔ وہ اس بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

تر پیورا بابو ذرا نرم ہوئے اور شربتی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھوں نے دھیمے لہجے میں کہا "میں آج تم سے صرف ایک درخواست کرنے آیا ہوں۔ تمھیں اب تک اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میری مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ میں میجک کے بہت سے کرتب جانتا ہوں لیکن روپیہ بنانے کا گر مجھے ابھی تک نہیں آیا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ میں کوئی امنگ نہیں ہے۔ آج کل میں بہت پریشان ہوں شربتی۔ اب مجھ میں اتنی طاقت بھی نہیں کہ اپنی روزی کما سکوں البتہ مجھے پورا یقین ہے کہ تم میری مدد کرو گے اور اگر میرے لیے قربانی دینی ہو گی تو تم دو گے بس یہ کام میرے لیے کر دو شربتی میں وعدہ کرتا ہوں کہ پھر تمھیں کبھی پریشان نہیں کروں گا"

شربتی گھبرا گیا۔ یہ کس طرح کی مدد چاہتے ہیں؟

تر پیورا بابو نے پھر بولنا شروع کیا "اب جو کچھ تم سے کہنے جا رہا ہوں وہ تمھیں عجیب سا لگے گا۔ لیکن کہے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ د... مجھے صرف روپے کی طلب نہیں ہے۔ بڑھاپے میں عجیب و غریب خواہش میرے دل میں ... ہوئی ہے۔ میں ایک بڑے اسٹیج پر بہت ... مجمع کے سامنے اپنا شو پیش کرنا چاہتا ... میں لوگوں کو بڑے بہترین فن دکھاؤں ... کام میں پہلی اور آخری مرتبہ کروں گا۔ میں ... خیال کو اپنے ذہن سے نکال نہیں پا رہا ہوں"

شربتی کو محسوس ہوا جیسے کسی نے سرد ہاتھ اس کے کلیجے پر رکھ دیا ہے۔ تر

ہوئے اس کے بعد اپنے مطلب کی بات کہی۔

"تم اپنا شو دکھانے لکھنو جارہے ہو، جارہے ہو نا؟ فرض کرو کہ تم عین وقت پر بیمار پڑ گئے ہو لیکن تم اپنے ناظرین کو ناامید تو نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں فرض کرلو تمہاری جگہ کسی دوسرے نے لے لی......؟"

سرپتی مبہوت رہ گیا ـــــــ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ واقعی اپنے حواس میں نہیں ہیں ورنہ ایسی بے ہودہ پیش کش کیسے کرتے؟

ترپورا بابو کی نظریں سُرپتی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ نظریں ہٹائے بغیر ہی انھوں نے کہا "تمھیں صرف یہ کرنا ہے کہ تم لوگوں کو بتادو کہ کسی سبب سے تم اپنا شو پیش نہیں کرسکتے لیکن تمھاری جگہ پر تمھارا گرو شو پیش کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ لوگ مایوس نہیں ہوں گے۔ مجھے تو یقین ہے کہ میرے شو سے لطف اندوز ہوں گے۔ لیکن اس صورت میں بھی میں چاہتا ہوں کہ پہلی شام کو جو آمدنی ہوگی اس میں سے آدھا تم لے لینا۔ باقی رقم ہی میرے لیے کافی ہوگی۔ اس کے بعد تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔ میں کبھی تمھیں پریشان نہیں کروں گا۔ لیکن مجھے یہ موقع ضرور دو سُرپتی ـــــــ صرف یہ موقع!"

"ناممکن!" سُرپتی نے بگڑ کر کہا: "آپ کی تجویز پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ میں بنگال سے باہر اپنا شو پیش کرنے جا رہا ہوں۔ کیا آپ نہیں سمجھ سکتے کہ لکھنو کا یہ شو میرے لیے کتنا اہم ہے؟ کیا آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ میں اپنا نیا کیریئر جھوٹ سے شروع کروں گا آپ کے ذہن میں ایسی بات آئی کیسے؟"

ترپورا بابو نے اسے بڑی سرد نگاہ سے دیکھا۔ اس کے بعد ان کی آواز ہر طرح کے شور سے بلند ہو کر پورے ڈبے میں گونج اٹھی۔ "کیا تمھیں سکے اور انگوٹھی والے جادو سے اب بھی دلچسپی ہے؟"

سُرپتی چونک اٹھا۔ لیکن ترپورا بابو کے دیکھنے کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

"کیوں؟" سُرپتی نے پوچھا۔

ترپورا بابو کے لبوں پر ایک افسردہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "اگر تم میری تجویز قبول کرلو تو میں تمھیں یہ جادو سکھا دوں گا اور اگر نہیں قبول کرتے تو......!"

ان کی آواز اس وقت ہوڑہ جانے والی ٹرین کی سیٹی میں گم ہو گئی۔ کیونکہ وہ ٹرین قریب ہی سے گزر رہی تھی۔ اس ٹرین کی روشنی میں ان کی آنکھوں کی عجیب وغریب چمک صاف نظر آئی۔

"اور اگر میں قبول نہ کروں تو؟" سُرپتی نے نرمی سے پوچھا ـــــ

"تم پچھتاؤ گے۔ تمھیں ایک بات جان لینی چاہیے۔ اگر میں ناظرین میں موجود رہوں تو میرے پاس ایسی طاقت ہے کہ بڑے سے بڑے جادوگر کو میں مصیبت میں ڈال سکتا ہوں۔ میں اسے بالکل بے بس کرسکتا ہوں۔"

ترپورا بابو نے اپنی جیب سے تاش کی ایک گڈی نکالی۔ "ذرا دیکھیں تم نے کتنی مہارت حاصل کی ہے ـــــ کیا تم ہاتھ کی ایک ہی جنبش میں اس غلام کو پشت کی طرف سے اٹھا کر اس طرح سامنے لا سکتے ہو کہ وہ آکر ڈنڈول کے اس درخت پر اٹک جائے؟"

سُرپتی نے سب سے پہلے یہی سیکھا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں اسے اس کھیل میں مہارت حاصل کرنے میں صرف سات دن لگے تھے۔

اور آج؟

سُرپتی نے تاش کی گڈی لے لی۔ گڈی ہاتھ میں لیتے ہی اسے محسوس ہوا کہ اس کی انگلیاں شل ہو رہی ہیں۔ پھر اس کی کلائی اور کہنی شل ہونے لگی، یہاں تک کہ اس کا پورا بازو شل ہو گیا۔ سرپتی نے پریشان ہو کر ترپورا بابو کو دیکھا۔ ان کے ہونٹ عجیب طرح سے مسکراتے ہوئے کچھ ٹیڑھے ہو گئے تھے اور ان کی آنکھیں سرپتی پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ آنکھیں بالکل غیر انسانی لگ رہی تھیں سرپتی کی پیشانی پر پسینے کی چھوٹی چھوٹی بوندیں نمودار ہو گئیں اس کا پورا جسم کانپنے لگا۔

"تمھیں میری طاقت پر اب یقین آیا؟"

سرپتی کے ہاتھ سے تاش کی گڈی گر گئی۔ ترپورا بابو نے اسے صفائی سے اٹھا لیا اور کہا:

"اب تم میری تجویز مانو گے؟"

سُرپتی اب کچھ ٹھیک ہونے لگا تھا جسم کا شل ہونا ختم ہو رہا تھا۔ "کیا واقعی آپ مجھے اپنا وہ پرانا گُر سکھائیں گے؟" اس نے تھکی تھکی سی آواز میں پوچھا۔

ترپورا بابو نے ایک انگلی اٹھائی۔ "تمھارا گرو، ترپورا چرن ملک، لکھنو میں تمھاری جگہ پر شو پیش کرے گا، کیونکہ تم اچانک بیمار پڑ گئے ہو۔ ٹھیک ہے؟"

"ہاں اس شام تم اپنی کمائی میں سے آدھا مجھے دو گے۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک۔"

"اچھا تو......"

شربتی نے اپنی جیب سے پچاس پیسے کا ایک سکہ نکالا اور اپنی انگلی سے مونگے والی انگوٹھی نکالی۔ اس نے خاموشی کے ساتھ یہ دونوں چیزیں ترپورا بابو کو دے دیں۔

جب بردوان میں ٹرین رکی تو انل چائے کی پیالی لیے ہوئے آگیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا باس خراٹے لے رہا ہے۔

"سر!" چند سیکنڈ کے پس وپیش کے بعد انل نے کہا۔ شربتی فوراً جاگ اٹھا۔

"کون ...... یہ کیا ہے؟"

"آپ کی چائے سر۔ سوری آپ کو میں نے ڈسٹرب کیا۔"

"لیکن ......؟" شربتی نے پریشانی میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

"کیا بات ہے؟"

"ترپورا بابو؟ وہ کہاں ہیں؟"

"ترپورا بابو؟" انل گھبرا گیا۔

"ارے، نہیں، نہیں۔ وہ تو ایکسیڈنٹ میں مرگئے تھے۔ مرگئے تھے نا؟ ۱۹۶۸ میں؟..."

"لیکن میری انگوٹھی کہاں ہے؟"

"کون سی سر؟ مونگے والی ایک انگوٹھی آپ کی انگلی میں ہے!"

"ہاں، ہاں۔ اور ......"

شربتی نے اپنا ہاتھ اپنی جیب میں ڈالا اور ایک سکہ نکالا۔

انل نے دیکھا کہ اس کے باس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"انل" شربتی نے آواز دی۔

"جلدی سے اندر آؤ۔ کھڑکیوں کو بند کردو۔ ٹھیک ہے۔ اب یہ دیکھو!"

شربتی نے انگوٹھی کو بنچ کے ایک کنارے پر رکھا اور سکہ دوسرے کنارے پر۔ "یا خدا میری مدد کر!" اس نے خاموشی سے دعا مانگی، اور سکے پر ہپناٹائز کرنے والی گہری نظر ٹھیک اسی طرح ڈالی جس طرح ابھی چند منٹ پہلے اسے سکھایا گیا تھا۔ سکہ اپنے آپ کھسکتا ہوا پہیے کی طرح لڑھکتا ہوا انگوٹھی کے پاس جا پہنچا۔ پھر سکہ اور انگوٹھی دونوں لڑھکتے ہوئے شربتی کے پاس فرماں برداروں کی طرح آگئے۔

انل کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ کر گرنے والی تھی کہ شربتی نے حیرت انگیز طور پر ہاتھ بڑھا کر اوپر ہی پیالی تھام لی۔

شربتی نے لکھنؤ میں اپنا تیسرا پبلک شو آخر ترپورا بابو کی طرح تقریباً [illegible]

[illegible]

[illegible]

لیا ۲۱۰ [illegible]

جادو کیا [illegible] تھا اور وہ [illegible]

اور انگوٹھی [illegible]

خواجہ حسن نظامی
حیات اور کارنامے

شمس العلما خواجہ حسن نظامی بڑی جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔ عالم، صوفی، معلم، مصلح، ادیب، مقرر، تاجر، نہ جانے کس کس حیثیت سے انھیں جانا پہچانا جاتا ہے۔ اتنی صفات کسی ایک ذات میں کم ہی جمع ہوا کرتی ہیں۔

خواجہ صاحب اُردو کے صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ ان کی تحریروں کو دلکش، بامحاورہ ٹکسالی زبان سے شناسائی حاصل کرنے اور اس کا لطف اٹھانے کے لیے بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں جو مضامین شامل کیے ہیں ان میں خواجہ صاحب کے ادبی کمالات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ان مضامین نے خواجہ صاحب اور ان کے کمالات کے تعارف کا حق بڑی حد تک ادا کردیا ہے۔

مرتب: خواجہ حسن ثانی نظامی

ضخامت: ۲۰۸ قیمت: ۲۹ روپے

اردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

آوارگی کا آشنا

دلیپ سنگھ

۴/۵۹، راجندر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰

تیسری قسط

سمینار ناروجین رائٹرس یونین کے ہال میں منعقد ہونا تھا۔ ہمیں وہاں پہنچانے کی ذمے داری ایک نوجوان ہندستانی انتھا کرشنن صاحب کی تھی۔ کرشنن پہلے ہندستان کی نیوز ایجنسی پریس ٹرسٹ آف انڈیا میں کام کرتے تھے۔ بعد میں ناروے جاکر بس گئے۔ میرا چونکہ اُن کے پرانے دفتر کے ساتھ آج کل گہرا سمبندھ ہے، اس لیے اس مختصر سے سفر میں اُن سے خاصی دوستی ہوگئی۔ اسی سفر کے دوران میں پتا چلا کہ ہم دونوں میں ایک اور بات مشترک ہے۔ ناروے میں کئی سال رہنے کے باوجود وہ مقررہ ہال تک پہنچنے میں کئی بار راستہ بھولے اور میں دلی میں چالیس سال گزارنے کے بعد آج بھی لوگوں سے پوچھتا رہتا ہوں کہ انڈیا گیٹ کو کونسی سڑک جاتی ہے۔

ہال میں پہنچے تو دیکھا کہ وہاں ہندو پاک مردوں اور عورتوں کی ایک خاصی تعداد موجود تھی۔ لگتا نہیں تھا کہ ان لوگوں کی دلچسپی صرف سمینار تک محدود ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ یہ سوچ کر اس ہال میں چلے آتے ہوں کہ آپس میں دو گھڑی مل بیٹھیں گے۔ اس چکر میں اگر کچھ تقریریں بھی سننی پڑیں تو سن لیں گے۔

میں نے دیکھا کہ ہال میں موجود تمام عورتیں خوب سج دھج کر آئی تھیں۔ انھوں نے اپنی بہترین ساڑیاں زیب تن کی ہوئی تھیں اور بالوں میں پھولوں کے گجرے سجا رکھے تھے۔ اُن کے مقابلے میں مرد نہایت ہی معمولی لباس میں تھے۔ بہت سے ٹی شرٹ اور جینز پہنے ہوئے تھے۔ ان کے لباس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ہمارے مردوں اور عورتوں میں تفریح کا تصور کتنا مختلف ہے۔ عورتیں چھٹی کے دن اپنی آرائش پر خصوصی توجہ دیتی ہیں کیونکہ کام کے دنوں میں انھیں بننے سجنے کی فرصت نہیں ملتی اور مرد اُس دن شیو کرنا بھی ریاضت سمجھتے ہیں کہ ہر روز یہی تو کرتے ہیں۔

ایشیائی لوگوں کی تقریباً ساری آبادی وہاں موجود تھی۔ اس کے باوجود ہال نصف سے زیادہ خالی تھا۔ منتظمین خاص طور پر چاولہ اور اُن کی اہلیہ بہت فکرمند تھے کہ اگر ہال نہ بھرا تو ہندستان سے آئے ہوئے مہمان کیا سوچیں گے۔ وضاحت کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے کہ ہال تو کب کا بھر گیا ہوتا لیکن موسم نے گڑبڑ کر دی۔ میں حیران کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، اتنا حسین موسم تو ناروے میں بہت کم ہوتا ہے جب ہلکی ہلکی دھوپ کی وجہ سے نہ صرف پارکوں اور گملوں میں پھول اُگ آتے ہیں بلکہ دلوں کے کنول بھی کھل اٹھتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُن کا مطلب یہ تھا کہ اتنے حسین موسم میں کون چاہے گا کہ وہ ایک بند کمرے میں بیٹھ کر ادب کے مسئلے پر لیکچر سنے۔ گویا موسم اور سمینار ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار تھے۔

لیکن ادب کے مسائل کی بھی اپنی ایک کشش ہے۔ آہستہ آہستہ لوگ آتے گئے اور کچھ ہی دیر میں ہال سامعین سے بھر گیا۔ عام طور پر یورپین لوگ وقت کی پابندی کو اپنی زندگی میں بہت اہم درجہ دیتے ہیں۔ اس سمینار میں اُن کے دیر سے پہنچنے کی وجہ موسم کی خوشگواری کے علاوہ یہ بھی تھی کہ صبح کے سیشن کا پہلا ایک گھنٹہ رسم افتتاح کے لیے وقف کیا گیا تھا۔ وہ لوگ شاید جان گئے ہیں کہ ہندستانی جب کسی تقریب کا افتتاح کرنے لگتے ہیں تو پھر کرتے ہی چلتے ہیں۔

سمینار کا افتتاح ناروے میں مقیم ہندستان کے سفیر جناب سادھو رام چودھری نے کیا۔ انھوں نے اپنی مختصر تقریر میں سمینار کے اربابِ بست و کشاد کو مبارک دی کہ انھوں نے ہندستان اور ناروے کے ادیبوں کو ایک دوسرے کے روبرو بٹھا کر ایک دوسرے کو سمجھنے اور نزدیک لانے کا موقع دیا ہے۔

اس کے بعد ہرچرن چاولہ نے تفصیل سے اس سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور ہماری میزبان ساہتک وچار سبھا کی کارکردگی سے ہم سب کو روشناس کرایا۔

ہرچرن چاولہ نے اپنی تقریر میں اُس ہال کا خصوصی طور پر ذکر کیا جس میں سمینار

منعقد ہو رہا تھا۔ وہ شرارت بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے کہ "یہ بلڈنگ پہلے کس کام آتی تھی میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔" میں نے سوچا تو مجھے لگا کہ پہلے اس بلڈنگ میں شاید مجرا ہوتا ہوگا۔ چاولہ صاحب شاید طوائفوں کا ذکر کرتے ہوئے شرما رہے ہیں۔ چنانچہ اُن کی تقریر کے دوران میرے کانوں میں گھنگروؤں کی صدائیں آتی رہیں اور طبلے پر تھاپ پڑتی رہی۔ بعد میں اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ اس بلڈنگ میں پہلے میونسپلٹی کا دفتر اور بعد میں پولیس آفس تھا۔ یہ سن کر میں خواب سے بیداری کے عالم میں آگیا۔ طبلے اور سارنگی کی بجائے اب میرے کانوں میں ایسی آوازیں آنے لگیں جو ہمارے تھانوں میں اکثر سُنائی دیتی ہیں۔ ویسے میرا تھانیدار دوست کہا کرتا ہے کہ شاعروں اور پولیس والوں میں گہرا سمبندھ ہے۔ شاعر دو مصرعے جوڑ کر زندگی کی کسی سچّائی پر سے پردہ ہٹا دیتے ہیں اور ہم پولیس والے دو اور دو چار کرکے مجرموں کو پکڑ لیتے ہیں۔

رسمِ افتتاح کی کارروائی کی نظامت ایک ہندستانی خاتون سجاتا پربھو کے سپرد تھی۔ سجاتا نے اپنے دلکش اندازِ گفتگو سے شرکا کا دل جیت لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ انگریزی زبان میں شاعری بھی کرتی ہیں۔

افتتاح کے بعد حاضرین کو کافی پیش کی گئی جس کے بعد باقاعدگی سے سمینار کا آغاز ہوا۔

مقامی شرکا میں دو نارویجین حضرات اور تین خواتین شامل تھیں۔ تھور و ولڈ سٹین مشہور ادیب ہیں۔ اُن کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آج کل وہ نارویجین رائٹرز یونین کے چیئرمین ہیں۔ معروف ناول اور افسانہ نگار خاتون تھورل بریکے پہلے نارویجین رائٹرز یونین کی چیئرمین رہ چکی ہیں۔ آج کل وہ PEN اوسلو کی چیئرمین ہیں۔ امریکہ کی پروفیسر گیل بیکر جو ان دنوں برگن یونیورسٹی ناروے میں تعینات ہیں۔ ان کے علاوہ پاکستان کے افسانہ نگار اور شاعر جمشید مسرور، ہر چرن چاولہ اور پورنیما چاولہ بھی ہال میں موجود تھے۔

پہلے سیشن میں "ادیب دو ثقافتوں میں" کے تحت پروفیسر اننتھا مورتی، تھورل بریکے اور ہرچرن چاولہ نے اپنے مضمون پڑھے۔ اس سیشن کی نظامت اننتھا کرشنن کر رہے تھے۔ انھوں نے کچھ اس انداز سے علمی بحث کا آغاز کیا کہ یہ سیشن ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ بعد میں ان سے مذاق کرتا رہا کہ پہلوانوں کو لڑانے کا فن آپ کو خوب آتا ہے۔

لنچ کے بعد دوسرا سیشن شروع ہوا۔ اس سیشن کا نفسِ مضمون تھا "ہندستانی ادب میں مروّجہ رجحانات" لیکن اس سیشن میں بھی پہلے سیشن کی بازگشت سُنائی دیتی رہی۔

دوسرے سیشن میں پہلا مضمون پروفیسر اندر ناتھ چوہدری کا تھا۔ پروفیسر چوہدری کا تعلق چونکہ مرکزی ساہتیہ اکادمی سے ہے اس لیے اُن کی گرفت اس موضوع پر بہت مضبوط ہے۔ دوسرا مضمون پروفیسر اننتھا مورتی کا تھا جس کا عنوان تھا "ایک مقامی بولی کا ادیب"۔ دونوں حضرات کا تعلق چونکہ درس و تدریس سے ہے اس لیے اُن کو اپنی بات نہ صرف دلچسپ انداز میں کہنے کی عادت ہے بلکہ ایک ایک نکتہ اپنے قارئین پر اس طرح واضح کر دیتے ہیں کہ گھر جا کر کتاب دیکھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ بعد میں جب ان دونوں حضرات نے مجھ سے پوچھا کہ ہمارے مضامین پر بہت کم سوال کیوں ہوئے تو میں نے جواب دیا کہ طالب علم اپنے پروفیسروں سے سوال کرنے کی ہمت کیسے کر سکتے ہیں۔

پروفیسر اننتھا مورتی نے اپنے مضمون میں ایک نہایت دلچسپ بات کہی کہ ہمارے ملک میں ادب کئی سطحوں پر لکھا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر رامائن نہ صرف کالیداس نے لکھی ہے بلکہ اس کے کئی لوک ورژن بھی ملتے ہیں جس میں لکھنے والوں نے اپنے مزاج اور ماحول کے مطابق کئی تبدیلیاں کر لی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایسی ہی ایک رامائن میں سیتا جب رام چندر جی کے ساتھ میں بن باس جانے کی پیش کش کرتی ہے اور وہ انکار کر دیتے ہیں تو سیتا جواب دیتی ہے کہ فلاں رامائن میں تو رام چندر جی نے انکار نہیں کیا تھا۔ یہ سُن کر ہال میں ایک قہقہہ گونج اُٹھا۔

پروفیسر اننتھا مورتی کا انداز بڑا دلکش ہے۔ سیمینار کے بعد میں نے سنجیدہ انداز میں اُن کے لیکچر کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ جب آپ کہتے ہیں کہ کنڑ زبان میں بہترین ادب تشکیل ہو رہا ہے تو خواہ مخواہ یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسے جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ پروفیسر اننتھا مورتی کی حسِ مزاح بھی بہت تیز ہے۔

اُس شام کو سیمینار میں حصہ لینے والے ادیبوں اور معتبر حاضرین کے لیے ہندستان کے سفیر سادھو رام چوہدری صاحب نے استقبالیہ دیا جس میں پاکستان کے ناظم خضر حیات خاں نیازی صاحب بھی شامل تھے۔ ویسے تو ایک سفارت کار کا دوسرے سفارت کی پارٹی میں شامل ہونا ایک عام سی بات لیکن یہ ذکر اس لیے ضروری ہو گیا کہ ہما

دو ملکوں میں سرکاری سطح پر کئی دفعہ اتنی دوریاں آجاتی ہیں کہ ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے اعلیٰ افسران کم از کم ایک دوسرے کی دعوت میں تو شامل ہو جاتے ہیں۔

اگلے دن سمینار کا تیسرا سیشن تھا جو میرے امتحان کا دن بھی تھا کیوں کہ یہ میرے مضمون سے ہی شروع ہونا تھا۔ نفسِ مضمون کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے جگہ جگہ لطیفوں کی مدد لی تھی۔ شروع ہی میں نے ایک مزاحیہ واقعہ سے کیا۔ میں نے کہا کہ جب میں ناروے آ رہا تھا تو میں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ وہاں سے تمھارے لیے کیا لاؤں۔ کہنے لگی "کوئی چھوٹی سی سجاوٹ کی چیز لیتے آنا"۔ میں نے کہا "یہ تمھیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کا شوق کیوں ہے"۔ میرے پانچ فٹ (نہیں) انیچ قد کو بغور دیکھتی ہوئی بولی "اگر چھوٹی چیزوں کا شوق نہ ہوتا تو تم سے شادی کیوں کرتی"۔

حاضرین کے زوردار قہقہے سے مجھے ... احساس ہوا کہ اب یہ لوگ میرے بس میں ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے میرے ایک ایک لفظ کو غور سے سنا اور کھل کر داد دی۔ میں نے اپنے مضمون میں کئی کام کی باتیں لیکن انداز ہی لکھا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ حاضرین کو بعد میں وہ باتیں بھی یاد رہ گئی ہوں گی جنھیں میں کام کی باتیں کہہ رہا ہوں۔

میرے مضمون کو سننے کے بعد حاضرین نے مجھ سے ہندستان کے مزاح نگاروں اور ان کے فن کے متعلق کئی سوال کیے جن کا جواب میں اپنی بساط کے مطابق دیتا رہا۔

میرے بعد ناروے کے مصنّف اور بریسٹا نے اپنا مضمون پڑھا۔ تھور اور بریسٹا ناروے کے مشہور ناولسٹ، افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ انھوں نے بھی اپنی بات کہنے کے لیے وہی حربے استعمال کیے جو میں نے کیے تھے یعنی بات فلاسفروں کی لیکن انداز مسخروں کا۔

ہم دونوں جب اپنے اپنے مضامین پڑھ کر اور پیدا شدہ مسئلوں پر بحث کا جواب دے کر فارغ ہوئے تو لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ لنچ کے دوران مجھے کئی ادیب دوست یہ کہہ کر لطیفے سناتے رہے کہ جب چاہوں انھیں استعمال کروں۔ میں نے کسی کو یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ یہ سب لطیفے میرے مضامین میں موجود ہیں اور شاید انھوں نے وہیں سے پڑھے ہیں۔

سمینار کا آخری سیشن تخلیقات کو پڑھ کر سنانے کے لیے وقف تھا۔ اس سیشن کی نظامت جمشید مسرور کے سپرد تھی۔ حالاں کہ تمام کارروائی انگریزی زبان میں تھی لیکن جمشید اردو کے شعر سنانے سے باز نہیں آتے تھے جن کا بعد میں انھیں انگریزی ترجمہ سنانا پڑتا تھا۔ ناروے کے ادیب دل ہی دل میں اس بات پر تعجب تو کرتے ہوں گے کہ اردو کے شاعر جب محبوب کے چہرے پر زلف کے بکھر جانے کی بات کرتے ہیں تو ساری دنیا میں اندھیرا کیوں ہو جاتا ہے۔

اس سیشن میں میں نے اپنا مضمون "بھٹکا ہوا مسافر" کا انگریزی ترجمہ سنایا اور سچی بات یہ ہے کہ حاضرین نے اُسے بہت پسند کیا۔ دیگر تخلیقات جن پر خوب داد ملی ہرچرن چاولہ، جمشید مسرور اور پورنیما چاولہ کی تھیں۔ نئے لکھنے والوں میں سچا تا بربھو، بیتا گروور، رشمی شاستری اور شسیکھا چندرا نے بھی اپنی تخلیقات سنا کر حاضرین کا دل موہ لیا۔ ان سب نے اعتراف کیا کہ انھیں ادب کی طرف مائل کرنے میں چاولہ خاندان کی کوششیں شامل ہیں۔ گویا چاولہ خاندان نہ صرف خود ادب کی خدمت میں سرگرم ہے بلکہ ادبی کارواں میں نئے ممبر بھرتی کرنے میں بھی اُن کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔

ناروے کے جن ادیبوں نے اس سیشن میں اپنی تخلیقات سنائیں اُن میں اوسے ماریانیے، ایوا رام، تھورل بریکے، آسکر سٹائن بیورلیکے اور اندا رئیڈر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ تخلیقات تو ان سب کی قابلِ قدر تھیں لیکن میں خاص طور پر اوسے ماریانیے اور ایوا رام سے متاثر ہوا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اوسے ماریانیے کی شخصیت میں جو وقار اور جاذبیت تھی وہ دیکھنے ہی بنتی تھی اور ایوا رام کا انداز مسخروں کا سا تھا لیکن بات بہت گہری کہتی تھیں۔ جمشید مسرور نے اُن کی تعریف میں اردو کے دو تین شعر پڑھ دیے شکرانے کے طور پر ایوا رام نے سیشن کے اختتام پر اُن کو ایک بوسہ دیا۔ میں نے بھی موقع غنیمت جان کر کہا کہ میں نے بھی دل ہی دل میں آپ کو بہت داد دی تھی۔ ایوا نے جواب دیا کہ میں نے بھی دل ہی دل میں آپ کو بوسہ دے دیا تھا۔

جب سمینار ختم ہوا تو کسی کا دل وہاں سے جانے کو نہیں تھا۔ دو ملکوں کے ادیبوں نے جو لمحے ایک دوسرے کی محبت اور رفاقت میں گزارے تھے کوئی نہیں چاہتا تھا کہ وہ ختم ہوں، لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں اچھی چیزوں کی زندگی مختصر ہوتی ہے۔ اس موقعے پر مجھے بھی جمشید مسرور کی طرح اردو کے شاعر عدم کا ایک شعر سنانے کی اجازت دیجیے:

ملاقاتیں مسلسل ہوں تو دلچسپی نہیں رہتی
یہ بے ترتیب یارانے حسیں معلوم ہوتے ہیں

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے
موصولہ عنوانات

نومبر ۱۹۹۲ء کے "ایوانِ اُردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں —— گلدستہ ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔

شعری عنوانات

بچوں کے ساتھ فیضِ بزرگاں ہے جب نظام
پھر ذائقہ جڑوں کا ثمر میں بھی آئے گا (نظام الدین نظام)

مرسلہ: فرح خورشید بنت محمد تبسین صدی،
حربر پورہ باؤس ۲۴۲ برہانپور ۴۵۰۳۳۱ (ایم پی)

بچی کی تھی ذرا آنکھ سبق ختم ہوا سب
پر آنکھ ابھی پہلے ہی صفحے کی طرف تھی (قضا ابن فیضی)

مرسلہ: معین الدین شمسی،
اسلامیہ مڈل اسکول، گریڈیہہ
(۸۰۵۱۳۰ بہار)

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں انکساری کا (اقبال)

مرسلہ: کندن لال گردھر بری والہ

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ معرفت نہ محبت نہ زندگی نہ نگاہ (اقبال)

مرسلہ: محمد قمر صدیقی، علی گڑھ

رحمتِ عام ہے یہ سارے زمانے کے لیے
علم مخصوص نہیں خاص گھرانے کے لیے (حفیظ جونپوری)

مرسلہ: طفیل احمد انصاری، جونپور

پڑھانا علم کی خاطر مثالِ شمع زیبا ہے
بغیر اس کے نہیں پہچان سکتے ہم خدا کیا ہے (نامعلوم)

مرسلہ: شوکت علی، سہردوئی

حُسن اور محبت کی اللہ رے ہمہ گیری
بلقیس و زلیخا کے قرآن میں افسانے (اصغر پاپوڑی)

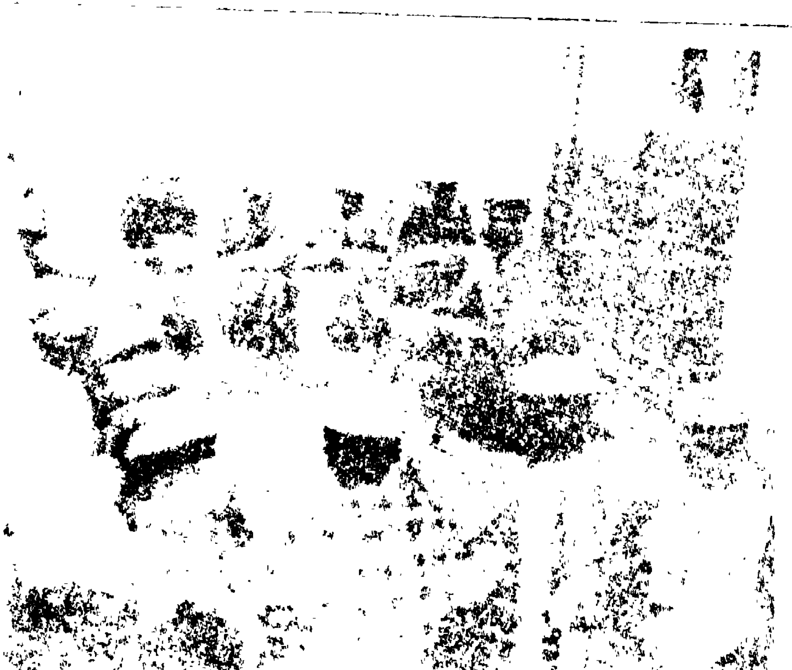
مرسلہ: غزالہ شہناز، برہان پور

پڑھ نہیں ہوتا کتابوں پہ کتابیں پڑھ دو
اگلے وقتوں میں تو دو لفظ اثر رکھتے تھے (...)

مرسلہ: ایم۔ علی، برہان پور

بچے ذہنوں کے در و دیوار پر تحریر ہے
حرف کا پندارِ فن کا بانکپن سوختہ (...)

مرسلہ: قمر جہاں ...



پچھلے ماہ کی تصویر

نثری عنوانات

"الف لام میم" (کلام حیدری کا افسانہ)
مرسلہ: محمد شکیل الرحمٰن، محمد بھیکن پور
نزد مسجد، ضلع بھاگلپور ۸۱۲۰۰۱ (بہار)

"عہدِ طفلی" (علامہ اقبال کی نظم)
مرسلہ: ارشد یونس، بیگوسرائے
"قدم بڑھاتا چل" (راج کمار سیلانی کا افسانہ)
مرسلہ: خالد احمد جالوی، دربھنگہ
"اخلاق کی تلاش" (جگدیش پرشاد کوشک کا افسانہ)
مرسلہ: محمد رحمت، سمستی پور
"رنگ ہزاروں خوشبو ایک" (بیکل اتساہی کا مجموعۂ کلام)
مرسلہ: معین الدین شمسی، گریڈیہہ

فرصت کہاں تھی اتنی کہ ہم کھولتے کتاب
ورنہ تمام علم تو قرآن ہی میں تھا (عمر قریشی)
مرسلہ: مسعود اختر انصاری، فیض آباد

تم بڑھو علم کے دریا میں تلاطم بن کر
میری خواہش ہے کہ چمکو مہ و انجم بن کر (نامعلوم)
مرسلہ: محمد عمر عارفی، کھیری ٹاؤن

پھوٹ پڑنے نہ پائے آپس میں
ایکتا کے دیے جلاتے رہو (پروین مسعودی)
مرسلہ: رحمت اللہ، فاضل پور

ٹکرا رہے تھے سر کئی اُلجھے ہوئے سوال
لیکن کسی پہ کھل نہ سکا در، جواب کا (محمود سعیدی)
مرسلہ: فرخندہ ناز، پھلائی گڑھ

...ب عشق کا دستور نرالا دیکھا
...کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا
مرسلہ: منصور حسین، برہانپور

...وب ہیں کالی گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
...ندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو (ندا فاضلی)
مرسلہ: یاسمین حیا، بمبئی

...ب خزانوں سے جو بڑھ کر ہے خزینہ علم ہے
...خدا تک ہم کو پہنچائے وہ زینہ علم ہے (عثمان نثار)
مرسلہ: محمد گلنواز اعظم، بھاگلپور

...عار علم سے بڑھ کر کوئی شعار نہیں
...وہ چمن ہے جہاں گل ہی گل ہیں خار نہیں (نامعلوم)
مرسلہ: گلشن جہاں، مظفرپور

نئی مطبوعات

غیاث احمد گدی کے افسانے
مرتب : جمشید قمر
صفحات : ۲۳۹
قیمت : ۹۰ روپے
ناشر : ایمن پبلیکیشن، رانچی
تقسیم کار : تاج بک ڈپو، مین روڈ، رانچی (بہار)

اُردو ادب کی ریت نرالی ہے، اس میں کچھ ایسی روایتیں بار پا جاتی ہیں کہ دوسری زبانوں کے ادب میں ان کی مثال تلاش کرنی مشکل ہو جاتی ہے، ایسی ہی روایتوں میں کتابوں کی ترتیب بھی ہے، کسی ایک مصنف یا مختلف مصنفین کی مختلف چیزیں اضطراری طور پر کسی واضح نشان یا مقصد کے بغیر، بغیر عرق ریزی کے چن لیں اور بہ عجلت یہ سرمایۂ عجیب بلکہ غریب کاتب کے حوالے کرکے کتاب چھپوالی، کبھی کبھی تو ایک ورق بھی اپنی طرف سے کچھ لکھنا وقت برباد کرنا جانا، لیکن بن گئے مرتب اور ایک کتاب کے مالک، شاید یہی سبب ہے کہ مرتبہ جعلی کتابوں کی ارتقا پذیر روایت ایسی کتابوں کو بھی مشکوک بنا دیتی ہے جن کے مرتب نے واقعی کچھ کرنا چاہا ہے۔ ترتیب ہمیشہ اپنے پس منظر میں ایک واضح مقصد کی داعی ہے، آخر کوئی کتاب کیوں ترتیب دی جا رہی ہے مرتب کا مقصد کیا ہے، مشتملات کے انتخاب میں کونسا نقطۂ نظر کام کر رہا ہے، آخر مرتب کسی مصنف، مصنفین، شاعر یا شعرا کو کیوں سامنے لانا چاہتا ہے، اس نے متن کی چھان پھٹک کا کونسا طریقہ اپنا رکھا ہے، پھر یہ بھی کہ وہ کوئی کتاب کس کے لیے مرتب کر رہا ہے۔ پڑھنے والوں کا کونسا طبقہ اس کی نگاہ میں ہے ــــ جلد باز، خام مرتبین کو ان سوالات سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

مجھے اس وقت جمشید قمر کی مرتبہ کتاب "غیاث احمد گدی کے افسانے" (تعارف و انتخاب) پر کچھ کہنا مقصود ہے، جمشید محقق کی حیثیت سے معروف نہیں ہیں۔ مرتب کے لحاظ سے بھی انھیں فی الحال بہت کم لوگ جانتے ہیں، لیکن مجھے اس کے اظہار میں ذرا بھی تامل نہیں کہ جمشید ترتیب کے آداب، ضابطے اور ذمے داریوں سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ مرتب کے منصب اور کارکردگی سے بھی واقف ہیں۔ ان کا ذہن صاف ہے کہ وہ کوئی کتاب کیوں مرتب کر رہے ہیں اور کیا تاثر دینا چاہتے ہیں اس باب میں تنقید و تحقیق کی روش کیا ہونی چاہیے ــــ انتخاب میں کیا چھوڑنا چاہیے اور کیا لے لینا ــــ غیاث احمد گدی اُردو کے معروف اور منفرد افسانہ نگار ہیں لیکن ان کے تمام افسانوں کی خبر اچھے اچھے پڑھنے والوں کو بھی نہیں ہے ــــ جمشید قمر نے تفہیم غیاث کے باب میں ان کے تمام مطبوعہ افسانے نیز غیر مطبوعہ کو اپنی نگاہوں میں رکھا ہے۔ اس عمل میں انھوں نے سینکڑوں رسالوں کی ورق گردانی کی ہے اور غیاث کی تحریروں کے لیے کولمبس بننے کی کوشش کی ہے، ایک واضح نقطۂ نظر سے ان کے افسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کرکے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دیا ہے لیکن ساتھ ساتھ ایک مکمل 'غیاث ببلوگرافی' دے دی ہے ہر افسانے کا سال اشاعت بلکہ ماہ اشاعت اور رسالے کا نام درج کر دیا ہے۔ 'عرضِ مرتب' میں غیاث کے فکر و فن پر کھل کر گفتگو کی ہے اور ترتیب کی غایت بھی واضح کی ہے، ان امور کے علاوہ غیاث احمد گدی کے معروف اور ممتاز افسانہ نگار بھائی الیاس احمد گدی کا ایک مضمون بھی شریک اشاعت کر لیا ہے جس سے غیاث کے ماحول اور فن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے ــــ غیاث نے 'میں اور میرے افسانے' کے عنوان سے اپنے فن کے بارے میں لکھا تھا وہ بھی اس کتاب میں موجود ہے، غیاث کا ایک انٹرویو (انٹرویوز میں انور شمیم اور اصغری) 'رو بہ رو' بھی کتاب کا جزو ہے۔ خود جمشید نے الگ سے غیاث کے تخلیقی شعور پر روشنی ڈالی ہے

اسی طرح یہ کتاب ہر طرح جامع ہے۔ اور یہ ثابت کرتی ہے کہ جمشید قمر کے اندر ایک اہم محقق اور نقاد روپوش ہے۔ مجھے امید ہے کہ 'غیاث احمد گدی کے افسانے' کی پذیرائی ہوگی اور اس کے نتیجے میں جمشید قمر نئے حوصلے کے ساتھ تحقیقی اور تنقیدی امور سر انجام دیں گے۔

— وہاب اشرفی

یونیورسٹی پروفیسر اور ہیڈ آف شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی رانچی

بین کرتا ہوا شہر

شاعر : عتیق اللہ
صفحات : ۱۲۸
قیمت : ۳۲ روپے
ناشر : نیو پبلک پریس، دہلی

'بین کرتا ہوا شہر' عتیق اللہ صاحب کا شعری مجموعہ ہے جس میں ۴۲ نظمیں اور ۱۵ غزلیں شامل ہیں۔ مجموعے کے آخر میں متفرق اشعار بھی دیے گئے ہیں۔

عتیق اللہ صاحب کی شاعری میں ذات اور کائنات کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ حدیثِ دل بھی ہے اور حدیثِ دیگراں بھی۔ ان کے لہجے میں متانت ہے لیکن شگفتگیِ بیان پر حرف نہیں آتا۔

'بین کرتا ہوا شہر' کو دیکھ کر فن پر گرفت کے ساتھ عتیق اللہ صاحب کی شخصیت و فکر کی وحدت و سالمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

ان کی بیشتر نظمیں نثری ہیں جن میں ابہام کا عنصر کہیں کہیں حاوی ہوتا نظر آتا ہے، مفہوم مبہم ہو جاتے ہیں اور ایک اچھی خاصی تصویر نظروں کے سامنے ابھر کر پھر دھندلی پڑ جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی ایک نظم کا اقتباس:

چیزوں نے اپنے معمول بدل دیئے ہیں
رسول آتے ہیں اور بے بیان چلے جاتے ہیں
خدا کی بستیاں کبھی اتنی ویران نہیں ہوئی تھیں
(میں سن رہا ہوں)

شاعر کیا کہنا چاہتا ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ رسول بے بیان واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ جملہ کافی کھٹکتا ہے۔ اپنی بات کی وضاحت میں ایک دوسری مثال بھی پیش کرنا چاہوں گا۔ چار مصرعوں پر مشتمل نظم 'آخری لمحہ' ملاحظہ فرمائیں:

پہلے لمحے پہ گرا
دوسرے لمحے پہ اٹھا
تیسرے لمحے پہ پھر اوندھا گرا
چوتھے لمحے پہ تو اس کی موت واقع ہوگئی

میں نہیں سمجھا کہ اس نظم میں کیا کہا گیا ہے۔

عتیق اللہ صاحب کی کچھ نظمیں اچھا تاثر چھوڑتی ہیں۔ 'بھاگلپور' 'فسادِ خون'، 'وہ'، 'انکر' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور اظہار کی خوبی بھی، قاری ان نظموں کے اسلوب سے محظوظ ہو کر ان کی فنکاری کا قائل ہو جاتا ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ہم بہت سے شاعروں کے ایک ہی مجموعے میں مختلف شخصیتوں اور فکر کی بے ربط لہروں سے دوچار رہتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہم کسی ایک ہی شاعر کا کلام پڑھ رہے ہیں۔ عتیق اللہ صاحب کے اس شعری مجموعے کے مطالعے سے جو خصوصیت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ شاعر کی وحدت و کلیت کہیں بھی ٹوٹتی یا بکھرتی نظر نہیں آتی۔ کچھ لوگ خارجی دنیا کو داخلیت کی عینک سے دیکھتے ہیں اور کچھ لوگ خارجی دنیا سے اثر قبول کرکے اپنے احساس کی صورت گری کرتے ہیں۔ یعنی کچھ لوگ دروں بینی اور کچھ لوگ جہاں بینی کے سہارے فنی تخلیق کا سفر طے کرتے ہیں۔ عتیق اللہ صاحب کا یہ سفر جہاں بینی کے سہارے طے کرتے ہیں، اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ دشمنوں کی طرح مجھ پہ وار کرتا ہے
مگر گروہ میں اپنے شمار کرتا ہے

کتنے برسوں کے بعد آنکھ کھلی
اور اسی روز مجھ کو مرنا تھا

میں تیسری آبادی ہوں
تو کس دشت کو جاتا ہے

آنسوؤں پر نماز پڑھتا ہوں
ایک آواز تھی اذاں جیسی

کہاں سے لاؤں وہ دیواریں جو نہ ٹوٹ سکیں
وہ چھت کہاں سے ملے جو اماں دے مجھ کو

شاعری ایک پُر اسرار عمل ہے۔ چنانچہ شاعری کا کوئی ایک حتمی معیار تلاش کرنا ممکن نہیں، البتہ کسی شاعر کے پورے کلام میں ایک شخصیت کے محوِ گفتگو رہنے کا احساس ایک ایسا معیار ہے جس کی بنا پر ہم کسی شاعر کو سچا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ عتیق اللہ صاحب جانچ کی اس کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔

'بین کرتا ہوا شہر' طباعت و کتابت کے لحاظ سے نہایت دیدہ زیب ہے۔ کاغذ بھی عمدہ استعمال کیا گیا ہے۔ مجموعے کا سرورق خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز بھی ہے۔

—— راشد انور راشد

لاشریک

شاعر: اظہار اثر

صفحات: ۱۲۸

قیمت: ۳۰ روپے

ناشر: اظہار اثر، وائی - ۵، نیو رہنمیت نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

ملنے کا پتا: سیمانت پرکاشن، ۲۲-۹ - کوچہ روح اللہ خاں، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اظہار اثر بیک وقت ایک صحافی، ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ "لاشریک" ان کا دوسرا اور تازہ شعری مجموعہ ہے۔ "لاشریک" کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں ذات و کائنات کے مظاہر سے گہری وابستگی ہے۔ وہ ان مظاہر کو ایک سائنسی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن ایک شاعرانہ اسلوب میں لفظوں کا جامہ پہناتے ہیں۔ دراصل ہمارا زمانہ سائنس کا زمانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے خط و خال سائنسی نقوش کے بغیر ادھورے اور نامکمل ہیں۔ اظہار اثر سائنس کی دھڑکنوں کے سامع ہیں اور اپنی شاعری میں ان دھڑکنوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ سمو سکتے ہیں۔ اپنی بات کی تائید میں میں چند نظموں کا نام لوں گا۔ "ذرّہ" نظم میں بظاہر ایٹم کو توڑنے کا سائنس کا عمل نظر آتا ہے مگر سائنسی صداقت کے باوصف یہ نظم انسانی جذبات اور محسوسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ "سیاہ سورج" اور "پیدائش" "ایک سورج" کی جیسی نظموں میں زندگی کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان کی ایک نظم "میں" دعوتِ فکر دیتی ہے اور اس کا اثر وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے گیتا، ویدانت اور قرآن توجّہ سے پڑھا ہے اور ان کے مرموزات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

کوئی جہت نہیں میری کہیں حدود نہیں
میں لاشریک ہوں، میرا کوئی وجود نہیں

کتابت و طباعت دیدہ زیب اور سرورق پُرمعنی ہے۔

سرسبز (سہ ماہی رسالہ)

ایڈیٹر: گوردیپ ٹھور

صفحات: ۴۰

قیمت: ۱۰ روپے

ناشر: کرشن کمار طور، ۳۴/۵۱، کنیارا روڈ، دھرم شالہ ۱۷۶۲۱۵

زیر نظر شمارہ ہائیکو سے متعلق ہے جس طرح انگریزی میں سانیٹ، ہندی میں دوہا اور اُردو میں غزل کو محبوبیت اور مقبولیت حاصل ہے اسی طرح جاپانی ادب میں "ہائیکو" ہے۔

زیر نظر شمارے میں انور مینائی کا مضمون "ہائیکو — ایک تجزیاتی مطالعہ" کافی محنت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ سلیم انصاری کا مضمون "کچھ ہائیکو کے بارے میں" بھی تفصیلی ہے ان کا کہنا ہے کہ ہائیکو کے تینوں مصرعے مساوی الوزن رکھ کر پہلے اور تیسرے مصرعے میں ردیف و قوافی کی قید کو اتفاق رائے سے تسلیم کر لیا جائے تاکہ اُردو میں ہائیکو کی ایک شکل متعیّن ہو جائے۔ اور اس مخصوص صنفِ شاعری میں نئے امکانات کی تلاش کی جا سکے۔ ان مضامین کے علاوہ مظہر امام، حمید الماس، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، عبدالمتین نیاز اور دیگر شعرا کے ہائیکو شامل ہیں۔ مظہر امام، ظفر گورکھپوری، مناظر عاشق ہرگانوی، محبوب علی بھگوانداس اعجاز، رونق شہری، رئیس الدین رئیس، کرشن کمار طور کے گیت بھی ہیں۔

——— دلیپ بادل

۲۲۵، چراغ دہلی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

انشا — عالمی اُردو افسانے

صفحات: ۳۶۸

سائز: $\frac{20 \times 30}{8}$ مجلد

قیمت: ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک کے لیے: ۲۰ امریکی ڈالر

ملنے کا پتا: انشا پبلیکیشنز، ۲۵-بی، ذکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳

یہ ماہنامہ "انشا" کی خصوصی اشاعت ہے جسے ایک مجلد کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس خصوصی اشاعت میں ہندستان اور پاکستان کے علاوہ برطانیہ، ناروے، ڈنمارک، سویڈن، کناڈا، امریکہ، سعودی عرب، نیدرلینڈ اور بنگلہ دیش میں مقیم اُردو افسانہ نگاروں کے افسانے بھی شامل کیے گئے ہیں جن کی تعداد ستر ہے۔ ہمعصر اُردو افسانے پر ایک مباحثہ بھی ہے جو ڈاکٹر عتیق اللہ نے مرتّب کیا ہے۔ شرکائے بحث میں جوگندر پال، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر شمیم نکہت، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر خالد اشرف اور نکہت ریحانہ کے اسمائے گرامی ہیں۔ یہ مباحثہ ہمعصر اُردو افسانوی ادب کے بہت سے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے اور کئی ایسے نکات سامنے لاتا ہے جو نئے بھی ہیں اور خیال انگیز بھی۔ ڈاکٹر محمد محسن اور ڈاکٹر اختر بستوی کے مضامین کے علاوہ مدیر

انشاؔ ف۔س۔ اعجاز کا طویل اداریہ" عالمی اُردو افسانے کا عالم" بھی بہت معلومات آفریں ہے۔

کہا گیا ہے کہ سبھی افسانے جو اس نمبر میں شامل ہیں، بہ طور خاص اسی کے لیے لکھے گئے ہیں لیکن ان میں ایک دو مطبوعہ افسانے بھی نظر پڑے مثلاً رفیق چوہدری کا افسانہ "بوڑھا آدمی اور لڑکی" جو" ایوانِ اُردو" میں شائع ہو چکا ہے۔

ف۔س۔ اعجاز نے نمبر بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ اعجاز صاحب مدیر کے علاوہ شاعر بھی ہیں۔ انھوں نے ایک جدّت یہ کی ہے کہ ہر افسانے کے مجموعی تاثر کو ایک شعر کی شکل دے دی ہے اور انھیں فہرست میں افسانوں کے عنوانات کے سامنے درج کر دیا ہے۔

امید ہے" انشاؔ" کی اس خصوصی پیشکش کو عمومی مقبولیت حاصل ہوگی۔

سہ ماہی **ذہنِ جدید**

دوسری جلد کا نواں شمارہ (ستمبر تا نومبر ۹۲ء)

مرتبین : زبیر رضوی، جمشید جہاں

صفحات : ۱۹۰

قیمت فی شمارہ : ۲۰ روپے

زرِ سالانہ : ۱۰۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)

پتا : ذہنِ جدید، پوسٹ بکس نمبر ۷۰۴۲، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

"ذہنِ جدید" اب ایک معتبر ادبی روایت کا روپ اختیار کرتا جا رہا ہے۔ سہ ماہی رسالوں کی اشاعت میں عموماً بے قاعدگی در آتی ہے لیکن یہ رسالہ اپنی اشاعتِ اوّل سے اب تک پابندیِ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اپنے مزاج و معیار کو نہ صرف برقرار رکھے ہوتے ہے بلکہ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہے۔

سابقہ شماروں کی طرح زیرِ نظر شمارے کے مشمولات بھی تنوع اور تازگی کے حامل ہیں۔ سافتیا کے مباحث سے متعلق جمیل جالبی کا اظہارِ خیال غور و فکر کے لیے کچھ نئے گوشے سامنے لاتا ہے۔

دیویندر اسّر نے ادب اور زندگی میں نظریے کی کارفرمائی پر گفتگو کی ہے۔ ان کی گفتگو سے بھی بحث کے کچھ پہلو نکلتے ہیں۔ ممتاز حسین کا ایک پرانا مضمون ان کے تئیں غالباً اظہارِ عقیدت کے طور پر شامل کیا گیا ہے جو سرسیّد کے نثری اسلوب پر ہے۔

افسانوں میں سب سے پھس پھسا افسانہ انتظار حسین کا ہے اور سب سے اثر آفریں شفق کا۔ انتظار حسین نے عراق کے حالیہ المیے کو "طوطا مینا کی کہانی" کا روپ دے کر دانستہ یا نادانستہ طور پر شاید اس کی المناکی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب ان کا دیومالائی اور داستانوی اسلوب بھی اپنی تازگی کھو چکا ہے اور وہ خود کو دہراتے ہوئے لگنے لگے ہیں۔ شفق نے ایک ایسے کردار کی کہانی سنائی ہے جو تقسیم کے وقت پاکستان کو ہجرت کر گیا تھا اور اب چالیس سال بعد اپنے آبائی شہر کو لوٹا ہے۔ اس طویل مدت میں اس نے جو ذہنی سفر طے کیا ہے اور دونوں طرف اس تہذیب کی جو پامالی ہوئی ہے جس کا وہ پروردہ ہے، یہ کہانی اسی کی روداد پیش کرتی ہے اور قاری پر بھرپور تاثر چھوڑتی ہے۔ خالدہ حسین اور شوکت حیات کے افسانے بھی اچھے ہیں۔ الیاس احمد گدی کے افسانے "بغیر آسمان کی زمین" کی پہلی قسط گزشتہ شمارے میں شائع ہوئی تھی، دوسری، جو آخری بھی ہے، اس شمارے میں آئی ہے۔ یہ کہانی موجودہ سماج کی خود غرضیوں اور ان خود غرضیوں کی تکمیل کے لیے اس کے اختیار کردہ غیر اخلاقی رویّوں کو موثر ڈھنگ سے سامنے لاتی ہے۔ شفیقہ فرحت کا مزاحیہ دلچسپ ہے۔

شاعری کے حصّے میں بہت سے نئے پرا[نے] نام شامل ہیں۔ راقم الحروف کو اختر حسین جعف[ری] مرحوم، شین کاف نظام اور شبنم عشائی کی نظم[یں] بہت اچھی لگیں۔ عالمی ادب اور ہندستانی اد[ب] کے تحت کچھ اچھے تراجم دیے گئے ہیں۔ از[حسبِ] معمول مصوّری، تھیٹر اور فلم پر معلوماتی مضا[مین] اور کتابوں پر تبصرے شامل ہیں ——— ا[س] شمارے کا ایک خاص وصف اُردو، ہندی، پنجابی کے شاعر اور افسانہ نگار اور ہزاروں لوک گیتوں کو یکجا کرنے والے جہاں گرد فن[کار] دیویندر ستیارتھی پر مضامین اور ان کے افسانوں کی شمولیت ہے۔ یہ ایک فرضِ کفا[یہ] ہے جو" ذہنِ جدید" نے ہم سب کی طرف سے ادا کیا ہے۔ ستیارتھی اب عمر کی نویں دہائی [میں] داخل ہو چکے ہیں لیکن ان کی شخصیت کی [تازگی] اور قلم کی تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ [اس] کے شاہد ان کے یہ دو افسانے بھی ہیں جو [اس] شمارے میں شامل ہیں۔

——— مخمور سع[یدی]

اُردو خبر نامہ

"مضامینِ نہرو" کا اجرا

۱۵ اکتوبر کو اُردو کے بزرگ ترین شاعر اور ادیب جناب آنند نرائن ملّا کی قیام گاہ ۲۴، بلونت رائے مہتہ لین پر اُردو اکادمی کی طرف سے ایک پُروقار تقریب منعقد ہوئی جس میں اکادمی کی سال رواں کی اہم اشاعت "مضامین نہرو" کی رسم اجرا مرکزی وزیر مملکت برائے شہری ترقیات محترمہ شیلا کول نے انجام دی۔ "مضامین نہرو" پنڈت جواہر لال نہرو کے منتخب انگریزی مضامین کے اُردو تراجم پر مشتمل ہے جو ملّا صاحب نے پنڈت جی کی زندگی میں ان کی اجازت اور ایما سے کیے تھے اور یہ پہلی بار پنڈت جی کی زندگی ہی میں کتابی صورت میں چھپ گئے تھے۔ ان مضامین کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر اکادمی نے اس کتاب کو دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس تقر



جناب ارجن سنگھ صدارتی تقریر کرتے ہوئے ــــ کرسیوں پر دائیں سے: پروفیسر گوپی چند نارنگ، محترمہ شیلا کول، پنڈت آنند نرائن ملّا اور جناب [illegible]

کی صدارت مرکزی وزیر برائے فروغِ وسائلِ انسانی جناب ارجن سنگھ نے کی۔ انھوں نے اردو زبان اور قومی یک جہتی کے تناظر میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ملک و قوم کو درپیش موجودہ چیلنجوں کا مقابلہ پنڈت نہرو کے نقشِ قدم پر چل کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر اردو کے مشہور ادیب اور نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے ملا صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک شخصیت نہیں ایک ادارہ ہیں جس کا فیضان اگلی نسلوں تک بھی پہنچتا رہے گا۔ تقریب کے آغاز میں اکادمی کے سکریٹری جناب ایس۔ اشتیاق عابدی نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور مخمور سعیدی نے جنھوں نے ملا صاحب کے مشفقانہ اصرار پر کتاب کی اشاعتِ ثانی کا پیش لفظ تحریر کیا ہے، کتاب کے بارے میں تعارفی کلمات کہے۔ آخر میں ملا صاحب نے کتاب کی اشاعتِ ثانی پر اکادمی کا شکریہ ادا کیا اور نہرو خاندان سے اپنی دیرینہ وابستگی پر روشنی ڈالی۔

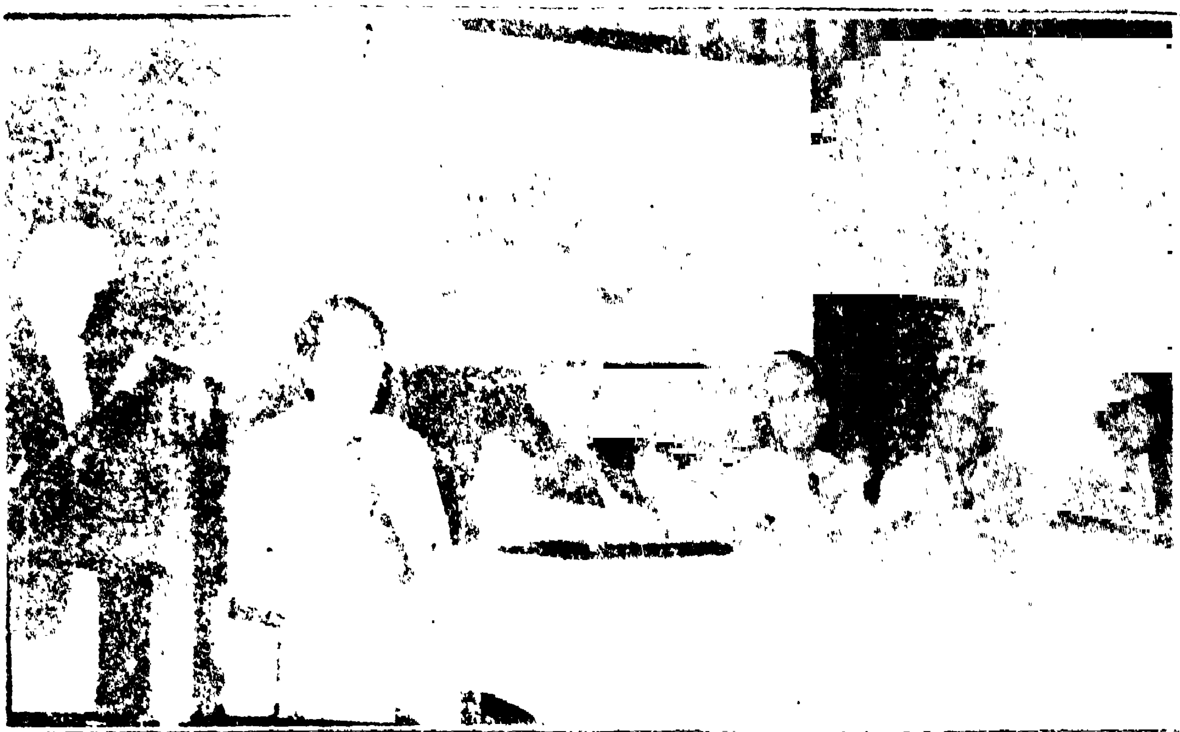
کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور کمار پاشی کی یاد

۱۶ اکتوبر کو دہلی کی ایک ثقافتی تنظیم "فنکار" کی جانب سے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور کمار پاشی کی یاد میں آندھرا پردیش بھون نئی دہلی میں ایک باوقار تقریب کا انعقاد ہوا جس کی صدارت مرکزی وزیر برائے فروغِ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے کی۔ انھوں نے اس موقع پر بیدی صاحب اور کمار پاشی سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ادبی اور شعری خدمات کو سراہا۔ مجوزہ اردو یونیورسٹی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ حکومت نے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کسی سیاسی مفاد یا مجبوری کے تحت نہیں کیا ہے بلکہ اس لیے یہ قدم اٹھایا ہے کہ ایک اہم زبان کی ترقی کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس تقریب میں جن شعرا نے اپنا کلام سنایا ان میں کیفی اعظمی کے علاوہ مخمور سعیدی، محسن زیدی، حیات لکھنوی، پریم وارثی، ٹھاکر خیال، امیر قزلباش، زبیر رضوی، قیس رامپوری شامل تھے۔ اردو کے مشہور ادیب نثر کرشن گوپال عابد کے دس سال کے پوتے نے بھی ملک کے موجودہ حالات پر ایک نظم پیش کی جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔ آخر میں محترمہ مدھومتا بوس، محترمہ نسیم بانو اور محترمہ ریتا گنگولی نے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور کمار پاشی کی غزلیں ساز و آواز میں پیش کیں۔

سہ روزہ غزل سیمینار

دہلی اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام "آزادی کے بعد اردو غزل کا تخلیقی اور فکری سفر" کے موضوع پر ایک سہ روزہ سیمینار ۶ نومبر سے ۸ نومبر تک منعقد ہوا۔ جس میں نامور ناقدین اور محققین نے کہا کہ نئے موضوعات کو قبول کر کے ہی غزل مقبول صنفِ سخن کی حیثیت سے برقرار رہ سکتی ہے۔ ٹوٹے ہوئے معاشرے کو جوڑنے اور ماضی کی بہتر روایات کو قائم رکھتے ہوئے غزل کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہے۔ غزل کا لہجہ رمزیہ رہا ہے۔ آج کے عہد میں فلم ٹی وی نے اشاروں اور کنایوں کے بجائے براہِ راست ترسیل کا کام شروع کر دیا ہے۔ غزل کو اس کا چیلنج بھی قبول کرنا چاہیے۔

سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں پروفیسر محمد حسن نے گزشتہ ۷۰ برس کی غزل کے فکری اور تخلیقی عمل کا تفصیل سے تجزیہ کیا۔ سیمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ تحریک آزادی سے لے کر آج تک غزل مختلف عوامل کے تحت نئے نئے تجربات کے ساتھ کامیابی سے آگے بڑھتی رہی مگر آج اردو زبان کے عمومی انحطاط کے دور میں غزل کو بھی سخت چیلنجوں کا سامنا ہے۔ انھوں نے اپنا مقالہ "فیض کی غزل کا آہنگ" پڑھا اور بتایا کہ "دستِ صبا" سے فیض غزل کے مستند شاعر بن گئے۔ انھوں نے مزید کہا کہ فیض نے اساتذۂ فن سے اس حد تک اکتساب کیا ہے جہاں ان کی تخلیقی حیثیت مجروح نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کہا کہ غزل میں صوفیانہ شاعری نے جو والہانہ پن پیدا کیا تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نئی شاعری نے ادارہ بندی کو ختم کر دیا ہے۔ ڈاکٹر حنیف کیفی نے غزل کے نئے رنگ و آہنگ پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر خالد علوی نے پاکستان کی غزل کے رجحانات پر مقالہ پڑھا اور ناصر کاظمی پر تیکھی بحث کی۔ پروفیسر زاہدہ زیدی نے عصری غزل کا منظر نامہ حالیہ تخلیقات کی روشنی میں پیش کیا اور کہا کہ حالیہ غزل کا سب سے اہم موضوع فرقہ وارانہ فسادات اور نسلی تعصب ہے۔ ڈاکٹر خورشید احمد نے حالیہ



سمینار کا افتتاحی اجلاس ——— دائیں سے: پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی، پروفیسر محمد حسن، جناب عزیز قریشی (صدر جلسہ)، پروفیسر قمر رئیس اور مائک پر جناب عابداللہ غازی۔

جدید غزل — اظہار کے چند پہلو" کے عنوان سے مقالہ پڑھا اور بتایا کہ شخصی داخلی وابستگی پر اصرار جدید غزل کا خاصہ ہے ——— ڈاکٹر شافع قدوائی نے مابعد جدید غزل کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اقدارِ حیات کے مسائل اور نئی غزل کے امکانات پر روشنی ڈالی۔ مسٹر کمال احمد صدیقی نے اپنے مقالے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ناصر کاظمی نئی غزل کے امام نہیں ہیں اور کہا کہ مابعد جدید غزل روایتی شاعری کا احیاء ہے۔ مسٹر شاہد احمد شعیب نے اپنے مقالے میں کہا کہ آزادی کے بعد غزل زندگی کی نئی جہتوں کی تلاش میں سرگرم ہے۔ پروفیسر لطف الرحمن نے "احساسِ تنہائی اور نئی غزل" کے موضوع پر

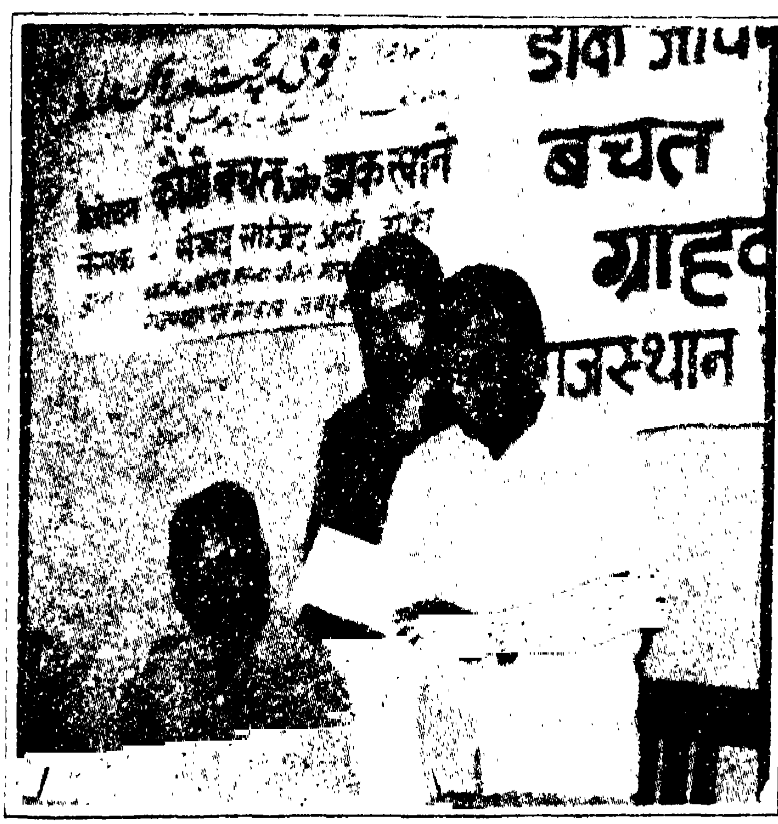


دائیں سے: جناب ایس۔ اشتیاق عابدی، جناب خورشید احمد، ڈاکٹر نصیر احمد خاں، جناب جوگندر پال، ڈاکٹر لطف الرحمن، جناب مظہر امام، جناب رفعت سروش اور پروفیسر قمر رئیس

ے میں کہا کہ نئی غزل میں احساس ی کو مختلف زاویوں سے اپنایا جا رہا ہے مظہر امام نے کہا کہ آزاد غزل کا خیال آزاد نظم سے مستعار ہے۔ فرحت احساس نے "غزل اور حسیت کی تقسیم" پر مختصر مقالہ پیش کیا اور میر و غالب کے حوالے سے حسیت کی تقسیم کا احاطہ کیا۔ پروفیسر لطف الرحمٰن اور فرحت احساس کے مقالوں پر تیکھی ادبی نوک جھونک بھی رہی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر مغنی تبسم اور پروفیسر عقیل رضوی نے بھی مقالے پیش کیے اور غزل کی نئی جہتوں کا مفصل احاطہ کیا۔ دہلی اردو اکادمی کے سیکریٹری پروفیسر اشتیاق عابدی نے سیمنار کی تاریخی کامیابی کے لیے دہلی کی تینوں یونیورسٹیوں کے اردو اسکالروں اور اردو سے وابستہ لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ سیمنار میں مجلس صدارت، نظامت اور مباحثے میں شرکت کرنے والوں میں لطف الرحمان، مظہر امام، رفعت سروش، پروفیسر عقیل رضوی، پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر شافع قدوائی، مخمور سعیدی، ڈاکٹر ابن کنول، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، مسٹر جوگندر پال، ڈاکٹر نصیر احمد خاں، ڈاکٹر خورشید احمد سمیت متعدد دانشور تھے۔ شجاع خاور نے غزل میں جاری نئی بے پروائی پر تشویش کا اظہار کیا اور دانستہ طور سے مشکل الفاظ کو غزل میں برتنے کو نامناسب روش بتایا۔ سیمنار انتہائی کامیاب رہا۔



سیمنار کی دوسری شام "شامِ غزل" کے طور پر منائی گئی جس میں محترمہ مدھومیتا بوس نے اساتذہ کی غزلیں پیش کیں۔ (تصاویر: سید فدا علی)



۱۵ اکتوبر کو "یوم بچت بینک" کے موقعے پر سید ساجد علی ٹونکی کی کتاب "قومی بچت اور ڈاک خانے" کی رسم اجرا جناب ایل۔ سی۔ رام نے انجام دی۔
تصویر میں کرسی پر ڈائرکٹر اسمال سیونگس حکومتِ راجستھان کو دیکھا جا سکتا ہے بیچ میں کتاب کے مصنف سید ساجد علی کھڑے ہیں۔



۴ اکتوبر کو بھوپال میں جناب صابر ادیب کے شعری مجموعے کی رسم اجرا ڈاکٹر بشیر بدر نے ادا کی

شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں "بزم ادب" کا قیام

۲۳ اکتوبر ۱۹۹۲ کو شعبۂ اُردو کے اساتذہ کی اکیڈمک کمیٹی کی ایک میٹنگ ڈاکٹر ہارون ایوب (صدر) کی صدارت میں منعقد ہوئی اس میٹنگ میں "بزم ادب" کی تشکیل عمل میں آئی۔ میٹنگ میں شعبے کے جن اساتذہ نے شرکت کی ان میں شری ایس۔ پی۔ مہتا، ڈاکٹر مدھو کٹاریہ اور ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی شامل تھے۔ بزم کے تحت سیمنار، سمپوزیم، شامِ غزل، شامِ افسانہ اور دیگر ادبی پروگرام منعقد کیے جائیں گے۔ بزم کے عہدیداران اس طرح ہیں۔

ایڈوائیزر: ڈاکٹر محمد شکیل خاں (ریڈر شعبۂ اردو)، صدر: اشوک کمار (ایم۔ اے اردو II)، نائب صدر: مس جتندر کور (ڈپلوما فارسی)، سکریٹری: محمد ندیم (ایم۔ اے اردو۔ I)، نائب سکریٹری: شہزور سنگھ (ڈپلوما فارسی)، ٹریزرر: مس تریتا کماری (ایم۔ اے اردو I) ممبران: سنجے سبودھ، محمد معین، احمد صدیق، مس نروندر جیت کور، کیپٹن من موہن سنگھ، مس انجو سینی۔

(ندیم خاں، سکریٹری، بزم ادب اردو)

رام لعل نابھوی کو ایوارڈ

جناب رام لعل نابھوی کی اطلاع کے مطابق انھیں آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ نے ان کی اردو زبان و ادب کی خدمات کے لیے "امتیازِ میر" ایوارڈ، سند اور نقد انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔

عابد علی خاں کا انتقال

۱۱ اور ۱۲ نومبر کی درمیانی رات میں اُردو روزنامہ "سیاست" حیدرآباد کے بانی مدیر عابد علی خاں کا حرکت قلب بند ہوجانے سے حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی عمر ۲ے سال تھی۔ پسماندگان میں بیوی ۴ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۹ کو حیدرآباد سے روزنامہ سیاست جاری کرنے سے قبل وہ ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن تھے اور کئی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری بھی رہے۔

حکومت ہند نے ان کی صحافتی خدمات کے صلے میں ۱۹۸۱ میں انھیں پدم شری کا اعزاز دیا تھا۔ ۱۹۸۲ میں انھیں غالب انعام برائے اردو صحافت دیا گیا۔ صحافت کے علاوہ انھوں نے قومی اور سماجی کاموں میں بھی دلچسپی لی۔ وہ قومی یکجہتی کونسل اور قومی مدیران کمیٹی کے رکن تھے۔

عابد علی خاں نے مدرسۂ عالیہ حیدرآباد میں ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ ان کی تین کتابیں جمہوریہ چین، مشاہیر چین اور اجرت محنت اور سرمایہ شائع ہوئیں۔ انھوں نے سوویت یونین، افغانستان، فن لینڈ، جاپان، یوگوسلاویہ، سعودی عرب اور یورپ وغیرہ کے دورے کیے تھے۔ مرحوم انجمن ترقی اُردو (ہند) سے ۲۰ سال تک وابستہ رہے انھوں نے مختلف فرقوں کو قریب تر لانے اور

(بقیہ صفحہ ۵۸ پر)

گرامی نامے

"ایوانِ اردو" کے ستمبر ۱۹۹۲ء کے شمارے میں راجستھان میں اُردو زبان کی ابتدا اور پرتھوی راج راسو" شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار نے محمود شیرانی کے مقالے "پرتھوی راج راسا" سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اور آخر میں پرتھوی راج راسو کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ راجستھانی بھاشا نے بھی اُردو کا خمیر تیار کیا۔ حافظ محمود خاں شیرانی جو تحقیقات کرچکے ہیں ان کے مطابق اُردو کا [illegible] [illegible] [illegible] راجستھانی زبانوں سے متعلق اور اُردو [illegible] پنجاب میں [illegible] پنجابی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور اُردو [illegible] کا تعلق [illegible] پرتھوی راج راسو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] واضح رہے کہ [illegible] [illegible] ([illegible] چھپا ہے) میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] فارسی کے الفاظ موجود ہیں۔ [illegible] [illegible] [illegible] ([illegible] شگفتہ" مطبوعہ ۱۹۸۷ء صفحہ ۱۰ [illegible] میں اُردو [illegible] رفیق [illegible] سروہی [illegible] [illegible] پرتھوی راج راسو" اور "بیسل دیو [illegible]

کے [illegible] ایک مثنوی "تاریخ غریبی" کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ جو ۱۷۴۲ء میں لکھی جا رہی تھی اور جو فارسی رسم الخط میں ہے اس میں راجستھانی اور ہندی کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ اسے راجستھان میں اُردو کی اوّلین تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے شروع کیے جانے کی تاریخ مندرجہ ذیل شعر [illegible] [illegible] مطابق ۱۷۴۲ء برآمد ہوتی ہے:

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] کتاب کا جو [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] کوں نفع نصیبی
[illegible] [illegible] تاریخ غریبی
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] فضلِ الٰہی

[illegible] [illegible] راجستھان میں غیر مسلم [illegible] [illegible] مصنف [illegible] و عبدالمعبود عثمانی صدر [illegible] عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک (راجستھان)۔

[illegible] حسن [illegible] صاحب قابلِ مبارکباد ہیں [illegible] راجستھان میں اُردو زبان کی [illegible] [illegible] مضمون لکھ کر مزید دعوت تحقیق دی ہے۔ اس سے نئے گوشے سامنے [illegible] ہے۔

[illegible] میرے شمارے کے "حرفِ آغاز" میں اُردو یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے آپ نے بجا طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ ابتدائی ورثانوی تعلیم کی طرف بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ تبھی اعلیٰ تعلیم کی پختہ عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔ نئی مطبوعات پر تبصرے پسند آئے لیکن تنہا تنہا" (شعری مجموعہ) مصنف سید شکیل دسنوی کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ کتاب پر تبصرہ کم اور REPORTED زیادہ ہے۔ یا پھر شاعروں کی DEFINITION فہرست سازی ہے۔

——عزیز اللہ شیرانی، ٹونک

[illegible] اکتوبر ۱۹۹۲ء کے "ایوانِ اُردو" میں سید ساجد علی (ٹونک) کا خط نظر سے گزرا۔ پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور کوفت بھی ہوئی۔ معلوم نہیں موصوف کیا فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہیں؟

پہلی بات — جس مضمون کے تمام تصورات اتنے واضح ہوں اسے مبہم بتاتے ہیں۔ اور پھر وہی بات خود کہتے ہیں (اپنی بنا کر) جس پر اس خاکسار نے مضمون کا بنیادی ڈھانچہ تعمیر کیا ہے۔ موصوف کے الفاظ۔۔ "تخلیقی ذہن ایک چھپا ہوا خزانہ ہے، ہماری درسگاہیں سے تلاش کرنے اور جلا بخشنے میں مدد کرسکتی ہیں۔۔۔" کیا خوب؟ یہی بات میں نے دلائل تفصیلات اور جزئیات کے ذریعے پیش کی

تو ساجد صاحب کے سر سے گزر گئی۔۔۔ میرا تو پورا موقف ہی یہ ہے کہ تخلیقی فنکار پیدا نہیں کیے جا سکتے، بلکہ ہماری درسگاہیں بچوں اور نوجوانوں کے ذہن میں پوشیدہ تخلیقی صلاحیتوں کو دریافت کر سکتی ہیں اور ان کی آزاد نشوونما میں مدد کر سکتی ہیں کہ جو صلاحیتیں عموماً LETENT مخفی یا بے عمل رہ جاتی ہیں وہ بروئے کار لائی جا سکیں۔۔۔۔ بشرطیکہ اساتذہ مناسب طریقۂ کار اختیار کریں اور مناسب ماحول پیدا کر سکیں۔

دوسری بات موصوف نے یہ کہی ہے کہ "مرحوم نے نفسیاتی تنقید کی عینک لگا کر مسئلے کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ جب کہ کسی بھی تخلیق کی بنیادیں سائنٹفک تنقید پر قائم ہیں"۔۔۔ اب ایسی باتوں کا کوئی کیا جواب دے — وہ کونسی "تخلیق" ہوتی ہے جناب جس کی بنیادیں سائنٹفک تنقید پر قائم ہوتی ہیں۔ یہ وہی بات ہوئی کہ PUTTING THE CART BEFORE THE HORSE. تخلیق مقدم ہے، تنقید اس کا مطالعہ اور تجزیہ ہے نہ کہ تخلیق کی بنیاد — محترم کو اگر تخلیق کی نفسیات اور ادبی تنقید کے لوازمات کا سرسری علم یا اندازہ بھی ہوتا تو وہ اس قسم کا ادعا کرنے سے پہلے دس بار سوچتے، اب رہی "نفسیاتی تنقید کی عینک" والی بات — تو عرض ہے کہ نہ تو نفسیات عینک ہے میرے لیے — نہ ہی مقالہ نفسیاتی تنقید یا کسی بھی قسم کی تنقید کے ضمن میں آتا ہے۔ یہ تو سیدھا سیدھا تعلیمات کے ڈسپلن کا موضوع ہے جس کے ایک پہلو کی "تخلیق کی نفسیات" کے پس منظر میں افہام و تفہیم کی کوشش کی گئی ہے (لطف یہ ہے کہ "ایوانِ اُردو" کے جملہ قارئین نے اس کو اسی پس منظر میں سمجھا اور پسند کیا ہے، جس کا اظہار "ماہ نومبر" کے "ایوانِ اُردو" میں شامل متعدد خطوط سے لگایا جا سکتا ہے) ضمناً عرض ہے کہ جس شخص کا ۴۵ سال سے درس و تدریس، تحقیق، تصنیف و تالیف کی صورت میں نفسیات عمق سے لے کر وجودی نفسیات تک اس علم سے گہرا شغف اور ربط رہا ہو، اور جس نے انگریزی اور اُردو میں متعدد مقالات اور کتابوں کی تصنیف و لندن یونیورسٹی سے تخلیق کی نفسیات میں ریسرچ ڈگری (اعزاز کے ساتھ) کی صورت میں اس ڈسپلن کے مختلف پہلوؤں کی گرہ کشائی کی سعیٔ مسلسل کی ہو، سے "نفسیاتی تنقید کی عینک" لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ (یہ الگ بات کہ زیر بحث مضمون "تنقید" کسی طرف سے ہے ہی نہیں) نفسیات اس خاکسار کے علمی روابط میں سے ایک ہے۔ اس پر مستزاد فاضل مراسلہ نگار نے اس خاکسار کو یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ "ادبی تخلیق کار کے لیے کن چیزوں کا جاننا ضروری ہے"۔۔۔ اب اس سادہ لوحی کا کیا جواب دے کوئی؟ کیا وقت پڑا ہے اردو پر — اُردو کے بیشتر "بزعم خود نقادوں" میں منجملہ اور خصوصیات کے MODESTY کی صفت بھی عنقا ہے۔

کمار پاشی، اور اب عزیز قیسی اور حکم چند نیّر کے سانحۂ ارتحال نے ہم سے تین اور قابلِ قدر اہلِ قلم چھین لیے۔ ان بچھڑنے والوں کا صدمہ ہم سب کے لیے گہرا اور ناقابلِ فراموش ہے: مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں۔۔۔

—— ساجدہ زیدی، علی گڑھ

▷ اکتوبر ۹۲ء کے شمارے میں رشید حسن خاں کا مضمون بہت معلوماتی ہے۔ نیاز صاحب نے جو اعتراضات کیے ہیں اُن میں اختلاف کی گنجائش ہوتے ہوئے بھی موصوف کی انتقاد پر پکڑ سے ژرف نگاہی ظاہر ہوتی ہے۔ "دھوری تصویر" نامکمل جگدیش صاحب کا ترجمہ کردہ افسانہ اچھا ہے لیکن کہیں کہیں ہندی کے الفاظ کا بھی استعمال کیا گیا ہے جب کہ ان کے متبادل الفاظ اُردو میں موجود تھے۔ وحید انور کا افسانہ نہ صرف چار مینار کا ہی المیہ پیش کرتا ہے بلکہ سارے ملک میں پھیلے ہوئے انتشار اور فرقہ وریت کا بھی غماز ہے۔

—— مہدی پرتاپ گڑھی، پرتاپ گڑھ

▷ "حرفِ آغاز" کے تحت آپ نے فراق صاحب کی بے اطمینانی کی وجوہ مختصر مگر مدلل بیان کی ہیں۔ احساسِ برتری بڑی عجیب شے ہے شاید تعلّی سے قطع نظر فراق صاحب کے چند اشعار تو برتری کی سرحد کو بھی پار کرتے نظر آتے ہیں:

ختم ہے مجھ پر غزل گوئی دورِ حاضر

یا

سہل تم نے فراق کو سمجھا

یا اس طرح کی کئی اور مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس کا سبب دراصل ان کی زندگی سے متعلق بے اطمینانی و بے زاری تھی۔

یوسف ناظم صاحب کی "جڑواں باتیں" بہت پسند آئیں۔

—— ایوب شاہد، گورکھپور

▷ ماہ اکتوبر ۹۲ء میں آپ کے اداریے نے چونکا دیا۔ آپ نے بڑی صاف گوئی سے کام لے کر یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا ہندستانیت کی تعبیر صرف ان اعتقادات اور رسومات کے دائرے میں رہ کر ہی کی جانی چاہیے جو ہندستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے مروج تھے، حقیقت یہ ہے کہ ریڈیو، ٹی وی، رسائل و اخبارات — غرض تمام ذرائع ابلاغ سے قدیم ... تصورات کو ذہنوں پر لادنے کی ...

جارہی ہے جس سے ہمارے مشترکہ تہذیبی ماحول میں ایک حبس کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ جناب رشید حسن خاں کا مضمون "مشرقی شعریات اور نیاز فتح پوری" تحقیق کے طالب علموں کے لیے بڑی اہمیت کی چیز ہے۔ جناب دلیپ سنگھ کا سفر نامہ "آوارگی کا آشنا" دوسری قسط کے لیے تجسس پیدا کرتا ہے۔ جناب لطف الرحمٰن کی غزل نہایت خوبصورت اور لطیف ہے۔ بہت دنوں کے بعد ایک اچھی غزل پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جناب قیصر اقبال کا افسانہ "مرادوں کا شہر" پوری صدی پر محیط ایک تاریخی آئینہ ہے جس میں ہماری سماجی، سیاسی اور معاشی صورت حال کی جھلکیاں صاف صاف نظر آرہی ہیں۔ اس کی اشاعت شمارے کو مزید اہم بناتی ہے۔

—— صدف جعفری، کلکتہ

▷ اکتوبر کے "حرف آغاز" نے سب سے پہلے توجہ کا دامن اپنی جانب کھینچا۔ فراق صاحب کے جس نظریے کی جانب آپ نے محتاط انداز میں اشارہ کیا ہے وہ غور طلب ہی نہیں بحث طلب بھی ہے۔ آزادی سے پہلے تحریک آزادی کی زیریں لہر کے طور پر یہاں کچھ افراد کے ذہن میں یہ خیال سر ابھار رہا تھا کہ آزادی چاہے جتنی تاخیر سے ملے مگر اس کا پرچم ہمارے ہاتھوں میں ہو اور ملک کی تعمیر نو ہم اپنے خوابوں کے مطابق کرسکیں۔ یہ وہی خواب تھا جس کی تعبیر کی جانب ہمارا ملکی نظام سیاست دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہا ہے۔ البتہ کچھ قارئین نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ اگر اس وقت یہ بحث چھڑ گئی تو آزادی کی منزل دور تر ہو جائے گی اس لیے ان حضرات نے بہ جبر اسے دبا رکھا تھا۔ اب جبکہ ملک آزاد ہو چکا ہے یہ مزاج نمایاں ہو کر سامنے آنے لگا ہے

افسانوں میں قیصر اقبال صاحب کا افسانہ "مرادوں کا شہر" اپنی علامات کی پہلو داریاں دکھا رہا ہے۔ یوسف ناظم صاحب کی تعریف کیا کروں، تعریف تو اس خدا کی ہے جس نے ناظم جیسا فنکار بنایا۔

—— ظفر حبیب، برونی، بیگوسرائے

▷ اکتوبر کے "ایوانِ اردو" میں مظہر امام صاحب کی غزل پڑھ کر ان کی بہت پرانی ایک غزل یاد آگئی۔ خاص کر یہ شعر پڑھ کر:

دو چار گام پر ہے مہِ شب کی پالکی
لمحوں کی سیڑھیوں سے اترنے لگی ہے شام

پرانی غزل کے دو اشعار دیکھیے:

سانحہ یہ بھی اک روز کر جاؤں گا
وقت کی پالکی سے اتر جاؤں گا

سیڑھیوں پر اگر یونہی چڑھتا رہا
ایک دن اپنے اندر اتر جاؤں گا

مظہر امام صاحب محتاط اور چوکنے شاعر ہیں۔ پھر یہ "دہراؤ" کیوں؟

لطف الرحمٰن صاحب کی غزل بہت ہی اچھی ہے۔ بہت دنوں کے بعد ان کی اتنی اچھی غزل پڑھنے کو ملی۔

—— مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

▷ اکتوبر کے "ایوانِ اردو" میں مظہر امام صاحب کی غزل پڑھی۔ اس غزل میں 'شام' کا SYMBOL کس چیز کے لیے استعمال کیا گیا ہے یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے اور شام کی جو حرکات بتائی ہیں وہ بھی عجیب ہی ہیں۔ مثلاً آفتاب وقت کا دم شام کبھی بھر ہی نہیں سکتی اس لیے کہ شام نام ہی سورج کے ڈھلنے کا ہے اور سورج غروب ہونے کا عمل شام کی شروعات ہے۔ دن کا سفر ختم ہونے کے بعد شام کا آنا لازمی ہے۔ وعدے سے مکرنے کا کوئی احتمال نہیں ہوتا ہے۔ اور ریگ رواں کی طرح بکھرنے پر آنکھوں کو موندا جاسکتا ہے لیکن پروں کو سمیٹنا کیوں ضروری ہوا۔ اگر کسی خیالی پیکر کے لیے شام کا لقب استعمال کیا گیا ہے۔ تو وہ کون ہے اس کی طرف بھی کوئی رہنمائی یہ غزل نہیں کرتی ہے۔

—— نثار محمد، دھار

▷ اکتوبر کے شمارے میں یوسف ناظم صاحب کا انشائیہ "جڑواں باتیں" پُر لطف اور چٹ پٹا ہے۔ ناظم صاحب نے بہت ہی سہج پیرائے میں اپنے کھردرے تجربوں کو فن کے بیسن میں لپیٹ کر قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ دلیپ سنگھ کا سفر نامہ بھی ان کے کسی مزاحیہ مضمون سے کمتر نہیں ہے۔ پڑھ کر جی خوش ہوگیا۔ وحید انور کا افسانہ "چار مینار —— چار سو سال" متاثر کرنے والا افسانہ ہے۔

—— محمد حامد، دربھنگہ

▷ دلیپ سنگھ کے مضمون جو "ایوانِ اردو" کے اکتوبر کے شمارے میں چھپا ہے، اس کا خلاصہ یوں ہے:

(۱) آنا ہرچرن چاولہ کا ناروے سے بلانے کے لیے دلیپ سنگھ کو برائے شمولیت ایک تقریب جو ناروے میں ہونی ہے۔ (۲) جانا دلیپ سنگھ کا۔ (۳) بتانا دلیپ سنگھ کا کہ تین بہت بڑے ادیب بلائے گئے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں۔ اور یہ کہ "انشا" نے ان پر گوشہ جاری کیا تھا۔ (۴) بھاگنا دلیپ سنگھ کا تلاش میں مخمور سعیدی اور بلراج کومل کے۔ (۵) پرچہ لکھنے کی تیاری میں جٹ جانا دلیپ سنگھ کا۔

"یہ سفرنامہ" نہیں "شیخی نامہ" ہے۔ آپ اسے خود ستائی نامہ' بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس خط کو شائع فرمائیے گا۔

——— رام لعل نابھوی' نابھا

▷ "ایوانِ اُردو" (نومبر) نظر نواز ہوا۔ اُردو یونیورسٹی کے قیام سے متعلق جنابِ ارجن سنگھ کے حالیہ اعلان پر مختلف حلقوں کی طرف سے پیش کردہ ردِّ عمل کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے جس مسئلے کو اولیت کا درجہ دیے جانے کی بات کہی ہے وہ یقیناً قابلِ غور ہے۔

یہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اُردو یونیورسٹی کے قیام کی سفارش گجرال کمیٹی نے ۱۹۸۰ء کی دہائی کے شروع ہی میں کر دی تھی اور اتنے سال بعد اس کے قیام کی نوید ملی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس کے قیام کے "اعلان" میں اتنے سال لگ سکتے ہیں تو اس کے نفاذ میں اگر اس سے زیادہ سال بھی لگ جائیں تو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

بہر حال ہم حکومتِ ہند کے تازہ اعلانیہ سے بدگمان نہیں ہیں۔

——— محمد فاروق اعظم' بھاگلپور

▷ نومبر کے نثری حصّے میں مشرف عالم صاحب کا افسانہ "ہم تمھیں بھول چکے ہیں منگو" بہت متاثر کن اور پرانی اور نئی پیڑھی کے اندازِ فکر کو نمایاں کرنے والا ہے۔ "گوشۂ کمار پاشی" بمصداق "نام نیک رفتگاں ضائع مکن" ایک اخلاقی فرض کو ادا کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ شعری حصے میں جناب رفعت سروش' جنابِ منظور ہاشمی' اور جنابِ عقیل شاداب اپنی پروازِ فکر میں کامیاب رہے ہیں۔ لیکن ولی مدنی صاحب کا مطلع اور پہلا شعر ہی ساقط الوزن ہیں ——— اس طرح کے اغماض سے مذاقِ سخن مجروح ہوتا ہے۔(۱)

——— کندن لال گردھر' بری والا

(۱) مطلع اور شعر ساقط الوزن نہیں ہیں۔ غالباً آپ کو یہ غلط فہمی اس لیے ہوئی کہ مطلع اور شعر میں لفظ "طرح" الگ الگ تلفظ کے ساتھ باندھا گیا ہے لیکن اس لفظ کے یہ دونوں تلفظ درست ہیں ——— ادارہ

▷ نومبر کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ گوشۂ کمار پاشی بہت مختصر ہے امید ہے جلد ہی ان پر بھر پور گوشہ آپ حضرات نکالیں گے؟

عبدالصمد صاحب کا افسانہ "مضبوط رشتہ" بے حد پسند آیا۔ مشرف عالم ذوقی کا افسانہ اور مشتاق انجم کا افسانہ "کاغذی ہے پیرہن" بھی بہت عمدہ ہے۔ دلیپ سنگھ صاحب کا رپورتاژ پُر لطف ہے۔ سیّد احمد شمیم کا مضمون "ابوالکلام غبارِ خاطر کے آئینے میں" مولانا آزاد کو سمجھنے میں ایک اہم رول ادا کر سکتا ہے۔

——— روشن لال روشن بنارسی' وارانسی

▷ نومبر کا شمارہ موصول ہوا۔ فہرست میں چار افسانے دیکھ کر خوشی ہوئی تھی لیکن پڑھنے کے بعد کسی قدر مایوسی ہوئی۔ شام بارک پوری کا افسانہ "بسیرا" حسبِ معمول کمزور افسانہ ہے۔ مشرف عالم ذوقی کے ادھر کئی افسانے پڑھے۔ ان کا ایک افسانہ "غلام بخش" جو 'ذہنِ جدید' کے گزشتہ شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اسے چھوڑ کر کسی میں کچھ دم نہیں۔ میرے خیال میں انھیں افسانوں کی تعداد سے زیادہ اس بات کی فکر ہونی چاہیے کہ کس طرح اچھّے اور طاقتور افسانے لکھیں کیوں کہ وہ لکھ سکتے ہیں۔ عبدالصمد بھی کوئی تاثر چھوڑنے میں ناکام ہی رہے۔ البتّہ مشتاق انجم کا افسانہ "کاغذی ہے پیرہن" خوبصورت ہے۔ زبان بھی اچھّی لکھی ہے۔ شعری حصّہ بھی اس بار کوئی خاص نہیں۔ ہاں گوشۂ کمار پاشی آپ نے بہت خوب نکالا اور اس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

——— شاہد اختر' کان پور

▷ نومبر کا "ایوانِ اُردو" پڑھا۔ افسانوں میں صرف مشرف عالم ذوقی کا افسانہ ہی افسانے کے معیار پر کھرا اُترتا ہے۔ مضامین بس ٹھیک ہیں۔ شعری حصہ ضرور لائقِ تحسین نظر آیا۔

——— توحید جوہر' بھوپال

▷ نومبر کا شمارہ دیکھا۔ عبدالصمد صاحب اور مشرف عالم ذوقی کے افسانے بے حد اچھے لگے۔ منظور ہاشمی کی غزل دل کو چھو گئی۔ کمار پاشی کا گوشہ بھی اچھا لگا۔ ۱۹۹۲ء میں بچھڑنے والے اعاظم رجالِ ادب کا "ایوانِ اُردو" پر قرض ہے۔ جلد از جلد آپ ان کا قرض اُتار دیں تو اچھا ہوگا اس بہانے قارئین ایک عظیم ادبی دستاویز سے مستفید ہوں گے۔

——— عبداللہ عبدالرحیم مالکی' ارریہ

▷ نومبر کا اداریہ پسند آیا یہ اُردو والوں کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اگر حکومت کے ذریعے اُردو زبان کے فروغ کے لیے کچھ کیا جاتا ہے تو ہم اُسے شک و شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں؟ رفعت سروش' منظور ہاشمی' فراق جلال پوری کی غزلیں پسند آئیں۔ عبدالصمد' شام بارک پوری' مشرف عالم ذوقی کے افسانے معیاری ہیں۔ دلیپ سنگھ کا سفرنامہ دلچسپ ہے۔ اُردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو آپ نے گوشۂ کمار پاشی نکال کر آسودگی بخشی ہے۔ کمار پاشی مرحوم جدید ذہن رکھنے والے ایک ایسے فنکار تھے جنھوں نے اپنی شاعری میں بڑے بڑے تجربات کیے ہیں اس خصوصی گوشے میں ایک کمی ہے وہ

یہ ہے کہ کمار پاشی مرحوم کی شاعری پر مضمون کی شکل میں کچھ دستیاب نہیں ہوتا ہے* اردو ادب کے ناقدوں کو اب پرانے چراغوں کے بجائے نئے چراغوں پر مضامین لکھنا چاہیے اور اس کا آغاز کمار پاشی جیسے جدید بلند مرتبہ شاعر سے کرنا چاہیے۔

—— ملک زادہ جاوید، نوئیڈہ

*اس شمارے میں ان کی شاعری پر بلراج کومل صاحب کا مضمون شامل ہے —— ادارہ

▷ نومبر کا "ایوانِ اردو" پڑھا۔ "گوشۂ کمار پاشی" بے حد تشنہ ہے۔ حالانکہ ان کے فن پر لکھنے والوں کی کمی نہیں پھر بھی نہ جانے کیوں گوشہ خالی ہے پاشی کی شاعری ہم سے تقاضا کرتی ہے کسی خاص نمبر کا آپ مستقبل میں ان پر کوئی خاص نمبر ضرور نکالیں۔

حصۂ منظومات میں رفعت سروش، اظہر نیّر اور عبدالاحد ساز کی کاوشیں پسند آئیں۔

—— بسمل عارفی، سمستی پور

▷ بھائی مخمور سعیدی صاحب، پاشی کیوں چلا گیا اور آپ نے اُسے جانے کیوں دیا؟ اُس کی تمام محبوبانہ ادائیں پسند تھیں یہ ادا پسند نہیں آئی، یہ تو دل دکھانے والی بات ہے، اچانک یہ خبر ملی جب میں چار ماہ بعد ہندستان لوٹا گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ آپ بخوبی جانتے ہیں ہم دونوں ایک دوسرے کو بے حد پسند کرتے تھے، صرف اُسے معلوم ہونے کی دیر تھی کہ دلّی آکر میں کہاں ٹھہرا ہوں بس وہ آپ کے ساتھ میرے پاس پہنچ جاتا تھا اور گھنٹوں ادبیات پر گفتگو کرتا تھا۔ سماج میں جب بھی میں نے کوئی بڑی ذمے داری سنبھالی وہ مجھ سے ملنے ضرور آیا اور لپٹ گیا، ہر بار اتنا خوش ہوا کہ خوشی سے آنسو چھلک آئے۔ میں نے اُس کے کلام کو ہمیشہ پسند کیا اور اُس کے بارے میں لکھتا رہا۔ آپ کا تو یار تھا، اس زمانے میں سب ملتے ہیں یار نہیں ملتے آپ کے گہرے دکھ کو سمجھتا ہوں، صبر کیجیے۔ بڑی دلنواز اور پیاری شخصیت تھی میرے لیے —— مخمور بھائی میں اُس کے جانے کی خبر سے لرز اُٹھا اور رو پڑا اسے کیا ہو گیا تھا، وقت کا ستم ہی ہوگا کہ اُس کے ساتھ اچانک ایسا ہوا۔ پاشی کی بیٹی (چھوٹی) کیا کر رہی ہے؟

مسلسل علاج کے بعد اب کسی قدر صحت بہتر ہے، دل کا معاملہ ہے آپ جانتے ہی ہیں۔ دعا کیجیے۔

—— (ڈاکٹر) شکیل الرحمٰن، نئی دہلی

مظہر امام صاحب کا پتا بدل گیا ہے۔ موجودہ پتا یہ ہے:

مظہر امام، ۱۷۶۔بی، پاکٹ ۱-، میور وہار، فیز ۱-، دہلی ۱۱۰۰۹۱

بقیہ:

اردو خبرنامہ

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے پوری زندگی انتھک محنت کی۔ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے بھی ان کی خدمات ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔ ان کے انتقال سے اردو صحافت کا جو نقصان ہوا ہے۔ اس کی تلافی آسان نہیں۔ ایسے باشعور اور باعمل لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ہم مرحوم کے سوگوار کنبے سے اظہار تعزیت کرتے ہیں اور ان کے غم میں شریک ہیں۔

اُردو اکادمی، دہلی کو اپنے کتب خانے کے لیے علمی اہمیت کی حامل قدیم کتابیں اور مخطوطے درکار ہیں۔ جو حضرات ایسی کتب اکادمی کو دینا چاہیں وہ درجِ ذیل پتے پر خط و کتابت کریں یا ملیں۔

سیکریٹری اُردو اکادمی، دہلی

گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۳۲۷۶۲۱۱، ۳۲۶۳۴۴۸

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:
ایس۔ اشتیاق عابدی، مخمور سعیدی

جلد: ۶ — شمارہ: ۹ | فی کاپی ۵۰ر۳ روپے — سالانہ قیمت ۳۷ روپے | جنوری ۱۹۹۳ء

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی
اُردو اکادمی، دہلی — گھٹا مسجد روڈ،
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سرورق، عکس: ارشد علی خاں

ایس۔ اشتیاق عابدی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی ۲ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

۶ دسمبر ۹۲ء کو ہندوستان کے مقدس شہر اجودھیا میں صرف ایک قدیم مسجد کا انہدام نہیں ہوا بلکہ ہماری وہ تاریخ اور تہذیب بھی منہدم ہو گئی جس کی تشکیل و تعمیر میں صدیاں صرف ہوئی تھیں اور جسے بنانے اور سنوارنے کے عمل میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک رہے تھے؛ اور بد قسمتی سے یہ کام ان لوگوں کے ہاتھوں سر انجام ہوا جو خود کو، ہندوستان میں ایثار اور اخلاق کی روایت کے بانی شری رام کا خصوصی نام لیوا کہتے ہیں۔

ہندوستان جیسے بڑے ملک میں جہاں مختلف مذہبوں اور نسلوں کے لوگ آباد ہیں، باہمی رواداری اور خیر سگالی، پُر امن زندگی کی شرطِ اوّل ہے۔ یہ رواداری اور خیر سگالی، کشادہ دلی اور وسیع النظری کے اُن اخلاقی اوصاف کی ودیعت ہوا کرتی ہے، جن کے سائے میں عظیم تہذیبیں جنم لیتی اور پرورش پاتی ہیں۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن کی جن خوبیوں پر ہم نازاں رہے ہیں، اُن کا سرچشمہ بھی یہی کشادہ دلی اور وسیع النظری رہی ہے۔ ہمارے زمانے کے ممتاز شاعر فراقؔ گورکھپوری جو ہندو فلسفے کے مؤید اور مبلغ بھی تھے، ان کی ایک مشہور غزل کا مقطع ہے:

سر زمینِ ہند پر، اقوامِ عالم کے فراقؔ
قافلے آتے گئے، ہندوستاں بنتا گیا

جس ہندوستان کا خمیر مختلف اقوامِ عالم کی یکجائی اور میل جول سے اٹھا ہے، اگر وہاں رواداری اور باہمی اخوت و محبت کا سرچشمہ خشک ہو گیا یا خشک کر دیا گیا تو یہ ملک ایک بنجر دھرتی بن کر رہ جائے گا جہاں مہذب انسانی زندگی کی نشو و نما مشکل سے مشکل تر ہوتی جائے گی۔

اجودھیا کی بابری مسجد کا انہدام ہندوستانی آئین اور ملک کی عدالتِ عالیہ کے احترام کو بھی زمیں بوس کر دینے کے مترادف ہے۔ اجودھیا ـــــ کے تخریب کاروں کے قدموں تلے ان انسانی حقوق کی بھی پامالی ہوئی جن کی ضمانت ہمارے آئین میں بلا لحاظِ مذہب و ملّت ہندوستان کے ہر شہری کو دی گئی ہے اور عدالتِ عالیہ کے واضح احکامات کی بھی۔ ایک ناعاقبت اندیش اشتعال آمادہ بھیڑ کو، خواہ اس کی تعداد لاکھوں ہی میں کیوں نہ ہو، من مانی کرنے کی کھلی چھوٹ مل جانا، کیا جمہوری ضابطوں اور عدل و انصاف کے تقاضوں کی برملا بے توقیری نہیں ہے؟ موقعے پر موجود پریس والوں کے ساتھ جو بدسلوکی ہوئی وہ مستزاد ـــــ

پھر اس المناک حادثے کے بعد ملک بھر میں جو صورتِ حال پیدا ہوئی وہ بھی کم المناک نہیں ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ کسی فرقے کی عبادت گاہوں پر حملے، مکانوں اور دکانوں میں آتش زنی، گلیوں اور بازاروں میں لوٹ مار، جہاں کہیں بھی ہو اور جس طرف سے بھی ہو، سخت قابلِ مذمت ہے۔ اس کا انسداد اور تدارک ہونا چاہیے۔ سنگین حالات میں مسلح طاقت کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے لیکن یہ استعمال بقدرِ ضرورت اور صرف مجرموں کے خلاف ہی ہونا چاہیے۔ بے گناہ مردوں اور عورتوں، بوڑھوں اور بچّوں پر تشدّد کرنا، ان کی جانیں لے لینا یا انھیں نیم جان کر دینا، سفّاکی ہے اور یہ بھی اسی درجے میں بلکہ اس سے زیادہ قابلِ مذمّت ہے، خاص طور سے اُس حالت میں جب اس کا مظاہرہ مُبیّنہ طور پر امن و قانون کے محافظوں کی طرف سے ہوا ہو۔ یہ شکایت کہ فسادات روکنے کی کوششوں میں جانبداری برتی گئی ہر جگہ سننے میں آئی۔ اور قومی پریس میں بھی اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔

یہ سب کچھ اس وقت ظہور میں آیا جب چند ہفتے بعد ہم اپنے ملک میں جمہوریت کے قیام کی ۴۳ ویں سالگرہ منانے والے ہیں۔ یہ سالگرہ مناتے ہوئے ہمیں ایک بار یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ جن جمہوری اصولوں اور قدروں کی تبلیغ ہم دُنیا کے ہر فورم سے کرتے ہیں کیا آج وہ قدریں اور اصول خود ہمارے یہاں محفوظ ہیں؟

ـــــ ادارہ

نظمیں

یہ کس کی سازش ہے؟

یہ کس کی سازش ہے؟
کس کا خوں ہے؟
یہ کون آمادۂ جنوں ہے؟
یہ کون آگ اور خوں کی ہولی جلا رہا ہے؟
یہ کون تیروں سے کھیلتا ہے؟
یہ کون خنجر بہ کف
اخوّت کا جسمِ نازک کچل رہا ہے؟
یہ کون انسانیت کے خیمے جلا رہا ہے؟
کہ آسماں سے مہیب شعلے برس رہے ہیں
ہوائیں مسموم ہو گئی ہیں
فضاؤں سے خوں ٹپک رہا ہے
زمیں کی چھاتی کو چیر کر نفرتوں کا لاوا اُبل پڑا ہے
ہر ایک ذی روح کے بدن پر
اِک ان کہے خوف کی ردا ہے

منافقت کی برہنگی کیسے حرفِ آغاز بن گئی ہے؟
عدوئے دانش کو کس جفا کار مصلحت نے
کلیدِ دانش سپرد کی ہے؟
عدوئے انسانیت کو کن چیرہ دستیوں نے
حکومتِ کرۂ زمیں سونپ دی ہے
بنیادِ ہست و امکان کھود ڈالی
کہ روئے ہستی سے عکسِ تہذیب کی درخشاں متاع کا
نور مٹ رہا ہے؟
شبانِ دیجور کی سیاہی امڈ رہی ہے
وہ تیرگی ہے — ہر ایک جویائے حق سے
تنویرِ علم و عرفاں کنارہ کش ہے

ساجدہ زیدی

گلبرگ، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ (یو.پی)

گُلِ وعدہ کا موسم

آگیا ہے پھر گُلِ وعدہ کا موسم
اور وہ رنگیں پرندے
جن کے تابندہ پروں پر
لگ چکی ہیں بارہا اِس دلرُبا موسم کی مُہریں
پھر اُنھی کھیتوں کو چُگنے آگئے ہیں
جن کے باعث
وہ برابر عیش فرماتے رہے ہیں...
یہ صدا دھرتی سے اُٹھ کر
آسماں در آسماں لہرا گئی ہے
اے زمین و آسماں کے درمیاں لٹکے ہوئے اُمّید کے زخمی پرندو
آنکھیں کھولو
اور دیکھو
کون آیا ہے تمھیں پیغام دینے
اُن کنواری جنّتوں کا
جو تمھاری آرزو کی ابتدا ہیں
جو تمھاری آرزو کی اِنتہا ہیں...
اِس صدائے وعدہ ساماں کی ادائے دلبرانہ
ہے عمل جس کا برابر جارحانہ
اپنے دل کا راستہ ہموار کرتی جا رہی ہے
کُھل رہی ہیں اُس کے حق میں
کھڑکیاں ہمدردیوں کی
اور دُنیا جانتی ہے
کون لے جائے گا اِس موسم کی بازی
اور کس کی سادہ لوحی
داد پائے گی شکستِ آرزو سے!

اِندر سُروپ دت ناداںؔ

B-3/269، پچھم وہار، نئی دہلی 110063

غلام عبّاس کی فنکاری

عبدالمغنی

پروفیسرس کوارٹرس، سائنس کالج کیمپاؤنڈ، پٹنہ ۵..

"آنندی" بہت مشہور افسانہ ہے اور تنقیدوں میں اس کے حوالے آتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے مصنف، غلام عبّاس کی پہچان بالعموم اسی حوالے سے کی جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ افسانہ نہایت فنکارانہ اور فکر انگیز ہے۔ اس میں صرف ایک واقعہ اس تسلسل، تفصیل اور ترتیب سے بیان کیا گیا ہے کہ قصّے کا ارتقا گویا اپنے آپ ہوگیا ہے۔ یہ ماجرا کی ایک ماہرانہ تشکیل ہے اور اسی سے عروج کی تعمیر بالکل فطری طریقے پر ہوئی ہے۔ ایک شہر کے بازارِ حسن کو شرفا و معززین احتجاج کرکے شہر سے دُور پھینک دیتے ہیں، مگر لال بتّی کے علاقے (ریڈ لائٹ ایریا) پر مشتمل سماج کے لیے خطرے کا یہ نشان ایک بار اُجڑ کر پھر پوری شان سے آباد ہوجاتا ہے، ایک بہت بڑا شہر اس کے گرد بن جاتا ہے، جہاں زندگی کی ساری رونق سمٹ آتی ہے، لہٰذا سماج کی پاکیزگی کے ذمّے دار نئے سرے سے اس طرح دوبارہ احتجاج کرتے نظر آتے ہیں جس طرح انھوں نے پچھلی بار پرانے شہر میں کیا تھا۔ یہ صورتِ حال انتہائی طنز آمیز اور عبرت خیز ہے اور افسانہ نگار کی جانب سے کسی تنقیدی تبصرے یا وعظ و نصیحت کے بغیر بجائے خود پڑھنے والوں کو دعوتِ فکر دیتی ہے، ان کے ذہن کو قصّے کی دلچسپی میں پوری طرح محو کرکے انجام پر یکایک جھنجوڑ دیتی ہے اور وہ گویا ایک خواب سے چونک اُٹھتے ہیں۔ کہانی کا سارا جادو ایک نئی بستی کے بسنے کے مرحلوں اور ان کی جزئیات کی تصویرکشی سے اُبھرتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک سادہ و پرکار، صاف ستھرے، رواں دواں اور شایستہ و پروقار بیان کے اسلوب کی نفاست و نزہت بے ساختہ ہونے کے باوجود بہت نمایاں ہے۔

آنندی ایک ایسی فنّی دستاویز ہے جس کے حسن میں فکر، آب و رنگ کی طرح سموئی ہوئی اور خال و خط سے جھلکی پڑتی ہے۔ صرف ایک واقعہ، زندگی کا ایک جلوہ، موجودہ سماج کا ایک پہلو، جدید تمدّن کی ایک ادا افسانے کا موضوع و مواد ہے اور افسانہ نگار کی ساری توجہ اس پر مرکوز ہے۔ اس موضوع و مواد کی ترسیل کے لیے ایک ایسی ہیئت اور تکنیک اختیار کی گئی ہے جو نہایت تراشیدہ و بالیدہ ہے، درست و چست ہے اور اس تکنیک کو اس چابک دستی سے استعمال کیا گیا ہے کہ کہانی سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایک نقطے پر ارتکاز کے باوجود کہانی کا پس منظر اور تناظر پھیل کر پوری انسانی آبادی، جدید شہریت اور موجودہ تہذیب کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ آنندی ایک شہر ہے، مگر یہ آج کی نئی دُنیا کا آئینہ بن گیا ہے۔ یہ غالب کے بہ قول جزو میں کل اور قطرے میں دجلہ دکھائی دینے کا عمل ہے۔ اس وسعت کی تہہ میں جو یہ تصوّر کارفرما ہے کہ ریڈ لائٹ ایریا پر مشتمل خطرے کا نشان کسی سرزمین پر اسی وقت رونما ہوتا ہے جب لوگوں کے دلوں میں لال بتّی جلنے لگتی ہے وہی دراصل افسانے کا محرّک و مقصود ہے، لیکن اس کی نشاندہی لفظوں میں نہیں، لطیف اشاروں میں کی گئی ہے بلکہ ماجرا پر غور کرنے سے خود بخود ہو جاتی ہے۔ یہی ایمائیت افسانے کی جان ہے اور ایک بڑی فنکاری کی دلیل۔ اس طرح وقت کا ایک سنگین مسئلہ اور اس سلسلے میں افسانہ نگار کے مقصد کی سنجیدگی قصّے کے تار و پود سے اپنے آپ عیاں ہوتی ہے۔ یہ ہے جمالیات و اخلاقیات کی ہم آہنگی، فکر و فن کی کامل پیوستگی۔

غلام عبّاس کا ایسا ہی ایک اور نفیس و لطیف افسانہ "آنندی" نام کے مجموعے میں "حمام میں" کے عنوان سے ہے۔ اس کی ہیروین، فرخندہ بیگم، ایک پراسرار، غم خوار اور دلچسپ کردار ہے۔ اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم۔ لوگ اس کو بیوہ سمجھتے ہیں۔

غربت کے باوجود اس کے گھر پر ہر روز سماج کے چند سمجھدار، ذہین اور بہتری کے خواب دیکھنے والے افراد کا اجتماع ہوتا ہے۔ وہ سب کی خاطر مدارات کرتی ہے اور وہ لوگ بھی اس کی کچھ مدد کرتے ہیں، اگرچہ خود خوشحال نہیں۔ وہ بے چاری

سلائی کرکے گزر اوقات کرتی ہے، مگر اس کی مشین چوری ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک رئیس اس کے یہاں وارد ہوتا ہے اور وہ ٹوٹی ہوئی عورت، جو نماز کی بھی پابند تھی، اس کے ساتھ خفیہ طور سے وابستہ ہو جاتی ہے، اگرچہ وہ اس کا اقرار و اعلان نہیں کرتی اور اس کے یہاں روز جمع ہونے والوں میں بعض اشخاص اس کے معمولات میں فرق سے اندازہ لگاتے ہیں کہ فرخندہ کی زندگی میں کوئی تبدیلی آگئی ہے، جس کا انھیں رنج بھی ہوتا ہے، حالانکہ اس کی بے کسی اور بے بسی ان کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اس کہانی کا عنوان ایک ایسے اُردو محاورے کی یاد دلاتا ہے جس میں طنز کا عنصر ہے، اگرچہ واقعہ صرف غسل کے لیے حمام میں پانی گرم کرکے رکھنے کا ہے۔ یہ افسانے کی لطیف ایمائیت کا ایک پہلو ہے کہ سوال اُٹھتا ہے، طنز کس پر ہے، ایک شخص پر یا سبھی پر؟ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں۔ بہرحال، یہ پورا ماجرا طنز آمیز معلوم ہوتا ہے اور موجودہ سماج کی کمزوریوں اور خرابیوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ بہتری کا خواب دیکھنے والے دوست فرخندہ کے دکھ کا مداوا کرنا تو دور کی بات ہے، اس کو سمجھ بھی نہیں سکے اور فرخندہ بھی اپنی ظاہری استقامت کے باوجود بالآخر شبہات کا نشانہ بن گئی، گویا ایک سلائی مشین کی چوری نے اس کا استقلال ختم کر دیا۔ یہ سب اخلاقی نتیجے پڑھنے والوں کو نکالنے ہیں، جبکہ افسانہ نگار نے اپنی طرف سے کوئی تبصرہ کیے بغیر صرف واقعات بیان کر دیے ہیں۔ یہی غلام عباس کی فنکاری ہے۔ فرخندہ ایک زندہ و یادگار کردار ہے۔

"سیاہ و سفید" بھی ایک خیال انگیز افسانہ ہے۔ مڈل سکول کی ایک قصباتی استانی 'میمونہ بیگم' اپنے بالوں میں ایک آدھ سفید بال دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے، اس لیے کہ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے اور جوانی ڈھل رہی ہے، مگر جب وہ اپنی بہن کے یہاں دلّی جاکر وہاں کی آب و تاب کے پیچھے بے راہ روی کی سیاہی کا ایک جلوہ دیکھتی ہے تو اسے اپنے بالوں میں سفیدی کی جھلک پر کوئی افسوس نہیں رہتا اور وہ اپنی موجودہ صاف ستھری، پاکیزہ و شائستہ اور پروقار زندگی پر گویا قانع ہو جاتی ہے، خواہ اس میں لطف و تفریح اور چمک دمک کی کمی ہو۔ یہ جدید تمدن کی پردہ دری اور موجودہ تہذیب کی شان و شوکت سے ایک سلیم الطبع خاتون کی مایوسی کا افسانہ ہے جسے افسانہ نگار نے پوری فنی چابک دستی سے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں سیاہ و سفید کے عنوان کی ترکیب محاورے کی حد تک رواں ہونے کے ساتھ ساتھ علامت کی طرح معنی خیز ہے۔

"اندھیرے میں" ایک مے خوار باپ کی خوے بد اور ایک پرہیز گار بیٹے کی ایک اشتعال انگیز فضا میں لغزش مستانہ کی کہانی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان عادات کے علاوہ حالات سے بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ اس میں کچھ ورثے کے اثر کی طرف بھی اشارہ ہے۔ "سمجھوتہ" بھی ایسی ہی ایک کہانی ہے، جس میں ایک پاک باز شوہر ایک آبرو باختہ لیکن نادم بیوی کے ساتھ بالآخر اس لیے سمجھوتا کر لیتا ہے کہ بیوی کے رویے سے مایوس یا مشتعل ہو کر اس نے بھی کچھ دنوں ہوس رانی کی تھی۔ "چکّر" ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق تناسخ کے چکّر کو سرمایہ دار اور مزدور یا امیر اور غریب کے درمیان رونما ہونے والے معاشی چکّر کی شکل میں پیش کرتا ہے، جس کا بار غریب مزدور پر اتنا زیادہ پڑتا ہے کہ وہ تناسخ کے اعتبار سے بار برداری کا ایک جانور بن جانے کی تمنّا کرنے لگتا ہے۔ اس میں نہ تو اشتراکیت کی کوئی تبلیغ ہے نہ سطحی پروپیگنڈے کا انداز، صرف سماج کی صورتِ حال اور اس میں غریبوں کی حالت زار کا ایک پُر اثر موقع ہے، گویا انسانیت کی تحقیر پر ایک خاموش احتجاج ہے۔

اسی طرح "ناک کاٹنے والے" میں طوائف اور اس کے چاہنے والوں کی پر درد اور پُرخطر زندگی کی تصویر کشی ہے، جس کو پڑھ کر عبرت حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہی کیفیت "جواری" کی ہے، جس میں جوا کھلانے والے ایک خاص کردار، 'نکّو' کی عیاری اور جوا کھیلنے والوں کی سادہ لوحی کا ایسا تیکھا مطالعہ ہے کہ اس کی روشنی میں جوے بازی کا پورا شغل یا کاروبار مضحکہ خیز نظر آنے لگتا ہے۔ یہ ایک اوّل درجے کا مزاحیہ ہے۔ "کتبہ" اس کے برخلاف ایک علمی و ادبی خاندان اور اس کے ایک غریب وارث کا المیہ ہے، جس میں نام کی تختی کسی مکان کی زینت بننے کے بجائے تعمیر مکان کی حسرت میں مرنے والے کا کتبۂ مزار بن جاتی ہے۔

"ہمسائے" ایک بچّے اور ایک بچّی کی طفلانہ محبّت کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ مناظر فطرت کے حسن کا ایک دل کش مرقع ہے، جس سے افسانہ نگار کے قلم کی چابک دستی کا اندازہ ہوتا ہے، گویا یہ قلم مصوّر کا موے قلم بن گیا ہو اور اس نے ہلکے ہلکے رنگوں اور چھوٹی چھوٹی لکیروں سے ایک مختصر سے کینوس پر نہایت عمدہ، رنگین و زرّیں تصویریں کھینچ کر رکھ دی ہوں۔ چند جھلکیاں دیکھنے کے لائق ہیں:

"اس پھلواری کے سرے پر لکڑی کا ایک بنچ رکھا تھا۔ اس پر بیٹھیے تو نیچے وادی کا حسین مگر اُداس اُداس منظر دکھائی دیتا۔ جتنی دیر سورج غائب

رہتا، ہلکی ہلکی نیلی دھند مرغولی کے جالے کی طرح اس منظر پر چھائی رہتی اور ایسا نظر آتا جیسے پانی میں عکس دیکھ رہے ہوں۔ جب سورج نکلتا تو دھند یکا یک سنہری ہوکر اس مرقع کو اور بھی حسین بنا دیتی مگر چند ہی لمحوں کے بعد آنکھوں میں چکا چوند ہونے لگتی اور دیکھنے والا جلد ہی اپنی نظریں پھیر لیتا۔" (ص ۳۰)

"... اس کے بعد اس کی نظر سامنے ڈیلیا کے پودے پر پڑی جس میں ایک بڑا سا سُرخ پھول صبح کی سُنہری دھوپ میں بڑی تمکنت سے جھم جھما رہا تھا..." (ص ۳۱)

"... سورج اب لمبے لمبے پیازی بادلوں کو پیچھے چھوڑ کر پہاڑیوں کے جھرمٹ سے نکل آیا تھا اور اس نے نڈر ہوکر اپنا سفر طے کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دھند جو نچلی وادی پر چھائی ہوئی تھی دھیرے دھیرے دھوپ میں تحلیل ہو رہی تھی اور نیچے کا منظر لمحہ بہ لمحہ نکھرتا آ رہا تھا..." (ص ۳۳)

"آسمان پر رفتہ رفتہ بادل پھر چھا گئے۔ اب کے بادل بہت گھنے اور قریب تھے۔ چنانچہ ہر طرف بھاپ ہی بھاپ پھیل گئی جس نے ہر چیز کو اوجھل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دم زور کا جھماکا پڑنے لگا۔" (ص ۴۱)

"دور افق کے پاس وہ پہاڑیاں جو عموماً بادلوں کے غبار میں کھوئی کھوئی رہتی تھیں اچانک مطلع صاف ہو جانے سے اب واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔ وہ دور تک ایک کے پیچھے ایک اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے شرمیلی لڑکیاں بڑی عمر کی لڑکیوں کی اوٹ لے کر جھانک رہی ہوں۔ بعض پہاڑیاں ہری بھری تھیں اور بعض ٹنڈ منڈ مگر وہ آپس میں ایسی خلط ملط ہو رہی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی لحاف کو بے ترتیبی سے ہٹا کر اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور لحاف کی کہیں تو اوپر کی سبز مخمل دکھائی دے رہی ہے اور کہیں اندر کا فاستری استر۔" (ص ۴۴)

"ذرا سی دیر میں سورج ڈوب گیا اور آس پاس کی پہاڑیاں قرمزی بادلوں میں کھو گئیں۔ نیچے وادی میں جا بجا سفید دھوئیں پھوٹ رہے تھے۔ درختوں کی چوٹیوں سے، مکانوں کی چھتوں سے، پہاڑیوں کی ڈھالوں سے جس سے وادی کا منظر دھندلا دھندلا ہو گیا تھا۔" (ص ۴۷)

یہ اقتباسات صرف منظر نگاری کا کمال دکھانے کے لیے نہیں پیش کیے گئے۔ ان کے پیش کرنے کا خاص مقصد بحیثیت افسانہ نگار عبّاس کے اسلوبِ نگارش پر روشنی ڈالنا ہے۔ یہ ایک نہایت فصیح و بلیغ شستہ و رواں طرز بیان ہے، جس میں بڑی بے ساختگی سے، موزوں ترین لفظوں میں، جزئیات نگاری کرکے موثر ترین تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ فطرت کے مناظر کو انسانی تشبیہوں سے مزید خوب صورت اور مانوس بنا دیا گیا ہے طرزِ تحریر کی یہ خصوصیت قدرتی مظاہر کے علاوہ انسانی تعلقات، معاملات اور واقعات کے بیان میں بھی پائی جاتی ہے، جس سے مشاہدے کی باریکی اور مطالعے کی گہرائی کے ساتھ ساتھ قدرت بیان اور ندرت اظہار کا ثبوت ملتا ہے:

"سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصے میں کتبے نے کئی جگہیں بدلیں۔ کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر۔ کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چارپائی کے نیچے کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے بکس میں۔ ایک دفعہ کسی نے اٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چلا تھا۔ اٹھا کر دھویا پونچھا اور بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔ مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیے گئے۔ جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیے تھے۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب کاغذی پھولوں کے سُرخ سُرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھری دہک اٹھی تھی۔" (ص ۱۶۲ - ۱۶۱ کتبہ)

"کبھی کبھی شام کو دوسری استانیوں کے ساتھ اسکول سے باہر چہل قدمی کرنے بھی جاتی مگر اس سے اسے کوئی لطف حاصل نہ ہوتا۔ بھلا قصبے میں اس کی دلچسپی کی کیا چیز ہو سکتی تھی۔ مرد اکھڑ اور ان پڑھ۔ عورتیں میلی کچیلی اور زبان دراز سڑکیں کچی اور گرد آلود۔ اور مکان مٹی کے بنے ہوئے بے ڈھنگے۔ بعض دفعہ کسی امیر زمیندار کی لڑکی کی ماں اسے اور دوسری استانیوں کو کھانے پر بلا لیتی۔ یا کبھی کبھی دو چار استانیاں مل کر کپڑا وغیرہ خریدنے شہر چلی جاتیں۔ اس کے سوا اس کھلے بندی خانے سے نکلنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی اس بے رنگ زندگی سے سخت دل برداشتہ ہو جاتی۔ مگر پھر سوچتی ابھی عمر پڑی ہے۔ کیا پتا کوئی بہتری کی صورت نکل آئے... اسی طرح دس سال بیت گئے تھے۔"
(ص ۲۰۹، سیاہ و سفید

"رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے لگی اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آ کر بر تیار نہ ہوئی تھیں اب اس کی یہ دن دونی رات

پھولتی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمین خرید ان بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اس وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایے پر اٹھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔"

(ص ۵۲-۲۵۱ آنندی)

یہ اقتباسات سماج اور اس کے افراد کے بظاہر خارجی مشاہدوں پر مبنی معلوم ہوتے ہیں اور وہ یقیناً ہر صورتِ حال کی ظاہری سطح کی عکاسی بہ خوبی کرتے ہیں، ہر منظر کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں، چند جزئیات سے واقعات کی مؤثر صورت گری کر دیتے ہیں۔ لیکن بہ نظرِ غور دیکھا جائے تو موضوع کی مناسبت سے متعلقہ اشخاص یا مواقع کی کیفیات کی نقاشی بھی سیدھے سادے بیانات اور تجزیات سے ہو جاتی ہے۔ "کتبہ" ایک کردار، شریف حسین کی زندگی کا ایک تعویذ بن گیا ہے اور وہ اسے بے حد عزیز رکھتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے، تاکہ مستقبل کے خوش آئند خواب کی تعبیر نکلے تو وہ اس کتبے کو اس کی صحیح جگہ پر نصب کر دے۔ یہ کتبہ اس کی حسرتِ تعمیر کا ایک نشان بن گیا ہے۔ لہٰذا کتبے کے رکھے جانے کی بدلتی ہوئی جگہوں کا جو بیان ہے وہ درحقیقت شریف حسین کی معیشت و معاشرت کے ساتھ ساتھ اس کی نفسیات پر بھی ایک لطیف قسم کی روشنی ڈالتا ہے۔ اس طرح خارجی مشاہدے کے بیان میں داخلی مطالعے کی شان بھی بالواسطہ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ غلام عباس کے فن کی ایمائیت کی ایک اور دلیل ہے۔

دوسرے اقتباس میں ایک قصباتی استانی میمونہ بیگم کے حالات اور نفسیات کی نشاندہی قصباتی زندگی کی اکتا دینے والی یکسانیت کی تصویر کشی سے کی گئی ہے۔ بیان کی واقعیت ہی اس سلسلے میں انسانی ذہن کی کیفیت پر دلالت کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت پسندی ہے جس میں ایک قسم کی علامت نگاری کے انداز پائے جاتے ہیں، کوئی معمہ اس مقصد کے لیے ترتیب نہیں دیا جاتا، صرف واقعات بیان کیے جاتے ہیں اور اس سے متعلقہ کردار کی ذہنی کیفیت کی غمازی ہوتی ہے، اس کی اکتاہٹ کی توجیہہ اور تشریح ہو جاتی ہے، گویا اس کے شعور بلکہ لاشعور کو آئینہ دکھایا گیا ہو، اس میں واقع ہونے اور پروان چڑھنے والی ایک الجھن کی بالواسطہ عکاسی کی گئی ہو۔ یہ دراصل قصہ و ماجرائی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہوئے نفسِ انسانی میں پڑنے والی گرہوں کو کھولنا ہے۔ یہ بیانیہ کی وہ دلکشی ہے جس میں فکری عنصر از خود، بالکل فطری طور پر، شامل ہو جاتا ہے اور واقعات کی تہوں میں احساسات کی جھلکیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اس سے مہارتِ فن کا اندازہ ہوتا ہے۔

تیسرے اقتباس میں آنندی نام کے ایک نئے شہر کو مخصوص حالات میں بستے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ بظاہر تمدن کے عمرانی پہلو کی نشاندہی ہے، مگر اس میں عام انسانی نفسیات کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس میں آنندی شہر کے کردار کی تعمیر کا نقشہ ہے، مگر اس کے پیچھے سماج کی جو نفسیات کام کر رہی ہے اس کا پرتو بھی اس تعمیر پر لازماً پڑ رہا ہے، جس کی طرف ایک واضح اشارہ بیسواؤں کی آبادی کے ذکر سے ہوتا ہے۔ سماج کے ذمے داروں نے کسی شہر میں بیسواؤں کا ایک محلہ اجاڑ دیا تو شہر سے دور بیسواؤں کا جو نیا محلہ آباد ہوا اس کے گرد ایک پورا نیا شہر ہی بس گیا اور سماج کے ذمے دار اس کی تعمیر اور آبادی کو روک نہیں سکے، اس لیے کہ عام لوگ صرف اپنی روزمرہ کی ضروریات کے مطابق کسی خاص جگہ، جو ان کے لیے سازگار ہو، بود و باش اختیار کر لیتے ہیں، حد یہ ہے کہ تعلیمی، تہذیبی اور مذہبی و اخلاقی سبھی ادارے ایک بنتے اور بڑھتے ہوئے شہر میں اپنے آپ پیدا ہو جاتے ہیں، خواہ اس کی بنیاد جس طرح پڑی ہو۔ یہ ایک واقعہ بھی ہے اور ایک سبق بھی۔ انسانی آبادی کی اس نوعیت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اخلاق و کردار کی حفاظت کے لیے درحقیقت دلوں کی دنیا آباد ہونی چاہیے، آدمی کے اندر تبدیلی ہونی چاہیے، اس کا ضمیر بیدار اور شعور بالیدہ ہونا چاہیے۔ یہ سب نکتے صرف شہر کے طرزِ تعمیر سے نہیں، بلکہ اس کے سیاق و سباق سے بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ اقتباس بہرحال ایک افسانے کا ہے جس کا خاتمہ بڑے عبرت خیز انداز سے ہوا ہے، جبکہ اس کی ابتدا ہنگامہ خیز تھی۔ یہ ماجرا کے مربوط ارتقا کا ایک پہلو اور نشان ہے۔

بیانیہ کی ان خوبیوں میں سموئی ہوئی کردار کی پختگی اور مکالموں کی چستی بھی ہے، اگرچہ افسانہ نگاری کے فن میں اصل اہمیت ماجرائی تعمیر، واقعات کی ترتیب اور نقطۂ عروج کی ترکیب کی ہے، اس لیے کہ کردار و مکالمہ ڈراما نگاری کے خصوصی و امتیازی عناصر ہیں۔ بہرحال غلام عباس کے افسانوں میں "جواری" کا نکو "کتبہ" کا شریف حسین "حمام میں" کی فرخندہ بیگم "چکر" کا

چیلارام اور "سیاہ وسفید" کی میمونہ بیگم چند اہم، دلچسپ اور یاد رہنے والے کردار ہیں، اگرچہ ان کی جو کچھ معنویت ہے وہ متعلقہ ماجرا کے اندر ہی ہے، اس کے باہر نہیں۔ یہ اشخاص بالکل جزوِ قصّہ ہیں اور قصّے سے الگ ان کے وجود کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ دیگر افسانوں میں تو کوئی ایک کردار نمایاں ہوتا ہی نہیں، بس قصّے کی روانی میں ابھرتا ڈوبتا رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غلام عبّاس کے فن میں جو کچھ اہمیت ہے وہ ماجرا کے ارتقا اور قصّے کے بیان کی ہے۔ وہ صرف اپنی قصّہ گوئی کی قوّت اور بیان کی قدرت و ندرت سے ایک طلسم پیدا کردیتے ہیں۔ ان کی ساری توجہ آئینہ سازی پر مرکوز ہوتی ہے، جس میں مختلف چہروں کا عکس وقتاً فوقتاً پڑتا رہتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ چہروں کے پیچھے کام کرنے والی نفسیات کا بھی۔ فن کار ایک صاف وشفاف آئینہ بناکر سامنے رکھ دیتا ہے، جس میں اشخاص قصّہ کے ظاہری و باطنی نقوش تو رونما ہوتے ہی ہیں، قارئین بھی اپنی کیفیات کا کچھ عکس اس میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ لطیف جلوہ سامانی ہی غلام عبّاس کے نگارخانۂ فن کا امتیازی وصف ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام عبّاس ایک سچّے، کھرے، پکّے اور پورے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی نظریہ و نظام سے وابستہ نہیں، یا زندگی کے معاملات میں بالکل غیر جانب دار ہیں، مسائل حیات سے بے پروا محض اپنی ذات میں مست اور فقط فن پرست ہیں۔ ان کے افسانوں کے اشارات اور مضمرات سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی مثبت قدروں سے وابستہ ہیں، معاشرت کے حقایق سے واقف ہیں اور تہذیب وتمدن کے حالات سے آگاہ۔ ان کی ایک فکر ہے، ان کا کوئی تصوّرِ حیات اور زاویۂ نگاہ ہے، جس کے مطابق وہ افراد اور سماج دونوں کے واقعات وکیفیات کا مشاہدہ ومطالعہ کرتے ہیں اور اگرچہ کوئی معاشی و نفسیاتی یا عمرانی وسیاسی تجزیہ نہیں کرتے، مگر ماجرا کی ترتیب اس طرح کرتے ہیں کہ قاری کا تأثر غیر محسوس طریقے پر ان کے نقطۂ نظر کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ بہ یک وقت سماجی حقیقت نگاری بھی ہے اور اوّل درجے کی فنکاری بھی۔

غلام عبّاس عام طور پر اپنے کرداروں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ یہ زیادہ تر اوسط درجے یا متوسط طبقے کے محروم مجبور انسان ہیں، جن کی تمنّائیں بھی ہیں، حسرتیں بھی، وہ ہر حال میں زندگی سے بھرپور اور اس کی مشکلات سے نبرد آزما ہیں۔ بعض اوقات کچھ عیار، پُر اسرار اور سرمایہ دار یا اجارہ دار قسم کے لوگ سامنے آتے ہیں تو غلام عبّاس ان کی مذمّت یا ان کے خلاف وعظ کرنے کے بجائے انھیں لطیف انداز کے طنز و مزاح کا موضوع بنادیتے ہیں، جس میں تمسخر سے زیادہ ظرافت کی بو باس ہوتی ہے۔ یہ حالات کے تیکھے مطالعات ہیں، جو افسانہ نگار کی نگاہ کی تیزی اور اس کے قلم کی چستی سے بہت دلچسپ، بامعنی اور فکر انگیز بن جاتے ہیں۔ یہ طرفداری نہیں، معاملہ فہمی، حقیقت شناسی اور بصیرت مندی نیز درد مندی ہے۔ اس میں ایک مثبت اخلاقی رویّہ یا انداز نظر برابر نمایاں رہتا ہے۔ آنندی فحاشی کی تائید نہیں، اس کی بنیادی اور حقیقی اصلاح کی طرف اشارہ ہے۔ سیاہ وسفید عیاشی کی حمایت کے بجائے اس کے خلاف سلیم الطبع اور سلامت روی کا ردّ عمل ہے۔ حمام میں ایک غریب عورت سے ہمدردی کے باوجود اس کی کسی لغزش پر تنبیہ ہے۔ سمجھوتہ بدکاری کے ساتھ مفاہمت نہیں، اس کے نتیجے میں نیکوکاری کا سبق ہے۔ جواری کے کردار کو مضحکہ خیز بنادیا گیا ہے۔ اندھیرے میں شراب کی ترغیب نہیں، اس کی طرف رغبت پر انتباہ ہے۔ چکر برملا غریب و مزدور پر رحم اور امیر و سرمایہ دار پر غضب کے جذبات ابھارتا ہے۔ ناک کاٹنے والے میں طوائف کے پیشے کی خطرناکی اور اس کے چاہنے والوں کی غنڈہ گردی کا ایک خاکہ ہے۔ ہمسائے بلاشبہ ایک رومانی افسانہ ہے، لیکن یہ بچپن کی بہت ہی معصوم، فطری، بے ضرر اور دلکش محبّت کا قصّہ ہے۔

غلام عبّاس اپنے ہم عصروں میں کرشن چندر کے نظریاتی رویّے اور راجندر سنگھ بیدی کے فنّی طریقے کے درمیان ایک توازن کی مثال پیش کرتے ہیں۔ تکنیک اور ہیئت کی تراشیدگی میں وہ بیدی سے کسی طرح کم نہیں، جب کہ فکر اور موضوع کی بالیدگی میں وہ کرشن چندر سے ذرا بھی پیچھے نہیں۔ ان کے یہاں منٹو کی بے ساختگی بھی ہے اور احمد ندیم قاسمی کی پرداختگی بھی۔ بیشتر روؤں میں وہ پریم چند کے مانند ایک فطری قصّہ گو اور اخلاق پسند ہیں، گرچہ ان کے موضوعات میں زیادہ تنوع اور فن میں زیادہ دبازت ہے۔ بعد میں آنے والوں کے درمیان تنوع میں قرۃ العین حیدر ان سے مشابہ ہیں، مگر خاتون افسانہ نگار کے فن میں ارتکاز کم اور وفور زیادہ ہے، جس نے آگے بڑھ کر ان کے ناولوں میں اپنے اظہار کا ایک بہتر سانچہ ترتیب دیا۔ یہ بات بہرحال قابلِ ذکر ہے کہ بیدی کی طرح اعلیٰ فنکاری کے ساتھ ساتھ غلام عبّاس نے بیدی سے زیادہ فکری استقامت اور اخلاقی متانت کا ثبوت دیا ہے اور کرشن چندر کے مانند انسانی دردمندی

ے باوجود غلام عباس نے کبھی فن کی نزاکت کو مجروح ہیں ہونے دیا، جب کہ یہ احتیاط و انضباط کرشن ندر کے یہاں نہیں ہے، لیکن غلام عباس کا فنی ظم وضبط کسی تکلف یا تصنع کا نتیجہ نہیں، ایک لکل قدرتی و فطری فنکارانہ احساس کا نمونہ ہے۔ سب سے بڑھ کر غلام عباس کی نثر اور طرز تحریر سین اور پرکار ہونے کے ساتھ ساتھ سادہ و بے ساختہ ہے۔ یہ افسانہ نگاری کے لیے موزوں ترین ،انچے میں ڈھلا ہوا، درست و چست، ہموار و ستوار اور پُروقار اسلوب ہے۔

جہاں تک راقم السطور کی معلومات کا علق ہے، افسانے میں غلام عباس، شاعری میں مجاز کی طرح، ایک مجموعے کے فنکار ہیں، لیکن غلام عباس متعلقہ صنفِ ادب کے بہترین اصولوں اور مونوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کی اعلیٰ معیاری تخلیقات کلاسک کا درجہ رکھتی ہیں۔ تاریخِ ادب س سوال کا جواب نہیں دے سکتی کہ اگر غلام عباس کے افسانوں کے مزید مجموعے، جیسے مجاز کے اشعار کے مزید مجموعے، مرتب ہو سکتے تو ان کا قطعی مقام متعلقہ صنف میں کیا ہوتا؟ یہ کہنا کافی نہیں ہوگا کہ غالب کی طرح ایک ہی دیوان مرتبے کے تعین کے لیے بہت ہے یا قوتِ فن کا سراغ چند تخلیقات سے بھی مل سکتا ہے۔ اوّل تو مرتبہ و مقام کے تعین کے لیے قوت کا پوری طرح عمل میں آنا ضروری ہے، دوسرے غالب کا اُردو دیوان درحقیقت ان کے فارسی دیوان یا کلیات کے ساتھ مل کر ہی ان کی فنی شخصیت و حیثیت کی وضاحت کرتا ہے، خاص کر اس دور کے اعتبار سے جس میں غالب نے شاعری کی، جب فارسی کلام کی دُنیائے اُردو میں بڑی اہمیت و وقعت تھی۔ پھر یہ بھی ہے کہ غالب کا متداول دیوان دراصل ان کا پورا کلام نہیں، منتخب کلام ہے۔

بہر حال، یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اپنے ہم عصروں کے درمیان غلام عباس، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ ساتھ، اُردو افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں، اپنا مقام رکھتے ہیں اور اُردو کے کلاسکی افسانہ نگاروں میں ان کا شمار یقینی ہے۔ انھوں نے قدرِ اوّل سے کمتر کوئی چیز کبھی نہیں لکھی۔ "آنندی" کے دس افسانوں میں "ہمسائے"، "کتبہ" اور "جنجر" کی طرح چھوٹے سے چھوٹا افسانہ بھی اپنی جگہ مکمل و موثر ہے، جب کہ "آنندی" "سیاہ و سفید" اور "حمام میں" جیسے بڑے افسانے تو نہایت کامیاب، بھرپور اور پُراثر ہیں ہی۔ ویسے حجم کے لحاظ سے "آنندی" اور "حمام میں" کے سوا باقی سب افسانے متوسط اور اوسط قسم کے ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً تمام افسانے فن کی کلاسکی تکنیک اور ہیئت کے مطابق زمان و مکان و تاثر کی وحدت ثلاثہ کی حدود میں صرف ایک ایک جلوۂ حیات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ غلام عباس کا فن بے خطا، کامل اور اعلیٰ ہے۔ اُردو کا کوئی دوسرا افسانہ نگار فن کی لطافت و نفاست میں ان پر سبقت نہیں لے جا سکا ہے۔ آج کے جدید افسانہ نگاروں کے لیے غلام عباس کی فنکاری ایک نمونے کی چیز ہے۔

غزل پارہ

ں طرف کیسی ہوا ہے، یہ پتا رکھنا ہے
ہر یہ طے کرنا ہے کس رُخ پہ دیا رکھنا ہے

ماؤں تو چھن ہی گئی ہم سے چناروں والی
ب اِسی نیم کے سائے کو، گھنا رکھنا ہے

ہ جو انجام کا موسم ہے، نظر میں ہے مگر
ر کچھ روز مجھے خود کو ہرا رکھنا ہے

ں کا اندازہ تو ہو، اُس پہ گزرتی کیا ہے
ر کچھ دیر مجھے، اُس کو خفا رکھنا ہے

دِی لے جائے اُٹھا کر تو اُٹھا لے جائے
ی دہلیز پہ پھر ایک دیا رکھنا ہے

س کے آنے کا کوئی وقت نہیں ہے، نظمی
ت بھر مجھ کو یہ دروازہ کھلا رکھنا ہے

اختر نظمی

ظفر غوری

بستی بستی کس کے ستائے پھرتے ہیں
چپ کا صحرا دل میں چھپائے پھرتے ہیں

پاؤں تلے دیکھیں، کس کو یہ فرصت ہے
لوگ زمیں کو سر پہ اٹھائے پھرتے ہیں

وقت نے ہم کو، ہم نے وقت کو قتل کیا!
دونوں اب کیوں آنکھیں چرائے پھرتے ہیں

ماضی سے ہم حال کا رشتہ توڑ چکے
مستقبل سے آس لگائے پھرتے ہیں

سیکھ رہے ہیں جینے کی اک طرز نئی
اپنوں میں اب بن کے پرائے پھرتے ہیں

گھٹا گھری ہے کوئی سائباں تلاش کرو
بلائیں ڈھونڈ رہی ہیں، اماں تلاش کرو

طلوعِ فکر کی خاطر نئے اُفق ڈھونڈو
نئی زمین، نئے آسماں تلاش کرو

جھلس نہ دے کہیں یہ تیز دھوپ لہجے کی
گھنیری چھاؤں سی کوئی زباں تلاش کرو

جدھر نگاہ اُٹھاؤ بس ایک ہی منظر
یہ دشتِ خوں ہے تو پانی کہاں تلاش کرو

کچھ ایسے نقشِ قدم ہیں جو بولتے بھی ہیں
جو سُن سکیں انھیں، وہ سارباں تلاش کرو

جو بِک سکو تو چلو ڈھونڈو مصر کا بازار
وبالِ دوش ہو سر تو سناں تلاش کرو

ملکہ نسیم

۱۴۱/۱۱۱۳ • محلہ خورجے والا، دولت گنج لشکر، گوالیار ۴۷۴۰۰۱ (ایم پی)
۲۴۴، سرائے کائستھان، پاٹن پول، کوٹہ (راجستھان)
ایف ۱۲، فوریسٹ کالونی، چار املی، بھوپال ۴۶۲۰۱۶

کٹے پرندے

شوکت حیات

ڈاکٹر مہابیر بھون، مہندرو، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

بیوی نے اس کی طرف اخبار اُچھال دیا۔
"لو اپنی آنکھیں خراب کرو . . . اور بڑھاؤ
ؤ!"

اس نے چشمہ درست کرتے ہوئے اُداس
ھوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ کچھ ہی دیر پہلے
سو کر اُٹھا تھا اور بے قراری سے اخبار کا انتظار
رہا تھا۔ اس کی نگاہیں تیزی سے اخبار کے پہلے
ے پر ایک خاص خبر ڈھونڈنے لگیں۔

اس کے صحافی دوست نے اس سے خاص
ر پہ کہا تھا۔

"یار! کل کا اخبار ضرور دیکھنا . . .' بڑی
ت اور عرق ریزی سے ایک خاص رپورٹ تیار
ہے:

"گرفتار شدہ نوجوان کو ٹرکوں میں بھر کر
علوم سنسان مقام پر لے جایا گیا۔ ایک ایک
ے سب کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔ لاشیں دریا
ں بہادی گئیں۔ دریا کا پانی سُرخ ہونے کے بجائے
سیاہ ہوگیا ——

میں نے جان پر کھیل کر مقتولین اور قاتلوں
ے ناموں کا پتا لگایا ہے۔ دیکھنا ہنگامہ ہو جائے
ا۔ دھوم مچ جائے گی۔ مری یہ رپورٹ اخبار کی
ہلی خبر بنے گی۔ ڈیئر! میں نے تھوڑے وقت میں
مواد فراہم کردیا ہے، اس کی تہہ تک پہنچنے میں
یشن کو ایک زمانہ لگے گا!"

اس کا دوست بہت حوصلے اور جوش سے کہتا جا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اب اس نے اسے داد دینا بند کردیا تھا۔ ایک زمانے سے اس کا یہ دوست جیسے ملک کا مقتدر صحافی بننے کی دھن تھی؛ اسی طرح اپنی مختلف خبروں کی کہانیاں سناتا رہتا:

"آدھی رات میں چپکے سے ایک فرقے کے لوگوں نے بیس جھونپڑوں کی آبادی والے علاقے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ چشم زدن میں آگ لگا دی۔ جو کسی طرح جان بچا کر آگ کے شعلوں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے، انھیں گولیوں سے بھون دیا۔"

" وہ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتوں کے نگہبان بن گئے تھے . . . اپنے پسینے کی رفعتوں سے آشنا ہو چکے تھے۔ ہجرت کی لڑائی ان کے سامنے تھی۔ انھیں تھانے کے رجسٹر میں مجرموں کی حیثیت سے درج کیا گیا۔ ان کے دیسی ہتھیار چھین لیے گئے۔ لیکن ان کا اصلی ہتھیار، جو سینہ بہ سینہ منتقل ہونے کی طاقت رکھتا تھا، وہ نہیں چھین سکے۔ انھیں گھنے جنگلوں میں لے جایا گیا۔ پیڑوں سے باندھ دیا گیا۔ ہاتھ ہلانے تک کی انھیں مہلت نہیں دی گئی۔ ان کا ونسٹر کی ہر کہانی کا پلاٹ کچھ اسی طرح کا تھا —— ایک کے بعد دوسری —— سینے کی صفیں گولیاں کھانے کو موجود رہتی تھیں۔ ان کا کوئی انت نہیں تھا۔"

"وہ نازک سی خوبصورت عورت درگا کا روپ دھارن نہیں کرسکی۔ اس کا مرد اس کے کمرے میں مردہ پڑا تھا۔ گھر کے دیگر مردوں اور عورتوں نے اسے قربانی کی عظمتوں سے واقف کرایا۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو زبردستی اسے نشہ آور محلول پلانے کے درپے ہوگئیں —— بھاگتے بھاگتے وہ غلّے کی بوریوں والے کمرے میں چھپ گئی۔ بلی پر چڑھائے جانے والے جانور کی طرح خوف سے سہمی دبک کر بیٹھ رہی —— ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے جس دیور نے اسے اندھیرے میں پہلی بار دبوچا اس نے عجیب کیفیتوں سے مغلوب ہو کر اس کے ساتھ منہ کالا کیا۔ پھر تانتا لگ گیا —— کافی دیر بعد ہزاروں کا مجمع اس کے اردگرد نعرے لگا رہا تھا —— ستی میّا کی جے ——
جلتی ہوئی عورت پوری قوت سے آگ کی لپٹوں سے بھاگ جانا چاہ رہی تھی۔ لیکن آدمیوں کے ہاتھوں کی بڑی بڑی لکڑیوں کی بے رحم ضرب نے اسے مجبور کردیا۔"

اس طرح کی متعدد خبریں وہ مختلف
یوں سے اسے سناتا۔ لیکن آج تک اس
دئی رپورٹ نمایاں خبر کی حیثیت حاصل نہیں
ی۔ وہ بولنے پر آتا تو بولتا ہی چلا جاتا . . .
کا چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ پیشانی کی رگیں تننے
ں۔ اس کی باتوں پر ہنکارا وہ اب بھی بھرتا
ا گرم جوشی ختم ہوگئی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ
ں کا دوست اس کی سرد مہری سے بد دِل
اتے لیکن اسے پہلے کی طرح حوصلہ افزائی کی
ہ کرنے سے اذیّت ہوتی۔

اس نے صحافی دوست کو بتایا کہ
مل وہ اپنی صحافت میں اصلی حقایق کو کھنگال کر
ہ لے آتا ہے جب کہ سستر خبروں میں جگہ
نے کے لیے انھیں خوبصورتی سے چھپانے
م کرنے کے آرٹ کو برتتے ہوئے سنسنی پیدا
نے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سنسان مقام پر گرفتار شدہ نوجوانوں
لی مارنے اور دریا میں پھینکنے کی خبر پہلے
، پر جلی حروف میں نہیں چھپی۔ بہت ــــــ
نڈنے پر اندر کی جانب ایک کونے میں چھوٹے
ے کے طور پر ملی جو کاٹ چھانٹ کر شائع
ی تھی۔ قاتلوں اور مقتولین کے ناموں کے
ر۔

وہ خود صحافی نہیں تھا اور نہ اس
کا رپورٹر۔ مرنے والوں میں اس کا کوئی
رشتے دار بھی نہیں تھا۔ لیکن نہ معلوم کیوں
نے اپنے اندر کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس کیا۔ پورے
دمیں عجیب سی اذیّت ناک ٹیس ـــــــ
دنوں زندگی سے اس کی بیزاری بڑھتی
ہی تھی۔ اخبار سے دلچسپی بھی کم ہو رہی تھی
ـــ بیوی کو اس کی ان بدلی ہوئی کیفیتوں

کا علم نہیں تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی صبح اخبار پڑھنے کے لیے ہوتی ہے۔

بیوی نے چائے کی پیالی لاکر رکھ دی۔ چائے رکھنے اور جھٹکے سے فوراً مڑ کر باورچی خانے کی طرف چل پڑنے کے انداز سے اس کے غصّے کا اظہار ہو رہا تھا۔ جھنجلاہٹ میں اس نے بسکٹ کے لیے ضد کرتے ہوئے بچّے کو ایک طمانچہ بھی جڑ دیا۔ بچّہ اس کی بغل میں کھڑا ہو کر بلکنے لگا۔

اسے لگا کہ بیوی کی جھنجلاہٹ واجب تھی۔ جو اخبار نہیں پڑھتے، وہ بھی تو زندہ رہتے ہیں۔ اگر اخبار پڑھنا وقت کی نبض پر انگلی رکھنے کے لیے ضروری تھا تو اس نے اب تک زندگی میں کون سا تیر مار لیا۔ مقابلے کے امتحانوں میں جنرل نالج اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کے لیے اس نے برابر قومی اخباروں کا مطالعہ کیا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ ایک پرائیوٹ کمپنی میں سیلزمین شپ۔ قدم قدم پر وقت سے پیچھے رہ جانے کے کچوکے۔

یوں بھی اس عرصے میں دنیا میں کیا تبدیلی ہوئی۔ ہر مہا نگری اسی طرح ظالم۔ گاؤں پہلے کی طرح اداس۔ چہرے جھوٹ اور سچ کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح جھولتے ہوئے۔ ظلم، جبر اور اداسی کی کہانیاں ہر جگہ ایک۔ امریکہ، روس، عراق، افغانستان اور . . . وہی تھوڑے سے پیٹ بھرے لوگ . . . وہی بیش تر . . . اخبار پڑھو نہ پڑھو . . . دنیا پوری سفاکی کے ساتھ اسی ڈھب پر گامزن۔

اسے یاد آیا کہ کالج کے زمانے سے اس کا جرنلسٹ دوست صحافت کے پُرخطر راستے کا مسافر بن گیا تھا۔ اس نے زندگی میں بہت دُکھ اُٹھائے تھے۔ اور دکھوں کے خلاف لوگوں کو باشعور بنانے کے لیے اس نے قلم سے جنگ کرنے کا راستہ چنا تھا۔ اس جہاں کی صحرا نوردی میں اس کا تعلیمی کیریئر خراب ہوا۔ لیکن اسے تو دنیا کو بدلنے کی دھن سوار تھی۔ پوری توانائی کے ساتھ خبروں کی دنیا میں داخل ہونے کے لیے وہ نبرد آزما تھا۔ اسے منمنی کامریڈ کا وہ جملہ اکثر ہانٹ کرتا کہ زیادہ پڑھائی لکھائی انسان کو احمق اور غلام بنا دیتی ہے۔

اس کی دلی خواہش تھی کہ اس کی تحریریں پہلی خبر کا درجہ حاصل کریں۔ کم از کم پہلے صفحے کا حصّہ بنیں۔ اسے شاید اندازہ نہیں تھا کہ پہلی خبر تو روزانہ ہر اخبار کی ایک ہی ہوتی تھی۔ سمجھدار لوگ اس کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ چند لفظوں کی تبدیلی کے ساتھ وہی قصّہ بار بار پڑھنا ہے۔

اس کی بیوی باورچی خانے سے آکر بولی:

"صبح سے اخبار پڑھنے میں مصروف ہو۔ منّے کا ہوم ورک تو چیک کر لو!"

"تمھیں کیا لگتا ہے کہ میں اخبار پڑھ رہا ہوں؟"

اس نے بیوی کی طرف نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا اخبار تمھیں پڑھ رہا ہے؟"

بیوی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ وہ اچھل پڑا۔

"ارے ظالم! تو نہیں جانتی تو نے کیسی عقل مندی کی بات کہہ دی۔ آج کل اخبار

...میں نے کہا میں یہی غور کرتا ہوں کہ آخر یہ ...کب پڑھیں گے ؟"

یہ کہتے ہوئے وہ خیالوں میں کھو گیا اور ...سرے سے بڑبڑایا جیسے خود سے یہی سوال ...رہا ہو۔

بیوی کو اس کی خود کلامی کا انداز بالکل ...نہ آیا۔ وہ جل بھن کر بولی۔

"بھاڑ میں پڑے تمھارا یہ اخبار۔ میں تو ...ردی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی۔ بیچنے سے ...بھر کی چائے کے پیسے بھی نہیں ملتے۔ چھٹی ...گھر پر رہتے ہو تو دس دن کی چائے ایک ...میں پی جاتے ہو ــــ خود کو خواہ مخواہ ...وئیل سمجھتے ہو۔۔۔ منّے کی کلاس ٹیچر ۔۔۔ تم وقت نہیں دیتے بچّے کو۔۔۔ ...دیر بعد دفتر جانے کی ہڑبڑی میں جانور ...باؤ گے۔۔۔ کیا سوچا ہے اپنے بچّے کو ...سی طرح سڑاؤ گے۔۔۔ میری زندگی تم نے ...کر دی اب۔۔۔!"

اس نے منہ بنایا۔ ایک اچھی پر لطف ...یہ بات کہہ کر آخر کار اس کی بیوی نے ...گی کی ٹھوس سفاک چٹان پر اس کا سر ...ردی سے پٹک دیا۔ اس کا موڈ خراب ...۔ خون بہنے کے احساس نے اس پر نقاہت ...کر دی۔ زخمی پر کٹا پرندہ اُڑنے کی ناکام ...کر رہا تھا۔

"تم نہیں جانتیں؛ میں دراصل اپنے ...منت کے حشر کے بارے میں سوچ رہا ...!"

"منّے سے تمھارے دوست کا کیا ...!"

"تمام منّوں کا۔۔۔!"

"میں نہیں سنتی تمھاری بکواس!"

بیوی پاؤں پٹکتے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئی۔

اس کے جرنلسٹ دوست نے ایک روز اسے بتایا کہ اب فری لانس جرنلزم کی خاک چھاننے سے اسے نجات مل گئی ہے۔ ایک قومی اخبار میں اسے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ملازمت مل گئی ہے۔ اسے "سیاست" کا ڈیسک ملا ہے۔ بس اب پہلا صفحہ اور پہلی خبر دور نہیں۔

اس کا چہرہ جوش اور اُمنگ سے سُرخ ہو رہا تھا۔ بات واقعی خوشی کی تھی۔ ایک مدت کے بعد اس کی آرزو پوری ہونے والی تھی۔ اتنے برسوں تک در بہ در بھٹکنے کے بعد آخر منزل تک پہنچنے والے راستے تک اس کی رسائی ہوگئی تھی۔ وہ برابر وقت نکال کر اس کے پاس آتا رہا اور اپنی کارگزاریوں کی تفصیل سناتا رہا۔

ایک روز اس نے بتایا کہ اس کے کام کے طریقے، محنت اور لگن سے لوگ بے حد خوش ہیں۔ ایڈیٹر کی نگاہوں میں اس کی تحریروں کی قدر و قیمت بڑھتی جا رہی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد وہ آیا تو خلاف معمول بے حد اُداس تھا۔ شاید اپنے دفتر سے لوٹ رہا تھا اور اپنا دکھڑا رونے کے ارادے سے اس کے گھر کی طرف مڑ گیا تھا۔ آج وہ پہلی بار سچ مچ مایوس لگ رہا تھا۔ اتنے برسوں کی ناکامی نے اسے کبھی متزلزل نہیں کیا۔ کالج کے تمام ساتھیوں کے لیے وہ ایک قابلِ تقلید نمونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ فولادی آدمی۔ منچلی لڑکیاں اس کے قریب کھڑی ہو کر اس سے دو باتیں کر کے یک گونہ تسکین حاصل کرتی تھیں ــــ لیکن اب شاید وہ ہمت ہار چکا تھا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے بیوی سے چائے کے لیے کہا۔ بیوی نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔ اس کے دوست نے تھکی تھکی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"یار، بات بنتے بنتے بگڑ جاتی ہے۔ اتنی محنت کے باوجود میری خبروں کو پہلا صفحہ میسر نہیں آتا۔ کل میں نے ایک حیرت انگیز خبر ڈھونڈی۔ اس کمپیوٹر عہد میں شہر کے ایک ایسے گمنام پڑھے لکھے جسمانی و ذہنی اعتبار سے نارمل آدمی کو دریافت کیا تھا جس نے چند ناگزیر اسباب کی بنا پر آج تک ٹرین کا سفر نہیں کیا۔ میں نے اسے پہلے صفحے کی نمایاں خبر بنانا چاہا۔ ایڈیٹر نے اس کی وجوہ جان کر روک لگا دی۔ بہانہ بنایا کہ اس بات کا تعلق میرے ڈیسک سے نہیں؛ میں اپنے کام سے کام رکھوں جب کہ میرا خیال تھا کہ یہ ایک سیاسی معاملہ تھا اور میرے دائرہ کار سے متعلق تھا۔ میرے اصرار کرنے پر اس نے اپنا رُخ بدل لیا۔

جو کچھ ہو رہا ہے۔۔۔ ہوتا آ رہا ہے'
وہی اہم خبر کا درجہ حاصل کر سکتا ہے!
اور جناب جو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔۔۔
یا پھر ہونا چاہیے۔۔۔۔؟؟

اپنے دماغ میں انھیں پہلے صفحے پر چھاپ کر صبر کر لیا کرو۔۔۔ ہمیں تو یہ سب اب۔۔۔ ہاں شروع شروع میں۔۔۔ خیر۔۔۔ میری کرسی تک پہنچتے پہنچتے تم ٹھیک ہو جاؤ گے!

جناب! لیکن مری شروعات نہیں ہے۔۔۔ میں ایک زمانے سے۔۔۔!

ایڈیٹر نے بڑی ہمدرد اور بے بس نگاہوں سے دیکھا۔ اسے کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس کے ہونٹوں پر کسی نے پتھر رکھ دیا تھا۔

نکھوں سے سراسیمگی عیاں تھی۔ بار بار وہ پیچھے مڑ کر یکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی اس پر حملہ آور ہو جائے گا . . ایک اندیکھے انجانے خوف نے اس کے ہاتھ اؤں باندھ دیے تھے۔ پورا ماحول پُر اسرار بن چکا تھا۔

اس دن اس کا دوست کسی گہرے دُکھ ں مبتلا تھا۔ اندرون میں کہیں کوئی طوفان اُٹھ ہا تھا۔ عمارتیں منہدم ہو کر کھنڈروں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔

"جانتے ہو؟" اس نے کچھ دیر تک دیوار ی طرف خالی خالی نگاہوں سے گھورنے کے بعد ہا۔ "کچھ نہیں ہوگا . . . اہم خبر بننے کے لیے مجھے . . . !"

پھر وہ ہنسنے لگا۔ ایک عجیب بے کیف اور پھیکی ہنسی جس کے پیچھے درد کا دریا مَوج زَن تھا۔

کئی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے خودکشی کر لی۔

کیا پتا اس کے ساتھ کیا ہوا۔

وہ نہیں جانتا اس میں اس کے گھریلو حالات کا ہاتھ تھا یا ازدواجی زندگی کی کشاکش کو دخل تھا۔ یا پھر اپنی صحافتی زندگی کی ناکامی سے تنگ آ کر اس نے جان دی، جسے وہ زندگی کی سب سے صحیح لڑائی سمجھ کر لڑتا رہا تھا۔ یا اس خودکشی کے ملمع کے پیچھے کسی قتل کی سازش تھی۔ یا پھر . . .

بہت ساری باتوں کے امکانات ہیں۔ ان میں سے کوئی بات بھی صحیح ہو سکتی ہے۔ لیکن فی الحال سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ اپنے ہی اخبار میں اسے پہلے صفحے کی اہم خبر بننا تو دور رہا، کہیں کوئی کونا بھی میسّر نہ ہوا۔

اُردو میں ڈانس ڈراما

آبرا ھیم یوسف
۱۶۔ نیم روڈ، امامی گیٹ، بھوپال ۴۶۲۰۰۱

ہندستان میں جب دسویں صدی کے آس پاس سنسکرت ڈرامے کی جگہ لوک ناٹکوں نے لینا شروع کی اسی زمانے میں چرن نامی پیشہ ور لوگوں نے جو ابتدا میں روایتی قصّوں کو گاگا کر سنایا کرتے تھے ایک نسوانی کردار شامل کیا جو رقص کے ذریعے جو کچھ گایا جاتا تھا اسے پیش کرتی تھی اور یوں ایک طرح کے ڈانس ڈرامے کی داغ بیل پڑی۔ چرن لوگوں نے جس ڈانس ڈرامے کی داغ بیل ڈالی تھی اس میں جذبات کو رقص کے ذریعے اور قصّے کو گروپ سانگ کے ذریعے بیان کیا جاتا اور آگے بڑھایا جاتا تھا۔ ادیا رنگا چاری "دی انڈین تھیٹر" کے صفحہ ۵۸ پر لکھتے ہیں :

"This Tradition Continued over the Centuries Through Folk-Drama to The modern Sophisticated Bharatanat-yam dance."

بھرت ناٹیم کے بارے میں رکمنی دیوی ارنڈیل اپنے مضمون "بھرت ناٹیم" مطبوعہ ماہنامہ 'آجکل' دہلی بابت ماہ اگست ۵۹ء میں لکھتی ہیں "بھرت ناٹیم کے ایک حصّے کی حیثیت سے تمثیلی رقص (DANCE DRAMA) بھی پروان چڑھا۔ یہ تمثیلیں سدر سے مختلف تھیں کیونکہ ان میں جتنے کردار ہوتے تھے اتنے ہی رقاص ہوتے تھے اس کے برعکس سدر میں ایک ہی کلاکار ابھی نیے (اداکاری) کے ذریعے مختلف کرداروں کا رول ادا کرتا تھا۔ یہ تمثیلی رقص تہواروں کے موقعے پر صرف مندروں میں ہوتے تھے۔" اس طرح بھرت ناٹیم کے ذریعے رقص ڈراما کسی نہ کسی شکل میں پروان چڑھتا رہا۔ اس کے علاوہ شریمتی ٹیگور اپنے مضمون "منی پوری رقص" مطبوعہ ماہنامہ 'آجکل' دہلی بابت ماہ اگست ۵۹ء میں لکھتی ہیں "راس لیلا منی پور کا ایک اہم اور مقبول رقص ہے۔ راس لیلا کا وشنو دھرم سے گہرا تعلّق ہے اور اس میں سری کرشن کی لیلائیں گیت اور ناچ کی صورت میں پیش کی جاتی ہیں۔ بھاگوت پران میں راس لیلا کو ایک ڈراما بتایا گیا ہے۔ . . اس ڈرامے کے مختلف پہلوؤں کو گیتوں کے سہارے ایک مکمل رقص کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔" لوک ناٹکوں اور کلاسیکل رقصوں اور راس لیلا میں ڈانس ڈرامے کی دو شکلیں نظر آتی ہیں۔ ایک میں پس منظر میں کہانی گائی جاتی ہے اور رقاص یا رقاصہ اداکاری اور رقص کے ذریعے ان احساسات اور جذبات کو پیش کرتا یا کرتی ہے جو گانے کے ذریعے پیش کیے جا رہے ہیں۔ دوسری شکل میں رقاص خود گاتا بھی ہے اور اسے رقص کے مختلف انداز میں اور اگر ضرورت ہو تو خاموش اداکاری کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ گویا رقص ڈراما قصّہ، رقص، موسیقی اور خاموش اداکاری کے اتحاد سے پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح اوپیرا میں موسیقی کی اہمیت ہے اور موقعے اور حالات کے مطابق لے، تال اور دھن بدلتی رہتی ہے اسی طرح رقص ڈرامے میں رقص کو اہمیت حاصل ہے رقاصائیں اور رقاص اپنے فن کے ذریعے وہ سب کچھ پیش کرتے ہیں جن کا قصّہ اور کردار مطالبہ کرتا ہے۔

لوک ناٹکوں، کلاسیکل رقصوں اور راس لیلاؤں میں ڈانس ڈراموں کی زبردست روایت موجود ہوتے ہوئے جب ہم اُردو میں ڈانس ڈراموں کی تلاش کرتے ہیں تو ہمیں مایوسی ہوتی ہے کہ اُردو میں ڈانس ڈراما مفقود ہے۔ ۱۹ویں صدی کے اُردو ڈراموں میں رقص اور موسیقی پر بہت زور دیا جاتا تھا چنانچہ اندر سبھا امانت کا ابتدائی نصف حصّہ پریوں کے رقص و موسیقی سے بھرا ہوا ہے مگر ان کا کوئی تعلّق قصّے سے نہیں ہے۔ اندر سبھا کی یہ روایت پارسی تھیٹر کے ڈراموں میں بھی جوں کی توں برقرار رہی لیکن ان منظوم ڈراموں کو نہ تو مکمل اوپیرا ہی کہا جا سکتا ہے اور نہ ڈانس ڈراما۔ لے دے کے واجد علی شاہ کے ڈرامے "رادھا کنہیا کا قصّہ" میں رقص ڈرامے کے کچھ آثار ملتے ہیں مگر یہ ڈراما نہ تو محلوں کی چہار دیواری سے کبھی باہر نکلا اور نہ اُردو ڈرامے پر اثر انداز ہو سکا۔ اُردو کا دامن آزادی کے پہلے تک

انس ڈرامے سے بالکل خالی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُردو ڈرامے نے لوک ناٹکوں، کلاسیکل رقصوں اور راس لیلاؤں ڈانس ڈراموں کی جو روایتیں موجود تھیں ان سے ستفادہ کیوں نہیں کیا جب کہ ابتدائی اندر سبھاؤں نے جن کے اثرات پارسی تھیٹر پر بھی پڑے لوک ناٹکوں ورخاص طور پر بھگت کی تکنیک پر ہی اپنی بنیاد کھی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ بھرت اٹیم کے تمثیلی رقص منادر کی چہار دیواری تک محدود تھے اور ہر شخص کے لیے عام نہیں تھے کہ وہ ان کی خوبیوں اور تکنیک سے واقف ہوسکتا سی طرح راس لیلاؤں کی حیثیت مذہبی تھی اور چونکہ اُردو ڈرامے کا کردار ابتدا ہی سے غیر مذہبی رہا ہے اسی لیے شاید اُردو ڈرامانگاروں نے راس لیلا کے مذہبی تقدس کے باعث عام ڈراموں میں ان کی تقلید سے احتراز کیا ہو۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں نے جس طرح ہندستانی موسیقی کو گلے لگایا رقص پر اس طرح توجہ نہیں دی۔ موسیقاروں میں مسلمانوں کے بڑے بڑے نام مل جاتے ہیں مگر رقاصوں میں ڈھونڈے سے بھی ایک نام نہیں ملتا اور چونکہ اُردو ڈرامانگار رقص کے فن سے کلّی طور پر واقف نہیں تھے اس لیے اسے نظر انداز کرگئے اور رقص و سرود کی جس طرح کی محفلوں سے وہ واقف تھے ڈراموں میں بھی ویسی ہی محفلیں سجاتے رہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ڈانس ڈرامے اور بیلے کے رقص کو سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کے لیے جس تربیت یافتہ ذہن اور اعلیٰ ذوق کی ضرورت ہے وہ اُردو ڈرامے کے ناظر میں پارسی تھیٹر کے غیر معیاری ڈراموں کے ذریعے پیدا نہ ہوسکا۔ بقول مولانا عبدالحلیم شرر پارسی تھیٹر نے رقص کے نام پر یورپ کی ڈرل کو رائج کیا جس میں چمک بھڑک تو تھی مگر رقص کا اعلیٰ فن مفقود تھا۔ اُردو ڈرامے کا ناظر اس چمک بھڑک پر ہی تالیاں پیٹتا رہا اور ہندستان کا اعلیٰ فنِ رقص اس کی نظروں سے پوشیدہ رہا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو اُردو میں رقص ڈرامے کی کوئی روایت قائم نہ ہوسکی۔

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں تجارتی تھیٹر تو اپنے انجام کو پہنچ گیا مگر ریڈیو کی ایجاد نے معتبر شاعروں کو اوپیرا کی طرف متوجہ کیا اور کچھ اچھے اوپیرا لکھے گئے ان میں سے بعض میں کہیں کہیں جو کچھ گایا جاتا تھا اسے رقص کے ذریعے پیش بھی کیا جاتا تھا لیکن اس کی مثالیں ان اوپیراؤں میں خال خال ہی ہیں۔ جناب رفعت سروش نے ڈانس ڈرامے کی طرف توجہ کی اور عورت، روشنی کا کارواں، فکرِ غالب اور انارکلی کو ڈانس ڈرامے قرار دیا اور شاید اسی وجہ سے جناب خلیق انجم نے انھیں ڈانس ڈرامے کا موجد قرار دیا اور جناب نظام صدیقی فرماتے ہیں کہ جناب رفعت سروش ڈانس ڈرامے کے مجتہد ہیں۔ یہاں ہمارا مقصد ان کے ڈانس ڈراموں پر تفصیلی بحث کرنا نہیں ہے۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ "روشنی کا کارواں" اور "انارکلی" میں ڈانس ڈرامے کے تمام عناصر موجود ہیں لیکن "روشنی کا کارواں" بے طرح پروپیگنڈے کا شکار ہوگیا ہے اس سے اس تخلیق کی عصمت داغدار ہوئی ہے "انارکلی" میں وہ کوئی نئی بات تو پیدا نہ کرسکے وہی مشہور کہانی ہے مگر پیش کش کا انداز نیا ہے اور اسے اچھا ڈانس ڈراما کہنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ "فکرِ غالب" ڈانس ڈرامے کے مقابلے میں اوپیرا زیادہ ہے۔ "عورت" کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ خود جناب رفعت سروش یہ طے نہیں کرسکے ہیں کہ یہ ڈانس ڈراما ہے یا بیلے یا کچھ اور "عورت" ان کے ڈراموں کے مجموعے "اسی دیوار کے سائے میں" شامل ہے۔ ابتدا میں جو فہرست دی گئی ہے اس میں اسے ڈانس ڈراما لکھا گیا ہے "پردہ اُٹھنے سے پہلے" کے عنوان سے جو دیباچہ لکھا گیا ہے اس میں اسے بیلے کہا گیا ہے اور کتاب میں جہاں سے یہ ڈراما شروع ہوتا ہے "ایک نرتیہ سولو کی" لکھا گیا ہے۔ اگر نرتیہ سولو کی سے مراد رقصیہ خود کلامی ہے تو یہ خود کلامی نہیں ہے۔ جناب نظام صدیقی جو اس کے غیر معمولی طور پر مداح ہیں کہیں اسے بیلے کہتے ہیں اور کہیں ڈانس ڈراما۔ محترمہ زاہدہ زیدی اس کی صنف کا تعین کیے بغیر ڈانس ڈرامے کی طرح اس کے موضوع کو تنقید کا نشانہ بناتی ہیں۔ ان کے اٹھائے ہوئے بعض سوالات دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔ مگر ان کے تلخ لہجے نے تنقید کا سارا مزا کرکرا کر دیا ہے۔ جناب نظام صدیقی فرماتے ہیں کہ یہ ڈانس ڈراما اپنے شنید نامہ اور شہود نامہ کی ننھی سی جان میں دونوں جہاں کی وسعتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا جمالیاتی ارتکاز، متوازن ایما اور اکثر نیم روشن اخفا ناظر کو تخلیقی رفاقتوں اور معنویاتی بلاغتوں کی گہرائیوں میں اُترنے اور سمانے کے حسین اور رفیع مواقع فراہم کرتا ہے۔" آگے مزید فرماتے ہیں "اس ڈانس ڈرامے میں پورا قدیم اپنشدی کتھا ساگر بھی نیا بھیس بدل کر تخلیقی اور جمالیاتی سفر مدام سفر پر ہے جو تخلیق عورت و فطرت سے متعلق ہے۔ یہ جنگل کے اندر سے جنگل کے پار اس کنوارے منطقے تک پہنچتا ہے جو ناموجود ہے۔ رفعت سروش کی بے تکلف تخلیقی ڈرامائی دسترس اور شاعرانہ پروازِ تخیل کس قدر لطافت اندوز اور

(بقیہ صفحہ ۲۲۶ پر)

غزلیں

بلقیس ظفیرالحسن

ہم پر تو کیے آپ نے سو طرح سے در بند
بیباک نگاہی بھی کبھی کی ہے نظر بند؟

اُس نام پہ آنچ آئے گوارا نہیں، ورنہ
ہیں دیدۂ نمناک میں کیا کیا نہ شرر بند

کیا وسعتِ افلاک، کہاں ہیں وہ اُڑانیں
اب طائرِ تخئیل ہے درماندہ و پر بند

جو کچھ نظر آتا ہے، وہ سب سچ نہیں ہوتا
ہو جاتی ہیں اکثر تو نگاہیں بھی نظر بند

لب سی لیں، کہیں کچھ نہ، گزر جائیں بھی جاں سے
کس دل سے کریں دِل میں تمنّاؤں کا در بند

اب تھک کے تپتے ریت میں بے حال پڑے ہیں
ہم ڈھونڈنے نکلے تھے صدف ہائے گہر بند

کچھ ضبط سے بھی کام لیا کرتے ہیں بلقیس
تہذیبِ چمن کے لیے کرتے ہیں شجر بند

بلقیس ظفیرالحسن

۴۱ - بی، جے - بلاک، ایم - آئی - جی فلیٹس فیز I، اشوک وہار دہلی ۵۲

رئیس الدین رئیس

منزلیں مٹتی ہوئی، دُور آسماں ہوتا ہوا
وحشتوں کے بیچ انساں بے زباں ہوتا ہوا

میں جنوں رفتار سب راہوں کو سر کرتا ہوا
غازیِ گفتار کا چہرہ دھواں ہوتا ہوا

خواب کے صحراؤں میں تعبیر کی بارش کی آس
رات کے ہمراہ دن بھی رائگاں ہوتا ہوا

صبح کے تازہ شگوفے شام کے بجھتے چراغ
آج کا پختہ یقیں کل کا گماں ہوتا ہوا

صبر کی کوشش لبوں پر تشنگی لکھتی ہوئی
چار جانب ریت کا دریا رواں ہوتا ہوا

۲۵،۱۷/۱، دہلی گیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ (یو۔پی)

تحسین منوّر

دُور کہیں ہریالی ہے
یہ حصّہ تو خالی ہے

خود سے ملنا چھوڑ دیا
اب یہ راہ نکالی ہے

کیا جانے وہ گیا کدھر
یہ کمرہ بھی خالی ہے

فصلیں تو سب سوکھ گئیں
زخموں پر ہریالی ہے

بادل گھِر کر آئے ہیں
بارش ہونے والی ہے

من کو بس میں کرنا ہے
اِک زنجیر بنالی ہے

تحسین منوّر

۱۶۵، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

شیکھر یا اگیے : ایک زندگی

خالد اشرف

شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی،

سچدانند ہیرانند واتسائن اگیے اپنی شخصیت کے تنوّع، علمیت کے پھیلاؤ اور مزاج کی رنگینی کے اعتبار سے ہندی کے دوسرے مصنفین سے بہت مختلف ہیں۔

تخلیق کو تعذیب قرار دینے والا یہ دانشور زندگی بھر ادبی معرکہ آرائیوں میں ڈوبا رہا۔ صف بندیوں کو توڑتا جوڑتا رہا، خیموں میں شامل رہ کر بھی الگ رہا۔ طویل تخلیقی عمر، فلسفیانہ فکر، فنکارانہ بے دماغی اور جمال پرستی کا امتزاج اگیے کو کبھی ہمالیہ کے پہاڑی سلسلوں میں بھٹکاتا اور کبھی پیڑ پر مچان ڈال کر شاعری کرنے پر مجبور کرتا رہا۔ نظریاتی اعتبار سے انقلابی تھے، اس لیے تحریکِ آزادی کے دوران میں زیرِ زمین تنظیموں سے وابستہ رہے اور جیل بھی گئے تاہم تخلیق میں وہ انفرادیت کو اجتماعیت پر، انانیت کو عمومیت پر اور خود پرستی کو خدا پرستی پر ترجیح دیتے رہے۔ شخصی آزادیوں کی تبلیغ، اظہار کا کھلا پن، لہجے کی کرختگی اور مروجہ مذہبی و اخلاقی اقدار کی تحقیر ان کے فن کی اساس ہیں۔ اگیے کا فن عوام سے گفتگو نہیں کرتا لیکن متوسط طبقے کی کھوکھلی زندگی کی نقاب کشائی، عظیم روایات کے نام پر انفرادی تجربے اور عقلی تجزیے پر لگائی گئی قدغن کے خلاف جہاد اور محبت کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے والی عورت اور حسّاس مرد کو تاریکی میں دھکیلنے والی معاشرتی قوتوں کے خلاف احتجاج ان کی تخلیقات میں ایک موجِ تہہ نشیں کی طرح جاری و ساری ہے۔

جیل یاترا، فوجی زندگی، مہماتی مصروفیات اور صحافتی ذمّہ داریوں سے گزرنے والے اگیے نے جہاں لاتعداد افسانوں اور نظموں کو جنم دیا ہے وہیں "شیکھر: ایک جیونی" (حصّۂ اوّل ۱۹۴۰، حصّۂ دوم ۱۹۴۴ء) ہندستانی ادبیات کا شاہکار ہونے کے علاوہ اس بنا پر بھی منفرد ہے کہ یہ ناول مصنّف کی ذاتی زندگی کی دستاویز سمجھا جاتا ہے۔ غیر ملکی ادب و شاعری کے وسیع مطالعے اور یوروپی دانشوروں کی سی آزاد روی کے باوجود اگیے کے فن کی بنیادیں ہندستانی ہیں۔ عادات و اطوار کے لحاظ سے مغرب زدہ نظر آنے والا یہ فنکار اپنی سوچ کے اعتبار سے سرتاسر دیسی بلکہ پکّا قوم پرست ہے۔ ان کا عقیدہ روایت شکنی تھا اس لیے شیکھر ایک زندگی میں انھوں نے مروجہ ضابطوں کو للکارا ہے کیونکہ ان کی ساری زندگی بجائے خود ایک منفرد قسم کی بغاوت تھی۔ عامیانہ پن اور فرسودگی سے ان کی مفاہمت کبھی نہیں ہو سکی لیکن وہ مولانا آزاد کی طرح آئینہ خانے کے قیدی نہ تھے، اسی باعث انھوں نے ہمعصر شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ مل کر گروپ بنائے، رسائل میں ان کو اہمیت دی اور ان کی تخلیقات کو سراہا بھی۔

شیکھر کی زندگی کی یہ تصویر جس کو مُصنّف نے A RECORD OF PERSONAL SUFFERINGS سے تعبیر کیا ہے، مکمّل کرنے میں اگیے کو دس سال لگ گئے تاہم ناول کی تیسری جلد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ دیباچے میں وہ ایلیٹ کا حوالہ دیتے ہوئے فنکار کی جذباتی ناوابستگی کی وکالت کرتے ہیں لیکن شیکھر ان کے ذاتی تجربات، ترجیحات اور محسوسات کی فصیل سے باہر نہیں نکل سکا ہے اسی لیے وہ اعتراف کرتے ہیں کہ "شیکھر میں میرا پن کچھ زیادہ ہے، ایلیٹ کا آدرش مجھ سے نہیں نبھ سکا ہے"۔ یعنی منصور کے پردے میں دراصل خدا ہی بولتا رہا ہے۔

شیکھر پامال راہوں سے ہٹ کر چلنے والا نوجوان ہے۔ وہ حسّاس، جمال پرست اور قرۃ العین حیدر کے نوجوانوں کی طرح بباطن ایک شاعر ہے۔ بچپن روایت زدہ برہمن چاردیواری میں دنیادار اور سخت گیر قسم کے باپ کے زیرِ تحکم گزرا ہے جس کے سنگلاخ ذہن میں شاعرانہ پھکڑپن اور مروّجہ اصولوں پر شک کرنے والی اولاد کے لیے لچک ناپید ہے۔ باپ کی آمریت شیکھر کی ٹیڑھی میڑھی ذات کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ باپ چھپ چھپ کر "مالن کی بیٹی" "دو جُورو کا آدمی"

فلمیں یا گانا" اور "طوطا مینا" جیسی فٹ پاتھی
کتابوں کے علاوہ جنسی لٹریچر پڑھتا ہے، نوکرانی
سے ناجائز تعلقات رکھتا ہے لیکن شیکھر کو "گپت گوبند"
پڑھنے پر جسمانی سزا دیتا ہے یعنی ڈپٹی نذیر احمد
کا جدید ایڈیشن ہے، خطرناک حد تک عاقبت
نااندیش۔ شیکھر دور نئی اقدار کی اس دھوپ چھاؤں
سے بیزار ہو کر منفیت کی راہ پکڑ لیتا ہے۔ بچپن
ہی میں وہ فطرت کی گود میں پناہ لے کر اپنے
SHEKHAR SON OF NATURE
ہونے کا اعلان کرتا ہے، کبھی گھر آئے مہمانوں کی
نقلیں کر دیتا ہے اور کبھی گھریلو سامان کو توڑ
ڈالتا ہے ـــــ تخریب کی لے یہاں تک
بڑھتی ہے کہ جان کو داؤ پر لگا کر گہرے پانیوں
میں کود جاتا اور کبھی پیڑ کی آخری ٹہنیوں پر جا چڑھتا
ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ باپ کی بہ نسبت
شیکھر ماں سے زیادہ دور ہے جو کمتر ذہن کی
ایک گھریلو عورت ہے۔ بیٹے کی آوارہ گردی، اکھڑ
مزاجی، ضدی طبیعت اور کھوجی تجسس اس کے
لیے ناقابلِ فہم ہونے کی بنا پر ناقابلِ برداشت
ہے۔ اس کے پاس ممتا کا کوٹہ نہایت محدود
ہے۔ شیکھر جیسا NON CONFORMIST
بالآخر اس کی سرد مہری اور نفرت کا نشانہ بن
جاتا ہے اور اس کا یہ جملہ ماں بیٹے کے نام نہاد
جذباتی تعلق کی بھرپور عکاسی کرتا ہے :
"سچ پوچھو تو میں اس پر بھی بھروسہ نہیں
کرتی۔"

ماں کا یہ جملہ شیکھر کی حسیات پر تازیانے
کا سا کام کرتا ہے اور وہ یہاں تک سوچتا ہے
"اچھا ہوتا کہ میں نہ ہوتا، جو ہوا ہوتا،
بدبودار کیڑا ہوتا۔ بہ نسبت اس کے کہ
میں وہ آدمی ہوتا جس پر کسی کو بھروسہ نہیں
ہے" ـــــ ماں اور بیٹے کے درمیان بے اعتمادی
اور نفرت کا انجام یہ نکلتا ہے کہ ماں کی موت پر
شیکھر بہت زیادہ زیاں محسوس نہیں کرتا، ماں
سے اس کا کمیونیکیشن تو دراصل کبھی قائم ہی نہیں
ہوا تھا۔ دیگر رشتوں میں بھی اس کی حالت ایسی
ہی تھی کیونکہ کم عمری میں ہی اس نے جان لیا تھا کہ
دنیا کا کوئی بھی رشتہ اس قدر مستحکم اور مکمل
نہیں ہے کہ اس کا سرپرست اور رہنما بن کر
اس کے لیے مشعلِ راہ بن سکے، اس بھیڑ میں
کوئی ایسا ذی نفس نہیں ہے جس پر جذباتی
رفاقت کے لیے انحصار کیا جا سکے۔ مذہب اور خدا
کے مروجہ تصور سے بھی شیکھر کو صد درجہ اختلاف
تھا۔ اس کو پڑھایا گیا تھا کہ کائنات کا نظام خدا
کی مرضی کے تابع ہے لیکن وہ مشاہدہ کرتا ہے کہ
عدم مساوات، معاشی جبر، غاصبوں کا تسلط اور
امن پسند انسان کو تاریک راہوں میں دھکیلنے
والی قوتیں دن بدن عروج حاصل کر رہی ہیں
اور خدا آسمانوں میں آرام فرما ہے۔ کبھی جب ماں
یا باپ کہتے کہ "گھبراؤ مت ایشور سب ٹھیک
کر دیں گے" تو وہ چاہتا کہ پھٹ پڑے اور پوچھے
کہ کیا جنگِ عظیم ٹھیک ہوتی ہے؟ بھوک ٹھیک
ہے، بیماری ٹھیک ہے، اتنے لوگ وباؤں کے
شکار ہو کر مرے، کیا ٹھیک ہوا؟ سب کچھ خدا
کے ہاتھ میں ہے، اس پر اسے اعتراض نہیں، وہ
سب کچھ ٹھیک کرتا ہے، یہ جھوٹ ہے، اسے وہ
کسی طرح برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ شیکھر خدا
کو ایک ایسی طاقت کے روپ میں دیکھتا ہے جو
انسان کے تمام دکھ درد اذیتیں، بیماری،
افلاس اور استحصال دیکھتا رہتا ہے اور مجبوروں
پر مختاری کی تہمت بھی لگائے رکھتا ہے۔ اس
نے دیکھا کہ مذہب کے ٹھیکیداروں نے اپنی تمام تر
تخریبی قوتوں کو یکجا کر کے انسان کے لیے ہر قدم
پر ذلت، غریبی، بیماری اور جرائم کے جہنم تخلیق
کر دیے ہیں اور امن و سکون سے زندہ رہنے کے
خواہشمند حساس فرد کے لیے مروجہ نظام کی تائید
کرنا ناممکن ہے اس لیے وہ اس مجرمانہ معاشرے
کے خلاف قدم قدم پر علمِ بغاوت بلند کرتا ہے،
طے شدہ قوانین و ضوابط کو پامال کرتا ہے، تھوپے
ہوئے رشتوں سے منکر ہے اور خدا کے وجود کو تسلیم
نہیں کرتا۔ والدین کی جانب سے مایوس ہو کر تعلیمی
نظام سے امیدیں وابستہ کرتا ہے لیکن اسکولوں
کا فوجی ڈسپلن اور اوسط ذہن اساتذہ کا
کردار اس کو اسکول کی فیکٹری نما چہار دیواری
سے متنفر کر دیتا ہے کیونکہ وہ انسان سے ٹائپ
بننے کو تیار نہیں ہے۔

شیکھر نے اسکول سے بھاگ کر فطرت کی
گود میں پناہ لی۔ اس کی زندگی میں پیڑ پودوں،
پھولوں اور کیڑے مکوڑوں نے اشرف المخلوقات
کا مقام لے لیا۔ وہ کبھی سانپوں کا پیچھا کرتا،
کبھی تتلیاں پکڑ کر ان کے رنگ گنتا، کبھی گھونسلوں
میں طرح طرح کے انڈے شناخت کرتا پھرتا،
کبھی کیلے کے تنے پر سوار ہو کر ندی میں میلوں تیرتا،
کبھی گھر سے بھاگ کر جھرنے کے کنارے رہنے کی
ٹھانتا لیکن بھوک لگنے پر واپس لوٹ آتا۔ وہ
پیدائش، موت اور زندگی کی معنویت کا متلاشی
ہے، جنسی تبدیلیوں کی تفہیم کا خواہشمند ہے،
تولید کے عمل کو جاننے کے درپے ہے لیکن متوسط
طبقے کی دوہری اقدار ہر مرحلے پر اس کے لیے
سدِ راہ بنتی ہیں اور اس کی غیر معمولی ذہنی و تخلیقی
قوتیں صحت مند طریقے سے اظہار نہیں پاتیں۔
ایسا لگتا ہے کہ جو زندگی وہ بسر کر رہا ہے وہ

زنجیر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ــــ ایسی زنجیر جس سے شیکھر بار بار پاؤں چھڑانا چاہتا ہے لیکن جو اس کو آزاد نہیں ہونے دیتی۔

ذات پات میں منقسم ہندو سماج بھی شیکھر کی شخصیت کے فطری ارتقا کو روکتا ہے لیکن چونکہ وہ اس غیر انسانی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا اس لیے کالج میں پہنچ کر اچھوت لڑکوں کے ساتھ مل کر تعلیم کی ترویج کا سلسلہ شروع کرتا ہے۔ مالابار کے خطے میں اس نے دیکھا کہ وہاں کے اچھوت جانوروں سے بھی پست زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کو برہمنوں سے بہت دُور رہنا لازم تھا تاکہ ان کا ناپاک سایہ ان پر نہ پڑ جائے! اعلیٰ ذات کا کھانا پکنے کے مقام سے بھی ان کو بہت دُور رکھا جاتا تھا لیکن کتّوں کو صرف دُھتکار دیا جاتا تھا۔ اُچھوت صرف ناؤ میں بیٹھ کر ندی پار کرتے تھے کیونکہ پُل اعلیٰ طبقے کے لیے مخصوص تھے۔ برہمنوں کے پڑوس میں نچلی ذات والے زمین نہیں خرید سکتے تھے، کنوؤں پر سے خود پانی نہیں بھر سکتے تھے اور اچانک برہمن کے سامنے پڑ جانے پر ان کو اپنی ذات کا باآوازِ بلند اعلان کرنا پڑتا تھا مبادا ان کی ناپاک پرچھائیں اعلیٰ ذات کے تقدس کو ختم کر دے! اس غیر انسانی تفریق کا انجام شیکھر نے ایک پچھڑی ذات کی لہولہان عورت کی شکل میں دیکھا جس کو اعلیٰ ذات والوں کی سڑک پر چلنے کے جرم میں سنگسار کر کے نیم جاں چھوڑ دیا گیا تھا۔ شیکھر ہڈیوں اور گوشت کے اس لوتھڑے کو اُٹھا کر ہسپتال میں پہنچاتا ہے۔

اس کے برہمن مخالف طرزِ زندگی اور پوجا پاٹھ نہ کرنے کی بنا پر اس کو برہمنوں کے ہاسٹل میں سے نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے اور طرح طرح سے اُسے تنگ کیا جاتا ہے۔ آخر میں پچھڑی ذاتوں کے نوجوان بھی اپنے دبوپن اور معاشی کمتری کی بنا پر شیکھر کا ساتھ دینے سے معذور ہو جاتے ہیں۔

شیکھر کی نوجوانی کا دور تحریکِ آزادی کے شباب کا دور بھی تھا۔ سودیشی کی تحریک عروج پر تھی۔ انگریزی لباس، زبان اور کلچر کے خلاف شیکھر کے اندر بھی نفرت کا جوالا مکھی دہک رہا تھا۔ چونکہ وہ "مصلحتوں" نزاکتوں اور ریاکارانہ تصنع کے خلاف ہے اس لیے اس نفرت کا اظہار بھی اکثر کرتا رہتا ہے۔ کانگریس کے کیمپ میں والنٹیر بن کر نہ صرف سخت ڈسپلن کے تحت اپنے فرائض انجام دیتا ہے بلکہ ایک سرکاری افسر کی جھوٹی رپورٹ پر جیل بھی کاٹتا ہے۔ جیل کا نیا جہان اس کی شخصیت کو پختہ کرنے، جرم و سزا کی ماہیت پر غور کرنے اور مجرموں کے شب و روز کا بغور مشاہدہ کرنے کا موقعہ فراہم کرتا ہے۔ جیل یاترا کے دوران شیکھر مدن سنگھ سے ملتا ہے جو اکیس سال سے سزا کاٹ رہا تھا لیکن ہنس سکتا تھا، ایک قیدی رام جی تھا جو اپنی بھابی اور اس کے آشنا کو قتل کر کے آیا تھا اور مطمئن تھا کہ اُس نے اپنے کُل کی لاج بچائی ہے، شیکھر کا ہم عمر محسن تھا جو ہر ممکن اذیت دیے جانے کے باوجود کسی پابندی کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔ شیکھر اپنی تمام تر علمیت، شائستگی، ایمانداری اور راست گوئی کے باوجود ان قاتلوں اور مجرموں کے استقلال و خلوص کے بالمقابل خود کو نہایت معمولی اور ناتجربے کار پاتا ہے۔ بندی خانے کی سزا اس کے لیے باعثِ افتخار ہے اور آزادی کے حصول کا مقدس مشن اس کو تقویت پہنچاتا رہتا ہے لیکن کوٹھری کی تنہائی، اداسی، گھٹن اور یکسانیت اس کو اندر ہی اندر توڑتی بھی رہتی ہے:

"ایک بے نام سی دھند شیکھر کے دل پر چھا گئی ــــ جامد نحوست کی ایک چادر سی۔ اُس رات اس طرح رونے کے بعد سے ہی جو بھاری پن اسے کچل رہا تھا، اسے کسی بھی طرح وہ اُتار کر نہ پھینک سکا۔

دھیرے دھیرے ایک ڈر سا اسے لگنے لگا ــــ کیا میں ہار رہا ہوں؟ کیا جیل کی زندگی مجھے توڑ رہی ہے۔ کیا میں بزدل ہوں؟ جیسے کسی اندرونی زخم میں کنکر چُبھے، ایسے ہی یہ وہم اس کے اندر چبھتا تھا۔۔۔ نہیں تو میں کیوں ایسے بے بس ہو کر رویا؟ جو اہل ہیں، بہادر ہیں وہ کیا روتے ہیں؟ ایسے کوٹھری میں اکیلے بند لیٹ کر ہمیسٹر کی طرح منمناتے ہیں؟"

جیل کا قیام شیکھر کو سوچنے کا درد بانٹنے کا اور انکسار کا سبق سکھاتا ہے۔ آزاد ہو کر سابق باغی، اکھڑ، ضدی اور مردم بیزار شیکھر خود کو بہتر اور REFINED انسان محسوس کرتا ہے ــــ قید خانے کا طویل داخلی سفر اُس وحشی کے لیے وہ بھٹی ثابت ہوتا ہے جس میں تپ کر وہ کندن نہ سہی کم از کم فولاد بن کر نکلتا ہے۔ اب شیکھر ایک نوجوان کی تلاطم خیز جذباتیت کے حصار سے نکل کر بالغ نظر مرد بن چکا ہے۔

بچپن میں شیکھر اگر صنفِ نازک کے لیے دل میں کوئی نرم گوشہ رکھتا تھا تو وہ اس کی بڑی بہن سرسوتی کے لیے مخصوص تھا۔ وہ ماں سے جتنا دور تھا بہن سے اتنا ہی نزدیک تھا۔ وہی اس کی دوست تھی، وہی اس کی دلچسپیوں کا مرکز تھی، وہی اس کی ہمجولی تھی اور وہی اس کی محافظ بھی تھی اور رہنما بھی۔ سرسوتی کی شادی ہو جانے پر شیکھر پر یکایک اپنے

غیر محفوظ ہونے کا انکشاف ہوتا ہے۔ بے سمتی کا احساس دل میں لیے وہ کبھی بیابانوں میں بھٹکتا پھرتا ہے، کبھی چھپ کر ممنوعہ لٹریچر پڑھتا ہے، کبھی بغیر سوچے سمجھے ندی میں کود جاتا ہے، کبھی خام شعری تک بندیاں کرتا ہے، کبھی خود کو بیمار تصور کر کے معالجے کی کتابیں کھنگالتا پھرتا ہے لیکن اس کو کوئی ذی روح ایسا نہیں ملتا جو مستقل طور پر اس سے ترسیل قائم رکھ سکے۔ زندگی کی معنویت، موت کا مطلب، پیدائش کا مقصد، مذہب کی ضرورت، سماج کی جبریت اور ریاست کی افادیت سے متعلق اس کے تشکیک زدہ حسّاس ذہن میں پلتے اور پنپتے ہوئے نت نئے سوالات کا تشفی بخش جواب دے سکے۔

شیکھر ابھی اس منزل میں ہے کہ صنفِ مخالف کی کشش، جسمانی تناؤ، عورت کی رفاقت اور ازدواج کی اہمیت سے آگاہ نہیں ہوا ہے لیکن اس کے دل میں صنفِ نازک کے لیے مخصوص جذبات موسمِ بہار کے اوّلین شگوفوں کی طرح پھلنے لگے ہیں۔ اس نے ایک دن ماں باپ کو ایک دوسرے میں تیرتے اور ڈوبتے ہوتے دیکھا۔ اُس کا جسم بھی کسی نرم و نازک وجود کو پامال کرنے کے درپے رہتا تھا لیکن اخلاقی پابندیاں، ضابطوں کی زنجیریں، خاندانی وقار کا بھرم اور شرافت کی بیڑیاں سانسوں تک پر پہرے بٹھائے ہوتے تھیں۔ شارداکی شکل میں پہلی بار اسے صنفِ لطیف کی رفاقت کا ایک جُرعہ میسّر ہوتا ہے۔ شاردا کے علاوہ اسے تپ دق کی مریض شانتی کی ترحّم آمیز محبّت ملتی ہے جو چند دنوں میں ختم ہونے والی ہے، شیلا کی خاموش محبت ہے، اچھوت کنیا پھولاں ہے جس کے ساتھ کھیلنے سے خالص آرین نسل کے والدین روکتے ہیں ـــــــ لیکن یہ تمام کچّے رشتے اپنی تکمیل تک نہیں پہنچ پاتے کیونکہ شیکھر کی جذباتی فہم ابھی اندھیروں اُجالوں کی اسیر ہے۔

شیکھر کی زندگی میں صرف ایک رشتہ پھلتا ہے جو خالہ زاد بہن ششی سے قائم ہوگیا تھا۔ بہت مدّت تک یہ رشتہ بھی دھندلکے کی چادر میں پوشیدہ رہتا ہے۔ اس کے تانے بانے جیل کے قیام کے دوران مضبوط ہوتے ہیں۔ ششی کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ چکا ہے اور سماج اس کو ایسا بار سمجھنے لگا ہے جس سے جلد از جلد نجات پالینا لازم ہوگیا ہے۔ وہ ابھی ازدواج کی پیچیدگی اور بندھنوں کو سمجھنے کے لائق بھی نہ تھی اور نہ ہی شیکھر کے سوا کسی دوسرے مرد کا عکس اس کے تخیل پر منعکس ہو سکا تھا۔ گو کہ یہ وابستگی بھی کسی واضح تعلق کی شکل میں نہ ڈھل سکی تھی لیکن وہ شیکھر کے مشورے کی آڑ لے کر اس ناوقت کے بندھن سے آزاد ہونا چاہتی ہے لیکن نیم پختہ انقلابی، غیر سماجی اور ذمّے داریوں سے خوفزدہ شیکھر اتنی قوت مجتمع نہیں کر پاتا کہ ششی کو اس جہنّم سے بچا کر اس کے لیے ایک چھوٹی سے جنّت تعمیر کر سکے۔ وہ جانتا ہے کہ ششی کی زندگی کا فیصلہ بدقسمتی سے اُن لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہے جن کو افراد کی ذاتیات میں دراندازی کرنے کا حق کسی نے نہیں دیا ہے لیکن اخلاق اور دھرم کے ان خود ساختہ محافظین نے ششی کی بیوہ ماں پر اتنا دباؤ ڈالا کہ ایسا لگنے لگا تھا کہ ششی کو گناہ کے راستے سے بچانے اور متوسط معاشرے کے STATOSQUO کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ششی کی رسّی جلد از جلد کسی دنیادار مرد کے ہاتھ میں تھمادی جائے۔ شیکھر کی مجہولیت اور کمزور قوتِ ارادی ششی کو کمزور تر بنا دیتی ہے اور وہ اس اجتماعی جبر کے بالمقابل سپر ڈال دیتی ہے۔ چونکہ وہ شیکھر کی خالہ زاد بہن ہے اس لیے شیکھر اس کو اپنانے کے سماجی ردّعمل سے بھی شاید خوفزدہ ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ششی کسی اور کی جھولی میں ڈال دی جائے لیکن وہ اس کو وہ تحفظ دینے میں ناکام رہتا ہے جس کی وہ طلبگار تھی۔ جیل کی بندشیں بھی شیکھر کو ششی کی قسمت کا فیصلہ بدلنے سے روکتی ہیں۔ وہ تن تنہا جیل کی کوٹھری میں روتا ہے اور ششی کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے۔

جیل سے رہا ہو کر وہ دیکھتا ہے کہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ماں کے مرنے کے بعد باپ یکایک ڈھہ سا گیا تھا۔ کالج کی زندگی غیر دلچسپ ہوگئی تھی، گھر عجیب لگنے لگا تھا، دوست کبھی تھے ہی نہیں، بھائیوں سے گہری رفاقت پنپ ہی نہ سکی تھی۔ چنانچہ گھر سے لاتعلق اور ہم عمروں سے غرور کی بنا پر نہ ملنے والا شیکھر کرائے پر کمرہ لے کر اپنے تجربات و نظریات کو تحریری شکل میں ڈھالنے لگتا ہے۔ وہ اپنے غیر روایتی افکار کے ذریعے قدامت پسند ہندو سماج کو متحرک کرنا چاہتا ہے۔ ششی کے گھر آنا جانا شروع کر دیتا ہے، اُس کا شوہر جو ایک اوسط ذہن کا پریکٹکل شخص ہے، ششی اور شیکھر کے بہن بھائی کے ناتے کو زیادہ پسند نہیں کرتا لیکن چونکہ شیکھر کے مزاج میں ایک عجب طرح کی معصومیت اور درویشی ہے جو اس کی غیر معمولی ذہانت سے مل کر ایک اچھی خاصی دلچسپ شخصیت کی تخلیق کر گئی ہے اس لیے وہ شیکھر اور ششی کے ربط ضبط کو ناقابلِ اعتراض سمجھتا ہے۔

تنہائی اور بے روزگاری کے یہ دن شیکھر کو نت نئے حقائق سے آشنا کراتے ہیں۔ وہ

مقالات لکھتا ہے لیکن پبلشر اس کے خیالات کو توڑ مروڑ کر شائع کرنے پر مصر ہیں، وہ افسانے لکھتا ہے تو ایڈیٹر بلا معاوضہ ہڑپنا چاہتے ہیں۔ وہ سماج سدھار کے لیے انجمن بناتا ہے تو اسے صنفِ نازک پر ڈورے ڈالنے کا حربہ سمجھا جاتا ہے، وہ پچھڑے طبقوں کو ذات پات کی تفریق کے خلاف صف آرا کرنا چاہتا ہے لیکن پسماندہ نوجوان اپنی کم ہمتی کے باعث اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ شیکھر قدم قدم پر گھٹیا پن، ریاکاری اور بشریت کش انبوہ سے نبرد آزما ہو کر مایوسی اور بیچارگی سے دوچار ہوتا ہے :

"میں نے دیکھا کہ ہر طرف دکھ ہے، گراوٹ ہے، زوال ہے۔ ایک اکیلا سماج ہی نہیں تمام زندگی ہی بنیادی طور پر غلاظت میں غرق ہے۔ سب کچھ بنیادی طور پر غلیظ ـــــ غلیظ اور متعفن۔ مقابلہ کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں یا سب کچھ ہے، جو کہ ایک ہی بات ہے۔ مٹی کو کاٹا جا سکتا ہے لیکن دلدل کو نہیں ـــــ اس میں دھنسنا ہی دھنسنا ہے۔"

تاریکی اور جمود کو فروغ دینے والی فرد مخالف قوتوں کے خلاف جہاد کے دوران جب جب شیکھر فرسٹریشن اور بیچارگی کے سایوں میں گھر جاتا ہے ششی اس کو زندہ و باعمل رہنے کی ترغیب دیتی ہے، اس کے غیر روایتی افکار کو سراہتی اور اپنی ذہنی و جذباتی رفاقت سے اُس کے لیے خود غرض اور ناروادار معاشرے میں زیست کرنے کا جواز فراہم کرتی ہے۔ لیکن ایک دن ایسا واقعہ ہو جاتا ہے کہ دونوں کی زندگی بدل جاتی ہے۔ ایک رات شیکھر کو شدید مایوسی کے لمحات میں خودکشی کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے ششی شیکھر کے پاس ٹھہر جاتی ہے۔ حالانکہ اُس رات کسی کا دامن آلودہ نہیں ہوا تھا لیکن صبح جب وہ شوہر کے پاس جاتی ہے تو ایک قیامت بپا ہو جاتی ہے۔ متوسط طبقے کی محدود اقدار کا پروردہ مرد یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ کن حالات میں ششی کو اس کے لیے مجبور ہونا پڑا، نہ وہ یہ قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے کہ اس کی بیوی پہلے کی طرح پاک صاف ہے۔ اُس کا ردِّ عمل اِس شکل میں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مار مار کر ششی کا ایک گردہ بیکار کر دیتا ہے۔ شیکھر جب ششی کی طرف سے صفائی پیش کرتا ہے تو اس کا جواب بھی نفرت اور تشدّد کی شکل میں ملتا ہے :

"یہی اصل پاجی ہے۔ کمیونسٹ بنا پھرتا ہے۔ ابھی سال کی جیل کاٹ کر آیا ہے۔ بھلے گھر میں کوئی گھسنے نہ دے۔ کمیونسٹ تو عورت کو ساجھے کا مال سمجھتے ہیں۔ ناسنک! ان کا تو کام ہی ہے لڑکیوں کو ورغلانا اور سُدھار کے نام پر رنڈیاں بنانا۔ ٹکے تو ہوتے ہیں، پیسہ پاس نہیں ہوتا، سستا طریقہ بھی ہے۔ پہلے بہن، پھر کامریڈ پھر رنڈی! کسی کا گھر بگڑے انھیں کیا۔ انھیں تو رنڈی ملتی ہے۔ بھلے گھر کی جوان اور مفت!"

چنانچہ ششی اپنے آپ کو شیکھر پر قربان کر دیتی ہے۔ وہ شوہر کے ہاتھوں بے عزّت اور مجروح ہو کر بھی شیکھر پر اپنا وجود، اپنی خدمت، اپنا ذہن، اپنی رفاقت اور اپنی صحت سبھی لٹا کر جتا دیتی ہے کہ خوشی یا غم بذاتِ خود اہم نہیں ہیں "اہم چیز رفاقت ہے"، ساتھ جھیلنے کا حوصلہ ہے۔ وہ شیکھر کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جہاندیدہ تو نہ تھی لیکن اس کا خلوص اور سبھی کچھ نچھاور کر دینے کا جذبہ اس قدر عظیم ہے کہ وہ انسان نہیں دیوی معلوم ہوتی ہے جیسے خدا نے اس کو شیکھر کی زندگی کو جاوداں کرنے اور کمزور لمحات میں تحفظ دینے کے لیے بھیجا ہو۔ وہ شیکھر کو قدم قدم پر سہارے دیتی ہے اور شیکھر بھی اس کے معالجے کے لیے خود کو وقف کر دیتا ہے۔ حالاں کہ معاشرہ اس بے نام رشتے کو بھی ناپسندیدہ قرار دیتا ہے لیکن وہ دونوں اپنے گرد و پیش سے کٹے ہوئے ایک دوسرے کے درد کا درماں بن جاتے ہیں۔ شیکھر اس کو "خود اذیتی کو مقصدِ حیات سمجھنے والی نرِا ہندو عورت" کہتا ہے لیکن در پردہ وہ ششی کے انجام کا ذمے دار اپنی ذات کو سمجھتا ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ اپنے ہوش کے اٹھارہ بیس برسوں میں کسی کو اُس کی ذات سے سُکھ نہیں پہنچا ہے۔ وہ اپنی ذات کے گنبد میں اسیر سدا اپنوں کو اذیتوں میں مبتلا کرتا آیا ہے لیکن ششی اپنے انجام سے مطمئن ہے کیوں کہ وہ اس آدمی کے چنگل سے نکل گئی ہے جو اس کے جسم کا مالک تو بنا دیا گیا تھا لیکن ذہنی و روحانی رفاقت کا نااہل تھا۔ وہ نہ مذہب اور اخلاق کے خود ساختہ ضابطوں سے اس رشتے کی نوعیت کی وضاحت کرنا چاہتی ہے اور نہ ہی شیکھر سے کسی RECOGNITION کی طلبگار ہوتی ہے :

"خود کو مٹا دینے میں میں نے خوشی محسوس کی۔ بھلے ہاتھوں سے دیا۔ بھسم کر دیا اور دیکھ لیا کہ سب کچھ جل گیا ہے ـــــ خاک ہو گیا ہے۔ یہ نہیں سوچا کہ دھوکا کھایا۔ میں نے واضح شکل میں دیکھا تھا کہ یہی ہوگا . . . تم مجھے ماں، بہن، بھائی، بیٹا کچھ مت سمجھو۔ کیوں کہ میں اب کچھ نہیں ہوں۔ فقط ایک سایہ ہوں۔"

شیکھر ششی کی رفاقت میں زیر زمین انقلابیوں کے ساتھ فعال ہو جاتا ہے۔ دہشت گردوں کو اپنے پاس پناہ دیتا ہے۔ سامراج

کے خلاف نظریاتی تبلیغ کا جان لیوا کام انجام دیتا ہے۔ جسم و روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے سائن بورڈ بنانے کا پیشہ اپناتا ہے اور ششی کی نگہداشت بھی کرتا ہے۔ لیکن ششی پرانی چوٹوں کی تاب نہ لاکر ایک منحوس ساعت میں چل بستی ہے اور شیکھر پھر بے سہارا اور تنہا رہ جاتا ہے۔

مجموعی طور پر شیکھر ایک لاابالی اور غیر سماجی نوجوان کا کردار ہے لیکن وہ بلا کا ذہین اور اس سے بھی زیادہ ایماندار' دنیاوی چالاکیوں سے دور' مصلحتوں سے عاری' مستقبل سے بے پروا اور حال سے ناآسودہ ہے۔ اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی مکّاری' بدعنوانی اور دورنگی کو وہ شدید نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے ـــــــ چونکہ اس کا سماج اس کی فنکارانہ صلاحیتوں اور خلوص کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے' اس کی سگی ماں تک اس کو ناپسند کرتی ہے اس لیے اس کا مزاج تخریبی ہوگیا تھا۔ شاید عامیانہ پن سے متنفّر ہونے کی بنا پر جنس کے تئیں بھی اس کا رویّہ ABNOR-MAL سا ہے۔ جب کالج کے ساتھی چھپ کر جسم فروشی کے اڈّوں پر جاتے ہیں تو وہ ان کو ناپسند کرتا ہے۔ لڑکیاں اس کے نزدیک آنا چاہتی ہیں لیکن وہ ان کے جذبات کو پامال کرتا ہے۔ وہ حسن' لطافت اور جمال کا رسیا ہے لیکن چونکہ بے عمل بلکہ کسی حد تک مجہول ہے اس لیے اس کی شخصیت جسمانی کم ذہنی زیادہ ہے۔ قاضی عبدالغفّار کی لیلیٰ جیسی ایک تعلیم یافتہ اور باذوق عورت اس کو منیکا کی شکل میں ملتی ہے جو تنہا ہے اور مردوں کو پاتی ہے۔ اس کی محفلیں چند روشن ذہن اور روشن خیال لوگوں کے لیے مخصوص ہیں لیکن وہ تمام مرد ذات کو غیر مہذّب اور لالچی جانور سے زیادہ نہیں سمجھتی اس لیے شیکھر اس کی دربارداری سے انکار کر دیتا ہے۔ صرف ششی ایک ایسی عورت ہے جو اس کو اپنانا چاہتی ہے لیکن سماجی بندھن آڑے آتے ہیں۔ آخر میں جب ششی اس کے شب و روز میں شامل ہو جاتی ہے تو بھی شیکھر اس سے جسمانی تعلّق قائم نہیں کرتا یا شاید اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کیوں کہ وہ ایک ایسا انوکھا کردار ہے جو ہر معاملے میں عام روش سے ہٹ کر چلنے کا عادی ہے اور کئی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے۔ جب اس کے گرد و پیش اس کی غیر معمولی ذکاوت' سیال شخصیت' شاعرانہ نفاست اور مخلصانہ سادہ لوحی کی پذیرائی نہیں کرتے تو اس کا ذہن فراریت اور منفیت کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ اپنے اطراف و جوانب سے کٹا ہوا وہ بے مقصد زندگی بسر کر رہا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے ششی آتی ہے اور اس وحشی کو رام کر لیتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد وہ پھر بے سمتی' تنہائی اور لاترسیلیت کا شکار ہو جاتا ہے۔

"شیکھر ایک جیونی" خارجی اظہار سے زیادہ داخلیت کا ناول ہے۔ حالانکہ قومی سطح پر جو سیاسی و سماجی تبدیلیاں اس دور میں رونما ہو رہی تھیں مصنّف اس میں خود شامل تھے۔ اس طرح کہ وہ دہشت پسند انقلابی گروپ میں یش پال کے ساتھ شریک تھے اور بم بنانے پر سزایاب بھی ہوئے تھے' اسی لیے ناول کا سماجی FRAMEWORK یکسر غیر اہم نہیں ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اگیے کا فن بنیادی طور پر فرد کے داخلی بحران اور نفسیاتی مد و جزر کا احاطہ کرتا ہے۔ ہندی کا یہ اہم فن پارہ اس عجیب و غریب حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ بظاہر بڑی مثبت معاشرتی تبدیلیوں اور روشن خیال قوتوں کے عروج کے اس عہد میں ہندستانی سماج بباطن کس قدر جمود رجعت پسندی اور گھٹن سے دوچار تھا۔ شیکھر کی زندگی ان بہیمانہ قوتوں کے خلاف جہادِ مسلسل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی یہ جدوجہد کامیاب نہیں ہوتی۔ شیکھر کے داخلی سفر میں ہر لمحہ ہونے والے فرسٹریشن کی یہ روداد دراصل اپنے عصر کے داخلی مسائل کی دستاویز بن گئی ہے۔

نظمیں

جمود

مری آنکھوں کی محرابوں میں وہ موسم بھی رکھے ہیں
عروسِ شب نکلتی تھی تو اس کے سرمئی آنچل میں
روشن چاند اور تارے بھی ہوتے تھے

کبھی اتنی اندھیری، ایسی ہیبت ناک شب پہلے نہیں دیکھی
فقط سائے ہیں، بہرے اور گونگے ان گنت سائے
اور ان انساں نما سایوں کے پیچھے کیا ہے؟
اندازہ نہیں ہوتا

مرا یہ خواب "دن نکلے گا" اب دھندلانے والا ہے
کہیں سے ایک مٹھی دھوپ مل جاتی،
تو میں اس رات کے چہرے پہ مل دیتا

جلیس نجیب آبادی
پٹھان پورہ، نجیب آباد ۲۴۶۷۶۳ (یوپی)

گاؤں سے باہر

(پنجابی نظم)

بلھے شاہ! چل آج تجھے میں
گاؤں سے باہر چھوڑ آؤں
اب، اس گاؤں میں
بھائی اور بہنوں کے سروں پر کاگوں کے سائے لہرائیں
اور صلیب ہے استادہ ــــ کالی زباں پر
بھگت رہے ہیں لوگ، سزائیں!

لوگ، گھروں کے دروازوں کو مقفل کرکے
دور ــــ سراؤں میں جا بیٹھے
ہر اک کو ہے فکر یہی، بس
وہ لوٹے اپنے گھر کو تو میں بھی لوٹوں
گم ہو چکا، ہجوم میں سب کا ٹھور ٹھکانہ ــ اتہ پتہ سب
جیسے اندھیروں میں ڈوبے ہیں ــ سارے ہی اشجار کے سائے!

کوئی نہیں پہچانے یہاں میری آواز
کس سے میں فریاد کروں؟
مجھ کو تو لگتا ہے جیسے، میں خود بھی
اک سایہ ہوں، اور کسی کا!
مرنے والوں کی فہرست میں تیرا نام ہے
اور تجھ پہ ہے نظر گولی کی
بلھے شاہ! اب تیرا نام میں
زندوں کی فہرست میں کس حیلے لکھواؤں؟
کوئی نہیں ہے محرم تیرا، اس گاؤں میں
کس سے میں اب مول کراؤں؟
بلھے شاہ! اس گاؤں سے تو بہتر ہیں
دیگر ــ ساری بے ڈھب گلیاں!!

ہربھجن سنگھ
مترجم: شاکر پرشارتھی
بھوڈی بازار، جگراؤں ۱۴۲۰۲۶

کہانی

کھلونوں سے
اسی صورت کبھی میں کھیلتا تھا وقت کے بے فکر آنگن میں
مگر اک دن
کسی نے توڑ ڈالے وہ کھلونے
میں جب چونکا تو دیکھا شہر کی آوارہ سڑکوں پر
بھٹکتا پھر رہا ہوں میں اکیلا ــــ اجنبی سا
مرے ہاتھوں میں ٹکڑے ہیں انھی ٹوٹے کھلونوں کے
مگر اس شہر میں فرصت کسے اتنی کہ جو دیکھے
مرے ٹوٹے کھلونوں کو
لگائے مول جو ان کا
سنو بچو
تم اپنے ان کھلونوں کو
حفاظت سے کہیں پر بند کردو
قید کردو
نہیں تو ایک دن کوئی انھیں بھی توڑ ڈالے گا

کفیل آزر
۱۰۱، اے، ٹروس، ڈاکٹر امبیڈکر روڈ، باندرہ، بمبئی ۴۰۰۰۵۰

سلگتے لمحوں کا کرب

تسنیم کوثر

معرفت پروفیسر انوار الحق تبسم، بالمقابل سلطان گنج تھانہ ڈاکخانہ مہندرو
پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ (بہار)

خوشی کی بات ہو یا غم کی، مسئلہ کوئی بھی ہو وہ دوڑا دوڑا میرے پاس چلا آتا تھا۔ اسکول میں کسی سے جھگڑا ہوا ہو، یا محلے میں کسی کے گھر کے شیشے توڑے ہوں۔ ممّی، ڈیڈی سے کوئی شکایت ہو یا اسکول کا کوئی فنکشن۔ میں! یعنی اس کی دِیدی ہر مشکل میں اس کی پناہ اور ہر خوشی میں اس کی ساتھی تھی۔ مجھے یاد ہے اس سے میری پہلی ملاقات ....

اسکول کے تقریری مقابلے میں وہ شریک تو ہو گیا تھا لیکن موضوع ایسا تھا کہ پریشان ہوا اٹھا تھا۔ اس کے ممّی، ڈیڈی دونوں ہی سروس کرتے تھے۔ اس لیے انھیں اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ اس کی مدد کرتے۔ پہلے دن وہ گلاب کے دو پھول لیے میرے گھر آیا۔ ہم اس مکان میں کچھ دن پہلے ہی آئے تھے۔ جو میرے شوہر نے حال ہی میں خریدا تھا۔ کسی سے بھی جان پہچان نہ تھی۔ پہلے دن اسے اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر مجھے تھوڑی حیرت ہوئی۔ اس نے دونوں سفید گلاب میرے حوالے کیے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا "نمستے دیدی"۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اندر آنے کے لیے پورا دروازہ کھول دیا۔ دس گیارہ برس کا گورا چٹا تیکھے نقوش والا یہ لڑکا مجھے بہت اچھا لگا۔ یہ تھی اس سے میری پہلی ملاقات۔

پہلے دن وہ اپنا مدعا گول کر گیا۔ دوسرے دن بھی وہ میرے لیے گلاب کے پھول لے کر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ گلاب تم کہاں سے لاتے ہو؟ کسی کا باغیچہ تو خراب نہیں کرتے؟"

"نہیں تو دیدی! بھلا مجھے کیا جرورت کسی کے باغ میں جانے کی"۔ روی نے کہا۔ یہی اس کا نام تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دروازے تک لایا اور سامنے اشارہ کر کے بولا "میں وہاں رہتا ہوں"۔ میں نے دیکھا وسیع و عریض رقبے میں وہ دو منزلہ عمارت ہرے بھرے پیڑ پودوں کے بیچ سفید بنگلے جیسی لگی، کنارے کنارے گلاب ہی گلاب تھے۔ روی نے میری طرف دیکھا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں اپنے باغ کے تئیں فخریہ چمک تھی۔ "ہوں ... اتنے گلابوں کے بیچ رہتے ہو تبھی تو خود بھی گلاب کا پھول لگتے ہو"۔ میں نے پیار سے کہا۔ "اوں دیدی آپ تو مجاک کرنے لگیں"۔ وہ نخریلے انداز میں بولا۔ "بھئی تم مجھے دیدی ہی کیوں کہتے ہو، آنٹی کیوں نہیں"۔ میں نے پوچھا۔ "یہ تو راز کی بات ہے"۔ وہ ایک پاؤں پر گھوم کر بولا۔ "بھئی ہمیں بھی تو اس راز کا پتہ چلے"۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔

"اب کیا بتاؤں!" وہ قدرے افسردہ لہجے میں بولا۔ "دراصل میں اپنی چھوٹی بہنوں کا بڑا بھائی ہوں۔ میرے دوست ابھیشک اور گورو کی ایک چھوڑ دو، دو دیدی ہیں۔ انھیں کوئی پرابلم ہو یا اسکول کا کوئی فنکشن [illegible] سے ان کی [illegible] حاضر۔ اب بتاؤں گا انھیں"۔ اس نے چٹکی بجائی۔

اس بیچ میں نے لیمن اسکواش تیار کر لیا اور اس کی طرف گلاس بڑھایا تو وہ بولا۔ "ارے دیدی آپ کو کیسے پتہ کہ میں صرف لیمن اسکواش ہی پیتا ہوں؟" میں نے ہنستے ہوئے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ "یہاں بھی تمھیں وہی ملے گا"۔ "ارے .... رے میں تو بھول ہی گیا۔ ممّی نے مجھے دہی لانے بازار بھیجا تھا"۔ اور وہ غٹاغٹ گلاس ختم کر کے اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے گھر کے سناٹے کا احساس ہوا۔ میری گود، میری مانگ بھری ہونے کے باوجود سُونی تھی۔ گرچہ سلیم نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے مجھے اس محرومی کا احساس ہو۔ ہاں اگر سسرال والے ہوتے تو شاید ... سلیم کا میرے سوا اپنا کوئی نہ تھا۔

تیسرے دن روی آیا تو لمبی تمہید کے بعد اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔ میں نے نہ صرف تقریر لکھ کر دی بلکہ اسے خوب اچھی طرح مشق بھی کروادی۔ مقابلے کا دوسرا انعام جیت کر وہ سیدھا میرے پاس چلا آیا

اور میرے ہاتھوں میں کپ تھما کر میرے پیر چھونے جھک گیا۔ میں نے جلدی سے اُسے اٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی اور میز پر رکھی مٹھائی سے اس کا مُنہ میٹھا کیا۔

"دیدی آج آپ کو میرے گھر چلنا ہے۔ میں اپنی ممی سے کہہ آیا ہوں۔" وہ بڑے پیار سے بولا۔

"اچھا شام کو چلوں گی۔" میں نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ "نہیں دیدی ابھی اس وقت چلیں نا!" اس نے ضد کی۔ "سلیم لنچ ٹائم میں گھر آتے ہیں انھیں کھانا بھی تو دینا ہوگا۔" یہ سوچ کر میں نے اُسے منانے کی کوشش کی۔ مگر وہ خوشامد پر اُتر آیا۔ اور میرے دوبارہ انکار کرنے پر اس نے مُنہ پھُلا لیا اور کٹّی کے لیے اپنی چھوٹی اُنگلی میری طرف بڑھائی اور خود بھیگی پلکیں لیے دوسری طرف گھوم گیا۔ "ارے روی تم تو گیس کا غبارہ ہوگئے۔ اب اڑے کہ تب۔" میں نے اسے ہنسانے کے لیے کہا اور وہ ہنس پڑا۔ وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر بولا۔ "آپ کو ابھی چلنا ہے اسی وقت۔" وہ اتنے رعب سے بولا جیسے میرا بڑا بھائی ہو۔ لاچار مجھے تیار ہونا پڑا۔

روی کی طرح ہی اس کے گھر والے بھی خلوص و محبت کے پیکر تھے۔ آہستہ آہستہ ہمارے تعلقات گہری دوستی میں بدل گئے۔ اس بیچ ان بچوں نے مجھے اتنا پیار دیا کہ میں یہ بھول گئی کہ میرا اپنا کوئی بچہ نہیں۔ باہم میل محبت سے رہتے تین سال گزر گئے۔

اس رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی وقت گزاری کے لیے میں نے کتاب پڑھنا شروع کردی۔

"ایک مذہب تو موروثی مذہب ہے کہ باپ دادا جو کچھ مانتے آئے ہیں۔ مانتے رہیئے ایک جغرافیائی مذہب ہے کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں ایک شاہراہ عام بن گئی ہے سب اس پر چلتے ہیں۔ آپ بھی چلتے رہیئے۔ ایک مردم شماری کا مذہب ہے کہ کاغذات میں ایک خانہ بنا ہوا ہے اس میں اسلام درج کرادیجیے ایک رسمی مذہب ہے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچہ ڈھل گیا ہے اسے نہ چھیڑیئے اور اس میں ڈھلتے رہیے۔ لیکن ان تمام مذہبوں کے علاوہ بھی مذہب کی ایک حقیقت باقی رہ جاتی ہے تعریف و امتیاز کے لیے اسے حقیقی مذہب کے نام سے پکارنا پڑتا ہے اور اس کی راہ گم ہو جاتی ہے۔"

ابھی میں نے "غبارِ خاطر" کا شروع کا حصہ ہی ختم کیا تھا کہ گلی میں ہنگامہ سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں اور سلیم ہڑبڑا کر چھت کی طرف دوڑے ہم ہی کیا محلّے کا ہر فرد اپنی اپنی چھتوں پر تھا۔ جیسے اوپر کھُلا آسمان ہی ہمیں سائبان دے سکتا ہو۔ ہم سب شدّتِ خوف و غم سے کانپ رہے تھے۔ چہرے فق اور جسم سرد ہو چکے تھے۔ بم کے دھماکے اب قریب قریب سنائی دینے لگے تھے۔ فضا میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی اور کہیں کہیں شعلے لپکتے دکھائی دے رہے تھے۔ نہ صرف ہمارے لیے بلکہ ہمارے شہر کے لیے بھی یہ ایک انہونی تھی۔

روی کے گھر گہرا سناٹا تھا۔ تمام روشنیاں گُل تھیں اور چاند کی مدھم روشنی میں وہ سفید سی عمارت بال ودھوا کی طرح لگ رہی تھی۔ ملہوترا صاحب تو فیملی سمیت گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ہاں نرنجن بابو کے گھر کی بند کھڑکیوں کے شیشوں سے ہلکی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ سلیم کی طبیعت بگڑنے لگی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور آسمان کو تکتے رہے۔ میں نے وہ رات سجدے میں گزاری۔ سردیوں کی آمد تھی ہوا میں خنکی گھُلنے لگی تھی یوں لگتا تھا کہ اب صبح کبھی نہ ہوگی۔ پاس پڑوس کے بچے اپنی ماؤں کے کلیجے سے یوں چمٹے تھے جیسے چیل کے خوف سے چوزے مرغی کے پَروں میں پناہ لیتے ہیں۔ لیکن صبح ایک اٹوٹ سچائی ہے۔

رات کو ہی شہر میں کرفیو لگ گیا۔ اور ہم سب اپنے اپنے گھروں میں قید ہوگئے۔ دروازے تو بند ہی رہتے ہیں کبھی کبھی کھڑکیاں کھُلتیں تو تازہ ہوا اندر آجاتی۔ گلی میں قبرستان کا سا سناٹا رہتا تھا۔ کبھی کبھی روی اپنے گھر کی کھڑکی میں نظر آتا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف تکتا رہتا۔ روی کے باغ کے پھُول مُرجھا گئے تھے گھاس جھُلس گئی ہرے پتے زرد ہو رہے تھے جنھیں ہوا جانے کہاں اُڑائے جاتی تھی۔ کرفیو نے ہمارے بیچ فاصلے بڑھا دیئے۔ نرنجن بابو کسی کلینک میں کمپونڈر تھے انھوں نے دوستی کا حق یوں ادا کیا کہ چھُپتے چھُپاتے سلیم کو دیکھنے آتے رہے۔ اپنے پاس سے کچھ دوائیاں بھی دیں۔ ان کے آنے سے مجھے ڈھارس ملی۔ خدا خدا کر کے وہ منحوس دن ٹل گئے۔

اس دن سلیم قدرے بہتر تھے دروازے پر دستک ہوئی تو انھوں نے ہی دروازہ کھولا۔ روی اپنی ممی کے ساتھ آیا تھا۔ میں اور اس کی ماں پہلے جھجکے اور پھر گلے لگ کر اس طرح روئے جیسے ندی کا باندھ ٹوٹ گیا ہو۔ روی بولا۔ "دیکھ رہی ہو دیدی باغ اُجڑ گیا ہے سمے سے پہلے ہی پت جھڑ کا موسم آگیا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ میرے

کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی ڈھارس بندھائی۔ چائے کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔

آج کافی دنوں بعد سلیم آفس گئے تھے میں گھر کی صفائی کر رہی تھی۔ روی آگیا۔ خلافِ معمول بہت خاموش اور اداس اداس سا تھا۔

"ہم جا رہے ہیں دیدی" وہ آنسوؤں سے لبریز آواز میں بولا۔ "کہاں جا رہا ہے میرا بھیا؟" میں نے دلار سے کہا۔ "یہ محلّہ چھوڑ کر" وہ بولا۔ میں چونکی۔ "ہاں دیدی" میں اسی وقت ان کے گھر آگئی۔ اس کی ماں کچن میں تھیں میں نے انھیں کندھے سے تھام کر اپنی طرف گھمایا۔ سوال میری آنکھوں سے جھانک رہا تھا۔ "ہاں نوری تم نے ٹھیک سنا ہے ہم پرسوں جا رہے ہیں۔" انھوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں جو کچھ سوچ رہی تھی وہ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ میں کچن سے باہر آگئی۔ پھر وہ میرے پیچھے پیچھے باہر آئیں۔

"نوری.... اب جانے کب ملاقات ہو۔ فرصت کے یہ پل پھر نصیب ہوں یا نہ ہوں آؤ دو باتیں کر لیں۔" پھر ہم دیر تک گزری باتیں یاد کرتے رہے۔

دو دن بہت جلدی بیت گئے۔ میں بجھے دل سے پیکنگ میں ان کی مدد کرتی رہی۔ آخر وہ دن آ ہی گیا۔ وہ لوگ جا رہے تھے۔ ہم سب گیٹ پر جمع تھے۔ "دیدی آگیا" روی نے میرے پیر چھوئے ٹپ سے دو آنسو میرے پیروں پر گر پڑے میں نے جھٹ اسے گلے لگا لیا۔ وہ سسک پڑا۔ اس کی بہنیں سونی اور مونی خاموش تھیں۔ روی کے پاپا نے بیٹے کو سمجھایا "روی بیٹا ہم صرف استھانانترت ہی تو ہو رہے ہیں تم چھٹی کے روز آجایا کرنا۔"

وہ لوگ چلے گئے اور ہم اپنے ویران خانے میں تنہا رہ گئے۔ ہفتہ بھر میں بہت زیادہ اپ سیٹ رہی۔ روی کی ممی جاتے ہوئے تلسی کا گملا مجھے دے گئیں۔ کیونکہ سلیم کو جب بھی زکام ہوتا وہ اس کے پتے پانی میں جوش دے کر پلا دیا کرتیں تو دوا کی ضرورت کم ہی پڑتی۔ شروع میں وہ پودا بالکل سوکھ گیا میں سمجھی یہ بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ لیکن میری مسلسل محنت نے اسے پھر سے ہرا کر دیا اور مجھے لگا روی ابھی بھی میرے ساتھ ہے۔

روی کا گھر "آدرش کنج" جمال صاحب نے خرید لیا۔ اس بیچ ہمارے محلّے کے وہ مکانات جو خالی ہو گئے تھے اور جو ادھورے تھے وہ بھی آباد ہو گئے۔ ایک ایک کمرے میں پورا پورا خاندان آبسا تھا۔ ادھورے مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے ٹاٹ کے پردوں سے ڈھک دیئے گئے تھے۔ کہیں بجلی نہیں تھی تو کہیں پانی۔ پھر بھی وہ آباد تھے۔

ایک صبح میں نے دھوپ کے لیے جو کھڑکی کھولی تو آدرش کنج میں جو اب "جمال منزل" کہلاتا تھا کچھ نئے چہرے نظر آئے۔ جانے رات کے کس پہر آئے تھے۔ کئی دن تک پتہ ہی نہیں چلا کہ کون ہیں؟ کیونکہ وہ بڑے بے تعلق سے رہتے تھے کبھی کبھی چھت پر کچھ بے کیف و رنگ چہرے نظر آتے مگر مُردہ مُردہ بجھے بجھے سے۔ ویسے مجھے تو تمام ہی نئے پڑوسی ایسے ہی لگتے تھے سب کے چہروں میں یکسانیت تھی۔ آدرش کنج سے مجھے غیر معمولی انسیت تھی اس لیے وہاں کے نئے مکینوں کے لیے میں خاص طور پر متجسس رہتی تھی شاید لاشعوری طور پر میں اس گھر سے رابطہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ میں نے ان کے بارے میں سلیم سے پوچھا تو وہ الٹا مجھ پر بگڑ بیٹھے۔

"تمھیں کیا؟ کوئی ہوں! تعلقات بڑھا لو۔ دل سے قریب کر لو اور پھر کوئی گرم آندھی چلے اور انہیں الگ کر دے۔"

میں اپنی کوششوں میں لگی رہی۔ ایک دن اخبار والے سے پوچھا تو وہ بولا "دنگا پیڑت ہیں" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ اور میں سوچنے لگی "یا اللہ یہ کیسا موسم ہے لوگ اپنے ہی شہر میں ہجرت کرنے پر مجبور ہیں۔"

دن جیسے بھی تھے گزر ہی گئے۔ رفتہ رفتہ حالات معمول پر آ گئے لوگ اب سڑکوں کے علاوہ گلیوں میں بھی آنے جانے لگے۔ رمضان کا مہینہ اپنے دامن میں مسرتوں کا خزانہ سمیٹ لایا۔ آسمان سے زمین تک نور کی ایک چادر سی تن گئی۔ لوگ پُرانے غم بھول کر عید کی تیاریوں میں لگ گئے۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ لیکن ہمارے محلّے کے بعض گھروں میں کرفیو جیسا سناٹا تھا۔

چاند رات تھی ان گنت کام تھے۔ لیکن میرا دل کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ پڑوسیوں کا دُکھ ابھی تازہ تھا۔ میں بیٹھے بیٹھے چونک پڑتی ہر چہرہ قاتل نظر آتا۔ سلیم نے مجھے افسردہ دیکھ کر کہا "چلیے مارکیٹ چلیں کچھ چھوٹی موٹی چیزیں لینا ہیں اور آپ کے کپڑے درزی کے یہاں تیار پڑے ہیں۔ میں آفس سے لوٹتے وقت گیا تھا" لیکن میرا دل نہیں چاہ رہا تھا میں نے بہانا تراشا "ساڑھے چار بج چکے ہیں۔ میں روزے سے ہوں، کہاں ماری ماری پھروں گی۔ افطار کے بعد آپ ہی لے آئیے گا" لیکن وہ بضد ہو گئے۔

ہم لوگ ٹیلر کے یہاں پہنچے تو کافی دیر

ہوچکی تھی۔ ٹیلرنگ ہاؤس کے مالک پرکاش بابو بذاتِ خود موجود تھے۔ اور ان کی مصروفیت دیکھتے ہی بنتی تھی۔ "آپ تو بہت مصروف ہیں، بھئی کسی کی دعوت ہے کیا؟" سلیم بولے۔ "اجی دعوت کیسی یہ ہمارے کاریگر ہیں نادینو، کمال، اکبر، ستو یہ لوگ رمضان کے پورے روزے رکھتے ہیں اور صاحب کام بھی پوری ایمانداری سے کرتے ہیں۔ سو میں ان کے لیے رمضان بھر اِفطار کا پربندھ کر دیا کرتا ہوں، اس بہانے تھوڑا سا پُن میں بھی کما لیتا ہوں۔" وہ کھیرا چھیلتے ہوئے بولے۔ میں پاس ہی رکھی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ وہ پھر گویا ہوئے۔ "سے ہو جلا بابا آپ نے بیکار کشٹ اٹھایا میں آپ کے کپڑے ماسٹر صاحب کے ہاتھ بھجوا دیتا وہ روز ادھر ہی تو جاتے ہیں۔ اب آ ہی گئے ہیں آپ لوگ تو آج افطار یہیں کیجیے۔" وہ نہایت خلوص سے بولے۔ "ارے نہیں کشٹ کیسا بازار تو آنا ہی تھا، اسکوٹر سے نکل جائیں گے۔ گھر پر سب کچھ تیار ہے۔" میں نے کپڑوں کا پیکٹ اٹھا لیا اور ہم باہر آگئے۔ میں نے سیڑھیوں سے اُترتے اُترتے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ سورج کی طرح چمکتی پیشانی لیے وہ اپنے کام میں مصروف تھے کتنی روشنی تھی ان کے گرد۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ خود سوزی کی آگ میں اپنا اکلوتا بیٹا گنوا چکے ہیں۔

میں یہ سوچ رہی تھی کہ فطرت کی اس بزمِ نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو۔ ہم لوگ گھر پہنچے تو اذان ہو رہی تھی۔ چاند ہو گیا۔ اگلے دن عید تھی۔

عید آئی اور گزر بھی گئی لیکن آگ برسانے والے بادلوں نے شہر دیکھ لیا ہے وہ پھر سے چھانے لگے ہیں۔ فضا پھر سے آلودہ ہوتی جا رہی تھی۔ ہر چہرہ ایک سوال ہے۔ کیا ہوگا؟ لوگوں کے چہرے بے کیف و رنگ ہوتے جا رہے ہیں ہمارے محلّے سے دو چار گھر اور خالی ہو گئے ہیں۔ جمال منزل کے نئے مکینوں کا سامان بندھا پڑا ہے۔ انھیں کسی محفوظ مقام کی تلاش ہے۔

میرا دل چاہتا ہے کہ سب چلّا چلّا کر کہوں رکو! نہ جاؤ اپنے گھروں کو چھوڑ کر۔ کبھی گھر تمھیں اپنی حفاظت کے لیے درکار تھا۔ آج گھر کو تمھاری ضرورت ہے۔

آوارگی کا آشنا

دلیپ سنگھ
۴/۵۹، راجندر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰

چوتھی قسط

آہستہ آہستہ اور بادل ناخواستہ ناروے کے ادیب ہال سے نکل گئے لیکن ایشیائی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر وہیں گپ شپ کرتے رہے ویسے تو اب بھی سب لوگ ہم مہمان ادیبوں کے ساتھ خاصی محبت سے پیش آرہے تھے لیکن ہمیں احساس ہونا شروع ہوگیا تھا کہ اب ہماری حالت ایسی ہی تھی جیسے ڈولی چلی جانے کے بعد باراتیوں کی ہوتی ہے۔ لوگ پوچھ تو رہے تھے کہ آپ کو چائے یا کافی کی ضرورت ہو تو بتائیے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ آپ واپس کب جارہے ہیں۔

ہرچرن چاولہ صاحب نے ہم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سمینار کے اختتام پر ہمیں فوراً نہیں جانے دیں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم ناروے میں کچھ دن اور ٹھہریں اور اس خوبصورت ملک کے حسن دلفریب کا لطف اٹھائیں۔ اس عرصے میں ہم اُن کے ذاتی مہمان ہوں گے۔ پروفیسر اننتا مورتی تو نہیں مانے کہ انھیں اگلی صبح برلن یونیورسٹی میں حاضری دینا تھی لیکن پروفیسر چوہدری اور میں فوراً رضامند ہوگئے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ دِلّی میں آئے دن ہونے والی ریلیوں میں شریک ہونے والے ہریانہ اور پنجاب کے کسان بھی ریلی کے بعد دِلّی شہر کا ایک چکر لگائے بغیر واپس نہیں جاتے تو پھر ہم ہزاروں کلومیٹر کا سفر کرنے کے بعد صرف سمینار میں پیپر پڑھ کر کیسے لوٹ جاتے۔

ہال میں جب ہم گپ شپ کر رہے تھے تو اچانک ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے "میں سعید انجم ہوں"۔ سعید انجم اُردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں اور میں اُن کے نام اور کام سے بخوبی واقف تھا۔ ہندستان سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے ناروے میں جن ادیبوں سے ملنے کا پروگرام بنایا تھا اُن میں سعید انجم کا نام بھی تھا لیکن سمینار کے دوران وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ جب میں نے شکایت کی کہ وہ اتنے دن کہاں رہے تو کہنے لگے کہ میں کچھ ذاتی کاموں میں مصروف تھا۔ اس وقت بھی صرف یہ کہنے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے ڈنمارک کے سفر میں آپ کی ڈرائیوری کا فرض میں نبھاؤں گا۔

اِس بات کا تو مجھے علم تھا کہ نصر ملک چاہتا ہے کہ میں بذریعہ کار ڈنمارک جاؤں کہ راستے کا نظارہ دیدنی ہے لیکن یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ دورانِ سفر میرے ہمراہ ایک ایسا شخص بھی ہوگا جس کے ساتھ وقت گزارنا باعثِ مسرت ہوگا۔

طے یہ پایا کہ میں تین دن اور ناروے میں رہوں گا اور چوتھے دن سویرے سویرے سعید انجم مجھے چاولہ صاحب کے گھر سے لے جائیں گے۔

اُس رات ڈنر نئی دِلّی ہوٹل میں تھا۔ یہ ہوٹل کپور تھلہ کے سردار گوردیال سنگھ چلا رہے ہیں۔ وہاں بہت سے سرکردہ ایشائی دوستوں سے ملاقات ہوتی۔ ہوٹل کی ایک نارویجین ویٹرس جو ہماری خدمت پر مامور تھی، شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے مہمان کے کان میں اُس کی دلفریبی کی تعریف کی تو وہ کہنے لگے کہ میں نے تو سُنا تھا کہ پنجابیوں کو عورتیں صرف اپنے حرم میں اچھی لگتی ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کو شلوار قمیص میں بھی اچھی لگتی ہیں۔

رات ہم لوگ چاولہ صاحب کے گھر آگئے۔ انھوں نے چوہدری صاحب اور میرے لیے الگ الگ کمروں کا بندوبست کر رکھا تھا لیکن اب ہماری حالت یہ تھی کہ ہمیں الگ رہنا اچھا نہیں لگ ــــ رہا تھا۔

ہم ۲۵ر سے ۲۷ر مئی تک ناروے میں گھومتے رہے۔ اِن تین دنوں میں دو دن تو اوسلو میں گزرے اور ایک دن اوسلو سے باہر۔ وہ غالباً ۲۶ر مئی کا دن تھا۔ لیکن میں اُس دن کا ذکر بعد میں کروں گا حالانکہ اِس طرح تسلسل میں گڑبڑ ہو جائے گی۔

۲۵ر کی صبح کو ہم لوگ ہندستانی سفارت خانے گئے کہ چوہدری صاحب کو اپنے پاسپورٹ کا ایک مسئلہ حل کرنا تھا۔ وہاں پہنچے تو سفارت خانے کے کئی افسر میرے واقف کار نکل آئے کہ میری زندگی وزارتِ خارجہ میں

ہی گزری ہے۔ سفیرِ محترم کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ باتوں باتوں میں وہ کہنے لگے کہ کہانی لکھنی ہو تو اسٹینوگرافر کو لکھانے میں زیادہ مشکل ہوتی ہے یا ہاتھ سے لکھنے میں۔ میں نے کہا "سر" زیادہ مشکل تو اُس وقت ہوتی ہے جب کہانی ذہن میں لکھی جارہی ہوتی ہے۔" اس پر ایک بھرپور قہقہہ پڑا۔ وہاں سے ہم چاولہ صاحب کے دفتر آگئے۔

چاولہ صاحب ڈائک مانسکے بیلی اوٹیک (DEICH MANSKE BIBLIOTEK) میں کام کرتے ہیں۔ یہ ناروے کی سب سے بڑی لائبریری ہے اور دُنیا کی بڑی لائبریریوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ ایک بہت ہی بڑی عمارت میں واقع ہے۔ لائبریری میں داخل ہوتے ہی احساس ہوتا ہے کہ آپ کتابوں کے ایک بہت بڑے محل میں داخل ہوگئے ہیں۔ تقریباً ہر زبان اور ہر مصنّف کی کتابیں اس لائبریری میں موجود ہیں۔ میری بھی۔ چاولہ صاحب کے ذمّے اُردو، ہندی اور پنجابی کتابوں کی تلاش اور فراہمی ہے۔

جس کمرے میں اُن کا دفتر ہے وہاں کئی اور زبانوں کے ماہرین بھی بیٹھتے ہیں جن میں بہت سی لڑکیاں ہیں، چاولہ صاحب نے اپنی سہولت کے لیے انھیں دیسی نام دے رکھے ہیں۔ کسی کو سندری کہتے ہیں اور کسی کو پیاری۔ کسی کو شانتی اور کسی کو موہنی۔ وہ لڑکیاں نہ صرف ان ناموں سے واقف ہیں بلکہ چاولہ صاحب سے بھی بہت مانوس ہیں۔ بزرگی کے کچھ خصوصی فائدے ہیں جن کا چاولہ صاحب پورا پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

میں زیادہ دیر فارسی زبان کے ایڈوائزر کے پاس بیٹھا رہا اور اُس پر بی اے میں پڑھی ہوئی اپنی فارسی آزماتا رہا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ ۱۹۵۳ء میں چھوڑی ہوئی زبان کے لیے میں ابھی تک اجنبی نہیں بنا تھا۔ فارسی کا ایڈوائزر میری بات بخوبی سمجھ رہا تھا۔ چالاکی میں صرف اتنی کر رہا تھا کہ جس بات کی میں فارسی نہیں بنا سکتا تھا وہ بات میں کہتا ہی نہیں تھا۔

اِس لائبریری کا وجود اِس بات کا ثبوت ہے کہ ناروے کی سرکار اپنی ذمّے داری سمجھتی ہے کہ ناروے میں آکر بس جانے والے تارکینِ وطن کم از کم اپنے ادب سے کٹ کر نہ رہیں اِس طرح ان لوگوں میں تنہائی کا احساس کم ہو جاتا ہے۔

لائبریری میں ایک نئی بات مجھے معلوم ہوئی۔ کوئی کتاب جتنی بار لائبریری سے مستعار لی جاتی ہے اُس کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے مُصنّف کو اِس کے حساب سے رائلٹی ملتی ہے۔ ہمارے یہاں جہاں مصنّف کو کتاب کی فروخت پر بھی رائلٹی دینے کا رواج نہیں ہے۔ وہاں پتا نہیں لائبریری سے مستعار لی ہوئی کتابوں پر رائلٹی ملنا کب شروع ہوگا۔ ویسے اگر ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ میرے سمیت اُردو کے تمام ادیب دن بھر لائبریریوں سے خود ہی اپنی کتابیں نکلواتے اور واپس کرتے رہیں گے تاکہ روٹی روزی کا ایک معقول ذریعہ بن جائے۔

چاولہ صاحب نے بتایا کہ کسی اخبار کا ایک نامہ نگار مجھے انٹرویو کرنا چاہتا ہے۔ انھوں نے میرا اُس سے تعارف کروایا اور ہمیں لائبریری کی کنٹین میں بٹھا دیا۔ وہ خود چوہدری صاحب کے ساتھ شاید پھر ہندستانی سفارت خانے کی طرف نکل گئے۔

نامہ نگار مجھ سے انڈیا پرسپیکٹوز کے بارے میں بات چیت کرتا رہا۔ یہ وہ ماہنامہ ہے جس کا میں مدیرِ اعلیٰ ہوں اور جسے بھارت سرکار کی وزارتِ خارجہ دس زبانوں میں شائع کرتی ہے جس میں ایک اُردو بھی ہے۔ نامہ نگار نے مجھے بتایا کہ اس رسالے کے ذریعے ہمیں ہندستان کو سمجھنے میں مدد مل رہی ہے۔ ظاہر ہے یہ بات سُن کر میری باچھیں کھل گئیں۔ اس کے بعد اُس کے زیادہ سوال میرے اوائل زندگی کے بارے میں تھے جنھوں نے بعد میں میری ادبی زندگی پر اثر ڈالا۔ وہ تو نیر شوق سے میرے جواب سُن ہی رہا تھا لیکن خود مجھے اپنی عمر کے وہ سال یاد کرکے بڑا لطف آرہا تھا جو میں نے اپنے آبائی گاؤں رام کے چیچھ ضلع گوجرانوالہ میں گزارے تھے۔ جب اُس نے میرے آبا و اجداد کے بارے میں پوچھا تو ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا کہ غالب کی طرح میں بھی اپنے بزرگوں کو فوج کے مختلف عہدوں پر سجادوں کہ وردی میں زیادہ پُر اثر لگیں گے لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ میرا قدوقامت میرے جھوٹ کی چغلی کھائے گا۔ چنانچہ میں نے صاف صاف بتادیا کہ میرے آبا و اجداد زمیندار تھے اور اس طرح اُن کا دیش کی مٹّی اور مٹّی سے پیدا شدہ چیزوں سے گہرا بندھن تھا — اتنا گہرا کہ آج بھی مجھے کسی خوبصورت، سروقد، متناسب بدن کی لڑکی کے لیے جو تشبیہہ سوجھتی ہے وہ عام طور پر کنوئیں کے پانی سے اُگی ہوئی مولی یا گاجر کی ہوتی ہے۔

جب تک میں نامہ نگار سے فارغ ہوا چاولہ اور چوہدری صاحب واپس لائبریری میں آگئے تھے۔ وہاں سے ہم تینوں ناروے ریڈیو اسٹیشن چلے گئے کہ وہاں ہمارا انٹرویو تھا۔

اپنے وطن میں ریڈیو پر انٹرویو دیتے اور لیتے میری عمر گزری ہے اس لیے میں جانتا [illegible] پندرہ منٹ کے پروگرام کے لیے [illegible] دو گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ بھی [illegible]

نہیں ہوتا اور کبھی پروڈیوسر۔ لیکن یہ یورپ تھا۔ پروڈیوسر کے پاس پہنچتے ہی ہم تینوں کو اسٹوڈیو لے جایا گیا جہاں پہلے سے سب انتظام مکمل تھا۔ پروڈیوسر نے ہمیں بتایا کہ پروگرام سیمینار سے متعلق ہے۔

بہتر انتظام کے علاوہ جو بات مجھے یہاں پسند آئی وہ انٹرویو کرنے والے کے سوال تھے۔ وہ سوال نہایت مختصر کرتا تھا اور ہمیں موقعہ دیتا تھا کہ ہم اپنے تاثرات کھل کر بیان کر سکیں۔ مجھے دلّی میں ٹی وی پر اپنا ایک انٹرویو یاد آگیا۔ انٹرویو کرنے والے کا پہلا سوال کچھ اس طرح تھا۔ "جب آپ نے سیریل "دل دریا" لکھا تو آپ کے تحت الشعور میں یہ بات تھی کہ کہانی کے ذریعے اُس اخوت، اُس محبت، اُس بھائی چارے کو اُبھارا جائے جو ہندستان کے مختلف فرقوں میں آپس میں ہے۔ آپ نے اپنی کہانی کا تانا بانا اسی بات کو مدِ نظر رکھ کر بُنا۔ جب آپ "یہ دُنیا غضب کی" لکھ رہے تھے تو آپ اپنے سیریل میں اُن پریشانیوں کو اُبھارنا چاہتے تھے جو ایک سادھارن آدمی کو ایک سرکاری دفتر میں پیش آتی ہیں۔ کیا جو کچھ میں نے کہا ٹھیک ہے؟"

میں نے کہا "ہاں"۔

اسی انداز میں وہ سوال پوچھتے رہے اور میں کبھی "ہاں" اور کبھی "نہ" میں جواب دیتا رہا۔ جب آدھے گھنٹے کا پروگرام ختم ہوا تو پتا چلا کہ ۲۷ منٹ وہ بولتے رہے اور میں نے پانچ بار "ہاں" اور ایک بار "نہ" کہا۔

پروگرام کے بعد جمشید مسرور نے ہمیں اپنے چارج میں لے لیا کہ اُس کے ذمّے ہمیں اوسلو دکھانے کی ڈیوٹی تھی۔

جمشید نے پوچھا کہ آپ لوگ خصوصی طور پر کیا دیکھنا چاہیں گے۔ چونکہ اندر ناتھ چوہدری اور میں نے دنیا کے کئی ملک دیکھ رکھے ہیں اس لیے ہم نے جواب دیا کہ یار میوزیم وغیرہ تو ہم نے بہت دیکھ رکھے ہیں، ہمیں کوئی ایسی چیز دکھاؤ جو ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔ جمشید کہنے لگا کہ چلو پھر نیوڈ بیچ پر چلتے ہیں۔ نیوڈ بیچ سمندر کے کنارے ایک ایسا مقام ہے جہاں لوگ دھوپ کے موسم میں مادر زاد لباس میں گھنٹوں پڑے پڑے اپنے جسم کے ہر حصّے کو دھوپ سے ہم کنار کرتے ہیں۔ چوہدری صاحب نے تو ہمیں ڈانٹ دیا کہ ایسی جگہ بالکل نہیں جاؤں گا اور نہ ہی تم دونوں کو جانے دوں گا لیکن ہم کہ ٹھہرے غیر ذمّے دار شخص، بضد تھے کہ وہاں ضرور جائیں گے۔ چوہدری صاحب ہم دونوں کو ایسی خطرناک جگہ تنہا کیسے جانے دیتے۔ چنانچہ ہمارے ساتھ ہو لیے۔

چوہدری صاحب کا اعتراض اپنی جگہ لیکن نیوڈ بیچ دیکھنے کا مقام ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں مرد، عورتیں اور بچّے مادر زاد لباس میں دھوپ میں لیٹے ہوئے یا تو کتابیں پڑھ رہے تھے یا آنکھیں بند کیے چُپ چاپ پڑے تھے۔ بہت سے لوگ پوری فیملی کے ساتھ تھے یعنی خاوند، بیوی اور بچّہ۔ ہزاروں لوگوں کو بے لباس دیکھ کر ایک لمحے کے لیے بھی میرے دل میں ایسے خیالات بیدار نہیں ہوئے جو اچھے نہیں سمجھے جاتے، اگر کچھ بُرا لگ رہا تھا تو وہ ہمارا اپنا لباس تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ہم بھی کپڑے اُتار کر ان لوگوں میں شامل ہو جائیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ لوگ اُس لباس میں ملبوس تھے جو قدرت نے ہمارے لیے متعیّن کیا ہے اور ہم لوگ مصنوعی لباس پہنے ہوئے تھے۔

وہاں سے نکلے تو ہم لوگ تِل نِل یُوال گاتے میں واقع فراگنر پارک میں آگئے۔ یہ ایک وسیع پارک ہے جہاں لوگ سیر کے لیے آتے ہیں لیکن اِس پارک کی شہرت کی ایک خصوصی وجہ یہ ہے کہ اِس کے صدر دروازے سے لے کر اس کے اندرونی مینار تک ننگے مرد، ننگی عورتیں اور بچّے دکھائے گئے ہیں۔ بہت سے مجسّمے ایسے بھی ہیں جن میں مرد و زن کا اختلاط دکھایا گیا ہے۔ اِن مجسّموں کا خالق گستو ویگیلان ایک عظیم بُت ساز مانا جاتا ہے۔

گستو ویگیلان کے بارے میں میں کسی قسم کی رائے دینے کا اہل نہیں ہوں کہ اس پارک کا وجود ہی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ناروے کے لوگ اُسے عظیم مانتے ہیں لیکن سچّی بات یہ ہے کہ بہت سے مجسّمے مجھے ایسے لگے جو انسان کے اندر جنسی جذبات اُبھارتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی اس طرح کے مجسّمے کھجراہو اور کونارک کے مندروں میں موجود ہیں لیکن مجھ نا اہل کی سمجھ بوجھ کے مطابق وہ ناروے کے مجسّموں سے کہیں زیادہ آرٹسٹک ہیں۔

حالانکہ ہم لوگ فیصلہ کر چکے تھے کہ کوئی بھی میوزیم نہیں دیکھیں گے لیکن مسز جاولہ کے اصرار پر ہم لوگ منک میوزیم دیکھنے چلے گئے۔ گئے تو اس طرح تھے جیسے کوئی ننھا سا بچّہ پہلی بار اسکول جاتا ہے لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ اگر نہ دیکھتے تو شاید ناروے کا سفر نامکمل رہتا۔ میرے علم کے مطابق ایڈوارڈ منک واحد مصوّر ہے جس کی تصویروں کی نمائش کے لیے ایک پورا میوزیم وقف کیا گیا ہے۔

بے پناہ شہرت حاصل کرنے کے بعد ایڈوارڈ منک ۱۹۴۴ء میں ۸۱ سال کی عمر پا کر فوت ہوا۔ جب اُس کی وصیت پڑھی گئی تو پتا چلا کہ وہ اپنی شاہکار تصویریں اوسلو شہر کو تحفے میں دے گیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء میں ایک میوزیم بنایا گیا تاکہ منک کی تصویروں کو نہ صرف بحفاظت رکھا جائے بلکہ اُن کی نمائش کی جا سکے۔ اِس میوزیم

میں منک کی ایک ہزار پینٹنگز، ساڑھے چار سو اسکیچز اور اٹھارہ ہزار عکسی تصویریں موجود ہیں۔ یہ تصویریں نہ صرف منک کا سوانحی خاکہ پیش کرتی ہیں بلکہ مصوّر نے تقریباً تمام انسانی جذبات جیسے ماں بچے کی محبت، عاشق کی معشوق سے الفت، ہجر و وصال کے لمحات وغیرہ کو اپنی مصوری کا موضوع بنایا ہے۔

حالانکہ مصوّری کے بارے میں میرا علم ایسا تو نہیں ہے کہ میں ایک عظیم آرٹسٹ کے فن کا تجزیہ کر سکوں لیکن اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ایڈوارڈ منک کی تصویروں کی ایک عجیب سی کشش ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس میوزیم کی تصویروں کو گھنٹوں دیکھتے رہیں۔

جمشید مسرور کی کار میں سفر کرتے ہوئے ہم اوسلو کے ایک ایسے علاقے سے گزرے جہاں بہت سی دُکانیں ہندستانیوں اور پاکستانیوں کی تھیں۔ ان دُکانوں کے گاہک بھی ہمارے ہی بھائی بند تھے کیونکہ بہت سے بورڈ اُردو میں لکھے ہوئے نظر آئے۔ دو بورڈ پڑھ کر مجھے بہت لطف آیا۔ یہ دونوں بورڈ حجامت کی دُکانوں پر تھے۔ ایک پر لکھا تھا "یہاں پاکستانی طرز کے بال بنائے جاتے ہیں" اور دوسری پر لکھا تھا "یہاں ہندستانی طرز کے بال بنائے جاتے ہیں"۔ بال بھی پاکستانی اور ہندستانی طرز کے ہوتے ہیں یہ مجھے اُسی دن معلوم ہوا۔ اس پر مجھے کئی سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ میں اُن دنوں سومالیہ میں ہندستانی سفارت خانے میں تعینات تھا۔ میرا ایک پاکستانی دوست لاہور سے شادی کرکے آیا تو باتوں باتوں میں میں نے اُس کی بیوی سے پوچھا "کیا آپ کو کھانا بنانا آتا ہے؟" اُس نے جواب دیا "ہاں کچھ پاکستانی کھانے بنا لیتی ہوں"۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔ ملک کیا تقسیم ہوا۔ ہمارے کھانے، ہمارے لباس، ہمارا رہن سہن تقسیم ہوگیا۔ لیکن ناروے آکر مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ہمارا بال بال بٹ چکا ہے۔

ان دو دنوں میں ڈنر کے لیے ہم مینا گروور اور سجاتا پربھو کے مہمان تھے سجاتا پربھو انگریزی میں شاعری کرتی ہے۔ سجاتا کے خاوند اپنے دفتر کے کام کے سلسلے میں اوسلو سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ صرف اس ڈنر کے سلسلے میں کئی گھنٹے گاڑی چلا کر شام کو آئے اور پھر اگلی صبح واپس گئے۔ اس خاندان کی یہ محبت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

ہماری دوسری میزبان مینا گروور کو ہندستانی موسیقی سے بہت محبت ہے۔ سیمینار کا آغاز اُنھی کے ستار وادن سے ہوا تھا۔ وہ اپنے گھر میں ہندستانی موسیقی اور رقص کا ایک اسکول چلاتی ہیں۔ ڈنر بہت پُرتکلف تھا اور ماحول بہت خوشگوار۔ اُس کے گھر، پتا نہیں کس طرح سکھوں اور پٹھانوں کے لطیفوں کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ کچھ لوگ پٹھانوں کے لطیفے سُنانے لگے اور کچھ سکھوں کے۔ میں اُس گروپ میں تھا جو پٹھانوں کے لطیفے سُنا رہا تھا لیکن جیت دوسرے گروپ کی ہوئی کیوں کہ کچھ دیر کے بعد میں خود اُن کا ساتھ دینے لگا۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

(باقی آئندہ)

بقیہ:

اردو میں ڈانس ڈراما

بصیرت افروز ہے۔ بیک نظر ملاحظہ فرما کر خاطر نشین کریں اور فیشن گزیدہ اور فارمولہ رسیدہ تنقید کی بے مغزی اور ادارہ گزیدہ تحکم و تشدّد پر ماتم کریں" (فکر و آگہی دہلی۔ رفعت سروش نمبر صفحہ ۵۱) جناب نظام صدّیقی خوبصورت الفاظ کا جال بننے میں اسقدر محو ہوتے کہ انھوں نے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا کہ وہ جس تخلیق کو بار بار ڈراما کہہ رہے ہیں اس میں ڈرامائی عناصر موجود نہیں ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ مختار صدّیقی کی تین طویل نظموں، عبدالعزیز خالد کی "زرِ داغ دل" علی سردار جعفری کی "نئی دُنیا کو سلام" اور عمیق حنفی کی طویل نظموں کے اوپیرا ہونے سے اس لیے انکار کر دیتے ہیں کہ ان میں اتحادِ ثلاثہ موجود نہیں ہے۔ لیکن "عورت" کو ڈراما تسلیم کر لیتے ہیں جب کہ اس میں اتحادِ ثلاثہ اور ڈرامے کے دیگر عناصر نہیں ہیں۔ یہ ایک ایسی بیانیہ نظم ہے جو بیلے کے انداز میں پیش کی جا سکتی ہے اور کی گئی ہے۔

بہرحال رفعت سروش صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بیلے اور ڈانس ڈرامے کی طرف توجہ دی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ معتبر شاعر اور فنکار اس طرف متوجہ ہوں کہ اُردو کا دامن بیلے اور ڈانس ڈراموں سے خالی نہ رہے۔

غزلیں

طلسمِ شب کی طرح صبحِ نو کا منظر ہے
نظر سراب جہاں ہے، وہاں سمندر ہے
میں خود کو ڈھونڈنے آج آئینے تک آیا تھا
یہ کوئی اور ہے جو آئینے کے اندر ہے
مری طرف گُلِ احساس اُچھالنے والے
تجھے خبر نہیں یہ پھول ہے کہ پتھر ہے
کئی گھروں کے اجڑنے کا جو سبب ٹھہرا
اُسی مکان کے پہلو میں اب مرا گھر ہے
وہ بددُعا کا ارادہ کرے تو مرجائیں
شمیم زیست تو بس ماں کی اِک دُعا بھر ہے

شمیم امروہوی

محلہ قاضی زادہ، امروہہ ۲۴۴۲۲۱

ہر شخص جن سے ڈر کے تجھے بس ملال دے
اے زندگی تو مجھ کو وہ سارے سوال دے
بے چہرگی کی قید میں کب تک رہے گا تو
باہر نکل کے خود کو کوئی خدّو خال دے
اِس آس نے تو اور بھی بخشی ہیں تلخیاں
جو دے سکا نہ ماضی وہ شاید یہ حال دے
مت ڈھونڈ اِن میں زیست کے اب گمشدہ نقوش
کرچیں سمیٹ اور فضا میں اُچھال دے
سائے کسی کی یادوں کے ہیں کب سے مضطرب
راشد اب ان کو تو کسی پیکر میں ڈھال دے

راشد ندیم

باڑوزئی اوّل، شاہ جہاں پور ۲۴۲۰۰۱ (یو۔پی)

لہو کی جھیل میں ہے چاند کی صدا روشن
ذرا سے لمس نے حرفِ بدن کیا روشن
اُتر گئی ہے گھروں سے، پہاڑیوں سے دھوپ
یہ برگ برگ پہ ہیں کس کے نقشِ پا روشن
گرا تو مجھ کو زمیں بھی نظر نہیں آئی
ابھی نگاہ میں اِک آسمان تھا روشن
کبھی تو لوٹ کے آئے گی رات پھولوں کی
ہے طاقِ سینہ میں اُمّید کا دیا روشن
گلی میں کالی ہوا سائیں سائیں کرتی تھی
کھلی جو دھوپ تو پھر ہوگئی فضا روشن

جینت پرمار

اے/۳۰۰، امبالی فلیا، سریکواڑ، شاہ پور، احمد آباد ۳۸۰۰۰۱

جس گھڑی سے اُڑان ذہن میں ہے
اِک وسیع آسمان ذہن میں ہے
شہر بھر کی کسی کو فکر کہاں؟
اپنا اپنا مکان ذہن میں ہے
آندھیوں کی طرح میں چل تو پڑوں
تتلیوں کی اُڑان ذہن میں ہے
بھول کر دھوپ میں سفر نہ کرو
گر کوئی سائبان ذہن میں ہے
آج کوٹھی میں رہ رہا ہوں مگر
کل کا ٹوٹا مکان ذہن میں ہے

کیفی سنبھلی

محلہ نوری سرائے، سنبھل (یو۔پی)

لندن، لندن، واہ رے لندن

عظیم اختر
سی۔ ۱۸۵، منٹو روڈ کمپلیکس، نئی دہلی۔ ۲

اُردو رسائل و جرائد کے قارئینِ باتمکین!

ہم آج کی صحبت میں آپ کی خدمت میں اپنے لندن پہنچنے اور وہاں کے قیام کا احوال لے کر حاضر ہو رہے ہیں۔ ہماری طرح آپ بھی اسے سفرنامے کا نام نہ دیں، کیونکہ سفرنامے لکھنے کے جملہ حقوق تو سیمناروں کے بیے جزوِ لاینفک سمجھے جانے والے سکہ بند قسم کے نقادوں اور محققوں نے اپنے نام محفوظ کرا رکھے ہیں۔ یہ حضرات اُردو کی ترویج اور ترقی کے لیے سیمناروں کی صدارتیں کرنے یا مقالہ پڑھنے کے لیے پہلے تو صرف اندرونِ ملک ہی چاروں کھونٹ گھومتے تھے لیکن اب مغربی دُنیا کے چھوٹے بڑے ملکوں میں بھی پہنچنے لگے ہیں مغربی دُنیا کے ان ملکوں میں ان حضرات کے قدم رنجہ فرماتے ہی اُن کے اعزاز میں منعقد کیے جانے والے جلسوں اور سیمناروں میں اُن کے مقالہ پڑھنے کی وجہ سے وہاں اُردو کی کس قدر ترویج ہوتی ہے اور ادب کو کس قدر فروغ حاصل ہوا ہے اُس کا حال لکھنے کے لیے سفرنامے لکھنا صرف جائز ہی نہیں بہت ضروری بھی ہے، لیکن ہم نے چونکہ مغربی دُنیا میں اُردو کو وہاں کی مُروّج زبان بنانے یا وہاں کے سماج میں اُردو ادب کو فروغ دینے کا کوئی اس طرح کام نہیں کیا ہے اس لیے سفرنامہ نہ لکھ کر لندن پہنچنے اور وہاں کے قیام کا احوال قلمبند کر رہے ہیں تاکہ اُردو کے باخبر قارئین کو پتا چل جائے کہ ہم بھی لندن پہنچ چکے ہیں۔

ہاں تو حضرات اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ بچپن میں ہم نے اپنے بڑوں کو انگریزی حکومت کے خلاف گفتگو کرتے اتنا سُنا اور دیکھا تھا کہ ہمارے دل میں بھی انگریزوں کے لیے نفرت پیدا ہو گئی اور یہ نفرت اتنی بڑھی کہ جب ہمیں ایک انگریزی اسکول میں داخل کرایا جانے لگا تو ہم نے لکھنے پڑھنے سے صاف انکار کر دیا کوئی دوسرے والدین ہوتے تو شاید ہمیں روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتے لیکن ہمارے ابّو اللہ بخشے انگریزوں کے کٹر دشمن۔ اور شمعِ آزادی کے پروانے تھے، انگریزوں کی ہر چیز سے نفرت کرتے تھے، ہمارے اس انکار کو انھوں نے نافرمانی پر محمول نہیں کیا بلکہ خوش ہوئے اور اسے ہمارے جذبۂ حبّ الوطنی سے تعبیر کرتے ہوئے ہمیں ایک دینی مکتب میں ڈال دیا — دینی مکتب میں اس جذبے کو نہ صرف تقویت ملی بلکہ یقین مانیے ہم نے ایک زمانے تک اپنی آنکھوں کو انگریزی کے حروفِ تہجی سے بھی آشنا نہیں ہونے دیا، لیکن جب ہم بڑے ہوئے اور ناولوں اور سفرناموں میں کیف و سرور میں ڈوبی ہوئی لندن کی رنگین راتوں اور حسین شاموں کے بارے میں پڑھا تو رہ رہ کر پچھتاوا آتا رہا کہ ہم نے انگریزی تعلیم کیوں نہیں حاصل کی ورنہ کمبخت دہائی دیتا "ٹکٹ منگوا دواں، میں لندن جاواں"؛ لیکن ٹکٹ منگا کر اور مُنہ اُٹھا کر لندن چلے جانا آسان نہیں تھا۔ ٹکٹ کا تو خیر کسی صورت انتظام ہو ہی جاتا لیکن لندن جانے کے لیے ویزا حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، کیونکہ انگریز اپنے آزاد کردہ ملکوں کے عوام کے ذہنوں پر انگریزی زبان اور انگریزی رسم و رواج کے سہارے اپنا تسلط اور اثر تو بہرحال قائم رکھنا چاہتے ہیں لیکن یہ نہیں چاہتے کہ NATIVES کہلائے جانے والے ایشیائی لوگ بِن بُلائے مہمان بن کر اُن کی سرزمین پر قدم رکھیں، کیونکہ وہ خود بھی تو کسی زمانے میں اس برِصغیر میں بِن بُلائے مہمانوں کی طرح وارد ہوئے تھے اور بالآخر یہاں کے حکمراں بن بیٹھے تھے — اس لیے ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو تو کُجا تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی بہت سوچ سمجھ کر لندن کا ویزا جاری کرتے ہیں۔ اُس زمانے میں اللہ کا نام لے کر ہم نے بھی بہت کوشش کی کہ ہمیں بھی لندن کا ویزا مل جائے۔ برطانوی ہائی کمیشن کے افسران کو بہت یقین دلایا کہ جنگِ آزادی کے دوران ہم اور ہمارے بڑے انگریزوں کے وفادار رہے ہیں، ہماری کئی پشتوں نے انگریزوں کا نمک کھایا ہے، ہم چونکہ آزادیٔ وطن کے وقت چھوٹے تھے، ہمیں انگریزوں کا نمک بہت کم کھانے کا موقعہ ملا ہے

اس لیے انگریزوں کا مزید نمک کھانے اور حق نمک ادا کرنے کے لیے لندن جانا چاہتے ہیں لیکن وہ انگریز ہی کیا جو باتوں میں آجاتے، کمبخت نہایت غور سے ہماری باتیں سنتے، زیر لب مسکراتے، خوش ہوتے لیکن ویزا جاری کرنے کا وقت آتا طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتے اور ہماری تمام امیدوں پر اوس پڑ جاتی۔

لندن جانے کی کوششوں میں پے در پے ناکام ہونے کے بعد ممکن تھا کہ ہم اپنے ہی ملک میں قناعت کے ساتھ بیٹھے رہتے، لیکن جب ہندستانی اور پاکستانی اخبارات میں لندن اور اس کے مضافات میں منعقد کیے جانے والے چھوٹے بڑے مشاعروں کی خبریں اور تصویریں شائع ہونا شروع ہوئیں اور ان مشاعروں میں شرکت کرنے کے لیے ہندستانی اور پاکستانی شاعروں کا باقاعدہ آدان پردان ہونے لگا تو لندن جانے کی خواہش ہمارے دل میں پھر کلبلانے لگی۔ ہمیں معلوم تھا کہ مقامی مشاعروں میں بھی ہفاعروں کو ذاتی تعلقات اور سفارشوں کی بنیاد پر مدعو کیا جاتا ہے، لیکن یہاں تو سات سمندر پار کے مشاعروں کا معاملہ تھا۔ اس لیے پہلی فرصت میں لندن میں مقیم اپنے ایک ہندستانی دوست کو خط لکھا کر میاں برِ صغیر ہندستان و پاکستان میں ہم لوگ اردو کو فروغ دینے کے لیے حکومتی امداد کی بیساکھیوں پر چل رہے ہیں اور ہر کام پلٹ کر حکومت کی جانب دیکھتے ہیں لیکن تم لوگ قابلِ مبارکباد ہو کہ اجنبی دیاروں میں اردو کو فروغ دینے کے لیے کس قدر زبردست پیمانے پر بے لوث خدمات انجام دے رہے ہو۔ یہ بے لوث خدمات اور تعمیری کوششیں قابلِ فخر و مباہات ہی نہیں تاریخ اردو میں سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ یہ تم لوگوں نے اچھا کیا کہ مغربی دنیا کے اجنبی اور غیر مانوس ماحول میں اردو کو رائج کرنے کے لیے مشاعروں کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہم لوگ اردو کے تم جیسے مجاہدوں کی دُور اندیشی کے قائل ہو گئے، سات سمندر پار کے اس ماحول میں مشاعروں کے ذریعے ہی اردو کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ ان مشاعروں سے اردو نہ صرف عالمی سطح پر پہنچ گئی بلکہ ہم شاعروں کا وقار بھی بلند ہوا ہے اور اپنے سماج میں باعزت سمجھے جانے لگے ہیں۔ ان مشاعروں اور آپ لوگوں کی خدماتِ جلیلہ کے طفیل اب شاعروں کے مشاہدات اور تجربات میں بھی اضافہ ہوگا جو اردو شاعری کے لیے خوش آئند چیز ہوگی۔ دِل چاہتا ہے کہ ایسے ہی کسی مشاعرے میں مَیں بھی شرکت کروں۔ تم تو میرے اپنے ہو اور تمھاری ذات سے ایک تعلقِ خاص ہے اس لیے صرف تم سے ہی بے تکلفی سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنے یا اپنے کسی دوست کے زیرِ انتظام ہونے والے مشاعرے میں مجھے بھی بُلواؤ تاکہ تم سے ملاقات ہو سکے، لندن دیکھ سکوں اور اپنے تجربات و مشاہدات میں اضافہ کر سکوں۔"

یہ خط بھیج کر ہم برطانیہ، کینیڈا یا ڈنمارک کے کسی مشاعرے کے دعوت نامے کے منتظر تھے کہ ہمارے دوست کا خط آیا جسے پڑھ کر سارا منظر نامہ بدل گیا اور ہمیں اپنا مستقبل جگمگ کرتا ہوا نظر آنے لگا۔ ہمارے دوست نے لکھا تھا کہ آپ کی دِل خوش کن اور حوصلہ افزا باتوں کے لیے شکریہ۔ یہاں دیارِ غیر میں ہم لوگوں کا اب اردو سے واجبی سا تعلق رہ گیا ہے۔ یہاں کی تیز رفتار اور مشینی زندگی میں اپنا ہوش رکھنا مشکل ہے، شعر و ادب اور اردو کی خدمت کی بات تو بہت دُور رہی۔ آپ بھولے بھالے اور معصوم انسان ہیں، یہاں منعقد کیے جانے والے مشاعروں سے نہ جانے کیا کیا کچھ تصوّر کر بیٹھے، میاں یہ خالصاً تجارتی اور کاروباری معاملات ہیں۔ برطانیہ، کینیڈا اور ڈنمارک جیسے یورپی ملکوں میں مقیم ہندستانی اور پاکستانی تارکینِ وطن کی ذہنی تفریح کے لیے تفریحی پروگرام منعقد کرنا ایک انتہائی منافع بخش دھندا ہے، جس کو بہت سے ایشیائی اور برطانوی باشندے چھوٹے بڑے پیمانے پر انجام دے رہے ہیں اور کھا کما رہے ہیں۔ میں خود جُز وقتی طور پر اس دھندے میں لگا ہوا ہوں اور اب تک کئی کامیاب پروگرام کرا چکا ہوں۔ اس قسم کے تفریحی پروگراموں میں عام طور پر ہم لوگ فلمی ستاروں کو بلاتے تھے، فلمی ستاروں کی وجہ سے پروگرام سپر ہٹ ثابت ہوتے اور خاصی آمدنی ہوتی، لیکن گذشتہ چند برسوں میں فلمی ستاروں کے بے جا ناز نخروں اور بہت زیادہ فیس مانگنے کی وجہ سے اب یہ پروگرام پہلے جیسے منافع بخش نہیں رہے اس لیے اب مشاعروں اور غزل نائٹ وغیرہ کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ فلم اسٹار نائٹ کے مقابلے میں مشاعرہ سستا پڑتا ہے۔ صفِ اوّل کے فلمی ستاروں کی تو بات ہی کیا دوسرے تیسرے درجے کے فلمی ستاروں کے مقابلے میں بھی اردو کے اچھے اور مستند و معتبر شعرا کم پیسوں میں آجاتے ہیں اور احسان مند الگ رہتے ہیں۔ مشاعرے صحیح معنوں میں کم خرچ بالا نشیں والے تفریحی پروگرام ثابت ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں تو اتر کے ساتھ مشاعرے منعقد کیے جاتے ہیں۔ یہاں کے سامعین کی دلچسپی اور شعری ذوق کو دیکھتے ہوئے ان مشاعروں میں عام فہم زبان میں شعر کہنے اور مشاعرہ جمانے والے مترنم شاعروں کو ہی مدعو کیا جاتا ہے، اس

طرح گائیکی کے ساتھ ہلکے پھلکے شعر سُن کر سامعین کو آموں کے ہی نہیں بلکہ گٹھلیوں کے دام بھی وصول ہو جاتے ہیں۔ کم معروف یا اُبھرتے ہوئے شاعروں کو مدعو کرنے کا رِسک (RISK) کاروباری مفاد میں نہیں ہے، آپ بھی چونکہ مشاعروں کی دُنیا کے جانے پہچانے شاعر نہیں ہیں اس لیے معذرت قبول فرمائیں، لیکن لندن آنے اور مغربی دُنیا کو دیکھنے کی آپ کی شدید خواہش کو دیکھتے ہوئے آپ کو لندن بُلانے اور یورپی ملکوں میں متعارف کرانے کا ایک بالکل اچھوتا اور انوکھا خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ برطانیہ، کنیڈا، ڈنمارک اور بہت سے دوسرے یورپی ملکوں میں ہزاروں ہندستانی اور پاکستانی تارکینِ وطن اپنے خاندانوں کے ساتھ مقیم ہیں۔ برسوں کی قربت کی وجہ سے اب اُن میں باہمی رشتے داریاں بھی قائم ہونے لگی ہیں۔ اس اجنبی ماحول میں بھی شادی بیاہ کے موقعے پر مہندی، نوشہ سازی، ملنی اور رُخصتی وغیرہ کی تمام رسمیں پوری کی جاتی ہیں۔ لیکن یہاں ان رسموں کے موقعے پر سہرا یا تہنیتی نظم یا رُخصتی پڑھنے والے شاعر کی کمی کا بُری طرح احساس ہوتا ہے۔ سہرا، رُخصتی یا تہنیتی نظم پڑھنا شادی بیاہ کے موقعوں کی ایک دلچسپ اور زندہ روایت ہے، اس روایت کو یہاں متعارف کرانا بہت ضروری ہے ورنہ ہمارے بچے اس سے ناآشنا رہ جائیں گے۔ اس لیے اگر آپ سہرے اور رُخصتی بھی لکھتے ہوں اور آواز بھی مترنم ہو تو فوراً مطلع کریں تاکہ آپ کو شادی بیاہ کے موقعے پر سہرا پڑھنے والے شاعر کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ یہاں پیسے کی کمی نہیں، اگر آپ کو لوگوں نے پسند کیا تو یقین مانیے پیسہ ٹوٹ کر برسے گا، آپ کے سارے دِلدّر دُور ہو جائیں گے اور مشاعرہ پڑھنے والے عام شاعروں سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوگی۔ اس طرح یہاں کی نہ صرف شادی بیاہ کی رسموں کا خلا پورا ہو جائے گا بلکہ یہ ایک اہم ادبی اور سماجی خدمت بھی کہلائے گی۔ میری خواہش ہے کہ اس خدمت کا سہرا صرف اور صرف آپ کے سر بندھے، اگر آپ اس خلا کو پورا کرنے اور اس طرح شعر و ادب کی خدمت کرنے کے لیے تیار ہوں تو فوراً مطلع کریں تاکہ یہاں کے اخبارات و رسائل اور ٹی وی پر ایک نئے اور مخصوص زاویے سے آپ کی پبلسٹی کا انتظام کیا جاسکے، کیوں کہ آئندہ دو ماہ بعد یہاں موسمِ بہار شروع ہونے والا ہے جو یہاں شادی بیاہ اور اسی قسم کی تقریبات کا موسم کہلاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پبلسٹی کے ساتھ ساتھ آپ کی بکنگ بھی شروع کردوں تاکہ پہلے ہی سیزن میں کچھ کما لیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بھرپور آئیڈیا کوئی اور لے اُڑے . . .

صاحبو، خط تو بہت طویل تھا جس کو پڑھ کر یقین مانیے محاورتاً نہیں بلکہ سچ مچ ہماری باچھیں کِھل اُٹھیں، خوشی کے مارے چیخ نکل گئی، عالمِ وارفتگی میں خط کو کئی بار چوما، آنکھوں سے لگایا، بے ساختہ سر پر رکھا اور جب ذرا اس TRAUMA سے باہر نکلے تو خالصاً عوامی زبان میں فوراً سے پیشتر ٹیلیفون، ٹیلی گرام، فیکس اور ٹیلیکس وغیرہ کے ذریعے اپنے دوست کو منظوری بھیج دی۔

محکمۂ ڈاک و تار کے مستعد چوکس اور فرض شناس کارکنوں کی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے ہمارے یہاں خط تو کُجا ٹیلی گرام وغیرہ بھی کبھی وقت پر نہیں پہنچتے اس لیے ہمیں یقین تھا کہ ہماری منظوری کو بھی لندن تک پہنچنے میں خاصا وقت لگے گا، لیکن شاید قسمت ہم پر مہربان تھی یا ڈاک و تار کے کارکنوں کی روایت اور وضعداری میں کوئی فرق آگیا تھا کہ ہمارا پیغام حیرت انگیز طور پر برق رفتاری سے لندن پہنچ گیا اور ہمارے کرم فرما دوست نے اُسی چستی اور برق رفتاری سے ٹکٹ اور دوسرے کاغذات بھیج کر ہمیں لندن بُلا لیا۔

جب ہم لندن پہنچے اور اپنے دوست سے بالمشافہ گفتگو کی، اخبارات و رسائل میں اپنا فوٹو اور اشتہار دیکھا تو اُس کے ذہنِ رسا کے قائل ہوگئے۔ اشتہار بازی اور پبلسٹی کے نت نئے طریقوں کی بدولت تو عام بازار میں ڈیڑھ دو روپے کیلو بکنے والا آلو بھی خوبصورت پیکٹوں میں آکر چپس کی شکل میں پچیس تیس روپے کیلو بِکتا ہے، یہاں تو معاملہ شادی بیاہ کی اہم رسم اور روایت کا تھا چنانچہ لوگوں نے ہاٹ کیک کی طرح ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا دھڑا دھڑ بکنگ شروع ہوگئی اور ہم سہرے، رخصتیاں اور تہنیتی نظمیں تخلیق کرنے میں جُت گئے۔ اُجرت پر عمدہ اور پسند آجانے والا سہرا یا رخصتی لکھنا کوئی آسان کام نہیں، کوئی اور شاعر ہوتا تو شاید رسّی تڑا کر واپس بھاگ آتا لیکن ہم چونکہ اپنے شہر میں دوستوں، رشتے داروں اور دوسرے لوگوں کی فرمائش پر بغیر کسی اُجرت کے سہرے اور رخصتیاں وغیرہ لکھتے ہی رہتے تھے اس لیے ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ عام طور پر صرف وہی تہنیتی نظمیں، رخصتیاں اور سہرے پسند کیے جاتے ہیں اور عوامی معیار پر پورے اُترتے ہیں جن میں دولہا اور دلہن کے زیادہ سے زیادہ رشتے داروں کے نام نظم کیے گئے ہوں بھلے ہی ناموں کی وجہ سے مصرعے بے بحر ہو جائیں، لیکن رشتے داروں

کے نام ضرور نظم کیے جانے چاہئیں کیوں کہ ترنم اور گائیکی بے وزن مصرعوں کا عیب چھپا لیتے ہیں، ہم نے اس نسخے پر ہمیشہ سختی سے عمل کیا اور کامیاب رہے ہیں۔ چنانچہ یہی نسخہ ہم نے یہاں بھی آزمایا اور یقین مانیے۔ پہلے ہی سیزن میں جھنڈے گاڑ دیے۔

قارئین باتمکین! اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہم پچھلے چھ سات سال سے لندن میں قیام پذیر ہیں۔ ہماری شہرت لندن کے اطراف سے نکل کر کنیڈا اور ڈنمارک وغیرہ تک پہنچ گئی ہے۔ شہرت اور پبلسٹی کی وجہ سے ہم ہر جگہ نکاح خواں قاضی اور پنڈت کی مانند ہر شادی بیاہ کی تقریب کے لیے لازمی اور ناگزیر سمجھے جانے لگے ہیں، جس کے نتیجے میں ہم بھی مشاعرہ باز شاعروں کی طرح سفر کے لیے ہمہ وقت پا بہ رکاب رہتے ہیں، ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں، خوبصورت کاروں میں گھومتے ہیں، اچھا، عمدہ اور پیٹ بھر کھانا ملنے کی وجہ سے ہمارے چہرے کی ازلی بے رونقی بھی غائب ہوگئی ہے، نفیس تراش خراش کے کپڑوں اور چہرے پر آئی ہوئی رونق کی وجہ سے اب ہم آئینے میں خود کو بھی اچھے لگنے لگے ہیں۔ ظاہری ہیئت کے ساتھ ساتھ خدا جانے کیسے ہماری آواز پہلے سے بھی زیادہ دلکش ہوگئی ہے۔ بڑے بوڑھوں نے کہا ہے اور ٹھیک ہی کہا ہے کہ اللہ مہربان تو گدھا بھی پہلوان، اللہ ہم پر مہربان ہے اور ہم بھی خالی اکھاڑے میں اُچھل کود کرنے والے پہلوان بنے ہوئے ہیں۔ پہلوان تو اکھاڑے میں آکر دوسرے پہلوانوں کو کشتی کے لیے للکارتے ہیں، لیکن جب ہم نوشہ سازی، رخصتی اور ملنی کی رسم کے موقع پر دولہا دُلہن کے رشتے داروں کو نام بنام مخاطب کر کے تان اُڑاتے ہیں اور آواز کا جادو جگاتے ہیں تو چھوٹے بڑے کرنسی نوٹوں کا مینہ برسنے لگتا ہے۔ اور تو اور یہاں کے مقامی باشندے جو شروع شروع میں ایسے موقعوں پر حیرت و استعجاب سے دیکھا کرتے تھے اور بعد میں طرح طرح کے سوالات کیا کرتے تھے اب تو وہ بھی اپنے یہاں شادی بیاہ کے موقع پر سہرا پڑھنے کے لیے ہم کو بُلانے لگے ہیں۔ خالص انگریزوں کے بیچ ہم اُردو کا جھنڈا بلند کرتے ہیں اور اُن سے داد پاتے ہیں۔

تو صاحبو اس طرح لندن میں ہمارے دن گزر رہے ہیں۔ اجنبی ماحول اور دیارِ غیر میں اُردو کو فروغ دینے اور فرنگیوں کی سرزمین پر اُردو کو ایک مروّج زبان بنانے کے لیے خاموش خدمت کر رہے ہیں۔ ہم اپنی ان خدماتِ جلیلہ کا اعتراف اپنی زبان سے نہیں بلکہ آپ سے کرانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کی کوئی انجمنِ اُردو کے فروغ کے لیے ہمیں بھی ایوارڈ سے نواز دے تاکہ ہم بھی مستند اور معتبر لوگوں میں شمار کیے جانے لگیں۔

ایوانِ اُردو اور اُمنگ کی مجلّد فائلیں

ہمیں اکثر ایسے خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں "ایوانِ اُردو" یا "اُمنگ" کے پُرانے شمارے بھجوانے کی فرمائش ہوتی ہے —— ایسی فرمائشوں کی تعمیل کے لیے "ایوانِ اُردو" اور "اُمنگ" کے گزشتہ شماروں کی ایک ایک سال کی فائلیں مجلّد کرالی گئی ہیں۔ "ایوانِ اُردو" کی ایک سال کی مجلّد فائل کی قیمت ساٹھ روپے اور "اُمنگ" کی فائل کی قیمت پچاس روپے ہے —— یہ فائلیں محدود تعداد میں ہیں، خواہشمند حضرات فوراً رجوع کریں ——

اُردو اکادمی، دہلی —— گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

غیر طلبیدہ نگارشات

جن کی واپسی کے لیے مناسب سائز کا ٹکٹ لگا ہوا لفافہ ساتھ نہ ہو، ناقابلِ اشاعت سمجھی جانے پر ضائع کردی جاتی ہیں۔

—— ادارہ

غزلیں

راہِ عمل پہ کیوں کوئی پیاسا دِکھائی دے
قطرہ، رواں دواں ہو تو دریا دِکھائی دے
میری شبِ فراق میں اتنی کشش تو ہے
خوابوں کی چاندنی میں وہ چہرا دِکھائی دے
تنہائیوں کا بوجھ کہاں تک لیے پھروں
یارب کوئی تو شہر میں اپنا دِکھائی دے
ہر دامنِ نظر میں اندھیرا ہے اِن دِنوں
ذہنوں میں نور ہو تو اُجالا دِکھائی دے
اُس بزمِ دل نواز کو ٹھکرا کے لوٹ آ
چاہت جہاں فریب ہو، دھوکا دِکھائی دے

عفّت زرّیں
۵۴۳، گلی حکیم جی، چوڑیوالان، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

زندگی پر اس طرح کچھ غم کا جادو چل گیا
دل سے جو نغمہ اُٹھا وہ آنسوؤں میں ڈھل گیا
غیر کے گلشن پہ برسی جھوم کر کالی گھٹا
میری بستی سے مگر اُڑتا ہوا بادل گیا
یہ بہاریں ہیں اگر، ایسی بہاروں کو سلام
پھول کھلنے بھی نہ پائے تھے کہ گلشن جل گیا
کیسی آہیں تھیں کہ جن سے ہوگیا شق آسماں
کیسے آنسو تھے کہ جن سے دل کا دامن جل گیا
وقت کی لہروں پہ ہنستے کھیلتے تم آگئے
موت جس کا نام تھا آخر وہ لمحہ ٹل گیا

شبانہ نذیر
سی۔۵۸، منٹو روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

میں سچ کہوں گا تو کس پر عتاب ٹوٹے گا
وہ دَور ہے کہ مجھی پر عذاب ٹوٹے گا
یہ پتھروں کی نہیں تہمتوں کی بارش ہے
ضرور اب دلِ خانہ خراب ٹوٹے گا
کریں نہ خاک نشینوں کے ظرف کا سودا
غرور آپ کا "عالیجناب" ٹوٹے گا
ابھی عروج ہے تیرا مگر خیال رہے
کہ زور تیرا بھی اے آفتاب ٹوٹے گا
بہت یقین ہے انورؔ شمیم آن پہ مگر
میں جانتا ہوں کہ اِک دن یہ خواب ٹوٹے گا

انور شمیم انورؔ
۴۹۳، چوک حاجی پورہ، فیروزآباد ۲۸۳۲۰۳

نوکِ خنجر پہ جسم و جاں رکھ دو
جتنے سر ہیں سرِسناں رکھ دو
چاہتی ہے یہی سیاہ ستم
سب کے در پر اُداسیاں رکھ دو
بھول جاؤ گے اپنے گھر کا پتا
راہ میں کچھ نشانیاں رکھ دو
واپسی کا کوئی سوال نہیں
موج کی زد پہ کشتیاں رکھ دو
خوش لباسی کا شوق ہے اُس کو
اُس کے دامن میں تتلیاں رکھ دو
نام لکھنے سے پہلے قاتل کا
کاٹ کر اپنی انگلیاں رکھ دو

منوّر امروہوی
۴۲۱۴/۷، گھٹا مسجد، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جو وہاں ہے وہ کہیں نہیں

ہریش رائے

مثیل آصف

روم نمبر ۳۴، سیفی ہوسٹل، ایم۔ ایم۔ ہال، اے۔ ایم۔ یو، علی گڑھ

پنڈت نریندر شاستری اور سرکار ہمیشہ تین ٹانگ کی دوڑ ہی دوڑتے۔ پنڈت جی نے اپنی دھاک شخصیت کے زور پر شراب کا دھندا شروع کیا۔ جب یہ دھندا اپنے عروج پر آیا تو سرکار نے پنڈت جی کو صلاح دی کہ شراب کے ساتھ ساتھ جوتوں کا دھندا بھی کرنا چاہیے۔ لہٰذا پنڈت جی نے جوتوں کا کاروبار شروع کیا۔ سرکار کو پنڈت جی کا جوتا بے حد پسند آیا۔ اس لیے انھوں نے عوام کے لیے جوتا پہننا ناگزیر کر دیا۔ پتا نہیں کیوں؟ شراب اور جوتوں کے دھندے سے پنڈت جی مطمئن نہیں ہوئے اور انھوں نے اپنے اطمینان کے لیے جنیئو کا کاروبار شروع کیا۔ یہ دھندا شراب اور جوتوں سے بھی زیادہ چلا۔

ایک دن پنڈت جی مجھے مل گئے۔ بڑے پریشان تھے۔ پریشانی کی حالت میں ایسے لگ رہے تھے گویا کروڑوں جنیئو بیکار ہو گئے ہوں۔ میں نے دریافت کیا: "کیوں پنڈت جی کیا جنیئو کے دام گھٹ رہے ہیں؟ وہ بولے "نہیں یہ بات نہیں، دام تو میں خود ہی طے کرتا ہوں۔"

"تو کیا جنیئو بِک نہیں رہے؟" میں نے پوچھا۔

انھوں نے ترچھی نظروں سے میری جانب دیکھا اور بولے: "نہیں، ایسا نہیں۔" میں نے پھر پُوچھا: "تو کیا اس دفعہ الیکشن کا ٹکٹ نہیں مل رہا ہے؟"

"کسی کی کیا مجال جو مُجھے ٹکٹ نہ دے۔" وہ شیر کی طرح گرجے۔

"تو پھر کیا بات ہے؟ آپ پریشان کیوں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولے "دراصل کچھ دن پہلے میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ خواب میں ایک آتما نے مجھے درشن دیے تھے اور کہا تھا: آج کل لوگ دھرم کے راستے سے بھٹک کر اِدھر اُدھر جا رہے ہیں۔ انھیں پھر سے دھرم کی طرف لانا چاہیے اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ میں نے آتما سے پوچھا تھا، تو آتما بولی۔ اس کے لیے تمھیں ایک ایسا درخت لگانا ہوگا جو بہت بڑا ہو۔ اس درخت میں اتنی طاقت ہوگی کہ لوگ خود بہ خود اس کی طرف کھنچتے چلے آئیں گے اس درخت میں میری آتما کا نواس ہوگا اور اسی درخت سے مہادیو خوش ہوں گے لوگ پھر دھرم کو ماننے لگیں گے اور تمھارا شراب، جوتے اور جنیئو کا دھندا ویدیسیوں میں چل نکلے گا۔" پنڈت جی نے بتایا۔

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ آپ کوئی بھی درخت لگا دیجیے۔" میں نے سمجھایا۔

"کوئی ایک درخت کیوں لگاؤں؟" انھیں غصہ آگیا۔ بولے: "میں پیپل کا درخت لگانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے میں نے ملک بھر کے ہر شہر کی ہر نرسری سے ایک ایک پودا منگوالیا ہے۔ لاکھوں پودے میرے پاس آچکے ہیں اب درخت کہاں لگاؤں۔ یہ سمجھ میں نہیں آرہا۔ بس اسی وجہ سے پریشان ہوں۔" انھوں نے بتایا۔

"پر لاکھوں پودوں کے تو لاکھوں درخت ہو جائیں گے جبکہ آتما نے تو ایک ہی درخت لگانے کے لیے کہا ہے۔" میں نے کہا۔

"دراصل میرے پاس کچھ نقلی قسم کے پودے بھی آگئے تھے میں نے ہر پودے کی جانچ کمپیوٹر کے ذریعے کرائی اور کوالٹی کنٹرول کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک ہی پودے کو ترجیح دی ہے اور اس پودے کو میں نے پاوتر کرا لیا ہے۔ آخر پیپل کے درخت کا معاملہ ہے۔" وہ بولے۔

"پاوتر کرا لیا ہے؟!" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں پاوتر۔ اس کے لیے اس پودے کو گنگا جل سے دھویا۔ اگربتی اور دھوپ سے اس کی پوجا کی اس پر چندن چھڑا۔ اسے لال چُنری میں لپیٹا تب کہیں جا کر وہ پودا پاوتر ہوا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ درخت کہاں لگاؤں؟"

"درخت لگانے کے بعد آپ کیا کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"درخت لگانے کے بعد درخت کے چاروں طرف ایک چبوترا بنواؤں گا۔ اس پر عطر کا چھڑکاؤ کروں گا تاکہ لوگوں کو درخت کی

(خو)شبو ملتی رہے۔ اور اس خوشبو سے لوگ کھنچے
(چ)لے آئیں پھر جس نرسری سے پودے آئے ہیں اُن
(ک)و درخت کے شیئر الاٹ کروں گا جس سے انھیں
(ا)پنی نرسری ٹھیک ٹھاک چلانے میں آسانی ہو۔"
(ان)ھوں نے بتایا۔

میں نے ایک دوست کا فرض ادا کیا اور
(ا)نھیں پریشانی کے عالم میں چھوڑ کر چلتا بنا۔

دوسرے دن پنڈت جی پھر میرے پاس
(آ)ئے۔ بڑے خوش تھے گویا انھیں بین الاقوامی
(ام)ن قائم کرنے کا نسخہ ہاتھ آگیا ہو۔ بولے "کل رات
(مج)ھے پھر خواب دکھائی دیا۔"

"کیا آتما پھر آئی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں اس دفعہ آتما نے مجھے درخت لگانے
(کی) جگہ بھی بتائی۔" انھوں نے بتایا۔ بولے "تمھاری
(س)وسائٹی کے باہر ایک میدان ہے۔ اس میدان
(می)ں ایک قبر ہے۔ قبر کی جگہ ہی درخت لگانا ہے۔"

"پر وہیں کیوں؟ وہاں تو قبر ہے۔" میں
نے پوچھا۔

"وہاں اس لیے کہ اسی جگہ آتما کا جنم ہوا تھا۔
(قب)ر تو بعد میں بنائی گئی۔" پنڈت جی نے بتایا۔ ان کی
(آن)کھوں میں ایک نئی روشنی دکھائی دی۔

"پر اس پر پھینے خاں کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"اعتراض کیوں ہوگا؟ درخت میدان میں
(لگ)ا رہا ہوں کوئی اس کے گھر میں تو نہیں لگا رہا۔"
(انھ)وں نے اس طرح کہا جیسے جنگ کا بگل بجانے
(جا ر)ہے ہوں۔ پھینے خاں کو جب یہ پتا چلا کہ پنڈت جی
(قب)ر پر پیپل کا درخت لگانے والے ہیں تو وہ ایسے
(اچ)ھلا کودا جیسے اس کی پتلون میں کاکروچ گھس گیا
(ہو)۔ اس قبر پر تو لوگ چادر چڑھانے آتے ہیں۔
(اب) اگر وہاں درخت لگ گیا تو چادر کس پر
(چڑ)ھائیں گے۔ اسے یہ بات گوارا نہیں تھی لہٰذا

اس نے میدان کے چاروں طرف کٹیلے تاروں
کی باڑھ بنادی اور پنڈت جی کو کہلوا بھیجا۔ "تم
وہاں درخت نہیں لگا سکتے۔ وہاں لاکھوں لوگ
چادر چڑھانے آتے ہیں۔" پنڈت نریندر ناتھ
شاستری جی کو جب پیپل کے درخت کے لیے
پھینے خاں کے حسد کا پتا چلا تو وہ غصّے سے بھڑک
اٹھے اور غصّے میں انھوں نے سوسائٹی کے
نوجوانوں کو جمع کیا اور بولے "یہ پھینے خاں مجھے
پیپل کا درخت لگانے کے لیے منع کر رہا ہے
وہ تو آتما کا جنم استھان ہے۔ درخت لگانے
کے لیے میں نے ملک کی ہر نرسری سے ایک
ایک پودا منگوا لیا تھا۔ اسے پاو تر بھی کروا لیا
ہے لیکن یہ پھینے خاں ہماری سبھیتا کو برباد کرنے
پر تُلا ہوا ہے۔"

"پر اب آپ کریں گے کیا۔ پھینے خاں نے
تو وہاں تار لگوا دیا ہے۔" ایک نوجوان نے پوچھا۔

"میں اس کے خلاف بھوک ہڑتال کروں
گا۔" پنڈت جی بولے۔

"پر پھینے خاں تب بھی نہ مانا تو؟"

"تو میں بڑے بڑے ہاتھیوں پر جلوس
نکالوں گا۔" پنڈت جی شیر کی طرح گرج کر بولے
ان کی گرج کے ساتھ ہی نوجوانوں نے درخت
کے لیے قربانی دینے کی قسم کھائی۔

ایک دن پنڈت جی پھر مجھے مل گئے۔ بڑے
پریشان تھے۔ کہنے لگے "پھینے خاں نے وہاں تار
لگوا دی ہے۔ اب درخت کیسے لگاؤں؟"

میں نے کہا "جب وہاں قبر ہے تو آپ
درخت کہیں اور لگا دیجیے۔" میری بات سُن کر
انھیں غصہ آگیا۔ بولے "میں تمھارا فلسفہ ماننے
کے لیے مجبور نہیں ہوں۔ یہ آتما کا معاملہ ہے۔
پتا ہے تمھیں ۸۳ فیصد لوگ میرے ساتھ ہیں۔

انھوں نے دل کی بات سن کر اپنی آمدنی کا آدھا حصہ
مجھے دان کر دیا ہے۔"

"پر جب پھینے خاں نہیں مان رہا تو آپ
کیا کریں گے؟"

"کل سے میں پرورشن کرنے والا ہوں۔"
انھوں نے اپنا پروگرام بتایا۔

پھینے خاں کو جب یہ معلوم ہوا کہ پنڈت جی
پرورشن کرنے والے ہیں تو اس نے قبر کے چاروں
طرف اپنے آدمیوں کا گھیرا ڈلوا دیا۔ کئی لوگ قبر
کو گھیر کے کھڑے ہو گئے اور پھر ایک دوسرے
سے کہنے لگے "اب دیکھتے ہیں پنڈت جی کس طرح
یہاں درخت لگاتے ہیں۔"

تب پنڈت جی نے لوگوں سے کہا "اب
ہم اس پاوتر پودے کا کیا کریں؟"

"اس جگہ پر تو پیپل کا درخت لگانا چاہیے۔"
ایک نوجوان نے کہا۔

"ملک کی ہر نرسری سے پودے آچکے ہیں۔"
دوسرے نے کہا۔

پنڈت جی سب کو اپنے ساتھ دیکھ کر مطمئن
ہوئے۔ اب تک ان کے پاس کروڑوں روپے
جمع ہو گئے تھے۔ وہ دل ہی دل میں یہ ٹھان
چکے تھے کہ اب اس دھندے کی شاخیں ملک کے
دوسرے شہروں میں بھی کھولیں گے۔ کچھ دنوں
کے بعد الیکشن ہوا۔ الیکشن میں پنڈت نے درخت
لگانے کا ایک پروگرام پیش کیا۔ ایک نامہ نگار
نے پنڈت جی سے دریافت کیا۔

"آپ وہیں درخت لگانا کیوں چاہتے ہیں؟"

"اس لیے کہ جو وہاں ہے وہ کہیں نہیں
ہے اور جو کہیں نہیں ہے وہ وہاں ہے۔" پنڈت
جی نے بتایا۔ الیکشن کے دوران پنڈت جی لوگوں
کو دھرم کے بارے میں بتاتے۔ تاریخ بتاتے

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

روورق کے اندرونی صفحے کے لیے
ولہ عنوانات

دسمبر ۱۹۹۲ء کے "ایوانِ اُردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جارہے ہیں ——— "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جارہے ہیں۔

شعری عنوانات

زندگی سے تنگ ہے، جینے سے سیر ہے
بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے (انیس)

مرسلہ: جویریہ فردوس نادر، معرفت ایس۔ ایف۔ رحمٰن نادر، قاضی پورہ، کلمب ۴۴۵۴۰۱، ضلع ایوت محل (ایم۔ ایس)

نیں ڈال کے چہرے پہ جاچکا ہے وقت
کے دیکھے وہ مجھ کو تو احتساب کروں (رونق شہری)

مرسلہ: ناظمہ رونق، دوبتا، ضلع گیا (بہار)

نیں آج رخ کی جھریاں دیکھا کیے
وانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کیے (صفی لکھنوی)

مرسلہ: رشدی حسن، لکھنؤ

تو ہم سفر کا ذہن پر طاری رہا برسوں
منزل پہنچ کر بھی سفر جاری رہا برسوں (عشرت دھولپوری)

مرسلہ: محمد حسین، برہانپور

ش و حواس تاب و تواں داغ جاچکے
ب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا (داغ دہلوی)

مرسلہ: محمد علی، برہانپور

کچھ لکھ رہا ہے دیر سے بجھتا ہوا چراغ
ہے دور تک فضا میں دھوئیں کی لکیر سی (مبارک شمیم)

مرسلہ: بدر سعیدی، ٹونک

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں میں ضعف پیری سے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو (میر انیس)

مرسلہ: غزالہ ہاشمی، گیا



پچھلے ماہ کی تصویر

ضعیفی زور پر آئی ہوتے بے دست و پا جبر
لیا بچوں سے بدتر ہم کو پیری نے جواں ہو کر (اکبر الہ آبادی)

مرسلہ : ناصر حسین، برہانپور

اچھو بھائی، برہانپور

اب بہارِ عمر ہے صرفِ خزاں
شک ہوتا ہے نہالِ زندگی (حفیظ جونپوری)

مرسلہ : طفیل احمد انصاری، جونپور

شعلہ زن دل میں خیالِ عارضِ پُر نور ہے
روشن اس اُجڑے ہوئے گھر میں چراغِ طور ہے (راسخ دہلوی)

مرسلہ : ظہیر افراز محمد حسین، برہانپور

خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب
تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا (سودا)

مرسلہ : فیضان فیضی نادر، کلمب

شباب ہاتھ سے جاتا رہا پتا نہ چلا
اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں کمر جھکائے ہوئے (نامعلوم)

مرسلہ : کنور محمد ندیم خاں، ٹونک

میں وقت کے صحراؤں میں بھٹکا ہوا راہی
ملتی ہے کہاں چھاؤں گھنی دیکھ رہا ہوں (اختر بستوی)

مرسلہ : ایثار محمد، بارہ بنکی

جس نے دیکھی ہے ترے پرکھوں کی عظمت لوگو!
آج بھی گاؤں کا وہ بوڑھا شجر باقی ہے (پرویز کمال)

مرسلہ : شیراں، ہزاری باغ

پت جھڑ کی رُت آ گئی چلو اب اپنے دیس
چہرہ پیلا پڑ گیا دھولے ہو گئے کیس (شین کاف نظام)

مرسلہ : معین الدین شمسی، گریڈیہہ

چلے بھی آؤ اندھیرا قریب ہے مجھ سے
کہ انتظار میں ہونے لگی نظر پتھر (عرفان نجمی)

مرسلہ : وسیم اکرم، برہانپور

نہ دیکھو میرے بڑھاپے کی جھریاں ہنس کر
ہر اک شکن میں جوانی کے تجربات پڑھو

مرسلہ : قادر بابا، اندور

گردشِ وقت کا اعجاز تو دیکھے کوئی
میری تصویر بھی اب مجھ سے جدا لگتی ہے (ثاقب اندوری)

مرسلہ : فرح خورشید، برہانپور

جب تک جیے بکھرتے رہے ٹوٹتے رہے
ہم سانس سانس قرض کی صورت ادا ہوئے (نامعلوم)

مرسلہ : محمد نسیم، سنبھل

ہاتھ کو اب عصا بنا لو کلیم
راستہ یوں نظر نہ آئے گا (مسعود کلیم)

مرسلہ : نغمہ شاہین، ہزاری باغ

غزالہ شہناز، برہانپور

پژمردہ پھول تو مری مٹھی میں رہ گئے
خوشبو کو مجھ سے چھین ہوا لے کے اُڑ گئی (بشیر بدر)

مرسلہ : عبدالمنان، برہنڈہ

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا (فانی)

مرسلہ : عابد حسین، برہنڈہ

نثری عنوانات

"ڈھلان پر رُکے ہوئے قدم" (شوکت حیات کا افسانہ)
مرسلہ : عابد نیاز،
معرفت ایس۔ این۔ حمید شمس والا
کٹرہ منڈی، سلطان گنج، لکھنؤ

"کہانی تمھیں لکھنے والی ہے" (الیاس احمد گدی کا افسانہ)
مرسلہ : یاسر ملک، شاہ جہاں پور

"بوڑھا یوکلپٹس" (مسرور جہاں کا ناول)
مرسلہ : ممتاز علی، بھاگلپور

"در بدری" (رتن سنگھ کا افسانہ)
مرسلہ : محمد شکیل الرحمٰن، بھاگلپور

"بڑھاپا" (نظیر اکبر آبادی کی نظم)
مرسلہ : فردوس النسا، ٹونک

نئی مطبوعات

اُردو ناول میں عورت کا تصوّر

مصنف : فہمیدہ کبیر
صفحات : ۱۴۷
قیمت : ۴۵ روپے
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اُردو میں خواتین کے مسائل، ان کے ادب اور ادب میں خواتین کے تصور کے بارے میں کم لکھا گیا ہے۔ البتہ گزشتہ چند برسوں سے اس موضوع کی طرف توجہ دی جانے لگی ہے۔ ڈاکٹر شمیم نکہت کی تصنیف "پریم چند کے نسوانی کردار" ڈاکٹر نیلم فرزانہ کا تحقیقی مقالہ "اُردو کی خواتین ناول نگار" اور گزشتہ سال اُردو ادب میں خواتین کا حصہ جیسے موضوع پر دہلی اُردو اکادمی کا سمینار اس سلسلے کی کڑیاں ہیں اب فہمیدہ کبیر کی تازہ تر تصنیف "اُردو ناول میں عورت کا تصوّر" اس موضوع پر اہم تصنیف ہے فہمیدہ کبیر نے اپنی تحقیق و تنقید کے دائرے کو اگرچہ نذیر احمد سے پریم چند تک محدود رکھا ہے لیکن طبقۂ نسواں کے بارے میں بتدریج ارتقائی تصوّر کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے یہ دَور نہایت اہم ہے۔ یہی وہ زمانہ بھی ہے جب ہندستانی سماج جمود سے حرکت پذیری کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور سیاسی و معاشی سطح پر ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں کہ سماج کا ہر طبقہ ان سے متاثر نظر آنے لگتا ہے اسی زمانے میں اُردو ناول نے اپنے آغاز و ارتقا کے مراحل طے کیے ہیں۔ اس لیے سماجی تبدیلیوں کے پس منظر میں طبقۂ نسواں کے بارے میں بدلتے ہوئے تصور کو سمجھنے اور تجزیہ کرنے میں ناول کا یہ دور بنیادی حیثیت رکھتا ہے فہمیدہ کبیر نے انھی بنیادی کڑیوں کو کھنگالنے اور ان کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔

فہمیدہ کبیر نے نہ صرف اس دور کے اہم ناولوں کا مطالعہ کیا ہے بلکہ تاریخ کے آئینے میں عورت کی بدلتی ہوئی حیثیت، سیاسی، معاشی، سماجی و تہذیبی تناظر میں عورت کے عروج و زوال اور اس کے اسباب و محرکات کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جس نے اس مقالے کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ انھوں نے جذباتیت سے گریز کیا ہے، غور و فکر کو اپنا مشیر بنایا ہے اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے مدلّل انداز میں شواہد کے ساتھ اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے اور مختلف ناول نگاروں کے یہاں مثالی عورت کا جو تصور ابھرتا ہے اس کو ہر باب کے آخر میں اختصار کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق نذیر احمد اگرچہ طبقۂ نسواں کی اصلاح تو چاہتے تھے لیکن ان کے یہاں عورت کی آزادی کا تصوّر، مذہب اور گھر کی چہار دیواری تک ہی محدود ہے جہاں وہ اُمورِ خانہ داری اور بچوں کی تعلیم و تربیت میں معروف نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس رتن ناتھ سرشار کی عورت زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ فہمیدہ کبیر کے الفاظ میں:

"سرشار کی مثالی عورت نہ حد سے زیادہ قدامت پرست ہے نہ بے انتہا آزاد۔ وہ اسے زندگی کی نعمتوں سے لذت اندوز ہونے کا پورا موقع دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھرنے اور چمکنے کا موقع بھی، چنانچہ ان کی آئیڈیل عورت محض خشک مزاج واعظ نہیں بلکہ مختلف علوم و فنون سے اس کی واقفیت قابلِ ستایش ہے... ان کی مثالی عورت بڑی حد تک مذہب کی بندشوں سے آزاد ہے۔ اس کے کردار میں شوہر پرستی کی صفت کو سرشار مستحسن قرار دیتے ہیں لیکن بیوی پر شوہر کی برتری کے قائل نہیں۔ وہ عورت کی انفرادیت کا احترام کرتے ہیں اسی لیے ان کے یہاں مرد اور عورت کے درمیان مساوات کا تصوّر ملتا ہے جو مغرب کی لبرل تہذیب کی دین ہے۔"

رسوا کی عورت اگرچہ طبقۂ متوسط تک محدود رہتی ہے لیکن پریم چند تک پہنچتے پہنچتے اس کا دائرہ خاصا وسیع ہو جاتا ہے جس میں اعلیٰ و ادنیٰ، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ، شہری معاشرے اور دیہی معاشرے کی عورتیں شامل ہو جاتی ہیں اور آزادی کے ساتھ کھلی ہوئی فضا میں سانس

لیتی ہوئی نظر آتی ہیں جن کی اپنی ایک شناخت بھی ہے۔ اور وہ اس منزل پر پہنچ جاتی ہیں کہ بقول مصنفہ اگر حالات مجبور کریں تو وہ کسی کی دست نگر ہونے کے بجائے ملازمت یا دست کاری کو وسیلۂ معاش بنا سکتی ہے وہ ایک ایسی عورت ہے جو صنعتی دور کی روز افزوں پیچیدگیوں کے پیش نظر گھر اور سماج دونوں کے لیے باعث رحمت بن سکتی ہے۔

فہمیدہ کبیر کی یہ کوشش بھی رہی ہے کہ وہ ایسے پہلوؤں کو تلاش کرسکیں جو محکومی سے آزادی، جہالت سے تعلیم، بے چارگی سے خود اعتمادی، بے بسی سے خود حفاظتی اور لاچاری سے خود کفالتی کی طرف رہنمائی کرسکیں۔ لیکن خود شناسی کے لیے جہاں جنس مخالف کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں اُسے اپنے باطن میں بھی جھانکنا پڑتا ہے۔ عورت خود کیا چاہتی ہے اور وہ سماج میں اپنی کیسی تصویر پیش کرنا چاہتی ہے اس کا بہتر اظہار خواتین ناول نگار ہی کرسکتی ہیں لیکن فہمیدہ کبیر نے اس جائزے میں اُردو کی خواتین ناول نگاروں کو نظر انداز کر دیا ہے انھوں نے اگر اس کی طرف بھی توجہ دی ہوتی تو یہ جائزہ زیادہ مکمل ہوسکتا تھا۔

کتاب کا سرورق دیدہ زیب، کاغذ سفید اور چکنا ہے نیز کتابت وطباعت میں نفاست کا خیال رکھا گیا ہے۔

—— عظیم الشان صدیقی

۲۰۰۲، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

داتا دیال مہرشی شوبرت لال ورمن

مصنف : ڈاکٹر محمد انصار اللہ
قیمت : ۱۰ روپے
ناشر : ساہتیہ اکادمی، دہلی

اُردو کے ایک کثیر التصانیف مصنف مہرشی شوبرت لال ورمن کی دریافت کا سہرا ڈاکٹر محمد انصار اللہ کے سر ہے۔ انھوں نے نہ صرف مہرشی جی کو دریافت کیا بلکہ علمی وادبی حلقوں میں مہرشی جی کے از سر نو تعارف کا بیڑا بھی اُٹھایا۔ اور اس سلسلے میں شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک کُل ہند سیمینار کا انعقاد کرایا۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ کی یہ تحقیق یا دریافت ان کے اسی ذوق وشوق کا نتیجہ ہے جو انھیں اُردو زبان و ادب کے ساتھ ہے۔

ساہتیہ اکادمی نے موصوف کی کتاب "مہرشی شوبرت لال ورمن" "ہندستانی ادب کے معمار" سیریز کے تحت شائع کی ہے جس میں انھوں نے مہرشی جی کی ولادت سے وفات تک کے مختصر حالات جمع کر دیے ہیں۔ ساتھ ہی مہرشی جی کی علمی، ادبی اور مذہبی خدمات کا ایک مختصر جائزہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ کی دلچسپی مہرشی جی سے اس لیے ہے کہ اُردو زبان میں لکھتے تھے۔ اور عہد ساز رسالہ "زمانہ" کے بانی تھے جس نے پریم چند جیسے ادیب کو متعارف کرایا۔

ہندستان کی دوسری زبان خصوصاً ہندی اور انگریزی میں بھی اس کتاب کے ترجمے کی خواہش کا اظہار بہت سے ذی علم حضرات نے کیا ہے۔ ہم ان کی خواہش کا احترام کرتے ہیں مگر ہمارا خیال ہے کہ ان حضرات کو اصل زبان سیکھنا چاہیے تاکہ مہرشی جی کے خیالات و نظریات سے واقفیت کے ساتھ ساتھ وہ ان کے اسلوب کی خوبیوں کا اندازہ بھی کرسکیں۔

اس کتاب کا مطالعہ اُردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے سود مند ہوگا۔

—— اسعد بدایونی

شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی)

خاکستر دل

مصنف : اخلاق سہسوانی
صفحات : ۱۶۰
قیمت : ۲۵ روپے
ملنے کے پتے : ۱۔ (مصنف) سہسواں، ضلع بدایوں۔
۲۔ ماڈرن بک ڈپو، نزد سبزی منڈی، بدایوں۔
۳۔ عبدالقیوم بک اسٹال، نزد تحصیل گیٹ، بدایوں۔

کتاب کا نام "خاکستر دل" تجویز کر کے مصنف نے اپنی فکر، احساس اور جذبے کو سمیٹ کر ایک معنی خیز ترکیب میں سمو دیا ہے یہ نام شاعر کے کرب دروں اور صلاحیت فن دونوں کا آئینہ دار ہے۔

شاعر کا وطن علما فضلا اور صلحا کا مولد ومسکن ہے کئی تاریخی کتابیں اہل سہسوان کی علمیت شرافت اور انسانی اقدار کے احترام کا ثبوت فراہم کرتی ہیں اخلاق صاحب اسی تہذیبی اور اخلاقی ماحول کے پروردہ ہیں سہسوان کی روایات اور کلچر کا اثر ان کے کلام پر بھی منعکس ہے۔

اخلاق صاحب کے اس مجموعے میں اچھے اور دل کو چھو جانے والے اشعار کافی تعداد میں ہیں اور ان سے مختلف المذاق لوگوں کے ذوق کی تسکین ہوسکتی ہے چند شعر مشتے نمونہ از خروارے :

دُنیا فریب دیتی رہی ہم کو۔ اور ہم
کچھ سوچ کر خلوص کے سانچے میں ڈھل گئے

"کچھ سوچ کر" میں رمز و کنایہ کا جو حسن ہے وہ داد طلب ہے۔

میرے مالک مرا جرم اتنا تو سنگین نہیں
مجھ کو اس دور میں جینے کی سزا دی جائے

ناسازگاری حالات پر اس سے زیادہ پُر اثر شکوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

کسی قدر ترے غم کی نوازشیں تو ملیں
مگر یہ دل تو غمِ بے حساب مانگے ہے

غم کے لذت شناس بلاشبہ غم موجود سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔

ایک شعر بطور خاص ملاحظہ ہو:

گلوں کی آنکھ میں آنسو بھرے تھے وقتِ سحر
چمن کی رات کٹی کس طرح خدا جانے

شاعر نے قاری کے سوچنے کے لیے جو کچھ چھوڑا ہے وہ اسے خون کے آنسو رُلا سکتا ہے۔

اور یہ مقطع:

اب زمانے کا تقاضہ تو یہی ہے اخلاق
دار پر چڑھ کے انا الحق کی صدا دی جائے

شاعری جمالیات کا فن ہے لیکن صبر آزما حالات نے اسے جلالی اندازِ فکر عطا کیا ہے شاعر نے "انا الحق" کی روایت کے ساتھ کچھ نئے مفہوم وابستہ کر دیے ہیں۔

خاکسار تبصرہ نگار کا سرزمین علم و عرفان سہسوان سے یہ دیرینہ تعلق ہے کہ سادات سہسوان اور سادات مودودی امروہہ کا شجرۂ نسب مشترک ہے اس تعلق خاص کے باوجود اخلاق صاحب کے لیے میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ ایسا شعر کہنے کی کوشش ہی نہ کریں جس میں ان کا تخلص بحر کی غنائیت کے خاتمے کا سبب بن جائے اور انھیں قاری سے بانداز اعتذار کوئی درخواست کرنی پڑے۔

——— تاباںؔ نقوی

سی۔۵۲، منٹو روڈ کامپلیکس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سیاہ لمس

مصنف : صابر زاہد
صفحات : ۱۶۰
قیمت : ۵۱ روپے
ملنے کا پتا : ڈاکٹر تنویر عالم، ۳۰۲، شنی پیٹھ، جلگاؤں ۴۲۵۰۰۱ (مہاراشٹر)

غزلوں، نظموں اور قطعات کے اس مجموعے کی تخلیق صابر زاہد نے کی ہے جو جلگاؤں (مہاراشٹر) کی جانی پہچانی شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں پروفیسر عنوان چشتی نے ان کی شاعری کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ "انھوں نے اپنے باطن کا اظہار جس صلابت سے کیا اُس کا احساس ہر غزل سے ہوتا ہے ... ایک دریا ہے جو کناروں کو توڑ کر باہر نکلنے کے لیے مضطرب ہے ..."

مقیم اثر بیاولی کا خیال ہے کہ صابر زاہد کے ہاں تقلیل الفاظ کے باوجود کثرت معنیٰ کی ایک جہت ادب کے ایک انوکھے تخلیقی زاویے کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتی ہے۔" اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ انھوں نے اپنے اشعار میں زندگی کے کرب کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید اُن کے یہ اشعار کرتے ہیں:

سچّائی کے دام بڑھیں گے
جھوٹ کی جب پیمائش ہوگی

کیوں بناتے ہیں گھروندے بچے
خواب کیا راج محل کے ہوں گے

کر دیتا ہے کوئی لاشعور کا ملبہ
جو گھر سے بھاگ گیا وہ شعور میرا تھا

وہ آج چپ ہے مگر کل ضرور سوچے گا
لپٹ میں کیوں نہ گیا اُس سے بات کرتے ہوئے

شاعر نے اپنے افکار کی قیمت میں کتابت اور طباعت کی خوبیاں سمیٹ کر اضافہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔

——— پرواںؔ ردولوی

۱۷۸، شوا کھنڈ، وشو کرما نگر، دہلی ۱۱۰۰۹۵

چانکیہ نیتی

شاعر : بشن داس وشنو
قیمت : ہدیۂ عقیدت
ملنے کا پتا : بلدیو کرشن اثر، ای۔۲۳۔ جی، ایم۔ آئی۔ جی فلیٹ، مایا پوری، نئی دہلی

"چانکیہ نیتی" (پنجابی کویتائیں) حال ہی میں کتابی شکل میں چھپ کر سامنے آئی ہے اور پنجابی کو اُردو رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ اس کے مترجم ہیں مرحوم بشن داس وشنو۔ شری وشنو پنجابی کے اونچے درجے کے شاعر تھے۔ اُردو پر بھی عبور حاصل تھا۔ اپنے جیتے جی انھوں نے سمراٹ چندر گپت کے مہامنتری وشنو گپت چانکیہ کی مشہور کتاب ارتھ شاستر کا پنجابی بھاشا میں ترجمہ کیا تھا۔ کام بہت مشکل تھا۔ لیکن بہت ہی خوبی سے سرانجام دیا۔ یہ نظم اُردو "ملاپ" میں

نسخہ دار چھپی تھی، جس کو پڑھنے والوں نے سراہا۔ لیکن افسوس وہ اپنی زندگی میں اس کو کتابی صورت نہ دے سکے جس کی سخت ضرورت تھی۔ اس دُنیائے فانی کو چھوڑنے سے پہلے انھوں نے اپنے شاعر بیٹے جناب بلدیو کرشن اثر کو اس کا مسودہ دیا تھا۔ انھی نے اب اس نیک کام کو سرانجام دیا ہے۔ پڑھنے والے جو اُردو اور پنجابی دونوں زبانیں جانتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔ وشنو گپت چانکیہ کی وہ گہری باتیں جو عام طور پر لوگوں کی سمجھ نہیں آتیں، وہ اس پنجابی کو یتا میں اُجاگر ہو اٹھی ہیں۔

کتاب کا گیٹ اَپ بہت اچھا ہے۔

——— کلدیپ تلوار

قلزمِ اعجاز

مُصنّف : عالم لکھنوی

صفحات : ۳۲۰

قیمت : ۳۴ روپے

ناشر : میرزا محمد یوسف، ۱۳۲۔ گولہ گنج، لکھنؤ (یو۔پی)

"قلزمِ اعجاز" میرزا الطاف حسین عالم لکھنوی کی مثنویوں اور قطعات تاریخ کا مجموعہ ہے جسے میرزا محمد یوسف نے مرتب کرکے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ پروفیسر ولی الحق انصاری نے لکھا ہے اور تعارف ڈاکٹر فدا حسین نے، پیش نامہ ڈاکٹر انیس اشفاق کا ہے اور حرفِ آغاز اس کتاب کے مرتب میرزا محمد یوسف کا۔

عالم لکھنوی اپنے زمانے کے ایک ایسے شاعر تھے جنھیں ہر صنفِ سخن پر دسترس حاصل تھی، انھوں نے اپنی زندگی میں ہزاروں شعر کہے جن میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں تقریباً دو سو قطعاتِ تاریخ شامل ہیں۔ چند سہرے اور قصیدے بھی "قلزمِ اعجاز" کا حصّہ ہیں۔ جو شاعر کی قادر الکلامی کے عکاس ہیں۔

عالم لکھنوی کے پاس جوش ملیح آبادی کی طرح الفاظ کا وسیع ذخیرہ تھا اور انھیں اس ذخیرے کو استعمال کرنے کا فن آتا تھا۔ ہر صنفِ سخن کے مطالبات پوری طرح ادا کرسکتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ عالم لکھنوی جس دور میں جیے اس میں لکھنوی تہذیب کا رنگ خاصا چوکھا تھا اس لیے "قلزمِ اعجاز" کے مطالعے سے اس دور کے لکھنؤ کی ثقافت اور تہذیب کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔

——— ایس۔اے۔رحمٰن

۷۔۱۰۵، گرین پارک، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

بقیہ :

جو وہاں ہے وہ کہیں نہیں

اور آتما والا خواب بتاتے ———

لوگ پنڈت جی کی باتوں کو سنتے اور متاثر ہوتے جاتے۔

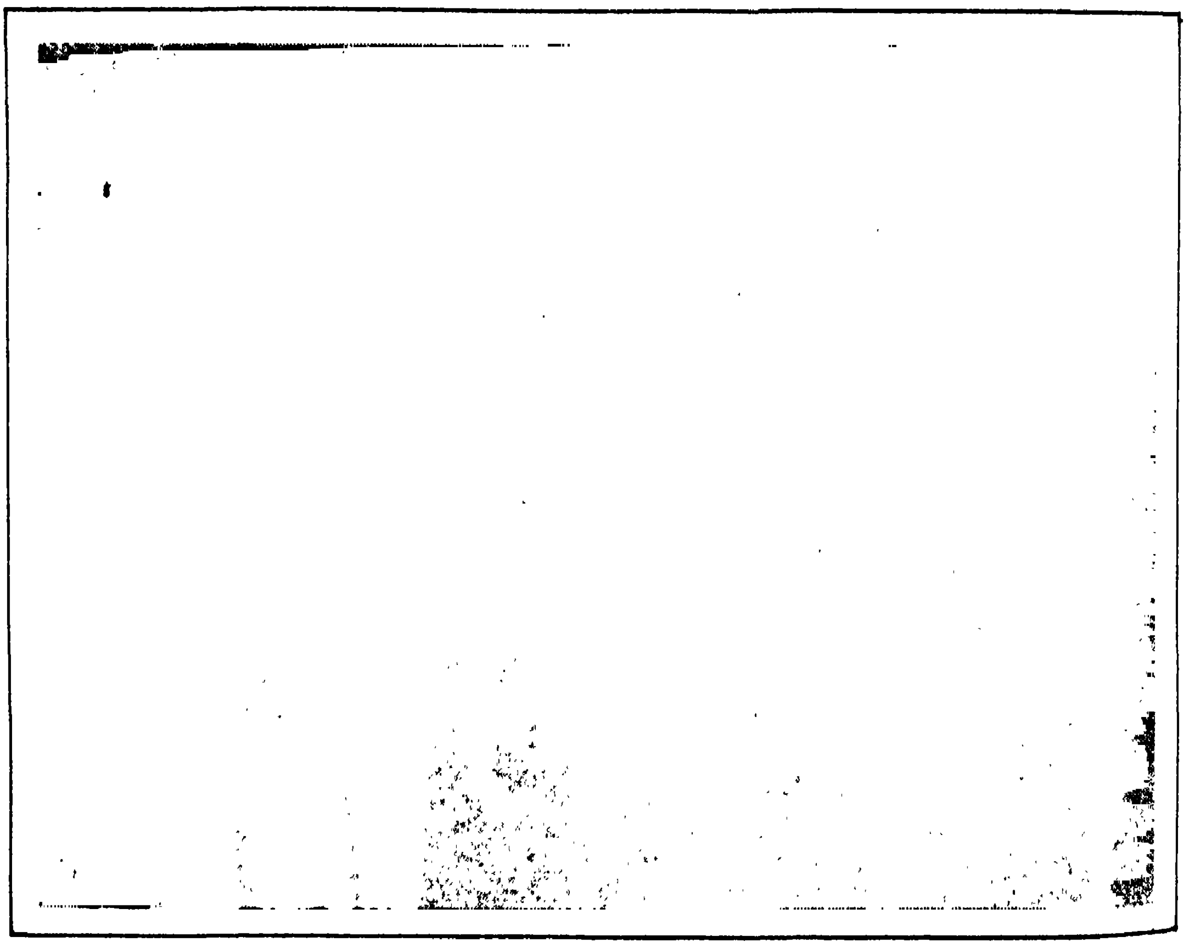
الیکشن میں پنڈت جی کی جیت ہوئی تب ایک نے پنڈت جی سے پوچھا "کیوں پنڈت جی اب تو درخت لگ جائے گا؟"

ہاں ہاں! لگ جائے گا، لگے گا کیوں نہیں! اب درخت تو کیا پورا باغ وہاں لگایا جائے گا۔ پنڈت جی نے مغلیہ دور کے حکمراں والی کیفیت پیدا کرکے کہا اور شپت لینے کے لیے راجدھانی کی طرف چل پڑے۔

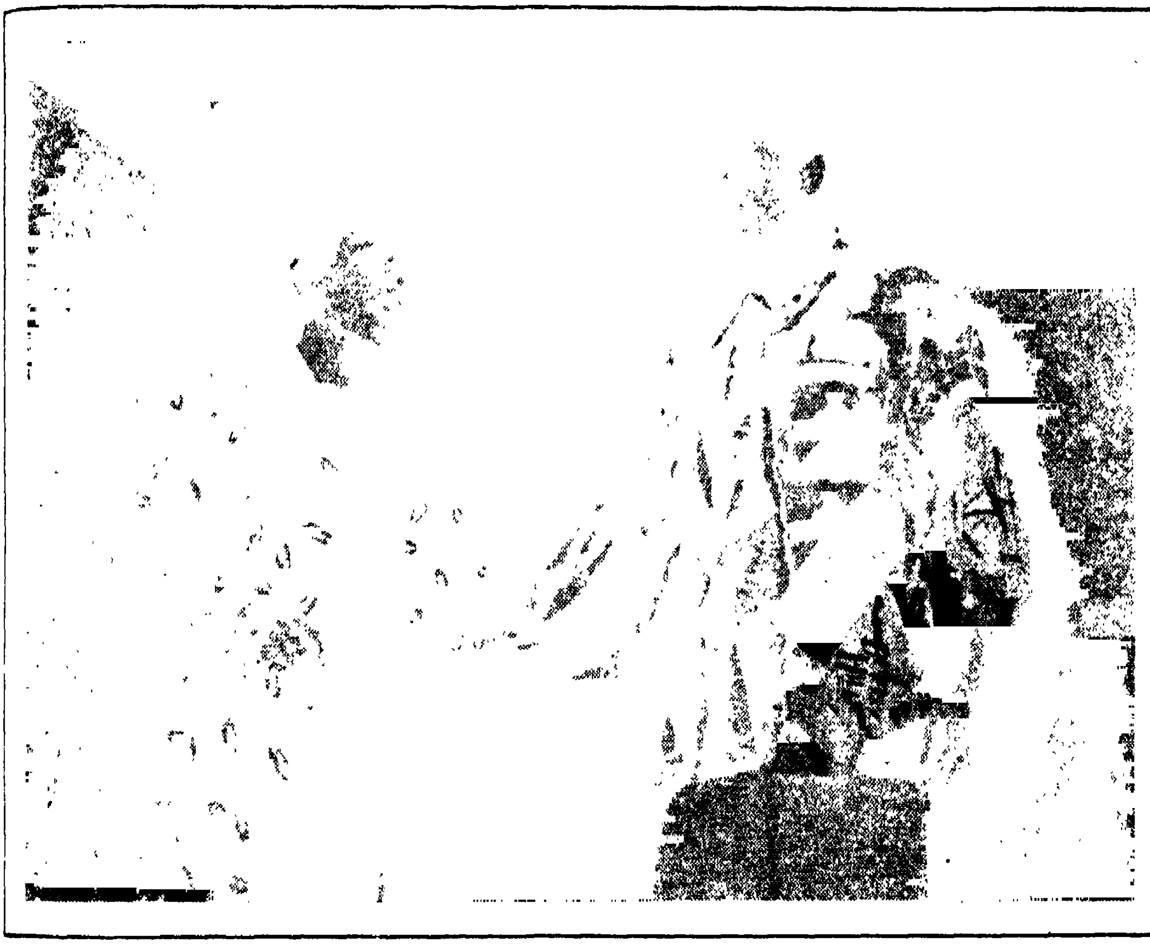
اُردو خبر نامہ

اُردو ڈراما فیسٹول

اُردو اکادمی' دہلی کی جانب سے پانچواں اُردو ڈراما فیسٹول ۱۵ ر نومبر سے ۲۰ ر نومبر تک شری رام سینٹر منڈی ہاؤس میں ہوا۔ یہ فیسٹول کامیاب رہا۔ ہم سیّد اشتیاق عابدی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اُردو کی بقا اور سالمیت کے لیے اس فیسٹول کا انعقاد کامیابی کے ساتھ کیا۔ پہلا ڈراما ۱۵ ر نومبر کو "غازی پور کا حجّام عرف کیا کرے گا قاضی" پیش کیا گیا۔ یہ پوروابھیاس گروپ کی پیش کش تھا اور ہدایت ایمانوین کی تھی۔ کہانی ایک لاوارث لڑکی کی ہے۔ لڑکی کا خود ساختہ وارث حکیم بتّن خاں ہے جو لڑکی سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے' مگر لڑکی ایک اور نوجوان نواب پر عاشق ہو جاتی ہے۔ حکیم بتّن خاں کے کردار میں راجکمار کا کام بہت اچھا تھا۔ ۱۶ ر نومبر کو گلوبل میڈیا پروڈکشن



ڈراما "غازی پور کا حجّام عرف کیا کرے گا قاضی" میں بتّن خاں' نواب اور روشنی کے کردار میں راجکمار' راجیش اور ایمانوین



ڈراما "یک شد نہ دو شد، تین شد" میں تحسین منور اور سنیتا ٹھکرال سندر موہن اور رینا کے روپ میں

کی پیش کش "شطرنج کے مہرے" دکھایا گیا۔ اس کے ڈراما نگار حبیب تنویر اور ہدایت کار منصور نقوی تھے۔ یہ ڈراما اودھ کے نواب واجد علی شاہ کے زمانے کی یاد تازہ کرتا ہے جب ہندستانیوں کی بے حسی اور باہمی چپقلشوں سے فائدہ اٹھا کر انگریز ملک پر قابض ہوئے۔ رجاور کے کردار میں اوما شنکر، مرزا کے کردار میں کرشن کانت ٹنڈن، میر صاحب کے کردار میں انوپ شرما اور کسان کے کردار میں انیل تھاپر نے قابل تعریف کام کیا۔ ۱۷ر نومبر کو انڈین آرٹ اینڈ کلچر گروپ کی طرف سے "آیئے دولہا میاں" پیش کیا گیا۔ ڈراما نگار عشرت ضمیر اور ہدایت کار عشرت کفیل کے اس ڈراما میں جہیز اور فرقہ پرستی کی برائیوں کو نمایاں کیا گیا ہے اور اس کے لیے طنز و مزاح سے کام لیا گیا ہے۔ شبانہ کے کردار میں وبھا چودھری نے بڑی فنکارانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ ۱۸ر نومبر کو تنا پروڈکشن کی طرف سے "یک شد نہ دو شد، تین شد" پیش کیا گیا۔ ڈراما نگار عطیہ بانو اور ہدایت کار شبیہہ عباس جعفری کے اس ڈراما میں راتوں رات امیر بن جانے والے لوگوں کے اوچھے پن کا بہت اچھا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ "یک شد نہ دو شد، تین شد" میں سب فنکاروں نے بڑی اچھی اداکاری کی ہے خاص طور سے سندر موہن کے کردار کو تحسین منور نے بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ ۱۹ر نومبر کا ڈراما "دو پیسے کی جنت" تھا۔ ڈراما نگار عبدل بسم اللہ اور ہدایت کار وبھانشو دبو تھے۔ تمثیلی انداز میں شخصی حکومت کی خرابیوں کو دکھایا گیا۔ بادشاہ کے صلاح کاروں کے روپ میں روہت تریاٹھی اور نواز الدین کا کام خاص طور پر متاثر کن تھا۔ ۲۰ر نومبر کو آخری ڈراما اندھیر نگری، اردو اکادمی کی طرف سے اسکول کے بچوں اور بچیوں نے پیش کیا۔ ایک راجا اپنی رعایا پر ظلم و ستم کے ساتھ حکومت کر رہا ہے — قاعدے قانون کا اللہ ہی حافظ ہے۔ ایک بزدل کے مر جانے پر ایک فقیر کو پھانسی کی سزا سنا



ایوارڈز کی تقسیم کے بعد اکادمی کے سیکریٹری جناب ایس۔ اشتیاق عابدی اور ڈپٹی سیکریٹری جناب بی۔ ایس۔ گبرا "آئے دولہا میاں" کے فنکاروں کے ساتھ

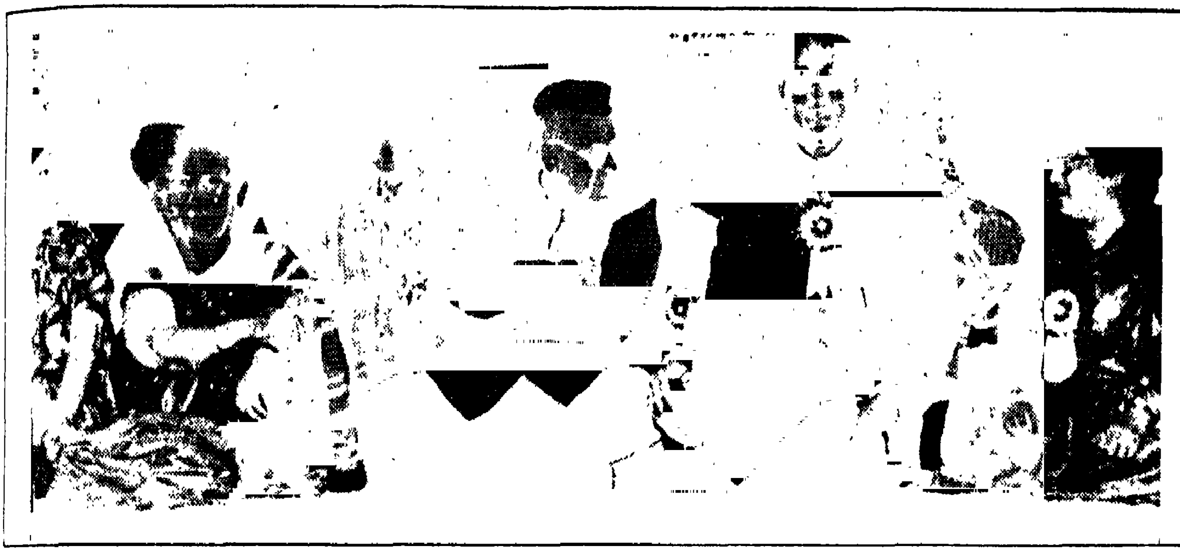
۔مگر آخر میں فقیر کہتا ہے جو پھانسی پر چڑھے
زہ سیدھا جنت میں جائے گا' وہاں موجود
ب لوگ کہتے ہیں ہم پھانسی چڑھیں گے اور
ن میں جائیں گے۔ احمق راجا کہتا ہے کہ ہمارے
تے ہوتے کون جنت میں جاسکتا ہے اس لیے
سی مجھے لگاؤ اور راجا کو پھانسی لگ جاتی
۔ آخری دن اُردو اکادمی دہلی کی جانب سے
ا گروپوں کی حوصلہ افزائی اور ترقی کے لیے
ایوارڈ پیش کیے گئے۔ یہ سب گروپ دہلی
تعلق رکھتے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو
نا ہے کہ اس طرح نئے اور پرانے فنکاروں
ور بھی مواقع ملتے رہیں گے۔ ہمیں توقع ہے کہ

دلّی انتظامیہ اور اُردو اکادمی اس طرح کے پروگرام مستقبل میں کراتی رہے گی' ہماری ایک تجویز بھی ہے کہ فیسٹیول سے پہلے ایک اُردو پریس کانفرنس کی جائے۔ ریڈیو اور ٹی وی کی طرف سے بھی اس ڈراما فیسٹیول کو نمایاں اہمیت دی جانی چاہیے۔

(روزنامہ "عوام" میں زبیر قریشی کی رپورٹ سے اقتباس)

سہ لسانی مشاعرہ

۲۰ نومبر کی رات کو ۸½ بجے نئی دہلی کے پیارے لال بھون میں ایک سہ لسانی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں اُردو کے علاوہ ہندی اور پنجابی کے شعرا اور شاعرات نے یک جہتی کے موضوع پر اپنا کلام سُنایا۔ اس مشاعرے کا اہتمام دہلی کی اُردو' ہندی اور پنجابی اکادمیوں نے اقلیتوں کے دن کی تقریبات کے سلسلے میں کیا تھا۔ مشاعرے کا افتتاح سیّد سبط رضی نے کیا اور صدارت جناب عزیز قریشی نے کی۔ اُردو اکادمی کے سیکریٹری جناب ایس۔ اشتیاق عابدی نے دونوں مہمانانِ گرامی کا خیر مقدم کرتے ہوئے قومی زندگی میں ان کی خدمات کا ذکر کیا اور اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے ان کی کوششوں پر بھی روشنی ڈالی۔ واضح ہو کہ



یوم اقلیت کے موقع پر منعقدہ سہ لسانی مشاعرہ ـــــ اسٹیج پر بائیں سے: بیگم ممتاز میرزا، جناب عزیز قریشی (صدرِ مشاعرہ) جناب سیّد سبط رضی (مہمان خصوصی) اور محترمہ نور جہاں ثروت نمایاں ہیں

جناب عزیز قریشی اس کمیٹی کے چیئرمین ہیں جو حکومتِ ہند نے اُردو یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں ابتدائی سفارشات اور تجویزیں پیش کرنے کے لیے قائم کی ہے۔ مشاعرے کے آغاز میں مہمانِ خصوصی سیّد سبط رضی صاحب نے اور اختتام پر صدرِ مشاعرہ جناب عزیز قریشی نے سامعین سے خطاب کیا اور ملک و قوم کی تعمیر و ترقی میں قلمکاروں کی ذمے داریوں پر زور دیا۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض مخمور سعیدی نے انجام دیے۔

انجمن فروغِ سائنس کا قیام

اُردو میں سائنسی ادب کے نہ ہونے کا اثر اُردو کے عام قاری کے ذہنی افق پر پڑا ہے۔ دوسری زبانوں سے واقفیت رکھنے والے عوام سائنس کی پیش رفت اور اس کی افادیت سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ سائنس کی مدد سے قوانینِ قدرت کو بہتر طور سے سمجھ پاتے ہیں۔ مشاہدات اور تجزیات کی اہمیت ان کی گرفت میں آچکی ہے۔ لہٰذا ان کے اندازِ فکر میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ برخلاف اس کے، ایک عام اُردو قاری کہانی قصّوں افسانوں یا اشعار کی دنیا میں کھویا رہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب کے بغیر کوئی زبان زندہ نہیں رہ سکتی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محض ادب کی آبیاری پر کسی زبان کا پھلنا پھولنا اور ترقی کرنا ناممکن ہے۔ اُردو میں پاپولر (عام فہم) سائنس کے فقدان کی وجہ سے اُردو عوام عملی طور سے آج کے مسائل سے ناواقف ہیں جس کے باعث ان کی سوچ میں وہ مثبت تبدیلی نہیں آئی ہے۔ جو کہ آج کی ضرورت ہے۔ اس پس منظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُردو میں سائنسی معلومات کی فراہمی ہماری اہم ترین ضروریات میں سے ایک ہے۔

"انجمن فروغِ سائنس" کا قیام اسی جذبے کے تحت عمل میں آیا ہے۔ اس کے خاص مقاصد دو ہیں:

(۱) طلبا میں سائنس فہمی پیدا کرنا

(۲) عوام میں سائنس کی تشہیر و ترویج

اگر آپ کسی بھی سطح پر سائنس کے طالب علم ہیں، اُستاد ہیں، مصنف ہیں، ماہر ہیں یا بہی خواہ ہیں اور انجمن فروغ سائنس (انفروس) سے تعاون کرنا چاہتے ہیں تو از راہِ کرم انفروس سے رابطہ قائم کیجیے تاکہ آپ کی صلاحیتوں سے اُردو داں طبقے کو مستفیض کیا جاسکے۔

اگر ہمارے مشن میں عملی دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی روشنی میں ہمیں اس مہم کے بارے میں اپنی رائے دینا چاہتے ہیں تو بلا تکلف ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازیں۔ آپ کی دلچسپی ہماری تحریک کے لیے ایک خوش آیند ابتدا ہوگی۔

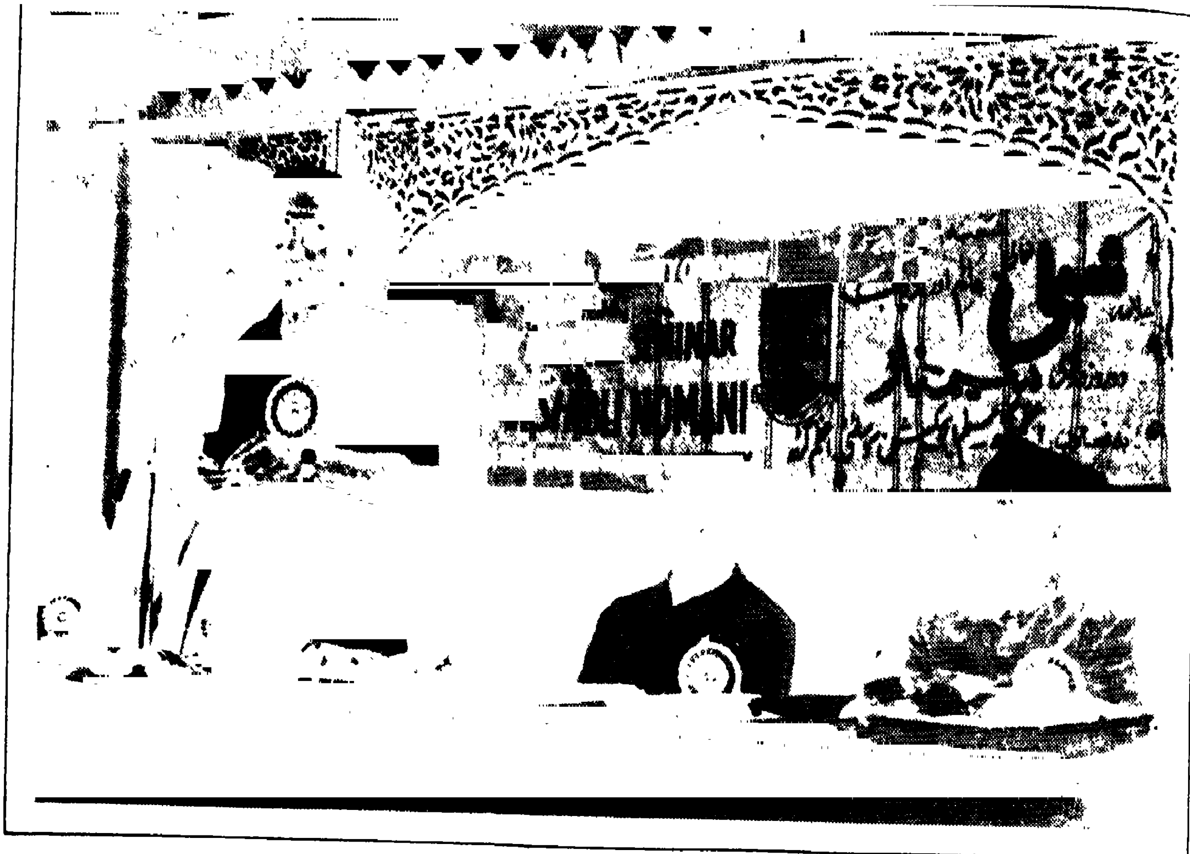
ہم آپ کے بے حد ممنون ہوں گے اگر آپ ہمارے پیغام کو اپنے حلقے میں پھیلائیں۔

پتا برائے سادہ خطوط:

انجمن فروغِ سائنس، پوسٹ بیگ نمبر ۹،
جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

رجسٹرڈ خطوط کے لیے:

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، جنرل سکریٹری
انجمن فروغِ سائنس، ۶۶۵/۱۲، ذاکر نگر،
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵



۲۴، اور ۲۵، اکتوبر ۹۲ء کو شعبۂ اُردو بمبئی یونیورسٹی نے اعظم گڑھ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے تعاون سے علّامہ شبلی نعمانی پر ایک دو روزہ سیمینار کا انعقاد کیا ـــــ تصویر میں: ڈاکٹر رفیق زکریا خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے۔ سیدھی طرف جناب ابوصالح انصاری اور پروفیسر عبدالستّار دلوی۔



۲۷، نومبر ۹۲ء کی شام کو ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی کے اوّلین شعری مجموعے "ربابِ صحرا" کی رسمِ اجرا اُردو گھر، نئی دہلی میں سابق وزیرِ خارجہ جناب آئی۔ کے۔ گجرال نے انجام دی۔ اس موقعے کی ایک تصویر ـــ دائیں سے: ڈاکٹر حنیف ترین، پروفیسر نثار احمد فاروقی، جناب اِندر کمار گجرال، جناب م۔ افضل اور جناب اے۔ فاطمی (ایم۔پی)

یہ سراسر ناانصافی ہے اس سلسلے میں افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ابھی تک اُردو کے کسی دانشور کا کہیں کوئی بیان تک نہیں آیا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس کے خلاف قلم اُٹھائیں۔

مضامین میں "ابوالکلام آزاد: غبارِ خاطر کے آئینے میں" مختصر لیکن جامع ہے۔ انور مینائی کا مضمون "توانائی مستقبل میں" بھی معلومات میں اضافہ کرنے والا ہے۔ لیکن زبان تھوڑی سہل ہوتی تو بہتر تھا۔

—— فیروز انجم، پٹنہ سٹی

▷ مشرف عالم ذوقی اور مشتاق انجم کے افسانے متوجہ کرتے ہیں۔ مشرف عالم ذوقی نے اپنے افسانے میں جس فنی رچاؤ کا ثبوت پیش کیا ہے وہ ان کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔

دلیپ سنگھ میرے پسندیدہ مزاح نگار ہیں ان کا سفرنامہ اپنے اندر بے شمار دلچسپیاں سمیٹے ہوئے ہے آئندہ قسطوں کا انتظار ہے۔

گوشۂ کمار پاشی اس شمارے کا اہم حصہ ہے۔ مخمور سعیدی کی نظم دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا ایک بے مثال نوحہ ہے جب کہ رزاق ارشد نے اپنی نظم میں کمار پاشی کی کتابوں کے ناموں کو جس خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔

اُردو خبرنامہ کے تحت یہ جان کر از حد افسوس ہوا کہ بھوپال کے نوتعمیر شدہ "ایوانِ اُردو" کو سنسکرتی بھون میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ہر اُردو نواز کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس ناانصافی کے خلاف کھل کر آواز اُٹھائے۔

—— اقبال حسن آزاد، مونگیر

▷ نومبر کے شمارے میں مضامین کا حصہ بہت اچھا رہا۔ افسانہ "ہم تمھیں بھول چکے ہیں منگو" پسند آیا۔ غزلیں بھی خوب ہیں۔

گزارش ہے کہ سحر اور کمار پاشی پر ضرور کوئی نمبر نکالا جائے۔

—— نواز بوہیتوی، کشن گنج

▷ دسمبر کا "حرفِ آغاز" پسند آیا۔ آپ نے صاف گوئی اور جرأت مندی سے کام لے کر اختر شیرانی کی رومانی شاعری کے پس منظر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اہلِ نظر کو اس طرح توجہ دلائی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اختر شیرانی سے کم درجہ شاعروں پر کافی کام ہوا ہے لیکن ناقدینِ ادب نے "شہنشاہ رومان" کو وہ منصب و مقام نہیں دیا ہے جس کے وہ صحیح معنوں میں مستحق تھے۔ ڈاکٹر یونس حسنی نے اپنا مقالہ ہندستان میں ہی تحریر کیا تھا اور ان کی کتاب "اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب"، برسوں پہلے پاکستان سے شائع ہوئی تھی۔ بھاگلپور کی ڈاکٹر قمر جہاں نے تو اپنی تصنیف "اختر شیرانی کی جنسی اور رومانی شاعری" میں ان کی رومانیت کے ڈانڈے جنسیات تک پہنچا دیے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن کا کہنا ہے کہ "اختر رومانی شاعر ہیں یا کچھ نہیں"۔ یہ دکھ کی بات ہے کہ اس طرح کا کلیہ قائم کر لیا گیا ہے۔ ان کی قومی اور انقلابی شاعری بھی کم پایے کی نہیں۔ پھر شاعری میں ان کے "تجربات" بھی نہایت اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

علاوہ ازیں وہ رومانی شاعر ہونے کے ساتھ افسانہ نگار، ڈراما نگار، صحافی، مترجم، مکتوب نویس بھی تھے۔ تحقیق و تنقید اور طنز و مزاح کے میدان میں بھی ان کی نگارشات موجود ہیں۔ ان کی نثری خدمات کا جائزہ لیا جاتے۔ ان کی ادارت میں شائع شدہ رسالوں پر نظر ڈالی جائے۔ ان کی کالم نویسی کا تجزیہ کیا جاتے اور کئی علمی و ادبی کتابوں کی ترتیب و تدوین میں ان کے تعاون کو منصفانہ نگاہ سے دیکھا جاتے تو معلوم ہوگا کہ اختر رومانی شاعر ہی نہیں بہت کچھ تھے۔

ضرورت ہے کہ ان کی شعری اور نثری خدمات کا بھرپور جائزہ لیا جائے۔ فکر انگیز اداریہ کے لیے احسنت و مرحبا کے الفاظ پیشِ خدمت ہیں۔

—— مختار ٹونکی، ٹونک

▷ "ایوانِ اُردو" کا دسمبر ۹۲ء کا شمارہ ملا۔ آپ نے بڑا کرم فرمایا جو کمار پاشی سے متعلق مضمون بلا تاخیر شائع کر دیا۔ امید ہے قارئین ایوانِ اُردو آپ کی توجہ اور میرے مضمون کی نوعیت کا خیر مقدم کریں گے۔

پروف ریڈنگ کی طرف غالباً مناسب توجہ نہیں دی جا سکی۔ کچھ ایسی اغلاط شائع شدہ مواد میں شامل ہو گئی ہیں جو میرے مسودے میں نہیں تھیں۔

صفحہ ۱۹، کالم ۲، پہلی سطر۔ صحیح الفاظ 'حیات و موت' ہیں۔

صفحہ ۱۹، کالم ۳، ۱۴ ویں سطر۔ آخری لفظ 'چھوٹ' ہے۔ چوٹ نہیں ہے۔(۱)

صفحہ ۲۱، کالم ۱، دوسری سطر۔ آخری سے پہلے کا لفظ 'تناظر' ہے۔ مناظر نہیں۔

صفحہ ۲۱، کالم ۲، پانچویں سطر۔ دوسرا لفظ 'حاوی' ہے۔ مادی نہیں۔(۲)

صفحہ ۲۱، کالم ۲، نیچے سے ساتویں سطر۔ آخری سے پہلے کا لفظ 'تناظر' ہے مناظر نہیں ہے۔

(۱) لفظ 'چوٹ' اور 'چھوٹ' سے جملے کے مفہوم میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) 'مادی روایت' بے معنی ہے۔ اُردو

کی حاوی روایت ہی کہنا مقصود ہے۔

—— بلراج کومل، نئی دہلی

▷ دسمبر ۹۲ء کے شمارے میں بلراج کومل نے کمار پاشی مرحوم کی شاعری کا عمدہ تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ الیاس احمد گدّی کا افسانہ بے حد متاثر کن ہے۔ خالدہ حسینی نے ہمارے محبوب فنکار و فلم ساز ستیہ جیت رے کی کہانی کا اچھا ترجمہ کیا ہے۔ امیر قزلباش کی غزل کا ایک ایک شعر میرے دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ پتا نہیں مجھے ان کی شاعری کیوں اتنی پسند ہے۔

—— مریم فاطمہ، بگڈ ہرہ

▷ مضمون "کمار پاشی — ایک مطالعہ" اور انشائیہ "ستا انصاف" بہت پسند آیا۔ افسانوی حصّے میں کوئی بھی افسانہ اس قابل نہیں کہ تعریف کی جاسکے۔ تاثیر کی سخت کمی ہے۔ اور جو افسانہ قاری کے ذہن کو متاثر نہ کرسکے وہ افسانہ نہیں کہلا سکتا۔ شعری حصّہ قابلِ تعریف ہے خصوصی طور پر ارشد مسعود ہاشمی کی نظم جو ترجمہ ہو کر بھی ایک انفرادی مقام کی حامل ہے۔ غزلیں بھی ایک دوسرے پر سبقت رکھتی ہیں۔

—— محمد فردوس عالم، مونگیر

▷ "ایوانِ اُردو" دسمبر کا شمارہ پڑھا۔ مشمولات میں شعری حصّہ حسبِ روایت تمام تخلیقات پر سبقت رکھتا ہے۔ افسانوی حصّہ کوئی تاثر پیدا نہیں کرسکا اور افسوس تو یہ ہے کہ ترجمہ کیا گیا افسانہ بھی لفظوں اور جملوں کی بھیڑ میں تاثیر سے خالی رہ گیا۔ افسانہ "عرفان کی اور" میں افسانہ نگار نے کثرت سے ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اگر غیر ضروری ہندی الفاظ سے یہ افسانہ آزاد ہوتا تو یقیناً ایک اچھا افسانہ بن سکتا تھا۔ "ستا انصاف" انشائیہ ہے یا مصنّف کا مشورہ۔ اگر مشورہ ہے تو یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ کمار پاشی پر مختصر مقالہ پسند آیا۔

—— مسرور قیصر، مونگیر

▷ دسمبر ۹۲ء کے "ایوانِ اُردو" میں "کمار پاشی — ایک مطالعہ" (بلراج کومل) "ستا انصاف" (نصرت ظہیر) اور "شام جیفرسن کے پنجرے" (الیاس احمد گدّی) جیسی معیاری تخلیقات دیکھ کر جی خوش ہوگیا لیکن "عرفان کی اور . . ." (عشرت ظہیر) جیسا کمزور افسانہ ذہن مکدّر کر گیا۔ کمال احمد صدیقی، امیر قزلباش اور طارق متین کی غزلیں اچھی ہیں۔ نظموں کا حصّہ کمزور ہے۔

عرفان کی اور . . . (عشرت ظہیر) مواد اور تکنیک کے اعتبار سے قابلِ قبول ہے لیکن عشرت ظہیر نے اشٹانگک، کلپنا، بادھک، پریتن، منشیہ، تپسیا، مرتیو، ات پیٹرن، ورودھی، پریوگ، اجیوکا، اوشیہ، انتم لکش، چیشٹائیں، چنتت، چنتن، مدرا جیسے مشکل ہندی الفاظ استعمال کر کے افسانے کی ترسیل و تفہیم پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔

میری ناقص رائے میں عشرت ظہیر صاحب ہندی کے ان الفاظ کی جگہ مناسب ترین اُردو الفاظ بھی استعمال کرسکتے تھے۔ اگر ان کی مجبوری یہ تھی کہ یہ سارے الفاظ ایک بودھ بھکشو کی زبان سے ادا ہوئے ہیں تو پھر مجھے کہنے دیجیے کہ اُسی بودھ بھکشو کی زبان سے یہ مکالمہ بھی ادا ہوا ہے "یہ ایک بے معنی جنگ ہے"۔

—— سلیم انصاری، بابینا کینٹ

▷ "ایوانِ اُردو" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ بلراج کومل کے مضمون "کمار پاشی — ایک مطالعہ" نے متاثر کیا اور بعض غزلوں نے بھی۔ لیکن صفحہ ۱۲ پر شائع ہوئی تینوں نظمیں بے حد سپاٹ اور کسی قدر لغو معلوم ہوتیں جن میں دوسری اور تیسری نظم کو بے مایہ بنانے میں مترجم کا بھی کچھ رول ضرور ہے۔ "اُردو خبرنامہ" بھی پڑھا اور اسی سلسلے میں آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اس میں دہلی اُردو اکادمی کے سہ روزہ غزل سمینار کی رپورٹ شائع کی گئی ہے۔ جس میں میرے مقالے کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ "پروفیسر زاہدہ زیدی نے عصری غزل کا منظرنامہ حالیہ تخلیقات کی روشنی میں پیش کیا۔ اور کہا کہ حالیہ غزل کا سب سے اہم موضوع فرقہ وارانہ فسادات اور نسلی تعصب ہے" اس رپورٹ کا پہلا جملہ تو بالکل صحیح ہے لیکن دوسرا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ میں نے اپنے مقالے میں حالیہ غزل میں تقریباً ایک درجن اہم اور تکراری موضوعات کی نشاندہی کی تھی جن میں سے ایک "فرقہ وارانہ فسادات" بھی تھا۔ اور نسلی تعصب کا تو کہیں ذکر بھی نہ تھا۔ دوسرے موضوعات جن کی میں نے نشاندہی کی وہ یہ تھے۔ سماجی ظلم اور ناانصافی کے خلاف احتجاج "کربلا" "ہجرت" "ذاتی غم" "انکشافِ ذات" "تنہائی" "لطف و مسرّت کے جذبات" "ابہام" اور "تخلیقِ شعر" اور "موت"۔ اور ساتھ ہی میں نے کچھ کلیدی شعری پیکروں اور علامتوں کی مدد سے بھی عصری غزل کے خدوخال کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی اور ان میں "خواب" "شکستِ خواب" "آئینہ" "گھر" "شہر" "جنگل" "خزاں" "صحرا" "سمندر" "زمیں" وغیرہ شامل تھے۔

—— زاہدہ زیدی، علی گڑھ

▷ مضامین کے انتخاب میں خصوصی توجہ درکار ہے۔ ایسے مقالات و مضامین کو جگہ ملنی

ہاہیے جن سے کوئی خاص یا اچھوتا گوشہ روشن ہوتا ہو اور افسانوں کے سلسلے میں بڑے نام پر چھے افسانوں کو ترجیح دی جانی چاہیے غزلوں ور نظموں کا انتخاب اچھا ہے ـــــ محض بڑے اموں کی شمولیت سے کوئی رسالہ "اہم ادبی رسالہ" رار نہیں دیا جاسکتا بلکہ "معیار" کا تعلق ہمیشہ ام کی بجائے تخلیقات سے رہا ہے۔

ـــــ شاہد جمیل، پٹنہ

> پہلی بار "ایوانِ اُردو" کا پرچہ ہاتھوں ں آیا۔ مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا کہ اتنی کم قیمت میں اتنا معیاری جریدہ! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب ہر حالت میں مجھے اس کا مطالعہ کرنا ہے۔

ـــــ محمد شہباز عالم نظامی، بھتر گاچھ

> ٹی۔وی سیریل "مرزا غالب" میں جگجیت سنگھ نے غالب کی غزل:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

گائی ہے، اسی غزل میں یہ شعر بھی گایا ہے:

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے سے اُٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

میں نے مرزا غالب کے الگ الگ پریس میں چھپے کئی دیوان دیکھے لیکن یہ شعر غزل میں دکھائی نہیں دیا۔ کیا یہ شعر غالب کا ہی ہے۔ اگر غالب کا ہے تو کون سے دیوان میں یہ شعر شامل غزل ہے۔ اور اگر یہ شعر غالب کا نہیں ہے تو جگجیت سنگھ نے غالب کی غزل میں کہاں سے شامل کیا ہے۔

قارئینِ ایوانِ اُردو اس بارے میں رہنمائی فرمائیں۔

ـــــ عقیل نعمانی، بریلی

O

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۳۲۷۶۲۱۱، ۳۲۶۳۴۴۸

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:
ایس۔ اشتیاق عابدی، مخمور سعیدی

جلد: ۶ ● شمارہ: ۱۰ ● فی کاپی ۵۰ر۳ روپے، سالانہ قیمت ۳۷ روپے ● فروری ۱۹۹۳ء

ماہنامہ "ایوانِ اردو دہلی" میں شائع ہونے والے افسانوں میں نام، مقام اور واقعات سب فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ مطابقت کے لیے ادارہ ذمہ دار نہیں۔
مضمون نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی
اردو اکادمی، دہلی ــــ گھٹا مسجد روڈ،
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد
سرورق، عمل: ارشد علی خاں

ایس۔ اشتیاق عابدی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی ۲ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، نئی دہلی ۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

اس بار خطوط کے کالم کے لیے ہمیں جو خطوط ملے ان میں ایک ایسے بزرگوار کا خط بھی ہے جو پچھلے پچیس تیس سال سے اُردو میں لکھ رہے ہیں تعلیم یافتہ اور صاحبِ مطالعہ ہیں اور ان کا مطالعہ خود ان کے بقول اُردو زبان و ادب تک محدود نہیں؛ وہ ہندی، انگریزی اور فارسی زبانوں سے بھی استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ بابری مسجد کے انہدام کو کسی نے پسند نہیں کیا اور اس کی مذمّت کی لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی یاد دلایا ہے کہ سومنات کا مندر توڑنے پر "مستند فارسی شعرا نے محمود غزنوی کی شان میں قصیدے لکھے" جو کچھ پُرانی اور نئی کتابوں میں موجود ہیں۔ شیخ سعدیؒ کے سومنات جانے یا نہ جانے کے غیر متعلق سوال کو بیچ میں لے آنے کے بعد انھوں نے اپنی بات یہاں ختم کی ہے کہ "تاریخ دہرائی جا رہی ہے" اور اپنے خط کی اشاعت پر ان لفظوں میں زور دیا ہے "یہ خط شائع فرمایئے اور غور فرمایئے۔"

ہمیں افسوس ہے کہ ہم ان کا خط شائع نہیں کر رہے ہیں لیکن ہم نے اس پر غور ضرور کیا۔ اس غور کے نتیجے میں ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ موجودہ مسموم فضا نے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں پر بھی کیسے منفی اثرات مرتّب کیے ہیں۔ فاضل مکتوب نگار نے موجودہ دَور کا موازنہ کم و بیش ایک ہزار سال پُرانے زمانے سے کیا ہے جسے کوئی روشن خیال آدمی دُرست قرار نہیں دے گا۔ پھر انھیں یہ دھیان بھی نہیں رہا کہ محمود غزنوی ایک مطلق العنان بادشاہ تھا جس کے دربار سے وابستہ شعرا صرف اس کی تعریف و توصیف ہی کر سکتے تھے۔ انھوں نے صرف اس موقعے پر ہی نہیں دوسرے کئی موقعوں پر بھی اس کے قصیدے لکھے ہیں۔ وہ ان کا مربّی تھا اور اس کی خوشنودی ہی میں ان کی عافیت تھی۔ اس میں مذہبی منافرت کی کارفرمائی دیکھنا کچھ زیادہ صحیح نہیں۔ فارسی شعرا کی وسیع المشربی اور انسان دوستی کے اظہارات سے ان کے دواوین اسی طرح پُر ہیں جس طرح اُردو شعرا کے دواوین۔ ہندستان پر محمود غزنوی کی فوج کشی کے پیچھے بھی محض مذہبی تفاخر یا تعصّب نہیں تھا۔ فردوسی نے اس کی جو ہجو لکھی ہے اس میں اس کی زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی حرص کی طرف واضح اشارے کیے گئے ہیں، اس کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے اس پہلو پر بھی نظر رہنی چاہیے۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ اس خط کی تشویشناکی موجودہ صورتِ حال کے حوالے سے مکتوب نگار کا یہ اطمینان ہے کہ "تاریخ دہرائی جا رہی ہے" گویا اگر ہم اس دورِ ظلمت کی طرف واپس جا رہے ہیں جب انسانی قدروں پر غیر انسانی رویّے غالب تھے تو ہمیں یہ سمجھ کر کہ تاریخ خود کو دہرا رہی ہے، اس عمل کو جائز قرار دے لینا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ پُرانے تاریخی حوالوں کی اُنگلی پکڑ کر ہم مراجعت کے اس سفر پر چل پڑے تو اس کا نقطۂ اختتام کیا ہوگا؟ کیا ہم دوبارہ قبائلی زندگی کے طور طریقے اپنا لیں گے اور ہمارے باہمی معاملات کی بنیاد جنگل کے قانون پر رکھی جائے گی؟ فاضل مکتوب نگار ایسا چاہتے ہوں، ہمیں شک ہے لیکن ان کے اندازِ فکر کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے!

ایسا نہیں کہ محترم مکتوب نگار اپنی اس سوچ میں تنہا ہوں۔ جن لوگوں نے بابری مسجد کو شہید کیا اور جن لوگوں نے اس سانحے پر خوشیاں منائیں، سوچ ان کی بھی یہی رہی ہوگی اور یقیناً انھوں نے بھی اپنی اس کارروائی کو تاریخ کا انتقام سمجھا ہوگا۔ مگر ہم انھیں مذہبی جنونی کہہ کر خود کو تسلّی دے سکتے ہیں اور دے رہے ہیں۔ اسے کیا کہا جائے کہ یہ خط ایک ایسے شخص کا لکھا ہوا ہے جو یہ جانتا ہے کہ "مسلم دانشوروں نے رامائنیں، گیتا، مہابھارت جیسی ضخیم کتابیں لکھیں، رام اور کرشن کے گیت گائے" اور یہ بھی کہ "ہندو شاعر اور ادیب تو کتاب ہی بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم لکھ کر شروع کرتے تھے۔ حمد کے بعد نعت، منقبت، سلام لکھتے تھے۔"

ہم تو یہی آرزو کر سکتے ہیں کہ کاش باہمی محبّت اور رواداری کا یہ دَور پھر لوٹ آئے اور تاریخ اپنے منفی عوامل کو دہرانے کی بجائے ان مثبت عوامل کو واپس لے آئے۔

——— ادارہ

اکبر علی خاں عرشی زادہ
عرشی منزل، رام پور (یوپی)

نئے جال لائے پرانے شکاری

علامہ اقبال کی ایک غیر معروف نظم

لگ بھگ ۳۲، ۳۳ سال ہوتے ہیں، جب میں نے علامہ اقبال کے غیر معروف کلام کی تلاش و ترتیب کا کام شروع کیا تھا۔ اس جستجو کے بیشتر نتائج "اقبال ریویو" کراچی، "نیا دور" لکھنؤ، "صحیفہ" لاہور اور "ماہِ نو" کراچی وغیرہ رسائل میں اُسی زمانے میں شائع کرا چکا ہوں، چند روز قبل مجھے اپنے کاغذات کی ورق گردانی کے دوران ایک نظم ملی جو علامہ اقبال کی زائیدۂ قلم ہے۔ نظم ذیل میں درج ہے اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ سب سے پہلے لاہور کے مشہور ادبی رسالے "نیرنگِ خیال" کے سالنامے بابت ۱۹۲۸ء میں "علامہ اقبال کا تازہ ارشاد" کے عنوان سے چھپی تھی۔ بہ گمانِ غالب یہ سالنامہ اسی سال جنوری میں شایع ہوا ہوگا۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو اس نظم کو اواخر ۱۹۲۷ء کی تخلیق سمجھا جاتے گا۔

۱۹۲۴ء میں "بانگِ درا" شایع ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے اُس میں یہ نظم جو بعد کی تخلیق ہے جگہ نہیں پا سکتی تھی۔ لیکن اس کے بعد جو اُردو مجموعے علامہ اقبال نے مرتب اور شائع کیے اُن میں سے بھی کسی میں یہ نظم شامل نہیں کی گئی۔ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ علامہ نے اسے اُن مجموعوں کے معیار سے فروتر جانا اور شمولیت کو مناسب نہ سمجھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ علامہ کے انتقال کے بعد جو مجموعے متفرق کلام کے مرتب اور شائع ہوئے اُن میں بھی یہ نظم نہیں آئی۔ لیکن مطالعۂ اقبال میں اس کی بہر حال اہمیت ہے اور اسی لیے یہ اُردو پڑھنے والوں کے وسیع حلقے تک پہنچائی جا رہی ہے۔ میں نے یہاں جو مصرعہ عنوان قرار دے دیا ہے وہ آج بھی لوگوں کے زبان زد ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم نے اپنی اشاعت ہی کے موقعے پر اُردو والوں کو متوجہ کر لیا تھا ——

یہ مکتب یہ اسکول یہ پاٹھ شالے — یہ تکیے، یہ مندر، یہ گرجے، شوالے
یہ پنڈت، یہ بنیے، یہ مُلّا، یہ لالے — یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے
غریبوں کا دُنیا میں اللہ والی

وطن کیا ہے؟ اِک نوعِ سرمایہ داری — بڑے سیٹھ ہیں قوم کے یہ بھکاری
وہ دیکھو چلی آ رہی ہے سواری — نئے جال لائے پرانے شکاری
غریبوں کا دُنیا میں اللہ والی

ل سے اب تک عروجؔ یہ ہے ہماری عمرِ رواں کا حاصل
ـ اور منزل، اِک اور منزل، اِک اور منزل، اِک اور منزل

مارا عزمِ جواں سلامت، جو خضرِ منزل، دلیلِ منزل
، اس کے دم سے رہِ سفر میں نہ کوہ حائل، نہ دشت حائل

س نفس احتیاط مانگے، قدم قدم اعتدال چاہے
ہاں میں رہنا بھی ایک فن ہے، نہ کارِ آساں، نہ کارِ مشکل

ہ جن کی آہٹ سے کانپتی ہے، فضا تمہاری حسین دنیا
ن اہلِ دنیا کی شان یہ ہے، نہ اس سے باہر، نہ اس میں شامل

والے منزل کے دوش پر ہوں، چراغِ منزل سے لو لگی ہے
رے لیے مسئلہ نہیں ہے شکستہ پائی، قریبِ منزل

فامِ حیرت کا رہنے والا، مری یہ باتیں سمجھ سکے گا
ر چہ گرمِ سفر ہوں لیکن نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل

آل کچھ ہو، مقابلہ کیا ستیزہ کاری و عافیت کا
ہماری دنیا خروشِ طوفاں، تمہاری دنیا سکوتِ ساحل

عروجؔ زیدی

حضرتِ عروجؔ زیدی کی پانچویں برسی پر ان کے خلف
اکبر جنابِ عرفان زیدی نے ہمیں مرحوم کی یہ غیر مطبوعہ
غزل ارسال کی ہے جو نذرِ قارئین ہے ——— ادارہ

ظفرؔ گورکھپوری

اشکِ غم آنکھ سے باہر بھی نہیں آنے کا
گر یہ تھم جائے وہ منظر بھی نہیں آنے کا

اس سفر کی یہی تقدیر ہے، چلتے رہیے
دشت ملنے کا نہیں، گھر بھی نہیں آنے کا

عہدِ غالبؔ سے زیادہ ہے مرے عہد کا کرب
اب تو کوزے میں سمندر بھی نہیں آنے کا

دل کے ہمراہ تقاضے ہی کچھ ایسے ہیں کہ چَین
اب سرِ کوچۂ دلبر بھی نہیں آنے کا

آس باندھے ہوئے بیٹھے ہو کہ گُل آئیں گے
اس طرف اب کوئی پتھر بھی نہیں آنے کا

ہائے کیا ہم نے تڑپنے کا صلہ پایا ہے
ایسا آرام جو آکر بھی نہیں آنے کا

سبزہ دیوار پہ اُگ آیا، ظفرؔ خوش ہولو
آگے آنکھوں میں یہ منظر بھی نہیں آنے کا

اے۔۲۰۲، فلوریڈا، شاستری نگر، اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۵۸

یزید کرلے اگر تجھ سے خم کیا جائے
کیا نہ جائے تو یہ سر قلم کیا جائے

مذاکرے نہیں ہوتے ہیں ترکِ الفت پر
اصول یہ ہے کہ یہ ایک دم کیا جائے

سبھی کے سامنے منظر سبھی کی دو آنکھیں
کہاں تک ان ہی آنکھوں کو نم کیا جائے

شعور کہتا ہے ہر بات کو نہ کر محسوس
وفور کہتا ہے یہ وعظ کم کیا جائے

نہ ختم ہوگا یہ شر مکتبی تلفظ سے
یہ ختم ہوگا جب اس کو ختم کیا جائے

امیرِ شہر کم از کم مجھے نہ دے خلعت
غریبِ شہر پہ کچھ تو کرم کیا جائے

شبِ وصال میں تو وہ ہوا جو ہوتا ہے
شبِ فراق کا قصہ رقم کیا جائے

نصیب ہو نہ سکی سرخوشی، نہ ہونے کی
شجاعؔ اس لیے ہونے کا غم کیا جائے

شجاعؔ خاور

ملے پارک لین، نئی دہلی

پاکستان میں اُردو زبان کا مسئلہ

(پروفیسر محمد علی صدّیقی سے گفتگو)

اطہر فاروقی

۲۴۰ پیریار ہوسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی - ۶۷

معروف ناقد محمد علی صدّیقی کا تعلق امروہہ (یو.پی) سے ہے۔ ان کی تحریروں میں وہ ACAD-EMIC DISHONESTY - کہیں نظر نہیں آتی۔ جیسے بعض پاکستانی قلم کاروں کے یہاں ہندستان دشمنی کی ذہنیت نے پھوہڑپن کی حد تک بڑھا دیا ہے۔ اُردو ہی نہیں، ہندی اور انگریزی، فارسی اور عربی کی ادبی تاریخ کے مطالعے نے ان کے نقطۂ نظر میں وسعت اور گہرائی پیدا کی ہے۔

کراچی یونیورسٹی کے تقابلی ادب کے شعبے میں پروفیسر محمد علی صدّیقی کا پاکستان کے انگریزی روزنامے "ڈان" میں گزشتہ بیس پچیس سال سے مستقل شائع ہونے والا کالم پاکستان کا مقبول ترین کالم ہے۔

س : ہم بھارت میں اکثر یہ سنتے ہیں کہ اُردو پاکستان کی قومی زبان نہیں ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر پاکستان میں اُردو کی آئینی حیثیت کیا ہے؟

ج : آئین کی رو سے اُردو کو پاکستان میں ۱۹۸۳ء تک قومی زبان کی حیثیت سے نافذ ہو جانا چاہیے تھا لیکن ضیاالحق کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اس کے لیے ابھی کچھ اور مدّت درکار ہے۔ اسی لیے اس نے ایک آئینی ترمیم کے ذریعے اس مدّت میں دس سال کا اضافہ کیا اور اب ۱۹۹۳ء میں قومی زبان کی حیثیت سے اُردو کا مکمل نفاذ ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں ہمارے یہاں ایک ادارہ مقتدرہ قومی زبان کام کر رہا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ درسی و دفتری زبان کی کتب تیار کرے تاکہ جب اُردو مکمل طور پر سرکاری زبان ہو جائے تو کوئی مسئلہ درپیش نہ ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ کسی زبان کو کسی ملک کی سرکاری زبان کا درجہ دینے سے قبل بڑی تیاریوں کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ بڑی افراتفری پھیلتی ہے۔ دس سال کی یہ مزید مدّت اس افراتفری کو روکے گی اور اُردو جب پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی تو درسی کتابیں اور دوسری ضروریات کی تمام کتابیں اُردو میں تیار ہوں گی، یوں اس نفاذ کو جلد ہی مکمل کامیابی مل جائے گی۔ اُردو کو تو پاکستان میں سرکاری زبان بننا ہی ہے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے تقسیم سے پہلے یہ اعلان کیا تھا کہ اُردو اور صرف اُردو پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی۔ انھوں نے تقسیم کے بعد مشرقی بنگال میں بھی اس عزم کا اعادہ کیا تھا۔ پاکستان میں آئین کی شکلیں حکومتوں کی خواہشوں کے مطابق بدلتی رہیں۔ جلدی جلدی حکومتیں بدلیں اور انھوں نے اپنے مفادات اور اپنی سہولیات کے مطابق آئین میں ترمیم و تنسیخ کی، مگر ہر آئین میں اُردو کو قومی زبان مانا گیا۔ اس پر ترمیم و تنسیخ کے کسی عمل کی جراحی نہیں ہوئی۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء کے آئین میں بھی اُردو کو ہی قومی زبان تسلیم کیا گیا۔ قومی زبان سے مطلب وہی ہے جو آپ کے یہاں ہندی سے ہے مگر ایک فرق ہے۔ ہمارے یہاں اُردو کے علاوہ جو دوسری زبانیں ہیں انھیں قومی زبان تسلیم نہیں کیا گیا ہے، جیسے آپ کے یہاں آئین کے آٹھویں شیڈول میں پندرہ دیگر زبانوں کو قومی زبانیں تسلیم کیا گیا ہے۔ دیکھیے آئین کی تشریحات میں ہر ملک میں کچھ نہ کچھ پیچیدگیاں ہوتی ہیں آپ کے یہاں اس بات کو لے کر پیچیدگی ہے کہ اُردو قومی زبان تو ہے مگر اس کے علاقے کا تعیّن نہیں ہے۔ مقصد یہ نہیں کہ اُردو کے ساتھ کوئی تعصب ہے بلکہ یہ قانونی پیچیدگی ہے اور ایسی ہی پیچیدگیاں دوسری زبانوں کی تشریحات سے متعلق ہیں ورنہ یہ ہر آئین کے ساتھ ہوتا ہے۔

س : لیکن پاکستان کے جغرافیائی اور سیاسی حالات، نیز لسانی پیچیدگیوں کے پس منظر میں یہ مشکل لگتا ہے کہ تمام اہلِ پاکستان اُردو کو اپنی زبان تسلیم کر لیں، خواہ اس کی آئینی اور سرکاری حیثیت کچھ بھی ہو؟

ج : میرا خیال ہے کہ پاکستان میں اُردو کے مستقبل کا تعلق قیامِ پاکستان کی تحریک سے ہے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے جب تک مغلیہ دور کے معاملات پر واقف کارانہ نظر نہ ہو تب تک پاکستان میں اُردو کی صحیح صورتِ حال پر سنجیدہ گفتگو ممکن

نہیں ہوگی کیوں کہ جب تک کسی ملک کے تمام صوبوں اور عوام کے لسانی مزاج سے واقفیت اور آگاہی نہ ہو یہ گفتگو ممکن نہیں ہوسکتی۔ جب پاکستان کے وجود کے لیے جد و جہد کی جارہی تھی اس میں مستقبل کے پاکستان کی قومی زبان کے طور پر اُردو کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت پنجاب اور بلوچستان میں اُردو سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ سندھ میں انگریزوں کے زمانے سے وہی سرکاری زبان کی حیثیت سندھی کو حاصل تھی۔ اس زبان کا رسم الخط اُردو سے قریب ہے۔ دوسرے صوبوں میں بھی اُردو کا ہی رواج تھا یعنی جب پاکستان وجود میں آیا تو یہاں اُردو ایک طاقتور زبان کی حیثیت سے موجود تھی، ہندستان کے لاکھوں مہاجرین نے سندھ اور پنجاب میں سکونت اختیار کی تو اُردو لاکھوں پاکستانیوں کی زبان بن گئی اور آئینی حیثیت ملنے سے قبل ہی عوامی مقبولیت کے سبب اور بانیِ مملکت کی پالیسی اور پارلیمنٹ کے ارکان کی اکثریت کے فیصلے کے مطابق بھی قومی زبان تسلیم کی گئی۔

آپ ادب کے طالبِ علم کی حیثیت سے اس امر سے بہ خوبی واقف ہوں گے کہ پاکستان میں اُردو کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہیں اور محمود خاں شیرانی کی کتاب 'پنجاب میں اُردو' اس کا بیّن ثبوت ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ پاکستان میں دوسری علاقائی زبانوں کی روایت بھی کم قدیم نہیں۔ موجودہ پاکستان کے کئی حصّوں میں مسلمانوں کی حکومت بہت پہلے قائم ہو چکی تھی۔ دہلی میں تیرھویں صدی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی جب کہ ان علاقوں میں آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں قائم ہو چکی تھی۔ جن موجودہ علاقوں کو ہم سندھ، ملتان اور پنجاب کا علاقہ کہتے ہیں وہ دہلی سے پانچ سو سال زیادہ مسلمانوں کے زیرِ اثر رہے ہیں۔ ان تاریخی حقائق سے روگردانی کسی مؤرّخ کے لیے ممکن نہیں کہ وہ زبان جس کو آج اُردو کہتے ہیں اس کی شروعات ان علاقوں میں ہوئی تھی مگر وہ پروان ہندستان بھر میں چڑھی۔ اُردو کی بنیاد کھڑی بولی پر ہے اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ دہلی کے قریب ہریانے کا قرب وجوار اُردو کا اصل گھر ہے یہاں کی زبان کو اُردوے معلّیٰ کہا گیا۔ اُردو ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی لشکر کے ہیں۔ مختلف زبانوں کے بولنے والے دلّی میں آئے ان کی ملی جُلی زبان یہی زبان تھی جسے انھوں نے ہندی بھی کہا' اُردو بھی کہا اور ہندوی بھی کہا۔ اُردو کے حالات پاکستان میں میری معلومات کی حد تک اچھّے ہیں بلکہ بہت اچھّے ہیں کیوں کہ یہاں اُردو کے لیے جو کام ہو رہا ہے وہ بنیادی ہے۔ اگر پاکستان کی سیاست ترقی پسندانہ خطوط پر چلتی ہے اور وہ علاقائی زبانوں کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے، ان کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتی ہے تو اُردو کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

س : ایک خیال یہ ہے کہ پاکستان میں اُردو نمائش اور تماشے کی چیز ہے اور سیاستدان اسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کر رہے ہیں؟

ج : اگر پاکستان کی سیاست رجعت پسندانہ خطوط پر چلتی رہی اور صرف اُردو کا راگ الاپتی رہی تو میں سمجھتا ہوں کہ بہت دشواری پیدا ہوگی۔ پاکستان میں اُردو کے متعلق تشویش کا تعلّق مادری زبان کے تئیں جذباتی طرزِ فکر سے ہے جو بالکل صحیح ہے لیکن اُردو کے ساتھ ہمیں دیانت دارانہ طور پر علاقائی زبانوں کے فروغ کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔ یہی صحیح اسپرٹ ہے۔ ہندستان میں یہی صورت ہے اور یہاں علاقائی زبانیں بھی خوب فروغ پا رہی ہیں۔ اُردو بھی ترقّی کر رہی ہے۔ مہاراشٹر میں مراٹھی ہے، انگریزی بھی ہے اور اگر کوئی اُردو پڑھنا چاہیے تو اُردو بھی ہے مگر ہمارے یہاں یہ فارمولا نہیں تھا۔ سندھ میں سندھی بہت ترقّی یافتہ زبان ہے اور انگریزوں کی آمد سے پہلے بھی وہاں سرکاری زبان تھی۔ اگر آپ کو سندھ کی ادبی تاریخ سے واقفیت ہے تو اس امر کا اندازہ بھی ہوگا کہ قیامِ پاکستان کے وقت سندھی ادب کی روایت بہت طاقتور تھی لیکن قیامِ پاکستان کے بعد لسانی مسائل سیاسی استحصال کا شکار ہوگئے اس لیے ہمارے یہاں زبان کا بحران نظر آیا مگر اب تمام لسانی مسائل حل ہونے کے قریب ہیں اور دونوں بڑے لسانی گروپ اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ صوبے کے اتحاد کے لیے دونوں گروہوں کا سیاسی اتّحاد ضروری ہے۔

مجھے پاکستان میں علاقائی زبانوں کا دوست تصوّر کیا جاتا ہے، ایک ایسا دوست جو اُردو کی ترقّی بھی چاہتا ہے۔ اُردو میری مادری زبان ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہر علاقے کو حق ہونا چاہیے کہ وہ اپنی مادری زبانوں کو ترقّی دے۔ میں اُردو اور علاقائی زبانوں کے درمیان کوئی خلیج نہیں سمجھتا جس طرح سے آپ کے یہاں زبان کا مسئلہ طے ہوا ہے ہمارے یہاں بھی یہ مسئلہ جلد ہی طے ہو جائے گا۔ فی الحال علاقائی زبانوں کا اپنے وجود کو تسلیم کرانے کا جو مطالبہ ہے اس کو تسلیم کرانے کی حمایت تمام اُردو والوں کو کرنا ہے۔ یہ مطالبہ اُردو کے خلاف کوئی تحریک نہیں ہے جب کہ عموماً سمجھا یا سمجھا!! جاتا ہے۔ اگر علاقائی زبانوں کو آپ نے تسلیم کر لیا تو آپ دیکھیں گے کہ اُردو وہاں اور ترقّی کرے گی۔

س : پاکستان میں علاقائی زبانوں کے فروغ کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کا طریقہ کیا ہے؟

ج : علاقائی زبانوں کے فروغ کے لیے ایک تجویز تو یہ سامنے آئی کہ پرائمری سطح پر مادری زبان کے ذریعے تعلیم دی جانی چاہیے۔ پہلے پنجاب اور بلوچستان میں پرائمری تعلیم صرف اُردو میں ہوسکتی تھی۔ اب اگر وہاں کے باشندے یہ چاہیں گے کہ ان کی زبان یعنی مادری زبان میں ان کی تعلیم ہو تو ایسا ہوسکے گا۔ اس تجویز کا منظور کرلیا جانا علاقائی زبانوں کے فروغ اور لسانی تنازعات کے حل میں بہت معاون ہوگا۔ پھر بھی علاقائی زبانوں کے لیے اتنا کام نہیں ہورہا ہے جتنا ہونا چاہیے۔ مثلاً پنجابی اُردو سے زیادہ پُرانی زبان ہے مگر اس میں بھی اتنا کام نہیں ہورہا ہے جتنا ہونا چاہیے۔ ہر جگہ کم و بیش یہی صورتِ حال ہے۔ بلوچی کے لیے بھی زیادہ کام نہیں ہوسکا، پشتو کی ترقی بھی بہت کم ہوئی۔ ہمارے یہاں بلوچی کا کوئی اخبار نہیں ہے، پنجابی کا اخبار اب آیا ہے۔ سندھی کے بہت سے اخبارات و جرائد ہیں مگر پھر بھی سندھی اُردو کے مقابلے میں پسماندہ ہے؛ اور اگر کام لگاتار ہوتا رہے تو بھی یہ کافی دنوں بعد ہو پائے گا کہ علاقائی زبانیں اُردو کے برابر آئیں۔ لیکن کوششیں تو ہونا چاہیے اور ہو بھی رہی ہیں۔ کچھ لوگ اس طرح کی باتیں بھی کرتے ہیں کہ اگر پنجابی ترقی پذیر ہوگی تو اُردو پر اثر انداز ہوگی اور اس کی ترقی رُک جائے گی لیکن ایسا نہیں ہے۔ اُردو پاکستان کی مقبول ترین زبان ہے۔ اس کی مقبولیت عوامی سطح پر ہے۔ پورے پاکستان میں ٹی۔وی اور عام ذرائع ابلاغ کی زبان اُردو ہے۔ ہمارے یہاں کوئی سیمینار اُردو کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ سیاسی جلسوں کی زبان بھی اُردو ہوتی ہے۔ اُردو ہمارے یہاں واحد زبان ہے جو بالعموم بولی جاتی ہے۔ اُردو از خود کراچی سے لے کر پاکستان کے دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ پنجاب میں بابا فرید کے تصوف کی زبان اُردو ہے۔ اگر آپ یہ کہیں گے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو پاکستان چلی گئی تو غلط ہوگا۔ اُردو اس علاقے میں پہلے سے موجود تھی۔ دنیا میں سب سے بڑا اُردو کا لغت پاکستان میں تیار ہو رہا ہے۔ یہ تکمیل کے آخری مراحل میں ہے اور اس کی گیارہویں جلد آرہی ہے۔ اس لغت میں ساڑھے تین لاکھ الفاظ ہوں گے جو مختلف زبانوں کے دھاروں سے گزرتے ہوئے اُردو کے ساگر میں شامل ہوگئے ہیں۔ اُردو کو پہلے ہندوی کہا جاتا تھا۔ ہندستان کی تمام زبانیں پراکرت پر مبنی ہیں، مسلمانوں نے انھیں ہندوی کہا، پنجابی اور ملتانی کو بھی ہندوی کہا۔ ہندستان میں جو بھی زبانیں بولی جاری تھیں وہ عربی فارسی نہیں بلکہ ہندی تھیں۔

س : کیا آپ کے یہاں اُردو کے اعلیٰ تدریسی نصاب میں ہندی کا کوئی لازمی پرچہ ہے کیوں کہ اس کے بغیر اُردو کلاسکس سے صحیح واقفیت نہیں ہوسکتی؟

ج : ہمارے یہاں ابھی یہ سہولت نہیں ہے یعنی ہندی رسم الخط میں اُردو پڑھانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ہم کلاسیکی ادب کو پڑھتے تو ہیں مگر اُردو رسم الخط کے ذریعے۔ بیشتر کلاسیکل متون اُردو رسم الخط میں موجود ہیں۔ مثلاً رانی کیتکی کی کہانی اُردو ہی میں لکھی گئی تھی اور اردو ہی میں پڑھائی جاتی ہے۔ رامائن اور مہابھارت سمیت شاید ہی کوئی ایسا کلاسیکل متن ہو جو اُردو رسم الخط میں موجود نہ ہو۔ ہماری آبادی کا بڑا حصہ ہندی بھلے ہی نہ پڑھ سکے مگر سمجھ ضرور سکتا ہے۔ ہمارے یہاں ہندی پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی لازمی پرچہ ہے۔ آپ کے یہاں صورتِ حال دوسری ہے جہاں اُردو اور ہندی دونوں قومی زبانیں ہیں۔ آپ کے یہاں خالص اُردو اور ہندی کے علاقے الگ الگ نہیں۔ جہاں ہندی سمجھی، بولی اور پڑھی جاتی ہے وہیں اُردو بھی پڑھی، سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اور آپ کے یہاں یہ بات ناممکن ہے کہ آج کا کوئی نوجوان ہندی نہ جانتا ہو۔ اس سے ادب کے طالب علموں کا ذہنی افق یقیناً وسیع اور کشادہ ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں ہندی بہ حیثیت مضمون ابتدا سے ہی نہیں ہے۔ ہمارے یہاں ہندو حضرات میں ایسے لاکھوں نوجوان ہوسکتے تھے جو ہندی تعلیم کا مطالبہ کرتے اور یوں ہندی ملک بھر میں پھیل جاتی۔ مگر چونکہ بیشتر ہندوؤں کی مادری زبان سندھی ہے اور سندھی کو وہ تمام سہولیات میسر ہیں جن کی عدم دستیابی تشویش پیدا کرسکتی ہے، یوں ہندی کے لیے امکانات بالکل ہی ختم ہوگئے۔ میں خود اس کا حامی ہوں کہ اگر ایم۔اے میں ہندی کا ایک لازمی پرچہ ہوتا تو بہت فائدہ ہوسکتا تھا مگر چونکہ یہ مطالبہ ہی نہیں ہے یوں ہندی بھی نہیں ہے۔ ہاں اعلیٰ امتحانات میں ایک پرچہ سو نمبر کا ہوتا ہے۔ جس میں آپ منجملہ دوسری زبانوں کے ہندی کو بھی بہ حیثیت مضمون لے سکتے ہیں۔

س : آپ کے یہاں شاعری اور ادب میں کون سے نئے رجحانات آج کل قابلِ ذکر ہیں؟

ج : ہمارے یہاں ایک رجحان تو وہ تھا جو قیامِ پاکستان کے نتیجے میں ہونے والے فسادات پر یعنی فسادات کے خلاف تخلیق ہوا۔ پاکستانی ادب کا بنیادی مزاج روحانی اور انسان دوستی ہے۔ اُردو کا تصوف سے تعلق بہت گہرا اور قدیم ہے۔ یہی متصوفانہ رجحانات ترقی پسند ادب کا حصہ رہے جس میں انسان دوستی، امن و آشتی اور مساوات پر خاصا زور تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد ادب میں اقدار کی شکست و ریخت، ماضیِ مرحوم کا نوحہ،

ہجرت کے تلخ تجربات کی ترجمانی کثرت سے ملتی ہے۔ اس وقت بیشتر بڑے اردو شاعر ہجرت کر کے نئے علاقوں میں آباد ہوتے تھے اور ان کے ساتھ ان کے ماضی کی یادیں ان سے کبھی جدا نہ ہونے والا سایہ بنی ہوئی تھیں ——— ۱۹۵۸ء میں پاکستانی ادب کا دوسرا رجحان پہلا مارشل لا لگنے کے بعد، اپنی آواز کو دبانے کی کوششوں کے خلاف ظلم و جبروت سے سابقہ پڑنے پر سامنے آیا۔ اس وقت چونکہ کھل کر مخالفت کرنا ممکن نہ تھا لہٰذا یہ رجحان دروں بینی کا رجحان بن گیا۔ اشاروں، کنایوں اور علامتوں کے سہارے اپنی باتیں کہی جانے لگیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تمام جدید لوگوں نے ترقی پسندانہ THEMES پر لکھنا شروع کیا۔ براہِ راست ادب جبروت کے ابتدائی زمانے میں ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ عالمی ادب میں ایسی متعدد مثالیں ملیں گی جہاں براہِ راست ادب جمہوری دور میں تخلیق ہوا۔ اور جمہوری اقدار کی پامالی نے علامت نگاری کے رجحان کو فروغ دیا۔ آپ کے یہاں اٹھارہ مہینے کی ایمرجنسی کے علاوہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا اور اس وقت بھی آپ کے یہاں حکومت کے خلاف خاصی صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ ۱۹۵۸ء کے بعد ہمارے یہاں نئے لکھنے والوں کے کلام میں تہہ داری بڑھی اور یہی جدیدیت کی بنیاد تھی۔ اس زمانے میں بہت سی تبدیلیاں آئیں، مواد بھی مختلف آنے لگا اور داخلیت پسندی زیادہ آگئی۔ اس خارجی صورتِ حال کے نتیجے میں بطونِ ذات کی طرف مراجعت کے جس طاقتور رجحان نے فروغ پایا، اس کے اظہار کی بہترین مثالیں ہمارا اس دور کا ادب پیش کرتا ہے۔ اس وقت لکھنے والا خود کو صرف اپنے تئیں ہی جواب دہ محسوس نہیں کرتا تھا، سماج پر جو ظلم ہو رہا تھا تخلیق کار کی علامتیں اسی سے عبارت تھیں۔ ہمارے یہاں بعض ایسے لکھنے والے بھی ہیں ادب جن کے لیے صرف بطونِ ذات کا معاملہ تھا مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اسی لیے ہمارے بیشتر جدید تخلیق کار ترقی پسند ہیں۔ یہ بات آپ کے یہاں کے پس منظر میں لوگوں کو بہت عجیب لگے گی کیوں کہ ہندستان کے حالات کو ذہن میں رکھ کر پاکستان کے ادب سے متعلق بہت مفروضے قائم کیے گئے ہیں۔ ہمارے یہاں جدیدیت پیدا ہی مارشل لا کے دورِ جبروت میں ہوئی اور اس میں ترقی پسندانہ رجحانات بالکل فطری تھے۔ مارشل لا ہمارے یہاں تین بار آیا اور ہر بار اس کے اثرات میں وہی تکرار رہی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ہمارے اٹھائیس سال مارشل لا کے خوف کے سایے میں گزرے ہیں اور ان ۲۸ برسوں کا ہمارا ادب بے حد علامتی ہے۔ ہمارے یہاں ادب معروضی صورتِ حال کا ردِ عمل ہے، صرف اظہارِ ذات اور بطونِ ذات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 'میں' 'ہم' بن جاتا ہے۔ جب کہ آپ کے یہاں جدید شاعری میں یہ 'میں' 'میں' ہی رہتا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آپ کے ملک کی سیاسی و سماجی صورتِ حال ہے۔

ہمارے یہاں سندھی ادبی سنگت موجود ہے۔ سرائیکی ادبی سنگت بھی فعال اور متحرک ہے۔ ہر زبان کی تنظیم قائم ہے اور اپنی زبان کی بقا و ترقی کے لیے فعال اور سرگرم ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس زبان کے ادیب اپنے ثقافتی گروپ کے جائز مطالبات کے لیے آواز بلند نہیں کرتے اور اپنی آسائشوں کو داؤ پر نہیں لگاتے، اس زبان کے ساتھ وہ ناانصافی کرتے ہیں۔ اور یہ ناانصافی ہمارے اور آپ کے، ہر دو ممالک کے ادیبوں نے کی ہے۔

س : پاکستان میں اُردو کی موجودہ روایت ہندستان سے بہت مختلف ہے۔ ہندستان میں چھوٹے قصبات و مضافات نے اُردو کلاسک کی ترتیب میں جو تاریخی رول ادا کیا ہے اور کر رہے ہیں وہ روایت پاکستان میں منتقل نہیں ہو سکی۔ خود آپ کا تعلق بھی یو۔پی کی ایک ایسی ہی تاریخی بستی سے ہے، تو کیا آپ اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ ہندستان کی نئی نسل زبان پر پاکستان کی نئی نسل سے زیادہ عبور رکھتی ہے ؟

ج : بھائی یہ بحث بہت طویل ہے اور میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ ہندستان میں اس نئی نسل کا ذہنی افق ہماری نئی نسل سے کہیں زیادہ وسیع ہے جس کا تعلق یو۔پی کے چھوٹے قصبات سے ہے مگر دوسرے علاقوں مثلاً بہار سے اُردو نوجوانوں کی جو نئی اور بڑی کھیپ آ رہی ہے ان کے یہاں زبان کا وہ عرفان مفقود ہے حالانکہ آپ کے یہاں اب یو۔پی میں اُردو کے حالات بہت حوصلہ افزا نہیں ہیں۔

پاکستان میں اُردو بولنے والوں کی تعداد ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲ر۷٪ تھی۔ اب ۱۹۹۱ء میں ہر چند زبان کا خانہ مردم شماری کے فارم سے خارج ہو چکا ہے مگر ۱۹۶۱ء ہی کی شرح کے حوالے سے بھی یہ تعداد دس فیصد سے کم کسی طور نہیں ہے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد مشرقی پاکستان سے اُردو بولنے والوں کی آمد اور سندھ اور پنجاب کے اندرونی علاقوں سے سندھ کے شہروں میں آباد ہو جانے والوں کی ایک بڑی تعداد کی پہلی زبان اُردو ہے۔ گجراتی بولنے والے خاندان کے بیشتر بچے بھی اُردو پہلی زبان کے طور پر بولتے ہیں۔ پنجاب میں بھی یہی صورتِ حال

..اگر ہم مادری زبان کے ساتھ پہلی زبان کے طور پر ..دو بولنے والوں کی تعداد کا تخمینہ لگائیں تو شاید ..دو بولنے والے ملک کی تیسری بڑی آبادی قرار ..ئیں۔ بقول آپ کے، اردو پاکستان میں اپنے ..ایتی مراکز سے دور ہے لیکن اب لاہور، کراچی اور ..ں اور اردو کے نئے مراکز ہیں اور ان مراکز سے ..ں اردو کو استناد مل رہا ہے وہ یقینی طور پر ..ندستان میں لکھی جانے والی اردو سے قدرے ..لف ہوگی لیکن بہت زیادہ نہیں۔ آپ کے یہاں ..ں اب بہار، مہاراشٹر اور جنوب کی دوسری ..استیں اردو کے نئے مراکز ہیں اور اس حوالے ..ے اردو میں ہر سطح پر تبدیلیاں آرہی ہیں۔ ..خیال ہے کہ اختلاف پر نظر رکھنے والے ماہرین ..ان ہی ہوتے ہیں اور ان کے اخذ کردہ کلیے ..نطقی طور پر درست ہو سکتے ہیں لیکن ابلاغ ..ندتک بہت زیادہ مؤثر نہیں ہو پاتے۔

س : ہندستان میں ادب کے موجودہ منظرنامے ..آپ کا تبصرہ کیا ہے ؟

ج : ہندستان میں اردو ادب خاصا متنوع ..کلاسیکی اور جدید مکاتبِ فکر میں آویزش ..لیکن یہ ادب اردو بولنے والوں کے نظام ..دار، تصورِ وقت اور تصورِ کائنات سے بہت ..دہ تک ٹھنک بھی نہیں رہ سکتا۔ ہندستان ..ں یاسیت پسندی کا فروغ غالباً وہاں کے ..ردو بولنے والوں کی 'سائیکی' کا عکاس ہے۔ ..ب اردو اور اردو بولنے والے خود ہندستانی ..ماج کی DESTING کے ساتھ یک جان ..و جائیں گے اور فرقہ پرستی کا آسیب یک سر ..تم ہو جائے گا تو شاید اردو ادب دیگر ہندستانی ..بانوں کی طرح، رجائیت کا لب و لہجہ بھی اختیار ..رلے۔ سرِ دست ہندستان کا اردو ادب اپنے باطن میں بڑا یاسیت پسند ہے اور وہاں کا ادیب گومگو کی صورتِ حال سے دوچار نظر آرہا ہے۔

س : اور آپ کے خیال میں ہندستان میں اردو کا مستقبل ؟

ج : اردو کا مستقبل حکومتی رویے اور اس رویے کی بابت اردو بولنے والوں کے گروہی تجربے پر منحصر ہے۔ اردو بہ حیثیت ایک زبان محفوظ ہے۔ یہ بہت سخت جان زبان ہے لیکن جب تک زبانیں روزگار کے مواقع کے ساتھ مربوط نہیں ہو جاتیں اس وقت تک ان کی افزائش کچھ ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ آپ کے یہاں فرانسیسی زبان کا مستقبل۔

لیکن میں اردو کے بہی خواہوں کی کوششوں سے مایوس نہیں ہوں، اور بالآخر یہ تاریخی تصور سرفراز ہوگا کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ کلچر کی سب سے بڑی نشانی ہے، اور یہ امر کہ یہ زبان مسلمانوں کی نسبتاً زیادہ تہذیبی اور مذہبی ضروریات پوری کرتی رہی ہے، وجہِ نزاع نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمان شعرا بشمول میرؔ، مصحفیؔ اور غالبؔ، اردو زبان کو ہندی ہی کہتے رہے۔ اردو بولنے والوں کو بھی اپنی زبان سے پیار کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں سے اخذ و اکتساب کے لیے تیار رہنا چاہیے کیوں کہ یہ ہندستانی سماج کا تاریخی تقاضہ ہے۔

س : ہندستان میں وہ نسل جسے پاکستان سے ایک جذباتی وابستگی تھی، رختِ سفر باندھ رہی ہے۔ اس نسل کے مکمل خاتمے کے بعد ہندستان اور پاکستان کے درمیان ادبی اور جذباتی تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی ؟

ج : ایک نسل رختِ سفر باندھتی ہے تو دوسری نسل اس کی جگہ لیتی ہے۔ ہندستان اور خود پاکستان بھی اس کلیے سے مبرا نہیں۔ دو ممالک کے باہمی تعلقات دونوں ہی ممالک کی سیاسی قیادتوں کی ترجیحات سے متعین ہوتے ہیں۔ اگر جذباتی وابستگی رکھنے والی نسل کی جگہ آنے والی نسل نے مسائل کے ادراک میں زیادہ سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا اور اس حقیقت کو پہچان لیا کہ دوستی صرف نعرہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو باہمی تعلقات کے تناقصات کے خاتمے سے پیدا ہوتی ہے۔ دونوں ممالک کی قیادتوں نے ایک دوسرے سے اختلافات کے اسباب واضح کر رکھے ہیں، اب ان اختلافات کو قائم بھی رکھا جا سکتا ہے اور کم یا ختم بھی کیا جا سکتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ ہم مختلف سیاسی، جغرافیائی تقاضوں اور معاشی مواقع کے لیے کسی حد تک صحیح دوستانہ کا ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر دونوں ممالک نے باہمی رنجشوں کو آنے والی نسل کے حوالے کیا اور خود وقت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہے تو پھر نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ روس اور امریکہ کے تعلقات میں بہتری سے یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ شاید ہمارے دونوں ممالک بھی کچھ دو اور کچھ لو کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے آئندہ نسلوں کے لیے زیادہ بہتر مستقبل چھوڑ جائیں گے۔

کیول سوری
۲۴۱۷، کمرہ بنگش، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

نظمیں

شردھانجلی!

آج پھر وقت کے خلاؤں نے
میری مسجد کو میرے مندر کو
اس طرح توڑ کر گرایا ہے
جیسے میرا کوئی خدا ہی نہیں

خوف

روشنی اس طرح لپکتی ہے
جیسے ڈس لے گی اُن اندھیروں کو
جو مرے ساتھ رہتے آتے ہیں

میں اور سورج

جلتے سورج کے تند خو شعلے
بھسم کرنے کی بات کرتے تھے
شام کو بے بسی سے تکتے ہیں

خود فریبی

بھول کر تیری ساری یادوں کو
اس طرح مطمئن ہوں میں جیسے
تجھ سے مِلنا گناہِ آدم تھا

خوش فہمی

اوڑھ کر تیرے نرم بانہوں کو
اس طرح سو گیا ہوں میں جیسے
کل کا سورج نکل نہ پائے گا

شہرِ تمنّا

کیسے پھر آج نظروں میں
ترے وہ سارے خط اُبھر آئے
آج تک تُو نے جو لکھے ہی نہیں

الزام

گہرا کالا بکھرتا ہوا آسماں
اس طرح قہر سے گھورتا ہے ہمیں
جیسے اس کے ستارے ہمیں کھا گئے

اندر آگ ہے

قاسم خورشید

پروڈیوسر ایجوکیشنل ٹیلی ویژن سینٹر، ایس سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کیمپس
مہندرو، پٹنہ ۰۰۰۰۶

کوئلری کے مزدوروں میں بے چینی تھی کہ سب کو خبردار کر دیا گیا تھا کہ آگ اندر ہی اندر پھیل رہی ہے۔ بہت ممکن ہے کہیں سے کوئی دھماکہ بھی ہو۔ زمین کے اندر کام کرنے والے مزدور تیزی سے اوپر آرہے تھے۔ ان کی بستیوں میں شور تھا —— ٹھیکے داروں کے کہنے پر سبھی ایک جگہ جمع ہوئے اور پھر حکمتِ عملی پر غور کیا جانے لگا۔ کالا سونا اندر ہی اندر دہک رہا ہے، اس تصوّر نے سب کے مستقبل پر بھی سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔

انجینئر اپنے کاموں میں لگے تھے جہاں کہیں شک ہوتا زمین بے آبرو کی جاتی لیکن بہت اندر جانے پر بھی آگ کا نہ ملنا تشویش کا باعث ہوا۔ سائنس کی ایسی ناکامی کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے —— آگ تو سچ مچ اندر ہے جانچ کے ہر عمل سے آگ کے ہونے کا خاص امکان ملتا۔

جب تمام تر کوششوں اور پورے یقین کے باوجود زمین کی تہہ میں جانے پر بھی آگ نہ ملی تو سبھی مزدوروں نے رائے دی کہ ہمیں پہلے کی طرح کام کرنے دیا جائے۔ ہم خود ہی اپنی حفاظت کرلیں گے لیکن انھیں اجازت نہیں دی گئی —— کئی دنوں کی کڑی محنت اور اعلیٰ سطحی تکنیکی جانچ کے باوجود دہکتے ہوئے انگاروں کا سراغ نہیں مل پایا اور تمام ماہرین نہ صرف یہ کہ اپنی کوششوں میں ناکام رہے بلکہ ان کے اعتماد کو بھی سخت ٹھیس پہنچی تھی۔

اور پھر ایک رات کی گہری خاموشی سے ابھری ایک عورت سُکھیا —— سُکھیا بہت دنوں سے چُپ ہے۔ اسے مَینا پالنے کا بہت شوق ہے۔ مَینا کے بولنے پر اس کا جی بہل جایا کرتا تھا لیکن ان دنوں نہ جانے کیوں مَینا بھی چُپ چُپ ہے۔ جب اندر آگ پھیلی اور یہ خدشہ بھی ظاہر کیا گیا کہ مزدوروں کی بستیاں بھی کسی وقت زمین دوز ہوسکتی ہیں تو سبھی مزدور، سائنس دانوں کے طے کردہ محفوظ مقامات پر جمع ہو کر کیرتن گانے لگے لیکن سُکھیا ان میں شامل نہیں ہو پائی بلکہ اس نے اپنا گھر بھی چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا —— کبھی کبھی گہری خاموشی سے اوب کر مَینا کچھ بولنے لگتی تو سُکھیا مسکرا دیتی۔ چونکہ سُکھیا کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہے شاید اسی لیے اس کے کسی بھی عمل پر اب کسی کا کوئی خاص ردِّ عمل نہیں ہوتا تھا —— وہ باضابطہ طور پر کام پر بھی نہیں جایا کرتی تھی ٹھیکے داروں کی ڈانٹ کا بھی اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔

سُکھیا چُپ کیوں ہوگئی ہے؟

اتنے بڑے حادثے کے امکان پر بھی سُکھیا کا کوئی ردِّ عمل نہیں؟

جب وہ عام مزدوروں کے ساتھ اندر کام کیا کرتی تھی تب بھی اسے کوئلے کے اندر کچھ تلاش کرتے ہوئے پایا گیا تھا۔ سونا نہیں، کوئ قیمتی پتھر نہیں۔ بلکہ اس کا کہیں کچھ کھو گیا تھا شاید وہیں کہیں دفن تھا جسے وہ اکثر کریدا کر بلکہ وہ کسی دبی ہوئی ایسی شے کی تلاش میں تھ جس کے حاصل ہونے پر اس کی تمام تر خوشیا لوٹ سکیں گی۔

سُکھیا کوئی غیر معمولی عورت نہیں تھ لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ ہر رات نشے میں چُورا مزدور پتی رام دین کی اذیتوں کا شکار ہونے باوجود ہر صبح ایک نئی اُمید کے ساتھ اس کے کامو میں ہاتھ بٹانے کو تیار ہو جایا کرتی تھی۔ رام د کو یہ اعتراف تھا کہ وہ سُکھیا پر بہت ظلم کرتا دوسرے مزدور اُس کی ایسی حرکتوں کی کافی ملا بھی کیا کرتے تھے لیکن پھر شام ڈھلے اس پر ای وحشت طاری ہوتی کہ کبھی کبھی وہ اپنی جھونپڑی تمام چھوٹا بڑا سامان غصّے میں باہر پھینک د سُکھیا اذیت برداشت کرنے کے باوجود اسے بہ بُرا بھلا کہتی ہی جاتی۔

رام دین بے حد محنتی مزدور تھا۔ جب نشے میں ہوا کرتا تبھی اپنی متضاد شخصیت کے سامنے آتا لیکن نارمل حالات میں وہ تمام مزدور کے لیے سب سے زیادہ ہمدرد دوست ثابت کرتا۔ جب کبھی کوئی مزدور ٹھیکے داروں کے ظلم شکار ہوتا تو رام دین سب سے پہلے ان کے مق

پڑا تھا بلکہ ایک بار ایک بیمار مزدور سائمن باسکی کی جوان بیوی کو ایک ٹھیکے دار کے چنگل سے اس نے چھڑایا اور پھر تمام مزدوروں کے تعاون سے کافی کوششوں کے بعد ٹھیکے دار کو جیل بھی بھجوادیا تھا لیکن جب جلد ہی ٹھیکے دار کو رہا کر دیا گیا تو رام دین مایوس رہنے لگا تھا نشے کی حالت میں وہ کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آتا۔ ان ہی دنوں کوئلری میں کام کا بوجھ کچھ زیادہ ہو گیا۔ مزدوروں کی تعداد بڑھی نہیں بلکہ رات میں اوور ٹائم شروع ہوا۔ برسات کی وجہ سے کوئلہ نکالنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بہت ساری سرنگوں کے دھنسنے کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ پانی کے مسلسل بہاؤ کی وجہ سے ایک سرنگ کے دھنسنے پر کافی مالی نقصان بھی ہوا لیکن سرنگ میں کام کرنے والے مزدوروں کو بچا لیا گیا تھا لیکن وہیں آس پاس کام کرنے والے رام دین کا اچانک غائب ہو جانا حیران کن تھا۔ بہت ــــ چھان بین کے بعد پتہ چلا کہ سرنگ کے دھنسنے پر صرف رام دین کو نہیں بچایا جا سکا تھا۔ وہ وہیں دب کر مر گیا ــــ سکھیا کے لیے یہ ایک غیر معمولی حادثہ تھا ــــ وہ رو دھو کر چپ تو ہو گئی لیکن اس کے اندر کہیں کوئی پھانس باقی تھی۔ ایک ہی سوال اس کے ذہن میں ابھرتا کہ ایسا کیسے ہوا کہ سبھی اس حادثے میں زندہ بچ گئے اور میرے پتی کی جان چلی گئی؟ پھر وہ کئی سطحوں پر خود کو کریدنا چاہتی لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہی تھی ــ اس کا گھر ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔ سکھیا کے ساتھ مینا کا بھی چپ ہو جانا کسی غیر معمولی حادثے سے کم نہ تھا۔

اسے رام دین کی موت کے سلسلے میں جو تشویش تھی وہ غلط بھی نہیں تھی لیکن وہ کس سے کہے؟ کون اس کے اندیشوں کی تائید کرے گا؟ کسی بھی وقت کسی بھی مزدور کو کوئی حادثہ پیش آ جانا بہت معمولی سی بات تھی۔

لیکن سکھیا کے لیے یہ کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا ــ ہوا یوں تھا کہ اس رات بیچ بیچ بہت تیز بارش تھی۔ زمین کے اندر مزدور اپنے کاموں میں لگے تھے لیکن سکھیا کو معلوم تھا کہ رام دین ان میں شامل نہیں تھا۔ اس کا کام کسی بھی طرح پانی کے بہاؤ کو روکنا تھا۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوا۔ سرنگ کے اندر اس نے پانی کو جانے سے بیچ بیچ روک دیا اور ٹھیکے دار اس پر بہت خوش ہوا۔ تب اس نے رام دین کو اپنی چھتری میں بلایا وہ اس کے پاس گیا اور سکھیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ایک چٹان کی اوٹ میں رام دین نے ٹھیکے دار کی دی ہوئی شراب پی۔ تبھی بارش اور تیز ہو گئی اور سرنگ کے دھنسنے پر یہ سارا معاملہ وہیں دفن ہو گیا۔

بارش کے تھمنے کے کچھ روز بعد ہی پتا نہیں کیسے اندر ہی اندر آگ پھیلنے لگی جبکہ اتنی تیز بارش کے بعد ایسا ہونا شاید عام لوگوں کے لیے غیر متوقع تھا لیکن آگ تو اندر ہی اندر بہت تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ لیکن دہکتے ہوئے انگاروں کا کہیں نام و نشان نہیں مل پا رہا تھا۔ یہ واقعی عجیب معاملہ تھا۔ جبکہ زمین بھی جگہ جگہ دھنس رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے مکان منہدم ہو رہے تھے پھر بھی جس آگ کا امکان تھا اسے اب تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

آج جب سکھیا کی کٹیا بھی دھنسنے لگی تو وہ مینا کا پنجرا لے کر رات کے اندھیرے میں کھو گئی۔ ٹھیکے دار نے اس کا پیچھا کیا۔ لیکن بہت کوشش کے باوجود وہ سکھیا کو رات کی تاریکی میں تلاش نہیں کر سکا ــــ سکھیا چلتے چلتے تھک گئی تو ایک جگہ بیٹھ گئی۔ پنجرا پاس میں ہی رکھ دیا اور نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔

صبح ہونے لگی تو وہ اچانک چونک اٹھی۔ سب کچھ خاموش ضرور تھا لیکن لگتا تھا منظر کسی بھی آہٹ پر بول پڑے گا ــــ سکھیا نے پنجرا دیکھا ــــ مینا کو کسی طرح پنجرے سے باہر نکالا اور دھیرے سے اسے زمین پر رکھا لیکن جیسے ہی مینا نے زمین کو چھوا اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ سکھیا بلک بلک کر رونے لگی ــــ مینا کا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جانا، اس کا دم توڑ دینا ایک ایسا حادثہ تھا جس نے ہر خاموشی کو اچانک بولنے پر مجبور کر دیا تھا ــــ سکھیا زور زور سے چیخنے لگی۔ وہ مزدوروں کو پکارنے لگی ــــ

"دوڑو ... جلدی آؤ ... دیکھو یہاں آگ ہے ... بہت آگ ہے یہاں ... جلدی آؤ ..."

اور بیچ بیچ اس جگہ سے جیسے ہی رام دین کی بوسیدہ لاش برآمد ہوئی۔ چاروں طرف دہکتے ہوئے انگاروں کا پتہ مل گیا ــــ یہی انگارے تیزی سے مزدوروں کے وجود میں منتقل ہونے لگے ــــ

میسور کی علمی و ادبی فضا

عظیم الشان صدیقی
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

آزادی سے قبل جنوبی ہندستان میں حیدرآباد کو اُردو مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ ریاست کی سرکاری زبان چونکہ اُردو تھی اس لیے زندگی کے ہر شعبے میں اُردو کا سکہ چلتا تھا۔ دارالترجمہ کے علاوہ اعلیٰ سطح پر عثمانیہ یونیورسٹی کی شکل میں اُردو ذریعۂ تعلیم کا پہلا کامیاب تجربہ بھی وہیں کیا گیا تھا جس کے فارغ التحصیل طلبا میں وزیرِ اعظم جناب پی۔ وی نرسمہاراؤ، سابق وزیرِ تعلیم نرسری شیوشنکر اور جناب سید ہاشم علی (سابق وائس چانسلر) وغیرہ کے نام شامل ہیں لیکن ریاست کے ہندستان میں ضم ہوجانے کے بعد جہاں اس کے بیشتر علاقے دوسرے صوبوں میں شامل کر دیے گئے وہاں اُردو مرکز بھی کئی شہروں میں تقسیم ہوگیا۔ اورنگ آباد، گلبرگہ اور بنگلور کے علاوہ یہ نعمت اور جن شہروں کے حصے میں آئی ہے ان میں میسور کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

میسور ہندستان کے جنوب بعید میں ایسی جگہ واقع ہے کہ اسے ملیالم، تامل، کنٹر اور اُردو تہذیب کا بجا طور پر سنگم کہا جا سکتا ہے۔ یہ جنوبی ہندستان میں اُردو کا آخری قلعہ بھی ہے جہاں ٹیپو سلطان کے زمانے ہی سے اُردو کا بول بالا رہا ہے اس دور کی بعض دستاویزیں بھی اُردو میں موجود ہیں اس زمانے میں ٹ، ڈ اور ڑ جیسے حروف چار نقطوں (ٹ۔ ڈ۔ ڑ) کے ساتھ لکھے جاتے تھے، یہاں اُردو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ تعلیم یافتہ خاندانوں میں اُردو بولنا، اُردو لکھنا، اُردو پڑھنا اور اُردو سے اپنا رشتہ ظاہر کرنا تہذیب اور شائستگی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔

میسور میں اگرچہ نجی دینی مدارس اور لڑکیوں کے لیے اسکول بھی موجود ہیں جن کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے لیکن یہاں سرکاری سطح پر بھی پہلی جماعت سے آٹھویں جماعت تک اُردو میڈیم اسکولوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ جن میں طلبہ اور اساتذہ کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے۔ لیکن نویں جماعت سے اُردو اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ جس کا سلسلہ یونیورسٹی تک جاری رہتا ہے۔ میسور کے تقریباً تمام کالجوں مثلاً مہاراجا کالج، یوراجا کالج، جے ایس ایس کالج، ڈی بنومیا کالج، سینٹ فلومینا کالج، مسٹریشین کالج، ریجنل کالج آف ایجوکیشن، ایوننگ کالج آف یونیورسٹی میں اُردو بطور مضمون پڑھائی جاتی ہے میسور یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کو بھی جنوبی ہندستان میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ خاصا بڑا اور فعال شعبہ ہے جہاں جنوبی کرناٹک، کورگ، کیرالا اور تامل ناڈ سے طلبہ اُردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے آتے ہیں۔ اس شعبے سے اُردو کے بعض نامور اہلِ قلم وابستہ رہے ہیں۔ جن میں پروفیسر آغا محمد شوستری، پروفیسر خضر علی خاں، پروفیسر ایچ۔ آر۔ عبدالمجید، پروفیسر حنیف کلیم، پروفیسر سراج الحسن، پروفیسر میر محمود حسن، پروفیسر حبیب النسا بیگم، مولوی محمد خاں اور پروفیسر محمد ہاشم علی وغیرہ شامل ہیں۔ آج کل شعبۂ اُردو کے صدر ڈاکٹر مسعود سراج ہیں پروفیسر عبدالقادر سروری نے بھی اپنی تدریسی، علمی اور ادبی زندگی کا آغاز میسور کے مہاراجا کالج سے ہی کیا تھا ڈاکٹر آمنہ خاتون جو بعد میں بنگلور یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر چلی گئی تھیں ان کا تعلق بھی میسور سے ہی تھا۔

میسور یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے کئی امتیازی پہلو ہیں۔ یہاں درس و تدریس کے علاوہ تحقیق و تنقید کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اور کئی اہم موضوعات پر مقالے لکھے جا چکے ہیں ان میں "جنوبی ہند میں اُردو مثنوی کا ارتقا"، "دکنی ادب میں سماج اور تہذیب" "خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل" "شاہ صدرالدین۔ حیات و خدمات" "سید عارف شاہ قادری۔ حیات و خدمات" "جنوبی ہند کی خواتین افسانہ نگار" اور "تذکرۃ البلاد الحکام" وغیرہ مقالات شامل ہیں۔ شعبۂ اُردو اپنے علمی اور ادبی جلسوں اور کل ہند سیمناروں کے لیے بھی مشہور ہے۔ یہ "میزان" کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کرتا ہے جس میں شعبۂ اُردو کی کارکردگی کے علاوہ طلبا و اساتذہ کے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور تخلیقات شائع کی جاتی ہیں۔

میسور یونیورسٹی کا انسٹی ٹیوٹ آف سپانڈنس کورس اس اعتبار سے دوسرے اسلاتی لیمی اداروں سے ممتاز ہے کہ یہاں ایم اے اور اے کا امتحان دینے کے لیے نچلی سطح کا کوئی امتحان س کرنے یا سند کی ضرورت نہیں ہے صرف عمر ی قید ہے۔ ہر وہ شخص جس کی عمر کم سے کم بیس سال ہے براہِ راست بی اے کے امتحان میں اور س کی عمر کم سے کم پچیس سال ہے وہ ایم اے کے امتحان میں شریک ہوسکتا ہے۔ داخلے کے بعد سباق بذریعہ ڈاک بھیج دیے جاتے ہیں جس ی وجہ سے جنوبی ہندستان میں یہ انسٹی ٹیوٹ اصا مقبول ہوگیا ہے۔ بی اے اور ایم اے کے صاب میں اُردو بھی شامل ہے۔ اس کورس میں اردو کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ سال ۹۱-۱۹۹۰ء میں صرف ایم اے اُردو آنل کے امتحان میں شریک ہونے والے طلبہ کی عداد ڈھائی سو سے زائد تھی۔

میسور کا فاروقیہ ایجوکیشنل ٹرسٹ اس یے قابل ذکر ہے کہ جس کی نگرانی میں نہ صرف فاروقیہ فارمیسی کالج چلایا جاتا ہے بلکہ اس نے تعلیم انسواں کے لیے بھی کئی اسکول قایم کیے ہیں۔ اس کے علاوہ ترقی اُردو بیورو کی مالی امداد سے یہاں اُردو خطاطی کا مرکز قائم ہے جہاں طلبہ کو وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔

میسور نے طباعت کی دشواریوں کے باوجود اُردو صحافت کو زندہ رکھا ہے۔ یہاں کے رسائل و جرائد میں قول میسور، شاہین (مُدیر صمد شاہین) نقاد (مدیر عبدالغفور خاں بسمل) نوجوان (مدیر محمد جعفر صوفی) انجمن (مدیر سلیم تمنائی) حقیقت (مدیر محمد عبداللہ شریف افضل) بیباک (مدیر خلیل بے باک) قابلِ ذکر ہیں اس کے علاوہ مہاراجا کالج سے ایک ادبی میگزین مخزن کے نام سے شائع ہوتا تھا لیکن یہ رسائل اب تاریخ کا حصّہ بن چکے ہیں۔ جہاں تک روزناموں کا تعلق ہے۔ آزادی سے قبل میسور میں اُردو کا پہلا اخبار "صبح بہار" کے نام سے منشی احمد علی صوفی نے جاری کیا تھا آزادی کے بعد مولانا رکن الدین سالک نے "تنظیم" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا جو پہلے ہفت روزہ تھا لیکن بعد میں روزنامہ بنادیا گیا تھا۔ آج کل میسور سے اُردو کے چار روزنامے شائع ہوتے ہیں جن میں آفتاب کرناٹک اور رہنمائے(؟) کو عوام میں مقبولیت حاصل ہے کرناٹک سرکار کی طرف سے بھی میسور ڈسٹرکٹ کا گزیٹیر شائع کیا جاتا ہے جس میں اُردو کے شعرا ادبا اور اُردو اساتذہ کا تذکرہ شامل ہوتا ہے میسور میں اب طباعت کی سہولتیں موجود ہیں اور اسد پریس اور تاج پریس نے اُردو کے لیے آسانیاں فراہم کردی ہیں۔

میسور اپنی علمی ادبی سرگرمیوں، جلسوں، مشاعروں اور کتابوں کی شاندار رسم اجرا کی تقاریب کے لیے بھی مشہور ہے۔ ادبی انجمنوں میں بزمِ اُردو اور انجمن ترقیِ اُردو خاصی سرگرم ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں ضمیر عاقل شاہی مرحوم کی ایما پر شاہد صاحب، رزاق افسر صاحب، مشتاق صاحب اور اقبال فرید صاحب نے مل کر بزمِ اُردو کے نام سے انجمن کی بنیاد ڈالی تھی۔ جب تک ضمیر عاقل شاہی زندہ رہے اس کی سرپرستی کرتے رہے اب جناب رزاق افسر اس کے روحِ رواں ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں انجمن ترقی اُردو کی بنیاد پڑی جس کے صدر جناب سلیم تمنائی ہیں اور سیکریٹری سید منظور احمد ہیں جو خاصی فعال شخصیت کے مالک ہیں۔

یہ دونوں انجمنیں، مشاعروں، ادبی نشستوں، رسم اجرا کی تقاریب وغیرہ کا اہتمام تو کرتی ہی ہیں ساتھ ہی باہر سے آنے والے مہمان ادیبوں اور شاعروں کے لیے استقبالیہ جلسوں کا انتظام کرنا بھی ان کے دستورالعمل میں ہے۔ اعزازی جلسوں میں میسور کی انجمن اساتذۂ اُردو بھی پیچھے نہیں ہے۔ وہ بھی خاصے بڑے جلسے منعقد کرتی ہے جن میں اُردو اساتذہ خصوصاً خواتین بڑی تعداد میں شریک ہوتی ہیں ان جلسوں میں شریک ہو کر شمال اور جنوب کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اُردو کا یہی وہ جادو ہے جو ملک کو متحد رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

میسور میں تصنیف و تالیف کی مضبوط روایت موجود ہے۔ جس میں تاریخ، مذہب اور ادب سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ میر حیات میسوری کی تصانیف مصباح الحیات، سراج العقائد، مولانا خلیق مرحوم کی معجزات محمدی اور پروفیسر ایچ۔ آر۔ عبدالمجید کی معلم القرآن، معالم القرآن کا تعلق اگر دینیات سے ہے تو محمود خاں بنگلوری کی تصنیف سلطنت خداداد اور اکرام کاوش کی داستان میسور تاریخی کتابیں ہیں۔ ادبی تصانیف میں پروفیسر آمنہ خاتون کی تصنیف میسور میں اُردو کو خاص شہرت حاصل ہے۔ ایچ۔ آر۔ عبدالمجید کی تصانیف میں پُرانے چراغ، پُرانی یادیں اور میر محمود حسنی کی تصانیف میں کرناٹک میں اُردو فارسی کتبے، کلیات نسیم میسوری، تاریخ کنڑ ادب (ترجمہ) ٹی۔ پی۔ کیلاسم (ترجمہ) شامل ہیں۔

سلیم تمنائی بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں "جنوبی ہند کا بہترین ادب" (ترجمہ و ترتیب)، "قومی یکجہتی اور دکن دیس" اور "دانستہ راز دیارِ دکن" میں شامل ہیں آخرالذکر کتاب ڈاکٹر

ہ اقبال کی میسور میں آمد، مصروفیات، ﴿سلطان کے مزار پر حاضری، تاثرات و تقاریر ﴾ ذکر پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر مسعود سراج کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "ادراک و عرفان" کے م سے شائع ہوا ہے۔ موصوف کو تاریخ گوئی سے ں دلچسپی ہے اور آج کل اسی موضوع پر کام رہے ہیں۔ سیّد منظور احمد نے ودّیا پیٹھ کی لیمی سرگرمیوں پر ایک کتابچہ تصنیف کیا ہے ں کے علاوہ وہ "ظریف اقبال" کے مرتبین ہیں لیم تمنائی کے ساتھ شریک ہیں۔ مشہور ڈرامہ "ٹیپو لطان" کے خالق خلیل منظری کا تعلّق بھی اسی رزمین میسور سے ہے۔

اُردو کی مشہور افسانہ نگار اور تنقید نگار ناز شیریں جن کا کراچی جاکر انتقال ہوا اسی شہر ں رہنے والی تھیں۔ حسنیٰ سرور بنیادی طور پر اعرہ ہیں اور ان کے تین شعری مجموعے "ایک اند چمکتا ہے"، "شبنم شبنم" اور "خواب زار" کے م سے شائع ہوتے ہیں۔ وہ افسانے بھی لکھتی ں۔ جن کا مجموعہ محمور سعیدی صاحب کے مقدمے ے ساتھ "برف کے پھول" ۱۹۸۹ء میں شائع دچکا ہے۔ ان افسانوں میں انھوں نے ایک درت کی حیثیت سے ہندستانی سماج میں عورت ، حیثیت، مسائل، جدوجہد اور عورت کی طرت اور نفسیات کی خوبصورت تصویرکشی کی ہے۔ دیگر خواتین میں مہ جبین انجم اور نکہت شاہین ے نام شامل کیے جاسکتے ہیں یہ دونوں ہی شعر ہتی ہیں جو عموماً سالانہ کے ادبی اڈیشن کی زینت نتے ہیں۔ میسور کی ایک اور قابلِ قدر تصنیف کالی داس۔ شخصیت اور فن" ہے جو شہانہ شبنم ی محنت شاقہ اور ادبی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ کالی داس کے ڈراموں کے اُردو میں ترجمے تو کیے جاچکے ہیں لیکن فن اور شخصیت پر مواد کم ملتا ہے شہانہ شبنم نے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ان کے ڈراموں کا بھی تفصیل سے تعارف کرایا ہے البتّہ کتاب میں فنّی تجزیے سے متعلق حصّہ کسی قدر کمزور ہے۔

نواحِ میسور میں چنن پٹنن کے خلیل خاور اپنی افسانہ نگاری کے لیے مشہور ہیں ان کے افسانوں کا مجموعہ "مسافت ناتمام" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ رشید احمد اگرچہ پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں لیکن افسانے بھی لکھتے ہیں۔ اُردو کے دیگر مراکز کی طرح میسور بھی بیسویں صدی سے شعر و شاعری کا مرکز رہا ہے یہاں اب بھی شعری نشستوں کا اہتمام کیا جاتا ہے البتّہ ان میں ایک تبدیلی آئی ہے۔ تاخیر سے آغاز اور دیر رات گئے ختم ہونے کے بجائے شام یا رات کے پہلے حصّے میں ہی اختتام کو پہنچ جاتے ہیں۔

شاعری اہلِ میسور کے لیے شوق اور وسیلہ اظہار تو ہے لیکن کل وقتی مشغلہ نہیں ہے، یہاں کے شعرا میں مختلف پیشوں سے تعلّق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ جن میں وکیل، ڈاکٹر، انجینیئر، جج، تاجر، سرکاری ملازم اور اہلِ حرفہ شامل ہیں جس کی وجہ سے موضوعات کا تنوع اور اظہار کی تازگی برقرار رہتی ہے۔

میسور میں مشاعرے کی کئی روایات رہی ہیں ان میں مشاعرہٗ بہشت کی روایت اس لیے منفرد نظر آتی ہے کہ اس کے لیے عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں مصرع طرح دیا جاتا تھا اور شعرا تینوں ہی زبانوں میں اشعار کہہ کر لاتے تھے۔ یہ ایسی شرط تھی جو شعرا اور سامعین دونوں کے لیے ہی امتحان کی حیثیت رکھتی تھی اس لیے ہر کس و ناکس اس میں شریک نہیں ہوسکتا تھا۔ مشاعرے کی دوسری روایت کا تعلّق خلیق مرحوم سے ہے۔ جو خود بھی اچھے شاعر تھے اور مشاعرے بھی منعقد کراتے تھے انھوں نے عربی کی شرط کو ختم کر دیا تھا اور صرف فارسی اور اُردو میں ہی مصرع طرح دیا جاتا تھا۔ ان مشاعروں میں جو کلام پیش کیا جاتا تھا اُسے گلدستہ کی شکل میں شائع کیا جاتا تھا جس سے اس دور کے شعرا اور ان کے رنگ کلام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مشاعرے کی تیسری روایت کی بنیاد بزمِ اُردو نے ڈالی ہے۔ اس نے میسور میں غیر طرحی مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا جس کی وجہ سے مشاعروں کی مقبولیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

جہاں تک میسور کے شعرا کا تعلّق ہے تو ان میں منشی میر عابد علی جاہ، منشی غلام حسین عاصی اور لالہ مہتاب رائے سبقت کے نام بھی ملتے ہیں جو دربار سلطانی کے دور سے تعلّق رکھتے ہیں۔ ان شعرا کا بیشتر کلام فارسی میں ہے۔ البتّہ مہتاب رائے سبقت اُردو میں بھی شعر کہتے تھے جن کی حیات اور شاعری کے بارے میں عبدالقادر سروری کی کتاب موجود ہے۔ ان کے علاوہ شعرا متقدمین میں اگر نسیم میسوری، میر حیات میسوری اور مولانا درگاہی کے نام شامل کیے جاسکتے ہیں تو شعرا متاخرین میں شہاب الدین سیّد درویش پیراں، منشی احمد علی صوفی، شاہ ابوالحسن ادیب، مودی غلام احمد، حکیم محمد قاسم انصاری قسیم، عبدالرحمٰن برق، حسن خاں گردشس، پروفیسر سراج الحسن ادیبی، پروفیسر محمد حنیف کلیم، نذیر احمد نیّر، ضمیر الدین ضمیر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

موجودہ دَور کے کہنہ مشق شعرا میں مظہرالصمد شاہد رزّاق افسر جیسے شعرا شامل ہیں۔ ان کے

پاس آٹھ دیوان غیر مطبوعہ ہیں جن کی اشاعت اور حفاظت کی فکر انھیں ہر وقت پریشانی میں مبتلا رکھتی ہے۔ یہ سب کی فکر کرنے کے بجائے اگر اپنے کلام کا انتخاب کرسکیں تو ممکن ہے کہ کرناٹک اُردو اکادمی یا فخر الدین علی احمد کمیٹی کے مالی تعاون سے اشاعت کی کوئی سبیل نکل سکے۔

موجودہ دور کے دیگر شعرا میں اقبال جلیس پیشے کے اعتبار سے جج ہیں ان کا شعری مجموعہ "حرف حرف خوشبو" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ پروفیسر عبدالغفار شکیل بھی (جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات سے وابستہ رہ چکے ہیں اور آج کل ٹیپو سلطان وقف کے نگراں ہیں) شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے علاوہ حسنیٰ سرور، اکرام کاوش، فیض اللہ خاں فیضؔ، وارث راقمی اور اقبال فرید کے نام بھی شعرا کی فہرست میں آتے ہیں اور نوجوان شعرا میں ڈاکٹر مسعود سراج، رفیق عارف، نورالحق سلیم ہیں۔

میسور کے شعرا کے کلام میں روایت اور انحراف، قدرت اور عصری حسیت کا سراغ ملتا ہے انھوں نے اگرچہ ادبی معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن بعض اوقات مقامی اثرات، لب ولہجہ اور محاورہ بھی بے ساختہ ان کے کلام میں در آتا ہے۔ میسور کے شعرا کی اتنی بڑی تعداد کے پیش نظر ضرورت ہے کہ تذکرۂ شعرا میسور علیحدہ سے ترتیب دیا جائے تاکہ یہ شعرا اور ان کا کلام تغیر زمانہ سے محفوظ رہ سکے۔ اور یہ کام میسور یونیورسٹی کا شعبۂ اُردو بخوبی انجام دے سکتا ہے۔

مختلف علاقوں اور ریاستوں میں جو ادب پروان چڑھ رہا ہے۔ اس کی اپنی ایک الگ ادبی، تہذیبی اور لسانی شناخت ہے جس کو نظر انداز کرنا ادب اور ادیب دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے جس سے نجات صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ ہر یونیورسٹی میں اس کی ریاست سے متعلق بی۔ اے یا ایم۔ اے کی سطح پر علاقائی اُردو ادب کا لازمی یا اختیاری پرچہ پڑھایا جائے تاکہ طلبہ اپنی ریاست کی ادبی روایت سے واقفیت حاصل کرسکیں اور ان کے شوق کو راہ مل سکے۔

اہل میسور کو اُردو زبان و ادب سے جو غیر معمولی دلچسپی اور محبت ہے اس کے پیش نظر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہاں نہ صرف اُردو کا چراغ روشن رہے گا بلکہ مستقبل میں اہل میسور اُردو کی زیادہ بہتر انداز میں خدمت انجام دے سکیں گے۔

(نوٹ: اس مضمون کے لیے بعض اہم معلومات رزاق افسر صاحب نے فراہم کی ہیں جن کا شکریہ واجب ہے باقی تاثرات میسور کے حالیہ سفر کا نتیجہ ہیں)۔

مہرباں جب سے زیادہ وہ نہیں کچھ کم ہے
ایسا لگتا ہے کہ ہر شے میں کہیں کچھ کم ہے
وسعتِ قلب و نظر کی ہے ضرورت ورنہ
آسماں کچھ ہے زیادہ نہ زمیں کچھ کم ہے
سرحدیں دل کی جہاں آکے ملا کرتی ہیں
فاصلہ میرے ترے بیچ وہیں کچھ کم ہے
رات ڈھل جائے گی آثار یہ بتلاتے ہیں
مجھ کو اِس بات کا ہر چند یقیں کچھ کم ہے
شاید ارمانوں نے دم توڑ دیا گھبرا کر
آج ہنگامہ مرے دل کے قریں کچھ کم ہے

آزاد گورداسپوری
کوارٹر نمبر ۴، بلاک نمبر ۲/۵۲، روڈ نمبر ۱، ادیتہ پور، جمشید پور ۸۳۱۰۱۳

ہر ایک حال میں جلنے کا حوصلا نہ رہے
مخالف میں دیے کی اگر ہوا نہ رہے
بس آندھیوں کو یہی دُھن سوار رہتی ہے
نظر کے سامنے اک پیڑ بھی کھڑا نہ رہے
مرے خدا! مجھے چادر بھی کر عطا، ایسی
جو میرے پاؤں چھپا لے تو سر کھلا نہ رہے
میں چاہتا ہوں کہ تیری گلی میں یوں پہنچوں
پھر اُس کے بعد نکلنے کا راستا نہ رہے
اِسی میں اہلِ سیاست کی عافیت ہے ضیاؔ
کوئی جگہ ہو کہیں امن کی فضا نہ رہے

ادریس ضیاؔ
کلا نتھ مارکیٹ، اعلیٰ پور، بدایوں ۲۴۳۶۳۱ (یوپی)

یہ زمیں رہ جائے گی یہ آسماں رہ جائے گا
ہم چلے جائیں گے اک دن یہ جہاں رہ جائے گا
دُھند میں کھو جائے گا یہ زندگی کا کارواں
دُور تک اُڑتا، غبارِ کارواں رہ جائے گا
ٹوٹتے تاروں سے ملتا ہے حقیقت کا سُراغ
ٹوٹتے جائیں گے تارے آسماں رہ جائے گا
سلسلہ آنے کا، جانے کا لگا ہے رات دن
میں کہاں رہ جاؤں گا، کل تو کہاں رہ جائے گا
اے معظّم ہم تو اک دن بزم سے اُٹھ جائیں گے
ذکر اپنا دوستوں کے درمیاں رہ جائے گا

محمد معظّم جیراجپوری
اسلم منزل، اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اب کوئی جگنو چمکتا کیوں نہیں
مسکراتا کوئی غنچا کیوں نہیں
گردشِ شام و سحر کے باوجود
رُخ زمانے کا بدلتا کیوں نہیں
کون تھا اپنا، پرایا کون ہے
تم نے اس بارے میں سوچا کیوں نہیں
اس کی خاموشی وبالِ جاں ہوئی
سوچتا ہوں خط وہ لکھتا کیوں نہیں
اب تو بارش بھی نہیں ہوتی وسیمؔ
بے ثمر یہ پیڑ جلتا کیوں نہیں

وسیم مینائی
تارین جلال نگر، شاہجہاں پور ۲۴۲۰۰۱ (یوپی)

پگھلتی ہوئی برف

نشاط آسلم
اے - ۸۸، پنڈارا روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

وجے اسکوٹر بند کرتے ہوئے حسبِ عادت زور سے چلایا "سُدھا!"

سُدھا ابھی نہا کر نکلی تھی۔ بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ چھوٹے سے سفید تولیے سے بالوں کو خشک کرتی ہوئی وہ بڑی نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ وجے کا جی چاہا کہ وہ بھیگی بھیگی سی سدھا کو بازوؤں میں بھر لے لیکن شاید وہ اس کا ارادہ سمجھ گئی اور مسکرا کر اندر بھاگ گئی۔ اُس کے دلفریب چہرے کے دمکتے ہوئے خطوط پر لرزاں شبنمی قطروں نے وجے کو ایسا سرشار کر دیا کہ وہ یہ بھی بھول گیا کہ اسے بتانے کے لیے وہ کسی بات کو راستے بھر یاد کرتا آیا تھا۔ اندر پہنچ کر اُسے دفعتاً خیال آیا:

"ارے سُدھا! تم نے صبح دفتر جاتے ہوئے یاد نہیں دلایا، کل ہاؤسنگ سوسائٹی کے لیے رقم جمع کرنے کی آخری تاریخ ہے، یہ موقع ہاتھ سے نہیں نکلنا چاہیے۔"

"فکر نہ کرو، وہ تو میں نے پرسوں ہی جمع کر دی تھی۔" سُدھا میز پر چائے کی ٹرے رکھتے ہوئے بولی۔

"بہت خوب! یو آر گریٹ! اکیلی گئی تھیں تم؟"

"نہیں مسز احمد بھی ساتھ تھیں۔" "اوہ! بہت اچھا کیا۔" وجے کاندھے پر تولیہ رکھ کر باتھ روم کی طرف چل دیا۔ سُدھا اسے بے حد عزیز تھی۔ ایک آدرش بیوی کے سارے گُن اس میں موجود تھے۔ انتہائی سمجھدار اور سلیقے مند۔ صبح چھ بجے سے اٹھ کر وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ شادی کو بارہ سال گزر چکے تھے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دفتر کے وقت پر وجے کو ناشتہ نہ ملا ہو، یا کسی دن جوتوں پر پالش نہ ہوئی ہو اور کپڑے پریس کیے ہوئے نہ ہوں۔ روزانہ شام کو اسے گھر آئینے کی طرح صاف و شفاف اور بچے گڑیوں کی طرح آراستہ ملتے۔ اس کے روزمرّہ کا معمول ایک صاف ستھری، تنی ہوئی چادر کی مانند تھا جس پر کسی شکن کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لیکن یہ خوبیاں بھی ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ سُدھا کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز تھی اس کی خود اعتمادی جو اس کے مزاج میں کچھ اس طرح رچی بسی تھی جیسے کسی گھنے سایے دار پیڑ کی جڑیں زمین میں پیوست ہوں۔ وہ ان عورتوں میں ہرگز نہ تھی جو ایک چوہیا یا چھپکلی کو دیکھتے ہی چیخ اُٹھتی ہیں اور شوہر کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتیں۔ شروع میں وجے ان باتوں کا مدّاح تھا لیکن رفتہ رفتہ اسے ایک گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ اور گھر کی پُر امن فضا سے طبیعت اوبنے لگی۔ اس کے لاشعور میں کہیں کچھ شورش، کچھ بے چینی، کچھ نشیب و فراز کی خواہش چھپی تھی۔ وہ دانستہ کئی بار راتوں میں دیر سے گھر آتا۔ کبھی جان بوجھ کر اس کی طرف سے بے پروائی برتتا۔ لیکن سُدھا نے کبھی کوئی باز پرس نہیں کی۔ اسے اعتماد تھا کہ وجے کبھی کوئی غلط کام نہیں کر سکتا۔ اسے اُن عورتوں سے سخت چڑ تھی جو خواہ مخواہ اپنے شوہروں پر شک و شبہ کر کے ان کا جینا اجیرن کیے رہتی ہیں یا بات بے بات روٹھ کر اور آنسو بہا کر عشوہ طرازیاں دکھاتی ہیں۔ زندگی سبک خرامی سے بہتی ہوئی ایک ندی تھی جس میں کہیں کوئی ہلچل نہیں کوئی بھنور نہیں، لیکن وجے پر اسی سکون کے باعث ایک بیزاری طاری ہوتی جا رہی تھی۔ پچھلے دنوں جب وہ ۲۰ دنوں کے لیے مدراس جانے لگا تو یہ سوچ کر پریشان تھا کہ اتنے دنوں تک سُدھا بچوں کے ساتھ اکیلی کیسے رہے گی۔ وہ دورے کو ملتوی کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ جب اس نے بیوی سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے بڑے پُر زور طریقے سے اُسے منع کیا کہ وہ اپنے پروگرام کو منسوخ نہ کروائے۔ وجے مطمئن ہو کر چلا گیا لیکن دل میں ایک خلش لے کر — کاش! سُدھا اس سے کہتی کہ وجے تم مت جاؤ۔ تمھارے بغیر مجھے راتوں میں ڈر لگتا ہے۔

دھیرے دھیرے اس کی بے خوفی اور خود اعتمادی وجے کے دل میں خار کی طرح کھٹکنے لگی۔ کہیں کوئی کام ہوتا، بچوں کے اسکول کا کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ حسبِ معمول اسے اطلاع دیے بغیر

سلجھالیتی۔ وجے کو جب معلوم ہوتا تو جھلّا اُٹھتا لیکن کچھ کہہ نہ پاتا۔ آخر کہے تو کیا؟ اپنے جذبات کا اظہار کرے تو کیسے؟ لوگ خامیوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں وہ ایک خوبی پر کیسے اُنگلی اُٹھائے؟ وہ ایک عجیب سی کشمکش میں گرفتار تھا۔ برسات کی گھپ اندھیری جھماجھم برستی راتوں میں جب بادل گرجتے اور بجلیاں زور زور سے کڑکتیں تو اس کا جی چاہتا کہ پاس سوئی ہوئی سُدھا ڈر کر اس سے لپٹ جائے اور وہ اسے پیار سے تسلیاں دے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ بجلی چاہے جتنی جولانیاں دکھاتی سُدھا کے ہونٹوں پر ایک دلآویز تبسم کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ بلکہ رات کو اگر کچھ کھٹکا ہوتا تو وہ وجے کو باہر جانے سے روک دیتی اور خود لائٹ جلا کر سارا گھر دیکھ آتی۔

وجے کے دل پر ایک بوجھ سا بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے اپنے گھر میں ایک گھٹن سی محسوس ہوتی۔ وہ اپنے دل کو لاکھ سمجھاتا، بیوی کے اوصاف کو ذہن میں لاکر اپنے دل و دماغ کے منفی رویّے کو اس کے تئیں مثبت کرنے کی کوشش کرتا۔ محبت کے نازک لمحات یاد کرتا، شادی کے ابتدائی پیار بھرے دنوں کو آواز دیتا۔ لیکن اس کی ہر کوشش بے سود ثابت ہوتی۔ ایک پژمردگی سی اس پر چھاتی جا رہی تھی۔ اس تبدیلی کو سُدھا نے محسوس بھی کیا لیکن کچھ سمجھ نہیں سکی کہ اس کا سبب کیا ہے؟ انھیں دنوں ایک چھوٹی سی بات ایسی ہو گئی جس نے وجے کے احساسات پر گویا مہر ثبت کر دی۔ جاڑوں کی رُت تھی۔ بچے اسکول کے ساتھیوں کے ساتھ پکنک منانے گئے تھے۔ وجے اور سُدھا گھر کے پیچھے چھوٹے سے لان میں بیٹھے دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک جھاڑیوں کے پیچھے سے سرسراتا ہوا قسمت کا مارا ایک کوبرا نکل آیا۔ وہ دونوں ہی سراسیمہ ہو گئے۔ سانپ انھیں نظر انداز کر کے کچن کی طرف بڑھنے لگا۔ وجے ابھی کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ اتنی دیر میں سُدھا نے بڑی پھرتی سے کرسی پر چڑھ کر پردے کی راڈ کھینچی اور بڑی سرعت سے سانپ پر پے در پے دو تین وار کر کے اسے ادھ مرا کر دیا۔ مزید کچھ چوٹیں کھا کر سانپ ٹھنڈا ہو گیا۔ سُدھا نے فاتحانہ انداز سے وجے کی طرف دیکھا۔ وجے کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ سُدھا کو حیرت ہوئی "کیوں وجے! کیا بات ہے؟" اس نے راڈ کو گملے کے نیچے ڈالتے ہوئے پوچھا "سوچتا ہوں کہ شیو جی کے ماتھے کا پھول ہمارے یہاں سے بچ کر ہی چلا جاتا تو بہتر تھا۔" وجے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ سُدھا ہنس پڑی۔

"تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو اور کہیں یہ اندر جا کر بیٹھ جاتا اور رات میں نکل کر کسی کو ڈس لیتا تو کیا ہوتا؟" وجے اُٹھ کر اندر چلا گیا۔

دوسری صبح جب وہ دفتر جانے کے لیے باہر نکلا تو اس کی طبیعت حد درجہ مکدر تھی۔ نیند پوری نہ ہونے کے باعث سر بھی بھاری تھا۔ باہر موسم سرور انگیز تھا۔ دھوپ کا سنہری لمس سکون بخش تھا۔ سامنے شیشم کا شاندار درخت تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے چکنے پتے ہوا کے ہلکوروں میں اتنی تیزی سے ہل رہے تھے جیسے بے شمار بچے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے تالیاں بجا رہے ہوں۔ وجے کو ایسا محسوس ہوا گویا شیشم کا پیڑ اس پر ہنس رہا ہو۔ وہ غیر ارادی طور پر تیزی سے قدم بڑھاتا وہاں سے گزر گیا۔

دفتر میں بھی فائلوں پر دستخط کرتے کرتے اس کا دھیان اسی چھوٹی سی بات پر لگا رہا۔ وہ اپنے آپ کو سُدھا کے سامنے بے حد سکڑا اور سمٹا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ کیسی مرد مار عورت ہے۔ اسے تو مرد ہونا چاہیے تھا۔ شاید قدرت نے جسم و فطرت کی آمیزش کے وقت غلطی کر دی۔ لیکن وہ اپنا دردِ دل کس سے بیان کرے۔ اس کی اُلجھن کے نازک پہلوؤں کو کون سمجھ سکے گا، جو سنے گا وہ مذاق ہی اُڑائے گا — "سر!" خیالوں میں غلطاں و پیچاں وجے ایک مترنم آواز سن کر چونک پڑا۔ اس کی پرسنل اسسٹنٹ نندنی سامنے کھڑی تھی۔ بیضوی چہرہ، مسکراتے لب اور شرمگیں آنکھیں۔ وجے نے آج تک اُسے اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ بس ڈکٹیشن دیتے وقت — کبھی کبھی سرسری سی نگاہ ڈال لیتا تھا، لیکن آج وہ اُسے بالکل نئی اور انتہائی پُرکشش نظر آ رہی تھی۔ ڈکٹیشن دیتے ہوئے اس نے غور کیا کہ نندنی کی ادائیں کتنی شرمیلی اور نسوانیت سے بھرپور تھیں۔ خلافِ معمول آج وجے نے اس سے چند اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کیں۔ دفتر سے نکلتے وقت اس کا موڈ خوشگوار ہو چکا تھا۔

وجے کے مزاج میں بڑھتی ہوئی سرد مہری نے سُدھا کو بے چین کر دیا۔ وہ دن بدن اس سے بے پروا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ حیران تھی۔ جب بھی کچھ جاننے کی کوشش کی، وجے نے ٹال دیا۔

ایک دن آفس میں کام زیادہ ہونے کے سبب وجے کو دیر تک رُکنا پڑا اور اسٹاف کے چند لوگوں کے ساتھ نندنی کو بھی۔ جب وہ باہر نکلا تو اندھیرا اُتر آیا تھا۔ وجے کا گھر دفتر سے نزدیک ہی تھا وہ اسکوٹر لے کر باہر نکلا تو بس اسٹاپ کے پاس نندنی کشمکش و پیچ کے عالم میں کھڑی نظر آئی۔ وہ اس کے قریب جا کر رُکا تو وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی "سر! میرا گھر یہاں سے صرف ایک بس اسٹاپ آگے ہے، اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے اور۔۔۔"

"بس آنے میں شاید دیر ہے۔" وجے نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

"سر! اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو کچھ دور تک مجھے پہنچا دیں! ادھر سنسان راستہ ہے تنہا پیدل جاتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

وجے کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی ——

"ڈر لگتا ہے" نندنی نے کتنی معصومیت سے یہ جملہ ادا کیا تھا۔ وجے کو ایسا محسوس ہوا جیسے کائنات بہت وسیع ہو گئی ہو، جہاں وہ کھل کر سانس لے سکتا ہے۔ اس نے نندنی کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اسکوٹر اسٹارٹ کر دیا۔

زندگی اسی روش پر چل رہی تھی لیکن سدھا کے چہرے پر بشاشت کی جگہ اُداسی نے لے لی تھی۔ آنکھوں میں فکر اور تشویش کی پرچھائیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ وجے اور اس کے درمیان ایک نامعلوم سی خلیج حائل ہوتی جا رہی تھی —— کون چھین رہا ہے وجے کو اس سے؟ دل کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ خلیج ناقابلِ عبور ہو جاتے، سدھا اسے پاٹنے کی کوشش میں لگ گئی۔ کئی بار اس نے وجے کو نندنی کے ساتھ دیکھا، وہ اس کا انداز دیکھ کر حیران رہ گئی۔ گھر میں وہ ہاں میں ہاں ملانے والا تابعدار شوہر تھا اور یہاں تحفظ کرنے والا مرد، جسے یہ اعتماد تھا کہ کوئی اس کی پناہ میں ہے، وہ کسی کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اُسے یقین اب بھی نہ آیا۔ کیا وجے اس کے ساتھ واشواس گھات کر رہا ہے۔ یا اس لڑکی کو دھوکا دے رہا ہے؟ سدھا کے دل میں کئی خنجر ایک ساتھ اُتر گئے لیکن بات کی تہہ تک پہنچنے میں وہ ناکام ہی رہی۔ اس نے وہی سمجھا جو ان حالات میں کسی بھی مرد کے متعلق سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی بے وفا، ہرجائی، تنوع پسند وغیرہ، وغیرہ۔ لیکن رو رو کر فریاد کرنا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ خاموش رہی، یہ خاموشی ایک سلگتی ہوئی آگ تھی جو رفتہ رفتہ اُسے پگھلانے لگی۔ وہ اندر ہی اندر مضمحل ہونے لگی۔ بچوں کا کام کسی طرح نپٹا کر چُپ چاپ خلاؤں میں تکتی رہتی۔ ہنسنا، مسکرانا، بناؤ سنگار اور آرائش بھولی بسری کہانیاں بن گئیں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے اندر یقین و قوت کا سرچشمہ سوکھتا جا رہا ہو۔

اس کشمکش و پیچ اور گھٹن سے وہ کچھ دنوں کے لیے نجات چاہتی تھی۔ اسے بہانہ تلاش نہیں کرنا پڑا۔ رشی کیش میں اس کی سہیلی سمن رہتی تھی جو نہ جانے کتنی بار اپنے یہاں چھٹیاں گزارنے کی دعوت دے چکی تھی۔ اس بار گرمیوں کی تعطیل میں سدھا بغیر بلائے ہی وہاں چل دی۔ بچے خوش تھے۔ وجے بھی خوش تھا۔ انھیں پہنچا کر واپس لوٹتے وقت وہ بار بار اسے اپنا اور بچوں کا خیال رکھنے کی تاکید کر رہا تھا لیکن سدھا کو حقیقت معلوم تھی۔

سمن کے گھر کا ماحول مختلف تھا۔ وہ اچھے عہدے پر فائز تھی۔ عمر بھر کنواری رہنے کا فیصلہ کر چکی تھی، اور زندگی بڑی خوشدلی سے ہنستے ہنساتے گزار رہی تھی۔ اس کے قہقہوں نے سدھا کو یہ موقع ہی نہ دیا کہ وہ اس سے اپنا دردِ دل بیان کرے۔ سب سے ملنے جلنے اور گھومنے پھرنے میں نصف سے زیادہ چھٹیاں بیت گئیں۔ آخر میں سمن کا چچازاد بھائی سنیل جو فوج میں کیپٹن تھا اچانک آن پہنچا۔ بے حد ہنس مکھ اور زندہ دل۔ اس کے آنے سے ایک نئی رونق آ گئی۔ آئے دن پکنک، بوٹنگ اور دور دراز علاقوں میں جا کر گھومنے کے پروگرام بنتے۔ سنیل —— کوہ پیمائی کا دلدادہ تھا۔ سب کو ساتھ لے کر ایک دن اوّلی کے پہاڑوں کی سیر کرانے چل دیا۔ سدھا کو گھومنے پھرنے سے وحشت ہوتی تھی لیکن سب کی خوشیوں کی خاطر سر جھکانا ہی پڑتا تھا۔ وہ تو اپنے من کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی لیکن ہنسی خوشی سے بھرپور فضا میں اُسے یہ دکھڑا رونا عجیب سا لگتا تھا۔

اوّلی تک کا سفر مشکل تھا لیکن دلچسپ۔ جیپ سے اُتر کر سب نے ہاتھوں میں سامان اُٹھا لیا۔ موسم خوشگوار تھا۔ نیلے آسمان کے پس منظر میں بارمل کی اونچی دلکش چوٹی مسحور کن نظارہ پیش کر رہی تھی۔ حدِ نظر تک خوشنما سبزہ زار اور گنگناتے ہوئے آبشار تھے۔ بے شمار رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو سے ہوا معطر تھی۔ سدھا کی ساری الجھن اور ذہنی تناؤ جیسے ہوا کے جھونکے اُڑا کر لے گئے۔ کتنا طویل راستہ طے ہو گیا اور وہ بے خبر رہی۔ گھومتے گھومتے تھک کر سب نے ایک جگہ اڈہ جما لیا۔ کھانوں کے ٹن اور پیکٹ کھولے جانے لگے۔ اس نے بھی کاغذ کی ایک پلیٹ میں کچھ ڈال لیا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر سنتری کی طرح پہرہ دیتی ہوئی نیل کنٹھ کی برف پوش چوٹی چمک رہی تھی۔ اس کی دلفریب اونچائیوں پر سمٹتے اور پھیلتے بادلوں کو دیکھ کر اسے ایک لطیف احساس ہو رہا تھا جیسے وہ بھی ان بادلوں کی طرح اوپر اٹھتی جا رہی ہو۔ کہیں دُور گگن کے اس پار ایک ایسی دُنیا میں جہاں خوشی ہے نہ غم۔ شکست کا احساس ہے نہ فتح کی مسرت۔ بادل کی مانند سبک اور ہلکا ہو کر آکاش و دھرتی کے درمیان تیرتے رہنا کتنا آسان اور دلکش ہے، پھر

...ستہ آہستہ تحلیل ہو جانا جیسے وجود کے ...ہ ساتھ ناآسودہ خواہشیں اور حزن و ملال ...ں معدوم ہوتے جا رہے ہوں۔ لیکن جہاں میں ...ی شے کو قرار نہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں موسم ...خوفناک روپ دھارن کر لیا۔ پروں سے نازک ...سفید بادل نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ ہمالیہ ...ان دیکھے پربتوں سے فیلِ بے زنجیر کی طرح ...وڑتے سیاہ بادلوں کے غول در غول آ کے ...ر آسماں پر محیط ہو گئے۔ ہر چیز کا رنگ ...ل گیا۔ ڈھلوان پہاڑیوں پر خوراک کی تلاش ...ں گھومتے ہوئے سیاہ ریچھ کسی عفریت کی ...ند لگنے لگے۔ سب لوگ گھبرا کر وہاں سے چل ...ئے۔ سدھا پریشان تھی کہیں یہاں بارش ...ں پھنس گئے تو۔ لیکن کچھ ہی دور جا کر مطلع ...اف ہو گیا۔ سورج نے پھر سے دھوپ کی ...رم سنہری چادر بچھا دی۔ سینکڑوں الپائن ...رندوں کے چہچہانے سے فضا گونج اٹھی جیسے ...طرت نے اپنا ساز چھیڑ دیا ہو۔ "یہ مہاجر چڑیاں ...ب جب سردیوں کا آغاز ہوتا ہے اور ہر چیز ...برف جمنے لگتی ہے یہ گرم علاقوں کو ہجرت ...ر جاتی ہیں لیکن موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی ...اپنے گھروں کو واپس لوٹ آتی ہیں۔" سنیل گلے ...ں کیمرہ لٹکائے دور بین پر نظریں جمائے بچوں ...و بتا رہا تھا۔ بچے دور بین لینے کی ضد ...ر رہے تھے۔

سدھا حقیقت کی دنیا میں لوٹ ...آئی۔ وہ تو مہاجر چڑیا نہیں بہت جلد اسے ...اپنے آشیانے کی طرف لوٹنا تھا۔ موسم سرما کی آمد سے پہلے، اس نے بڑی اکتاہٹ سے سوچا۔

واپسی میں اُسے اچانک نیل کنٹھ پر جمی برف کا خیال آ گیا۔ بے اختیار اس نے پوچھا "سنیل! یہ گرمیوں میں بھی نیل کنٹھ کی چوٹی برف سے کیسے ڈھکی ہوئی تھی؟" وہ ہنس پڑا۔

"سدھا جی! وہاں کی برف تو کب کی پگھل گئی یہ صرف آپ کی نظروں کا دھوکا تھا" سمن اور بچے ہنسنے لگے۔ وہ جھل سی ہو گئی۔

سنیل کی رخصت ختم ہو چکی تھی۔ اگلی صبح وہ واپس جا رہا تھا۔ سبھی اس کے جانے سے افسردہ تھے۔ "کتنا فرق ہے سنیل اور وجے میں"۔ اسے الوداع کہتے ہوئے ایک بہکتا ہوا خیال سدھا کے دل میں آیا جس پر وہ اگلے پل خود ہی شرمندہ ہو گئی۔ اس کے چلے جانے سے ماحول بے کیف ہو گیا۔ سمن کے اصرار کے باوجود سدھا مزید وہاں نہ رک سکی۔ اُسے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ کیا حرج تھا اگر سمن اسے کوئی ایسا موقع فراہم کر دیتی جب کچھ دیر کے لیے ہی سہی اسے اس گھٹن سے چھٹکارا مل جاتا۔

دل پر ویسا ہی بوجھ لیے ہوئے وہ واپس آ گئی۔ ساری چیزیں بدستور تھیں۔ وہی ایک نامعلوم سا سناٹا اور ویرانی۔ وہی وجے تھا۔ اپنی دنیا میں مگن۔ اس سے بے نیاز' کٹا کٹا سا۔ کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ آخر اس مختصر سے وقفے میں ہو بھی کیا سکتا تھا۔ وہ خود بھی تو جوں کی توں تھی۔ اَولی کے پہاڑوں کی ٹھنڈک بھی اس کے دل میں جلتی ہوئی آگ کو نہ بجھا سکی تھی، جس کی تپش نے اس کا قرار چھین لیا تھا۔ کیا بگاڑا تھا اس نے وجے کا؟ کیا کمی تھی اس میں؟ کیا اُسے کھل کر وجے سے بات کرنی چاہیے۔ لیکن یہ اس کی توہین ہوگی۔ وہ اپنی انا تو نہیں کچل سکتی ۔۔۔ تھی ایکسا بے وفا عام سے مرد کے لیے۔ کیا حرج ہے اگر زندگی اسی طرح گزرتی رہے۔ ندی کے دو کناروں کی طرح جو آمنے سامنے ہو کر بھی کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ اس کے دل و دماغ میں ایک تلاطم سا آیا ہوا تھا۔ اس اندرونی کشمکش نے اسے مضمحل اور بیمار سا کر دیا۔ وجے کو اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ ان باتوں پر غور کرتا۔ ویسے سدھا کی طرف سے اُسے یہ شبہ تک نہ تھا کہ وہ کبھی اتنی بے بس بھی ہو سکتی ہے۔ جب وہ بیچ بیچ صاحبِ فراموش ہو گئی تب بھی وہ اس حقیقت سے لاعلم ہی رہا کہ کسی کا نام خون نچوڑنے والی سرنج کی مانند سدھا کے جسم میں پیوست ہے۔ دھیرے دھیرے خون نچڑتا جا رہا ہے اور بتدریج وہ زرد پڑتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر بھی کیا خاک سمجھتے ___ غمِ دل کا علاج کسی کے پاس ہوتا تو کرتا۔ بچوں کی رونی صورتیں دیکھ کر وجے کو بھی تشویش ہونے لگی۔

آج وہ مدتوں بعد صحیح وقت پر آفس سے لوٹا تھا۔ بچوں کے کھانا کھا کر سو جانے کے بعد وہ سدھا سے باتیں کرنے لگا۔ ترحم آمیز باتیں ___ اس کی دانست میں اس کی طبیعت موسم کی تبدیلی سے خراب تھی اور شاید وہ جلد ہی اچھی ہو جائے گی۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ شش و پنج میں پڑ گیا کہ سدھا کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرزاں تھیں، چہرے پر تردد کی لکیریں کافی گہری ہو گئی تھیں۔

وہ باتیں کرتا کرتا وہیں پر سو گیا۔ سدھا کی پلکیں بھی نیند سے بوجھل تھیں۔ اُسے ایسا لگا جیسے اندھیرے میں ایک خوفناک سایہ ہاتھ پھیلائے اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اگر پہلے ایسا ہوتا تو وہ فوراً لائٹ جلا لیتی،

لیکن اس وقت تو مارے دہشت کے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ سایہ قریب آتا گیا۔ سدھا نے دیکھا وہ تو نندنی تھی۔ سرخ آنکھیں، وحشیانہ چہرہ، ہاتھوں میں نیل پالش پتے ہوئے لمبے لمبے ناخن اور بکھرے بال۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔ سدھا کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔ پاس سویا ہوا وجے چونک کر جاگ اٹھا۔ اس نے جلدی سے سوئچ آن کیا۔ سدھا بری طرح کانپ رہی تھی۔ وہ روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ "وجے ـــــ وہ مجھے مار ڈالے گی ـــــ مجھے بچاؤ اس سے۔۔۔"

"کون مار ڈالے گی، شاید تم نے کوئی برا خواب دیکھا ہے؟" وجے نے اسے تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔

"نندنی! نندنی! وہ مجھے مار ڈالے گی"۔ سدھا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وجے دم بخود رہ گیا۔ تو سدھا نے اسے یہاں بھی شکست دے دی۔ "نندنی کون ہے؟" اس نے انجان بن کر پوچھا۔ اب سدھا کے حواس بھی درست ہو چکے تھے۔ وہ گھبراتے ہوئے بولی "پتہ نہیں، مجھے بھی معلوم نہیں ـــــ شاید یہ کوئی خواب ہی تھا"۔

صبح سنگار میز کے پاس کنگھی کرتی ہوئی سدھا سے وجے نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "سدھا! تم تو زندگی میں کبھی نہیں ڈریں، پھر ایک بے ضرر سی لڑکی نے تمہیں اس قدر کیوں خوفزدہ کر دیا؟ وہ تو ایک اچھی دوست تھی، بس!"

سدھا زیر لب مسکراتی ہوئی بولی "تمی یعنی ـــــ؟"

"شاید تمہیں معلوم نہیں، تین مہینے، نندنی نے استعفیٰ دے دیا"۔

"کیوں؟"

"اس کی شادی ہو گئی اپنے انجینئر شو کے ساتھ وہ یو۔ ایس۔ اے چلی گئی"۔ وجے لہجے میں کسی طرح کی حسرت نہ تھی۔

شرمندہ سی سدھا سوچ رہی کہ سنیل نے سچ ہی کہا تھا، نیل سے برف تو کب کی پگھل چکی، وہ محض اس کی نگاہوں کا دھوکا تھا۔

نظمیں

یہ منظر رات کا ہے

رات کا وقت ہے،
سنّاٹے کا صحرا ہر سو
میرے ہمراہ کوئی یادِ درخشاں بھی نہیں
ذہن مفلوج، نگاہیں زخمی
چشمِ نمناک پریشان و ہراساں، بے بس
دل دھڑکنے کا ہنر بھول گیا ہو جیسے
نطق بے جان، لبوں پر ہے سکوت
چیخ کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ بن کر
میری بے جان سماعت پہ ہے حملہ آور
رات کا وقت ہے
سنّاٹے کا صحرا ہر سو
آگ کے شعلے لپکتے ہوئے تا حدِّ نظر
شہر میں کوئی نہیں ہے شاید
راستے بوٹ کی آواز سے لرزاں ہیں فقط
رات گہری ہے سحر کی کوئی امید نہیں
اب در و بام کے رشتے بھی ہوئے بے معنی
شہر بدروحوں کا مسکن بن کر
ابنی برباد اخوت کا تماشائی ہے

زین رامش

معرفت ڈاکٹر حسین الحق "ریذیڈنس" نیا کریم گنج، گیا (بہار)

استحکام

بھیانک رات کا پچھلا پہر
برسات کا موسم
پرایا شہر، ان دیکھے محلّے، اجنبی سڑکیں
گھنیرے بادلوں کی اوٹ میں آکاش سہما سا
اندھیروں کی ردا اوڑھے ہوئے خوابیدہ سنّاٹا
مرے اطراف میں جیسے سکوتِ مرگ طاری ہے
میں تنہا ہوں
سفر شب کا مرے ہمراہ جاری ہے
مجھے معلوم ہے یہ شہر آسیبوں کا مسکن ہے
مجھے معلوم ہے خونی درندے رات کو اکثر
یہاں پر رقص کرتے ہیں
مجھے معلوم ہے اس شہر کی راتیں
مرے جیسے ہزاروں اجنبی لوگوں کی شہ رگ کا
لہو پینے کو خوش بختی سمجھتی ہیں
مگر محسوس ہوتا ہے
کہ میرے حوصلوں میں جان ہے اب بھی
یہ لگتا ہے مجھے
میرے ارادوں میں
وہی دیرینہ استحکام زندہ ہے
اندھیروں میں بھی جیسے نور کا پیغام زندہ ہے
مری آنکھوں میں، دل میں، روح میں
اور میرے ہونٹوں پر
خدا کا نام زندہ ہے۔

عقیل نعمانی

شجاعت پور، میر گنج، بریلی (یو۔پی)

امن کی فاختہ

امن کی فاختہ
شاخِ زیتون پر
گنگناتی ہوئی

ایک بادل اُٹھا
سُرخ بارش ہوئی
موت ننگی ہوئی

باز، اک جنگ کا
بھوک کا
قحط کا
رنگ کا
نسل کا
حملہ آور ہوا

امن کی فاختہ
جسم و جاں کو لیے
ہجرتوں کے پہاڑوں کو ڈھونے لگی

شاخِ زیتون کی
یادِ رفتہ ہوئی

وسیم احمد قریشی

"آپ کا کتاب گھر" ۲۷۸/ای، تکونا پارک، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ی کیتکی کی کہانی

یک سرسری جائزہ

غلام حسین
مسلم مسافر خانہ، اسٹیشن روڈ، گورکھپور
(یو.پی)

انشاؔ کی ادبی شخصیت اُردو اور ہندی ادب ں یکساں مسلم و محترم ہے۔ ان کا شمار ہندی ب کے اولین اساطین پنڈت للو لال، سدل مشر رمنشی سدا سکھ لال کے ساتھ ہوتا ہے۔ علاوہ یا ان کی تخلیق "رانی کیتکی کی کہانی" کو ہندی رکے ارتقا کا اہم ترین نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ بع زاد کہانی فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ند سال بعد لیکن کالج سے باہر لکھی گئی ۔ متعدد بار اُردو اور ہندی میں اعت پذیر ہوئی۔ ایشیاٹک سوسائٹی لمتہ اور انجمن ترقی اُردو نے بھی اسے زیورِ طبع سے آراستہ کیا ہے ــــ آزادی کے عد متعدد محققین نے اس کے تنقیدی یڈیشن شائع کیے۔

داستانوں میں جو کہانی ہوتی تھی، تقریباً ی انداز کی کہانی انشاؔ نے بھی لکھی۔ فرق ہے ۔ یہ کہ داستانیں طویل ہوتی تھیں اور یہ مختصر ر داستانوں کے مقابلے میں مختصر ترین ــ ہانی کا آغاز اس وقت کی روایت کے مطابق مد و نعت اور منقبت سے ہوتا ہے مگر اختصار ے ساتھ۔ وہ صفحات کے صفحات سیاہ کرنے ے بجائے چند جملوں میں اپنی بات کو بڑی ابلدستی سے پیش کرتے ہیں۔ حمد و نعت اور نقبت کو جس مختصر اور پُر اثر انداز میں قلم بند کیا ہے یہ ان کے کمالِ فن کی مثال ہے۔ حمد کے چند جملے ملاحظہ فرمائیے:

"مٹی کے باسن کو اتنی سکت کہاں جو اپنے کمہار کے کرتب کچھ تاڑ سکے۔ سچ ہے، جو بنایا ہوا ہو، سو اپنے بنانے والے کو کیا سراہے اور کیا کہے! یوں جس کا جی چاہے بڑا بکے۔ سر سے لگا پاؤں تک جتنے رونگٹے ہیں، جو سب کے سب بول اٹھیں اور سراہا کریں اور اتنے برسوں اسی دھیان میں رہیں، جتنی ساری ندیوں میں ریت اور پھول پھلیاں کھیت میں ہیں، تو بھی کچھ نہ ہو سکے۔" (ص ۵۸)

حمد و نعت اور منقبت کے بعد جس سبب کے تحت کہانی معرضِ وجود میں آئی ہے اسے تحریر کرنے کے بعد اصل کہانی شروع کی گئی ہے۔

یہ مختصر داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی پُر خلوص محبت سے آراستہ ہے۔ کنور شکار کھیلتے ہوئے ہرن کے تعاقب میں راستہ بھول جاتا ہے۔ بھوکا پیاسا، تھکا ماندہ سرشام بغرض آرام ایک آم کے باغ میں جا پہنچتا ہے۔ جہاں کیتکی چالیس پچاس نوخیز لڑکیوں کے ساتھ جھولا جھولتی ہوئی ممتاز نظر آتی ہے، دیکھتے ہی کنور اور کیتکی ایک دوسرے پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور پہلی ملاقات میں انگوٹھی بدلنے کی رسم پوری کر لیتے ہیں جو محبت کے عہد و پیمان کی علامت ہے۔ رازِ عشق فاش ہونے پر کنور کے ماں باپ شبھ گھڑی شبھ مہورت پر شادی کا پیغام کیتکی کے ماں باپ کے پاس بھجواتے ہیں مگر کیتکی کے باپ جگت پرکاش اپنی جاہ و حشمت کے غرور میں پیغام مسترد ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ پیغام لے جانے والے کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک بھی کرتے ہیں جس کی بنا پر دونوں راجاؤں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے۔ طلسماتی کرتب سے جگت پرکاش کو نہ صرف فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے بلکہ سورج بھان کا خاندان ہرن اور ہرنی کے قالب میں منتقل ہو جاتا ہے۔ کیتکی اپنے محبوب کی جدائی میں بے قرار ہو کر گرو مہندر گر کا دیا ہوا بھبھوت اپنی آنکھوں میں لگا کر کنور کی تلاش میں صحرا صحرا دریا دریا رات دن ایک کرتی ہے۔ اس محنت شاقہ میں اس کی سہیلی مدن بان معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ آخر میں کنور اور کیتکی کی شادی دھوم دھام سے ہو جاتی ہے اور دونوں خوش و خرم زندگی گزارنے لگتے ہیں۔

اس داستان میں رانی کیتکی کا کردار ہر اعتبار سے پروقار ہے۔ وہ خوبصورت اور خوب سیرت ہونے کے ساتھ ساتھ شرم و حیا کی پیکر ہے۔ اس کا دل جذبۂ ترحم سے لبریز ہے۔

اور نگاہ مردم شناس۔ وہ ایک ہی نظر میں اودے بھان کی مجبوری والم کے کیف وکم سے واقف ہوجاتی ہے اور ہندستان میں مہمان نوازی کی جو روایت ہے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کنور کے قیام وطعام کے انتظام کا حکم صادر کرتی ہے۔ وہ کنور کی محبت میں گرفتار تو ہوجاتی ہے مگر سماجی روایت کو نبھانے کی حتی الامکان کوشش کرتی ہے۔ دورانِ جنگ کنور، کیتکی کو اپنے ساتھ مفرور ہوجانے پر بہ اصرار آمادہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر ناموس خاندان کا پاس اس کے قدم روک دیتا ہے اور وہ کنور کے خط کا جواب اس طرح تحریر کرتی ہے:

"اے میرے جی کے گاہک جو تو مجھے بوٹی بوٹی کر چیل کوؤں کو دے ڈالے، تو بھی میری آنکھوں چین اور کلیجے سکھ ہووے پر یہ بات بھاگ چلنے کی اچھی نہیں، اس میں ایک باپ دادے کو چٹ لگ جاتی ہے۔ اور جب تک ماں باپ جیسا کچھ ہوتا چلا آیا ہے اسی ڈول سے بیٹے بیٹی کو کسی پر پٹک نہ ماریں اور سر سے کسی کو چپیک ـــــ نہ دیں، تب تک ایک جی تو کیا، جو کروڑ جی جاتے رہیں پر بھاگنے کی کوئی بات ہمیں تو چہتی نہیں۔" (ص ۴، ۵)

کیتکی کی محبت میں حقیقت و عقیدت کی گہرائی اور گیرائی ہے اور ساتھ ہی ساتھ شریکِ حیات و رفیقِ حیات کے رشتے کی ایسی شمع روشن ہے جو زندگی کے تاریک سے تاریک تر گوشے کو منور کرتی ہے۔ اس کی محبت وقتی اور سطحی نہیں ہے۔ وہ اپنے محبوب کی جدائی میں ساون بھادوں کے روپ روتی ہے اور جب صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا ہے تو اپنے سکھ چین کو بالائے طاق رکھ کر کسی کی پروا کیے بغیر اپنے معتوب محبوب کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے۔ اس ہفت خواں کو طے کرنے میں وہ کامیاب ہوتی ہے۔ کیتکی کا ظاہر اور باطن دونوں جاذبیت کے حامل ہیں۔ اگر اس کے قالب میں ایک ہندستانی عورت کی عصمت وعفت کا دل دھڑکتا ہے تو وہ حسن و جمال میں بھی بے مثال ہے۔ انشاؔ اس کی خوبصورتی اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"رانی کیتکی کا بھلا لگنا، لکھنے پڑھنے سے باہر ہے۔ وہ دونوں بھوؤں کی کھچاوٹ اور پتلیوں میں راج کی سماوٹ اور نکیلی پلکوں کی رنداہٹ اور ہنسی کی لگاوٹ دنتڑیوں میں مستی کی اداہٹ اور اتنی سی بات پر رکاوٹ سے ناک اور تیوری چڑھالینا اور سہیلیوں کو گالیاں دینا اور چل نکلنا اور ہرنیوں کے روپ سے کرچھالیں مار پرے اچھلنا کچھ کہنے میں نہیں آتا۔" (ص ۱۱)

کنور اودے بھان راجاؤں کے عہد کا ایک ایسا کردار ہے جو بے عملی کا آئینہ دار ہے۔ اس کے شباب میں جوت کی ایک سوت ہے مگر اسے شکار اور پیار کے سوا دُنیا کی کسی اور چیز سے سروکار نہیں۔ اگر عورتوں کے احترام اور والدین سے شرم وحیا کو اس کے کردار سے نکال دیا جائے تو اس میں کچھ نہیں رہ جاتا۔ باغ میں جب لڑکیاں اس سے بے مروتی سے پیش آتی ہیں تو وہ عاجزی اور انکسار کا مظاہرہ کرتا ہے کیتکی کے عشق میں گھٹ گھٹ کر مرتا ہے مگر والدین کو اس کی قطعی خبر نہیں ہونے دیتا۔ والدین کی بہت فہمائش پر بالمشافہ نہیں بلکہ صفحۂ قرطاس پر دل کا حال عاجزی کے جس پیرائے میں اس نے قلم بند کیا ہے اس کا ایک ایک لفظ شرم وحیا میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ اپنی تحریر اس طرح شروع کرتا ہے:

"اب جو میرا جی تھنوں میں آگیا اور کسی ڈھب سے نہ رہا گیا' اور آپ نے مجھے سو سو روپ سے کھولا' اور بہت سا ٹٹولا تب تو لاج چھوڑ کے ہاتھ جوڑ کے 'منہ کو پھوڑ کے گھگھیا کے یہ لکھتا ہوں۔" (ص ۷۱)

قصّے کہانیوں میں سہیلیوں کا اہم کردار ہوا کرتا ہے۔ اس داستان میں مدن بان کا وہی کردار ہے جو مثنوی سحر البیان میں نجم النساء کا ہے۔ مدن بان کیتکی کی ہمدم و مونس، ہمدرد ہمراز ہی نہیں بلکہ اس کی مشیرِ خاص بھی ہے۔ کیتکی کے پائے استقامت میں اگر کہیں لغزش پیدا ہوتی ہے تو وہ اسے سنبھالنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں کیتکی جب اودے بھان کو دل دے بیٹھتی ہے تو مدن بان قاصدہ کا کام انجام دیتی ہے مگر جب لگاوٹ میں تجاوز دیکھتی ہے تو وہ اسے اس طرح ٹوکتی بھی ہے:

"اتنا بڑھ چلنا اچھا نہیں ـــــ اب اٹھ چلو اور ان کو سونے دو اور روئیں تو پڑا رونے دو۔" (ص ۶۸)

جب کیتکی اپنی آنکھوں میں بھبھوت لگا کر تلاشِ محبوب میں نکل پڑنا چاہتی ہے تو وہ فقط فہمائش پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ والدین سے شکایت کرنے کی دھمکی بھی دیتی ہے۔ مدن بان میں ایثار و قربانی کا جذبہ موجود ہے وہ کیتکی کی خوشی اور غم کو اپنی خوشی اور غم تصور کرتی ہے۔

انشاؔ نے جہاں کردار نگاری میں اپنے جوہر دکھائے ہیں وہیں منظر نگاری میں بھی اپنے قلم کا جادو جگایا ہے۔ انشاؔ کی منظر نگاری کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ جو منظر انھوں نے

قلم بند کیے ہیں وہ قاری کے سامنے اسی طرح اُبھرتے ہوتے ہیں جیسے پردۂ سیمیں پر تصویریں دونوں راج کی ندیوں کے گھاٹ کا منظر ملاحظہ ہو:

"کوئی کیا کہہ سکے، جتنے گھاٹ دونوں راج کی ندیوں میں تھے، پکی چاندی کے تھکے سے ہوکر لوگوں کو ہکا بکا کر رہے تھے۔ نوڑیے، بھولیے، بجرے، لچکے، مور پنکھی، سونا مکھی، سیام سندر، رام سندر اور جتنے ڈھب کی ناویں تھیں، سنہرے روپے سے سجی سجائی، کسی کسائی اور سو سو لچکے کھاتیاں، آتیاں، جاتیاں، لہراتیاں پڑی پھرتیاں تھیں۔ ان سب پر یہی گویے، کنچنیاں، رام جنیاں، ڈومنیاں، کھچا کھچ بھری ہوئی اپنے اپنے کرتب میں ناچتی، گاتی، بجاتی، کودتی پھاندتی دھومیں مچاتیاں، انگڑائیاں جمہائیاں، انگلیاں نچاتیاں اور اُدھلی پھرتیاں تھیں۔" (ص ۱۰۶، ۱۰۷)

اس کہانی میں ہندستانی تہذیب و تمدن رسم و رواج، مذہب و مشرب کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔ اور جن عناصر سے اس داستان کے رنگ روپ کو سنوارا گیا ہے وہ ہندستانی اساطیر سے ماخوذ ہیں۔ کہانی کی پوری فضا ہندستانی ہے۔

بنیادی طور پر انشاؔ شاعر تھے اور ان کی طبیعت کا ایک خاصہ یہ تھا کہ وہ سب سے الگ راہ نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ مصحفی سے ان کا جو معرکہ ہوا وہ بھی ان کی علیحدگی پسندی اور احساس برتری کا ثبوت ہے۔ انشاؔ کے سامنے اُردو نثر کے جتنے نمونے تھے وہ ان سے الگ نثر کا کوئی نمونہ پیش کرنا چاہتے تھے۔ رانی کیتکی کی کہانی کی تحریر کا محرک یہی جذبہ تھا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

"کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندی کی چھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے، تب جا کر میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ نہ ہو۔"

(ص ۵۹، ۶۰)

جس دور میں رانی کیتکی کی کہانی لکھی گئی اس دور میں معرب اور مفرس اُردو لکھنے کا چلن تھا مگر انشاؔ نے اپنی جدّت طبع اور فکر رسا سے ایک نئی جہت نکالی۔ ان کا یہ دعویٰ درست ہے کہ انھوں نے کسی غیر ملکی زبان کا کوئی استعمال نہیں کیا مگر جہاں تک گنواری زبان کا معاملہ ہے تو دو سو برس قبل بھلے ہی رانی کیتکی کی زبان گنواری نہ متصور کی جاتی رہی ہو مگر آج زیادہ تر الفاظ گنواری زبان سے قریب تر نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے الفاظ غیر مستعمل اور غیر مروّج ہیں۔ اسے نثر کا ایک مصنوعی نمونہ کہنا چاہیے — پھر بھی زبان میں لطافت اور سلاست موجود ہے۔ انشاؔ اس اسلوب کے موجد اور خاتم دونوں ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کہانی کا بے نظیر اسلوب ہندی اور اُردو کو قریب تر کرنے کی ایک مستحسن کوشش تھی۔

رانی کیتکی کی پر لطف اور دلچسپ رومانی کہانی جمالیاتی حس سے بھرپور ہے۔ اس میں وہ سارے عناصر موجود ہیں جن سے داستان نگاری کا فن عبارت ہے: مافوق الفطرت عناصر کی تحیر آفرینی، حسن و عشق کی رنگینی، لطافتِ زبان اور فصاحتِ بیان۔ رانی کیتکی کی کہانی انشاؔ کا ایسا کارنامہ ہے جسے اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کا مشترک ورثہ کہا جاسکتا ہے۔

نوٹ: حوالے "رانی کیتکی کی کہانی" مرتبہ ڈاکٹر سیّد سلیمان حسین سے ماخوذ ہیں۔
اشاعت اوّل، جولائی ۱۹۷۵ء، طابع نظامی پریس لکھنؤ۔

حضرتِ یکتا

ماسٹر اختر

۷ - کربلا، بھوپال ۴۶۲۰۰۱

الماس یکتا کا جب بھی ذکر آتا ہے تو ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ انھیں ادب کی کس صنف سے وابستہ کریں۔ انھوں نے تو اپنی دانست میں ادب کے ہر میدان میں جھنڈے گاڑ رکھے ہیں لیکن ہم جب بھی اُن کی حیثیت کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایک ایسے تاجر کی تصویر اُبھر آتی ہے جس کی دُکان بالکل خالی ہو لیکن وہ اُسی دُکان سے دُنیا کی ہر چیز مہیّا کرنے کا دعویدار ہو۔

ایک وقت تھا جب اُن سے ہماری گاڑھی چھنتی تھی۔ ہم اُن کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے لیکن جیسے جیسے ہم اُن کے نزدیک ہوتے گئے ہمارا ذہن و دل اُن سے اتنا ہی دُور ہوتا گیا۔ اُن کی ادبی، کارستانیاں دیکھ دیکھ کر اُن کے تئیں ہماری نفرت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور ہم اُن کی تمام کارگزاریوں کو منظرِ عام پر لانے کے جتن سوچنے لگے۔ لیکن یکتا کی کھل کر مخالفت کرنا صرف ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ ہم جیسے ہر شریف آدمی کے لیے ذرا مشکل کام تھا۔ یکتا اپنے مخالفین کے خلاف کوئی بھی زیبا و نازیبا حربہ استعمال کرنے سے نہیں چُوکتے تھے۔ آپ آج اُن کی مخالفت کیجیے کل ہی آپ کے گھر کی دیوار پر کوئی بیہودہ نعرہ لکھا نظر آئے گا یا کوئی گندہ پوسٹر چسپاں ہوگا یا پھر آپ کہیں بھی اپنی بے عزّتی کرانے کے لیے تیّار رہیے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ عین الحق جیسے حق پرست کو بھی یکتا کے معاملے میں خاموش رہنے میں عافیت نظر آتی تھی۔ حالانکہ عین الحق کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ مقامی اخبارات و رسائل کو عین الحق کے مضامین اور تبصرے ڈاک سے ملتے تھے۔ وہ بہت آسانی سے یکتا کے ادبی سرقوں، لُوٹ کھسوٹ اور ہٹ دھرمیوں کا پردہ فاش کرسکتا تھا۔ لیکن شاید اس خیال نے کہ وہ کب تک لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ سکے گا اُس کی زبان بند کر رکھی ہو، بہرحال یہ ہر ایک کو یقین تھا کہ عین الحق یکتا کے دھول دھپّے کے تیور سے مرعوب ہے۔

یکتا شاعر ہیں، محقّق ہیں، ناقد ہیں انشا پرداز ہیں۔ ڈراما نگار ہیں، دانشور ہیں اور نمعلوم کیا کیا ہیں۔ وہ بحرِ ادب کے ایسے غوّاص ہیں جہاں موتی نہ ملتے ہوں وہاں سے موتی ہی کیا معدنی اشیا بھی نکال لائیں۔

انھیں پنجے لڑانے کا بہت شوق ہے۔ لیکن عملی طور پر نہیں صرف محاورتاً۔ اپنی خیالی دنیا میں وہ نہ جانے کتنی عظیم المرتبت ادبی ہستیوں کے پنجے موڑ چکے ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ انھیں اگر واقعی پنجہ لڑانے کا شوق ہوتا تو میں ہی اُن کی انگلیاں توڑ کر ادب کو ان کی سازشوں سے نجات دلا دیتا۔ وہ ہیں تو پنجیوں کے ایسے تعزیے کہ اگر زور دار ہوا کی زد پر آجائیں تو لطیفے کے خواب کی تعبیر مل جائے لیکن دماغی طور پر وہ اتنے قوی ہیں کہ بس خدا ہی اُن کے شر سے بچائے۔

وہ تعریف کے بہت بھوکے ہیں اور شہرت تو گویا اُن کا مقصدِ حیات ہے۔ شہرت پانے کی راہ اگر غلاظت کی دلدل سے بھی نکلتی ہو تو وہ اُس میں سے بھی بلا جھجک ڈوب کر گزر جائیں گے۔ راہ چلتے آپ سے پوچھیں گے کہ اُن کے بارے میں یا اُن کے کسی کارنامے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ سمجھدار لوگ تو راہ میں اُن سے اکثر بچ کر نکل جاتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے جس سے بھی اپنے بارے میں رائے طلب کرلی گالیاں اُس کا مقدّر بن جاتی ہیں۔ خاموش رہنے والوں اور تعریف نہ کرنے والوں کا تو وہ فی الفور ہی حساب کر دیتے ہیں لیکن مُنہ پر تعریف کرنے والوں کا بھان وہ گھر جا کر ہی کرتے ہیں۔ زبانی تعریف وہ صرف اپنی بیوی کی برداشت کرتے ہیں اور زبانی تعریف کرنے والوں کا کھاتہ بھی وہ بیوی کے سامنے ہی کھولتے ہیں۔ لوگوں کو اُن کے نام سے نہیں بلکہ اُن کی ظاہری جسمانی خصوصیات کی مناسبت سے یاد کرتے ہیں۔ گھر پہنچتے ہی بیوی کو مخاطب کریں گے "آج وہ گھنترا ملا تھا۔ میری کل والی غزل اُسے بھوت پسند آئی۔ دیکھو تو سالے زبانی کہتے ایسے تم فخرِ بھوپال ہو۔

لکھ کر تیں کیں گے۔ دو لائنیں لکھ کر اخبار میں دے دیں گے تو سالوں کی اماں مر جائے گی۔"

اس پر بیوی ٹکڑا لگائیں گی "خدا غارت کرے ان جل ککڑوں کو۔"

پہلے میاں بیوی میں بہت نا چاقی رہتی تھی۔ جس طرح چھچھوندر دن میں اپنے بچّوں کی دم ایک دوسرے کے منہ میں پکڑا کر انتقال مکانی کرتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح یکتا صاحب اپنی بیوی کو ایک کے ہاتھ میں دوسرے کی انگلی پکڑا کر قطار کی شکل میں گھر کے باہر نظر آتے تو لوگ سمجھ جاتے کہ میاں بیوی میں جھگڑا ہوا ہے۔ ہم نے ایک روز بچّوں پر ترس کھا کر استانی بی کو وہ گر بتا دیے جس سے سارے جھگڑے ختم ہو گئے۔ استانی بی ماشاء اللہ ہیں بہت سمجھدار۔ اتنی سمجھدار کہ اب تو تعریف کی ہوا بھر بھر کر انھیں ٹھو کا ہی سُلا دیتی ہیں۔

اُن کا سیدھا ہاتھ فالج زدہ ہے اس میں قلم پکڑنے کی بھی سکت نہیں ہے۔ اس لیے وہ بائیں ہاتھ سے لکھتے ہیں۔ اتفاق سے میں بھی بائیں ہاتھ سے لکھتا ہوں۔ میرا یہ ہاتھ اتنا طاقتور ہے کہ میں اُن کے ہاتھ کو اُن کے منحنی جسم سے اُکھاڑ پھینکنے کی ہمّت رکھتا ہوں۔ شاید اسی لیے میرے ذہن میں یہ خیال روز بروز جگہ پاتا گیا کہ ادب کو یکتا کی کارگزاریوں سے نجات دلانے کا واحد حل اُن کی انگلیاں توڑنا ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُن کی انگلیاں توڑنے سے زیادہ مشکل مرحلہ اُن کو پنجہ کشی پر آمادہ کرنا تھا لیکن ایک روز یہ مشکل خود بخود آسان ہو گئی۔ ایک روز چند احباب کی موجودگی میں جب وہ کسی بلند مقام شاعر کا پنجہ موڑ رہے تھے۔ میں نے اُن کو حقیقی پنجہ کشی پر اُکسایا اور وہ فوقیت کا مارا پنجہ کشی کے لیے مجھی کو چیلنج کر بیٹھا۔ پہلے تو میں واقعی حیران رہ گیا۔ چند لمحوں بعد جب ذرا عقل آئی تو اُن کے چیلنج کو پیچھا کرنے کے لیے ٹال مٹول کے بہانے تراشے اور اس طرح اس چیلنج کو قبول کیا گویا میں بادلِ نخواستہ اس پر آمادہ ہوا ہوں۔ مقابلے کی تیاری کے لیے ایک ماہ کا وقت لیا تا کہ شہر میں اس کی شہرت ہو جائے۔

اُن سے بعید نہیں تھا کہ وہ اس معاملے کو خود ہی شہرت دیں۔ اخبار میں اپنا نام دیکھ کر وہ اتنے خوش ہوتے ہیں کہ گالیاں دینے والوں کو بھی دعائیں دیتے ہیں۔ اخبارات و رسائل میں دی گئی گالیوں کو وہ زبانی تعریف سے بہتر سمجھتے ہیں۔ جس دن اخبارات میں اُن کے نام کے ساتھ فوٹو بھی آ جائے تو صبح کا ناشتہ ہوٹل میں کرتے ہیں۔ خرید و فروخت، چہل قدمی اور احباب سے ملنے کا بھی وہی دن ہوتا ہے۔ زبردستی لوگوں کو مخاطب کریں گے "کیوں خاں نمائیاں کون سا اخبار آتا ہے؟"

"ندیم ——— کیوں؟"

"ارے خاں کیا معلوم کیوں۔ آج میری یاں کوئی اخبار نہیں یا یا۔ ذرا سونے کے بھاؤ دیکھنا تھے۔"

"اگر کسی نے کہہ دیا کہ یکتا صاحب آج تو اخبار میں آپ کا فوٹو بھی آیا ہے۔ تو بڑی زور دار ایکٹنگ کریں گے: "نہیں جی ——— ذرا میں بھی تو دیکھوں" پھر اخبار رکھ کر اپنی پیشانی پیٹ کر کہیں گے "یار اخبار والے بھی نجانے کس مٹّی کے بنے ہیں۔ ہزار بار کہہ دیا کہ مجھے اپنا فوٹو چھپوانا بالکل پسند نہیں اے۔ یہ فوٹو انگلینڈ کے ایک رسالے میں چھپا تھا۔ سالے لے اُڑے۔ اب اگر سردار جعفری نے دیکھ لیا تو کیا جواب دوں گا۔"

"سردار جعفری ——— ؟"

"ہاں بھئی ——— سردار جعفری نے میرے ایک شعر پر خوش ہو کر یہ ٹوپی عنایت کی تھی جو میں اس تصویر میں پہنے ہوا ہوں ——— وہ کیں گے کہ اتنے گھٹیا اخبار میں میری ٹوپی چھپوا دی۔"

"لیکن جناب ——— سردار جعفری تو ٹوپی پہنتے ہی نہیں ہیں؟"

"بس اسی دن سے چھوڑی ہے۔"

جب کئی کئی دن اخبار میں اپنا نام دیکھنے کو ترس جاتے ہیں تو بھڑوں کے چھتّے میں پتھر مارنے کے مترادف کوئی ادبی شوشہ چھوڑ کر کچھوے کی طرح اپنے خول میں سکڑ جاتے ہیں۔ جب کوئی شوشہ سُوجھے ہی نہیں یا اللہ اخبار والوں کو عقل دے دے تو سرکاری اسپتال کی راہ لیتے ہیں۔ خطرناک امراض کی علامات کی وہ زوردار ایکٹنگ کرتے ہیں کہ ڈاکٹر انھیں فوراً اسپتال میں داخل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بس پھر کیا ہے۔ روزانہ اُن کے لیے دعائیں، دواؤں اور امداد کی اپیلیں، صحت سے متعلق خبریں اور صحتیاب ہونے کی خبریں، عبادت کرنے والوں اور بہی خواہوں کا شکریہ بھی اخبارات کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے۔ گویا وہ اسپتال میں نہیں بلکہ اخبارات میں براجمان رہتے ہیں۔ اس درمیان وہ نمائش کے کسی بھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اسپتال اور اسپتال سے چھٹی کے بعد آستانۂ یکتا نمائش گاہ کا کام دیتا ہے۔ دُنیا بھر سے آئے ہوئے دیسی رسائل و کتب جاذبِ نظر اندراج کے ساتھ اور بغیر ڈاک کی مُہر کے عیادت نامے جا بجا بکھرے پڑے رہتے ہیں۔

ایک روز میں استمزاج کو اسپتال

بھیجا تو دیکھا کہ ٹن کے ایک خالی ڈبے کو پیک دان کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اُس ڈبے پر اُردو میں جلی حروف میں حلوہ سوہن کا لیبل چسپاں تھا۔ انھوں نے ٹن کو خاص طور سے اس طرح پکڑ رکھا تھا کہ لیبل ہماری جانب رہے ہم نے لیبل کی جانب اشارہ کرکے اُردو کی بے حرمتی کی جانب توجہ دلانی چاہی۔ لیکن ہمارے اشارے کو وہ وہی سمجھے جو سمجھنا چاہتے تھے گویا ہم اُن سے حلوہ سوہن کے بارے میں پوچھ رہے ہوں۔ وہ ٹن میں کھکھار کو خارج کرتے ہوئے بولے "یہ حلوہ وزیر آغا نے پاکستان سے بھیجا تھا۔"

ہم نے جل کر کہا "حضور میں حلوے کی نہیں لیبل کی بات کر رہا ہوں۔ اس کو استعمال کرنے سے پہلے یہ لیبل تو پھاڑ دیا ہوتا۔ اور اب تو حلوہ سوہن اور اُردو کے ساتھ ساتھ بیچارے وزیر آغا کی بھی خرابی ہو رہی ہے۔"

وہ سبکی تو برداشت ہی نہیں کر سکتے مشتعل ہو گئے اور چھاتی ٹھونک کر بولے "میں —— میں اُردو کا خادم —— میں پھاڑ دوں اُردو کا لیبل ؟ ذرا پاکستان میں جا کر دیکھو اُردو میں چھپے ہوئے طرح طرح کے ڈبے لوگ طہارت کے لوٹوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مجال ہے اُردو کو کسی نے مٹانے کی کوشش کی ہو —— آخ تھو —— اور ایک تم ہو کہ —— آخ تھو ——"

اُس دن سے ہمارے ذہن میں وزیر آغا اور حلوہ سوہن ایک دوسرے سے اس طرح چپکے ہیں کہ جدا ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ دامِ خیال میں جب بھی آتے ہیں تو دونوں ساتھ ہی آتے ہیں لیکن متلی کے ساتھ ساتھ۔

اُس روز ہمارے ذہن میں اُن کی اُنگلیاں توڑنے کا خیال بہت پختہ ہو گیا۔ ہم نے عہد کیا کہ اب ہم اُن کی اُنگلیوں سے قلم کا رشتہ توڑ کر ہی دم لیں گے۔ جب اُنگلیاں ہی نہیں ہوں گی تو رخسارِ ادب کو کھرچیں گے کس طرح۔

وہ کچھ کرتے دھرتے نہیں ہیں۔ اُن کی زندگی کا سارا بوجھ ادب کے کاندھوں پر ہے انجمن اُردو کے نام سے ایک بوگس ادارہ کھول رکھا ہے جس کے صدر سے لے کر چپراسی تک خود ہی ہیں۔ ادارے کے نام پر تمام دنیا سے اخبارات و رسائل و کتب مفت حاصل کرتے ہیں۔ سال میں ایک دو بار جگہ جگہ کا دورہ کرکے چندے بھی وصول کر لاتے ہیں۔ چندے جب گزارے کے لیے ناکافی ہوتے ہیں تو کتب، رسائل یا اخبارات کی ردّی فروخت کرکے کام چلا لیتے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنّف ہیں اور صاحبِ دیوان بھی ہیں۔ خدا بھلا کرے زیراکس کاپی کی مشین ایجاد کرنے والے کا۔ جب سے یہ طریقہ عمل میں آیا ہے۔ وہ ہر سال اپنی کسی نہ کسی کتاب کا نیا ایڈیشن نکال دیتے ہیں۔ برسہا برس سے جو کتابیں پڑی سڑ رہی تھیں دو چار اوراق کی تبدیلی اور نئی جلد بندی سے نئے ایڈیشن کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ عام طور پر اِن کتابوں میں اُن کا اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ دوسروں کی محنتوں کو توڑ مروڑ کر اپنا بنا لیتے ہیں۔ ادب کا اِن تصانیف سے کیا بھلا ہو گا اس سے انھیں کوئی غرض نہیں ہے۔ عام قاری تو نہیں جانتا کہ اِن تصانیف میں جو کچھ ہے وہ کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ جو لوگ جانتے ہیں اُنھیں مصلحت پسندی اور عافیت کوشی کچھ کرنے نہیں دیتی۔ کہیں سینگ دانت سے اور دانت سینگ سے خائف نظر آتا ہے تو کہیں من ترا حاجی بگویم کی مثال۔ اب اگر ایسی حالت میں کسی کی رگِ حمیت پھڑکتی بھی ہے تو وہ کھُل کر کسی کی جانب اُنگلی اُٹھا کر بات نہیں کرتا بلکہ ہوا میں تیر چلاتا ہے۔ ظاہر ہے اُس کا حشر بھی وہی ہوتا ہے جس کا تجربہ غالب کو ہوا :

کس کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

یکتا جب پیسوں سے تنگ ہو جاتے ہیں یا درمیان میں کوئی ضرورت آ پڑتی ہے تو رقم حاصل کرنے کے عجیب و غریب طریقے استعمال کرتے ہیں۔ عام طور پر ایسے ہی موقعوں پر کتابوں کے نئے ایڈیشن نکلتے ہیں۔ وہ اپنے کسی بھی غیر معروف چیلے کو پچاس کا نوٹ دے کر کتب فروش کی دُکان پر بھیجتے ہیں جو کتب فروش سے کہتا ہے کہ میں فلاں شہر سے آیا ہوں مجھے الماس یکتا کی فلاں کتاب کے پانچویں ایڈیشن کی دس کاپیاں درکار ہیں۔ یہ پچاس روپے پیشگی رکھیے اور شام تک کتابوں کا پارسل تیار رکھیے میں آتا ہوں لیکن وہ شام کبھی نہیں آتی۔ یکتا ہزار نخروں کے بعد نقد ادائیگی پر مطلوبہ کتابیں دینے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اُن کی نظر میں ادبی یا تہذیبی تقاضوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے اُن کی ادبیت اُنھی پیشہ ورانہ حکمت عملیوں کی موید ہے کہ خود کو زندہ رکھنا ہے تو پہلے اپنی قوتوں کو حصولِ شہرت و زر کے لیے استعمال کرو۔ قاری کے سامنے وقفہ وقفہ سے کچھ بھی ڈالتے رہو اور زبان کی گائے کو بغیر دانہ گھاس کے اُس وقت تک نچوڑتے رہو جب تک کہ اُس میں دودھ کی ایک بوند بھی پیدا کرنے کی سکت باقی ہو۔

اس لیے ہم نے اُن کی اُنگلیاں توڑنے کو جائز قرار دے دیا تھا۔ اب ہمیں انجام کی پروا بھی نہیں تھی اب ہم نے تہیہ کر لیا تھا کہ

ہم ادب کے دشمنوں کی جانب اُنگلی اُٹھا کر للکاریں گے۔ صرف للکاریں گے ہی نہیں انھیں اُن کے خول سے باہر کھینچ کر ہی دم لیں گے۔ بس ذرا ہم یکتا کی انگلیاں توڑ کر لوگوں کو اپنی جانب متوجہ تو کرلیں۔ انگلیاں توڑنا تو ایسے افراد کے خلاف بغاوت کی محض علامت ہی رہ جائے گی اصل مزا تو اُس کے بعد آئے گا۔

اس سنجیدہ معاملے میں ہماری بیوی کا پُرجوش تعاون بہت مفید و مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ انھوں نے ہمیں مقابلے کی تیاری کے لیے ہیلتھ کلب کی ممبری اختیار کرنے سے روک دیا تھا اور خود ہی ہماری کوچ بن گئی تھیں۔ اُن کی بتائی ہوئی ورزشیں جیسے آٹا گوندھنا۔ سڑک کے نلکے سے گھر کا پورا پانی بھرنا، کپڑے دھونا۔ گھر کا سودا سلف ایک ہاتھ میں ٹانگ کر بازار سے گھر تک پیدل لانا وغیرہ وغیرہ ہماری ہمت و قوت میں روز بروز اضافہ کر رہی تھیں۔ الغرض اب باطل کو اُس کے کیفر کردار تک پہنچانے کا وقت قریب آچکا تھا۔ وہ دشمنِ ادب اب ہمیں ہمارے پنجے میں پھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

انھی دنوں شہر میں یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ یکتا ایک فرقہ پرست پارٹی میں کوئی عہدہ قبول کرنے جا رہے ہیں۔ میرے لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی میں اُن کی کئی قلابازیاں دیکھ چکا تھا۔ مزہ اس وقت آیا جب ایک جلسہ عام میں وہ یکتا سے ایکتا ہو گئے اور اُردو کے لیے دیوناگری رسم الخط کی وکالت بھی کر بیٹھے۔ پھر کیا تھا شہر میں ہلچل مچ گئی۔ لوگوں نے اُن کے گھر پر دھاوا بول دیا اور وہ رُوپوش ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ہمارے لیے اُن کے ہاں آنے جانے پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ابھی میل ملاقات میں بھی کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اخلاقی تقاضے سے مجبور ہو کر ہم صبح صبح اُن کے گھر جا دھمکے۔ ہمیں دیکھ کر وہ باغ باغ ہو گئے بانہیں پھیلا کر بولے "آؤ یار آؤ — اتنے دن کہاں رہے آج تو میں تمھیں بہت یاد کر رہا تھا۔ تم نے دیکھا لوگوں کی عقلوں پر کیسے پتھر پڑ گئے ہیں — کیا تم بھی یہی سوچتے ہو کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ؟"

میں اس مسئلہ پر اُن سے کوئی سنجیدہ بات نہ کرنے کا تہیہ کرکے آیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو فیصلے وہ کر لیتے ہیں خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط' اُن پر آخر دم تک اڑے رہتے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اُنھوں نے اپنی زندگی کا صرف ایک ہی فیصلہ بدلا تھا جب انھوں نے ہومیو پیتھی کی سند کہیں سے حاصل کرکے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس پر لوگوں نے یہ مہم چلائی کہ ڈاکٹر اور الماس یکتا کے درمیان بریکٹ میں ہومیو پیتھی لکھنے لگے۔ کافی اخباری جھڑپیں ہوئیں اور جب عین الحق بھی اُن کے خلاف ہو گئے تو وہ اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر نہ لکھنے کا اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے۔

میں انھی خیالات میں گم تھا کہ انھوں نے سکوت توڑا "کیوں بھئی تمھیں یہ سکتہ کیوں آگیا؟"

"کچھ نہیں" میں نے اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "آپ کا فیصلہ صحیح ہے یا غلط میں نے اس پر ابھی غور نہیں کیا ہے۔"

کچھ لمحے کمرے میں مکمل سکون طاری رہا۔ وہ اپنی الجھن میں رہے اور میں اپنی کشمکش میں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی معاً ہماری گفتگو اُس موڑ پر آپہنچی تھی کہ میں یکتا کے فیصلے پر اُس کی صحیح سمت میں رہنمائی کر سکتا تھا یا اُسے اور بھٹکا بھی سکتا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو ٹٹولا تو ضمیر نے کہا اگر ادب دوستی اور تہذیب و اخلاقیات — کی علم برداری کے میرے دعووں میں ذرا بھی سچائی ہے تو مجھے یکتا کو وہ مشورہ دینا ہوگا جس میں ادب اور یکتا دونوں کی بہتری ہو۔ لیکن شاید میرے وجود میں میرے ضمیر کے علاوہ بھی کوئی زبردست طاقت موجود ہے جو نہیں چاہتی کہ یکتا کبھی راہِ راست پر آئے۔ کتنی عجیب بات ہے ادب میں در آنے والی بے اعتدالیوں اور خود غرضانہ رویوں نے میرا سکون چھین رکھا ہے یکتا کے راہِ راست پر آنے سے ادبی بے اعتدالیوں میں کچھ تو کمی ہو سکتی ہے مجھے کچھ سکون میسر آسکتا ہے لیکن میں اپنی اس ذہنی کیفیت کو کیا نام دوں کہ یکتا کے راہِ راست پر آنے کے تصور سے ہی میرا سکون اور بھی چھن جاتا ہے۔ میں نہ جانے کیوں چاہتا ہوں کہ یکتا زندگی بھر غلطیوں پر غلطیاں کرتا رہے۔ اگر مجھ جیسا ادب دوست ادبی معاشرے میں پھل پھول رہے نامناسب رویوں کی آبیاری کرتا ہے تو پھر یکتا قصوروار کہاں رہا۔ بڑا مجرم تو میں خود ہوں اور وہ معاشرہ ہے جس میں میں سانس لے رہا ہوں۔ ادب کو منفی رویوں سے پاک و صاف رکھنے کے لیے پہلے مجھے اپنے اندر کی اُس طاقت کو کچلنا ہوگا جو مجھے حق گوئی سے باز رہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مگر یکتا مجرم اس لیے ہے کہ اُس کی غلط کاریوں کے لیے اُسے کوئی ترغیب نہیں دیتا ہے۔ اس وقت حالات بہت سازگار ہیں زمانہ اُس کا مخالف ہے۔ مجھے اس آگ کو اور ہوا دینی ہوگی۔ دو روز بعد میں اُس کی انگلیاں توڑ کر سارے

انے کی ہمدردیاں حاصل کروں گا۔

"تم پھر غروب ہوگئے" یکتا نے دفعتاً میرے انہماک کو توڑا۔

میں نے اپنے چہرے پر خوش مزاجی کے تمام خطوط سمیٹتے ہوئے کہا "آپ اپنے فیصلے پر اڑے رہیے مگر تخلص میں دو حرفی اضافہ کر لیجیے۔ آج ہی اخبار میں یہ بیان دے دیجیے کہ لوگ دورانِ تقریر تالیوں کی گونج میں میری بات پورے طور پر نہیں سن سکے۔ میں نے ایکتا کی مناسبت سے اپنا تخلص ایکتائی اختیار کرنے کا اعلان کیا تھا۔"

"ارے وا ـــــ کیا دُور کی کوڑی لائے ہو۔" وہ خوش ہوکر بولے "تمارا بھی جواب نئیں اے یار ـــــ جبی تو میں تمّاری اِتّی قدر کرتا اوں۔ اِتّی قدر کرتا اوں ـــ اِتّی ـــــ"

"کہ جاتے تک کا نہیں پوچھتا" میں نے لقمہ دیا۔

"ہو ہو ہو ـــــ ہا ہا ہا" وہ بڑی دیر تک دانت دِکھاتے رہے۔ پھر گھر کے اندرونی دروازے کی جانب گھوم کر بھوپالی اسٹائل میں ہانک لگائی "اجی سُنتی یو ـــ کیا مچھی تل لئی یو ذرا پیلے دو پی یالی چار بنا دو ـــ یہ گنج ـــ ار ـــ رر ـــ م ـــــ میرا مطلب ہے یہ تمارے بھیتے بھائی تشریف لاتے ہوتے ہیں۔"

پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولیں میں شروع ہوگیا "اس تخلص کو اختیار کرنے سے آپ کو جو مالی و سیاسی مفادات حاصل ہوں گے، وہ اپنی جگہ، آگے چل کر اس سے ایک نئے ازم کی شروعات بھی ہوسکتی ہے۔"

"وہ کس طرح" انھوں نے میری آنکھوں میں جھانک کر پُرشوق انداز میں پوچھا۔

"سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں دیکھیے۔ آپ ایکتائی۔ آپ کا جانشین دوتائی اُس کا جانشین تین تائی۔ الغرض تائی ازم کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور اگر واقعی آپ کی طرح آپ کا کوئی لائق جانشین پیدا ہوگیا تو پھر دُنیا بھر کے سارے تائی جیسے تالستائی چغتائی۔ حاتم طائی۔ فسطائی ـــــ وہ درمیان میں بول پڑے "غلاط ـــــ غلاط ـــــ بالکل غلط طوتے والی تائی نئیں چلے گی۔"

"کیوں نہیں چلے گی ـــ؟ جب اُردو والوں نے حاتم طائی سے بھی ہزاروں سال پہلے سے چلی آرہی طوطے کی دونوں طوییوں کو اُس سے جُدا کرکے بیچارے کو ٹنڈ مُنڈ کر دیا تو یہ آپ کے حاتم طائی کیا بیچتے ہیں؟"

"یار آج تو تم بڑی سمجھداری دکھارئے یو" پھر میری آنکھوں میں تھوڑی دیر تک جھانکتے رہنے کے بعد فریفتگی کے انداز میں بولے "یار آج تو میں تمّیں کھانا کھاتے بغیر نئیں جانے دوں آ۔"

"کھانا ـــــ یہ تو میں چائے پینے کے بعد ہی بتا سکتا ہوں کہ کھانے کی گنجائش ہے بھی یا نہیں۔ شاید اُستانی بی نے سُنا ہی نہیں۔"

"ارے ہاں یار" انھوں نے پُرتاسف لہجے میں کہا اور ایک بار پھر اندرونی دروازے کی جانب مُنہ کرکے آواز لگائی "مین کا بیگم سُنتی یو۔ کیا مرغا پکارئی یو۔ اَبی تک چار نئیں پائی۔"

"بس۔" میں نے اطمینان بخش لہجے میں کہا "اب مجھے آپ کی دعوت قبول ہے۔"

"گ ـــ کیا مطلب" وہ سٹپٹا کر بولے

"اَبی تو تم کے رئے تے کہ چاری کر فیصلہ کروئے۔"

"جب مچھلی تلی گئی ہے اور مُرغ پک رہا ہے تو پھر مجھے بھلا کیا تامل ہوسکتا ہے۔"

"مچھی ـــ مرغ" وہ گڑبڑا گئے "اوہ مرغ ـــ ہاں ہاں۔ مچھی مُرغ ـــــ مگر خاں یہ تائی ازم کی بات اَبی راز میں ای رکھنا۔"

یکتا بہت چالاک انسان ہیں۔ انھیں میرے تیور بھانپ لینا چاہیے تھے لیکن کیا کیجیے کہ شہرت کے حریص کی راہ کا جنگل راہِ عقل کا جنگل مرغ ہو جانے کے بعد ہی سبز ہوتا ہے۔

انھوں نے میری توقع کے مطابق نہ تو رسم الخط سے متعلق اپنا بیان واپس لیا اور نہ ہی اپنا فیصلہ بدلا۔ یہاں تک کہ وہ دن آ پہنچا جس کا مجھے بے چینی سے انتظار تھا۔ مقابلے کے لیے مجھے رات ٹھیک نو بجے اُن کے گھر پہنچنا تھا۔ لیکن اس سنجیدہ معاملے میں اُن کی بے توجہی اور سکون و اطمینان کو دیکھ کر مجھے اُن سے ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں وہ کوئی اُستادی نہ دکھا جائیں۔ اس لیے میں مقررہ وقت سے دو گھنٹہ پہلے ہی اُن پر نگاہ رکھنے کے لیے وہاں پہنچ گیا۔ وہاں میرے آنے جانے پر کوئی روک ٹوک تو تھی نہیں۔ اس لیے میں اُن کے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوگیا۔ وہ اپنے کام میں اس قدر منہمک تھے کہ میں اُن کی پشت پر پہنچ گیا لیکن انھیں میرے آنے کی کوئی خبر نہ ہوئی۔ اُس دن میں نے جو کچھ دیکھا پتا نہیں اُس سے میری آنکھیں خیرہ ہوئیں یا نہ ہوئیں لیکن مجھے اپنی مجسّم خیرگی کا احساس ہے۔ وہ نہایت خوش خطی سے اپنے سیدھے ہاتھ سے لکھ رہے تھے۔ عین الحق اُن کا یہی سیدھا ہاتھ تھا۔

زندگی کے مسئلے حل ہو گئے
یعنی سارے لوگ پاگل ہو گئے
چار چھ پڑھ لیں کتابیں اور ہم
یہ سمجھ بیٹھے کہ صیقل ہو گئے
رات کی خوشبو کا جب آنچل اڑا
مخملی جذبات بیکل ہو گئے
جن پہ تھا تحریر صحراؤں کا نام
وہ مناظر سبز جنگل ہو گئے
دیکھ کر پیلی رُتوں کی ساحری
حوصلے ساجد کے بھی شل ہو گئے

ساجد حمید

معرفت ایم۔ محمود شریف صاحب، سوائی پلیا، این۔ ٹی۔ روڈ، شموگہ ۵۷۷۲۰۲

یہ اور بات کہ اس سے ہے واسطہ دل کا
جو آگیا تو عجب حال ہوگیا دل کا
ہزار بار سنایا ہے ماجرا دل کا
کبھی تو کاش سمجھتا وہ مدعا دل کا
اب آخر ایسے مسافر کو کیا کہا جائے
جو پوچھتا ہو ہر اک گام فیصلہ دل کا
سکوں ملے تو فسردہ ہو اضطراب تو خوش
سمجھ سکا نہ کوئی بھی معاملہ دل کا
بچا کے رکھنا ہے اے شان دوستی کا بھرم
وگرنہ کم کہاں ہوتا ہے فاصلہ دل کا

شان بھارتی

پوسٹ آفس سبوا، دھنباد ۸۲۸۱۲۱

ہم اپنے دوستوں کی اس ادا کو پا نہ سکے
رہے تو ساتھ مگر دل سے دل ملا نہ سکے
خدا کا شکر ہے ورثے میں گھر ملا ورنہ
ہم آج تک کوئی دیوار بھی اٹھا نہ سکے
بس ایک بار کے ہنسنے کی یہ سزا پائی
زمانہ بیت گیا ہے کہ مسکرا نہ سکے
ہمیشہ کام لیا ہم نے انکساری سے
ہم اپنے قد کو کسی سے کبھی بڑھا نہ سکے
نجانے کونسی آنکھوں سے پڑھ لیا اس نے
وہ ایک راز جسے ہم کبھی بتا نہ سکے

سیفی سرونجی

سیفی لائبریری، سرونج ۴۶۴۲۲۸ (ایم۔ پی)

سانحہ یہ نہیں تو کیا ہے میاں
سازِ دل اور بے صدا ہے میاں
ہر قدم ایک نقشِ پا ہے میاں
راستہ خود ہی رہنما ہے میاں
وقت کچھ اس قدر خفا ہے میاں
لمحہ لمحہ گریز پا ہے میاں
بے اثر آج ہر دُعا ہے میاں
کون اس دَور کا خدا ہے میاں
پھر مجھے قیدِ خاک کیا ہے میاں
حق لہو کا تو سب ادا ہے میاں
ہم سے اوڑھی گئی نہ عُریانی!
سو بدن کا لہو قبا ہے میاں
کچھ کہوں کچھ سُنوں نہ کچھ دیکھوں
اب یہی ایک راستا ہے میاں

روشن لال روشن بنارسی

D-47/110-A، رامپورہ، وارانسی ۲۲۱۰۰۱ (یو۔ پی)

آوارگی کا آشنا

(پانچویں قسط)

دلیپ سنگھ

۴/۵۹، راجندر نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۶۰

جی مجھے اپنا وعدہ اچھی طرح یاد ہے کہ ۲۶ر مئی کو ناروے میں گزارے ہوئے دن کی روداد بھی میرے ذمے ہے۔

اوسلو کے مغرب میں قریب ۳۵ کلومیٹر کی دوری پر ایک خوبصورت شہر ہے درامن۔ طے یہ ہوا کہ ہم ۲۶ر مئی کو اُس شہر کی سیر کو چلیں گے۔ چنانچہ ناشتے کے بعد چاولہ صاحب، اندرناتھ چوہدری اور آپ کا یہ داستان گو جمشید مسرور کی کار میں سوار ہو کر درامن کی طرف چل دیے۔

درامن کے سفر کا پروگرام اِس لیے بنایا گیا کہ ایک تو یہ چھوٹا سا شہر ناروے کا نہایت ہی خوبصورت شہر مانا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ یہاں سے تھوڑا آگے جائیں تو سمندر کے کنارے ایک جگہ ہے جسے نارویجین زبان VERDENS ENDE کہتے ہیں جس کا مطلب ہے دنیا کا آخری کنارہ۔ کہا جاتا ہے کہ ہماری زمین اِس مقام پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ ناروے آنے والا ہر سیاح اِس مقام پر ضرور آتا ہے کہ اِس طرح اُسے احساس ہوتا ہے کہ اُس نے پوری دُنیا کی سیر کر لی۔

درامن کا سفر میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے کیوں کہ اسی سفر کے دوران میری ملاقات ایک غیر معمولی انسان سے ہوئی۔ نام تھا اُس کا بنارسی داس۔

بنارسی داس درامن کا سرکردہ ہندستانی ہے۔ وہ ناروے میں منتقل ہونے سے پہلے پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کا باشندہ تھا۔ وہ فخر سے یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ اُس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جسے عام لوگ اچھوت اور گاندھی جی ہریجن کہتے تھے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اِس طبقے کے لوگ ہمارے ملک میں بے شمار ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے اپنے دل کو سمجھا لیا ہے کہ پچھلے جنم میں اُن کے کرم ایسے تھے جن کی وجہ سے اُن کے لیے موجودہ زندگی کی ذلت برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ وہ شرافت سے اُونچی ذات والوں کے غلیظ ترین کام اپنے ذمے لے لیتے ہیں اور اِس دنیا کی راہوں پر اِس احتیاط سے چلتے ہیں کہ ان کا ناپاک سایہ کسی اُونچی ذات والے کے بدن کو چھو تک نہ سکے۔

اُن کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جسے احساس ہے کہ سوسائٹی نے اُن کے متعلق اپنا رویّہ بدل لیا ہے۔ چنانچہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ آئین میں جو سہولتیں اُن کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے موجود ہیں اُن کا پورا پورا فائدہ اُٹھا کر وہ زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھیں۔ بنارسی داس اِن دونوں طبقوں سے الگ تھلگ ہے۔ پہلے طبقے سے اِس طرح مختلف ہے کہ بچپن سے ہی اُسے احساس تھا کہ ایک اچھوت کے گھر میں اُس کی پیدائش محض ایک حادثہ ہے اور اُس پر اِس حادثے کی کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔ چنانچہ اُس نے کبھی وہ ظلم برداشت کرنا ضروری نہیں سمجھا جو سوسائٹی نے اُس پر عائد کر رکھا تھا۔ بنارسی داس جب اسکول میں پڑھنے گیا تو اُس نے دیکھا کہ "اونچی" ذات کے لڑکے تو بنچ پر بیٹھتے تھے اور ہریجن ٹاٹ پر۔ بنارسی داس نے اِس تقسیم کو ماننے سے اِنکار کر دیا۔ اُس کی ضد تھی کہ وہ بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ بنچ پر بیٹھے گا۔ اسکول سے لے کر کالج کی تعلیم مکمل کرنے تک اُس نے کبھی کسی ناانصافی کے آگے سر نہیں جھکایا۔ اِس سلسلے میں اگر ایجی ٹیشن کرنے کی ضرورت پڑی تو ایجی ٹیشن کی۔ ہڑتال کی ضرورت پڑی تو ہڑتال کی۔ بحث سے کام چلا تو بحث کی لیکن ناانصافی سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔

بنارسی داس نے اپنے فرقے کے دوسرے طبقے کا رویّہ اپنانے سے بھی اِنکار کر دیا۔ ہمارے آئین میں ہریجنوں کے ساتھ سالہا سال کی بے انصافی کے کفارے کے طور پر اُن کو کچھ رعایات دی گئی ہیں جن پر یقیناً اُن کا حق ہے لیکن بنارسی داس کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اِن مراعات کا فائدہ اٹھائے۔ اُس کا کہنا ہے کہ جب مجھے ہریجن گھر میں پیدا ہونے کی ذلّت سے سمجھوتہ منظور نہیں تو پھر میں یہ کیسے منظور کر لوں کہ اپنی زندگی کو

ز خوشگوار بنانے کے لیے اپنی پیدائش کے حادثے ور اپنے کو اتفاق میں شمار کروں۔ چنانچہ زندگی کی دوجہد اُس نے اپنے بل بوتے پر کی۔ وہ وطن سے ہجرت کرکے ناروے چلا آیا۔ یہاں بے حد محنت کے بعد اُس نے اپنی زندگی میں رنگ بھرے۔ اُس ادرامن میں بہت ہی اچھا کاروبار ہے۔ ایک بایت ہی کشادہ آرام دہ گھر ہے۔ اُس کے بچے بہترین تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ہم جیسے "اونچی" ات کے لوگ فخر سے اُس کے دسترخوان پر بیٹھ کر راحتی محسوس کرتے ہیں۔

درامن میں ہم لوگ بنارسی داس کی کار میں منتقل ہوگئے اور وہ ہمیں دُنیا کے آخری کنارے کی طرف لے گیا۔

راستہ بہت ہی جاذبِ نظر تھا۔ گاڑی میں بہت سے کیسٹ رکھے تھے جنھیں بنارسی داس ہماری تفریح کے لیے بجا رہا تھا۔ میرے اصرار پر بنارسی داس نے جگجیت سنگھ کا ایک کیسٹ بجایا جسے سن کر جمشید مسرور نے کہا کہ جگجیت کے گیت میں اتنی مرکیاں نہیں ہیں جتنی مہدی حسن کے گیت میں ہوتی ہیں۔ اُس کی فرمائش پر بنارسی داس نے مہدی حسن کی ایک غزل لگا دی۔ جسے سن کر اس نے کہا کہ مہدی حسن بے شمار مُرکیوں کی مدد سے جو کیفیت پیدا کر رہا ہے وہ جگجیت کی سیدھی سادی آواز میں ہے۔ اس پر کار میں بیٹھے ہمارے ساتھیوں کا ایک قہقہہ بلند ہوا جس سے مجھے در جمشید مسرور کو احساس ہوا کہ ہم لوگ سنگیت نہیں سن رہے، فرضی حب الوطنی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

دُنیا کا آخری کنارہ مجھے بہت بھایا۔ سمندر کے بیچوں بیچ بہت سے پہاڑی ٹیلے تھے جن پر ہم لوگ بہت دیر تک گھومتے رہے اور تصویریں کھینچتے رہے تاکہ اس بات کی سند رہے کہ ہم نے پوری دُنیا کا چکر لگا لیا ہے۔ اُس جگہ پر ایسا سکوت چھایا ہوا تھا کہ جس پر تقریر بھی فدا ہو۔ میں نے جب بنارسی داس سے کہا کہ مجھے دُنیا کا آخری کنارہ اچھا لگا ہے تو کہنے لگا کہ ایسا ایک دوسرا مقام بھی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو آپ کو وہ بھی دکھا دیں گے۔ اس پر بحث چھڑ گئی کہ دنیا کے سارے آخری کنارے ناروے میں کہاں سے آگئے۔ جمشید مسرور کا کہنا تھا کہ دُنیا کا آخری کنارہ بس یہی ہے اور بنارسی داس بضد تھا کہ میں ایسے کم از کم دو اور کنارے دکھا سکتا ہوں۔ جمشید مسرور نے کہا کہ اس سمندر کے بعد زمین کا نشان تک نہیں ہے لیکن بنارسی داس کا کہنا تھا کہ سمندر کا کنارہ کسی زمین سے ضرور جا لگتا ہوگا۔ جب جمشید مسرور نے کہا کہ پھر یہ بورڈ یہاں کیوں لٹکایا گیا ہے کہ یہ زمین کا آخری کنارہ ہے تو بنارسی داس نے جواب دیا کہ ناروے کے لوگوں کا جو تخیل اس دُنیا کے بارے میں ہے وہ یہاں تک اُڑان بھرنے کے بعد ختم ہوگیا۔

ہر بحث کی طرح یہ بحث بھی کسی فیصلہ کن حد تک نہ پہنچ سکی۔ ویسے دیکھا جائے تو دونوں کا کہنا صحیح تھا۔ ہم سب کی زندگی میں کئی ایسے مقام آتے ہیں جب لگتا ہے کہ ہمارا آخری پڑاؤ آگیا لیکن باہمت لوگ وہاں سے بھی آگے گزر جاتے ہیں کہ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔

اس دلفریب جگہ سے لوٹنے کو کسی کا جی نہیں چاہتا تھا لیکن بہرحال لوٹنا تھا۔ چنانچہ ہم سب لوگ بادلِ نخواستہ اُٹھے اور درامن کی طرف چل دیے۔ درامن میں اونچائی پر ایک جگہ ہے جہاں سے یہ شہر پورے کا پورا دیکھا جاسکتا ہے۔ کچھ دیر اس نظارے کا لطف لینے کے بعد ہم سب لوگ بنارسی داس کے گھر کی طرف چل دیے کہ ہمیں ڈنر اُن کے ہاں لینا تھا۔

ڈنر سے پہلے بنارسی داس ہمیں اپنے گھر کی پہلی منزل پر لے گیا اور دعوتِ ناؤ نوش دی۔ بنارسی داس کو شراب کی لت نہیں اور نہ ہی وہ کسی کو پلا کر سمجھتا ہے کہ اُس نے اپنے مہمانوں پر اپنی امارت کا رعب ڈال دیا ہے۔ لیکن اُس کی یہ خواہش ضرور تھی کہ مہمان نوازی میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ رہے۔ اس وجہ سے ایک بڑی مضحکہ خیز صورت پیدا ہوگئی۔ ہم سب اس لیے پی رہے تھے کہ کہیں بنارسی داس ہمارے انکار کا بُرا نہ مان جائے۔ اس چکر میں اُس نے خود بھی پی حالانکہ اُسے یہ شے بالکل پسند نہیں ہے۔ اور میں نے بھی پی حالانکہ میرے ڈاکٹر نے مجھے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ چنانچہ جب میں نے گلاس اپنے ہاتھ میں تھاما تو جیب میں رکھی ہوئی دوائیوں کی شیشی پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

گپ شپ کے دوران گفتگو کا رُخ پھر ہندوستان کے ہریجنوں کی طرف مُڑ گیا۔ جمشید مسرور کو بنارسی داس سے یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ ہندوستان میں ہریجنوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کئی قدم اُٹھائے گئے ہیں۔ اور خود عوام کا رویّہ اُن کے متعلق دن بدن بدل رہا ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ منو مہاراج ہندو سوسائٹی کو جس حال میں چھوڑ گئے تھے وہ وہیں پر اٹکی ہوئی ہے۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ ناروے میں مقیم ہندوستان کے موجودہ سفیر اسی طبقے سے ہیں تو مجھے لگا جیسے اُسے بنارسی داس کی بات کا کامل یقین ہوگیا ہو۔

بنارسی داس کی باتیں سن کر مجھے یہ خیال ہوا کہ حالانکہ اُس نے محنت اور مشقت سے اپنی

ندگی اُن تمام ذلتوں سے پاک کرلی ہے جو اُس
ی پیدائش کے حادثے نے اُس پر مسلّط کر دی
یں لیکن اُن دنوں کی تلخ یادوں سے وہ ابھی تک
بات نہیں پا سکا۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ کوئی آسان
ام بھی نہیں۔

خالص ہندستانی اور پیار بھرے ماحول
ں ایک لذیذ ڈنر کھانے کے بعد ہم لوگ اوسلو
طرف چل دیے۔ دل میں وہی احساس تھا جو
یک اچھے ماحول میں ایک دن گزارنے کے بعد
ئی دن رہتا ہے۔

چاولہ صاحب کے گھر پہنچے تو سعید انجم کا
ن آیا کہ اگلی صبح وہ مجھے چاولہ صاحب کے گھر
ے پہلے اپنے گھر لے جائے گا اور پھر پروگرام کے
طابق ہم لوگ ڈنمارک کی طرف چل پڑیں گے۔

صبح اُٹھ کر میں اور اندر ناتھ چوہدری
احب رختِ سفر باندھنے لگے۔ چوہدری صاحب
اسی دن دِلّی کے لیے روانہ ہونا تھا۔

سعید انجم کے پہنچنے سے پہلے جمشید مسرور
ر اُن کی اہلیہ روبینہ الوداع کہنے کے لیے
شریف لائے اور ہمیں تحائف سے نوازا۔ اُس
ے سے کہیں زیادہ قیمتی تحفہ تو اُن کی محبت
ی جو مجھے زندگی بھر مسرور رکھے گی۔

کچھ دیر بعد سعید انجم مجھے اپنے گھر لے گیا۔
اں بٹھا کر وہ کچھ گھنٹوں کے لیے اپنی ڈیوٹی نبھانے
ں اسکول میں چلا گیا جہاں وہ ڈراما پڑھاتا
ہے۔ یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہے کہ افسانہ نگاری
ے علاوہ سعید انجم ایک فلم ساز بھی ہے۔ اور
س کی ایک فلم دنیا کے کئی ملکوں میں دِکھائی جا چکی
ہے اور بہت سے انعامات حاصل کر چکی ہے۔

سعید چلا گیا تو میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے
س کے افسانوں کا مجموعہ "سب اچھا ہوگا" پڑھ
لیا۔ اس مجموعے کی کئی کہانیاں میں ڈاکٹر محمد حسن
کے پرچے عصری ادب میں پڑھ چکا تھا۔ کچھ
کہانیاں کراچی کے افکار میں پڑھ چکا تھا۔ لیکن
مجموعہ پڑھ کر مجھے اُس کی تخلیقی قوّت کا بھرپور
اندازہ ہو گیا۔ کہانیوں سے زیادہ دلچسپی سے
میں نے اُس کی کتاب کا دیباچہ پڑھا جس میں
اُس نے اپنا تعارف خاصی تفصیل سے دیا ہے۔
یہ دیباچہ پڑھ کر میں نے اپنے ذہن میں اُس
کی شخصیت کا ایک عکس تیار کر لیا۔ میں سمجھتا
ہوں کہ اگر کسی شخص کے ساتھ لمبے سفر پر جانا
ہو تو اُسے پہلے سے اچھی طرح جان لینا چاہیے
ورنہ ایک دوسرے کو سمجھنے میں خاصہ وقت نکل
جاتا ہے اور کام کی کوئی دوسری بات نہیں
ہو پاتی، چنانچہ دیباچہ پڑھ کر اور اُسے جان
لینے کے بعد میں اب اُس سے ایک تفصیلی ملاقات
کے لیے تیار تھا۔

(باقی آئندہ)

ہائیکو

(۱)

دامن پھیلا ہے
یا میری محرومی کا
آنگن پھیلا ہے

(۲)

رت فریادوں کی
پھر آج، چلو مانگیں
بھیک مرادوں کی

(۳)

اُجڑا جب بازار
لوٹے لے کر اپنے ساتھ
حسرت کا انبار

(۴)

سر پر خون سوار
انا ضمیر سب میرے
اندھے بہرے دار

(۵)

ہم کس کو روتے
جب اپنے ہی گیان کے
خشک ہوتے سوتے

سلیم انصاری

ٹینکو ڈرم یونٹ، ببینا کینٹ، جھانسی (یو۔پی)

ماہیے

(۱)

یہ تیری مری دُوری
تم کیسے کروں ماہی
مجبوری ہے مجبوری

(۲)

لمحوں کی سیاہی کے
افسانے لکھے دِل نے
خود اپنی تباہی کے

(۳)

اے دِل یوں نہیں روتے
چاہت کے گلے شکوے
آپس میں نہیں ہوتے

(۴)

ساون کی فضا ناچے
جب آم کے پیڑوں پر
کوئل کی صدا ناچے

(۵)

مرجھائی ہوئی بیلیں
گلشن کی بہاروں سے
کھیلیں بھی تو کیا کھیلیں

(۶)

بیکار جھمیلوں میں
انسان بھٹکتا ہے
سنسار کے میلوں میں

روحی بہار دواج

۱۷/۳۴۳، جواہر نگر، نیو ریلوے روڈ، گڑگاؤں ۱۲۲۰۰۱، ہریانہ

(۱)

پھر یاد تری آئی
ماضی کے دریچے پر
لی درد نے انگڑائی

(۲)

بے تاب نظر آئی
اِک موج سمندر کی
جیسے مری تنہائی

(۳)

پھر چاند پہ جانا ہے
امّید کی وادی میں
پھر پھول کِھلانا ہے

وقیع منظر

شاہجہاں منزل، این۔آر۔آر۔ روڈ، آسنسول ۷۱۳۳۰۲، مغربی بنگال

ڈھلتی شام

جیونت دلوی
انجم عبّاسی
بندوقی والا بلڈنگ، بی بلاک، روم نمبر ۱۲، جیل روڈ، ناسک، بمبئی ۴۰۰۰۰۹

ٹی۔ وی کا شٹر بند تھا۔ اسے گھورتے ہوئے ماں ٹی۔ وی کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ ٹی۔ وی کا شٹر کھول کر ٹی۔ وی چالو نہیں کرتی۔ پچھلے دنوں ایک بار ٹی۔ وی بگڑا تو لیلا نے کہا "گھر کے سب لوگ ٹی۔ وی کو ہاتھ لگائیں گے تو ٹی وی خراب ہوگا۔" سارے لوگوں سے اس کی مراد بوڑھوں سے تھی۔ اس کے سسر اور اس کی ساس۔ وشوناتھ کے ماں باپ —— اس وقت سے ماں نے توبہ کرلی تھی۔

دروازے پر لگی کال بیل بج اٹھی اسے لگا کہ شاید لیلا آئی۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ لیلا کے پاس تو چابی ہے۔ جوڑوں کی جکڑن برداشت کرتے ہوئے ماں کے اٹھنے تک دوسری بار بیل بجی۔ اس نے دروازہ کھولا —— پتاجی تھے۔ اسے اس کا دھیان نہیں رہا تھا کہ وہ کسی کام سے نیچے گئے تھے۔ پتاجی کے اندر آتے ہی وڑوں کی خوشبو کمرے میں آئی وہ دو دو بٹاٹے وڑوں کی دو پڑیاں لائے تھے۔ اس خوشبو ہی سے اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ لیکن آلو کھانا اس کے لیے منع تھا۔ تلی ہوئی کوئی چیز بھی اسے کھانی نہیں تھی۔ اسے ذیابیطس اور بلڈ پریشر کے مرض تھے —— پتاجی کو ذیابیطس کی معمولی شکایت تھی لیکن وہ کسی قسم کی احتیاط نہیں برتتے تھے ان کی عمر لگ بھگ ۸۰ سال کی تھی، پھر بھی جسم کی ساخت مضبوط تھی۔ اس کے علاوہ انھیں صحت کی مطلق پروا نہیں تھی۔

"وڑے کھاؤ گی؟" جیب سے ایک پڑیا نکال کر انھوں نے پوچھا۔

"کیوں تم کھاتے ہو تیل کے وڑے؟ پہلے ہی ذیابیطس کی بیماری ہے ایسی حالت میں پیٹ کے درد کی وجہ سے رات بھر چلّاتے رہوگے"

وہ درد سے بلبلا اٹھی

"کل اگر موت آجائے تو یہ ارمان نہ رہ جائے۔"

"ہم پچھلے کئی برسوں سے 'کل ہم مر جائیں گے، کل ہم مر جائیں گے' دوہراتے رہے ہیں۔

"اور کھاتے رہے ہیں" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگے اور کھانے میں مشغول ہوگئے کھاتے کھاتے پھر انھوں نے پوچھا "کھاؤ گی؟"

"مجھے نہیں چاہیے۔ پہلے ہی میرے جسم میں شکر بڑھ گئی ہے۔"

کہنے کے لیے تو وہ کہہ گئی مگر وڑوں کی خوشبو سے اس کا جی للچانے لگا —— وہ ان کے ہاتھوں کے وڑوں کی طرف دیکھتی رہی۔

"کیا لیلا آئی؟"

"ابھی تک نہیں۔"

"اگر کھانا ہے تو اس کے آنے سے پہلے کھالو۔"

لیلا کا طریقہ اچھا ہے ڈائٹنگ کی آڑ میں وہ ان دونوں کو کچھ بھی کھانے نہیں دیتی۔

"واہ کیسے لذیذ ہیں وڑے... ادرک... لہسن... مرچی..."

کھاتے کھاتے وہ چہکنے لگے۔

"اتنا تھوڑا سا ٹکڑا دیجیے۔"

اپنی انگلیوں میں ٹکڑے کی سائز بناتے ہوئے وہ بولی۔ اپنے منہ میں آیا ہوا پانی اس نے نگل لیا۔

انھوں نے اسے آدھا وڑا دیا۔ وہ چڑ کر بولی "اتنا سا ٹکڑا دینے کے لیے کہا تو کیا اتنا سا ہی ٹکڑا دینا چاہیے —— ؟"

انھوں نے اسے مزید آدھا ٹکڑا دیا کھاتے کھاتے وہ بولی "دروازے پر دستک ہو تو ذرا دور رہ کر دروازہ کھولیے نہیں تو لیلا وڑوں کی خوشبو سونگھ لے گی، جلدی کھا ڈالیے اس کے آنے سے پہلے ——"

انھوں نے دوسری پڑیا کھولی —— وہ بولی "دونوں مت کھائیے ایک وشا کے لیے رکھیے۔"

"وہ اگر لیلا کے آنے سے پہلے آیا تو ——"

یہ کہتے ہوئے انھوں نے ایک وڑے والی پڑیا جیب

میں ٹھونس لی۔

"میرے بلڈ پریشر کی دوائیاں لائے کیا؟" رومال سے مُنہ پونچھتے پونچھتے وہ ایک دم گڑبڑا گئے۔ اس کی دوائیوں کے پیکٹ وہ بتاشا وڑے والے کے یہاں بھول گئے تھے۔

"تمھاری بھولنے کی عادت آج کل بڑھتی ہی جارہی ہے ــــ" وہ غصّے سے بولی ــــ "جاکر دیکھوں؟"

"اب کہاں جاؤ گے۔ اندھیرا ہو چلا ہے۔ اگر نصیب بھی ہوں گے تو کل ملیں گے وشا کو بھی کہا ہے۔ شاید وہ لے آئے۔"

"اچھا ہوا میں نے پُرانی گولیوں کے ہی تین پیکٹ لیے۔ دو دو روپیوں والے۔"

"وہ گولیاں تو مجھے اب کوئی فائدہ نہیں دیتیں ــــ"

"ڈاکٹر نے نئی گولیاں لکھ کر دی ہیں ایک پیکٹ اٹھارہ روپے کا ہے اس لیے وہ گولیاں میں نہیں لایا ــــ"

"رہنے دو۔ وِشا لائے گا۔"

اتنے میں کال بیل بجی۔ وہ دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھے۔

"لیلا ہوگی۔ مُنہ صاف کرلو اور ذرا دُور کھڑے ہوکر دروازہ کھولنا۔ تمھارے مُنہ سے وڑوں کی بُو آئے گی ــــ"

انھوں نے دُور کھڑے رہ کر دروازہ کھولا۔ دروازے میں وِشا کھڑا تھا۔ اُس نے آتے ہی اُن سے پوچھا ــــ

"وڑے کھا رہے ہیں؟"

"تم کھاؤ گے؟" یہ کہہ کر اُنھوں نے اپنی جیب سے وڑے والی پُڑیا نکالی۔

"ایک ہی دیجیے۔"

"ایک ہی تو ہے۔"

"لیلا شاید باہر گئی ہے؟" اُس نے پوچھا اور وڑا مُنہ میں ڈالا پھر اُس نے کہا "بہت اچھا ہے۔ ماں نے کھایا؟"

"اتنا سا، ناخن کے برابر ٹکڑا کھایا ہے" ماں نے بڑی بے لطفی سے کہا۔

وِشا کو وڑا کھاتے دیکھ کر پھر اُس کے مُنہ میں پانی آرہا تھا۔

"تمھارے جسم میں شکر بڑھ گئی ہے ماں"

"بڑھنے دے۔ زندہ رہ کر بھی کیا کرنا ہے؟"

"کچھ نہیں!" اس نے کہا اور اپنے دانتوں پر زبان کی نوک پھیرنے لگا۔

"وِشا! میری نئی گولیاں ملیں؟"

"لیلا سے کہا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کپڑے اُتارنے لگا۔

پتا جی بولے "ڈاکٹر نے نئی گولیاں دی ہیں۔ ان گولیوں کے ایک پیکٹ کی قیمت اٹھارہ روپے ہے ــــ"

"سستی جان کر یہ پُرانی ہی گولیاں لائے۔ تین پیکٹ اور . . . وہ بھی وڑے والے کے یہاں بھول آئے۔ چھ روپے پانی میں گئے۔" ماں نے قدرے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی پانی میں نہیں گیا ــــ کل لے آؤں گا۔" پتا جی بولے۔

ماں نے پوچھا "شرد کو فون کیا تھا؟" شرد اُس کا دوسرا لڑکا۔ جو الگ رہتا ہے۔

وِشا بے توجہی کے سے عالم میں چُپ رہا ــــ جھگڑا نہ ہوتے ہوئے ان دونوں میں زیادہ یگانگت نہیں تھی۔ پتا جی کی گھڑیوں کی دُکان تھی۔ شرد کو لگا کہ وہ وِشا نے مُفت قبضے میں کرلی لیکن وہ اس بات کو دھیان میں نہیں رکھتا کہ پتا جی نے اُسے پیٹ کاٹ کاٹ کر ایم ایس سی تک تعلیم دی۔ اور اسی لیے وہ اب ایک بین الاقوامی فارماسیوٹیکل کمپنی میں افسر ہے لیکن بڑا ہونے کے ناطے وہ وِشا کو پڑھا نہیں سکے۔ دُکان کے ایک ملازم کو نکال کر انھوں نے اسے نوکر کی حیثیت سے رکھا۔ اسے گھڑیوں کی ریپئرنگ کی تعلیم دی۔ اور اسی لیے وہ دُکان خود بخود وِشا کی تحویل میں چلی گئی۔ ایسا نہیں کہ وہ دُکان ہزاروں روپیوں کی تھی۔ چھوٹی سی تو تھی۔ آگے چل کر وِشا نے قرض لے کر اُسے بڑھایا۔ لیکن ان ساری باتوں پر شرد دھیان نہیں دیتا۔ وِشا نے تھوڑی دیر کے بعد اپنے آپ سے کہنے کے سے انداز میں کہا ــــ

"کیا اس کا فون آیا تھا؟"

"میں گیا تھا اس کے آفس میں۔"

"کس لیے؟"

"اسے اپنے آفس کے لیے گھڑیاں خریدنی تھیں۔"

یہ سُن کر وہ شرمندہ سی ہوگئی اُسے لگا تھا کہ شرد اُنھیں اپنے پاس رہنے کے لیے بلائے گا۔

"مجھے لگا کہ یہ پوچھنے کے لیے کہ ہمیں کب آکر لے جائے" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

"یہ تم اُس وقت اس سے پوچھتی ہو جب وہ یہاں آتا ہے۔ اسی لیے تو وہ آتا نہیں" پتا جی نے قدرے خفا ہوتے ہوئے کہا۔

"چھوٹا بیٹا! پوچھا تو کیا ہوا۔ چار مہینوں کے لیے اگر وہ ہمیں لے جائے تو اتنی مدت تک کیا لیلا اور وِشا کو رہائی نصیب نہیں ہوگی؟"

"وہ لے جائے گا! تم راہ دیکھتی رہو، ہم بیوی اور اس کی بچی!" وہ بولے — "بانو ٹھیک ہے نا؟ اسکول جاتی ہے؟"

"جاتی ہے۔" یہ کہہ کر وِشا کپڑے تبدیل کرنے اندر کمرے میں چلا گیا۔ اُس کے اندر جاتے ہی وہ پتا جی سے بولی "اتنا بولا مگر اُس نے ٹی وی آن کیا؟ اب تک تو سارے پروگرام ختم ہو چکے ہوں گے۔"

پتا جی کچھ کہنے ہی والے تھے کہ اتنے میں وِشا باہر آ گیا۔ اس لیے پتا جی کچھ گڑبڑا سے گئے اور اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے۔

"ابھی تمھارا پھر کچھ کھو گیا ہے؟" ماں نے کہا۔

"ایک لاکھ روپے کہاں گئے؟" جیبیں ٹٹولتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"ایک لاکھ؟"

"ارے وہ لاٹری کا ٹکٹ!"

"کس لیے روپیا ڈبوتے ہو ہر ہفتے۔"

"کچھ نہیں کھویا۔ پچھلے ہفتے دو روپے لگے تھے۔"

"بہت ہو گیا۔ اُس نے کہا "اس سے بہتر ہوتا پہلے سے ہی کچھ بچایا ہوتا۔" وِشا نے کہا۔

یکلخت اُن کا پارہ چڑھا۔

"ارے وِشا۔ ہمیشہ بچایا ہوتا۔ تو کہتا ہے کچھ بچایا ہوتا تو کیا میں ریس کھیلنے جاتا تھا یا جوا کھیلتا تھا؟"

"لیکن جب جیب میں پیسے تھے تو بانٹ رہے تھے سب کو۔"

"سب سے تمھاری کیا مراد ہے؟"

"واگلے کو دیے نا دس ہزار!"

"اس کی لڑکی کی شادی تھی اس لیے دیے تھے۔"

"اُس نے صرف چار ہزار واپس کیے، اپنے گاؤں کے کتنے بچے تھے یہاں کمانے کے لیے۔"

"ارے ہاں لیکن اسی وجہ سے تو انھیں تعلیم ملی!"

"لیکن میں میٹرک کے آگے کی تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔ تمھاری گھڑیوں کی دُکان میں کھپتا رہا۔ آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے۔"

"ہاں اور اسی وجہ سے تو اپنا شرد ایم ایس سی ہو سکا نا؟"

"اُس کو تعلیم ملی وہ کما رہا ہے ہر ماہ آٹھ دس ہزار روپے —"

"اور تمھیں دُکان دی اس کا کیا؟"

"دکان میں تھا ہی کیا؟ اب بھی گھر خرچ چلانا دشوار ہے۔ رنّیا کو (لڑکے کو) پنچ گنی رکھا ہے۔ اس کی بورڈنگ کے اخراجات ادا کرتے کرتے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔"

یہ سُن کر ماں نے مداخلت کی اُس نے کہا "ابھی سے پنچ گنی میں اُسے رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ کیا ہم اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے تھے؟ پھر کس لیے رہتے ہیں دادا دادی؟"

"تمھارے ہی لاڈ پیار سے تو وہ بگڑا۔"

وِشا کے یہ کہتے ہی پتا جی کا پارہ اور چڑھا۔ وہ ایک دم گلا پھاڑ کر چلانے لگے۔

"کچھ بگڑا نہیں وہ۔ ہم سے الگ رکھنے کے لیے ہی تو اس نے بھیجا اُسے پنچ گنی۔"

وِشا کی دُکھتی رگ اُنھوں نے پکڑ لی تھی۔ وہ دھیمی آواز میں بولا "بابا! آپ بھی تو کڑوے پن سے کچھ بھی بولتے رہتے ہیں اور وہ پھر چڑ جاتی ہے۔"

"ارے بلا وجہ نہیں کہتا۔ ہم ہو گئے بوڑھے اور غیر کار آمد۔ اس لیے ہماری ایسی ناقدری؟ ہمیں گیلری میں لے جا کر پھینک دو نیچے ختم کر دو ہمیشہ کی جھنجھٹ!" کہتے کہتے پتا جی کو کھانسی کا دورہ پڑا۔ ماں نے محسوس کیا کہ اب یہ جھگڑا ختم ہو جانا چاہیے۔ وہ بولی — "وِشا! تم ان کی طرف توجہ نہ دو — انھیں یہ عادت پیدائش سے ہے۔ یہ اپنے باپ سے بھی اسی طرح اُلجھتے تھے۔"

لیکن پتا جی آج رُکنے والے نہیں تھے۔ انھیں کچھ باتیں وِشا کو سُنانی تھیں۔ وہ بولے "ارے! ہو گی تمھاری ماں کی ڈائٹنگ! لیکن کیا اُسے اتنا بھوکا رکھنا چاہیے۔ ایک پلیٹ اُبلے چاول اور اتنی سی اُبلی ہوئی بھاجی؟ بھاجی لانے کے لیے بھول گئے یہ کہہ کر دہی کی آدھی پیالی دے دی۔ بس اسی پر پورا دن کاٹنا ہے تمھارے کُتّے کو جتنا تم کھانے کے لیے دیتے ہو اتنا تو کم از کم ہمیں دے دو تمھیں بتا رہا ہوں میں وِشا! جب وہ مرے گی تب ڈاکٹر کہیں گے کہ وہ بلڈ پریشر اور ذیابیطس سے مر گئی — لیکن دراصل وہ بھوک اور فاقہ کشی سے مر گئی ہو گی —"

وہ متواتر بولتے رہے اور کھانستے رہے ماں ڈر گئی۔ یہ سب روکنے کے لیے وہ بیزار ہو کر بولی "میں کچھ مرتی نہیں۔ اور اگر مر گئی تو اس میں کوئی بُری بات نہیں۔ تم بلا وجہ اونچی آواز میں مت جھگڑو۔ آواز بلند ہو تو مجھے بڑی فکر لگ جاتی ہے۔" کہتے کہتے وہ بے چین ہو گئی اس کے ہونٹ سفید ہو گئے۔

"ماں" وِشا نے پوچھا "کیا سچ تمھیں کافی غذا نہیں ملتی؟ ڈاکٹروں نے ہی تو تمھارے کھانے کی مقدار مقرر کر دی ہے۔"

وِشا کو بہت بُرا لگا اُسے ایسے لگا جیسے

محبت بھی لیکن حالات کے سامنے وہ بے بس تھا۔ ماں باپ کو بھی اس کا احساس تھا۔

"مجھے تو خوب ملتا ہے! لیلا بہت زحمت اُٹھاتی ہے۔ سچ پوچھو تو تم ہمیں کسی بوڑھوں کے آشرم میں لے جاکر رکھو۔ تم لوگ بھی کب تک کرتے رہوگے ہمارے لیے؟ اسی لیے تو کہتی تھی کہ شرد ہمیں چار مہینے کے لیے لے گیا ہوتا تو تم لوگوں کو تھوڑی فرصت مل ہوتی۔" کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی موت نہیں آتی اس احساس سے۔

کپکپاتی آواز میں اس نے کہا "تمھارے پاس بھی تمھاری زندگی ہے۔ تمھارے شوق اور خواہشات ہیں۔ تم بھی کتنے سال ہمارا بوجھ اُٹھاتے رہوگے؟" کہتے کہتے اُس کی آواز نے دم توڑ دیا اور وہ چُپ ہوگئی۔

"میں لیلا سے کہتا ہوں" وشا نے کہا "ڈاکٹروں نے سخت ڈائٹنگ کے لیے کہا ہے اس کا خیال رکھیے ــــ"

یہ سُنتے ہی والد بھڑک اُٹھے "ڈاکٹروں کا کیا جاتا ہے؟"

"تمھاری بھی ابا، شکر بڑھ گئی ہے" اُس نے کہا۔

"کوئی حرج نہیں، جنھیں زندہ رہنا ہے وہ ڈائٹنگ کرلیں۔ میں ڈائٹنگ نہیں کروں گا سو بار میں نے لیلا سے کہہ دیا ہے لیکن تھالی میں تھوڑا سا پروس کر تھالی کمرے میں لاکر رکھ دیتی ہے۔۔۔ بعد میں کچھ بھی نہیں۔"

"لیکن ابا! تمھیں مانگ لینے میں تامل کیا ہے؟ ہمارے اخراجات میں کھینچ تان تو ہوتی ہے لیکن اپنے یہاں دھان بھاجی وغیرہ کی کوئی کمی نہیں۔" وشا نے کہا۔

"لیکن وشا! ہمیں تو معلوم ہوتا ہے تاکہ بعد میں پروسنے کی خواہش ہے یا نہیں؟" پتاجی یہ کہہ کر الگ جا بیٹھے جیسے وہ کسی دُور کے گاؤں میں جا چکے ہوں۔ زیادہ بولنے سے ان کا دم چھٹنے لگا تھا۔

"ابا! آپ تو بہت ہی کھینچ رہے ہیں۔" وشا بولا ــــ "اور آپ دونوں ایک بات دھیان میں رکھیے۔ آپ میرے والدین ہیں لیکن آپ دونوں لیلا کے کون؟ آپ نے اُسے چاہا تو وہ بھی آپ سے چاہت رکھے گی۔"

وہ بھی تھوڑی دیر خاموش رہا۔

ماں معاملات کو ہموار کرتے ہوئے بولی "دیکھو وشا! تم اسے کچھ مت کہنا وہی کھنچاؤ دل میں رہے گا تم سے سچ کہتی ہوں لیلا ہمارے لیے کافی زحمت اُٹھاتی ہے۔" تب وشا خود کو سمجھانے کے سے انداز میں پُرسکون لہجے میں بولا

"میں تم سے ایک بات کہنا ہوں۔ بوڑھے ماں باپ کو سنبھالنا ایک مشکل کام ہے پھر بھی میں تمھیں سنبھالتا ہوں۔ اور سنبھالوں گا کیوں کہ تم دونوں نے ہمارے لیے کیا کیا زحمتیں اُٹھاتی ہیں۔ مجھے اس کا احساس ہے کبھی ہم لوگ بھی بوڑھے ہوجائیں گے، مجھے اس کا بھی خیال ہے۔"

ماں سے اکڑے ہوئے پاؤں پھیلانے کے بعد اٹھا نہیں جارہا تھا پھر بھی وہ بڑی مشکل سے اُٹھی۔ وشا کے پاس گئی اور اسے پُچکارتے ہوئے بولی "ان کی ان باتوں کا دل پر کوئی اثر نہ لو وشا! انھیں تو یہ عادت ہی ہے۔ انھیں گھر کے لوگ نہیں چاہیے۔" پتاجی کا بھی گلا رندھ گیا وہ بھی اُٹھے۔ اُس کے پاس گئے۔ اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے بولے "وشا! تم سے ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ دل میں کچھ تو بھرا رہتا ہی ہے وہ اس طرح نکلتا ہے۔ تمھیں ٹھیس پہنچانا میرا مقصد نہیں تھا۔ تمھارے سوا ہمارا کوئی کچھ کرے گا نہیں۔ وشا! تمھارے سوا ہمارا دوسرا کوئی سہارا نہیں ــ"

بولتے بولتے ان کی آواز دھیمی ہوتی گئی۔ ماں بیٹھے بیٹھے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ اس صورتِ حال سے نجات پانے کے لیے وشا نے ٹی وی آن کیا۔ پتا، ماں اور وشا کے چہرے پر ٹی وی کا اُجالا پھیلا۔ اُس اُجالے میں زرتار سے جیسے کرنیں پھوٹتی ہیں، اسی طرح پانی کی لکیریں ان کی آنکھوں پر چمکنے لگیں۔

اتنے میں بیل بجی۔ وشا نے دروازہ کھولا۔ لیلا آئی اس کے ایک ہاتھ میں دو بھری ہوئی تھیلیاں اور دوسرے ہاتھ میں بابی کُتّے کی زنجیر تھی اُس کے اندر آتے ہی وشا نے تھیلیاں لیں اور وہ اندر چلا گیا۔ لیلا بابی کو باندھنے کے لیے گیلری میں گئی ماں لیلا کے پنجابی ڈریس کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ لیلا کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اُس نے پتاجی کو اشارہ کیا۔ لیلا کا پنجابی ڈریس دیکھیے۔ اوڑھنی تک اس نے لی نہیں۔ یہ بھی اس نے اشارے سے بتایا۔

لیلا آئی اور ٹی وی دیکھنے بیٹھی۔ اتنے میں ماں نے پوچھا "میری گولیاں ملیں؟"

"پُرانی ہی لائی ہوں" لیلا نے جواب دیا

"وہ نئی گولیاں کہیں ملتی نہیں۔ پانچ چھ دُکانوں میں پھرتی رہی لیکن کہیں بھی وہ گولیاں نہیں۔"

پتاجی نے فوراً ماں کی طرف دیکھا۔ لیلا کو لگا کہ اس میں کوئی تو اشارہ پوشیدہ ہے۔ وشا نے البتہ کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ وہ سادگی سے بولا "آج کل ہر دوا کا یہی ہے کبھی ملے گی اور کبھی نہیں۔"

پھر چاروں ٹی وی دیکھنے میں مگن ہوگئے۔

ٹی وی پر اس وقت دیکھنے کے قابل کوئی پروگرام نہیں تھا لیکن اس پروگرام کے بعد ناٹک تھا اسے دیکھنے کے لیے ماں کافی بیتاب تھی۔ اتنے میں لیلا اُٹھی اور اُس نے ٹی وی بند کر دیا۔ اور وہ ماتا پتا کے سامنے کھڑی ہو کر اُنھیں دیکھتی رہی تاکہ وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے جائیں۔

ماں نے تاڑ لیا۔ اُس نے آہستہ سے اپنے پاؤں نیچے کیے اور دیوار کا سہارا لے کر اٹھنے لگی۔ پتا جی کے بھی دھیان میں بات آ گئی لیکن وہ ضد سے بیٹھے رہے۔ دونوں ہاتھوں کو اپنے سینے پر تہہ کر کے گردن سیدھی کیے وہ بیٹھے رہے۔ لیلا کا اس طرح ٹی وی بند کرنا وِشا کو پسند نہیں آیا۔ وہ ہلکی آواز میں اس سے بولا "انھیں ٹی وی دیکھنا ہوگا۔"

"ماں کی آنکھوں پر بُرا اثر پڑتا ہے" وہ ماں کو دھمکانے کے سے انداز میں بولی "بیٹھے بیٹھے ان کے پاؤں بھی اکڑ جاتے ہیں۔"

وِشا نے کچھ نہیں کہا۔ کچھ کہتا تو اُسے ہی بیلا کی باتیں سُننی پڑتیں۔

ماں آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی جانب جانے لگی پھر بھی پتا جی ناانصافی کے خلاف خاموش جنگ کی خاطر بیٹھے رہے۔

"پتا جی ــــ اُٹھیے" لیلا نے کہا۔ وِشا کو لیلا کی بات نہیں بھائی۔ لیکن وہ کچھ بھی نہیں بولا۔ ماں دل میں ناراض ہو گئی تھی۔ اپنی ناراضگی کا لیلا کو پتہ نہ چلے اس لیے وہ پیار بھرے لہجے میں بولی "لیلا! اندر کچھ کرنا ہے؟"

بھاجی بُھننے، پیاز کاٹنے جیسے ہلکے کام وہ کبھی کبھی کرتی رہتی تھی۔

"کچھ بھی نہیں۔ . . آپ آرام کیجیے۔"

لیلا کچھ ایسے لہجے میں الفاظ پر زور دے کر بولی کہ ماں کو اس کے لہجے کی تُرشی کا شدید احساس ہوا۔ اس دوران پتا بے عزتی سے جل بھن کر پاؤں پٹختے ہوئے کمرے میں چلے گئے۔ اپنے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے کھڑے رہے اپنے ہی عکس کے ساتھ غصّے سے کہنے لگے "واہ رے بابا صاحب! تمھارے نانا کی ٹانگ"

اسے سُن کر ماں کو ہنسی آئی مگر اس ڈر سے اس نے اپنی ہنسی پر قابو پا لیا کہ کہیں ان کا غصّہ تیز نہ ہو جائے۔ ان کے غصّے کو فرو کرنے کی نیت سے وہ بولی" اس کی کوئی غلطی نہیں ــــ ٹی وی دیکھتے رہنے سے آنکھوں پر اثر پڑتا ہوگا۔ اور بیٹھے بیٹھے جوڑوں میں بھی جکڑن پیدا ہوتی ہوگی۔"

پتا جی صرف اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ ابھی تک ان کا غصّہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی آواز کو تیز کرتے ہوئے بولے

"سُنا تم نے؟ سُنا نا! چھ کیمسٹ گھوم کر آئی لیکن کہیں بھی وہ دوا نہیں تھی۔ کتنا بڑا جھوٹ ہے؟"

"رہنے دیجیے" وہ انھیں سمجھاتے ہوئے بولی "کاہے کو چاہیے وہ نئی دوا؟ آپ غصّہ نہ کریں۔"

"جب مجھے غصّہ آتا ہے تو بھوک لگتی ہے۔"

"پھر غصّہ کیوں ہو؟"

"تم نے تمھارا وڑا کھایا؟"

"کبھی کا کھا چکی۔"

وہ ہنسی۔

پتا جی جیب میں کوئی چیز تلاش کرنے لگے اس جیب میں، اُس جیب میں۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"میں نے اس جیب میں ایک وڑا رکھا تھا" انھوں نے کہا۔ اور دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"وہ وڑا تم نے وِشا کو نہیں دیا؟"

"ہاں ہاں! آج کل یاد نہیں رہتا۔" یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر سوچتے رہے اُنھیں بھوک لگی تھی۔

انھوں نے پوچھا "کچھ کھانے کے لیے ہے؟ ایک دم بھوک لگی ہے، غصّہ آگیا تھا نا!"

"پھر غصّے کیوں ہوتے ہو؟ بسکٹ دوں؟"

"دے دو۔"

اس نے تکیے کے نیچے سے بسکٹ کا پڑا نکالا۔ اُس میں سے دو بسکٹ نکال کر دیتے ہوئے بولی "میں اپنے پاس رکھتی ہوں اس کا مطلب کیا؟ جب زیادہ بھوک محسوس ہوئی تو آدھ بسکٹ مُنہ میں ڈال لیا۔ کسی کو دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کل باہر جانا ہوا تو یاد سے ایک پوڑا لے آنا۔"

تھوڑی دیر سکون رہا۔ بسکٹ کھا کر فارغ ہونے پر بھی پتا جی بلاوجہ مُنہ ہلا رہے تھے وہ بولی دل میں کچھ الگ سا اور عجیب سا محسوس کرتے ہوئے ــــ

"شرد نے رہنے کے لیے بُلایا نہیں، نہ بُلائے۔ لیکن یہ بھی تو کھلے دل سے بولا نہیں کر شرد کے یہاں کیوں جاؤ؟ رہو ہمارے یہاں۔"

"کون؟"

"یہی بڑا۔ تمھاری گھنٹے کی سوئی۔"

"گھنٹے کی سوئی" کہنے پر پتا جی کو قدرے ہنسی آئی۔ بچپن میں اُنھوں نے ہی ان دو بچوں

ے نام رکھے تھے۔ بڑے کو گھنٹے کی سوئی اور چھوٹے کو منٹ کی سوئی نام دیا تھا وہ بولے "بچپن میں لاڈ پیار سے دیے ہوئے نام اب یاد بھی نہیں آتے۔" در پھر اپنے آپ کو کسی سچائی کا مفہوم سمجھانے کے نداز میں بولے "گھنٹے کی سوئی ہو یا منٹ کی ـــــ دونوں ایک ہی سمت جاتی ہیں ـــــ البتہ گھنٹے کی سوئی ذرا بہتر ہوتی ہے۔"

"بہتر کیسے؟ وہ تو پکّا ہے۔ کبھی دس روپے بھی نہیں دیتا۔"

"چھوٹا بھی تو کیا دیتا ہے؟"

"کم از کم آنے کے بعد دس کا نوٹ تو ہاتھ پر رکھتا ہے۔"

"اسی لیے تین چار مہینوں کے بعد آتا ہے۔"

پھر ادھر اُدھر دو تین پھیرے لگاتے ہوئے بولے "مجھے ایک بار لاکھ دو لاکھ کی لاٹری لگنی چاہیے ـــــ پھر نچاؤں گا سب کو ریچھ کی طرح۔"

ہال میں وِشا اکیلا تھا۔ اُسے کبھی کبھی لگتا کہ والدین کے کمرے میں جاکر دو چار لمحے بیٹھ کر ان سے باتیں کرے۔ لیکن لیلا کو یہ پسند نہیں اس لیے وہ ان کے کمرے میں نہیں جاتا۔ ہال میں وہ اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ لیلا باورچی خانے سے باہر آئی تو اس نے اس سے کہا۔

"تمھیں اُس وقت ٹی وی بند نہیں کرنا چاہیے تھا جب ماتا پتا بیٹھے تھے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو؟" وہ ایک دم بپھرنے والے انداز میں بولی "ٹی وی متواتر دیکھتے رہنا آنکھوں کے لیے مناسب نہیں۔" کہتے کہتے وہ اندر جانے لگی۔ اتنے میں اس نے کہا "اور اسے (ماں کو) تھوڑا زیادہ کھانا دینا!"

"انھوں نے کہا؟"

"اس نے نہیں کہا مگر وہ کمزور دکھائی دیتی ہے۔"

"وہ شوگر کے بڑھ جانے کی وجہ سے ہے۔ پتاجی وڑے لائیں گے، بھجیا لائیں گے، بسکٹ لائیں گے۔ کھائیں گے۔ کسی کی زبان پر کسی قسم کا کنٹرول نہیں۔"

"بوڑھے آدمی ہیں انھیں تھوڑے ہی منع کر سکتے ہیں؟"

وہ غصّے سے بھر کر بولی ـــــ "یہ ساری باتیں تم اپنے چھوٹے بھائی سے کیوں نہیں کہتے؟ دیکھیں تو مینا انھیں کیا کھلاتی ہے؟ کھانے کو دے گی فرسان اور فرسان کے ساتھ آئی ہوئی چٹنی کھانے کے وقت پلیٹ میں پیش کرے گی۔"

"پھر بھی لیلا وہ ہمارے لوگ ہیں... ہمیں خدمت کرنا چاہیے۔"

"ہاں۔ گھڑی میں کوک بھرنے کی طرح وہ آسان نہیں۔ ہمارے لیے ہماری اپنی کوئی زندگی باقی نہیں رہی ـــــ ان کی وجہ سے آزادی سے گھوم نہیں سکتے۔ چار دن پنچ گنی جانا چاہیں تب بھی جا نہیں سکتے ـــــ" وہ سارے کیے کرائے پر پانی پھیرتی اور پیچ و تاب کھاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ ماں ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اُسے صاف طور پر سُنائی نہیں دیا۔

"دونوں کی کچھ ہلکی ہلکی باتیں ہو رہی تھیں۔ آپ نے سُنیں؟" اُس نے پوچھا۔

لیکن پتاجی کا دھیان نہیں تھا۔ انھوں نے بیڈ کے نیچے والی ٹرنک کھینچ کر کھولی تھی۔ وہ کوئی چیز تلاش کر رہے تھے۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

انھوں نے جواب دیا نہیں ـــــ ٹرنک کھول کر ٹرنک کے کاغذات کو اُلٹ پلٹ کرنے کی انھیں عادت تھی ـــــ اسی میں ان کا وقت اچھی طرح کٹ جاتا تھا۔

اتنے میں لیلا اندر آئی اور اُس نے سوئچ آف کر کے کمرے کی بتّی بُجھا دی لوٹتے وقت وہ ناراضگی سے بولی "کوئی سبب نہ ہوتے ہوئے بتّی جلائے رکھنے کا مطلب کیا ہے؟"

کمرے میں ایک دم اندھیرا ہو گیا ـــــ ماں بولی۔

"رہنے دو ـــــ ٹرنک میں سے کیا ڈھونڈنا ہے وہ کل ڈھونڈ لیں گے۔"

"نہیں! میں تو ابھی ہی ڈھونڈوں گا۔"

وہ اُٹھے اور اُنھوں نے دوبارہ بتّی روشن کی۔ اور ضد سے بولے "جلاؤں گا میں بتّی جلاؤں گا۔ میں مفت بجلی استعمال نہیں کرتا۔ میں نے اپنی دُکان اس کے شوہر کو مفت دے دی ہے۔"

"اس سے صرف اختلاف بڑھتا ہے۔"

"بڑھنے دو۔"

کھلی ٹرنک میں سر ڈال کر وہ پُرانے خطوط، لفافے اور کاغذات دیکھتے رہے۔ یہ بات نہیں تھی کہ انھیں یقینی طور پر کچھ چاہیے تھا لیکن اچانک انھیں ایک پُرانا لفافہ ملا۔ بہت سالوں پہلے کا ـــــ انھوں نے اُسے کھولا۔ اندر کا خط نکال کر وہ پڑھنے لگے۔ پڑھنے کے لیے اس میں کچھ نہیں تھا۔ اُس میں صرف دو تین الفاظ تھے ان کے پتا ـــــ واجی کے لکھے ہوئے۔ جو لفظ انھیں صرف یاد نہیں تھے بلکہ زندہ ہو کر ان کی آنکھوں کے سامنے رقص

کررہے تھے۔"میری موت پر اخراجات کے لیے" کاغذ پر یہ الفاظ لکھ کر سو روپے کی نوٹ پن سے جوڑ دی گئی تھی۔

گہن رکھی ہوئی زمین کو چھڑانے کے لیے کئی سال پہلے انھوں نے بابا سے۔ اپنے لڑکے سے دو ہزار روپے مانگے تھے۔ بابا کی گھڑیوں کی دکان حال ہی میں شروع کی گئی تھی ــــ اتنے پیسے نہیں تھے کہ ان کو آسانی سے پیسے بھیجے جا سکیں۔ اور بابا کا خیال تھا کہ دکان چلنے کے مقابلے میں زمین کو چھڑانا اہم نہیں ہے۔ بابا نے پیسے نہیں بھیجے جس کی وجہ سے داجی اس سے ناراض ہوئے اور انھوں نے آخر تک اپنے لڑکے کا نام زبان پر نہیں لیا۔ بابا سے انھوں نے کبھی بات نہیں کی۔ انھوں نے کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دی جان دینے سے قبل کھڑکی کی سلاخ میں یہ لفافہ رکھ چھوڑا تھا۔ وہ اپنے سامنے رقص کرنے والے ان چار لفظوں کو دیکھتے رہے اور وہ پرانی نوٹ جارج پنجم کی تصویر والی، جو اب چل نہیں سکتی اور جس کے فولڈ کھولے جائیں تو نوٹ کے ٹکڑے ہو جائیں۔

"کیوں؟ کیوں انھیں ایسا گمان ہوا کہ میں ان کی میت کے بھی اخراجات ادا نہیں کروں گا؟ میں ان کا اکلوتا لڑکا ہوتے ہوتے ..."

کہیں ان کا شاپ، اس بڑھاپے میں میرے مصائب کا سبب تو نہیں؟"

"شاپ!"

"چابی لگاتے ہی جس طرح قفل کھل جاتا ہے اسی طرح ان کا منہ کھلا رہا۔ وہ اس اندھیرے میں کہیں دیکھتے رہے۔ ان کے سوکھے گال پر آنسو امڈ امڈ کر بہنے لگے ــــ مجھے داجی کو اس وقت سمجھ لینا چاہیے تھا" وہ دل ہی دل میں بولے اور گنبد میں تڑپنے والے پرندے کی جو پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے، وہی پھڑپھڑاہٹ انھیں سنائی دینے لگی ــــ بڑی اونچی آواز میں۔

(مراٹھی سے)

مدح خوانی کو نہ کوئی مرثیہ خوانی کو ہے
اب خدا معلوم کیا منظور ویرانی کو ہے
کچھ پذیرائی کسی گوشِ سماعت نے نہ کی
اک یہی شرمندگی میری سخن دانی کو ہے
زیب و زینت بھی بنے اور عیب پوشی بھی کرے
ایسے پیراہن کی خواہش تن کی عریانی کو ہے
چاہے چمکا دے اِسے تو چاہے ٹھوکر مار دے
تیرے قدموں سے تعلّق میری پیشانی کو ہے
اپنے در کی خاک میرے آنسوؤں کو بخش دے
جذب ہونے کی تڑپ آنکھوں کے اس پانی کو ہے

رزّاق سیّد

۲۵۱۲، جگواڑہ، ناسک ـ ۴۲۲۰۰۱ (مہاراشٹر)

آخر کب تک اوپر اوپر دیکھا جائے
گہرائی میں کیوں نہ اُتر کر دیکھا جائے
تیز ہوائیں یاد تری لے کر آئی ہیں
نام ترا بھر ریت پہ لکھ کر دیکھا جائے
شور حریمِ ذات میں آخر کیوں اُٹھتا ہے
اندر دیکھا جائے کہ باہر دیکھا جائے
گاتی موجیں شام ڈھلے ہی سو جائیں گی
بعد میں ساحل پہلے سمندر دیکھا جائے
سارے پتھر میری ہی جانب اُٹھتے ہیں
ان سے کب محفوظ مرا سر دیکھا جائے

احمد محفوظ

۱۴۳ - پیریار ہوسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

کچھ کرشمہ دکھایئے صاحب
آگ دل کی بجھایئے صاحب
پاس آئے گی دوڑ کر دُنیا
مُسکرا کر بُلایئے صاحب
اوڑھ لیں چاندنی اندھیرے بھی
چاند ایسا کھلایئے صاحب
بانٹ دیجے خوشی زمانے میں
درد اپنا چُھپایئے صاحب
کہہ چکی اپنے دل کی بات صدف
آپ بھی کچھ سُنایئے صاحب

صدف جعفری

۴۶، زکریا اسٹریٹ، کلکتہ - ۷۳

مری اُڑان میں شرکت ترا اصول نہیں
اور آگے بڑھ کے پلٹنا مجھے قبول نہیں
سفر ہی میری تمنّا، سفر جنون مرا
یہ سائبان کے سائے مجھے قبول نہیں
میں کامنی ہوں اُگ آئی تمھارے آنگن میں
مہک رہی ہوں، نہ کاٹو، کہ میں ببول نہیں
یقین لایا کس اندھی مہیب بستی میں
میں سوچتی تھی تعاقب ترا فضول نہیں

عذرا پروین

۱۴/۴۰۱، عبدالعزیز روڈ، چوک لکھنؤ - ۳

نئی مطبوعات

دیوار پر لکھی ہوئی عبارت

افسانہ نگار: آسی رام نگری
صفحات : ۲۸۰
قیمت : ۷۵
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

آسی رام نگری مرحوم ایک استادِ فن تھے اور نئے لکھنے والوں کی تحریروں پر اصلاح دیا کرتے تھے۔ اس طرح متعدد نوجوان افسانہ نگار اُن کے دامنِ تربیت میں پلے۔ آزادی سے قبل اُن کے افسانوں کا ایک مجموعہ کئی بار چھپا اور اب اُن کے سعادت مند صاحب زادے نسیم بن آسی نے اپنے مرحوم والدِ محترم کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ شائع کیا ہے۔

آسی صاحب پریم چند کے دَور کے لکھنے والوں میں تھے۔ اور اُن کا ایک خاص انداز تھا جو افسانے سے زیادہ انشائیہ کے قریب تھا۔ اس لیے کہ وہ قصّہ کی بجائے انشا پردازی پر زور دیتے تھے اور اپنے تصورات و خیالات کا اظہار مختلف موضوعات پر کیا کرتے تھے۔ اسے چشمۂ خیال کی تکنیک تو ٹھیک نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ ماجرا کی ترتیب سے ادبِ لطیف سے ملتی جلتی ایک چیز ہے جس میں احساس کی رومانی رو کو ایک خاص سلیقۂ تحریر سے بیان کیا جاتا ہے۔ جدیدیت کے حلقۂ کوشش آج کے بہتر سے نئے افسانہ نگار آسی کے افسانوں میں اپنا اک پیش رو تلاش کر سکتے ہیں۔ یہ تو کچھ خیالستان قسم کی چیز ہے۔ بہر حال آسی کی تحریروں میں زبان و بیان کا ایک سلیقہ ہے جس سے نئے لکھنے والے کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ کتابت، طباعت، کاغذ، جلد اور سرورق معقول ہے۔

—— عبد المغنی

شجر شجر چھاؤں

شاعر: پی۔ پی۔ سریواستو رند ساغری فتح گڑھی
صفحات : ۱۱۲
قیمت : ۵۰ روپے
ملنے کا پتا : باب العلم پبلی کیشنز، 45/B، سیکٹر II، نوئیڈہ (یو۔پی)

"شجر شجر چھاؤں" جانے پہچانے شاعر پی۔ پی۔ سریواستو رند ساغری فتح گڑھی کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ رند کی شاعری بنیادی طور پر، عام انسانی احساسات و جذبات کی سیدھی سادی مگر خوبصورت ترجمانی ہے۔ جیسے :

بات تو کچھ بھی نہ تھی لیکن اندھیری رات میں
اِک دیا جلتا ہوا دہلیز پر اچھا لگا
سونے چاندی کے کھلونوں سے نہیں بہلے گا
دل وہ بچہ ہے جو مچلے گا تو پھر روئے گا

کلاسیکی اقدار سے جدید ترب و لہجے کا اہتمام اور ان کی پاسداری، رند کا فنی رویّہ بھی ہے اور شعری سفر بھی۔ غزل کی جدید امیجری کی ایک مثال :

یہ بند کمرے کی تنہائیوں کا قفل تھا کہ پھر
ہمارے وہم پہ اک وار قاتلانہ ہوا
وہ فاختہ تھی جسے گولیوں نے بھون دیا
یہ قتل صحنِ گلستاں میں جارحانہ ہوا

نئی غزل، فکر اور تجزیہ کی تازگی کے ساتھ ساتھ اظہار اور اسلوب کے جدید تر قرینے بھی مانگتی ہے۔ رند کہتے ہیں :

شاید یہ اونچی اونچی فصلیں نگل گئیں
اس شہر میں ہمارا بھی تھا گھر گیا کہاں
مرے خیال کی چڑیوں نے میرے کمرے میں
بڑا حسین سا اک گھونسلا بنایا ہے

زندگی شاعری گھر آنگن کی شاعری سے بھی قریب ہے۔ گھر کے پیار اور گاؤں کی مٹی کی خوشبو، ان کی یادوں، ان کے خیالوں اور ان کے احساس و تصور کو معطر رکھتی ہے اور ان کے میٹھے میٹھے درد، ایک چبھتی ہوئی کسک کی صورت میں ان کے اشعار میں رچی بسی ہوئی ہے:

سوندھی سوندھی سی گاؤں کی خوشبو
بھولی بسری سی اک قسم یارو
وہی بچپن، وہی میداں، وہی کھیل
وہی بوڑھا شجر ہے اور میں ہوں

زندگی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے احساسات میں ہلکی سی آنچ کی تپش ہے ان کا لہجہ دھیما اور شائستہ ہے۔ اور شعری جمالیات کی شفق اپنے خوبصورت رنگوں کی ٹھنڈک سے فرحت بخشتی ہے مثلاً:

پھول ہی پھول تھے بکھرے ہوئے تا حدِ نظر
میں تیری یاد میں جس راہ سے ہو کر گزرا

بہت روشن عبارت ہے بدن کی
اگر معنی بھی واضح ہوں نظر میں

پہلے شعلوں سے کھیلنا اے زند
انگلیاں پھر گلاب پہ رکھنا

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انھیں لطافت اور نفاست کا شاعر کہا ہے شمس الرحمٰن فاروقی نے ذہنی واردات اور خارجی حقائق کا شاعر اور ضمیر حسن دہلوی نے وسیع موضوع کا شاعر کہا ہے رفعت سروش نے "شہر شہر چھاؤں" میں بہاریں تلاش کیں۔ مخمور سعیدی کے بیان کے مطابق میرا اپنا احساس یہی ہے کہ زند شاعری کی شاعری ایک جانی پہچانی دنیا کی نئی تعبیر کی شاعری ہے اور ذات اور کائنات کے وجدانی انکشاف کا یہ عمل ہی اچھی اور سچی شاعری کی پہچان ہے۔

—— ابوالفیض سحر

Z-623، سروجنی نگر، نئی دہلی 110023

حسنِ کوہسار

مصنف: بہاری لال بہار شملوی
صفحات: ۸۸
قیمت: ۴۰ روپے

آئینے زندگی کے

مصنف: بہاری لال بہار شملوی
صفحات: ۹۶
قیمت: ۴۰ روپے
ملنے کا پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی 2

بہار شملوی ہماچل کے بزرگ قلمکار ہیں اور انھوں نے نظم و نثر دونوں کو اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ انھوں نے ساری عمر ہماچل کے خوبصورت پہاڑوں، جنگلوں، ندیوں اور رومان پرور فضاؤں اور یہاں کے سادہ دل لوگوں کے درمیان گزاری ہے۔ ہماچل اور اس کا کلچر ان کی سرشت کا ایک اہم تشکیلی عنصر بن گئے ہیں۔ ان کی تحریروں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے علاقے کا محض سطحی یا جغرافیائی منظر نامہ پیش نہیں کرتے بلکہ ہماچل کی تصویر کشی میں اس کے حال کے ساتھ ساتھ اس کے ماضی کو بھی کچھ اس خوبی سے منسلک کرتے ہیں کہ ان کی تحریریں ہماچل کے تاریخی، ثقافتی، سماجی اور اقتصادی ماحول کا ایک معلوماتی منظر نامہ بن جاتی ہیں۔

"حسنِ کوہسار" میں بہار کے چار مضمون، ایک طویل سفر نامہ اور دو خاکے شامل ہیں۔ دریائے بیاس کی روداد، دھویا کلو کے دسہرہ کے ہفت روزہ جشن کا بیان یا ہماچل کے ایک دور افتادہ گاؤں میں صدیوں سے چلے آرہے جمہوری نظام کی بات، بہار کی باریک بینی، مشاہدہ اور یادداشت ہر جگہ اپنا جوہر دکھاتی ہے۔ اپنے طویل سفر نامے "لاہول سپیتی کا سفر" تاریخ و جغرافیہ کے رابطوں اور ماضی اور حال کے رشتوں کے وسیلے سے انھوں نے دورانِ سفر پیش آمدہ مناظر اور مشکلات کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔

"آئینے زندگی کے" میں شامل سبھی افسانوں میں ہماچل کے سادہ طبیعت و زندہ دل کرداروں کے توسط سے زندگی کی سچائیوں کو بغیر افسانوی رنگ و روغن کے بیان کیا گیا ہے اور اس طرح یہ افسانے حقیقی زندگی کی قاشیں بن گئے ہیں۔ زندگی کی بات کہتے میٹھے ذائقے والی قاشیں "شہیرا" میں جنگلوں کے کاٹے جانے کے باعث بدلتے ذہنی سکون کی تباہی کا ذکر ہے۔ "ٹونا" پہاڑی لوگوں کی توہم پرستی اور اس کی بنا پر ان کے استحصال پر مبنی ہے۔ "برہم بھوت" کا مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ اگر بھوت اور بدروحیں محض وہم ہیں تو انسان ان کی گرفت میں کیوں آجاتے ہیں اور اگر یہ دماغی عارضہ

ہیں پھر تانترک علاج سے کیوں یہ عارضہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ مینا رانی اور اس کی جوگن وادی کلو کی تاریخ کا ایسا ورق ہے جس پر رقابت، مجبوری اور غداری کی داستان لکھی ہے۔ چند کہانیاں مزاحیہ لب و لہجے کی حامل بھی ہیں۔

ان افسانوں کا کینوس محدود سہی لیکن ان کے تار و پود سے بہار کا گہرا رابطہ ہے یہی وجہ ہے کہ موضوعات، واقعات اور کرداروں کی ہم آہنگی میں کہیں بھی بے سُرا ہونے کا احساس نہیں ملتا۔

یہ دونوں کتابیں معلوماتی ہونے کے علاوہ اپنے موضوعات کی تازگی اور بیان کی شگفتگی کے باعث ہمارے بہت سے اُداس لمحوں میں بہار لاسکتی ہیں۔

—— آزاد گلاٹی

گورنمنٹ کالج، نابھہ ۱۴۷۲۰۱

دل کی تحریر

مصنّف : عابد ضمیر
صفحات : ۱۲۸
قیمت : ۳۰ روپے
ملنے کا پتا : عابد ضمیر، اسلام پور، آسنسول ۷۱۳۳۰۱

عابد ضمیر ایک جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ آج کا انسان جن مسائل میں گھرا ہوا ہے عابد ضمیر نے انھی کو اپنا مرکز خیال بنایا ہے۔ "دل کی تحریر" ان کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے جو فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی تعاون سے منظرِ عام پر آرہا ہے۔

اس مجموعے میں اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ شاعری کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کے درد و کرب کے اظہار کا وسیلہ ہے لیکن عابد ضمیر کے افسانے پڑھ کر بھی یہی احساس ابھرتا ہے۔ اعجاز علی ارشد کی رائے ہے کہ عابد ضمیر کے افسانوں میں زندگی کا کوئی گہرا مطالعہ نہیں لیکن ان کے افسانوں میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتیں ہیں، تلخ بھی اور شیریں بھی۔ بظاہر یہ معمولی دکھائی دینے والے قصے ہیں جنھیں پڑھ کر ہم آسودگی کے احساس سے مسکرا اٹھتے ہیں اور کبھی ہماری پلکیں نم ہو جاتی ہیں۔ لیکن انھی معمولی قصوں کے پردے میں غیر معمولی حقیقتیں، زندگی کی تلخیاں اور ناہمواریاں بھی لپٹی ہوئی ہیں۔

عابد ضمیر دراصل اپنے افسانوں کے پلاٹ اپنے ارد گرد سے ہی لیتے ہیں۔ وہ کرداروں کو محض پیش نہیں کرتے بلکہ ان کے ساتھ جیتے ہیں اسی لیے ان کے افسانوں میں سچائی اور واقعیت کا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی کہانیاں مختصر ہوتی ہیں جو دھیمی رفتار سے آگے بڑھتی ہیں اور قاری کی دلچسپی کو آخر تک برقرار رکھتی ہیں۔

"دل کی تحریر" افسانوں کا قابلِ پذیرائی مجموعہ ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت مناسب اور سرورق جاذبِ نظر ہے۔

شجر صدا

شاعر : سریندر شجر
صفحات : ۱۰۳
قیمت : ۴۰ روپے
ناشر : ناہید پبلی کیشنز، نئی دہلی

"شجر صدا" سردار سریندر سنگھ شجر کا مجموعۂ کلام ہے جو اس حقیقت کا ایک اور ثبوت ہے کہ اُردو کسی خاص فرقے یا مذہب کی زبان نہیں ہے۔ سریندر شجر نوجوان ہیں یہ یک خوشگوار اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ اُردو کی دلآویزی نوجوان نسل کو بھی اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ عموماً تو زبان وہی پنپتی ہے جو روزی روٹی کا وسیلہ بن سکتی ہو لیکن جب اس کے بغیر بھی کوئی زبان پسند کی جانے لگے تو اسے اس زبان کا اعجاز ہی کہا جائے گا۔

کتاب کا پیش لفظ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا لکھا ہوا ہے جو "اُردو غزل کی نئی آواز" کے عنوان شاملِ کتاب ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ کنور صاحب کا شاید آخری مضمون ہے جو موصوف نے کسی نوجوان کے تعارف میں تحریر کیا ہے۔ کنور صاحب نے باصلاحیت نوجوانوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور سریندر شجر کے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ ان کی کتاب کا پیش لفظ سحر صاحب نے لکھا۔

شجر کو شعر گوئی ورثے میں نہیں ملی۔ یہ ان کا ذاتی میلان ہے اسی لیے ان کا لہجہ فطری ہے اور بے ساختہ بھی۔ وہ اپنے دل کی بات بڑی سادگی اور سچائی سے کہہ دیتے ہیں:

سوچیے تو سبب نہیں ملتا
دل مگر اس سے اب نہیں ملتا

ان کا یہ احساس بھی دیکھیے:

ہر ایک شخص سے ان بن ہے کیا کیا جائے
ہمارے ہاتھ میں درپن ہے کیا کیا جائے

زندگی سے لوگ آج کل کتنی دور ہوتے جارہے ہیں، اس کا احساس شجر کو ہے اور وہ اس کی وجہ جانتے ہیں:

وہ شے کہ جسے زیست کہا کرتی ہے دنیا
دنیا نے اسے غور سے دیکھا بھی نہیں ہے

اور اس ... باد

ا۔

—— ایس۔اے۔رحمٰن

اے۔۵، گرین پارک، نئی دہلی ۱۶

شہرِ خوباں

شاعر : عاصی فائقی

صفحات : ۱۲۸

ملنے کا پتا : حریم نور، قاضی پورہ، گلی نمبر ۱، کھنڈوہ (ایم۔پی)

"شہرِ خوباں" عاصی فائقی برہانپوری
چوتھا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے پہلے جناب
...تی کے تین مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں
...ر حضراتِ اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین وصول
...چکے ہیں۔

جنابِ عاصی فائقی کی زنگا رنگ طبیعت
...ر اَن گنت نیز متضاد مشاغل حیران کن ہیں۔
...ی صاحب زود گو اور پُر گو شاعر بھی ہیں
...بد و زاہد بھی، عیال داری کی ذمّے داریوں
...ں معروف و منہمک بھی اور احباب کے
...ے خوشگوار تفریحِ طبع کا موضوع بھی۔ ایسی
...ہ جہت شخصیت کے بارے میں اگر یہ نہ کہا
...ائے تو آخر کیا کہا جائے کہ :

یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

...درت کی یہی دین اور مہربانی ہے جو جنابِ عاصی
...ے کلام میں سوز و گداز، جذبات کی فراوانی،
...خیل کی پاکیزگی، تفکّر کی صلابت، زبان و بیان
...صحت، نیز روانی و سلاست بن کر جلوہ نما ہے

... ساتھ مشرف ...
زیارتِ حرمین شریفین بھی ہیں اور ایک بار
نہیں بلکہ دو بار انھیں یہ شرف حاصل ہوا
ہے ——— عاصی صاحب کے
کچھ منتخب اشعار پیش کر رہا ہوں تاکہ ناظرین
بھی میری طرح محظوظ ہو سکیں :

دریچے کھل رہے ہیں چاندنی کے
کہ وہ چلمن ہٹاتے جا رہے ہیں

کوئی دیوانہ کب سے منتظر ہے
ذرا دیکھو اِدھر بھی مسکرا کے

مبذول میری سمت ہے چشمِ کرم ابھی
ممکن نہیں کہ دردِ محبت ہو کم ابھی

خاموشی ہی خاموشی ہے ہر طرف چھائی ہوئی
میں ہوں اور اُن کا تصور، تیسرا کوئی نہیں

کانٹے تر و تازہ ہیں، فسردہ گل و لالہ
یہ کیسی ہوا اب کے بہاروں میں چلی ہے

—— عمر سیفی

ٹونک (راجستھان)

انتخابِ کلامِ داغ

علامہ اقبال نے داغ کے مرثیے میں کہا ہے :

تھی زبانِ داغ پر، جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ معنی وہاں بے پردہ، یاں محمل میں ہے

داغ کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کے معتقدوں اور مداحوں نے بھی لکھا ہے اور نکتہ چینوں نے بھی اور ان لوگوں نے بھی جو خالص تنقیدی نقطۂ نظر سے کلامِ شاعر کو پرکھنے کے قائل ہیں؛ ان سب لوگوں کی تحریروں کا مرکزی خیال ایک ہی ہے کہ داغ زبان کے شاعر تھے اور روزمرہ کا حسن ان کے کلام کی اصل خوبی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ داغ کی حق تلفی اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی کہ انھیں صرف زبان اور اندازِ بیان کا شاعر کہا جائے۔ اقبال نے داغ کی شاعری کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی حیثیت بنیادی نقطے اور محور کی ہے اور کہا ہے کہ وہ ایک جذبۂ مشترک جو ہر انسانی دل میں تمنا بن کر رہتا ہے مگر ہر شخص اس کے اظہار پر قادر نہیں، داغ کے اشعار اسی جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

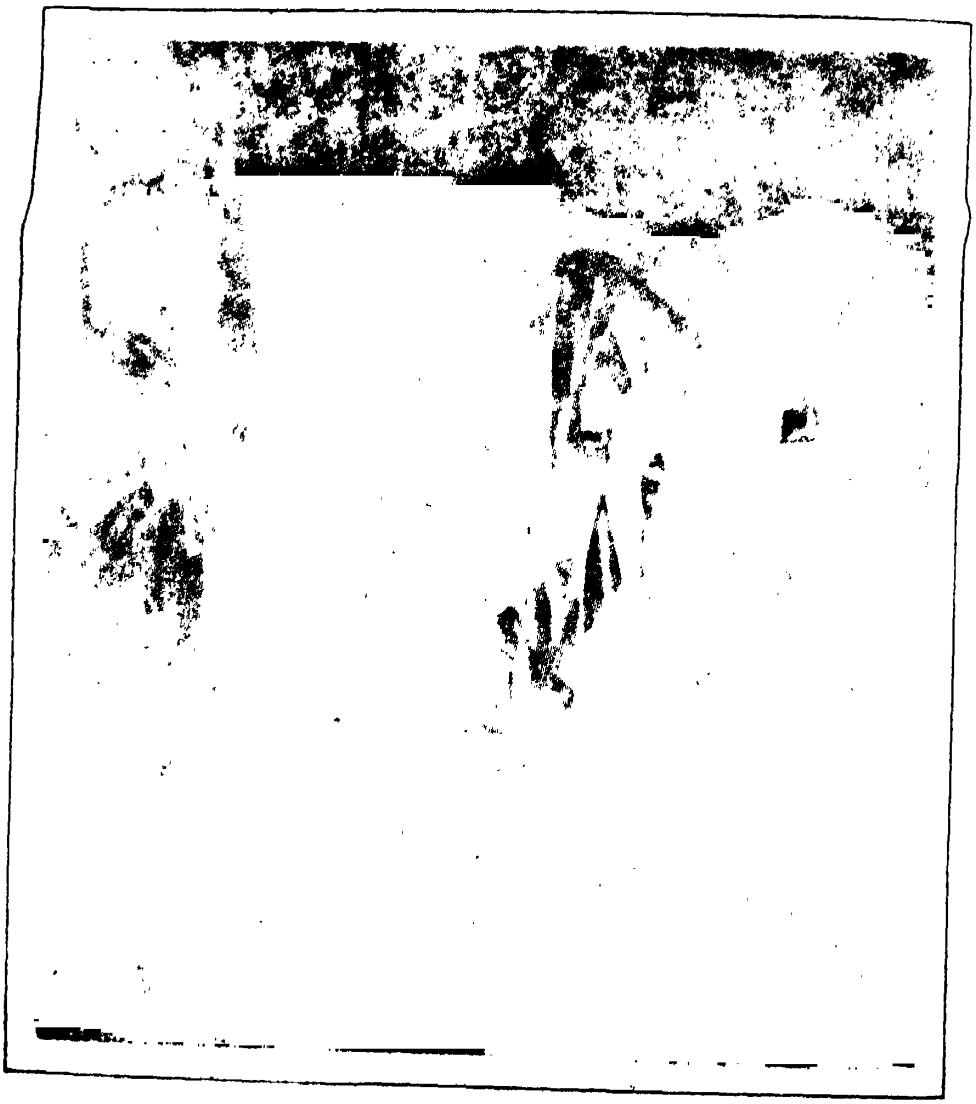
بات میں اگر گہرائی کچھ نہ ہو، بس بات کہنے کا ڈھنگ اچھا ہو تو ایسی باتیں چنگاریوں کی چمک کی طرح جلد ہی دھندلا جاتی ہیں جبکہ داغ کی شاعری آج بھی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کے ہاں سارا کرشمہ محض اندازِ بیان کا نہیں، یہ کرشمہ ہے اس انسانی جذبے کی ترجمانی کا جو آرزو بن کر ہر دل میں موجزن رہتا ہے۔

مصنف : نواب مرزا خاں داغ دہلوی
مرتبہ : بیگم ممتاز میرزا
صفحات : ۲۴۹
قیمت : ۳۴ روپے

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

جنوری ۱۹۹۳ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جارہے ہیں :



پچھلے ماہ کی تصویر

سیدھی سادی بول چال کی زبان میں دل کی بات کہنے کا انداز سربندر شہر کی انفرادیت ہے اور اس صلاحیت کے لیے وہ قابلِ مبارکباد ہیں۔

——— ایس۔ اے۔ رحمٰن

اے۔ ۵، گرین پارک، نئی دہلی ۱۶

شہرِ خوباں

شاعر : عاصی فائقی

صفحات : ۱۲۸

ملنے کا پتا : حریمِ نور، قاضی پورہ، گلی نمبر ا، کھنڈوہ (ایم ۔پی)

"شہرِ خوباں" عاصی فائقی بُرہانپوری کا چوتھا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے پہلے جناب عاصی کے تین مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں اور حضراتِ اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔

جناب عاصی فائقی کی رنگا رنگ طبیعت اور اَن گنت نیز متضاد مشاغل حیران کن ہیں۔ عاصی صاحب زود گو اور پُرگو شاعر بھی ہیں عابد و زاہد بھی، عیال داری کی ذمے داریوں میں مصروف و منہمک بھی اور احباب کے لیے خوشگوار تفریحِ طبع کا موضوع بھی۔ ایسی ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں اگر یہ نہ کہا جائے تو آخر کیا کہا جائے کہ :

یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

قدرت کی یہی دین اور مہربانی ہے جو جناب عاصی کے کلام میں سوز و گداز، جذبات کی فراوانی، تخیل کی پاکیزگی، تفکر کی صلابت، زبان و بیان کی صحت، نیز روانی و سلاست بن کر جلوہ نما ہے۔

عاصی صاحب بحمدللہ اپنی تمام تر دینوی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ مشرف زیارتِ حرمین شریفین بھی ہیں اور ایک بار نہیں بلکہ دو بار انھیں یہ شرف حاصل ہوا ہے ——— عاصی صاحب کے کچھ منتخب اشعار پیش کر رہا ہوں تاکہ ناظرین بھی میری طرح محظوظ ہو سکیں :

دریچے کھل رہے ہیں چاندنی کے
کہ وہ چلمن ہٹاتے جا رہے ہیں

کوئی دیوانہ کب سے منتظر ہے
ذرا دیکھو ادھر بھی مسکرا کے

مبذول میری سمت ہے چشمِ کرم ابھی
ممکن نہیں کہ دردِ محبت ہو کم ابھی

خاموشی ہی خاموشی ہے ہر طرف چھائی ہوئی
میں ہوں اور اُن کا تصور تیسرا کوئی نہیں

کانٹے تر و تازہ ہیں، افسردہ گل و لالہ
یہ کیسی ہوا اب کے بہاروں میں چلی ہے

——— عمر سیفی

ٹونک (راجستھان)

انتخابِ کلامِ داغ

علامہ اقبال نے داغ کے مرثیے میں کہا ہے :

تھی زبانِ داغ پر، جو آرزو ہر دل میں ہے
یعنی یہ لیلیٰ وہاں بے پردہ، یاں محمل میں ہے

داغ کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کے معتقدوں اور مداحوں نے بھی کہا ہے اور نکتہ چینوں نے بھی اور ان لوگوں نے بھی جو خالص تنقیدی نقطۂ نظر سے کلامِ شاعر کو پرکھنے کے قائل ہیں؛ ان سب لوگوں کی تحریروں کا مرکزی خیال ایک ہی ہے کہ داغ زبان کے شاعر تھے اور روزمرہ کا حسن ان کے کلام کی اصل خوبی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ داغ کی حق تلفی اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی کہ انھیں صرف زبان اور اندازِ بیان کا شاعر کہا جائے۔ اقبال نے داغ کی شاعری کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی حیثیت بنیادی نقطے اور محور کی ہے اور کہا ہے کہ وہ ایک جذبۂ مشترک جو ہر انسانی دل میں تمنا بن کر رہتا ہے مگر ہر شخص اس کے اظہار پر قادر نہیں، داغ کے اشعار اسی جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

بات میں اگر گہرائی کچھ نہ ہو، بس بات کہنے کا ڈھنگ اچھا ہو تو ایسی باتیں چنگاریوں کی چمک کی طرح جلد ہی دھندلا جاتی ہیں جبکہ داغ کی شاعری آج بھی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کے ہاں سارا کرشمہ محض اندازِ بیان کا نہیں، یہ کرشمہ ہے اس انسانی جذبے کی ترجمانی کا جو آرزو بن کر ہر دل میں موجزن رہتا ہے۔

مصنف : نواب مرزا خاں داغ دہلوی

مرتبہ : بیگم ممتاز میرزا

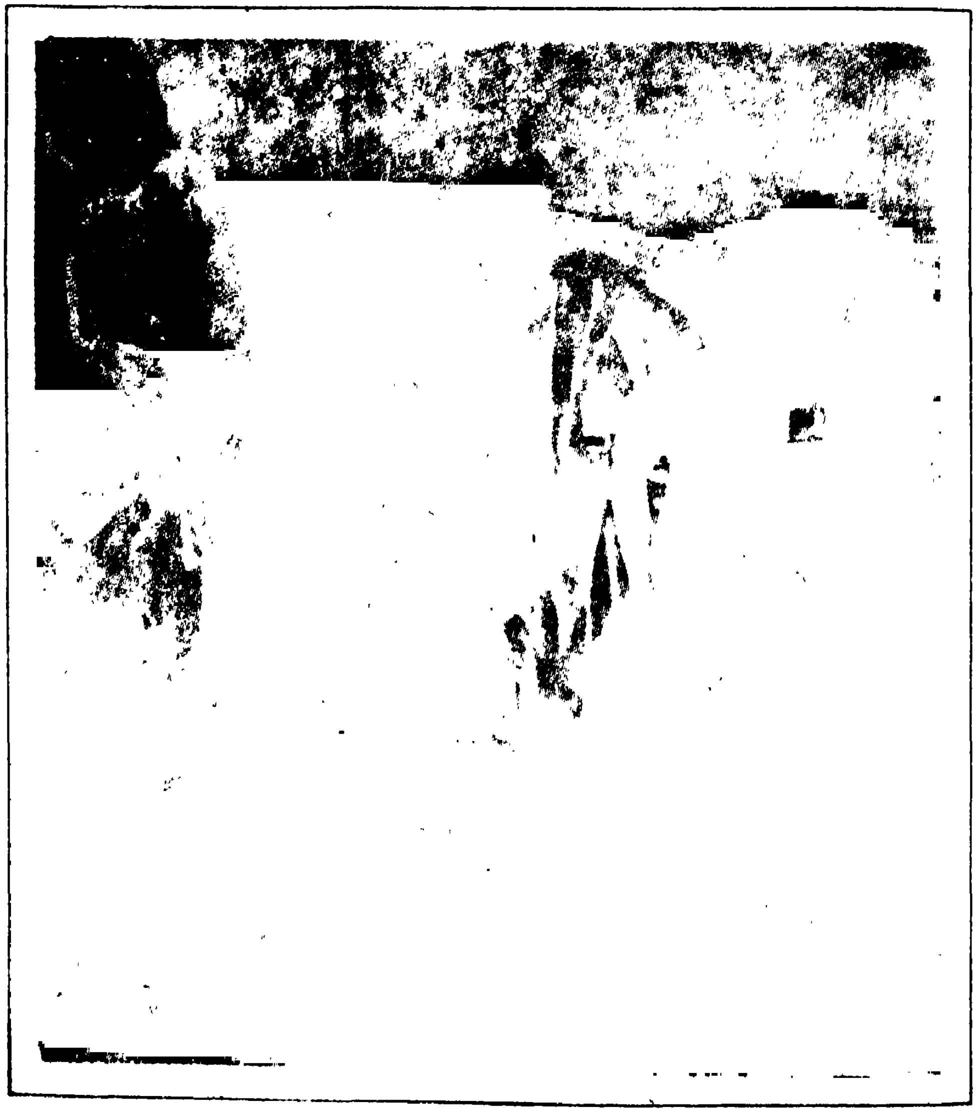
صفحات : ۲۴۹

قیمت : ۳۴ روپے

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

جنوری ۱۹۹۳ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں :



پچھلے ماہ کی تصویر

شعری عنوانات

میری سنتے ہو تو اک بات کہوں
اُجلے پانی میں گہر مت ڈھونڈو (مشتاق)

مرسلہ: معین الدین شمسی،
اسلامیہ مڈل اسکول،
گریڈیہہ ۸۱۵۳۰۱

اپنی پرچھائیں بھی ڈس لیتی ہے
ہر قدم سوچ سمجھ کر رکھیے (حفیظ بنارسی)

مرسلہ: رُخسانہ خانم، آگرہ

بہتے پانی پر لکھی تحریر تھے وعدے سبھی
ہاتھ آئے گا نہ اب کچھ لاکھ ڈھونڈا کیجیے (بشر نواز)

مرسلہ: محمد کامل خاں، بلاسپور

ہاتھ مرے پتوار بنے اور لہریں بنیں کشتی میری
زورِ ہوا کا قائم ہے دریا کی روانی باقی ہے (کمار پاشی)

مرسلہ: فضیل اشرف، ہزاری باغ

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا (شکیل)

مرسلہ: اے۔ علی، برہان پور

ادب ہو یا تہذیب ہو، کاج ہو یا بیوپار
سب پر اپنی چھوڑ گیا چھاپ "سمندر پار" (مانک ٹمزہ پوری)

مرسلہ: محمد جاوید، نیو بمبئی

اے حسینانِ جہاں حُسن پہ مت اتراؤ
داغ پڑ جائیں گے چیچک کے نکل آنے سے (نامعلوم)

مرسلہ: فاروق اقبال بنگلوری، بنگلور

نثری عنوانات

"ذوقِ سفر" (غلام ربانی تاباں کا شعری مجموعہ)
مرسلہ: محمد شکیل الرحمٰن، محلہ بھیکن پور روڈ،
نزد مسجد ضلع جاگیپو ۸۱۲۰۰۱ (بہار)

"انسان اور بزمِ قدرت" (علامہ اقبال کی نظم)
مرسلہ: شاہین فاروقی، نئی دہلی

"پانیوں کا سفر" (جیلانی صبا کی نظم)
مرسلہ: ظفر سعید، علی گڑھ

"سیاہ لمس" (صابر زاہد کا شعری مجموعہ)
مرسلہ: پرویز شمیم، گریڈیہہ

"تین چہرے" (سعادت حسن منٹو کا ناول)
مرسلہ: معین الدین شمسی، گریڈیہہ

(نوٹ: اس مہینے سے یہ سلسلہ ختم کیا جا رہا ہے۔ ادارہ)

اُردو خبر نامہ

مالک رام صاحب کو حالی ایوارڈ

ماہرِ غالبیات مالک رام صاحب کو حالی ایوارڈ ہریانہ اُردو اکادمی کی جانب سے ۲ نومبر ۱۹۹۲ء کو گورنر ہریانہ جناب دھنک لال منڈل نے راج بھون چنڈی گڑھ میں پیش کیا۔ انعام تیس ہزار نقد، ایک شیلڈ، ایک شال اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔

مالک رام صاحب نے غالبیات اور مولانا آزاد پر قابلِ قدر کام کیا ہے اور ان موضوعات پر ذکرِ غالب، تلامذۂ غالب، گفتارِ غالب، فسانۂ غالب، مولانا آزاد کے بارے میں، مولانا آزاد کے خطوط، انتخاب نثر مولانا آزاد (زیرِ طبع) اور مولانا آزاد کی بعض کتابوں کے تنقیدی ایڈیشن ایڈٹ کیے ہیں۔

مالک رام صاحب کے علاوہ اُردو کے بارہ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو بھی گورنر ہریانہ نے انعامات و اعزازات سے نوازا۔

انعامات برائے سائنسی فروغ

نیشنل سائنس سینٹر پرگتی میدان نئی دہلی کے ڈائرکٹر جناب پی۔ کے۔ بھومک کو ڈاکٹر ایس۔ زیڈ۔ قاسم گولڈ میڈل کے لیے چُنا گیا ہے۔ موصوف کی خدمات جنوبی ہند کی ریاستوں میں سائنس کے فروغ کے لیے قابلِ تحسین رہی ہیں۔

محترمہ اقبال ملک اسوسیٹ پروفیسر سونی بفیلو یونائٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ کو ڈاکٹر زیڈ۔ یاوی سلور میڈل کے لیے چُنا گیا ہے۔

یہ دونوں ایوارڈ سائنس اور کائنات سوسائٹی آف انڈیا کی جانب سے سال ۹۳-۱۹۹۲ء کے لیے دے گئے ہیں اس سوسائٹی کا قیام ۸۶ء میں بچوں اور دیہی عوام کے اندر سائنسی ذہن اور دلچسپی پیدا کرنے کے لیے عمل میں آیا تھا۔ سوسائٹی کی شاخیں ملک کی مختلف ریاستوں میں قائم ہیں مثلاً بنگال، بہار، یو۔ پی، گجرات، مدھیہ پردیش، دہلی۔ اس دوران سوسائٹی نے مختلف سمینار سمپوزیم، لکچر سیریز، سائنسی نمائشوں کا انعقاد کیا ہے۔ ا سے زیادہ سائنسی ماڈل تیار کیے گئے جس کے ذریعے بچوں کو تعلیم میں مدد مل سکے۔ زیادہ تر ماڈل ریاستی سرکاروں اور مرکزی سرکار کی طرف سے انعام یافتہ ہیں۔

انعامات کا اعلان سوسائٹی کے بانی سکریٹری شکیل احمد کاکوی نے دہلی میں کیا۔

"انشاء" کے عالمی اُردو افسانہ نمبر پر انعام

ماہنامہ انشاء کلکتہ کے "عالمی اُردو افسانہ" نمبر کو ڈنمارک کی جنوب ایشیائی لکھاریوں کی تنظیم "SOUTH ASIAN WRITERS ASSO-CIATION" نے پانچ ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ تنظیم کے روحِ رواں جناب نصر ملک کی رائے میں یہ "افسانہ نمبر" مشرق و مغرب کے اُردو لکھاریوں کے درمیان

تحت آپ نے اختر شیرانی کی شاعری کے متعلق بڑی دلچسپ باتیں تحریر کی ہیں۔

ستیہ جیت رے کی کہانی "دو جادوگر" اور دلیپ سنگھ کی "آوارگی کا آشنا" کی تیسری قسط اچھی لگی۔ غزلوں میں سوائے اختر بستوی کے تمام غزلیں کوئی خاص تاثر چھوڑنے میں ناکام نظر آتی ہیں۔

—— ریاض الدین ریاض، بھیونڈی

○ دسمبر ۹۲ء کا "ایوانِ اردو" ملا۔ کمار پاشی پر بلراج کومل کا مضمون پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔ کمار پاشی ایک اچھا انسان اور ایک سچا شاعر تھا اس کی قدر شناسی بہت ضروری ہے۔

—— شہود عالم آفاقی، کلکتہ

○ حیدرآباد میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی تو میں نے پاشی کی خیریت دریافت کی تھی۔ اور اس وقت قیصی اپنی بزم میں شامل تھا۔ اب یہ دونوں نہیں رہے۔ قیصی سے میرے دیرینہ تعلقات تھے بہت دیرینہ ہم نے اپنی زندگی کی معاشی صعوبتیں کئی بار مل کر جھیلی ہیں۔ اداس ہو ہو کر ان دنوں کا مذاق بھی اڑایا ہے یہ اُن دنوں کی بات ہے جب قیصی حیدرآباد کی عدالتِ خفیفہ میں بنچ کلرک تھے اور میں دفتر جاگیرات میں کلرک تھا۔ مابعد انھوں نے ترکِ وطن کیا اور بمبئی میں کچھ ہی مدت کی جدوجہد کے بعد بفضلہٖ اچھے دن گزارے۔ صاحبِ قلم تو وہ تھے ہی صاحبِ ثروت بھی ہوتے۔ لیکن ان کی شناخت تادمِ آخر ان کا قلم ہی ٹھہرا۔ ان کی دوسری شادی میرے ہی گھر موقعہ دبیرپورہ حیدرآباد میں ہوئی تھی اور یہ ان کی حیاتِ معاشقہ کا کامیاب انجام تھا۔ منیرہ مرحومہ سے اُس FEUDAL زمانے میں میرے مثالی عقد نے میرے عزیز ترین اور قریب ترین دوستوں کو اس درجہ حوصلہ دیا کہ وہ جب بھی درد آشنا ہوتے مجھے اور منیرہ کو اپنے زخموں کے اندمال کا وسیلہ جانا۔ ہم نے چونکہ ایک دوسرے کے حصول کے لیے بڑی اذیتیں اٹھائی تھیں اور حیات و موت کی اُنسیت تک امکانات کو لامحدود کر دیا تھا سو طبعاً موم ہو کر رہ گئے تھے۔ محبت کی آنچ کہیں لگے پگھلنا ہماری سرشت تھی۔

ف س۔ اعجاز جب "ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ" جیسا دستاویزی نمبر ترتیب دے رہے تھے۔ میں نے ان سے قیصی اور صفیہ اریب سے لکھوانے کے لیے اپنی وساطت کی پیش کش کی تھی۔ قیصی نے چند نجی حالات کے تحت معذرت کی اور مجھے بھی خط لکھا اور میری خواہش کو رد کرنے کے ضمن میں صفائی پیش کی۔ صفیہ شاید اپنی خرابیِ صحت کے باعث کچھ نہ لکھ سکیں۔

میں جانتا ہوں کہ کمار پاشی کی اور آپ کی رفاقتیں کس درجہ استوار اور اٹوٹ تھیں۔ لیکن جب لاد چلا بنجارہ تو آپ پر کیا گزر گئی ہوگی۔ اس کی بیوی بچوں کا اُدھر کیا حال ہوگا۔ میں تو صرف دو تین بار مل کر ہی اس شخص کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ وہ جب بھی یاد آتا اُسے خط لکھ دیتا اور جواب میں محبت ملتی۔

میں اور غیاث احمد گدی، علی گڑھ میں افسانے پر ایک سے می نار کے بعد لوٹ رہے تھے تو دِلی میں میرے ایک عزیز کے پاس قیام کیا تھا۔ پاشی نے دو بار ہماری دعوتیں ہماری اسی قیام گاہ پر کی تھیں۔ اس کی باتیں یاد آتی ہیں، اس کا نرم لہجہ یاد آتا ہے۔ آپ کا ذکر بے حد چاہت سے کرتا تھا —— آپ کا وہ نسخہ عرقِ گلاب والا اس نے ہمیں وہیں بتلایا تھا۔ گدی محتاط آدمی تھا۔ اس نے عمل کیا یا نہیں۔ پتا نہیں مجھ کھلنڈرے نے فوری تجربہ کیا۔ لطف آیا۔ اور پھر یہ لطف بار بار آیا۔ آپ کو دعائیں دیں، پاشی گویا درمیان سے ہٹ گیا تھا۔

اُس کے اِس طرح چپکے سے چلے جانے کی خبر پڑھی تو کیا بتاؤں کتنی دیر پتھر سا بنا رہا۔ اس نے اپنے گھر جاتے جاتے یہ کیسا راستہ چن لیا۔ وہ تو مشاعرے میں حیدرآباد آنے والا تھا اور میں اس کو نظام آباد کھینچ لانے کے جتن کر رہا تھا۔

دسمبر کے "ایوانِ اردو" میں یہ پڑھ کر کہ آپ نے اکتوبر یا نومبر میں کمار پاشی پر ایک گوشہ شائع کیا ہے اپنی اس محرومی کا احساس ہوا کہ مجھے اکتوبر اور نومبر کے "ایوانِ اردو" کے دونوں شمارے نہیں ملے۔ کرم ہوگا اگر بھجوا سکیں۔ ستمبر کے "ایوانِ اردو" کے دو شمارے مل گئے تو میں نے یہی سوچا کہ یہ کرم فرمائی ازراہِ التفات ہے۔ میرا افسانہ اسی شمارے میں شامل ہے۔ ستمبر کے شمارے کی بات نکلی ہے تو میں یہ بھی لکھتا چلوں کہ میں اس وقیع نمبر کے تعلق سے آپ کو بطورِ خاص خط لکھنا چاہتا تھا۔ اس شمارے میں ساجدہ زیدی کا مضمون معاف کیجیے اس شمارے کی توقیر بن گیا ہے۔ اس موضوع پر ساجدہ زیدی ہی قلم اٹھا سکتی تھیں۔ انھوں نے اتنے اہم سوالات اتنے واضح اور سلجھے ہوئے انداز سے اٹھائے ہیں کہ جامعات میں پڑھانے والے پروفیسرس جو تخلیقی فنکار خود بھی ہیں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کر سکتے ہیں۔ ان مضامین کی یک جائی کی افادیت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ میں تو چاہوں گا کہ آپ ایسے سینئر اور نامی اساتذہ کو جو خود بھی تخلیقی فنکار ہیں بطورِ خاص اس موضوع پر لکھنے کے لیے مدعو کریں۔ خود علی گڑھ ہی میں بے شمار نام نکل آئیں گے مثلاً معین احسن جذبی، خورشید الاسلام

قاسمی عبدالستار، وحید اختر، شہریار، زاہدہ زیدی، ابوالکلام قاسمی وغیرہ پھر دوسری جامعات بھی ہیں۔(۱)

پاشی پر دسمبر کے حالیہ شمارے میں بلراج کومل کا مضمون اچھا ہے۔ آخری حصہ دل میں اتر جاتا ہے لیکن پاشی کے فن پر اور وضاحت سے بات ہونی چاہیے، مجھے یقین ہے کہ آپ عزیز قیسی کے لیے بھی ایک گوشہ جلد مختص کر سکیں گے۔ وہ بھی تو بھول سکنے کی چیز ہرگز نہیں ہے۔(۲)

—— اقبال متین، نظام آباد

(۱) ہم ان حضرات سے توجہ کے ملتمس ہیں —— ادارہ

(۲) ہم جلد ہی ان کے بارے میں مضمون شائع کریں گے —— ادارہ

( ) دسمبر کا "ایوانِ اردو" پڑھا۔ غزلیات میں عشرت دھولپوری کی غزل بڑے پائے کی غزل ہے بلراج کومل کا "کمار پاشی —— ایک مطالعہ" اس حقیقت کا تو آئینہ دار ہے کہ کومل صاحب بطور نقاد کیا کچھ جانتے ہیں اور اپنے علم و دانش کو اظہار دینے پر کتنی قدرت رکھتے ہیں لیکن پاشی کی نظموں وغیرہ کا انھوں نے حوالہ دیا ہے وہ پاشی کی قدرت زبان یعنی مٹی جھلی زبان میں ٹھہرے ہوؤں سے وابستہ پھیلے احساسات اور جذبات کے اظہار میں کامیابی کا ثبوت تو فراہم کرتی ہیں۔ لیکن ان میں وہ خیالات کی تہہ داری نہیں کے برابر ہے جس پر کومل صاحب شاید اپنے علمی اور تنقیدی نظریات کا طومار استوار کرنا چاہتے تھے۔ کسی شاعر پر مطالعے کی کوشش اس کی تمام تخلیقات کے پیش نظر ہونی چاہیے۔ میری نظر میں پاشی ایک GENIUS تھا۔

—— رام پرکاش راہی، دہلی

( ) دسمبر کے شمارے میں رؤف خیر کا مضمون "ڈپٹی نذیر احمد اور حیدرآباد" پڑھ کر شکایت کا احساس ہوتا ہے۔ موصوف نے ڈپٹی صاحب کی خدمات کا جائزہ تو لیا ہے لیکن کہیں کہیں جو استہزائیہ انداز اختیار کیا ہے وہ کھٹکتا ہے۔ مضمون نگار آخری جملے میں بھی چوٹ کرنے سے باز نہیں آتے۔ ملاحظہ فرمائیے "سب سے بڑا اعزاز تو ان کے لیے یہی تھا کہ وہ نظام دکن کے اتالیق مقرر تھے اور ظاہر ہے یہ خدمت وہ فی سبیل اللہ نہیں کرتے تھے۔" کیا رؤف خیر صاحب یہ بتانے کی زحمت فرمائیں گے کہ بادشاہوں اور نوابوں کے کتنے اور کون کون سے اساتذہ نے اتالیقی کا فریضہ فی سبیل اللہ انجام دیا ہے۔ اور یہ فیصلہ تو اہل علم کریں گے کہ ڈپٹی صاحب کے لیے اتالیق ہونا اعزاز کی بات تھی یا نظام کے لیے یہ اعزاز کی بات تھی کہ ڈپٹی نذیر احمد ان کے اتالیق تھے۔ جن کا شمار اردو کے عناصر خمسہ میں کیا جاتا ہے۔

اس بار افسانوی حصہ انتہائی جاندار ہے۔ الیاس احمد گدی، عشرت ظہیر اور ستیہ جیت رے کے افسانوں کو بھلانا آسان نہیں ہے۔ پہلے دو افسانوں میں عصری مسائل کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

—— غلام نبی مومن، کلیان

( ) رؤف خیر صاحب کا مضمون بہت خوب اور پر از معلومات ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ ڈپٹی نذیر احمد خاں صاحب سے کچھ خوش نہیں۔ مضمون مصنف کے حیدرآبادی ہونے کا پوری طرح عکاس ہے۔ غزلیات تو "ایوانِ اردو" میں ہمیشہ ہی انتخاب ہوتی ہیں مگر اس بار محترمہ مسعودہ حیات صاحبہ کی غزل متاثر کن ہے۔ عہد رفتہ کی گم شدہ یادیں تازہ ہو گئیں۔ امید ہے کہ ایسے جذبات کا احساس مجھ جیسے ان گنت اور ناظرین کو بھی ہوا ہوگا۔ کیا حسب حال کلام ہے: اللہ کرے زور کلام اور زیادہ۔

الیاس احمد گدی صاحب تو اچھے افسانے لکھتے ہی ہیں مگر "تمام جیفرسن کے ہنجرے" بے حد خوبصورت ہے۔ نئی تہذیب اور ترقی کا اس سے اچھا محاسبہ اور کیا ہوگا۔ ارشد الحمید صاحب کی کہانی نما نظم اچھی ہے۔ جناب دلکش غازی پوری کا چوتھا شعر تو پیش گوئی ثابت ہوا۔ "آوارگی کا تماشا" بہت اچھا لگ رہا ہے ایسا لگتا ہے کہ ہم جناب دلیپ سنگھ کے ہم سفر ہیں بہت معلوماتی اور ہلکا پھلکا طرز نگارش ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ مضمون مسلسل جاری رہے۔ اتنی کم قیمت میں آپ اتنا عمدہ معیاری رسالہ نکال رہے ہیں۔ اس کے لیے آپ سب لائق تحسین ہیں۔ اس دور میں اردو داں تو ہیں مگر ہمدردانِ اردو کا فقدان ہے۔

—— سید ماجد رضوی، رام پور

( ) دسمبر ۹۲ء کا شمارہ کافی معیاری ہے۔ "ستا انصاف" ہمارے فریب کار سماج کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے۔ "ڈپٹی نذیر احمد خاں اور حیدرآباد" مضمون تحقیقی ہو کر بھی تحریر شگفتہ ہے۔ جناب عشرت دھولپوری کی غزل اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ دیگر غزلیں کمزور ہیں۔

—— عشرت واحد، اندور

( ) دسمبر ۹۲ء کے شمارے کے سبھی مشمولات لائق تحسین ہیں۔ خاص طور سے عشرت ظہیر کا افسانہ "عرفان کی اور . . ." اور بلراج کومل صاحب کا مضمون "کمار پاشی —— ایک مطالعہ"

—— محمد رحمت نعمت اللہ، دربھنگہ

( ) اردو کے موقر رسائل میں "ایوانِ اردو" کا مقام بہت بلند ہے۔ اس میں شائع ہونے والے افسانے دعوتِ فکر و نظر دیتے ہیں۔ اس بار الیاس احمد گدی کا "تمام جیفرسن کے ہنجرے" بڑا خیال انگیز افسانہ ہے۔

—— یٰسین رضا، ریسوڑ، اکولہ

○ دسمبر ۹۲ء کے "ایوانِ اُردو" میں رام لعل نابھوی صاحب نے اپنے خط میں دلیپ سنگھ کے سفرنامے کے ایک حصّے کا جس انداز میں خلاصہ پیش کیا ہے۔ اُسے پڑھ کر یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ موصوف کی ذہنی کیفیات اِن دِنوں کس "ذہنی بحران" سے گزر رہی ہیں۔ کیا نابھوی صاحب یہ بتانا پسند کریں گے کہ دلیپ سنگھ کے سفرنامے میں اُن غیر ضروری جملوں کی تعداد کتنی ہے جنھیں بنیاد بنا کر وہ ایک اچھے خاصے ادبی سفرنامے کو ایک غیر ادبی نام "شیخی نامہ" میں بدل کر خوش ہیں؟ اور اگر واقعی خوش ہیں تو میرے اس سوال کا جواب دیں کہ سفرنامہ اصل میں ہے کیا اور اس کے لکھنے کی تکنیک کیا ہے؟ کیا اس کے لکھنے کی جو فنی تکنیک ہے اس پر فی الحال وہ کوئی مقالہ لکھ رہے ہیں کہ نہیں؟

——— محمد حامد، دربھنگہ

○ میرا مضمون "شیکھر ایک زندگی" شائع کرنے پر شکریہ۔ اس میں کتابت کی کئی غلطیاں ہیں ——— یہ ناول دو جلدوں میں اُنیس سو چالیس اور چوالیس میں شائع ہوا تھا اور "باذوق عورت اس کو م ن ی ک ا کی شکل میں ملتی ہے جو تنہا ہے اور مردوں کو پ ا ل ت ی ہے" ——— صرف دو کی نشاندہی کر رہا ہوں۔ کمار پاشی پر گوشہ تشنہ رہا۔ چند ماہ پہلے "نو بھارت ٹائمس" نے اور اب "قومی آواز" نے ان کی انتہائی خوبصورت نظم "اجودھیا میں آرہا ہوں" شائع کی تھی جو اُردو کے سیکولر کردار کی نمائندہ ہے، اسے کم از کم "سرود رفتہ" میں شائع کر دیں۔ پروفیسر ساجدہ زیدی کی نظم خوب ہے۔ غلام عبّاس کے مضمون میں شیام بینیگل کی فلم "منڈی" کا ذکر بھی آنا چاہیے تھا جو "آنندی" پر BASED تھا مجھے تو غلام عبّاس ایک کہانی کے مصنّف لگتے ہیں۔ عظیم اختر کا طنزیہ پسند آیا۔ آج سارے موضوعات گھوم پھر کر وہیں پہنچتے ہیں جن کی آپ کا اداریہ نشاندہی کرتا ہے میرے حقیر مطالعے کے مطابق چند پڑھے لکھوں کو چھوڑ کر ہندستان کبھی سیکولر نہیں رہا ——— ٹی وی پر دس دس عورتوں اور مردوں کو دو لائنوں میں کھادی کے کپڑے پہنا کر کھڑے کرکے اور ان سے "بے سُرے" بھائی کو بھائی پیارا - ایسا ہوگا چمن ہمارا" قسم کے نیم فلمی ٹائپ گیت پیش کرنے سے کچھ نہیں فرق پڑتا سیکولرازم کی بقا کے لیے معاشی عدم اولین شرط ہے۔ بھیانک بیروزگاری اور کیڑے مکوڑوں کی طرح بڑھنے والی انسانی آبادی کے اس دور میں مذہب تو ایک بہانہ ہے۔ زمینیں، مکانات، دُکانیں، دھندے اور ملازمتیں چھیننے کا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات آج سے بھی زیادہ تاریک تھے لیکن اس وقت نہرو جیسے عظیم ذہن (جناح کے رومال برابر پاکستان کا کیک لے کر بھاگنے کے بعد) زندہ تھے، ساری دُنیا میں کافی حد تک بھائی چارہ اور بین الاقوامی درد مندی کا ماحول تھا، یوروپ کی معاشی ہوس زدگی آج جتنی نہیں بڑھی تھی اور میڈیا بالخصوص ٹیلی ویژن پر کریم بنانے والوں اور بسکٹ بیچنے والوں کا قبضہ نہیں تھا، فلمیں اس قدر پُر تشدد اور ان کی اداکارائیں اس قدر عریاں اور جسماتی ہوئی نہیں تھیں ——— یہ سب عوامل بھوکے ننگے عوام میں لوٹ کھسوٹ اور کمزوروں کا مال و متاع لوٹنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ پڑوس اور ماحول کا اثر اپنی جگہ۔ ہندستان کے آس پاس "نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر" یکے بعد دیگرے سبز مملکتوں کا قیام۔ بنگلہ دیش، پاکستان، افغانستان، ایران اور ابانیہ، مصر، الجیریا، سعودی عرب، کویت، لبنان، عراق، لیبیا، سوڈان، کشمیر اور ترکی اور چھ سابق روسی ریاستوں اور چین کے جنوبی خطوں میں بنیاد پرستی کا فروغ اور خونیں جدوجہد۔ ہندستان کب تک محفوظ رہتا اور کیوں۔ پھر آج ساری دُنیا میں رنگ، مذہب، علاقائیت اور زبان یہاں تک کہ قبائل کے نام پر کمزوروں کو مارا کاٹا اور معاشی شودر بنایا جا رہا ہے، خود غرضی اور مجرمانہ چالاکیوں کی آڑ میں نئے کنزیومرازم کی تکمیل کی جارہی ہے۔ آج سیکولرازم انتہائی سڑا گلا تصوّر اور کمزوروں کی مجبوری بن گیا ہے اور اب ہندستان میں میرے خیال میں اس کا کوئی FUTURE نہیں ہے۔ انتظار حسین کا زمین تنگ ہونے کا محاورہ اور "آگ کا دریا" کے ابوالمنصور کمال الدین کا کمال کی شکل میں پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور ہونا۔ ذہن کو مستقل HAUNT کر رہے ہیں۔ یہی مسئلہ اُردو کا بھی ہے جب سیکولرازم ختم ہوا تو اُردو بھی قریب الختم ہے۔ یہ ہاری ہوئی لڑائی بہت ہو چکی ہے ویسے بھی اُردو عملاً اب صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے اور وہ بھی دیکھیے کب تک رہے!

——— خالد اشرف، دہلی

○ دسمبر ۹۲ء کے "ایوانِ اردو" میں شاہد اختر (کانپور) کا خط نظر سے گزرا۔ پڑھ کر بہت کوفت ہوئی یہ معلوم نہیں موصوف کس نقطۂ نظر سے شاہد بارک پوری اور مشرف عالم ذوقی کے افسانوں کو دیکھا کرتے ہیں جو انھیں کمزور نظر آتے ہیں۔ عبدالصمد کے افسانے "مضبوط رشتہ" پر بھی موصوف نے نکتہ چینی کی ہے۔ جبکہ "ایوانِ اردو" کے متذکرہ شمارے میں "مضبوط رشتہ" سب سے اچھا افسانہ

——— منظر مظفرپوری، مظفرپ

○ "ایوانِ اُردو" کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں مجھے بے حد پسند ہے۔ اُردو کے لیے کہاں کیا ہو رہا ہے۔ "ایوانِ اُردو" کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا رہتا ہے۔

——— شریف الدین خاں، ڈونگر

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر : ۳۲۷۶۲۱۱ ، ۳۲۶۳۴۴۸

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر :
ایس۔ اشتیاق عابدی، مخمور سعیدی

جلد : ۶ ● شمارہ : ۱۱ ● فی کاپی ۵۰ر۳ روپے، سالانہ قیمت ۳۷ روپے ● مارچ ۱۹۹۳ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، دہلی ـــــ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس : تنویر احمد
سرورق : عمل : ارشد علی خاں

ایس۔ اشتیاق عابدی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی ۲ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

گزشتہ دو ڈھائی مہینے سے ملک کی فضا پر ہولناک تاریکیوں کا تسلط رہا ہے لیکن ان تاریکیوں کی دبیز چادر سے روشنی کی کرنیں بھی متواتر چھن چھن کر باہر آتی رہی ہیں۔ بابری مسجد کے انہدام پر اُن لوگوں نے جو اس کے ذمے دار تھے فخر و مباہات کا اظہار ضرور کیا اور انھوں نے اپنے کچھ ہمنوا بھی پیدا کر لیے لیکن عام طور پر اس حرکت کی شدید مذمت کی گئی اور اس مذمت میں اقلیتی فرقے سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ اکثریتی فرقے کے افراد اور تنظیموں نے حصّہ لیا۔

دسمبر کے دوسرے ہفتے سے ملک بھر میں انسانیت کش فرقہ وارانہ فسادات کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس کی زیادہ تر تفصیلات لرزہ خیز ہیں اور یہ ظاہر کرتی ہیں کہ انسان جب اپنی انسانیت کو خیر باد کہہ کر حیوانیت اختیار کرتا ہے تو اس کی درندگی حیوانوں کی درندگی کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہے لیکن قتل و غارت کے اس ہنگامے میں انسانی شرافت کے کچھ حوصلہ افزا مظاہر بھی سامنے آئے۔ قتل و غارت کا بازار سب سے زیادہ بمبئی میں گرم ہوا لیکن اسی بمبئی میں یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ مشہور فلمی اداکار سنیل دت فسادات کے ردّ عمل کے طور پر اپنی پارلیمانی نشست سے مستعفی ہو کر امن و اماں کی بحالی کے لیے بھوک ہڑتال کر رہے ہیں اور کرکٹ کے ممتاز کھلاڑی سنیل گواسکر کچھ بے گناہوں کو موت کے چنگل سے بچانے کے لیے اپنے ہم مذہب فسادیوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے ہیں۔

فسادات کے تعلق سے نیشنل پریس کا کردار بھی مستحسن رہا۔ نہ صرف یہ کہ فسادات کی رپورٹنگ بے کم و کاست کی گئی بلکہ فسادات کے محرکات و عوامل کی نشاندہی میں بھی غیر جانبداری سے کام لیا گیا۔ یہ حقیقت پریس کے ذریعے ہی اُجاگر ہوئی کہ ان فسادات کے پیچھے مذہبی تعصب سے زیادہ سیاسی مہم جوئی کا دخل تھا اور اس وقت بھی جب پورا ملک نفرت اور تشدد کی آگ میں جل رہا تھا، بعض لوگ اس آگ پر اپنی اپنی روٹیاں سینکنے میں لگے رہے۔

ہمارا یہ یقین ہے کہ ہندستانی تہذیب کی اساس بقائے باہم کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں صدیوں سے ایسے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے آئے ہیں جو الگ الگ مذہبوں کے ماننے والے ہیں، الگ الگ زبانیں بولتے ہیں اور جغرافیائی اور موسمی اثرات کے تحت جن کے رسم رواج، رہن سہن کے طریقے، خوراک ــــ اور پوشاک میں یک رنگی کی بجائے رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ یہ رنگا رنگی ہماری تہذیب کا عیب نہیں حسن ہے اور اس حسن کو تبھی قائم رکھا جا سکتا ہے جب ہم کسی رنگ کو دوسرے رنگ سے بُرا نہ سمجھیں، رد نہ کریں۔

کثرت میں وحدت کی تلاش ہمارے صوفی سنتوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ اس عمل کی جلوہ نمائی ہماری شاعری، مصوری، موسیقی اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ماضی میں ہمارے عوام اپنے حکمرانوں کے محکوم ضرور تھے لیکن وہ اپنی اخلاقی روحانی رہنمائی کے لیے ان کی طرف نہیں ان صوفیوں، سنتوں اور فنکاروں کی طرف دیکھتے تھے جو ان کی روزمرّہ کی زندگی میں ان کے شریک اور ان کے دُکھ درد سے واقف تھے ــــ حالیہ نفرت اور تشدد کی بھی سب سے زیادہ سرگرم مزاحمت ادب اور صحافت کے علاوہ زندگی کے دوسرے ثقافتی شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد ہی کی طرف سے ہوئی ہے اور یہ اس طرف ایک ــــ واضح اشارہ ہے کہ ہماری تہذیبی میراث کے اصلی وارث کون ہیں!

ــــــــ آدارہ

دو ہندی نظمیں

ذیل میں ہم ہندی کی دو نظمیں شائع کر رہے ہیں۔ یہ دونوں نظمیں ہندی کے مشہور اخباروں میں شائع ہوکر ہندی کے قارئین میں گفتگو کا موضوع بن چکی ہیں۔ پہلے جناب دیوی پرشاد مشر کی نظم شائع ہوئی تھی ــ جنابِ چندر بھان خیاؔل کی نظم اسی کے ردِّ عمل کے طور پر کہی گئی ــــــ ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین بھی ان نظموں کا مطالعہ دلچسپی سے کریں گے۔ ــــــ ادارہ

(۱)

دیوی پرشاد مشر

مسلمان

کہتے ہیں وے ویپتی کی طرح آئے
کہتے ہیں وے پردوشن کی طرح پھیلے
وے ویادھی تھے
براہمن کہتے تھے وے ملیچھ تھے
وے مسلمان تھے
انھوں نے اپنے گھوڑے سندھو میں اُتارے
اور پکارتے رہے ہندو، ہندو، ہندو
بڑی جاتی کو انھوں نے بڑا نام دیا
ندی کا نام دیا
وے ہر گہری اور اویرل ندی کو
پار کرنا چاہتے تھے

وے مسلمان تھے لیکن وے بھی
یدی کبیر کی سمجھداری کا سہارا لیا جائے تو
ہندوؤں کی طرح پیدا ہوتے تھے
اُن کے پاس بڑی بڑی کہانیاں تھیں
چلنے کی ٹھہرنے کی پلٹنے کی
اور مرتیو کی
پرتی پکش کے خون میں گھٹنوں تک ــــــ
وے ڈوبے ہوتے تھے
اور اپنے خون میں کندھوں تک ــــــ
وے ڈوبے ہوتے تھے
اُن کی مٹھیوں میں گھوڑوں کی لگامیں
اور میانوں میں سبھیتا کے
نقشے ہوتے تھے
نہ مرتیو کے لیے نہیں
وے مرتیو کے لیے یُدھ نہیں لڑتے تھے
وے مسلمان تھے

وے فارس سے آئے
توران سے آئے
سمرقند، فرغانہ، سیستان سے آئے
وے ترکستان سے آئے
وے بہت دُور سے آئے
پھر بھی وے پرتھوی کے کچھ حصّوں سے آئے
وے آئے کیوں کہ وے آسکتے تھے
وے مسلمان تھے
وے مسلمان تھے کہ یا خدا اُن کی شکلیں
آدمیوں سے ملتی تھیں ہوبہو
ہوبہو
وہ بہت وپورن اپرواسی تھے
کیوں کہ اُن کے پاس خود کی اسمرتیاں تھیں
وے گھوڑوں کے ساتھ سوتے تھے
اور چٹانوں پر ویریہ بکھیر دیتے تھے
نرمان کے لیے وے بے چین تھے
وے مسلمان تھے
یدی سچ کو سچ کی طرح کہا جاسکتا ہے
تو سچ کو سچ کی طرح سُنا جانا چاہیے
کہ وے پرایہ اِس طرح ہوتے تھے
کہ پرایہ پتہ ہی نہیں لگتا تھا
کہ وے مسلمان تھے یا نہیں تھے
وے مسلمان تھے
وے نہ ہوتے تو لکھنؤ نہ ہوتا
آدھا الٰہ آباد نہ ہوتا
محرابیں نہ ہوتیں گنبد نہ ہوتا
آداب نہ ہوتا
میر مخدوم مومن نہ ہوتے شبانہ نہ ہوتی
وے نہ ہوتے تو اپ مہادیپ کے سنگیت کو سُننے والا خسرو نہ ہوتا
وے نہ ہوتے تو پورے دیش کے غصّے سے بے چین ہونے والا کبیر نہ ہوتا
وے نہ ہوتے
تو بھارتیہ براِدیپ کے دکھ کو کہنے والا غالب نہ ہوتا
مسلمان نہ ہوتے تو اٹھارہ سو ستاون نہ ہوتا
وے تھے تو چچا حسن تھے
وے تھے تو پتنگوں سے رنگین ہوتے آسمان تھے
وے مسلمان تھے
وے مسلمان تھے اور ہندوستان میں تھے
اور اُن کے رشتے دار پاکستان میں تھے
وے سوچتے تھے کہ کاش، ایک بار وے پاکستان جاسکتے
وے سوچتے تھے اور سوچ کر ڈرتے تھے
عمران خاں کو دیکھ کر وے خوش ہوتے تھے
وے خوش ہوتے تھے اور خوش ہو کر ڈرتے تھے
وے جتنا پی۔اے۔سی کے سپاہی سے ڈرتے تھے
اتنا ہی رام سے
وے مرادآباد سے ڈرتے تھے وے میرٹھ سے ڈرتے تھے
وے بھاگلپور سے ڈرتے تھے وے اکڑتے تھے لیکن ڈرتے تھے
وے پوتر رنگوں سے ڈرتے تھے
وے اپنے مسلمان ہونے سے ڈرتے تھے
وے فلسطینی نہیں تھے لیکن وے اپنے گھر کو لیکر گھر میں دیش کو لیکر
دیش میں خود کو لیکر آشوستھ نہیں تھے
وے اکھڑا اکھڑا راگ دیش تھے
وے مسلمان تھے
وے کپڑے بُنتے تھے
وے کپڑے سیتے تھے
وے تالے بناتے تھے
وے بکسے بناتے تھے
اُن کے شرم کی آوازیں
پورے شہر میں گونجتی رہتی تھیں
وے شہر سے باہر رہتے تھے
وے مسلمان تھے لیکن دمشق اُن کا شہر نہیں تھا
وے مسلمان تھے لیکن عرب کا پیٹرول اُن کا نہیں تھا
وے دجلہ کا نہیں، یمنا کا پانی پیتے تھے

وے مسلمان تھے
وے مسلمان تھے اس لیے نیچ کہلاتے تھے
وے مسلمان تھے اس لیے کچھ کہتے تھے تو ہچکتے تھے
دیش کے زیادہ تر اخبار یہ کہتے تھے
کہ مسلمانوں کے کارن ہی کرفیو لگتے ہیں
کرفیو لگتے تھے اور ایک کے بعد دوسرے حادثے کی
خبریں آتی تھیں
اُن کی عورتیں
بنا دہاڑ مارے پچھاڑیں کھاتی تھیں
بچّے دیواروں سے چپکے رہتے تھے
وے مسلمان تھے

وے مسلمان تھے اس لیے
زنگ لگے تالوں کی طرح کھلتے نہیں تھے
وے اگر پانچ بار نماز پڑھتے تھے
تو اس سے کئی گنا زیادہ بار
سر پٹکتے تھے
وے مسلمان تھے
وے پوچھنا چاہتے تھے کہ اس لال قلعے کا ہم کیا کریں
وے پوچھنا چاہتے تھے کہ اس ہمایوں کے مقبرے کا ہم کیا کریں
ہم کیا کریں اس مسجد کا جس کا نام
قوت الاسلام ہے
اسلام کی طاقت ہے
ادرک کی طرح وے بہت کڑوے تھے
وے مسلمان تھے
وے سوچتے تھے کہ کہیں اور چلے جائیں
لیکن نہیں جا سکتے تھے
وے سوچتے تھے یہیں رہ جائیں
تو نہیں رہ سکتے تھے
وے آدھا ذبح بکرے کی طرح تکلیف کے جھٹکے محسوس کرتے تھے
وے مسلمان تھے اس لیے
طوفان میں پھنسے جہاز کے مسافروں کی طرح
ایک دوسرے کو بھینچے رہتے تھے
کچھ لوگ یہ بحث چلاتے تھے کہ
انھیں پھینکا جائے تو
کس سمندر میں پھینکا جائے
بحث یہ بھی تھی کہ
انھیں دیش سے نکالا جائے تو
کس دیش میں بھیجا جائے
بحث یہ تھی
کہ انھیں دھکیلا جائے
تو کس پہاڑ سے دھکیلا جائے
وے مسلمان تھے لیکن چینٹیاں نہیں تھے
وے مسلمان تھے وے چوزے نہیں تھے
ساودھان ــــ سندھو کے دکھشن میں
سینکڑوں سالوں کی ناگرکتا کے بعد وے
مٹی کے ڈھیلے نہیں تھے
وے چٹان اور اُن کی طرح سچے تھے
وے سندھو اور ہندکش کی طرح سچے تھے
سچ کو جس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہو
اُس طرح وے سچ تھے
وے سبھیتا کا انیوارییہ نیَم تھے
وے مسلمان تھے افواہ نہیں تھے

وے مسلمان تھے
وے مسلمان تھے
وے مسلمان تھے

(۲)

چندر بھان خیالؔ

ہاں! وے مسلمان ہیں

ہاں، وے مسلمان تھے
ہم جیسے انسان تھے

لیکن ان کے سینوں میں قرآن تھا
اور ہاتھوں میں تلوار
یقیناً وے پکارتے ہوں گے ہندو! ہندو!! ہندو!!!
ہند کے باسیوں کو
وے ہندو ہی کہہ سکتے تھے

اور ہند کے باسی
یعنی بڑے نام والی نامور جات
بائیں بازو کی طاقت سے بے خبر
دائیں ہاتھ میں ترازو لیے
اپنا نفع نقصان تول رہی تھی
نیچ 'اچھوت' اناریہ ایندھن پر
کھول رہا تھا
برہمن واد کا کڑھاہا
اور تلی جا رہی تھیں
ستّا اور سہولت کی پوڑیاں

پوڑیاں کھانے کے شوقین
برہمن
انھیں ملیچھ کہہ سکتے تھے
پوڑیاں کھانے کا شوق اور بنانے کا فن
انھیں نربیات نہیں ہوا تھا
لیکن
اُن کے دلوں میں صفائی تھی
وے ایمان کی تازگی لے کر نکلے تھے
تبھی تو
دشت کیا چیز ہے
دریا بھی انھوں نے نہیں چھوڑے
جہاں چاہا اُتار دیے اپنے گھوڑے

حملہ آور تو حملہ آور ہوتے ہیں
گھر لوٹا اور چلتے بنے
جیسے انگریز آئے اور نکل بھاگے
وے کیسے حملہ آور تھے؟
لوٹنے آئے اور لٹنے والوں کے ہو کر رہ گئے
صرف تلوار کے نہیں
وے وچار کے دھنی بھی تھے
جیسے خواجہ معین الدین چشتی
وچار ہی زندہ ہے

ہاں! وے مسلمان تھے
ٹھیک کہتے ہو
وے آسمان سے نہیں اُترے تھے
لیکن آسمانی دھوپ لے کر آئے تھے
وے مساوات، مساوات چلّاتے آئے تھے
نیا انقلاب لائے تھے
وے یقیناً یہیں کہیں دور سے آئے تھے
اور آریوں کی طرح ہی آئے تھے

فرق بس اتنا تھا
آریوں نے کھدیڑا تھا اناریوں کو
وندھیاچل کے اُس پار تک
جو بچے رہ گئے تھے وے سیوک بنائے گئے
یعنی بھنگی، چمار، نائی، دھوبی وغیرہ وغیرہ
لیکن وے مسلمان تھے
اہلِ قرآن تھے
انھوں نے مسلمان بنائے
اپنی عبادت گاہوں میں لے آئے
بھنگی جب سیّد کے ساتھ مسجد میں بیٹھا ہوگا
ذرا سوچ کر دیکھو کیا سوچا ہوگا؟

تم کہتے ہو وے مسلمان تھے

وے درحقیقت مسلمان ہیں
اتہاس کے گلہاروں ہیں، ماضی کے بازاروں ہیں
تاکنے جھانکنے سے فائدہ!
وے مسلمان ہیں
اور ہماری طرح ورتمان ہیں
وے مسائل زدہ انسان ہیں
انھیں ماضی میں زندہ رکھنے کی خواہش
زخموں پر نمک لگا کر جگانے کی کاوش
بیداری نہیں خون کے آنسو لائے گی

ننگے سچ کو
لفظوں کا لباس دینے سے کیا ہوگا
تم ٹھیک کہتے ہو
سچ کو سچ کی طرح سنا جائے
تو سنو

مسلمان نہ ہوتے تو
قبیلوں، ورنوں، طبقوں اور جاتیوں کے جنگل میں
تنفر کی آگ لگی ہوتی
جنگل جل چکا ہوتا
پھر آرکشن کی دھوپ میں کیسے سینکتے
آرکشن کا ورودھ کون کرتا
جمہوریت کی مینا کہاں چہچہاتی
سمتا، سنتولن، سماج سدھار شبد کوش میں دھرے رہتے

اینٹ پتھر کی عمارتیں کوئی بھی بنا سکتا ہے
شہر بستے ہی رہتے ہیں
وے نہ ہوتے تو بہت کچھ نہ ہوتا
یا کچھ نہ کچھ ہوتا
وے ہیں تو دقت کیا ہے؟
وے مسلمان ہیں

وے رتھ یا گھوڑے پر سوار آتنک نہیں

وے رام سے نہیں ڈرتے
لیکن ڈرتے ہیں رام نام کے سوداگروں سے
وے مارکس سے نہیں ڈرتے
لیکن ڈرتے ہیں مارکس کے نافہم پیروکاروں سے
وے واقعی نہیں ڈرتے
لیکن ڈرتے ہیں
حکمِ الٰہی میں ملاوٹ کرنے والے مُلّاؤں سے

وے تیرنا جانتے ہیں لیکن
ندی کنارے بیٹھنے پر مجبور ہیں
اُن کے صرف رشتے دار ہیں پاکستان میں
سرحد پار سے آئے ہوؤں کو ٹٹولیے
جنم بھومی کی اہمیت کیا ہے
اجودھیا سے زیادہ وے کراچی میں جیتے ہیں

ہاں! وے مسلمان ہیں
دو سو برس تک انگریزوں سے لڑتے رہے
انھوں نے پاکستان بنایا
وے پاکستان کے خلاف جنگ میں شہید ہوئے
وے مسلمان ہیں
ان کے پُرکھوں کی ہڈیاں یہیں دفن ہیں
وے کہیں سے نہیں آئے
وے کہیں نہیں گئے
وے کہیں نہیں جائیں گے
وے پاکستان سمیت پھر آئیں گے
کیوں کہ وے مسلمان ہیں
وے اہلِ ہندوستان ہیں

گرین ہاؤس

جوگندر پال

۲۰۴، منداکنی انکلیو، کالکاجی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

یُو۔ این۔ او کے ڈپٹی سیکریٹری جنرل کے اس نجی سن ڈاؤنر سے مولو اب گھر لوٹنا چاہ رہا تھا مگر اُس نے اتنی پی لی تھی کہ اُسے ڈر تھا، اٹھا تو لڑکھڑانے لگوں گا۔

آسٹریلین لاکر اُس کی خواہش اور خوف بھانپ کر ہنسنے لگا۔ "پر جب نشے کا یہ عالم ہو تو گھٹنوں کو سیدھا ہی کیوں کیا جائے ؟"

لاکر سے مولو نے پوچھنا چاہا کہ یہ کیا نام ہوا، لاکر ؟ ___ اور خود ہی جواب بھی دینا چاہا ___ اچھا، اپنے جرائم پیشہ باپ دادا کی یاد میں اب بھی تمھارا مُنہ بند ہے ___ مگر اپنے سامنے ہی بیٹھے امریکی فارن آفس کے ایک سینئر آفیشل کو پاکر وہ اُسی پر ٹوٹ پڑا۔ "مسٹر لاکر، کیا تم ہماری امریکی سرکار کی کسی حالیہ بدحواسی پر تبصرہ کر رہے ہو ؟"

"کیا مطلب ؟" امریکی آفیشل کے کان اتنے کھڑے ہوگئے کہ وہ اپنے کان ہی کان نظر آنے لگا۔

"مطلب یہ، کہ جب سے روسیوں نے تائب ہوکر کان پکڑ لیے ہیں، وائٹ ہاؤس نشے میں اپنی دو ٹانگوں پر کھڑا ہی نہیں ہو پا رہا ___ تم یہی کہنا چاہ رہے تھے نا مسٹر لاکر ؟" مولو نے اپنی بات سے محظوظ ہوکر سٹیورڈ سے ایک اور وہسکی طلب کی۔ "ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں، مائی ڈیئر بلیک برڈ ؟" اُس نے امریکی آفیشل سے پوچھا "امریکی سرکار ذرا دم لینے کے لیے چپ چاپ بیٹھی رہے ؟"

لاکر نے شاید وہسکی کا گھونٹ بھرنے کے لیے مُنہ کھولا تھا مگر وہ بول اُٹھا "امریکی کا تو خاصہ ہے کہ دم لینا ہو تو اور تیز چلنے لگتا ہے۔"

"میں بھی تو امریکی ہوں،" مولو نے اُسے جواب دیا۔ "میں تو دم لینے کے لیے دم ہی لیتا ہوں۔"

"اسی لیے وہ امریکی سیاست دان ___ کیا نام ہے اُس کا ؟ ___ وہ تمھاری امریکیت کو مشکوک قرار دیتا ہے۔" لاکر کو نشے میں زبان کو ڈھیلا چھوڑ دینا بڑا خوشگوار لگ رہا تھا۔ "وہ تمھاری ساری صحافتی سلطنت خریدنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔"

"سنو، مسٹر لاکر۔" مولو پل بھر بے چین سا ہوکر وہی مول چند دھرم چند نظر آنے لگا جو کوئی ڈیڑھ ایک دہا پہلے کینیا کی آزادی پر وہاں اپنا سارا بزنس بیچ کر یو۔ ایس۔ اے میں آبسا تھا۔ "سنو، سودا اگر واقعی پٹ گیا تو تم دیکھو گے تمھارا وہ گھاگ سیاست دان ہی سرتاپا بک جائے گا۔" اُسے گویا اپنا یہ بیان بھی ناکافی لگا۔ "میرا مطلب ہے، بشرطیکہ مَیں نے اُسے خریدنا چاہا ___"

مولو نے ایک ہی ڈیک میں اپنی ساری وہسکی حلق سے اُتار لی تو آپ ہی آپ پُرسکون ہوکر مُسکرانے لگا۔

بلیک برڈ کے کان بھی ڈھیلے ہوکر نیچے لٹک آئے اور وہ ہنس کر کہنے لگا "اگر تم میری تنخواہ کی دُگنی رقم دینے پر تیار ہو مولو تو مجھے ہی کیوں نہیں خرید لیتے ؟"

"دُگنی تنخواہ پر کیوں ؟"

"ہیٹی کہتی ہے۔" بلیک برڈ بدستور ہنستے ہوئے اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا جو پیٹ سے سیر ہوکر کھا کر مُنہ ہلائے جا رہی تھی۔ "اگر تم دُگنی تنخواہ نہ لائے تو تمھیں طلاق دے دوں گی۔"

"طلاق کے جھنجھٹ میں کیوں پڑتی ہو ہیٹی ڈارلنگ ؟" مولو نے بلیک برڈ کی بیوی کو مشورہ دیا۔ "دُگنی تنخواہ کے لیے دو خاوند کر لو۔"

ہیٹی اور بلیک برڈ نے سب سے اونچا قہقہہ لگایا۔

"اپنی بیوی کو ساتھ کیوں نہیں لائے نائٹ بوائے ؟" ہیٹی مولو سے پوچھنے لگی۔

"کیسے لاتا ؟ عین وقت پر اُس کے ایک دانت میں درد جاگ پڑا۔ گھریلو نسخوں سے بات

بننے میں نہ آئی تو میں نے ڈاکٹر کو فون کیا،" مولو نے سٹیورڈ کو ایک اور وہسکی کا اشارہ کیا۔ "میں اُسے ڈاکٹر کے گھر چھوڑ کر یہاں چلا آیا ہوں۔"

"خوبصورت عورتوں کو رات کے وقت جوان ڈاکٹروں کے گھر نہیں چھوڑنا چاہیے۔" ہیٹی اپنے پرس سے شیشہ نکال کر ہونٹوں پر لپ سٹک کی تہہ جمانے لگی۔

"خوبصورت عورتوں کی ترجیح اگر یہی ہو۔" مولو ایک عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ اور اُس کی بیوی ایک دوسرے کے لیے یک جہتی کو دہرا دہرا کر ازحد بور ہو چکے ہیں۔ "تو ہمارے امریکی قانون کے تحت شوہروں کو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انھیں انھی کی ترجیحوں پر چھوڑ دیں اور اپنی ترجیحیں دریافت کریں۔"

جواباً ہیٹی نے اپنے بال جھٹک کر کچھ اس طرح آنکھیں مٹکائیں گویا کہہ رہی ہو "میں تو تمھارے سامنے بیٹھی ہوں مگر مجھے دریافت کرنے کے لیے تم نامعلوم کہاں بھٹک رہے ہو۔" "تمھیں گھر جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ کیا پتہ، ڈینٹسٹ اُسے ساری رات علاج کے لیے وہیں روکے رکھے؟"

"مگر تم یہ کیوں سمجھتی ہو ہٹل گرل، کہ گھر لوٹ کر ہم واقعی گھر جا پہنچتے ہیں؟"

"تو پھر کہاں جا پہنچتے ہیں؟" ہیٹی کا خیال تھا کہ انجان پن کے میک اپ سے عورت کی جنسی کشش میں ڈھیروں اضافہ ہو جاتا ہے۔

"کیا پتہ، کہاں؟" اگر ہیٹی کا شوہر وہاں موجود نہ ہوتا تو مولو ہیٹی کے قریب سرک کر اپنا سر اُس کے سینے پر ٹکا لیتا۔ "برڈی!" اُس نے ہیٹی کے شوہر کو مخاطب کیا۔ "اگر میں واقعی تمھیں خریدنا چاہوں تو کتنے پیسے لو گے؟" اور پھر اپنے سوال کے جواب کا انتظار کیے بغیر اُس نے ہیٹی کی طرف مُنہ پھیر لیا۔ "ہاں، ہیٹی ڈیئر، کیا پتہ، کہاں؟"

لیکن مولو کے ذہن میں اپنے گھر کا تصور صرف اُسی ایک گھر سے بندھا ہوا تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا ـــــ ہمالیہ کے کوہستانی سلسلے سے کچھ ہی فاصلے پر اُس چھوٹے سے میدانی شہر سیالکوٹ میں ایک چھوٹا سا نہایت پرانا مکان، جو اتنا پرانا تھا کہ اتنے سالوں کی دوری سے بھی مولو کو ویسے ہی صاف دکھائی دیتا تھا، اور اتنا پکا، کہ ابھی تک اُس کے دل و دماغ میں جُوں کا تُوں کھڑا تھا۔ سیالکوٹ میں وہ کبھی گھر پہنچنے سے لیٹ ہو جاتا تو یہاں ٹرنکوں والے بازار سے اُس جینیوں کی گلی میں سے ڈگ بھرتے ہوئے وہ وہاں اُس پُل پر آ پہنچتا اور پھر وہاں سے دوڑتے ہوئے ایک ہی سانس میں مندر کے پڑوس میں اپنے گھر کے دروازے کے سامنے۔

"بھابو جی!"

وہ گلا پھاڑ کر ماں کو آواز دیتا اور اُس کی باولی ماں گویا اپنے بھیتر اُسی کو ڈھونڈ رہی ہوتی اور اُس کی آواز سنتے ہی بے اختیار اندر سے وارد ہو کر اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیتی۔ "تو کدھر نکل گیا سیں، مولو؟" بچپن میں بھی مول چند کو سب مولو ہی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ "کہہ کے جایا کر، پُترا۔"

"یا پھر، ہیٹی،" مولو نے اچانک ہیٹی کی طرف مُنہ اُٹھا کر کہا۔ "گھر وہ ہوتا ہے جہاں ہمارا انتظار کیا جاتا ہے۔"

بلیک برڈ نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "کس سے مخاطب ہو مولو؟ میری بیوی کو تو اُس کی ایک دوست لے گئی ہے ـــــ کہاں؟ ـــــ یہیں کہیں کسی دلچسپ آدمی سے ملانے ــــ۔"

"دلچسپ آدمی!" مولو نے مُنہ میں بڑبڑا کر وہاں سے ایک بار پھر اُٹھنے کا ارادہ کیا لیکن لڑکھڑا سا گیا اور پھر بیٹھ گیا۔

"تمھارا گھر بہت دُور ہے مولو۔ کیا تمھیں یقین ہے، بہ حفاظت پہنچ جاؤ گے؟" سنگلین لاکر نے مولو سے بھی زیادہ چڑھا رکھی تھی لیکن وہ کسی عادی مجرم کی طرح بڑا پُرسکون اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

"فکر مت کرو، لاکر۔" بلیک برڈ بولا۔ "ہماری امریکی کاریں نہایت قابلِ اعتماد ہیں۔"

"کیا وہ تمھاری شـ[illegible] نہیں پیتیں؟" روسی سفیر ایک جرمن امریکی فائر آرمز ڈیلر کے بازو میں بازو ڈالے کسی عرب ریپبلک کے نمائندے کے ساتھ ایک بینک [illegible] ہوا۔

"نہیں، وہ ہماری مقدس مادرِ وطن کا تیل پیتی ہیں۔" عرب جمہوریہ کا نمائندہ سب کی طرف دادِ طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ وہیں بیٹھ گیا۔

"میں سمجھا تھا ایکسیلینسی، تم دعویٰ کرو گے تمھاری مقدس مادرِ وطن کا دودھ پیتی ہیں۔" مولو کے ہاتھ [illegible] جواب دینے لگتے تو اس کا ذہن تن جاتا۔ وہ سوچنے لگا، "بہت ہی اچھا ہو جو آدمی کا اُٹھنا بیٹھنا ـــــ اُس کی مانند ٹریفیکنگ صرف اُس کے ذہن میں ہو، اُس کے سارے کام یہیں انجام پاتے رہیں۔"

اُسے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے پا کر سبھی اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں دراصل ہند چینی بھارت کے اُن رشتوں کے بارے میں سوچنے لگا تھا تو

ایک بار کسی درخت کے نیچے کچی مٹی پر سمادھی لگا لیتے تھے تو مٹی میں اتنے مگن ہو جاتے تھے کہ اُن کے وجود پر درخت اُگ آتے مگر وہ اندر ہی اندر متواتر دھڑکتے رہتے تھے اور اُن کے وجود میں ساری کائنات سمٹ آتی تھی اور ــــ"

"خدا کے لیے، مولو!" جرمن امریکی کارخانے دار نے مولو کو ٹوکا۔ "ہم تمھارا یہ آرٹیکل کل تمھارے 'گڈ اولڈ' 'آل ورلڈ' میں پڑھ لیں گے۔ اِس وقت صرف باتیں کرو، صرف مُنہ ہلاؤ۔"

"اِس میں کیا مشکل ہے؟" مولو نے جرمن امریکی کو کھانے کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "پیٹ بھرتے جاؤ، مُنہ ہلتا رہے گا۔"

"اِس سے میرا کام بہت مشکل ہو جائے گا۔"

اِسی گروہ کے ایک کونے میں عالمی ادارے کے فوڈ فار آل پروگرام کا باس بھی چُپکے سے آ بیٹھا تھا۔

"ہاں، مائی ڈیئر مولو، اگر ہم نے اِتنا کھانا شروع کر دیا،" جرمن امریکی نے اشیائے خوردنی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ "تو تمھارے ہندستان بھیجنے کے لیے کیا بچے گا؟"

"فائر آرمز، مائی ڈیئر ڈیلر ان ڈیتھ!"

سبھوں کے قہقہے کسی بم کے مانند پھوٹ پڑے، جس سے آس پاس کے لوگ انھیں تجسّس سے دیکھنے لگے۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی ــ"

فوڈ فار آل پروگرام کا باس کہنے لگا۔ "جب ہندستان اور پاکستان کے پاس پیٹ بھر کھانا بھی نہیں تو وہ کیسے بچانے کے لیے اپنا سارا پیسہ ڈیفنس پر خرچ کر دیتے ہیں؟"

"اور کیسے؟ اپنی بھوک اور ــ"

"اور خدا کو ــ ہے نا؟"

"ہاں، ہندستانی ہو یا پاکستانی، خدا کو بھی اپنے سامان میں باندھ کر پناہ کی تلاش میں دُنیا بھر میں مارا مارا گھوم رہا ہے۔"

"خدا کو بھی کیوں؟"

"خدا کے بغیر اُس کی لڑنے جھگڑنے کی خواہش کیونکر پوری ہوگی؟"

سب ہنس دیے۔

"ہنسنے کی بات نہیں۔ گھر میں آگ لگی ہو ــ"

"کون لگاتا ہے آگ ــ؟"

"گھر میں آگ لگی ہو،" بولنے والے نے ذہن میں بکھرتے ہوئے جملے کو جلدی سے ازسرِنو یکجا کیا۔ "تو ہر شخص عافیت کے لیے باہر کی طرف دوڑتا ہے ــ"

"عافیت! ــ مائی فُٹ!" جرمن امریکی اُنھیں بتانے لگا۔ "میرے بھائی نے جرمنی سے لکھا ہے کہ وہاں بیسیوں مشکوک اڈوں پر ایک ایک کمرے میں ایک ایک درجن ایشیائی بیمار مویشیوں کی طرح فرش پر اُوپر تلے پڑے رہتے ہیں اور پولیس ویزا چیک کرنے کے لیے چھاپہ مارتی ہے تو وہ دہائی دینے لگتے ہیں، ہماری کھال کھینچ لو، جان لے لو، پر ہمیں واپس گھر مت بھیجو ــ"

"تعجّب ہے ــ! اُن کے بیوی بچے ــ"

"بیوی بچوں کو بھی یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ گھر نہ لوٹ آئیں۔"

"تعجّب ہے ــ!"

"اِس میں تعجّب کی کیا بات ہے؟ اگر وہ گھر لوٹ جائیں تو اُنھیں پردیس سے پیسہ کون بھیجے گا ــ ہے کیوں، مولو ــ؟"

"اوہ، شٹ اَپ!" مولو اُسے بڑی موٹی گالی بکنا چاہتا تھا، مگر اُسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ اپنے بوڑھے ماں باپ اور جوان بہن کو پیچھے چھوڑ کر پہلے پہل کینیا آ نکلا تھا۔ اُن دنوں اُن کے یہاں اُس کے بابا کا دور کا ایک رشتے دار آیا ہوا تھا جس نے کینیا میں اپنی گروسری سے لاکھوں کی دولت پیدا کر رکھی تھی۔ گروسر نے اُس کی بی۔ اے کی تھرڈ کلاس کی ڈگری پر ریجھ کر اُسے بہلا پھسلا کے کینیا چلنے پر آمادہ کر لیا تھا، تاکہ وہاں پہنچ کر وہ اُس کی لڑکی سے شادی کر لے۔

کینیا میں مولو کی دُلہن ایک دن اُسے اپنے باپ کی گروسری وین میں نیشنل پارک لے گئی جہاں میلوں کے احاطے میں جنگلی جانور کھلے بندوں گھومتے پھرتے تھے۔ اُس روز کا ایک منظر مولو گویا اِس وقت اِس کُن ڈائنر میں بعینہٖ دیکھ رہا ہو۔ ایک جنگلی بیل سر جھکائے گھاس پر مُنہ مار رہا ہے کہ اُس کی پشت سے اچانک ایک ٹائیگر اُس پر چڑھ آیا ہے اور اُسے چیرنے پھاڑنے لگا ہے مگر بیل بدستور اپنی چار ٹانگوں پر کھڑا ہے اور مُنہ میں آئی گھاس کو تیز تیز چبانے لگا ہے کہ مرنے سے پہلے اِسے حلق سے اُتار لے ــ

وہ ساری رات مولو نے چُپکے چُپکے رو کر گزاری تھی اور اپنے ماں باپ اور بہن تینوں کو مخاطب کر کے ایک بڑی لمبی چٹھی لکھی تھی اور انھیں یقین دلایا تھا کہ وہ ہر مہینے تنخواہ کے دن گھر پہنچنے سے پہلے انھیں اپنی نصف تنخواہ کا منی آرڈر پوسٹ کر دیا کرے گا۔ اُس کے پہلے منی آرڈر کی وصولی پر بابا نے اُسے فوری طور پر مطلع کیا تھا کہ یہاں پوری خیریت ہے۔

ھارا منی آرڈر مل گیا ہے اور ہم نے سوچا ہے کہ
ے تین ماہ کے منی آرڈروں سے پہلا کام یہ
یں گے کہ سارے گھر کا فرش پکّا کروالیں ——
ھاری ماں اور بہن کچّے فرش کے لیپ پوت
ے عاجز آچکی ہیں اور ——

"شٹ اپ —!" مولو نے سر اُٹھا کر
ار آر مسز ڈیلر سے کہا مگر جب اُس جرمن امریکی
ے اُسے ہنستے ہوئے بتایا 'میں تو تم سے پوچھ رہا
وں بھائی' تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے، تو
س نے آواز لٹکا کر جواب دیا' آئی ایم سارِی
ی ڈیر مسٹر۔

"تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو؟"

"نہیں' میں نے بہت پی لی ہے۔" مولو
ے کہا" اِن حالات میں میرا نشہ اُس وقت کم
وتا ہے جب اور پیوں ——"

"اور —!" جرمن امریکی نے جھوم کر
ہا" شراب کا نشہ ہو' یا پاور کا' یا کوئی بھی'
س کا تدارک اِسی طور ممکن ہے — اور —!"
ر وہ سبھوں کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔" ہیرز
بیسج فرام آور گریٹ امیریکا ——
—! ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے' بس اور —!
س اُٹھاؤ دوستو اور اپنے اس امریکی دوست
خوشی کی خاطر ایک ہی ڈِبک میں سارا بچا کھچا
ر پی جاؤ ——"

سبھوں نے اپنے گلاس خالی کردیے
ر وسٹیورڈ بڑی خاموش مستعدی سے آگے
ھ کر اُن کے لیے اور شراب انڈیلنے لگے۔

مولو نے اپنے بھرے ہوئے گلاس پر
اہ ڈالی اور اُسے چھوئے بغیر کھڑا ہوگیا۔
ھینک یو' ایوری باڈی! باقی کی میں اب گھر
کے پیوں گا۔"

"یہیں کیوں نہیں؟ بلیک بَرڈ نے اُس سے پوچھا۔

"کیوں کہ اپنے مکان کی چار دیواری میں مجھے اپنا آپ بھروسے کے قابل معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی ایک جگہ ہے جہاں میں دُھت چین سے سو جاتا ہوں۔"

ہیٹی اِس وقت اُنھی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ مولو کا جملہ کان میں پڑنے پر وہ کہنے لگی۔ "مگر گھر میں سوؤ گے کس کے ساتھ' مولو؟ تمھاری بیوی تو اپنے ڈینٹسٹ کے پاس گئی ہوئی ہے۔"

"دی اولڈ بِچ!" مولو نے دل ہی دل میں کہا اور اُس کی طرف ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

بینکویٹ ہال میں ابھی وہ چند ہی قدم چلا تھا کہ ایک وِنگ سے اُسے سنائی دیا۔

"جامبو' بوانا مولو۔"

اُس نے دیکھا کہ کینیا کا ہائی کمشنر چند لوگوں میں سے اُٹھ کر اُسے سلام کہہ رہا ہے۔

"جامبو' ایکسیلینسی۔" اُسے معلوم تھا کہ افریقی اور ایشیائی ریپبلکوں کے سفیر شاہی اہتمام سے پکارے جانے پر جامے میں پھولے نہیں سماتے۔

"آؤ' ہمارے ساتھ نہیں بیٹھو گے' بوانا؟"

مولو نے سوچا کہ ترقّی پذیر ممالک کے نوکر شاہوں کی دعوت برسرِ راہ بھی قبول نہ کی جائے تو وہ اِسے اپنی توہین پر محمول کرلیتے ہیں۔

"ہاں' ہاں' کیوں نہیں' ایکسیلینسی؟" وہ لڑکھڑائے بغیر اپنا آپ لڑکھڑاتے محسوس کرکے اِس گروپ میں آبیٹھا اور ایک نیگرو سٹیورڈ اُس کے سامنے گلاس رکھ کر شراب انڈیلنے لگا۔ نیگرو کے جھکے ہوئے سر کے بالوں کے چھلے دیکھ کر مولو کو لگا کہ وہ اپنے کینیا کے گھر میں بیٹھا ہوا ہے اور اُس کا کالا نوکر اُس کا گلاس بھر رہا ہے۔

کینیا کی بیس بائیس سالہ زندگی بھی گروسر کے داماد نے راجہ بن کر بتائی تھی —— ہندستان سے وہاں آئے ابھی اُسے دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ چند کالوں نے اُس کے اکلوتے سالے کو قتل کردیا۔ اُس کا سالا نصف شب کو کیبرا دیکھ کر نشے کی حالت میں گھر لوٹ رہا تھا کہ لٹیروں نے اُس کی گاڑی رکوا کر اُسے ڈرائیور کی سیٹ پر ہی ختم کردیا اور اُس کا بٹوا' گھڑی' انگوٹھی —— جو کچھ بھی اُن کے ہاتھ آیا —— لے کر چمپت ہوگئے۔ اُس کا رنڈوا سسر بھی اپنے بیٹے کے غم میں چند ہی ماہ میں اُس کے پیچھے ہولیا۔ پھر جب بڈّھے کے وکیل نے اُسے کُل جائداد کی تفصیلات سے آگاہ کیا تو اُس نے اپنی زندگی کو نئے سرے سے پلان کرنے کی ٹھان لی۔ اُس نے اپنی اچھّی خاصی سرکاری نوکری چھوڑ دی۔ بڈّھا اِتنا کچھ چھوڑ گیا تھا کہ وہ کام وام کے بغیر بھی ٹھاٹ سے رہ سکتا تھا' تاہم بچّے کے سامنے کھلونوں کا ڈھیر لگا ہو تو وہ کب تک کھیلنے سے ہاتھ روکے رکھے گا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اُس نے گروسری سنبھال لی۔ اس کے علاوہ اپنے بعض پرانے انگریز افسروں کی باقاعدہ کمیشن طے کرکے وہ کئی سرکاری اداروں کو ٹھیکے پر متفرق ضروریات سپلائی کرنے لگا۔ جوں جوں اُس کا کام بڑھتا چلا گیا وہ سارے ایسٹ افریقہ میں نئے

طرز پر گروسری کی ایک لمبی طلائی زنجیر بنانے میں جٹ گیا اور اتنی دولت پیدا کرلی کہ کوئی ایک دہائی میں اُس کا شمار ملک کے نصف درجن مالدار ترین اشخاص میں ہونے لگا۔

اُس کے ماں باپ؟ —— اب اُسے اتنی فرصت کہاں رہی تھی کہ اُن کی یاد میں گھلتا رہے۔ پہلے پہل تو اُس نے کئی بار انھیں لکھا کہ وہ بھی اُسی کے پاس آجائیں، لیکن بوڑھا بوڑھیا اُڑ گئے کہ وہ اِس عمر میں سمندروں پار اپنا مردہ کہاں خراب کریں گے، وہ یہیں اپنے سیالکوٹ کے گھر میں اُس کی طرف مُنہ اور من کر کے ٹھنڈی ہوائیں محسوس کر لیا کریں گے۔ چنانچہ وہ دونوں اُس کی ٹھنڈی ہوائیں محسوس کر کر کے سلگتے رہے اور وہ ان کے ماہانہ الاؤنس میں اُن کی شفقت و دُعا کے صلے کی رقم بھی جوڑ کر انھیں اُس وقت تک پیسے بھیجتا رہا جب تک اُسے پتہ نہ چلا کہ اُس کے پیسے چند ماہ سے اُن کی بجائے نہ جانے کون وصول کرتا رہا ہے۔ انھیں مرے کبھی کے آدھے سال سے بھی اوپر ہو لیا تھا۔

اُن کی موت کی اطلاع پاکر اُس شام کو وہ اپنے بنگلے کے ٹیرس پر تنہا آبیٹھا تھا اور جانی واکر کے پیگ پے درپے چڑھاتے ہوئے اپنے دل میں ماں باپ کی جلتی ہوئی ارتھیوں پر نگاہ جمائے ہوئے تھا اور اُس کا رونا نہیں نکل رہا تھا، شاید اِس لیے کہ وہاں کوئی نہ تھا جو اُس کی ڈھارس بندھاتا —— اُس کی بیوی؟ —— نہیں، وہ اُس کی ڈھارس کیسے بندھاتی۔ بانجھ لجاوتی کی کوکھ میں کینسر کا ٹیومر اُگ آیا تھا اور اُس کے پیٹ میں چار سُو پھیل رہا تھا۔ اُسے تو خود آپ ڈھارس کی ضرورت تھی جسے پورا کرنے کے لیے مولو نے چوبیس گھنٹوں میں آٹھ آٹھ گھنٹوں کے لیے تین تربیت یافتہ نرسیں لگا رکھی تھیں —— اُس کے بچے؟ —— نہیں، اُس کے کوئی اولاد نہ تھی جس کی توتلی آنکھوں میں کھوکر اُسے اپنی ٹوہ کھوہ ہونے لگتی۔

جلتی ہوئی ارتھیوں پر بدستور ٹکٹکی باندھے اُس نے ایک اور پیگ ہونٹوں سے لگا لیا اور جب شراب اپنا رستہ چیر کر اُس کے معدے میں اُتر رہی تھی تو چاند آسمان سے اُس کے سر میں سماتے جا رہا تھا۔۔ چاند؟ —— جب کینیا آنے کے لیے سیالکوٹ سے اُس کی گاڑی روانہ ہوئی تھی تو چاند اُس کے ساتھ ساتھ دوڑے چلا آرہا تھا —— مولو! —— نہ جاؤ مولو —— ! اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ —— مولو —— !مو —— ! —— او شٹ اَپ —— اِشٹ اَپ —— !تھوڑے ہی فاصلے پر ٹیرس کی لفٹ کے قریب افریقی بیرے مؤدب کھڑے انتظار کر رہے تھے کہ بوانا کو کب بے ہوش ہوا اور کب وہ اُسے سٹریچر میں ڈال کر اُس کے بیڈ روم میں پہنچا دیں —

”بوانا —— ؟“

”او شٹ اَپ —— !“ مولو نے نشے میں ہڑبڑا کر کہا، اور یہ دیکھ کر کہ اُس سے تو کینیا کا ہائی کمشنر ہمکلام ہے اُسے تاسف ہوا ——

”آئی ایم ساری، ایکسیلینسی۔ میں دراصل اپنے آپ کو ڈانٹ رہا تھا۔“ مولو نے سٹیورڈ کو اشارہ کیا کہ اُس کے لیے وہسکی لائے۔

”کامن ویلتھ کے ملکوں کو یہ ایک برٹش دین ہے۔“ برٹش وائس کونسل واٹس بھی وہاں موجود تھا۔ ”کہ اپنے آپ کو ڈانٹ کر وہ اپنی اصلاح کرتے رہیں۔“

”چہ خوب!“ مولو نے سارے گروپ پر نظر دوڑا کر کہا۔ ”یہاں تو ہیڈ ماسٹر کی نگرانی میں پوری کامن ویلتھ کلاس روم میں موجود ہے۔ انڈیا، پاکستان، یوگنڈا، کینیا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ ——“ اُس نے اوب کر خود کو باقیوں کی طرف دیکھنے سے روک لیا۔ ”کیا وکٹوریہ راج کی برکتوں پر کوئی سبق جاری ہے مسٹر واٹس؟“

”مسٹر مولو پیکنگ کو ائٹ لائیک ہم سیلف!“ واٹس نے کہا۔ ”ہم سب تمھیں مس کر رہے تھے۔“

واٹس کے لہجے میں سفید جھنڈا پاکر مولو نے اپنا انداز بھلا کر لینا چاہا۔ ”مسٹر واٹس، آئی وِش آئی ہیڈ ناٹ ری ناؤنسڈ مائی برٹش سٹی زن شپ —— !“

”تم اگر درخواست دینا چاہو۔“ برٹش وائس کونسل نے اُسے جواب دیا۔ ”تو ہم پھر سے تمھاری برٹش سٹی زن شپ پر غور کرسکتے ہیں۔“

”تم برٹش لوگ اتنا غرور مت کیا کرو مسٹر واٹس۔“ وہسکی کا گلاس ہاتھ میں لے کر مولو خود کو روک نہ پایا۔

”کیا مطلب؟“

مولو وہسکی کا گھونٹ بھرنے کے لیے ذرا رک گیا۔ ”اب یہی دیکھو مسٹر واٹس، تمھارے گریٹ برٹین نے کینیا کے برٹش پاسپورٹ ہولڈروں کی برٹش شہریت تو قبول کرلی مگر بڑے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ لوگ اپنی برٹش شہریت کے باوجود آپ کے ملک میں رہ نہیں سکتے ——“

”وطن کی محبّت کا تقاضہ تو یہ تھا —— مسٹر مولو“ ہندستان کا سفیر کمود پوچھنے لگا۔

"کہ تم بھارت ہی لوٹ جاتے۔ آخر تم یہاں امریکہ کیوں چلے آئے ہو؟"

"وطن کی محبت کا تقاضہ پورا کرنے، مسٹر — مسٹر کموڈ۔" کموڈ سے بات کرتے ہوئے مولو کو ہمیشہ کموڈ کی 'ڈی' پر زور ڈالنے کی ترغیب رہتی۔ "میرا مطلب ہے اسّی کروڑ کی آبادی میں ایک اور نفس کا اضافہ کیوں ہو؟"

"اسّی کروڑ!" نیوزی لینڈر جن استعجاب میں اپنی آواز کو پھیلاتا ہی چلا گیا۔ "کیا انڈیا کی عورتیں بارہ مہینے حاملہ رہتی ہیں مسٹر کموڈ؟"

"ہاں، مسٹر جن۔" کموڈ کی بجائے مولو نے اُسے جواب دیا۔

"ہندستانی مغربیوں سے اسی مانند اپنے بدلے چکاتے ہیں۔ آپ لوگ کہیں بھی مریں، وہ آپ کو اپنے ملک میں پیدا کر لیتے ہیں —"

"ری آلی!" جن گھبرا کر اپنی ساری جن ایک دم پی گیا۔ "یہ بڑے بَل! مجھے کسی ہندستانی گھر میں پیدا ہونا پڑ جائے تو میں پیدائش پر ہی رو رو کر جان دے دوں۔"

"مگر ہم ہندستانی ساری زندگی روتے رہتے ہیں، پھر بھی ہماری جان نہیں نکلتی۔"

"مگر ہم امریکیوں کو ہندستانیوں میں شمار نہیں کرتے مسٹر مولو۔" کموڈ کو مولو پر غصہ آگیا۔

"مسٹر کموڈ، کیا مجھے پاکستانی سمجھ کر مجھ سے ناراض ہو گئے ہو؟"

پاکستانی سفارت کار نے کموڈ کے گلے میں اپنا بازو ڈال دیا۔ "میری اور کموڈ کی دوستی پر شک کی گنجائش روا رکھ کے تم ہم دونوں سے ظلم برت رہے ہو مولو۔"

"یہی تو سارے سکینڈل کی بنا ہے علی۔"

مولو کی پاکستانی سفیر سے بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ "اشخاص ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور انھی اشخاص کی سرکاریں شاید اُن کی محبت کے باعث ایک دوسرے سے نفرت۔"

"بس اگر کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے۔" پاکستانی سفیر نے کہا۔ "تو ہمارے درمیان اور کوئی تنازعہ ہے ہی نہیں۔"

"مگر کشمیر ہندستان کا انٹیگرل پارٹ ہے۔" کموڈ بولا۔

"نہیں، کشمیر پاکستان کی مذہبی اور تہذیبی کُل میں واقع ہے۔" علی نے فوراً جواب دیا۔

"نہیں —!"

"نہیں —!"

اسی دوران یو۔این۔او میں آسٹریلیا کا نمائندہ سب کو بتانے لگا۔ "چند سال پہلے اپنے سڈنی میں ایک کشمیری میرا شریک کار تھا۔ اُس نے ہماری آسٹریلین شہریت اختیار کر رکھی تھی۔ ایک دن میں نے اُس سے پوچھا، کیوں مسٹر ظہیر الدین، یہاں آنے سے پہلے تم کہاں تھے، ہندستان میں، یا پاکستان میں —؟ پتہ نہیں، کہاں —؟ اُس نے جواب دیا — دنگوں سے جان بچانے کے لیے نامعلوم میں کہاں بھاگا پھرتا تھا مسٹر ڈاوزر۔ مجھے تو یہاں آسٹریلیا پہنچ کر پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ میں اپنے ہی وجود میں ہوں —"

ہندستان اور پاکستان کے سفارت کار ابھی تک اپنے چہروں کے یکساں خدوخال سے برآمد ہوتے ہوئے ہونٹوں کو اتنی یکساں وسعت میں کھوئے ہوئے تھے گویا محب و محبوب ہوں۔

"نہیں —!"

"نہیں —!"

گریٹ برٹین کے والٹس نے نہایت سفارت کارانہ صناعی سے بات کا رخ موسم کی خرابی کی طرف موڑ دیا۔ "یہاں کی سردی بڑی خشک ہے مگر ہمارے گریٹ برٹین کی سردی اپنے گیلے پن کے باعث ہمیں بہت عزیز ہے۔"

مولو شاید بور ہونے لگا تھا۔ "کیا آپ لوگ اسی لیے نہانے سے بہت گھبراتے ہیں؟"

جب سب لوگ ہنس رہے تھے تو کینیا کا ہائی کمشنر مولو سے اور قریب سرک آیا۔ "ہنر میری سمجھ میں نہیں آتا مولو! تم نے ہمارا کینیا کیوں چھوڑ دیا؟"

جواب میں مولو صرف مسکرا دیا۔

کینیا کی آزادی سے چند سال پہلے ہی اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ حارث کیسا پلٹا کھانے والے ہیں۔ چنانچہ اُس نے اپنی گروسری کی طلائی زنجیر کاٹنا اور جائداد بیچنا اور دھیرے دھیرے اپنا سارا پیسہ امریکہ بھیجنا شروع کر دیا تھا حتیٰ کہ آزادی کے آس پاس وہاں اُس کے اکاؤنٹ میں لاکھوں ڈالر جمع ہو گئے جب اُس نے امریکہ روانہ ہونے کا طے کر لیا تو آزاد کینیا کی لیجسلیٹو کونسل کے ایک افریقی رکن نے اُس سے پوچھا، جب ہندستان کو آزادی ملی تو تم یہاں بھاگ آئے اور اب ہمیں ملی ہے تو تم امریکہ بھاگ رہے ہو۔ کیا تم وہاں نہیں رہ سکتے جہاں آقائیت کے اسباب نہ رہیں —؟

"شاید تم پوچھنا چاہ رہے ہو جوناثین وہاں کیوں نہیں رہتا جہاں آقائیت کے اسباب پیچیدہ ہونے لگتے ہیں۔" مولو نے اُسے ہنس کر جواب دیا اور سوچنے لگا، میں اِسے کیا بتاؤں؟ اس لیے کہ پناہ گاہیں بدلے بغیر میری بھی

آقاییت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، جیسے یں نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنے پیسیروں پر کھڑا کیا ہے۔

"بوانا موانگی۔" تھوڑے توقف کے بعد اُس نے آزاد کینیا کی پارلیمنٹ کے رُکن کو دوبارہ مخاطب کرکے کہا۔ "جس اکثریت کی سرکار کو تم بذریعہ اور برائے اکثریت قرار دے کر خوش ہوتے ہو، ذرا اس کا چیر پھاڑ تو کرکے دیکھو۔ جمہوری انتخابات میں ڈھول بجانے والوں کو نہ گنیں تو انتخاب کرنے والے بھی وہی ہوتے ہیں اور منتخب بھی وہی ——"

"مگر بوانا ——"

"نہیں، بوانا، تمہاری سواحلی میں ایک کہاوت ہے: بومڑ اپنی چار ٹانگوں پر اس لیے سیدھا نظر آتا ہے کہ اُس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ اِسی بومڑ کا دوسرا نام جمہوریت ہے۔"

"بومڑ وومڑ کو خارج کرکے سیدھی بات کرو۔"

"سیدھی بات یہ ہے جمہوریت میں بھی سارے لوگ چند ایک کی حکمرانی میں ہی بسر کرتے ہیں۔"

"مجھے یقین ہے بوانا، امریکی تمہاری یہ نان سنس پسند نہیں کریں گے۔"

"اور مجھے یقین ہے بوانا موانگی، اِٹ شُوڈ میک پرفیکٹ سنس ٹُو دا امیریکنز —— خیر۔" گروسری کے دھندے نے مولو کو باتوں کا اتنا دھنی بنا دیا تھا کہ وہ تسلسل توڑے بغیر بات سے بات پیدا کر لیتا۔ "جمہوریت کا یہ غیر اخلاقی پہلو اگر تمھیں ناپسند ہے تو آؤ، اس کا اخلاقی پہلو بھی دیکھ لو۔ یہاں بھی پہلا درس یہی ہے کہ آدرشِ جمہوریہ اقلیت کو ٹالنے کا مجاز نہیں —— ہہ ہا ہہ ——! جیسے بھی کہہ لو، کلیدی لفظ وہی ہے —— واحد —— فردِ واحد ——! سو جمہوریت کی تعریف یوں ہونی چاہیے ——"

مولو اپنے لفظوں کو ترتیب میں بٹھانے کے لیے ذرا رُک گیا۔ "سرکار بہ رشتۂ اقلیت، برائے اقلیت —— اینڈ آف کورس —— بذریعہ اقلیت ——! ہوئی ہے نا بوانا؟"

کینیا کی آزادی کے چند ماہ بعد مولو وہیں رُکا رہا، کہ اُس کی بیوی کے دم کا بھروسہ نہ تھا۔ اُس نے کئی بار ڈاکٹر سے مشورہ بھی کیا کہ کیا مَرسی کِلنگ مناسب نہ رہے گا مگر اِسی اثنا میں خدا نے آپ ہی اپنی مَرسی کے دروازے کھول دیے۔ مولو نے پوری ہندو رسومات کے ساتھ مرحومہ کے دھوئیں کو بیکنٹھ کی طرف اُڑانے کا اہتمام کیا اور خود آپ کینیا کی آزادی کا پہلا جشن خوب دھوم دھام سے منا کر امریکہ اُڑ آنے کے لیے ہوائی جہاز میں آ بیٹھا۔ راستے میں چاند اُس کے جہاز کے ساتھ ساتھ دور تک دوڑتا رہا —— مولو ——! مولو ——! شاید وہ اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گیا اور —— اور ——

وہ سیالکوٹ میں اپنے ماں باپ کے کچے آنگن میں چاندنی میں اپنے سائے سے کھیل رہا ہے —— مولو ——! اُسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی ہے —— اب اندر آکے سو جاؤ بیٹا! —— نہیں ماں، مجھے نیند نہیں آرہی —— مولو ——! اُس کے باپ نے اُسے ڈانٹ کر بلایا ہے —— چلو، اندر آؤ ——! آیا، بابا ——!

مولو ہڑبڑا کر اپنی ہوائی جہاز کی سیٹ میں جاگ پڑا —— مولو ——! دوڑتے دوڑتے چاند کی سانس پھول گئی تھی مگر وہ ابھی تک ویسے ہی اُس کے پیچھے چلا آرہا تھا —— مولو ——! یہاں سے بھی آگے جا رہے ہو مولو؟ وہاں تمہارا کون ہے ——؟ آؤ مولو، میں تمھیں بابا اور ماں کے پاس لے چلتا ہوں —— آؤ ——! مولو کی آنکھیں پھر مُندنے لگیں۔

سو جاؤ مولو۔ بہت کھیل لیے ہو —— آؤ، آکے سو جاؤ —— مولو ——! آیا ماں ——

وہ اپنے پہلے گھر کے کچے آنگن سے کوٹھری میں داخل ہو رہا ہے اور چاندنی بھی دبے پاؤں اُس کے پیچھے چلی آرہی ہے اور چند قدم میں ہی اُس کے آگے ہو کے اُس کی چارپائی پر اُچھل آئی ہے اور وہ اُسے یہاں بھی پاکر کھِلکھلا کر ہنس پڑا ہے —— دیکھو، مولو کی ماں، تمہارا باؤلا بیٹا آپ ہی آپ ہنسے جا رہا ہے —— سو جاؤ، بیٹے! سویرے اسکول جانا ہے —— ہاں، بابا ——! چادر میں چاندنی کو بھی لے مولو نے مُنہ سر لپیٹ لیا ہے اور حسبِ معمول سات بار اوم کا جاپ کرنے کے لیے مُنہ کھول ہے مگر چھٹی بار نیند ہی نیند میں ایک اور نیند میں اُتر آیا ہے —— ماں ——! ماں —— ماں اور بابا کہاں کھو گئے ہیں؟ —— با —— ——! —— وہ انھیں بابے بیری کے میلے میں ڈھونڈ رہا ہے —— ماں ——! —— مولو بے اختیار رونے لگا ہے اور سارے میلے میں رو رو کر گھومتے ہوئے دونوں نیندوں کی سرحدوں سے باہر نکل آیا ہے۔

آنکھ کھُلنے پر بھی وہ اپنے معصوم گر سے کان نہیں ہٹا پایا۔

اور ——

مگر کینیا کا سفیر اُسے مخاطب کر کہہ رہا تھا۔ "اگلے ویک اینڈ کو میرا کینیا

جانے کا پروگرام تھا بوانا موبو، مگر میں نے اپنی روانگی صرف اِس لیے ملتوی کر دی ہے کہ تمھارے گریٹ گِبنز مرحوم کی برتھ ایپی ورسری کا گریٹ ڈنر بھی اُسی دن ہے۔"

"اِٹ اِز آور گریٹ پریویلج۔"

موبو گریٹ گِبنز مرحوم کا پروٹیجی بھی تھا اور اُس کی زندگی میں اُس کے "آل ورلڈ" کا پارٹنر بھی۔ گریٹ گِبنز کی بیوی یہاں امریکہ آنے سے بیشتر وہاں کینیا میں ہی ایک جرمن وائٹ ہائی لینڈر کی بیوی تھی اور وہاں موبو سے بھی اُس کا افیئر چلتا رہا تھا۔ اُسی کے ذریعے موبو کا گِبنز سے رابطہ پیدا ہوا تھا، جس کے بعد دو ایک سال میں ہی وہ اِتنے قریب آ گئے تھے کہ گِبنز نے اُسے اپنی صحافتی سلطنت میں برابر کا حصہ دار بنالیا تھا۔ گِبنز کو شراب کی اِتنی لت تھی کہ پیے بغیر ہوش میں نہ آتا تھا اور ڈاکٹروں کی باتوں میں آ کے کبھی پینے سے ہاتھ کھینچ لیتا تو بیٹھے بیٹھے بھی لڑکھڑا جاتا۔ اپنی بیوی کے مانند اُسے بھی موبو سے عشق تھا، شاید اِس لیے، کہ اُس کی ماں بھی ہندستانی تھی ـــــ نہیں ـــــ وہ فوراً اپنے آپ کو دُرست کر کے موبو کو بتاتا ـــ دراصل میرا باپ ہندستانی تھا۔ میرا مطلب ہے، میری ماں ہی میرا باپ تھی، کیوں کہ اُسی نے اپنی نہایت کڑی نگہداشت میں مجھے اونچا کیا ـــ گِبنز ہنسنے لگتا ـــــ میرے بگڑنے کا یہی سبب ہے کہ میری ماں مجھے لمحہ بھر بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھی۔ جب وہ مر گئی تو خود کو اُس کی نظر سے بندھا ہوا نہ پا کر میں بے روک ٹوک اپنے موجودہ جہنم کی طرف بڑھتا چلا آیا ـــــ

"تمھارا باپ ـــ؟"

"میرے امریکی باپ کو پیسہ کمانے سے فرصت ہی کہاں تھی؟ اُسے تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ میں اُس کا بیٹا ہوں یا اُس کے کسی پڑوسی کا ـــ اُسے چھوڑو موبو، تم مجھے اپنی ماں کے بارے میں کچھ بتاؤ ـــ نہیں، میری شراب میں پانی مت ملاؤ۔" گِبنز اُسے ٹوکتا۔ "موبو، ہندستانی ماؤں کے بارے میں میری لاعلمی مضحکہ خیز ہے۔ تم اپنی ماں کا کچھ ایسا خاکہ کھینچو کہ میں بھی اپنی ماں کو جاننے پہچاننے لگوں۔"

گِبنز اِس لیے پیتا تھا کہ ہوش میں رہے، اور موبو اِس لیے کہ ہوش کھو بیٹھے۔ کئی بار ایسے ہوا کہ شراب پی کر موبو خواہ آسمان کی طرف دیکھتا خواہ اپنے ذہن میں، دُھند ہی دُھند میں کہیں سے وہی چاند آ نمودار ہوتا ـــ آؤ گے نہیں، موبو ـــ؟ آؤ، ماں تمھاری راہ تک رہی ہے

"تم کہاں چلے گئے تھے موبو؟" گِبنز کی بیوی نے ایک دن اُس سے کہا تھا۔ "میں پچھلے دس دن سے تمھارا راستہ دیکھ رہی ہوں۔"

مگر نشے میں ہوش کھو کر وہ موبو کو اپنی ماں ہی معلوم ہو رہی تھی اور اُس کی گود میں سر رکھ کر اُس کا رونا تھمنے میں نہیں آ رہا تھا اور گِبنز کی بیوی نے جلدی جلدی اُس کے اور اپنے کپڑے اُتار کر اُسے اپنے ساتھ رضائی کی حدت میں لٹا لیا تھا اور اُس سے والہانہ پیار کرنے لگی، مگر موبو سسکیاں بھرتے ہوئے اپنے خواب میں ڈوبا جا رہا تھا ـــــ

"موبو، تمھارے گریٹ گِبنز کی دلچسپ گفتگو کی گونج ابھی تک ویسے ہی کانوں میں محسوس ہوتی ہے۔" نیوزی لینڈر، جو یہاں ایک مدت سے رہ رہا تھا، موبو کو مخاطب کر کے اُس کی توجہ طلب کر رہا تھا۔

"اِسی لیے ہمارے 'آل ورلڈ' نے اِس ڈنر میں ایک ایکٹر کی خدمات حاصل کی ہیں۔" موبو نے اُسے بتایا۔ "اُس ایکٹر کی باتیں سُن کر یہی لگتا ہے کہ گِبنز ہی راکٹ میں سوار ہو کر جہنم سے آ پہنچا ہے۔"

"کیا امریکی سرکار نے اپنی سپیس ٹیکنالوجی شیطان کو بھی بیچ دی ہے" پاکستانی سفارت کار سے نہ رہا گیا۔

"میں تو رائے دوں گا کہ جسے بھی ہماری سپیس ٹیکنالوجی حاصل کرنا ہے وہ شیطان سے غیر مشروط راہ و ربط پیدا کرے۔"

"نعوذ باللہ! ـــ" عرب ریپبلک کے نمائندے نے بے اختیار بہ آواز بلند کہا جیسے سُن کر موبو کو اچانک گھر لوٹنے کی خواہش ہونے لگی اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چیئریو، ایوری باڈی!"

چند ہی قدم پر ہال کے بیرونی دروازے پر میزبان اور اُس کی بیوی جانے والوں کو شب بخیر کہنے کے لیے کھڑے تھے۔

"میں تم سے بہت خفا ہوں موبو۔" پچھلے ماہ موبو نے اپنے "آل ورلڈ" میں پورے نصف صفحے پر ہوسٹس ڈالی کی تصویر شائع کی تھی جس باعث وہ اُس پر خاص مہربان تھی اور اُس سے بڑی بے تکلفی سے پیش آنے لگی تھی

"ڈالی ڈیئر، کل تک بھی اِسی طرح ناراض رہنا۔"

"کیوں؟"

"اِس وقت میں نشے میں ہوں۔" موبو نے اُسے جواب دیا۔ "اِس وقت کیسے بتا سکتا ہوں کہ خفا ہو کر تم واقعی زیادہ خوبصورت

لوم ہونے لگتی ہو۔"

"باؤ نائی!"

"ٹا ۔۔۔ ٹا!"

موبو آگے بڑھنے لگا تو اُس کی چال ڈھال دیکھ لی کا شوہر بولا۔ ٹھہرو موبو۔ نشے میں ہو تو ایک ٹ اور چڑھا جاؤ۔" وہ شاید 'آل ورلڈ' میں اپنے سن ڈاؤنر کے رائٹ اپ سے متعلق سوچ رہا تھا۔ ہوش آجائے گا:"

"ہوش آجائے گا مائی ڈیئر رولی ' تو ونسا خدا نظر آنے لگے گا۔" موبو آگے بڑھنے لگا رولی کے اشارے پر ایک سٹیورڈ اُس کے ساتھ لیا اور وہ گویا اُسی کے پیروں پر چل کر اپنی رے پاس آکھڑا ہوا۔

○

موبو کو گاڑی چلانے کا ہوش ہی کہاں تھا ؟ بس یہی سمجھ لیں کہ اُس کی گاڑی آپ ہی پ چلتی جا رہی تھی۔ اُس کی زندگی کی گاڑی بھی ں ہی چلتی آئی ' اسی لیے تو وہ سیالکوٹ کے ؤناں محلّے سے یہاں نیویارک آپہنچا ' ورنہ ی مرضی سے اُسے کہیں سے کہیں پہنچنا ہوتا تو لہ چاؤناں سے محلّہ دھارو وال سے آگے قدم رکھتا۔ دھارو وال میں ۔۔۔ کیا نام تھا اُس ۔۔۔ ؟ جبیں رہا کرتی تھی۔ ستارہ جبیں موبو پہلی محبوبہ تھی اور وہ اُسے ابھی تک اسی لیے نہیں بھول پا تھا یا پھر شاید اس لیے' کہ اسے اُس کا نام بہت سند تھا ' یا شاید چہرہ ۔۔۔۔ موبو کو اچانک ستارہ جبیں کا خیال آ گیا تھا اور وہ اُس کا ہرہ آنکھوں میں لانے کی کوشش کر رہا تھا گر ایک اُس چہرے کے سوا دنیا بھر کی عورتوں ے چہرے یکے بعد دیگرے اُس کے سامنے رہے تھے ۔۔۔ نہیں ' وہ اُس کی شکل بھولا تو نہیں تھا مگر ۔۔۔۔ اُس نے مُسکرا کر سر ہلا دیا ۔۔۔ مگر پتہ نہیں اُس کی کیا شکل تھی + بڑی بھلی شکل تھی ' اتنی بھلی ' کہ اُس نے جبیں کو بے جھجک بتا دیا تھا ' تم میرا آدرش ہو ' میرا سب کچھ نہیں ' جی ہی جی میں بتایا تھا۔ سچ مچ تو اُس نے اپنی ستارہ جبیں سے بات بھی نہ کی تھی۔ اُسے تو شاید معلوم ہی نہ تھا کہ موبو اُس سے محبّت کرتا ہے۔ موبو نے اپنی محبّت کو اپنی ذات کا ایک نہایت مقدّس راز سمجھ کر سینے سے لگائے رکھا ۔۔۔ موبو کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔۔۔ مقدّس راز ۔۔۔ !؟ عمر گنوا کر اُس پر کُھلا تو یہ تھا کہ محبّت ایک پبلک آفیئر ہے۔ جس سے بھی چاہو ' محبّت کرو ' مگر اُس کی اور اپنی سہولت کے مطابق کرو ' اور چاہنے والے بہت زیادہ ہوں تو صبر سے کام لے کے اپنی باری پر کر لو ۔۔۔ اور کیا ۔۔۔ ؟

موبو پر جو ہنسی کا دورہ پڑا تو اُس کی گاڑی ذرا غلط پہلو کی طرف کھینچ آئی اور مخالف سمت سے ایک برق رفتار کار کے ڈرائیور نے اپنے پھیپھڑوں سے آواز بلند کی ۔۔۔

"بلڈی فُول!"

مگر موبو کو اپنی ترنگ میں جو خواہش اُٹھی تو اُس نے یہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔

آئی ایم اے بلڈی فُول!

آئی ایم ۔۔۔ اے بلڈی فُول!

وہ اپنے سامنے سڑک پر نگاہ جمائے نامعلوم کہاں پہنچا ہوا تھا اور اُس کی گاڑی از خود اُڑی جا رہی تھی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ کر وہ گویا سٹیئرنگ ' تھراٹل یا سوئچ بورڈ کے مانند گاڑی کا ہی کوئی حصّہ بن جاتا ' گاڑی ہی بن جاتا ' اور اس پر بھی اپنے آپ کو سوچتے ہوئے پا کر اُسے تعجّب ہونے لگتا کہ گاڑیاں کیونکر سوچ سکتی ہیں۔ چند ہی روز پہلے اُس نے اپنے "آل ورلڈ" میں ہیومن آٹو موبیلز کے موضوع پر ایک مڈل میں اپنے قارئین کو یہ واقعہ سنایا تھا: پرسوں مَیں اپنی کار میں ڈیوک آف ایڈنبرا کی آمد پر اُس سے انٹرویو کرنے برٹش ایمبیسی جا رہا تھا۔ ایمبیسی سے تھوڑی ہی دُور میری کار اچانک پنکچر ہو گئی۔ ڈیوک آف ایڈنبرا سے میری اپوائنٹمنٹ کا وقت گزرا جا رہا تھا اور مجھے گاڑی کا پہیّہ تبدیل کرنے کے خیال سے اُلجھن ہو رہی تھی۔ پانچ سات منٹ گومگو میں ہی گزر گئے اور پھر مجھے ایک دم جیسے اپنی مشکل کا یہ حل سوجھا ۔۔۔ ارے ۔۔۔! دو سو گز کا فاصلہ ہی تو ہے۔ پیدل ہی کیوں نہ چلا جائے ۔۔۔ ارے ہاں ۔۔۔! اس انکشاف پر خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں بھول ہی گیا تھا میرے ٹانگیں بھی ہیں ۔۔۔

آئی ایم اے بلڈی فُول!

مڈل یاد آنے پر موبو گویا اپنے سامنے "آل ورلڈ" کھولے ڈیوک آف ایڈنبرا سے اپنا انٹرویو پڑھنے لگا تھا۔

مجھے زرد رُو پا کر ڈیوک آف ایڈنبرا کو شاید خیال گزرا کہ آل ورلڈ نے اپنے جونیئر سٹاف میں سے کسی کو بھیج دیا ہے ' پھر بھی اُس نے ۔۔۔ جیسا کہ اُس کے تعلّق سے مشہور ہے ۔۔۔ خوش دلی سے کہا ' ہیلو! کیا نام ہے تمہارا ؟

"یوئر رائل ہائی نیس۔" میں تو سوچ کر ہی آیا تھا کہ مجھے اسی طرح انٹرویو کو شروع کرنا ہے۔ "ایک زمانہ تھا کہ لوگ مجھے بھی ڈیوک آف ایڈنبرا کہا کرتے تھے۔"

"مائی ا!" مجھے معلوم تھا کہ ڈیوک آف ایڈنبرا کی مزاج کی رگ اگر پھڑک اٹھے تو وہ اپنی لاگت پر بھی بولنے سے نہیں چوکتا۔ "کیا تمھاری بیوی بھی کہیں کوئی ملکہ ہے؟"

"ہاں، یوئر رائل ہائی نیس۔ آپ کے یہاں تو گروسر کی بیٹی کو پرائم منسٹر کے آفس تک ہی روک دیا جاتا ہے مگر ہمارے یہاں ایسٹ افریقہ میں ہندستانی گروسروں کی بیٹیاں ملکائیں قرار دی جاتی تھیں اور ہم ہندستانی درآمد شدہ بھوندو شوہر، آپ کے مانند ڈیوک۔"

ڈیوک آف ایڈنبرا کسی سکول بوائے کی معصومیت سے ہنسنے لگا تھا۔ "تو آؤ، اپنی اس کامن پرابلم سے ہی انٹرویو کا آغاز کریں۔"

"یوئر رائل ہائی نیس، اگر اپنی بیوی کی بجائے آپ حکمران ہوتے تو ـــــ"

میرا پورا جملہ ادا ہونے سے پہلے ہی ڈیوک نے جواب دیا۔ "تو میں اپنی ساری بے چارگی اور ڈیوک آف ایڈنبرا کا لقب فوری طور پر کوئین کو سونپ دیتا۔"

قہہ قہہ ہنستے ہوئے موہو کو محسوس ہوا کہ اس کی گاڑی کے پہیے سڑک کے ٹیڑھے میڑھے پتھروں پر اچھلنے لگے ہیں۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ اگر میں اپنی بیوی کے علاج میں اپنی دعائیں بھی شامل کر لیتا تو شاید ـــــ مگر وہ اپنے آپ کو بتانے لگا کہ کسی نے بھلا شیطان کو بھی دعائیں مانگتے دیکھا ہے۔ شیطان کی شہزادگی تو خدا کا مذاق اڑانے کے دم سے ہے۔ دعا کی صلاحیت کھو کر ہی تو وہ اتنے بڑے امریکی فورتھ اسٹیٹ کو اپنی ملکیت میں لا پایا ہے ـــــ مسٹر پریزیڈنٹ ـــــ اس نے ایک دفعہ اپنے ایک ایڈیٹوریل میں یو۔ ایس۔ اے کے صدر کو راست مخاطب کر کے متنبہ کیا تھا۔ یہ کیا تک ہوئی کہ جہاں تمھاری منطق جواب دے جاتی ہے وہاں تم کانگریس کو خدا کا واسطہ دینے لگتے ہو ـــــ؟ موہو اپنے واقف کاروں کو بتایا کرتا کہ مجھے جب بے منطق نیکیوں کی تحریک ہوتی ہے تو خواہ مخواہ خدا کو ڈسٹرب کرنے کی بجائے میں خوب شراب چڑھا کر اپنی گاڑی میں بے تحاشہ جنگلوں کی طرف ہو لیتا ہوں اور وہاں کسی ٹری ٹاپ ہالی ڈے ان کے محفوظ چبوتروں سے اس وقت تک چوپاؤں کی زندگی کے فطری اسباب کا مطالعہ کرتا ہوں جب تک میری سمجھ میں پوری طرح نہ آ جائے کہ سب سے بڑی نیکی کیونکر وہی ایک ہے جو ہر ذی جاں اپنے ساتھ برت پاتا ہے، اور نہ برت پائے تو کوئی اور اسی کی نیکی کو برت کر اسے ہڑپ کر جاتا ہے۔

"تم نیک انسان نہیں۔" اس کی کینیا کی ہندستانی بیوی اس سے لڑتے ہوئے اکثر کہا کرتی۔ "جب تم مجھے اپنی باہوں میں لیتے ہو تو میری کوکھ سکڑ کر بند ہو جاتی ہے اور میں تمھاری چوٹیں برداشت کیے جاتی ہوں اور بس ـــــ"

"سن آ، اے بچ! ـــــ موہو اپنی بیوی کو کوس رہا تھا کہ شاید اس کی گاڑی کے پہیوں تلے رات کا کوئی جانور آ گیا مگر نشے میں کسی کی چیخیں کہاں سنائی دیتی ہیں ـــــ ساری زندگی مجھ سے نفرت کرنے کے باوجود شکایت کرتی رہی کہ میں اس سے محبت نہیں کرتا۔

"تو کیا کرتا ہوں؟"

"دھندا ـــــ!"

موہو کی موجودہ سفید بیوی بھی اس سے یہی کہا کرتی ـــــ ڈارلنگ، جب تم میرے بدن پر اچھل کود میں مصروف ہوتے ہو تو مجھے لگتا ہے تمھارے کسی بیوٹی ٹل ایڈیٹوریل سے لطف اندوز ہو رہی ہوں اور بس ـــــ

سن آ، اے بچ ـــــ! اس نے اپنی اس بیوی کو بھی گالی بکی ـــــ میری بے مہر مباشرت کے باعث میرے بچے میرے خون میں ہی بوڑھے ہو کر رہ گئے ہیں اور میں اُن کا بلغم تھوکتا رہتا ہوں ـــــ اس نے شکر ادا کیا کہ اس کی اولاد پیدا ہونے سے رہ گئی، ورنہ پیدا ہوتے ہی کھانس کھانس کر اس سے مخاطب ہو کر کہتی ـــــ ڈیڈ! فرمانبردار باپ اپنی اولاد کے احکام کو تولتے نہیں، انھیں بجا لاتے ہیں ـــــ!

ہہ ہہ ہا ـــــ ہہ ہا ـــــ! موہو کی ہنسی روکے نہ رک رہی تھی، شاید وہ اپنے خون میں کھانستی اولاد کے کھوسٹ رویوں پر ہنسے جا رہا تھا، یا شاید یو۔ این۔ او کے ڈپٹی سیکریٹری کے سن ڈاؤنر میں اس بوڑھے ایشیائی پروفیسر رادھا سوامی پر، جس کی باتوں میں گھر کر تین چار حسیناؤں کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ فرار کی کیا صورت کریں۔ لڑکیوں کی بے چارگی کے منظر سے محظوظ ہو کر موہو بھی پروفیسر کے گھیرے میں جا داخل ہوا تھا۔

"بھوک خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے خوبصورت لڑکیو۔" ایشیائی پروفیسر کی نظر امریکی لڑکیوں کو چاٹ چاٹ کر کھا رہی تھی۔ "تمھارے امریکہ کا سب سے بڑا مسئلہ اس کا رچھاپن ہے۔ اسے بھوک ہی نہیں لگتی، مگر کوئی کھائے گا نہیں تو جیے گا کیسے؟ لہٰذا امریکہ موت کے خوف سے بے بھوک کھاتا رہتا ہے ـــــ"

"میں آپ کے کھانے کے لیے کچھ لاتی ہوں۔"

"نہیں" پروفیسر نے بولنے والی لڑکی کے کندھے کو مضبوطی سے تھام لیا "پہلے میں تمھیں ایک مہاراجہ کی کہانی سناتا ہوں۔ اس کہانی سے میری ساری بات واضح ہو جائے گی"۔

اسی دم بوڑھے پروفیسر کی نوجوان بیوی بھی اُسے ڈھونڈتی ہوئی آ پہنچی اور اُس کا آخری جملہ سُن کر بولی "تم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہی ہو لڑکیو۔ میرا شوہر اپنی بات کو کبھی واضح نہیں کر پائے گا۔ اُسے سن کر مجھے تو وہ کچھ بھی غیر واضح معلوم ہونے لگتا ہے جو پہلے بین واضح تھا"۔

"کیا واضح تھا؟" فلسفے کا پروفیسر اپنی بیوی سے پوچھنے لگا جو ماحولیاتی آلودگی کے انسداد پر تحقیق کے کام پر مامور تھی ———

"پولیوشن ؟"

"ہائی' مولو!" مسز رادھا سوامی مولو کو بھی وہیں پا کر کھل اٹھی۔ "مائی ڈیئر ہز بینڈ کو سمجھاؤ مولو' کہ پولیوشن صرف دھوئیں اور گیس سے نہیں ہوتی' بانونی لوگوں کے شور سے بھی پولیوشن بڑھ رہی ہے"۔

"میں نے تو سُنا ہے لاجی" مولو نے مسز رادھا سوامی کو جواب دیا "کہ آدمی کے برے خیال بھی سانس کے راستے ماحول میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں"۔

لاجی نے اُس کی طرف دیکھ کر کرشن کی گوپی سی بنے اپنی ساؤتھ انڈین پتلی کمر با کو بل دیا' گویا یہ کہنے کے لیے' کچھ بُرا بھلا سوچو تو جانوں بھی' مولو' نہیں تو کیا پتہ' کیا ؟

"کیا یہ سچ ہے"۔ حسیناؤں میں سے ایک نے سوال کیا "کہ ہماری پولیوشن سے ہماری دُنیا گرین ہاؤس میں منتقل ہوتی جا رہی ہے ؟"

"ہاں"۔ دوسری بولی "میں نے بھی پڑھا ہے کہ ہماری پولیوشن سے آسمان میں یہ جو گرین ہاؤس بن رہا ہے' کیا مجال' اِس کی دیواروں سے باہر کچھ جا پائے"۔

"مولو" مانو اچانک یاد آنے پر مسز رادھا سوامی رُک نہ سکی۔ "میں نے آج تمھارے "آل ورلڈ" میں پڑھا ہے کہ چاند کے پہلے ٹرپ کے لیے دھڑا دھڑ بکنگ کی جا رہی ہے ———"

مولو! ——— مولو! ——— مو ——— لو ——— !

مولو کی گاڑی ہوا سے باتیں کر رہی تھی کہ اُسے یک بیک چاند کی مانوس آواز سنائی دی جو آسمان سے اُتر کر اُس کی متصل نشست کی کھڑکی پر آ بیٹھا تھا ——— چلو' مولو' میں تمھیں لینے آیا ہوں ——— کہاں کیا ؟ آؤ! ———

مولو ——— !

مولو نے سوچ رکھا تھا کہ گھر پہنچنے سے پہلے وہ وہسکی نہیں پیے گا مگر اپنی خواہش سے مغلوب ہو کر اُس نے ڈرائیور کی سیٹ کے پہلو کے ایک تھیلے سے وہسکی کی بوتل نکالی اور ابھی اِسے کھول کر مُنہ سے بھی نہ لگا پایا تھا کہ اُس کی گاڑی سڑک کے کنارے اِس موڑ پر مڑتی ہوئی نیچے وادی میں لڑھک گئی۔

○

مولو بچ گیا تھا۔

اُسے اسپتال میں داخل ہوئے کوئی ہفتہ بھر ہو لیا تو ایک صبح ڈاکٹر نے اُس کے زخموں کے معائنے کے بعد تشفی میں سر ہلایا اور اُسے بتانے لگا۔ "جب تمھیں یہاں لایا گیا تھا مسٹر مولو' تو ہم دو ڈاکٹروں کی رائے میں تمھاری مکمل موت واقع ہو چکی تھی' مگر یہ کیا ہوا' کہ تم نے یکلخت آنکھیں کھول لیں"۔

"میں آنکھیں کیسے نہ کھولتا ڈاکٹر ——— ؟"

مولو اُسے بتانے لگا "میری روح واقعی اُڑان بھر چکی تھی' مگر کہاں جاتی ؟ ذرا سی اوپر گئی تو گرین ہاؤس کی چھت کے نیچے ہی پھڑ پھڑا کر رہ گئی' اور نجات کی کوئی راہ نہ پا کر اپنے جسد خاکی میں لوٹ آئی ———"

ہائیکو

س درجہ خراب ہوگیا ہوں
حباب میں بٹ رہا ہوں بے دام
ردو کی کتاب ہوگیا ہوں

س ہوبا مشین
ل ہرا اعتبار سے ہوتا نہیں کوئی
ئی ہے شبد ہین تو کوئی ہے ارتھ ہین

رہ پژمردہ اور ٹوٹے دنت
یے رام نام صبح و شام
شن موہن اب آگیا ہے انت

یسر طعن و طنز کے سہنے پڑے
لمبی نظم لکھ سکتے نہیں
ڑھے ہوکر ہائیکو کہنے پڑے

قابلِ قدر تو میرا پیغام ہے، مَیں نہیں
مَیں حقیقت میں ہوں نام سے ماورا
کرشن موہن کوئی میرا ہنام ہے، مَیں نہیں

اِس قدر تھا جاذبِ دل اُس کا حُسنِ بے مثال
اپنی پیرانہ سری کا بھی نہ آیا کچھ خیال
میں نے جب دیکھا اُسے تو دیکھتا ہی رہ گیا

میرا ہادی نہیں، میرا سالک نہیں
اِس سے میرا تعلّق ہے اِس نوع کا
دُکھ مرا داس ہے، میرا مالک نہیں

اِس لیے دُنیا مجھے ہے گھُورتی
وقت سے پہلے ہی مَیں
بن گیا ہوں بُورتی کی مُورتی

کرشن موہن

۱۵۸، پُشپانجلی، دہلی ۱۱۰۰۹۲

دوہے

○

دھرتی جس کا تخت ہے امبر جس کا تاج
کالی کملی اوڑھ کر سویا وہ مہاراج

○

بیتے جس کی چھاؤں میں جیون کے دن رات
اپنے من کی آس کا ٹوٹ گیا وہ پات

○

سارے سپنے لکڑیاں سب آشائیں گھاس
سچّے سچّے شبد میں لکھ جیون اتہاس

○

خشکی میں بھی پائے گا پانی تو نکال
سچ کی رسّی باندھ کر ڈول کنویں میں ڈال

○

لاکھ سپیرے پیٹ لیں اپنا اپنا ڈھول
ناگن کو جو لے گئے اُن کی بین امول

نذیر فتح پوری

دفتر اسباق، ۲/۲۱، پیتا پارک، پرود، پونہ ۔ ۔ ۔ ۔

معانی کی نیرنگیاں

صابر سنبھلی
شعبۂ اُردو، ایم۔ ایچ (پی۔ جی) کالج مرادآباد

زبان لفظوں کا خزانہ ہے، لیکن سب الفاظ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان کی نوعیتیں کئی حیثیتوں سے الگ الگ ہوتی ہیں۔ جیسے نرمی اور سختی کے لحاظ سے، دلکشی اور بھونڈے پن کے اعتبار سے، شیرینی اور تلخی و ترشی کے لحاظ سے اور تنوع اور وحدت کے لحاظ سے؛ لیکن یہاں الفاظ کی ان نوعیتوں سے بحث مقصود نہیں؛ بلکہ بعض الفاظ کے معانی کے تضاد کو دکھانا مقصود ہے۔

غلام ربّانی مرحوم لکھتے ہیں:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی زبان کے دو لفظ بالکل ہم معنی نہیں ہوتے۔ ایک لفظ کی موجودگی میں دوسرے لفظ کا پیدا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ زبان کو اس لفظ کی ضرورت تھی اور اس کے معنی میں ضرور کچھ فرق ہے۔" (الفاظ کا مزاج، شائع کردہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، طبع اوّل، ص ۱۸)

یہ بھی ایک الگ بحث ہے، لیکن اسی طرح یہ بھی ہے کہ الفاظ کی بڑی تعداد ایسی ہے جن کے صرف ایک ہی معنی نہیں ہوتے۔ اگر ہم ایسے الفاظ کو جمع کرنا چاہیں جو صرف ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہوں تو ہمیں اس میں دشواری پیش آئے گی اور اس کوشش کے نتیجے میں الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ بھی فراہم نہیں ہو سکے گا۔

یہ بھی ایک عام سی بات تھی۔ چونکا دینے والی بات تو یہ ہے کہ بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک سے زیادہ معنی میں استعمال تو ہوتے ہی ہیں؛ لیکن جن معانی میں استعمال ہوتے ہیں وہ یا تو ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں یا مفہوم کے اعتبار سے ایسے مخالف معلوم ہوتے ہیں جیسے رات اور دن کا فرق۔ ہر چند کہ ایسے الفاظ کی تعداد بہت کم ہے۔

اس مضمون میں ایسے ہی چند الفاظ اور اُن کے معانی پیش کیے جا رہے ہیں۔ تلاشِ بسیار کے بعد ایسے جو الفاظ ہم دست ہوئے ہیں اُن کی تعداد ایک درجن سے زیادہ نہیں ہے۔ لغات سے معنی نقل کرنے میں طوالت سے بچنے کی غرض سے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ صرف ضروری حصّوں یا اُن اجزا کو ہی نقل کیا جائے جن سے ہمارا مقصد پورا ہوتا ہے۔

۱۔ اجابت:

ترقی اُردو بورڈ، کراچی کی فرہنگ "اُردو لغت تاریخی اصول پر" (حصّہ اوّل ۱۹۷۷ء) میں اس لفظ کے معنی اس طرح لکھے ہیں:

"(دعا کی) مقبولیت، قبول کرنا یا ہونا...
.... مجازاً رفعِ حاجت۔"

فرہنگ آصفیہ حصّہ اوّل میں یہ معنی درج ہیں:

"منظوری۔ قبولیت (۳) دفعِ برا
ملین۔ پیخانہ یا دست۔"

فیروز اللغات میں بھی تقریباً یہی مع
ہیں۔ صاحبِ فرہنگِ عامرہ نے لکھا ہے:

"منظوری۔ پاخانہ۔"

جان ٹی پلیٹس نے اجابت کی تشریح
طرح کی ہے:

swering .... accepting
Petition or Prayer).....
proach.....Consent.......
tion of The bouels,
tion, Stool (Dast)

نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس لفظ کے مختلف
معانی کے درمیان دو معنی بہت اہم ہیں۔ د
کی مقبولیت اور براز۔ ایک مقدس تر اور د
نہایت مکروہ اور گھناؤنے۔ یہ ہے معنی کا ت
یا معنی کی اعجوبہ گری۔

۲۔ انجب:

آبِ حیات کی روایت کے مطابق یہ
لفظ ہے جس کو سیّد انشا نے "زیادہ نجیب
کے معنی میں نواب سعادت علی خاں والیِ اود
کی شان میں استعمال کیا تھا اور دوسرے ذ
معنی کی وجہ سے معتوب ہوئے۔ اس لفظ

انی لغات میں اس طرح درج ہیں:

"بہت شریف . ۱۔ دوغلا گھوڑا" (اُردو
ت تاریخی اصول پر جلد اوّل ۱۹۷۷ء)

(۱) بڑا شریف (۲) باندی بچّہ (فیروز اللغات'
ائع کردہ جے ۔ ایس ۔ سنت سنگھ اینڈ سنز دلّی۔
۱۹۹ء)

بہت شریف آدمی (خاندانی آدمی) اور
ندی بچّے میں کتنا فرق ہے ۔ اس کی تشریح ضروری
یں ۔

۔ بکسنا:

جان ٹی۔ پلیٹس کے مطابق اس کی اصل
سکرت لفظ विकसनीय ہے (جس کی
ندی میں رائج شکل विकास ہے یعنی
DEVOLOPMEN) اس لیے اس کے معنی
لنا یا شگفتہ ہونا تو قرین قیاس ہیں' لیکن یہ
ا عجیب لفظ ہے کہ اس کے دوسرے معنی
اکے بالکل خلاف ہیں ۔ لغات میں اس کے
درجۂ ذیل معنی کا اندراج ملتا ہے:

(۱) کِھلنا' کُھلنا' شگفتہ ہونا . . .
(۲) مُرجھانا' کُملانا' پژمردہ ہونا۔ (اُردو
ت تاریخی اصول پر' جلد دوم ۱۹۷۹ء)

(۱) کلی کِھلنا (۲) مسکرانا۔ تبسّم کرنا۔
م ہونا ۔ خوش ہونا ۔
(۳) کُملانا ۔ پژمردہ ہونا ۔ مُرجھانا۔ گلوں
رختوں کا افسردہ ہونا ۔ (فرہنگ آصفیہ
لد اوّل)

(۱) کلی کِھلنا ۔ کلی چٹکنا (۲) مسکرانا'
ش ہونا (۳) پژمردہ ہونا' کُملانا' مرجھانا
ز اللغات)

یعنی ایک طرف کِھلنا اور دوسری طرف
ھانا ۔ یہ بات کچھ کم عجیب نہیں ہے ۔ "کِھلنا"
معنی تو خیر قرین قیاس ہیں ۔ پژمردہ ہونے
کے معنی میں اس لفظ کو میر حسن نے بھی
مثنوی سحر البیان میں استعمال کیا ہے:

کلیجہ پکڑ ماں تو بس رہ گئی
کلی کی طرح سے بکس رہ گئی

۴ ۔ حرام:

یہ مشہور لفظ ایک طرف تو حلال کا
نقیض ہے دوسری طرف محترم جیسے متبرک
مہینے کے ساتھ تعظیماً لگایا جاتا ہے مسجد الحرام
بھی عام ہے ۔ لغات نے اس لفظ کی تشریح
اس طرح کی ہے:

نامناسب' ناشایستہ' ناروا' ممنوع . . . . .
حرمت والا' بزرگ' محترم' قابلِ تعظیم . . . . .
شرعی طور پر ناجائز' خلافِ شرع'
حلال کی ضد (اُردو لغت تاریخی اصول پر' جلد ۸)

ناروا' ناشایستہ' حرمت رکھا ہوا' احرام
باندھا ہوا ۔ (فرہنگِ عامرہ)

ناجائز' خلافِ شرع' حرمت' بزرگی'
بڑائی (جدید اُردو لغت' شائع کردہ رام نرائن
بینی مادھو الٰہ آباد)

گویا حرام کے کئی معنی ہیں اور وہ خیموں
میں بٹے ہوئے ہیں ۔ ایک طرف نامناسب'
ناشایستہ' ناروا' ممنوع' ناجائز' خلافِ
شرع' حلال کی ضد جیسے بُرے معنی ہیں تو دوسری
طرف حرمت والا' بزرگ' محترم' قابلِ تعظیم'
احرام باندھا ہوا' بزرگی اور بڑائی جیسے شریف
معنی بھی ہیں ۔ گویا معنی کے اعتبار سے یہ لفظ
بھی کم عجیب نہیں ۔

۵ ۔ حرم:

حرم کے دونوں متضاد معنی مشہور ہیں ۔
دیر و حرم کی ترکیب میں حرم سے کعبہ مراد لیا
جاتا ہے ۔ جو بہت شریف معنی ہیں اور عیاش
رئیسوں کے واقعات میں اس کے ذلیل معنی
مراد لیے جاتے ہیں ۔ لغات کے مطابق:

"خانۂ کعبہ اور اس کا احاطہ مراد ہے . . .
. . . . لونڈی' باندی' خادمہ . . ." (مہذب اللغات
جلد چہارم ۱۹۶۹ء)

"گھر میں ڈالی ہوئی باندی' وہ کنیز جس
سے محبّت کی ہو" (فرہنگ آصفیہ' جلد دوم)

1. "The Sacred, Circvit Round The Temple of Macca.........
2. A Female Slave who be comes a mistress, asbentmistress".
(New Hindustani English Dictionary S.W.Fallon)

معلوم ہوا کہ ایک معنی محترم ہیں اور
دوسرے ایسے ہیں جن کا مرتبہ سماج کی نظر
میں گرا ہوا ہے ۔

۶ ۔ حرمت:

اس کے معنی بھی حرم جیسے ہی ہیں ۔
زیادہ تفصیل میں نہ جا کر صرف دو تین
فرہنگوں کے اندراجات نقل کرنے پر ہی اکتفا
کیا جاتا ہے:

"عزّت' آبرو' بڑائی' عظمت
پاکیزگی . . . . . ناپاکی ۔" (اُردو لغت
تاریخی اصول پر جلد ۸)

خط کشیدہ یعنی پاکیزگی اور ناپاکی قابلِ
غور ہیں ۔

"عزّت ۔ حرام ہونا ۔" (لغات کشوری)
"عزّت' عزیز ہونا' حرام ہونا ۔" (جدید

اُردو لغت ۔ ناشر رام نرائن بینی مادھو' الٰہ آباد)

۷ ۔ سناٹا :

سناٹا اُن لوگوں کے لیے بڑا مزے دار اور دلچسپ لفظ ہے' جو معانی پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں ۔ "بکسنا" کی طرح اس کے بھی دونوں معنی ایک دوسرے کے قطعی نقیض ہیں ۔ لغات کے مطابق ۔

"حیرت' سکتے کا عالم' تحیّر' سنسان' ہُو کا عالم' ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ۔" (مہذب اللغات' جلد ششم ۱۹۶۹ء)

(۱) "دریا کے چڑھاؤ کا شور' زور کی ہوا یا بارش کی دور سے آنے والی آواز ۔

(۲) سنسان' ہُو کا عالم' خاموش' چُپ چاپ' شہر خموشاں کا عالم ۔" (فرہنگ آصفیہ' جلد سوم)

"Loud or violent Sound, rumbling noise, clatter (madeby wind and rain or hail and C. at a distance), howling(of the wind,(roaring roar (of waves or a conflagration)............ ...... Still, Scilent, Lonely, dreary ...." (Dictionary Platts.)

نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے معنی شور بھی ہیں اور خموشی بھی اور یہ سبھی جانتے ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے نقیض ہیں ۔ اس لحاظ سے یہ بھی ایک عجیب اور انوکھا لفظ ہے ۔

۸ ۔ شاہ :

ہر شخص جانتا ہے کہ شاہ راجا یا حاکم وقت کو کہتے ہیں ۔ دوسری طرف فقیروں کو بھی شاہ صاحب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں ۔ صرف ایک حوالہ کافی ہوگا :

"بادشاہ' سلطان ... فقیروں کا لقب ۔" (مہذب اللغات' جلد ہفتم ۱۹۷۰ء)

یعنی یہ لفظ ایک طرف دولت و ثروت کا ترجمان ہے تو دوسری طرف دلق و قدح کا ۔

۹ ۔ صلوات :

فرہنگ آصفیہ جلد سوم میں ہے :

(۱) "صلوٰۃ کی جمع ۔ خدائے تعالیٰ کی طرف سے درودیں' برکتیں' رحمتیں' مہربانیاں ۔

(۲) گالی ۔ بھوگ ۔ دشنام ۔ کلام نا ملائم ۔ لام کاف ۔"

(۱) اور (۲) ایک دوسرے کے نقیض ہیں ؛ لیکن (۱) معنی اُردو میں زیادہ مستعمل نہیں ہیں ۔

۱۰ ۔ علامہ :

ایک معنی تو مشہور ہیں یعنی وہ شخص جو علم و فضل میں یکتا یا انتخاب ہو لیکن دوسرے معنی معروف نہیں ۔ فرہنگ آصفیہ' جلد سوم کے ایک اندراج سے اس کے دونوں پہلو سامنے آجائیں گے ۔

"(۱) بہت جاننے والی عورت ۔ نہایت عالم عورت ۔ فاضلہ ۔

(۲) نہایت چالاک اور عیّارہ عورت .... مکّارہ عورت ۔ بدعورت ۔

(۳) نہایت دانا اور فاضل مرد ۔

(۴) نہایت چالاک اور عیّار مرد' مکّار آدمی ۔"

تبصرے کی ضرورت نہیں ۔ ایک عالم و فاضل کو اگر مکّار کہہ دیا جائے تو کیا اس کی توہین کا پہلو نہیں ہے؟ ہے اور ضرور ہے ۔ یہ ہے اس لفظ کے معنی کی نیرنگی ۔

۱۱ ۔ میمون :

اُردو میں مستعمل نہیں ہے' لیکن مسلمانوں میں لڑکیوں کے نام " میمونہ" رکھے جاتے ہیں ۔ اتفاق سے یہ لفظ عربی میں بھی ہے اور فارسی میں بھی ۔ عربی میمون کے معنی بہت اچھے ہیں اور فارسی میمون کے معنی ایسے ہیں کہ کوئی خود کو میمون کہلانا پسند نہیں کرے گا ۔ صرف دو فرہنگوں سے معانی نقل کیے جاتے ہیں :

"(۱) مجستہ ۔ مبارک ۔ بہرہ مند ۔ کامیاب ۔ اقبال مند ۔ مقصدور ۔ نیک بخت ۔ مسعود ۔ محمود ۔ بختاور ۔ بھاگوان ۔ خوش نصیب ۔ سرسبز ۔

(۲) بوزنہ ۔ بندر ۔ لنگور ۔ (فرہنگ آصفیہ جلد سوم)

"Fortunate, auspicious, Prosperous ....monky", (Dictionary-Duncon Forbes)

۱۲ ۔ ہار :

خالص اُردو کا لفظ ہے ۔ فرہنگ آصفیہ جلد چہارم میں اس کے معنی یوں لکھے ہیں :

(بقیہ صفحہ ۲۸ پر)

چہرہ

سلام بن رزاق

۹/۱۱، ایل۔ آئی۔ جی۔ کالونی، کرلا (ویسٹ) بمبئی ۷۰۰۰۰

اُسے پتا ہی نہ چلا کہ کب وہ ایک دردمند انسان سے تیز دھار دار ہتھیار میں تبدیل ہو گیا۔

پورا شہر فسادات کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ گھروں کو پھونکا اور دکانوں کو لوٹا جا رہا تھا۔ عبادت گاہوں کو تباہ و برباد کیا جا رہا تھا۔ انسانوں کو جانوروں کی طرح ذبح کیا جا رہا تھا۔ عورتوں کی عصمت دری کی جا رہی تھی اُن کی چھاتیاں کاٹی جا رہی تھیں، ان کی شرمگاہوں کو نیزوں سے چھیدا جا رہا تھا۔ ماؤں کے سامنے بچوں کی ٹانگیں چیری جا رہی تھیں اور پھر کسی وحشی شکاری کی طرح انھیں سلاخوں پر پرو کر آگ پر بھونا جا رہا تھا۔ غرض یہ کہ انسانیت اور شرافت کی دھجیاں اُڑ چلی تھیں اور تہذیب گلی گلی کوچہ کوچہ مُنہ چھپاتی پھر رہی تھی۔ ریڈیو اور ٹی وی کی خبریں، اخباروں کے تبصرے صبح و شام گشت کرتی افواہیں۔

اس سب کے بیچ اسے اپنا وجود ایک حقیر ذرّے سے بھی زیادہ بے معنی، بے حقیقت لگ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ ٹی۔ وی کی خبریں سُن کر کبھی وہ خوف و دہشت سے کانپنے لگتا۔ اور کبھی اخباروں کے اشتعال انگیز تبصرے پڑھ کر اس کی رگوں میں غصّے اور نفرت کی چنگاریاں سی بھر جائیں۔ کبھی اسے لگتا کہ ڈر کا شکنجہ اسے اس قدر کستا جا رہا ہے کہ وہ انسان کے بجائے ایک معمولی سے لجلجے کیچوے میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ اور کبھی کوئی خبر اسے اس قدر مشتعل کر دیتی کہ اسے محسوس ہوتا اس کے ناخن بڑھ رہے تھے، دانت باہر نکل آئے ہیں۔ اور اس کے جسم پر کسی گوریلا کی طرح لمبے اور گھنے بال اُگ آئے ہیں۔ تب وہ گھبرا کر آئینے میں اپنی صورت دیکھتا۔ مگر آئینے میں تو اس کی شکل ایک عام انسان جیسی ہی تھی۔ وہی ماتھا، آنکھیں، ناک اور ہونٹ۔ پھر اس کے اندر یہ کیسا وحشی پرورش پا رہا تھا۔

پچھلے دو تین ہفتوں سے وہ ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا تھا۔ رات ہوتے ہی فضا میں ایک ایسا پُر اسرار سناٹا چھا جاتا کہ خود اپنے سانسوں کی آمد و رفت بھی طبیعت پر گراں گزرتی تھی۔ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرتے اور باتیں کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک انجانا خوف جھانکتا رہتا۔ رات میں کامپوز کی ایک آدھ ٹکیا کھا کر وہ سونے کی کوشش بھی کرتا تو کبھی مکمل نیند نہ آتی۔ وہ ہر آدھ گھنٹے کے بعد کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر چونک چونک پڑتا ——— کبھی دیکھتا کہ اس کے چاروں طرف زبردست آگ لگی ہے اور آگ کی لپٹیں زہریلی ناگنوں کی طرح اس کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ وہ ان سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگتا ہے۔ مگر اسے اس آگ کے گھیرے سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ کبھی وہ دیکھتا ہے کہ اس کا ایک قریبی دوست اس کے گھر آیا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں پھولوں کا ایک گلدستہ ہے۔ دوست اسے گلدستہ پیش کرتا ہے۔ وہ جوں ہی گلدستہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے ——— ایک دھماکہ ہوتا ہے اور گلدستہ پتّی پتّی فضا میں بکھر جاتا ہے۔

کبھی دیکھتا ہے کہ اسے بہت شدّت کی پیاس لگی ہے۔ وہ پانی پینے کے لیے نل کھولتا ہے مگر یہ دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے کہ نل سے پانی کی بجائے خون کی دھار نکل رہی ہے۔ ایسے ہی اوٹ پٹانگ خواب دیکھ دیکھ کر وہ جاگ جاگ پڑتا۔ اور پھر دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا۔

اس روز بھی اس نے ایک ایسا ہی خواب دیکھا تھا کہ اچانک اس کے اندر ایک گینڈے کی سی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے ماتھے پر ایک سینگ نکل آیا ہے۔ اس کی شکل دیکھ کر خود اس کے بیوی بچے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا کہ یہ سینگ عارضی ہے ———

بس تھوڑی دیر بعد خود ہی غائب ہو جائے گا مگر بیوی بچوں کا خوف کسی طرح کم نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ تبھی کسی کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کان لگا کر کسی آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اسے اب کوئی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ باہر ایک ہولناک سناٹا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ اچانک ایک شور بلند ہوا۔ جیسے ہزاروں بدارواح بیک وقت چیختی چنگھاڑتی گلیوں میں دوڑتی پھر رہی ہوں اور اسی وقت کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بیوی بھی جاگ گئی تھی۔ اس نے سہمی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔۔۔۔

بیوی کی پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔۔
"نہیں"۔۔۔۔

وہ دروازے کے قریب پہنچ کر آئی ہول میں سے دیکھنے لگا۔ اس کے پڑوسی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ دروازہ تھوڑا کھول کر جھانکنے لگا۔

"باہر نکل آؤ۔۔۔۔ دشمن نے حملہ کر دیا ہے۔"

وہ پورا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ سامنے اس کے تینوں چاروں پڑوسی کھڑے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں تلوار تھی، کسی کے ہاتھ میں گپتی اور کوئی بلم لیے کھڑا تھا۔

"تم بھی کوئی ہتھیار لے لو، آج دشمن کے حملے کا منہ توڑ جواب دینا ہے۔"

"کون سا دشمن؟" اس کے منہ سے اچانک نکل گیا۔

"چلو، احمق مت بنو؟" دشمن سر پر آچکا ہے۔"

وہ تینوں چاروں اسے گھسیٹتے ہوئے بلڈنگ سے باہر لے آئے۔ باہر آس پاس کی بلڈنگوں سے بھی کئی لوگ اکٹھا ہو چکے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا۔ لاٹھی، بلم، تلوار، چاپڑ، ہاکی اسٹکس اور کلہاڑی۔۔۔۔

یہ سارے ہتھیار رات کے اندھیرے میں بار بار چمک کر اس کے اندر ایک کپکپی پیدا کر رہے تھے۔ اس نے سامنے اندھیرے میں دیکھا۔ دور سڑک پر چند پرچھائیاں سی دوڑتی نظر آئیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی اور دل سینے سے نکل کر کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ دفعتاً سامنے سے سوڈا واٹر کی دو چار بوتلیں آکر پھٹیں، جواب میں ادھر سے بھی پتھر اور اینٹیں پھینکی گئیں۔ اُدھر سے نعرہ لگا۔ ادھر سے بھی نعرے کا جواب دیا گیا۔ پتھر، اینٹوں اور سوڈا واٹر بوتلوں کی بارش، نعروں کی گونج، گالیوں کی بوچھار، ایک قیامت کا شور اُٹھا۔

"مارو، جانے نہ پائے، ختم کر دو آگے بڑھو، آج سارے حساب چکا دو۔"

لوگ چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے۔ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ نیزے اور تلواریں چمکا رہے تھے۔ پہلے تو وہ حیران آنکھوں سے سب کو دیکھتا رہا۔ ان کی چیخیں اور نعرے سنتا رہا۔۔۔۔ اندھیرے میں اُسے کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ دوست نہ دشمن۔۔۔۔ اس کے پڑوسی بلم اور تلواریں لیے بھیڑ میں کہیں گم ہو چکے تھے۔ اتنے میں ایک چیخ بالکل اس کے قریب سے اُبھری کسی کے سینے میں بلم اُتار دیا گیا تھا۔

ایک لمحے کو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ خوف کی ایک لہر بجلی کے کرنٹ کی طرح اس کے شریانوں میں دوڑ گئی۔۔۔۔ مگر پھر جانے کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔۔۔۔ شاید اس کے اندر سویا ہوا گوریلا بھی جاگ گیا تھا۔ گوریلا غرایا، ایک خوفناک چیخ اس کے حلق سے نکلی اور اس نے جھک کر پاس میں پڑی ہوئی تلوار اٹھالی۔ پھر ایک چنگھاڑ کے ساتھ بجلی سی چمکی اور اس کی تلوار دشمن کی گردن پر پڑی، گردن آدھی سے زیادہ کٹ کر لٹک گئی اور دشمن کسی کٹے ہوئے درخت کی مانند زمین پر ڈھیر ہو گیا۔۔۔۔ اتنے میں پولیس کے سائرن کی آواز سنائی دی۔۔۔۔

کوئی چلایا۔۔۔۔ "بھاگو۔۔۔ پولیس آگئی۔۔۔۔"

سب اِدھر اُدھر بھاگنے لگے، وہ بھی تلوار پھینک کر اپنے گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔۔۔۔ اندھیرے میں گلی پار کر کے گٹر پھلانگا، پھر تیزی سے اپنی بلڈنگ میں داخل ہو گیا۔ اڑتا ہوا اپنے گھر کے زینے طے کیے اور غڑاپ سے اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔۔۔۔

بیوی ڈری سہمی کھڑی تھی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

وہ بستر پر گر کر کسی تھکے ہوئے جانور کی طرح۔۔۔۔ ہانپنے لگا۔۔۔۔ ہانپتا رہا۔

"کیا ہوا بولو نا ——؟" بیوی دوبارہ گھگھیا ئی۔

"کچھ نہیں —— سو جاؤ چُپ چاپ"۔

اس کی آواز میں سچ مچ جانور کی سی غراہٹ تھی۔ بیوی سہم کر چُپ ہو گئی —— "مجھے ڈر لگ رہا ہے"۔ بیوی نے لرزتی آواز میں کہا۔ اس نے بیوی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ بیوی کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ مگر اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ بے حد دہشت زدہ ہے۔ اس نے آہستہ سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور قدرے نرم آواز میں بولا۔

"سو جاؤ، کچھ نہیں ہوگا۔ پولیس آچکی ہے . . ."

بیوی گٹھری بنی اس کے بغل میں لیٹ گئی اور آہستہ آہستہ سسکنے لگی۔ وہ اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے چپ چاپ پڑا رہا۔

باہر دور سڑک پر شور سنائی دے رہا تھا۔ دو چار فائر بھی ہوئے —— پولیس کی گاڑیوں کے سائرن چیخ رہے تھے۔ شاید پولیس نے کچھ لوگوں کو گرفتار کر لیا تھا۔

اس کے اندر جاگنے والے گوریلا کے ناخن جھڑنے لگے۔ دانت ٹوٹ گئے اور لمبے گھنے بال غائب ہو گئے۔ گوریلا کسی خوفزدہ بچے کی طرح اس کے وجود کے کسی کونے میں دوبارہ سکڑ سمٹ گیا تھا۔

اب باہر خاموشی چھا گئی تھی۔ مگر وہ خاموشی اس کے اندر ایک کربناک چیخ کی طرح گونج رہی تھی۔ اور ساتھ ہی بار بار گھوم جاتی تھی تصور میں ایک کٹی ہوئی گردن اور لہرا کر زمین پر گرتا ہوا ایک انسانی وجود ——

وہ اندھیرے میں چت لیٹا چھت میں گھومتے پنکھے کو گھورتا رہا —— بے چینی بڑھ جاتی تو کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیتا۔ مگر آنکھیں بند ہوتے ہی کٹی ہوئی گردن نظروں میں گھوم جاتی اور وہ چونک کر دوسری کروٹ بدل لیتا۔ وہ رات بھر اسی طرح کروٹیں بدلتا رہا —— ایک پل کے لیے بھی اس کی آنکھ نہ لگ سکی۔

صُبح وہ چائے پی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہی رات والا پڑوسی تھا۔ پڑوسی نے چوکنی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر انتہائی رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی۔ "رات کے دنگے میں سات آدمی مارے گئے۔ تین اپنے اور چار اُن کے ——"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چُپ چاپ اس کا منہ تکنے لگا۔ پڑوسی اس کے اور قریب آیا۔

"میں نے بھی ایک کو لڑھکا دیا تھا۔ تم نے کسی کو مارا یا نہیں ——؟"

اتنے میں زینے پر کوئی کھٹکا ہوا۔ پڑوسی دروازے سے ہٹتا ہوا بولا۔ "میں بعد میں آؤں گا"۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔

رات کا منظر ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ کٹی ہوئی گردن جیسے اس کے تصور میں کسی میخ کی طرح گڑ گئی تھی۔ اس کے اندر بگولا اٹھا ——

"کون تھا وہ؟ دوست تھا یا دشمن؟ کیسی ہو گی اس کی صورت؟ شادی شدہ تھا یا غیر شادی شدہ؟ شاید وہ بھی اس طرح اس کے جھگڑے میں پڑنا نہ چاہتا ہو —— اور اسی کی طرح اس کے کسی پڑوسی نے اسے بھی اس نرک میں گھسیٹ لیا ہو ——؟ اس کے ہاتھ میں جو بلّم تھا وہ اس کے ہاتھ میں اسی طرح غیر متوقع طور پر آ گیا ہو جس طرح اس کے ہاتھ میں وہ تلوار آ گئی تھی —— اُف —— درد سے اس کا سر پھٹنے لگا۔ میز پر رکھی چائے ٹھنڈی ہو گئی —— وہ اُٹھ کر باتھ رُوم چلا گیا۔ شیو بناتے ہوئے اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ اسے اپنی شکل بدلی بدلی سی دکھائی دی۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھتے ہوئے اس نے سوچا اگر اس کی گردن بھی آدھی کٹ کر لٹک جائے تو؟ آئینے میں اپنی کٹی ہوئی گردن دیکھ کر وہ کانپ گیا۔ باتھ روم سے باہر نکل کر اس نے کپڑے تبدیل کیے جب جوتے پہننے لگا تو بیوی نے جھجکتے ہوئے کہا . . .

"آج دفتر مت جائیے —— مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے"۔

"دفتر نہیں جا رہا ہوں"۔

"پھر . . . ؟"

"آج اخبار والا نہیں آیا —— چوراہے سے اخبار لے کر آتا ہوں —— گھبراؤ نہیں ——"

"جلدی آجانا"۔

وہ باہر نکل گیا۔ سڑک پر پہنچ کر اس سمت نگاہ ڈالی جدھر رات میں ہنگامہ ہوا تھا —— وہاں دور پولیس کے جوان تعینات نظر آئے۔ وہ دوسری طرف مُڑ گیا۔ راستے میں جگہ جگہ کانچ کی کرچیں بکھری تھیں۔

اینٹیں اور پتھر بکھرے پڑے تھے۔ پوسٹ لیمپ کے بلب ٹوٹے ہوئے تھے۔ دکانوں کے شٹر اکھڑے ہوئے تھے۔ ایک دکان بری طرح جل گئی تھی۔ اس سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ سڑک پر اکا دکا آدمی آ جا رہے تھے۔ مگر ہر کوئی چوکنا اور گھبرایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ سامنے سے ایک پولیس وین آرہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ ایک طرف کو ہٹ گیا۔ پولیس وین تیزی سے اس کے بغل سے گزر گئی ——— وہ آگے بڑھ گیا ———

چلتے چلتے اُسے اچانک محسوس ہوا کہ وہ چوراہے پر جانے کی بجائے کہیں اور نکل آیا ہے ——— اس نے نظر اُٹھا کر دیکھا وہ اپنے وارڈ کے سرکاری ہسپتال کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ یہاں کیوں آیا ہے ———؟ سوال اس کے دماغ میں سانپ کے پھن کی طرح اُبھرا۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہوگیا۔

اندر ہسپتال کا کاریڈور لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ مگر کسی کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یہ سب لوگ غالباً فساد میں زخمی ہونے والوں اور مرنے والوں کے عزیز رشتے دار تھے۔ کچھ لوگ ٹولیوں میں کھڑے دھیرے دھیرے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور باقی اُسے تسلی دے رہے تھے کچھ نوجوانوں کے چہرے جوش اور غصے سے تمتما رہے تھے۔ ہر شخص ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ انھیں لوگوں میں دو چار حوالدار بھی ڈنڈے لیے ادھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک حوالدار سے پوچھا۔

"حوالدار صاحب! کل رات رام نگر میں مرنے والوں کی لاشیں کدھر رکھی ہیں؟"

"کیوں؟"

"کل سے میرا بھائی کھو گیا ہے

شاید ——— مرنے والوں میں ———"

"اُدھر جاؤ ———" اس نے ایک بڑے سے لوہے کے جالی دار دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر ایک بندوق دھاری سپاہی کھڑا تھا ———

"مجھے لاشوں کا چہرہ دیکھنا ہے ——— میرا بھائی ..." جملہ پورا ہونے سے قبل ہی حوالدار نے گردن سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ جالی دار دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ جس میں سے صرف ایک آدمی دب دبا کر اندر جا سکتا تھا ———

وہ اندر داخل ہوگیا ——— یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا ———

جس میں کسی قسم کا کوئی فرنیچر نہیں تھا ———

کمرے میں دو ٹیوب لائٹ روشن تھیں ———

سامنے ایک قطار میں سات کٹی پھٹی لاشیں پڑی تھیں ———

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔

اس نے اندھیرے میں صاف طور پر اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی اس کی ایک جھلک اس کے لاشعور میں کہیں محفوظ تھی۔ نصف کٹی ہوئی گردن، پھٹی پھٹی آنکھیں اور کھلا ہوا منہ ——— وہ لاشوں کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے جھک کر ایک ایک لاش کا چہرہ دیکھنا شروع کیا ———

مگر ——— یہ کیا ———؟

وہ ایک جھٹکے سے سیدھا کھڑا ہوگیا۔ جیسے بجلی کا ننگا تار چھو گیا ہو ———

اُن ساتوں کے چہرے ایک جیسے تھے ——— اور سب کی شکلیں ہو بہو اس کی صورت سے ملتی جلتی تھیں۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیر کانپ رہے ہیں اور ہتھیلیاں پسینے سے بھیگتی جا رہی ہیں۔

بقیہ:

معانی کی نیرنگیاں

"شکست ——— جیت کا نقیض۔ ہار ... پھولوں یا موتیوں کی مالا' رشتۂ مروارید ..."

بظاہر معنی ایک دوسرے کے نقیض نہیں ہیں لیکن اس لحاظ سے متضاد ہیں کہ پھولوں یا موتیوں کی مالا (ہار) خوشی، فتح یا کامیابی کے موقعے پر پہنائی جاتی ہے اور شکست فتح کی نقیض ہے۔ مالا خوشی کی ترجمان ہے اور شکست سراسر وجہ رنج و غم ہے۔

تلاش کرنے سے زبان میں اس طرح کے اور بھی الفاظ مل سکتے ہیں۔ کاوش کرنے والی اور تجسس نظر درکار ہے۔

غزلیں

بدنام نظر

شعلۂ جاں ڈرا ڈرا سا ہے
شہرِ دل میں کوئی خدا سا ہے

چہرے کی تختیاں دُھلی سی ہیں
نام سب کا مٹا مٹا سا ہے

زخم سینے پہ درد آنکھوں میں
شہر یوں تو سجا سجا سا ہے

پھیرتا ہے نگاہ کیوں مجھ سے
کوئی شاید مرا شناسا ہے

سوکھتے جارہے ہیں ہونٹ نظرؔ
میری بستی میں کون پیاسا ہے

بھاگا، دھنباد ۸۲۸۳۰۱ (بہار)

برسات کا اُدھر ہے دماغ آسمان پر
چھپّر اِدھر نہیں ہے ہمارے مکان پر

اب تک رمقِ حیات کی پیدا نہ ہوسکی
کیا میں لہو چھڑکتا رہا ہوں چٹان پر

جھلسیں جب انگلیاں تو مجھے ہوش آگیا
پانی چھڑک رہا تھا میں جلتے مکان پر

دو چار ہاتھ اُڑکے زمیں پر جو گر گئے
تنقید کر رہے ہیں ہماری اُڑان پر

پھر یہ ہوا کہ مجھ سے بغلگیر ہوگیا
جس کو بڑا غرور تھا تیر و کمان پر

وہ بات سارے شہر میں مشہور ہوگئی
اب تک نہ آسکی جو ہماری زبان پر

جہلِ خرد نے توڑ دیں سب بندشیں شہودؔ
ناسخ کا اب اجارہ نہیں ہے زبان پر

شہود عالم آفاقی

۱۷/۸۳، بلگچھیا روڈ، کلکتہ ۳۷

خورشید افسر بسوانی

حرف و سخن کی فکر و نظر کی کچھ گرہیں بھی کھول چکا
سوچ رہا ہوں چپ ہوجاؤں اب تک کافی بول چکا

میری آشائیں بھی اکثر ان لہروں کی نذر ہوئیں
میرا من بھی کشتی بن کر دریا دریا ڈول چکا

چپکے چپکے ہاتھ بڑھایا ہم نے بھی اس وقت اُدھر
جب وہ پرندہ دھیرے دھیرے اُڑنے کو پر تول چکا

غم تو یہ ہے پھر بھی تری تصویر مکمل ہو نہ سکی
اپنی آنکھوں کے پانی میں رنگ بھی سارے گھول چکا

وقت غموں کی قیمت پاتا اور کسی سے کیا افسرؔ
میرے پاس آیا لیکن جب سب کی جیب ٹٹول چکا

بسواں، سیتاپور ۲۶۱۲۰۱ (یوپی)

اُردو شاعری میں ہولی کے رنگ

ابوالفیض سحر
ای - ۳/۴۲۳، سروجنی نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۳

اُردو محض ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب اور ایک طرزِ زندگی بھی ہے۔ اس کی ابتدا اور پھر اس کے ارتقا کے ہر مرحلے سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے ضمیر اور خمیر میں، وسیع المشربی، اعلیٰ ظرفی، انسان دوستی، رواداری اور حب الوطنی کا رچاؤ بساؤ ایک فطرتی شان کے ساتھ موجود ہے۔ یہ رنگا رنگی، یہ ہمہ گیریت، یہ کشادہ دامنی شاید ہی کسی اور زبان میں نظر آئے۔ یہ اُردو تہذیب ہی دراصل ہندستان کی مشترکہ قومی تہذیب ہے۔

حضرت امیر خسرو، اس گنگا جمنی تہذیب کے نقیبِ اوّل تھے۔ اپنی شاعری میں جہاں جہاں وہ ہندستان کی تعریف کرتے ہیں وہاں لگتا ہے جیسے ان کی روح وجد کر رہی ہو اور ان کا قلم موتی بکھیر رہا ہو۔ اپنے ہندوی کلام کے علاوہ مثنوی نہ سپہر میں انھوں نے ہندستان کی سرزمین، یہاں کے باشندوں، یہاں کے رسم و رواج، موسموں، پھلوں پھولوں اور پرندوں کی جی جان سے مدح سرائی کی ہے۔ اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ نے بھی یہاں کے لوگوں، رسموں رواجوں، موسموں اور رُتوں کے رنگوں میں رچ بس کر، امیر خسرو کی روایت کو اپنے طور پر آگے بڑھایا ہے۔

امیر خسرو کے زمانے میں "بسنت" کا اہتمام خاص دلچسپی سے کیا جاتا تھا۔ اسی لیے خسرو کے ہاں "بسنت" کا رنگ بہت گہرا ہے۔ قلی قطب شاہ کے ہاں بھی نوروز کے ساتھ بسنت کا ذکر بڑے ذوق و شوق سے اور بڑی آب و تاب سے آتا ہے۔ قلی قطب شاہ نے جو کبھی معانی بھی تخلص کرتے تھے، دکنی زبان میں لکھا تھا:

آنگاں سوں بسنت آیا نورانی
کریاں کسوت سکھیاں سب آردسانی
بسنت کے پھول کھلے ہیں اب رنگیلے
ہوا حیران دیکھ اس تائیں معانی

ایک اور مقام پر اپنی مخصوص عادت کے مطابق نبی کے صدقے میں، بسنت کی خوشیاں نصیب ہونے کا ذکر کیا ہے:

بسنت ونت چھند سو کند گال اُوپر
پھولایا آگ کیسر کی بہارا
نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شہ
رنگیلا ہو رہیا تر لوک سارا

اسی طرح دکن کے بیشتر شعرا نے عید اور شب برات جیسی تقاریب کے دوش بدوش بسنت، ہولی اور دیوالی پر بھی طبع آزمائی کی ہے جو اُردو زبان و ادب کے ابتدائی دور سے ہی سیکیولر ہونے کی دلیل ہیں۔

شمالی ہند میں اُردو شاعری کے ابتدائی دور پر نظر ڈالیں تو انشا اللہ خاں انشا کھولی کی مدح پر بسنت کے حوالے سے مسرت و انبساط کا اظہار کرتے ہوئے ملتے ہیں:

صد برگ کہہ دکھاتے ہے گہ ارغواں بسنت
لاوے ہے ایک تازہ شگوفہ یہاں بسنت
آتے نظر ہیں دشت و جبل زاد ہر طرف
ہے اب کے سال ایسی ہی اے دوستاں بسنت

شاہ حاتم کے ہاں ہولی کی منظر کشی کا رنگ دیکھیے کس قدر شوخ ہے:

مہیّا سب ہے اب اسباب ہولی
اٹھو یارو بھرو رنگوں سے جھولی
ادھر یار اور ادھر خوباں صف آرا
تماشا ہے تماشا ہے تماشا
چمن میں دھوم و غل چاروں طرف ہے
ادھر ڈھولک ادھر آواز دف ہے
ادھر عاشق اُدھر معشوق کی صف
نشے میں مست و ہر یک جام بر کف
گلال ابرک سے سب بھر بھر کے جھولی
پکارے یک بیک ہولی ہے ہولی
لگی پچکاریوں کی مار ہونے
ہر اک سو رنگ کی بوچھار ہونے
کوئی ہے سانولی کوئی ہے گوری
کوئی چنپا برن عمراں میں تھوڑی

میر تقی میر کے ہاں بھی ہولی کا ذکر ملتا ہے، ان کی ایک مثنوی کے چند اشعار:

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگِ صحبت سے عجب ہیں خورد و پیر
روشن الدولہ کی تھی یہ روشنی
کب ہوئی تھی لیکن ایسی دوستی
تھا جہاں تک آبِ دریا کا بہاؤ
واں تلک تھا اس چراغاں کا دکھاؤ
ایک عالم دیکھتا تھا دور سے
رات، دن تھی روشنی کے نور سے

سعادت یار خاں رنگین کے کلام سے بھی ایک اقتباس پیش ہے جس میں ہولی کی دھوم دھام کی منظر کشی بڑی دلچسپ صورت میں ملتی ہے :

بھر کے پچکاریوں میں رنگیں رنگ
نازنیں کو کھلائی ہولی سنگ
چلتی ہے دو طرف سے پچکاری
مینہ برستا ہے رنگ کا بھاری
کوئی جاتی ہے اس طرف سے ادھر
کوئی آتی ہے اس طرف سے ادھر
بھر کے پچکاری یہ جو ہے چالاک
مارتی ہے کسی کو دور سے تاک
کسی نے بھر کے رنگ کا تسلا
ہاتھ سے ہے کسی کا منہ مسلا

منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی نے ہولی کی تمہید "بسنت" کے نام سے یوں باندھی ہے :

ساقی کچھ آج تجھ کو خبر ہے بسنت کی
ہر سو بہار پیش نظر ہے بسنت کی
سرسوں جو پھول اٹھی ہے چشم قیاس میں
پھولے پھلے شجر ہیں بسنتی لباس میں

پتے جو زرد زرد ہیں سونے کے پات ہیں
صد برگ سے طلائی کرن پھول مات ہیں
اک آگ سی لگائی ہے ٹیسو نے پھول کے
کیا زرد زرد پھول کھلے ہیں ببول کے

یوں تو ملک کے ہر گوشے میں آج بھی ہولی کی بہاریں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں مگر نظیر اکبرآبادی کے زمانے میں گزرے ہیں ہولی کے نظارے اپنی نظیر آپ تھے :

وہ شوخ رنگیلا جب آیا یاں ہولی کی کر تیاری
پوشاک سنہری زیب بدن اور ہاتھ چمکتی پچکاری
کی رنگ چھڑکنے سے کیا کیا اس شوخ نے ہر دم عیاری
ہم نے بھی تب اس چنچل کو پھر خوب بھگویا ہر باری
پھر کیا کیا رنگ بہے اس دم اور دھوم دھمک کچھ چپک چپک

بات یہیں ختم نہیں ہوتی بہت کچھ اور بھی ہونا ہے۔ نظیر کے چٹخارے دار ہولی ناموں کا ذکر تفصیل طلب ہے مگر پھر بھی پھاگن کے اس رنگ رس کے گیت کے بغیر بات مکمل نہ ہوگی :

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم، شیشے، جام چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

سیماب اکبرآبادی نے ہولی کے مسرت و انبساط کے دن کی آرزو مندی اس طرح کی تھی :

کاش حاصل ہو حقیقی زندگی کا ایک دن
سرخوشی کا ایک لمحہ یا خوشی کا ایک دن

چاہتا ہوں گلشنِ کہنہ پر آجائے شباب
تنکا تنکا پھول ہو اور پتہ پتہ آفتاب

دلی بھی ہولی کے نشے سے ہمیشہ سرشار رہا ہے۔ فائز دہلوی نے عبیر، کیسر اور گلال کے اس تہوار کا جو رنگین نقشہ کھینچا ہے وہ اس طرح ہے :

ہر چھبیلی از لباسِ کیسری
تازہ کرتی ہے بہارِ جعفری
ناچتیں گا گا کے ہولی دم بدم
جیوں، سبھا اندر کی، در باغِ ارم
از عبیر و رنگ کیسر اور گلال
ابر چھایا ہے سفید و زرد و لال
جیوں جھڑی ہر سو ہے پچکاری کی دھار
دوڑتی ہیں ناریاں بجلی کے سار

مرزا غالب نے اپنے ایک قصیدے میں عیدِ نوروز اور ہولی کی لطافتوں کا ذکر بڑے لطیف پیرائے میں کیا ہے :

گرچہ ہے بعد عید کے نوروز
یک بیش از مہ ہفتہ بعد نہیں
سو اس اکیس دن میں ہولی کی
جا بجا مجلسیں ہوئیں رنگیں
شہر میں کو بہ کو عبیر و گلال
باغ میں سو بہ سو گل و نسریں
شہر گویا نمونۂ گلزار
باغ گویا نگار خانۂ چیں
تین تہوار اور ایسے خوب
جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں

آخری تاجدارِ اودھ واجد علی شاہ اخ

تو ہولی اور راس وغیرہ کے گیت لکھتے ہی تھے۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے بھی ہولی کا ایک پیارا گیت لکھا ہے، بول ہیں:

کیوں مُنہ پر رنگ کی ماری پچکاری
دیکھو کنور جی دونگی گاری

ہولی کے گیتوں نے محض نشاط انگیز بزم آرائیاں ہی نہیں کیں بلکہ جنگِ آزادی کی رزم گاہوں میں بھی جوش و خروش پیدا کیا ہے، جیسے:

سر پر پگڑی لال باندھ کر چولا پہن بسنتی
ہم جیسے مستانوں کی تو ہولی یونہی منتی

علی جواد زیدی کی نظم کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

پہلے زمانہ اور تھا مے اور تھی دور اور تھا
وہ بولیاں ہی اور تھیں
وہ ٹھولیاں ہی اور تھیں
لیکن مرے پیرِ مغاں
کل تو نیا انداز تھا
اک دَور کا تھا خاتمہ اک دور کا آغاز تھا
تیرے وفاداروں نے جب کھیلیں گلابی ہولیاں
نکلے بنا کر ٹولیاں
ہنستے چلے گاتے چلے
اپنے گلابی رنگ سے دُنیا کو نہلاتے چلے

جب بات ہولی کے اس رنگ کی چلی ہے تو نذیر بنارسی کی نظم "منائیں پہلے ہولیاں دوالی پھر منائیں گے" کا بھی ایک بند ملاحظہ کریں جو انھوں نے چینی جارحیت کے خلاف جنگ کے وقت کہی تھی:

لہو سے پھاگ کھیل کر گھروں کو جگمگائیں گے
شکست دے کے دشمنوں کو قمقمے جلائیں گے
منائیں پہلے ہولیاں دوالی پھر منائیں گے
صفوں کو چیر چیر کر مصیبتوں کو ریل دو
جدھر سے جنگ آئی ہے ادھر اسے ڈھکیل دو

اس محاذ کے دوسرے سرے پر شمیم کرہانی نے پھاگن ہیں "جیون رس" برسانے کی بات کی ہے تا کہ ہمارے دیس میں خلوص و محبت کی کھیتیاں لہلہائیں:

تیرے تپن میں دن دن تیرے رنگ و بو کی ڈولی
رہے بسنتی آنچل تیرا بھرے گلوں سے جھولی
جیون رس برسائے پھاگن رنگ اُڑائے ہولی
جو نفرت کی آنکھ سے دیکھے مار دے اس کو گولی
مرے وطن اے مرے وطن

جدید دَور کے نئے شعرا نے بھی ہولی پر بہت کچھ لکھا ہے۔ چکبست، تلوک چند محروم، فراق، ساغر نظامی، سلام مچھلی شہری، شاد تمکنت، زبیر رضوی، ندا فاضلی کے علاوہ کرشن موہن، کمار پاشی، مخمور سعیدی، کرشن مُراری وغیرہ کے ہاں بھی ہولی کا ذکر ملتا ہے تلمیح کے طور پر یا علامت اور استعارے کے طور پر بھی ہولی کو خوب برتا گیا ہے۔ اس سے کئی محاورے، تراکیب اور کہاوتیں بھی وجود میں آئی ہیں۔ جاں نثار اختر نے اپنی نظم "امن نامہ" میں کہا تھا:

دہکتی رہے پاک ہولی کی آگ
رہیں کھیلتی ناریاں پی سے بھاگ

پریم پال اشک کے ہاں اس کسک کی لے تیز ہوئی ہے:

مہینہ پھاگ کا سرسوں بھی پھولی
کوئی موہن یہ آئے پھاگ اڑائے
کبھی رادھا کی چولی بھیگ جائے
مرے دہقان نے محنت وصولی
جلائیں گے چتا ہم مفلسی کی
اسی کی راکھ سے کھیلیں گے ہولی

فضا ابن فیضی نے ہولی کی خوبصورتیوں کو اس طرح اُجاگر کیا ہے:

یہ وہ موسم ہے کہ اس موسم رنگیں کے لیے
پھول سے بادِ صبا رنگ و لطافت مانگے
یہ وہ محفل کہ اسے روشنی دینے کے لیے
شمع مہکے ہوئے عارض سے صباحت مانگے
یہ وہ موسم ہے کہ اس موسم سرمستی میں
عشرتِ شوق ملی حسن کی سوغات ملی

بیکل اُتساہی نے اپنے البیلے لب و لہجے میں ہولی کے تہوار پر مادرِ وطن ہندستان کے حسن کا گن گان کیا ہے:

سرل سرل مگن مگن مرے وطن کا روپ ہے
پرت یہ رنگ یہ مدھر بسنت کی چہل پہل
یہ راگنی میں جگمگاتے گیت یہ نئی غزل
نشہ بکھیرتا ہوا مرے وطن کا روپ ہے
یہ جھناتت یہ بانسری کے گیت نیرتا ہوا
یہ نیت ریت ہیت کے سمن بکھیرتا ہوا
امریشودا کا للن مرے وطن کا روپ ہے

اس رنگ روپ کے جہانِ ہندستان کی تہذیبی روایات کے پس منظر میں رفعت سروش نے ایک مختصر سانولی سلونی نظم کہی ہے جو ہماری قومی زندگی کی چاندنی کا احاطہ

(بقیہ صـ ۳۷ پر)

غزلیں

یہ جو زیست تو جیسے مقدّروں میں تھا
وہ اجنبی ہی سہی میرے دلبروں میں تھا

بہت عجیب تھا کردار، مجھ سے ہو نہ سکا
مگر فقیر تھا، میں بندہ پروروں میں تھا

عجب کہ پھٹ نہ گئے اپنے زورِ وحشت سے
غریبِ شہر ہیں سودا مگر سروں میں تھا

کہاں سے بہتے ہوئے پھول آ رہے ہیں ادھر
کہاں چھپا ہوا ساحل سمندروں میں تھا

وہ میرے پاس رہا جگنوؤں کے موسم میں
عجیب سابقہ سیماب پیکروں میں تھا

غریبِ شہر ہے جمشید اس کی بھی سنیے
کبھی یہ شخص بھی اچھے سخنوروں میں تھا

جمشید مسرور

LINDEBERGSDJEN 46 a N-1068 OSLO 10
NORWAY

کامل بہزادی

یہ شہر ہے فساد زدہ اُجڑا لگے مجھے
ہر سمت اپنے خون کا منظر لگے مجھے

کم ظرف دیکھتے ہیں پرانی صراحیاں
قطرہ مرے سبو کا سمندر لگے مجھے

اپنی خطاؤں پر کوئی شرمندگی نہیں
دل اپنا آئینہ نہیں پتھر لگے مجھے

یہ کون سی ادا ہے خدا جانے آپ کی
پتھر کے ساتھ پھول بھی آ کر لگے مجھے

کامل بنے گا کتنا سہارا یہ دیکھنا
بیٹا تو اپنے قد کے برابر لگے مجھے

جی ۱۱ / ۹ (۱ ۲۲۱) کوارٹرس، ساوتھ ٹی ٹی نگر، بھوپال

سوا نیزے پہ سورج آ گیا ہے
مگر دن ہے کہ اب تک سو رہا ہے

یہ بادل لائیں گے پانی کہاں سے
سمندر جب کہ خود پیاسا کھڑا ہے

پرندوں کی اڑانیں رک گئی ہیں
فضا میں کتنا ہنگامہ ہوا ہے

جو بستی کل تلک دارالاماں تھی
وہاں ہر موڑ اب مقتل بنا ہے

ہے میرا جرم سنگِ میل ہونا
تبھی زندہ مجھے گاڑا گیا ہے

وفا انسان ہے انساں رہے گا
فرشتہ ہے نہ کوئی دیوتا ہے

وفا صدّیقی

نزد بھوپال ٹاکیز، بھوپال ۴۶۲۰۰۱

غزلیں

ہر شخص انا پسند ہے یا انتہا پسند
اس شہر کو ہے خون میں لت پت ہوا پسند

آئینہ بولتا ہے، نظر تو ملا کے دیکھ!
انسان کو نہیں ہے کچھ اپنے سوا پسند

دستِ ستم کو گردنِ انصاف کی تلاش
خنجر کو تازہ خون کا ہے ذائقہ پسند

تاریخ ہے گواہ، فسادات کا سبب
ہر دور میں بنی ہے پسند اور ناپسند

بازار سے فراقؔ ہر اک چیز اڑ گئی!
کیا لوگ ناپسند کریں اور کیا پسند

فراقؔ جلال پوری

محلہ قاضی پورہ، پوسٹ جلال پور ضلع فیض آباد ۲۲۴۱۴۹ (یوپی)

ان گنت روپ بدلتے ہوئے چہرے کتنے
ہم نے دیکھے ہیں پگھلتے ہوئے چہرے کتنے

چھاؤں کی بھیک نہیں، جائے اماں چاہتے ہیں
کرب کی دھوپ میں جلتے ہوئے چہرے کتنے

اپنی پہچان بنانے میں ہیں مصروف ابھی
میرے اشعار میں ڈھلتے ہوئے چہرے کتنے

وقت، طوفان کی مانند گزرجاتا ہے
روز، قدموں سے مسلتے ہوئے چہرے کتنے

تو سوچ آن تو کر عہدِ گزشتہ کی ریاضؔ
پھر نظر آئیں گے چلتے ہوئے چہرے کتنے

ریاض الدین ریاضؔ

۵۴۷، کھنڈرو پاڑہ، بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲ (تھانے)

کس کا خیال روح کی لذّت میں ڈھل گیا
کیا میں حصارِ جسم سے باہر نکل گیا

محوِ سفر رہا تھا میں دو چار روز بس
لوٹا تو میرے شہر کا نقشہ بدل گیا

پیپل کی چھاؤں صحن میں، پنگھٹ پہ گاگریں
موسم پرانی یاد کے منظر نگل گیا

شہروں کو اب فصیل میں رکھنا محال ہے
انسان کیا حدود سے آگے نکل گیا

نظّارۂ جمال کی پھر ضد نہ کر حنیفؔ
آگے بھی شوقِ دید میں اک طور جل گیا

شین میم حنیف

جودھ پور جنرل اسٹور، نزد سُنجاتی گیٹ، جودھ پور ۳۴۲۰۰۰

مڑ کے دیکھا تو خود سے ڈر آیا
کیسے رستوں سے میں گزر آیا

کھڑکیاں کھل گئیں، مکانوں کی
لوٹ کر آج کون گھر آیا؟

اب کے موسم کا حال کیا کہیے
ہر پرندہ لہو میں تر آیا

یاد آتے ہی اُس کی، شام ڈھلے
درد کی زد میں دل نظر آیا

حادثوں سے کوئی کہے فاروقؔ
غم کے دریا سے میں اُبھر آیا

فاروق انجینیر

۳/ڈی، تھرمل کالونی، کوٹہ (راجستھان)

آوارگی کا آشنا

دلیپ سنگھ
۴/۵۹ ، راجندر نگر ، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰

چھٹی قسط

سعید انجم کا خیال تھا کہ وہ اپنے اسکول سے دو گھنٹے میں لوٹ آئے گا لیکن وقت زیادہ لگ گیا۔ چنانچہ اُس کے افسانوں کا مجموعہ پڑھنے کے بعد ایک بار پھر میں نے اُس کی لائبریری کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے ایک کتاب نظر آئی "شہاب نامہ"۔ میں اس کتاب کے بارے میں سُن تو چکا تھا لیکن دیکھی نہیں تھی۔ یہ کتاب پاکستان کے ایک سینیئر بیوروکریٹ اور افسانہ نگار قدرت اللہ شہاب صاحب کی داستانِ حیات ہے۔ شہاب صاحب پاکستان میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے۔ ظاہر ہے ایسے شخص کو پاکستان میں ہونے والے ایسے بہت سے واقعات کا پس منظر معلوم ہوگا جن کے بارے میں ہم جیسے لوگ محض اندازے لگا سکتے ہیں۔ انھوں نے خود اسی کتاب کے دیباچے میں حفیظ جالندھری صاحب کا مندرجۂ ذیل شعر درج کیا ہے:

جب کہیں انقلاب ہوتا ہے
قدرت اللہ شہاب ہوتا ہے

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ بقول حفیظ "وطن عزیز میں انقلاب کی آڑ میں جتنی غیر جمہوری کارروائیاں ہوتی رہی ہیں اُن سب میں میرا کچھ نہ کچھ ہاتھ تھا"۔ مجھے یقین تھا کہ ایسے شخص کے تجربات کا مطالعہ دلچسپ ہوگا۔ چنانچہ میں نے کتاب اُٹھالی۔

یہ بڑی ضخیم کتاب ہے۔ اس میں تقریباً ساڑھے بارہ سو صفحے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر سعید انجم مجھے پورا دن بھی اپنے گھر میں چھوڑ جاتا تو میں اس کتاب کو پوری طرح پڑھ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے کوشش کی کہ مختصر سے وقت میں اسے کو کم از کم اس طرح دیکھ لوں جیسے ہمارے تبصرہ نگار تبصرہ لکھنے سے پہلے کسی کتاب کو دیکھتے ہیں۔

اس مختصر وقت میں میں کتاب کے کم از کم سو صفحے پڑھ گیا۔ ان سب سے تو شاید آپ کو دلچسپی نہ ہو لیکن کم از کم ایک واقعہ میں اپنے قارئین کو ضرور سنانا چاہوں گا۔ لیکن اس سے پہلے ایک بات "شہاب نامہ" کے دیباچے سے:

"ملازمت کے دوران میں نے اپنا کام ایمانداری اور بے خوفی سے کیا۔ اس کی پاداش میں چار بار استعفےٰ دینے کی نوبت آئی"۔

اب وہ واقعہ سُنیے لیکن پہلے اُس واقعے کا پس منظر۔

قدرت اللہ شہاب جب آئی سی ایس کے امتحان میں کامیاب ہوئے تو ہندستان میں تھے۔ کچھ سال یہیں ملازمت کی۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد وہ وہاں ہجرت کر گئے۔ ہندستان کی ملازمت کے دوران میں وہ اپریل ۱۹۴۷ء میں اُڑیسہ میں ڈپٹی ہوم سیکریٹری تھے۔

اب وہ واقعہ اُن کی زبانی سنیے:

"اُڑیسہ کے چیف منسٹر شری ہری کرشن مہتاب کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ ایک بار دہلی سے وہ کانگرس کی کسی میٹنگ سے واپس آئے تو اپنے معمول کے مطابق انھوں نے کاغذات کی ایک صندوقچی میرے حوالے کردی۔ ہمارا طریقۂ کار یہ تھا کہ سیاسی کاغذات چھانٹ کر میں اُن کے پرسنل پرائیویٹ سیکریٹری کے سپرد کر دیتا تھا اور سرکاری کاغذات متعلقہ محکموں کو بھیج دیتا تھا۔ اُن کا پرسنل پرائیویٹ سیکریٹری بڑا متعصب ہندو تھا۔ وہ اکثر اس بات پر سر پیٹتا تھا کہ مہتاب صاحب کے سیاسی کاغذات میرے ہاتھ سے کیوں گزرتے ہیں.....

"اس بار جو میں نے چیف منسٹر کے کاغذات کا جائزہ لیا' تو اُن میں ایک عجیب دستاویز ہاتھ آئی۔ یہ چھ سات صفحات کا سائیکلوسٹائلڈ انتہائی خفیہ (TOP SECRET) حکم نامہ تھا جو کانگرسی چیف منسٹروں کے نام اس ہدایت کے ساتھ جاری کیا گیا تھا کہ ہر چیف منسٹر اسے اپنی ذاتی تحویل میں رکھے۔ اس میں لکھا تھا کہ تقسیم ہند کا معاملہ تقریباً طے پا چکا ہے۔ اس لیے جن صوبوں میں کانگرس کی وزارتیں قائم ہیں وہاں مسلمان افسروں کو کلیدی عہدوں سے تبدیل کر دیا جائے.....

"یہ حکم نامہ پڑھ کر مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا۔

مہاتما گاندھی کی نام نہاد بے تعصبی کی لنگوٹی بادِ مخالف کے جھونکوں میں اُڑ کر دُور جا پڑی اور وہ اپنے اصلی رنگ و روغن میں بالکل برہنہ ہوگئے۔ اہنسا پرم دھرم کے اس چھوٹے پجاری کے اشاروں پر ناچنے والی انڈین نیشنل کانگرس کے عزائم اتنے ہی خطرناک اور سنگین نکلے جتنے کہ ہندو مہاسبھا یا راشٹریہ سیوک سنگھ کے سمجھے جاتے تھے.....

"یہ دستاویز پڑھ کر تھوڑی دیر میرے دل میں ایک عجیب سی کشمکش ہوتی رہی۔ ڈپٹی ہوم سیکریٹری کا پیشہ ورانہ ضمیر میرے اندر چھپے ہوئے بے عمل ناقص اور خوابیدہ مسلمان کے ضمیر کے ساتھ ٹکرا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تھوڑی سی لڑائی کے بعد جیت ٹوٹے پھوٹے مسلمان کی ہی ہوئی۔ چنانچہ میں نے یہ دستاویز اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی اور اُسی رات قائدِ اعظم سے ملاقات کرنے کی نیت سے دلی روانہ ہوگیا۔"

جب شہاب صاحب نے یہ دستاویز قائدِ اعظم کو پیش کی تو انھوں نے پوچھا:

"یہ تم نے کہاں سے حاصل کی؟"

"میں نے فر فر ساری بات سُنا دی۔"

"ویل، ویل، تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا This is Breach of Trust"

اور پھر جب قدرت اللہ شہاب صاحب قائدِ اعظم کے کمرے سے نکل رہے تھے تو قائدِ اعظم نے کہا:

"بوائے! دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنا۔"

میں نے یہ قدرے لمبا اقتباس اس لیے یہاں درج کیا کہ اس سے قائدِ اعظم کی عظمت، اور اصول پرستی اور ایک ایسے سول سرونٹ کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کا دعوےٰ ہے کہ ملازمت کے دوران میں نے اپنا کام ایمانداری اور بے خوفی سے کیا اور اس کی پاداش میں چار بار استعفےٰ دینے کی نوبت آئی۔" میرے خیال میں انھیں ہری کرشن مہتاب صاحب کے بیگ سے کاغذ چُرا کر قائدِ اعظم کے پاس لے جانے سے پہلے بھی استعفےٰ دے دینا چاہیے تھا۔ لیکن بار بار استعفےٰ دینے والے سرکاری ملازم بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ وہ اس وقت کبھی استعفےٰ نہیں دیتے جب انھیں خدشہ ہو کہ شاید اسے منظور کر لیا جائے۔

سعید انجم اسکول سے لوٹا تو ہم ڈنمارک کی جانب روانہ ہوگئے۔

یورپ کی سڑکوں پر کار میں سفر کرنے کا لطف یہ ہے کہ منزل پر پہنچنے کی خواہش اتنی شدید نہیں ہوتی جتنی اپنے ہاں ہوتی ہے۔ مجھے تو بالکل نہیں تھی۔ کشادہ سڑکیں، دل آویز نظارے اور آلائشوں سے پاک فضا۔ اس پر طرّہ یہ کہ سعید انجم کا ساتھ تھا۔ سعید ایک سلجھا ہوا سمجھدار اور متحمل طور پر غیر متعصب انسان ہے۔ سفر کے دوران میں مجھے اُس میں کوئی ایسا عنصر نظر نہ آیا جس سے احساس ہو کہ ہم دونوں دو ایسے ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں جو آئے دن ایک دوسرے سے اُلجھتے رہتے ہیں۔ اُس کی دو باتوں سے میں بے حد متاثر ہوا۔ ایک تو یہ کہ وہ دوسرے کی بات سننے کو نہ صرف تیار رہتا ہے بلکہ اگر اُسے اُس کی گفتگو میں عقل کی کوئی بات نظر آئے تو اس کے ساتھ اتفاق کرنے میں کوئی بُرائی نہیں سمجھتا۔ مجھے یاد ہے ہماری گفتگو کے دوران میں اُس کے ایک افسانے کا ذکر آیا تو اُس نے کہا کہ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ میں نے یہ افسانہ صدر ضیاء الحق کے عہد میں شائع کروایا تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی میں تو تمھیں ایک اچھے افسانے پر داد دے رہا تھا لیکن تم شاید اپنی جرأت کی داد چاہتے ہو۔ یہ سُنتے ہی سعید بہت کھُل کر ہنسا اور کہنے لگا "آج کے بعد میری اس جرأت کا ذکر میرے افسانے کے ساتھ نہیں ہوگا۔"

سعید انجم کی دوسری خوبی جس نے مجھے متاثر کیا۔ وہ اس کا دوسروں کی نیک نیتی پر اعتبار تھا۔ اِس کی مثال کچھ دیر کے بعد پیش کروں گا کہ کتنی باتیں مناسب وقت پر زیادہ اثر کرتی ہیں۔

ناروے سے ڈنمارک جائیں تو راستے میں آپ کو سمندر میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ آپ سویڈن کے بارڈر پر جہاز میں سوار ہوتے ہیں اور جب اُترتے ہیں تو آپ ڈنمارک میں ہوتے ہیں۔ کیا تو ہم نے بھی ایسا ہی لیکن یقین اب بھی نہیں آتا کہ ہمارے سفر میں سمندر کا سفر بھی شامل تھا ہم کار سمیت جہاز میں داخل ہوئے۔ کار کو پارک کیا اور ایک ریستوران میں جا کر بیٹھ گئے۔ جہاز رُکا تو ہم نے اپنی کار اٹھائی اور اپنے آپ کو اُس سڑک پر پایا جو ڈنمارک جا رہی تھی۔

جب سڑک پر آگئے تو شام کے قریب آٹھ بج رہے تھے۔ سعید کہنے لگا کہ ایک گھنٹے میں ہم نصر ملک کے ساتھ اُس کی محبت کا لطف اٹھا رہے ہوں گے۔

نصر نے انھی دنوں گھر بدلا تھا۔ سعید نے چلنے سے پہلے اُس کے گھر کا راستہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ بتائی ہوئی راہوں پر گاڑی چلا رہا تھا لیکن منزلِ مقصود ہمارے ہاتھ نہیں آرہی تھی۔ نصر کے نئے مکان میں فون نہیں تھا لیکن نصر کے ایک دوست علی صفدر کا فون نمبر سعید کو معلوم تھا۔ وہاں فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی نصر کے گھر ہمارے انتظار میں پریشان ہو رہے ہیں۔ اب تک ڈنمارک میں گاڑی چلاتے چلاتے ہمیں تین گھنٹے ہو چکے تھے۔

یورپ میں ایک تو لوگ ہیں بہت کم اور دوسرے سب کے پاس گھر ہیں جن کی وجہ سے

آدھی رات کو سڑکوں پر کوئی نہیں ملتا۔ راستہ پوچھیں تو کس سے؟ اور اس پر طرّہ یہ کہ سعید سمجھتا تھا کہ وہ ٹھیک راستے پر جا رہا ہے۔ اس چکّر میں ہم لوگ آدھی رات کو پیچھے چھوڑ آئے۔ جس گھر میں بھی روشنی نظر آتی سعید اُس کی طرف چل پڑتا تاکہ دیکھیے یہ نصر کا مکان ہے جو اتنی رات گئے ہمارے انتظار میں پریشان ہو رہا ہے۔ ابھی ابھی جب میں نے کہا تھا کہ دوسروں کی نیک نیتی پر اُس کا اعتماد بہت گہرا ہے تو یہی بات میرے ذہن میں تھی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ نصر ملک اور اُس کے دوست عجیب لوگ ہیں کہ انھیں ذرا بھی فکر نہیں کہ ہم کہاں ہیں اور سعید سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ ہمارے انتظار میں پریشان ہو رہے ہیں۔ حالانکہ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ لوگ اپنے گھر کی آرام دہ فضا میں بیٹھے بیئر سے جی بہلا رہے تھے۔

اس وقت سوال ہمارے سامنے یہ تھا کہ نصر کا گھر کیسے تلاش کیا جائے۔ سڑک پر جو ایک آدھ آدمی ہمیں نظر آیا وہ شراب کے نشے میں دھت تھا۔ اُس سے راستہ کیا پوچھتے۔ اُس کو تو خود خضرِ راہ کی تلاش تھی۔

جب ہم ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک کر چور ہو گئے تو یورپ کی اُس فورس کی طرف رجوع کیا جو وہاں سب سے زیادہ مددگار اور ہمارے ہاں سب سے زیادہ پریشانی کا کارن بنتی ہے۔ سعید نے جاتی ہوئی ایک پولیس وین کو روکا۔ پولیس والوں نے اُسی وقت وائرلیس پر ایک ٹیکسی طلب کی۔ اُسے ہماری منزلِ مقصود کا پتہ دیا اور کہا کہ ان کے آگے آگے جاکر انھیں پہنچاؤ۔ چنانچہ وہ ٹیکسی ڈرائیور ہمارا خضرِ راہ بنا اور ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اُس نے نہ تو لمبا راستہ لیا اور نہ منزل پر پہنچ کر زیادہ کرایہ طلب کیا۔ ان یورپین لوگوں کو ہم سے کتنا کچھ سیکھنا ابھی باقی ہے!

نصر کا گھر کئی منزلہ عمارت میں ایک فلیٹ تھا۔ پوری بلڈنگ میں وہی ایک گھر تھا جس میں بتّی جل رہی تھی۔ جب تک ہم وہاں پہنچے ہم تھک کر چور ہو چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ جاتے ہی نصر اور اُس کے دوست مجھے وہسکی کا گلاس پیش کریں گے۔ حالانکہ میں نے پچھلے پانچ برسوں سے ڈاکٹروں کی ہدایت پر پینی چھوڑ رکھی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا کہ جب وہ لوگ پیش کریں گے تو میں انکار نہیں کروں گا کہ اس تھکے ماندے جسم کو گرمی ہی راس آئے گی۔ البتہ اگلے دن سویرے انھیں سمجھا دوں گا کہ رات گئی بات گئی۔ اب مجھے کوئی دعوتِ ناؤ و نوش نہ دے۔

میرے اندازے کے عین مطابق نصر کے مکان پر نصر اور اس کے دوست علی صفدر، ابوطالب اور چاند شکلا بیئر پی رہے تھے۔ سب نے جوش و خروش سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ میرے اندازے کے عین مطابق چاند شکلا نے مجھے ایک گلاس پیش کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں گلاس کو ہاتھ میں لیتا، نصر اُس کی راہ میں حائل ہو گیا اور کہا کہ کلکتہ سے انشا کے مُدیر ف۔ س۔ اعجاز کا فون آیا ہے اور اُس نے خصوصی طور پر ہدایت دی ہے کہ دلیپ سنگھ صاحب کو کوئی شراب نہیں پلائے گا کہ یہ شے اُن کی صحت کے لیے اچھی نہیں ہے۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ آپ کے کئی دوست بعض دفعہ کتنے خطرناک دشمن ثابت ہو سکتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

بقیہ:

اُردو شاعری میں ہولی کے رنگ

کرتی ہے:

ہولی پھر آج آئی دلوں میں اُمنگ ہے
پچکاریوں میں پیار کی الفت کا رنگ ہے
اہلِ وطن رنگے ہیں محبت کے رنگ میں
بے شک یہ زندہ قوموں کے جینے کے ڈھنگ ہیں
بادل اُڑے فضا میں عبیر و گلال کے
تازہ ہوئے خیال میں لمحے وصال کے
سب پردے غیریت کے اُٹھے سب گلے ملے
لایا ہے ایک نشہ سا ساغر میں ڈھال کے
ساغر چلے خوشی کے تو پھر آ گیا خمار
ہر شخص دوسرے سے ہے ملنے کو بیقرار

کچھ پی ہے کچھ لنڈھائی ہے ہولی کا دن ہے آج
موسم پہ آ گیا ہے عجب طرح کا نکھار

ہولی کے حوالے سے ہندستان کی سماجی زندگی کے رنگ رنگ مرقعے اُردو شاعری کے آبگینوں میں اس طرح رقص کناں ہیں جیسے کسی عظیم الشان محل میں سینکڑوں پیکرِ نور و رنگ محوِ رقص ہوں:

نیل گگن کے راج محل میں رنگوں کا سنگھار
رنگ ہی اپنا دھن ہے ہاں یہ رنگ ہی اپنا پیار

شاہنامۂ اُردو (منظوم)

از منشی مولچند منشیؔ دہلوی

رام لعل نابھوی

محلّہ دیوان، نابھا ۱۴۷۲۰۱، پنجاب

فردوسی طوسی کا شاہنامہ فارسی مشہور و مقبول ہے۔ حکایاتِ شاہنامہ پر گیارہویں صدی میں بزبانِ فارسی خلاصے مرتّب ہوئے۔ جو نثر میں تھے۔ ان خلاصوں کے اُردو کے مصنّفین نے نظم و نثر میں ترجمے کیے۔

فارسی نثر میں دو خلاصے مرتّب ہوتے:

شاہ جہاں بادشاہ نے اپنے جلوس کے ۲۶ ویں سال ۱۰۶۳ھ میں دارالملک کابل کی صوبے داری شاہزادہ محمد دارا شکوہ کو تفویض کی۔ شاہزادۂ موصوف نے توکّل بیگ حسینی ولد تولک بیگ کو غزنی کی وقائع نویسی پر مامور کیا۔ اس زمانے میں شمشیر خاں غزنی کا حاکم تھا شمشیر خاں کی فرمائش پر توکّل بیگ نے فردوسی کے شاہنامے کا نثرِ فارسی میں خلاصہ لکھا۔ اور اس کا نام تاریخِ دلکشائے شمشیر خانی رکھا۔

راجہ رام نرائن خلف لچھمی نارائن دربارِ مغلیہ میں ایک ذی ثروت عہدے دار گزرا ہے۔ حاجی پور اس کا وطن تھا۔ چینا نگر میں سکونت تھی۔ شاہزادہ محمد بیدار بخت نے اس کو اپنا پیشکار دیوان بنا لیا تھا۔ شیخ علی حزیں سے اس کے دوستانہ روابط تھے۔ ۱۱۴۰ھ میں اس نے بہ عہدِ محمد شاہ بادشاہ شاہنامے کا فارسی نثر میں خلاصہ کیا اور منتخب بے بدل اس کی تاریخ نکالی۔

انھی خلاصوں پر مصنّفینِ اُردو نے اپنے شاہ ناموں کی بنیاد قائم کی ہے۔ زبانِ اُردو میں اس وقت تک سات شاہنامے معرضِ تحقیق میں آئے ہیں۔ ان میں چھٹا نسخہ "شاہنامۂ اردو منظوم منشیؔ دہلوی کا ہے"[1]

منشیؔ دہلی کے ایک معزز کایستھ خاندان کے ممتاز، صاحبِ علم اور مقتدر و مشہور شخص تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ شاہ نصیر ملازمِ قدیم شاہ عالم بادشاہ دہلی کے شاگرد تھے۔

منشیؔ کی تصنیفات و تالیفات مندرجۂ ذیل ہیں:

۱۔ ریختہ دیوان[2]
۲۔ قواعدِ اُردو، ہندستانی گرامر (مطبوعہ)[3]
۳۔ سام نامہ (غیر مطبوعہ)[4]
۴۔ ہیر رانجھا (غیر مطبوعہ)[5]
۵۔ شمشیر خانی کا ترجمہ بنام شاہنامۂ اُردو نظم میں (مطبوعہ)[6]
۶۔ شاہنامۂ فردوسی کا ترجمہ اُردو نظم میں[7]

منشی دیبی پرشاد بشّاش کے یہ الفاظ قابلِ توجہ ہیں:

"انھوں نے شمشیر خانی اور شاہنامۂ فردوسی کا ترجمہ اُردو نظم میں کیا ہے۔ از انجملہ شمشیر خانی کا ترجمہ بنام شاہنامۂ اُردو بہت مشہور ہے۔"

منظوم شاہنامۂ اُردو جو شمشیر خانی فارسی نثر کا ترجمہ ہے، دستیاب ہے لیکن شاہنامۂ فردوسی کا ترجمہ اُردو نظم میں کیا ہوا دستیاب نہیں۔

شاہنامۂ اُردو منظوم کے قلمی اور مطبوعہ تیرہ نسخوں کی تفصیل یہاں درج کی جاتی ہے:

۱۔ قصّۂ خسروانِ عجم، پہلی بار دہلی میں چھپا، ۱۸۴۴ء[8]
۲۔ قصّۂ خسروانِ عجم، دوسری بار کلکتہ میں چھپا، ۱۸۴۶ء[9]
۳۔ شاہنامۂ اُردو، نول کشور پریس، ۱۸۹۷ء - ۱۹۲۷ء میں بارہویں بار چھپا[10]
۴۔ شاہنامۂ اُردو، مطبع مرتضوی، ۱۲۷۱ھ[11]
۵۔ شاہنامۂ اُردو، مطبع چشمۂ فیض، دوسری بار شائع ہوا[12]
۶۔ شاہنامۂ اُردو، مطبع رضوی، ۱۳۰۰ھ[13]
۷۔ شاہنامۂ اُردو، بمبئی پریس، آگرہ[14]
۸۔ شاہنامۂ اُردو، مطبع مسیحائی[15]
۹۔ شاہنامۂ اُردو، غلام علی اینڈ سنز تاجرانِ کتب لاہور، اندازاً۔ پہلا قبل[16]
۱۰۔ شاہنامۂ اُردو، مطبع فیض احمدی، ۱۳۱۸ھ[17]

۱۱۔ شاہنامۂ اردو و قصۂ خسروانِ عجم [18]

۱۲۔ شاہنامۂ اردو قلمی نسخہ نمبر ۴۴۴ [19]

۱۳۔ شاہنامۂ اردو، نسخہ نمبر ۱۷۱ [20]

شاہنامۂ اردو ایک ضخیم کتاب ہے۔ زیادہ نسخے ڈیمائی سائز پر چھپے ہیں کچھ باتصویر ہیں مثنوی ہیں ہے۔ مثنوی کی صنف بیانیہ اور توضیحی شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا نمایاں تسلسل اور ربط ہے۔ اس کی اہم خصوصیت حقایق نگاری ہے۔

احسن مارہروی کا کہنا ہے:

"جذباتِ انسانی، مناظرِ قدرت، تاریخی واقعات جس خوش اسلوبی اور روانی سے مثنوی میں سما سکتے ہیں، ان کی اتنی گنجائش کسی صنفِ سخن میں نہیں۔ زندگی کے تمام سوانح رزمیہ ہوں یا تاریخی، عشقیہ ہوں یا اخلاقی، فلسفیانہ ہوں یا افسانہ۔ غرض کہ تخیل کی کھپت مثنوی میں ہوتی ہے۔"

انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ نمبر ۱۷۱ کے مطابق ترجمہ منشی نے اپنے بھائی کے کہنے پر کیا تھا، جس کا تخلص زور آور تھا۔ اور ۱۲۵۰ھ / ۱۸۱۰ء میں اسے مکمل کیا۔

آئیے اب شاہنامۂ اردو کی جزئیات دیکھیں۔ شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ پھر مناجات۔ نعت۔ تعریف محمد اکبر شاہ بادشاہ۔ سبب تالیفِ کتاب۔ احوالِ سلطنت۔ داستان۔ جلوس۔ بیان وغیرہ ہیں۔ آخر میں خاتمۂ کتاب ہے۔ سب کے عنوانات فارسی میں ہیں۔ فارسی تراکیب کا غلبہ نمایاں ہے۔

اب ذرا آغازِ کتاب ملاحظہ ہو۔ یہ انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ نمبر ۱۷۱ سے لیا گیا ہے۔

یہ نسخہ انیسویں صدی کا ہے:

سر نامہ حمد خدائے کریم
کہ ہے کردگار غفور الرحیم

شہی بخشِ شاہنشاں ہے وہی
مہی بخشِ فرماں رواں ہے وہی

کبھی دے فریدوں کو وہ دستگاہ
کرے گاہ جمشید کو وہ تباہ

چھپی ہوئی کتابوں میں دوسرا شعر یوں ہے:

بلندی دہِ خسرواں ہے وہی
شہی بخشِ شاہنشاں ہے وہی

انڈیا آفس لائبریری کے کیٹلاگ کے آخری اشعار یہ ہیں:

غرض نظمِ دلکش نے پایا نظام
بخوبی ہوا شاہنامہ تمام

مرتب یہ شاہنامہ جب ہو چکا
کیا فکر منشی نے تاریخ کا

تو پھر ہاتفِ غیب نے صبحدم
کہا قصۂ خسروانِ عجم

چھپی ہوئی کتابوں میں پہلا شعر آخر میں "خاتمۂ کتاب" کے تحت درج ہے۔ دوسرا اور تیسرا شعر شروع میں "سبب تالیف کتاب" کے نیچے درج کیا گیا ہے۔

"شاہنامۂ اردو" کے اشعار کی تعداد کم و بیش ۱۹۴۴۰ ہے۔

حمد و مناجات ۳۴ اشعار۔ نعتیہ کلام ۲۵ اشعار۔ محمد اکبر شاہ کی تعریف میں ۲۳ اشعار کا قصیدہ ہے۔

"سبب تالیفِ کتاب" اس کتاب کا ضروری حصہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

عزیزانِ معنی شناس ایک روز
کہ تھا مثلِ نوروز بہجت فروز

بہم محفل آرا تھے ہنگامِ شب
مہیا تھے سامانِ عیش و طرب

وہ مجلس تھی رشکِ بہارِ چمن
ہر اک لحظہ تھا ذکرِ شعر و سخن

تواریخ کا بھی جو مذکور تھا
تو پھر ہر کسی نے بیاں یوں کیا

کہ ہے شاہنامہ تماشا کتاب
عجب نظم دلکش ہے باآب و تاب

ولے ہر کسی کو میسر نہیں
یہ تاریخ فرخ نہیں ہر کہیں

توکل کہ مرد سخن سنج تھا
کیا ترجمہ اس نے شاہنامے کا

لکھا نثر میں نسخۂ مختصر
کہ احوال معلوم ہو سربسر

یہ شمشیر خانی سے موسوم ہے
تمام اس میں احوال مرقوم ہے

یہ سن کر برادر مرے مہرباں
سخن فہم و دانشور و نکتہ داں

کہ زور آور ان کا جہاں میں ہے نام
تخلص پسندیدہ مشہورِ عام

یہ بولے کہ اے منشی اس نامے کو
تم اب ریختی کی زباں میں لکھو

کرو نظم ترتیب باآب و تاب
بنامِ شہنشاہِ گردوں جناب

مرتب یہ شاہنامہ جب ہو چکا
کیا فکر تب سالِ تاریخ کا

پھر ہاتفِ غیب نے صبحدم
کہا قصۂ خسروانِ عجم

شاہنامۂ فردوسی میں کیومرث سے شروع کرکے پچاس بادشاہوں، ان کے وزیروں، مشیروں، سپہ سالاروں اور پہلوانوں کے حالاتِ رزم و بزم بیان کیے گئے ہیں۔ یہ داستان یا تاریخ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوکر تین شاہی خاندانوں، کیانی، اشکانی اور ...نی کے کارناموں، مہموں، جنگوں، فتوحات، عروج و زوال کی داستان بیان کرکے ساسانی خاندان کے آخری بادشاہ یزدگرد سوم پر ختم ہوتی ہے۔ فردوسی کا یہ شاہنامہ ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ منشی کا کمال یہ ہے کہ اس نے شاہنامے کی بحر ہی استعمال کی۔ شاہنامۂ فردوسی میں رستم و سہراب کی داستان بہت دلچسپ ہے۔ اسے متعدد زبانوں میں لکھا گیا ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے اس داستان کو انگریزی نظم کا جامہ پہنایا۔ شاہنامے کا یہ عظیم ترین اور غم ناک ترین المیہ باب ہے۔ بلکہ عالمی ادب میں ایک شاہکار ٹریجڈی ہے۔ منشی نے تقریباً چار سو اشعار میں رستم و سہراب کی داستان بیان کی ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہوئے لے کے نیزے ستیزہ کناں
لگی چلنے باہم سناں پر سناں
ہوا زخم کوئی نہ واں کارگر
وہ نیزے شکستہ ہوئے سربسر
دلیروں نے پھر کھینچ کر تیغِ تیز
کیا گرم بازار لیکن ستیز
ہوئی پارہ پارہ زرہ یک قلم
رہا پھر نہ زنہار گھوڑوں میں دم
بہم ضرب پر ضرب تھی بے دریغ
شکستہ ہوئی آخرِ کار تیغ
لیا ہاتھ میں پھر عمودِ گراں
لڑے اس قدر ہر دو جنگ آوراں
جدا گانہ پھر ہر دو استادہ ہو
وہ سہراب اور رستمِ نامجو
ذرا راست کرنے لگے اپنا دم
ولیکن نہ کینہ ہوا دل سے کم
پھر اتنے میں سہراب نے یوں کہا
کہ تیر و کماں سے ہو جنگ آزما
بہم دونوں لے کر کمان و خدنگ
دلیرانِ جنگی لگے کرنے جنگ
ہوئے دم میں ترکش تہی سربسر
ہوا پر نہ اک تیر بھی کارگر
پکڑ کر کمر ہمدگر بعد ازاں
لگے زور کرنے وہ دونوں جواں
کیا پہلے رستم نے زور اس قدر
کہ وہ زور کرتا اگر کوہ پر
تو دیتا جبل کو زمیں سے ہلا
ولیکن نہ سہراب زیں سے ہلا
کیا زور اس نے بھی ہر چند پر
نہ لیکن ہلا رستمِ نامور

جنگ کی منظر کشی، اشعار میں زور اور روانی، تخیل کی جولانی، بلند پروازی، تصور کی ندرت آفرینی اور مشاہدے کی باریک بینی کا بڑا شاعرانہ اور حقیقت انگیز امتزاج ہے۔

لاہور کے بشیر ساجد لکھتے ہیں:[11]

"حیرت ہے کہ اُردو شعر و ادب کی تاریخ و تنقید میں اس کا کہیں سرسری ذکر بھی نہیں ملتا۔ کسی نقاد نے اس پر توجہ نہیں کی۔ حالاں کہ یہ اس قابل ہے کہ جدید انداز میں اسے مرتب اور مدوّن کرکے ایک تحقیقی مقدمے کے ساتھ شائع کیا جائے۔"

مولچند منشی کا انتقال ۱۸۳۲ء میں ہوا اور اسی سال ان کے استاد شاہ نصیر کا بھی انتقال ہوا۔

مناسب ہوگا کہ مولچند منشی کے تمام کام کا جائزہ لیا جائے اور شاہنامۂ فردوسی کے منظوم اُردو ترجمے کی بھی تلاش کی جائے جس کی آج سے ۱۰۷ سال قبل دیبی پرشاد بشاش نے نشاندہی کی ہے۔

حواشی:

۱ "عالمگیر" لاہور، خاص نمبر، جلد ۱۰ نمبر ۱ صفحہ ۱۳۱، ۱۳۲۔

۲ انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ، نمبر ۱۷۱۔

۳ " "

۴ اُردو کے ہندو مثنوی نگار عطاءاللہ پالوی صفحات ۱۹۸ تا ۲۰۷، مطبع آرٹ پریس، پٹنہ۔

۵ "

۶ تذکرہ آثار الشعرائے ہنود، از دیبی پرشاد بشاش، مطبع رضوی ۱۱۵ء، صفحہ ۱۲۳۔

۷ "

۸ انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

نئی مطبوعات

بوڑھے کے رول میں

مصنّف : محمد اسد اللہ

صفحات : ۱۰۶

قیمت : ۳۵ روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

سال ۱۹۸۵ء میں مصنّف کی ایک کتاب ...ال ہم نشیں" پڑھی تھی۔ یہ مراٹھی مزاحیوں کے ...م پر مبنی تھی۔ کتاب زیرِ نظر انشائیوں کا مجموعہ ... مصنّف کا کہنا ہے کہ وہ ۱۹۷۷ء کے آس ...ہانیوں، نظموں سے کھلواڑ کرتے رہے آخر ان ...ب سے دامن بچاکر انشائیہ کی کھلی فضا میں ...آئے۔

انشائیہ ایک لطیف صنفِ ادب ہے ...ں کہ اس میں غزل کا سا ایجاز، افسانے کا ...تاثر، ناول کا سا فلسفۂ حیات اور ڈرامے کے ...انتظاریہ لمحات اور ان کے پس منظر میں ...ز و مزاح کی دھیمی دھیمی سمفنی ہوتی ہے۔ ان ...ب پر مستزاد انکشافِ ذات کا عمل یہی وہ ...ہیں ہیں، جن کا انشائیے میں ہونا ضروری ہے۔ ...ی انشائیہ پڑھ کر کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے ...تحریر کی نفاست، غنائیت اور رنگینی اس کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔

مصنّف نے اس کتاب میں ۱۵ انشائیے شامل کیے ہیں۔ جو متعدد رسالوں میں پہلے چھپ چکے ہیں۔

پیش لفظ میں ڈاکٹر وزیر آغا نے مصنّف کو انشائیہ نگاری میں کامیاب بتایا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے صفِ اوّل کا انشائیہ نگار اور احمد جمال پاشا (مرحوم) نے "حرفِ آخر" میں انشائیہ نگاروں میں چمکتا چہرہ قرار دیا ہے۔

انشائیہ لکھنا مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح معنوں میں انشائیے بہت کم لکھے جاتے ہیں۔ ہر تحریر پر انشائیہ کا لیبل لگا لینا اور بات ہے۔

کچھ انشائیوں کے تیور ملاحظہ فرمائیے:

انڈا: عورت اس وقت مکمل ہوتی ہے جب وہ ایک آدھ بچّے کو جنم دینے میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔ بھلا خاندانی منصوبہ بندی والوں کو یہ نکتہ کون سمجھائے کہ انسانی یا حیوانی سطح پر تخلیق کا ہر نشان پوری کائنات کی تکمیل کی طرف اٹھتا ہوا قدم ہے۔ ہر انڈا اپنے چلبلے بشرے سے تکمیلیت کی ایک عجب سی آسودگی سے سرشار نظر آتا ہے تو اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ اس کے خاندان کا چراغ اس کی ذات میں روشن ہے بلکہ آئندہ نسلوں کی پوری فوج اس کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ وہ وقت کی طویل زنجیر میں ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک اہم کڑی ہے۔

گنگنانا: میں جب غسل خانے سے نہا دھوکر نکلتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں پورا صوفی بن چکا ہوں۔ پاک و صاف، بے ریا، بے لوث، جیسے بدن کے میل کے ساتھ روح کی آلائش بھی پانی میں بہہ گئی۔ اس تذکیے کے دوران ہم ہلکے پھلکے ہوکر گنگنانے لگتے ہیں۔ شاید اسی لیے محفلِ سماع میں گنگنانے کو خاص دخل ہے۔ اشلوک، آیتوں اور [illegible] کی محبوب سواری یہی گنگناہٹ ہے نظمیں اور اشعار جو دراصل آدمی کے اندر کے خبرنامے ہیں، گنگناہٹ ہی کے کاندھے پر سوار فضا میں تتلیوں کی طرح بھٹکتے پھرتے ہیں۔"

اسی قسم کا رنگ و آہنگ سبھی انشائیوں میں ملتا ہے۔ موضوعات بالکل نئے ہیں۔

صفحہ ۳۳ پر صفحہ ۳۲ کی عبارت دہرائی گئی ہے۔ اسے حذف سمجھا جائے۔ اچھے انشائیے ہیں۔ اچھی کتابت اور اچھی طباعت سے مزیّن۔

——— رام لعل نابھوی

محلّہ دیوان، نابھا

سنسان جنگلوں کا راستہ

مُصنف : شبّیر اختر
صفحات : ۱۱۱
قیمت : ۴۰ روپے
ناشر : مکتبہ دین و ادب، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

"سنسان جنگلوں کا راستہ" شبّیر اختر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر مظفّر حنفی نے پیر مقدم کے عنوان سے شبّیر اختر کے افسانوں کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ادب کی دنیا میں شبّیر اختر کا خیر مقدم کیا ہے۔ فلیپ پر عائشہ صدّیقی کی رائے ہے۔ رام لعل نے قارئین کے نقطۂ نظر سے گہرا رشتہ قائم کرنے کے شبّیر اختر کے انداز کو روایت کے احترام کا نام دیا ہے۔

"سنسان جنگلوں کا راستہ" کے افسانے انسانی زندگی کے مختلف النوع مسائل کا احاطہ کرتے تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی اس انداز سے کرتے ہیں کہ قاری کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مغربی اطوار کی تقلید میں سماج اور فرد کے رشتوں کی ناہمواری، فرقہ وارانہ فسادات سے پیدا ہونے والے مسائل و مصائب اور ان کے دور رس نتائج، بیجا رسوم کا شکار عام آدمی اور اس کا ذہنی رویّہ، اپنی ذات کے بجائے کائنات میں حُسن کی تلاش کا المیہ، استحصال زدگی اور فراریت کا خطرناک انجام جیسے مسائل شبّیر اختر کے افسانے کا بنیادی موضوع ہیں۔

سفید کبوتر، جگ اندھیرا ہی رہا، سنسان جنگلوں کا راستہ اور بے سمت راستے کا سفر جیسے افسانے افسانہ نگار سے بہتر توقعات کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ 'پرایا پھول' اور 'آخری واپسی' جیسے افسانے گھسے پٹے موضوعات پر مشتمل عام افسانے کی طرح ہیں جسے نیا انداز دینے کی کوشش کی گئی ہے، بعض افسانوں میں دو مختلف کرداروں کے مکالموں میں ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

کتابت و طباعت گوارا ہے سرورق کتاب کے نام کی مناسبت سے معنی خیز ہے۔

—— عطا عابدی

153/22-E، ذاکر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

خرام حرف

مصنّف : دلکش ساگری مرحوم
قیمت : ۴۸ روپے
ملنے کے پتے : (۱) محمد طاہر سوداگر، دلکش منزل، سرونج
(۲) بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ بھوپال
(۳) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
(۴) فلمی ستارے، ترکمان گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

"خرام حرف" دلکش ساگری کا شعری مجموعہ ہے جو سعادتمند اولاد کی کوششوں سے کتابی صورت میں قارئین کے ہاتھوں تک پہنچا ہے۔

جہاں دلکش ساگری مرحوم کی دو تذکرہ نما کتابیں "بھوپال میں غزل" اور "گمنام گوشے" ان کے نثری اسلوب اور اہل ادب سے ان کی ہمدردی اور محبّت کا پتہ دیتی ہیں، وہیں "خرام حرف" ان کے شعری ذوق کی ترجمان ہے۔

یہ کتاب ۵۱ غزلوں کے ۲۷۷ اشعار اور چار چار مصرعوں کے ۲ دو قطعات پر مشتمل ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دلکش ساگری مرحوم کی بنیادی دلچسپی غزل سے تھی، ان کا شعری ذوق اگرچہ روایت کا امین ہے مگر تقاضائے جدّتِ سخن سے منحرف نہیں۔

ذاتی تجربات و مشاہدات اور عصری مسائل سے پیدا شدہ احساسِ اضطراب انگیز، ان کے اشعار میں جابجا ملتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب بقولِ ناشر نہایت عجلت میں تمام مراحل سے گزر کر سامنے آئی ہے شاید اسی لیے دورانِ ترتیب اور بعد از کتابت نظرِ ثانی کی محتاج رہی۔ پھر بھی قاری کو کافی اچھا شعری سرمایہ فراہم کرتی ہے، مثلاً:

کیا اپنی طرف دیکھوں جب شہرِ مسائل میں
ٹوٹی ہوئی ہر گھر کی دیوار نظر آئے

نہ ہیں رسول نہ ہادی نہ پیشوا نہ امام
مجھے تو میرے وطن سے نکالتا کیوں ہے

کیوں زمیں ہم پر ہوئی جاتی ہے تنگ
آسمانوں کی طرف اڑ جائیں کیا

چلو کہ اس سے بھی کچھ دیر گفتگو کر لیں
یہ اجنبی تو مصیبت زدہ سا لگتا ہے

—— طاہر اسلم

2236/x، گلی نوتان، ترکمان گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

کھنڈر میں چراغ

مصنف : ملک زادہ جاوید
صفحات : ۱۴۴
قیمت : ۶۰ روپے
ناشر : مصنف، سی۔۱۳۳۹، اندرانگر، لکھنؤ

آزادی کے بعد اُردو شاعری میں جس قدر
ع آیا ہے وہ بے مثال ہے۔ ۱۹۴۷ء میں
ملک آزاد ہوا تو ہر صنف ادب پر ترقی
ندی کی چھاپ تھی دیکھتے دیکھتے یہ رنگ بدلنا
ع ہوا اور جدیدیت کی تیز لہر نے اس کی جگہ
۔ جدیدیت میں شدّت آئی تو اس شدّت کا
ردِّعمل ہوا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد جو شاعر آئے
ے یہاں جدید اسلوب بھی تھا اور ترقی پسندانہ
ات بھی۔ ملک زادہ جاوید کی شاعری اسی دور
جمانی کرتی ہے۔ ان کی شاعری پر تقریباً
رہ بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور اب
اپنا پہلا مجموعۂ کلام لے کر اس اعتماد کے
بزمِ سخن میں آئے ہیں:

بیتے دنوں کی یاد ہوں کل کا سراغ ہوں
اے زندگی میں تیرے کھنڈر کا چراغ ہوں

شعر سے جاوید نے اپنا تعارف کرایا ہے اور
صح ہے کہ ان کی شاعری میں ڈوبتے سورج کی
شن کرنوں کو پکڑنے کی آرزو ہے۔ انھوں نے
ے طور پر سوچا ہے اور اپنی لفظیات برتی
۔ ان کی شاعری میں کھنڈر، پرندے، چراغ،
لی وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کے ذریعے ان
مضطرب ذہن کو سمجھا جا سکتا ہے:

نقشِ ماضی مٹ گئے سب رفتہ رفتہ شہر کے
اس عمارت کی جگہ تھا مقبرہ ٹوٹا ہوا

گفتگو نہیں کرتے اپنے آشیانوں کی
یہ عجیب فطرت ہے موسمی پرندوں کی

نہ گھر نصیب ہو کوئی، نہ سائبان رہے
یہی بہت ہے مرے سر پہ آسمان رہے

جاوید کا یہ پہلا مجموعۂ کلام ان کے خوش آئند مستقبل
کی نشاندہی کرتا ہے۔ ابتدا میں ہی ان کے بارے
میں چھ مضمون شامل ہیں جن کو پڑھنے کے بعد
قاری ان کے کلام سے ملتا ہے اگر اتنے زیادہ
مضمون شروع میں نہ ہوتے تو اچھا تھا۔

—— رضیہ حامد

B 45، بھوپال کالونی، سیکٹر ۱۷، نوئیڈا ۲۰۱۳۰۱

ہزار شعر

مؤلف : ایم آر گپتا ستوریا

صفحات : ۱۲۸

قیمت : قومی یکجہتی اور اُردو دوستی

ناشر : ادارہ شہیدانِ وطن پرکاشن،
معرفت راجندر پرتاپ گپت،
۳/۲۰ بی، انڈین ایئر لائنز
کالونی، کالینہ، بمبئی ۴۰۰۰۲۹

زیرِ نظر کتاب ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے جو مختلف شعرا کے ہیں۔ یہ اشعار ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک احاطہ کرتے ہیں۔ مؤلف نے شعرا کے اسما اس لیے نہیں لکھے تاکہ قارئین خود اشعار کو گنگنائیں اور معلوم کریں کہ کون سا شعر کس شاعر کا ہے کچھ لوگوں کو یقیناً اس تلاش و جستجو میں لطف آئے گا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

چار دن کی دوستی کا ہے زمانے میں رواج
کس توقع پر کوئی کس سے شناسائی کرے

دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یارب
میرا اپنا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

مہربانی کی آس رہنے دے
کون جیتا ہے مہربانی تک

یوں دیجیے فریبِ محبت کہ عمر بھر
میں زندگی کو یاد کروں، زندگی مجھے

وہاں تک محبت نبھاؤں گا تم سے
جہاں تک محبت کا امکان ہوگا

جوانی سر کسی کی باعثِ الزام ہوتی ہے
نگاہِ نیک بھی اس عمر میں بدنام ہوتی ہے

قوم کا غم ہوا لے کے دل کا یہ عالم ہو
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

—— دلیپ بادل

چراغ دلی، نئی دہلی ۱۱

ششماہی علم و ادب (دوسرا شمارہ)

صفحات : ۹۶ (ڈیمائی سائز)

قیمت : ۶ روپے

ناشر : حلقۂ ادب۔ لکھمنیا
ضلع بیگو سرائے (بہار)

رسالہ "علم و ادب" شمالی بہار کے مشہور گاؤں لکھمنیا سے شائع ہونے والا ایک ششماہی جریدہ ہے۔ یہاں ہر دور میں ادیب، شاعر اور عالم دین موجود رہے ہیں۔ رسالہ "علم و ادب" کے جواں سال مدیر اور شاعر طارق متین اسی ماحول کے پروردہ ہیں —— اب تک "علم و ادب" کے دو شمارے آچکے ہیں۔ دوسرا شمارہ جو میرے سامنے ہے پہلے شمارے کی نسبت زیادہ معیاری

ہے۔ اس کے مشمولات میں آج کے مشاہیر کی تخلیقات درج ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کی افسانوی صورتِ حال پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مہمان اداریہ اپنی زبان کی خامیوں کے باوجود ایک اچھا جائزہ ہے۔ حسن عسکری مرحوم کے ایک مقالے "روایت کیا ہے؟" پر بحث کرتے ہوئے حبیب الحق نے بہت اہم سوالات اٹھائے ہیں جو مزید بحث کے لیے دروازے کھولتے ہیں۔ "اُردو ناول کے اہم رجحانات" سے متعلق ڈاکٹر شاہد جمیل کی تحریر اور ڈرامے کے فن پر ظہیر انور کا تجزیہ" کامیڈی آف دی آرٹ" بھی اپنی جگہ اہم ہیں۔

اس شمارے میں مخمور سعیدی کی نظمیں "بازار سے گھر تک" اور "ترغیب" بہت زیادہ متاثر کرتی ہیں "بازار سے گھر تک" پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا حساس دل ان تہی دست اور ناآسودہ لوگوں کے کرب کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے جو آج کے جھمجماتے اور لالچ کا جال پھینکتے بازاروں کی تاب نہ لا کر تاریکیوں کی پناہ میں خود کو چھپا لینے کی ناکام کوشش کرتے ہیں:

نام بڑی دوکانوں کے چبھتے رہیں گے آنکھوں میں
خالی ہاتھ جو گھر پہنچا نیند نہ اس کو آئے گی

دوسری نظموں میں قیصر شمیم کی نظم "نئے کوہ قاف کی کھوج میں" عمدہ ڈکشن اور خوبصورت منظر نامہ پیش کرتی ہے مگر قاری کے لیے ایک سوال بن کر رہ جاتی ہے اور اس کا جواب ساجدہ زیدی کی نظم "یہ وقت کا بیکراں سمندر" میں بڑی عمدگی سے سامنے آجاتا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ صدف جعفری کی ہائیکو اور ماہیے بھی فن اور تجربات کو اعتبار بخشتے ہیں۔ البتہ شباب للت کی رباعیاں کمزور ہیں — غزلوں میں رمز عظیم آبادی کی غزل (بے موسم کے پانی برسے ساون ساون دھوپ) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ سالک لکھنوی، عنوان چشتی، ابراہیم اشک، عشرت ظفر، شرون کمار ورما، جمیل فاطمی اور طارق متین کی غزلیں بھی دلکش ہیں۔

افسانوں میں علی امام نقوی کا افسانہ "چھلاوے" نہایت دلچسپ اور فنکارانہ ہے۔ اقبال حسن آزاد کی علامتی کہانی بابری مسجد او فسادات کے مسئلوں کی جانب واضح اشارے کرتی ہے مگر مشرف عالم ذوقی کی کہانی "اپنی ک کیسی ہے؟ اس کا فیصلہ قارئین کریں گے تبصرے ا مکتوبات بھی رسالے سے بڑے قلمکاروں کی دلچسپی کا پتہ دیتے ہ

——— قیصر اقبال، مونگ

بقیہ:

شاہنامۂ اُردو

نمبر ۱۷۱۔

؎۹ " " "

؎۱۰ تا ؎۱۵ یہ مطبوعہ نسخے ناجھوی کے پاس ہیں۔

؎۱۶ بشیر ساجد، لاہور کے پاس ہے۔

؎۱۷ دیکھیے ترجمہ ہائے متون فارسی، صفحہ ۱۸۳۔

؎۱۸ " " "

؎۱۹ کیٹلاگ کتب خانہ نواب سالار جنگ۔

؎۲۰ انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ — نمبر ۱۷۱

؎۲۱ سیارہ لاہور، سالنامہ ۱۹۹۱ء مضمون بشیر ساجد، لاہور، بہ عنوان "شاہنامۂ منشی — ایک فراموش شدہ رزمیہ مثنوی"

ایوانِ اُردو کے اگلے شمارے میں
ہم جناب غلام ربّانی تاباں پر ایک خصوصی گوشہ
پیش کر رہے ہیں
اس شمارے کی ضخامت عام شمارے سے زیادہ ہوگی
لیکن قیمت میں کوئی اضافہ نہ ہوگا

——— ادارہ

اُردو خبرنامہ

مشاعرہ جشنِ جمہوریت

ہر سال کی طرح ۲۳ جنوری کی رات'
ے کے سبزہ زار پر جشنِ جمہوریت کا کُل ہند
رہ منعقد ہوا جس کا اہتمام حسبِ
ن اُردو اکادمی، پنجابی اکادمی، ہندی اکادمی
ا ہتیہ کلا پریشد نے مل کر کیا تھا۔ مشاعرے
یب مشاعرہ ملک زادہ منظور احمد کے
کُل ۲۶ شعرا اور شاعرات کو مدعو کیا
ا جن میں سے ۲۴ نے شرکت کی۔ جنابِ
دار جعفری اپنی کسی دوسری مصروفیت
سے، محترمہ ممتاز میرزا ناسازیٔ مزاج
سب سے اور جنابِ محمد علوی، جنھیں
باد سے آنا تھا' وہاں کے نامساعد حالات
سے مشاعرے میں شریک نہ ہوسکے۔
مشاعرے کا افتتاح دہلی کے لیفٹننٹ
جناب پی۔ کے۔ دوے نے شمع روشن
کیا۔ انھوں نے کہا کہ ۲۶ جنوری کا دن
ا ہمیں آئین کے احترام اور جمہوری قدروں
داری کا پیغام دیتا ہے اور اس پیغام



دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب
پی۔ کے۔ دوے مشاعرے
کی شمع روشن کرتے ہوئے
ساتھ کھڑے ہیں
جناب [illegible]

کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا صحت مندانہ قومی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس سے پہلے اکادمی کے سیکریٹری جناب اشتیاق عابدی نے محترم گورنر صاحب، شعرا اور ناظرین کا مشاعرہ کو خوش آمدید کہتے ہوئے زور دے کر یہ بات کہی کہ اردو زبان اور اردو ثقافت کا خمیر مختلف نسلی گروہوں اور مذہبی فرقوں کے باہمی میل جول اور بھائی چارے سے اٹھا ہے۔ ضرورت ہے کہ باہمی محبت و اخوت کی اس روایت کو نہ صرف قائم رکھا جائے بلکہ اسے فروغ بھی دیا جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے زمانے میں کچھ طاقتیں اس روشنی کو بجھانے کے درپے ہیں، ہمیں ان طاقتوں سے ہار نہیں ماننی ہے اور اس روشنی کو زندہ رکھنا ہے۔

مشاعرے کی صدارت جناب پرشوتم گوئل نے کی اور نظامت ملک زادہ منظور احمد نے۔ پرانے شہر میں رات کا کرفیو نافذ تھا لیکن پھر بھی اردو شاعری کے قدرشناسوں کی ایک کثیر تعداد مشاعرے میں شریک ہوئی۔ انتظامیہ کی طرف سے واپسی کے لیے موقعے پر ہی کرفیو پاس کے اجرا کا انتظام تھا جس کا اس روز کے اخباروں میں اعلان آ گیا تھا۔



دہلی اردو اکادمی کے سیکریٹری جناب اشتیاق عابدی حاضرین سے مخاطب ہیں۔



اسٹیج کا ایک منظر، بائیں سے: جناب پی۔ کے۔ دوے، جناب پرشوتم گوئل، جناب بیکل اتساہی، جناب بشیر بدر، محترمہ ملکہ نسیم، جناب ساغر خیامی، جناب وسیم بریلوی۔



کیفی اعظمی

گرڈوبنا ہی اپنا مقدر ہے تو سنو
ڈوبیں گے ہم ضرور مگر ناخدا کے ساتھ



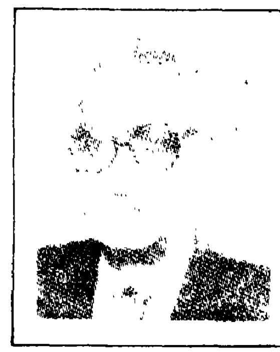
ملک زادہ منظور احمد

کل خزاں میں دیوانے بے نیازِ دامن تھے
فکرِ پیرہن اب ہے جب بہار آئی ہے



بشیر بدر

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو



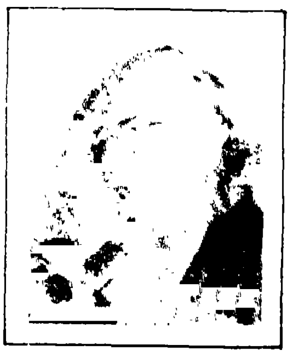
جگن ناتھ آزاد

کاش تجھے دکھائی دے اے مرے دیدہ ور وطن
آج جبینِ وقت پر ابھری ہوئی جو ہے شکن



بیکل اتساہی

ضد، حسد، نفرت، تعصب، دشمنی تحریر ہے
کیسے کیسے روپ میں اب زندگی تحریر ہے



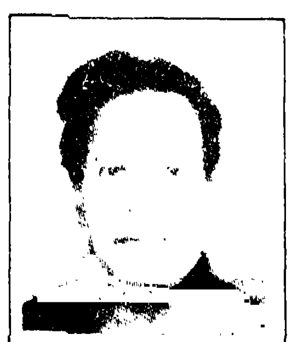
مخمور سعیدی

مری آنکھوں میں اک مسمار مسجد
مرے کانوں میں اک زخمی اذاں ہے



خمار بارہ بنکوی

مرنے سے پہلے شکل ہی اک بار دیکھ لوں
اے موت زندگی کا پتا چاہیے مجھے



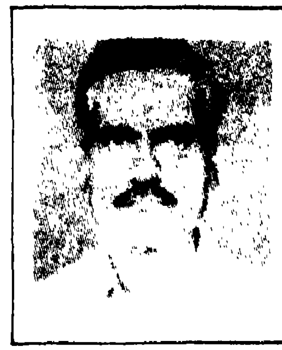
کرشن بہاری نور

کہاں کی ہار محبت میں اور کیسی جیت
میں روٹھ جاؤں کبھی خود کبھی مناؤں اسے



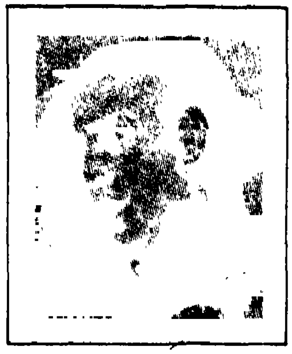
بانو دارابِ وفا

فصیلِ شب سے لٹکتا ہے آج سر اُس کا
کل آفتاب سا چمکے گا آسمان میں وہ



ساجد اشر

دِل سے دِل کا رابطہ کٹ جائے گا
طنز کی قینچی چلائی جائے گی



ندا فاضلی

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجے رشتہ
دِل ملے یا نہ ملے، ہاتھ ملاتے رہیے



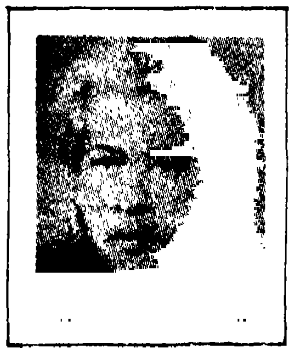
ملکہ نسیم

گھر کی ویرانی سے شب بھر گفتگو کرتے ر
کوئی آہٹ ہی نہ تھی در کھولتے بھی کس ط



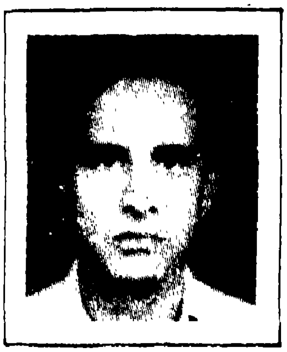
راھی شہابی

علم اک موتی بھی ہے شبنم بھی ہے تارا بھی ہے
اور غلط ہاتھوں میں پڑ جائے تو انگارا بھی ہے



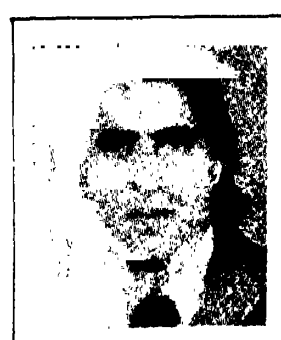
والی آسی

پھر وہی ریگِ بیاباں کا ہے منظر اور ہم
پھر مقابل میں ہے اک ظالم کا لشکر اور ہم



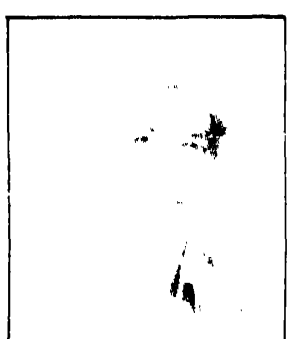
معراج فیض آبادی

ہر ایک سینے میں دِل ہو مگر کشادہ ن
دِیا جلے تو جلے روشنی زیادہ نہ



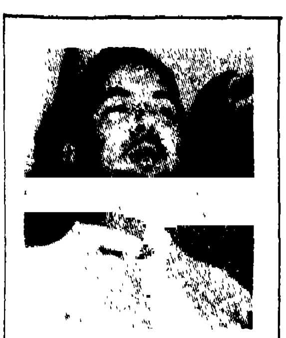
وسیم بریلوی

میلے کی رونقوں میں بہت گم تو ہو وسیم
گھر لوٹنے کا وقت میاں سر پہ آ گیا



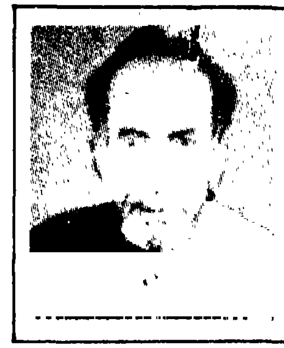
مظفر رزمی

خدا ہی پار لگائے گا اس کو اب رزمی
یہ ناخدا تو سفینہ بھنور میں چھوڑ آیا



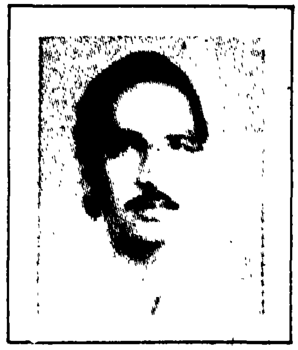
رؤف خیر

ہمیں سنبھال کہ ہیں شاہکارِ کوزہ گر
ہماری خاک تیری آگ سے توانا۔



نواب احسن

ہند آوارہ سے لمحوں کی بدولت اکثر
ہرے بدلے ہوئے صدیوں کے نظر آتے ہیں



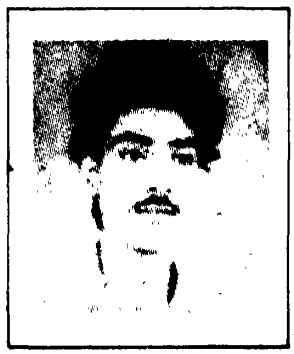
نواز دیوبندی

تم سایہ سایہ چل کے بہت خوش ہوا ور ہیں
رستے میں ایک چھوٹا سا پودا لگا کے خوش



منور رانا

کبھی تھکن کے اثر کا پتا نہیں چلتا
ہ ساتھ ہو تو سفر کا پتا نہیں چلتا



راشد ندیم

اگر وہ پوچھنے آئے گا حالِ دل راشد
تو اس کے سامنے سوکھا گلاب رکھ دیں گے



منظر بھوپالی

جس کو ہم شعلہ بناتے وہ شرر پانی کیا
آنسوؤں نے آج تو خونِ جگر پانی کیا



ساغر خیامی

اب کے برس فساد کا گھر گھر اثر گیا
دنگوں سے جو بچا تھا وہ فاقوں سے مر گیا

ادیب آگے آئیں

اُردو بھون، پٹنہ میں حلقۂ ادب بہار کی جانب سے ایک ادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت اقلیتی کمیشن حکومت بہار کے سابق چیئرمین جناب ہارون رشید نے کی۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی اور کہا کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندستان فسطائیت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ فرقہ پرستی کا یہ فتنہ عظیم ہندوستان اور اُردو آبادی کی تباہی و بربادی کا باعث ہو سکتا ہے۔ تمام غیر فرقہ پرست عناصر کے لیے یہ ایک مشترک خطرہ ہے۔ لہٰذا ان عناصر کا مقابلہ بھی متحد ہو کر کرنا چاہیے۔"

جلسے سے خطاب کرنے والے تمام ادیبوں اور شاعروں نے فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحان پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا اور اس بات پر زور دیا کہ اس وقت ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی ایکتا کی فضا کو مضبوط اور خوشگوار بنانے کی غرض سے تمام سیکولر طاقتوں کو آگے آنا چاہیے تاکہ ایک مرتبہ پھر نئے سرے سے ملک کے اندر محبت، اخوت اور بھائی چارے کی فضا پیدا ہو سکے۔

(فخر الدین عارفی)

بزمِ خوشدلانِ جودھ پور

سالِ نو کی آمد پر بزمِ خوشدلانِ جودھ پور کے زیرِ اہتمام ایک خصوصی

نشست منعقد کی گئی۔ مہمانِ خصوصی تھے
بزم کے سرپرست سابق فائنس منسٹر (حکومتِ راجستھان) محترم متھراداس ماتھر۔ صدارت کی جودھ پور کے اسّی سالہ بزرگ شاعر جناب ابوالاسرار رمزی اٹاوی نے۔ پروگرام کی نظامت پروفیسر مدن موہن ماتھر نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں سرانجام دی۔

بزمِ خوشدلاں کے صدر جناب پریم شنکر سریواستو نے مہمانوں کا استقبال تازہ پھولوں کے گلدستے پیش کرکے کیا۔ اور بزم خوشدلاں کے اوّلین سرپرست محترم بی۔ پی۔ بیری صاحب (سابق چیف جسٹس، راجستھان) کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ بیری صاحب نے لکھا تھا "سیاسی قلابازیوں نے ہمارے ملک کو تاریک غاروں میں دھکیل دیا ہے۔ ایسے زبوں حالات میں ظرافت و خوشدلی ہی ہمیں مایوس و ہراساں ہونے سے بچا سکتی ہے۔"

پروگرام میں شرکت کرنے والوں میں ہندی، اُردو اور راجستھانی کے نوجوان اور بزرگ طنز و مزاح نگار (نظم و نثر) اور لطیفہ گو حضرات شامل تھے۔ مہمانِ خصوصی جناب متھراداس ماتھر نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارے ملک کی تاریخ میں ۱۹۹۲ء کا سال سب سے پراگندہ اور وحشت ناک سال گزرا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کا منحوس سایہ نئے سال پر بھی پڑے۔ لیکن ہمیں اپنا ذہنی توازن برقرار رکھتے ہوئے ہنستے ہنستے اس آسیب کو کھدیڑ دینا چاہیے۔ متھراداس ماتھر صاحب اپنی عمر کے ۷۷ ویں سال میں بھی زندہ دلی اور جوانوں کا سا جوش سلامت رکھے ہوئے ہیں۔ آپ نے کئی پُرلطف اشعار اور چٹ پٹے لطیفے سُنا کر پوری محفل کو زعفران زار بنا دیا اور اس طرح جلسے کی



۱۶ جنوری ۹۳ء کو راشٹرپتی بھون میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما کو رسالہ "فکر و آگہی" دہلی کا خصوصی شمارہ "بیکل اتساہی نمبر" پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر رضیہ حامد (مدیرہ فکر و آگہی) اور بیکل اُتساہی۔



اس موقع پر جناب رفعت سروش نے اپنا تازہ مجموعۂ کلام "شاخِ گل" بھی صدر جمہوریہ کو پیش کیا۔ درمیان میں کھڑی ہیں سروش صاحب کی صاحبزادی محترمہ شبانہ نذیر۔

بابی میں چار چاند لگا دیے۔
سالِ رواں کے لیے بزمِ خوشدلانِ جودھپور کی نئی تشکیل ہوئی وہ اس طرح ہے :
سرپرست : جسٹس بی۔پی۔ بیری، متھرا داس ماتھر۔ صدر : پریم شنکر سریواستو۔ نائب صدر : ایس۔آر سنگھی، لیاقت اللہ خاں۔ جنرل سیکریٹری و خازن : ایم۔ ایل۔ شرما۔ پبلک ریلیشنز آفیسر : بی۔ ایل۔ راج پروہت، ہیمنت شرما۔ معاون سیکریٹری : لیاقت اللہ خاں۔
قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ستمبر یا اکتوبر ۱۹۹۳ء میں خوشدلانِ جودھپور کے زیرِ اہتمام اور ملک کی مختلف اکیڈمیوں اور دیگر ادبی اداروں کے تعاون سے ایک سہ روزہ تقریب منعقد کی جائے گی جس میں اُردو، ہندی، راجستھانی، سندھی، پنجابی، برج اور اگر ممکن ہو تو انگریزی کے بھی مزاح نگار ان نظم و نثر کو دعوتِ شرکت دی جائے گی۔
خط و کتابت کا پتہ :
پریم شنکر سریواستو، ۸۴۱، ساوتری سدن، ۱۱۔ چوپاسنی روڈ، جودھپور ۳۴۲۰۰۳۔

نوائے میر ایوارڈ

آل انڈیا میر اکادمی، لکھنؤ نے اپنی سلور جبلی کے موقعے پر ڈاکٹر اختر بستوی کو "نوائے میر" ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ آل انڈیا میر اکادمی اس سے قبل ۱۹۸۵ء میں اختر صاحب کو "امتیازِ میر" ایوارڈ دے چکی ہے۔



پچھلے دنوں سپرو ہاؤس کی ایک تقریب میں مرکزی وزیر جناب کمال الدین احمد نے جناب کے۔ ایل۔ ساقی نارنگ کی مرتب کردہ کتاب "ادیبوں کے لطیفے" کا اجرا کیا۔ تصویر میں ان دونوں حضرات کے علاوہ مرکزی وزیر جناب جی۔ وینکٹ سوامی کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس تقریب کی صدارت مشہور مجاہدِ آزادی جناب بشمبر ناتھ پانڈے نے کی اور بزرگ ادیب جناب مالک رام نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ مقررین میں دونوں مرکزی وزرا اور صاحبِ صدر کے علاوہ اور کئی لوگ شامل تھے۔ جناب سید شریف الحسن نقوی نے جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

جناب غلام ربانی تاباں کا انتقال

زندگی بھر فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد کرنے والے اور اپنی شاعری کے ذریعے انسانی مساوات کی تعلیم دینے والے ۷۹ سالہ ممتاز ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباں کا ۷ فروری کو جامعہ ملیہ کی ذاکر نگر کالونی میں ان کی رہائش گاہ پر شام ساڑھے چار بجے انتقال ہو گیا۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کا جسدِ خاکی ان کے آبائی وطن قائم گنج لے جایا گیا اور وہاں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ تاباں صاحب تقریباً ایک ماہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں زیرِ علاج رہ کر دس دن قبل گھر آ گئے تھے۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ تاباں صاحب نے اپنی آنکھیں عطیے میں دینے کی وصیت کی تھی لیکن اسپتال میں کسی ڈاکٹر کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ان کی یہ آخری خواہش پوری نہ ہو سکی۔

غلام ربانی تاباں ۱۵ فروری ۱۹۱۴ء کو موضع پتھورہ تحصیل قائم گنج ضلع فرخ آباد (اتر پردیش) میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی۔ دسویں پاس کر کے علی گڑھ چلے گئے جہاں سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ وہاں سے آگرہ جا کر بی۔ اے اور پھر ایل۔ ایل۔ بی پاس کیا۔ فتح گڑھ میں ۱۹۴۰ء میں وکالت شروع کی۔ وکالت نہ چلی اور نہ ہی تاباں صاحب نے اس میں کوئی دلچسپی لی۔ مزاج شاعرانہ تھا۔ ملک کی آزادی کا جذبہ لیے وہ آزادی کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۵۰ء میں دہلی میں مکتبہ جامعہ میں ملازمت کر لی اور ۱۹۵۷ء میں مکتبہ کے جنرل منیجر بن گئے جہاں سے ۱۹۷۰ء میں ریٹائر ہوئے۔

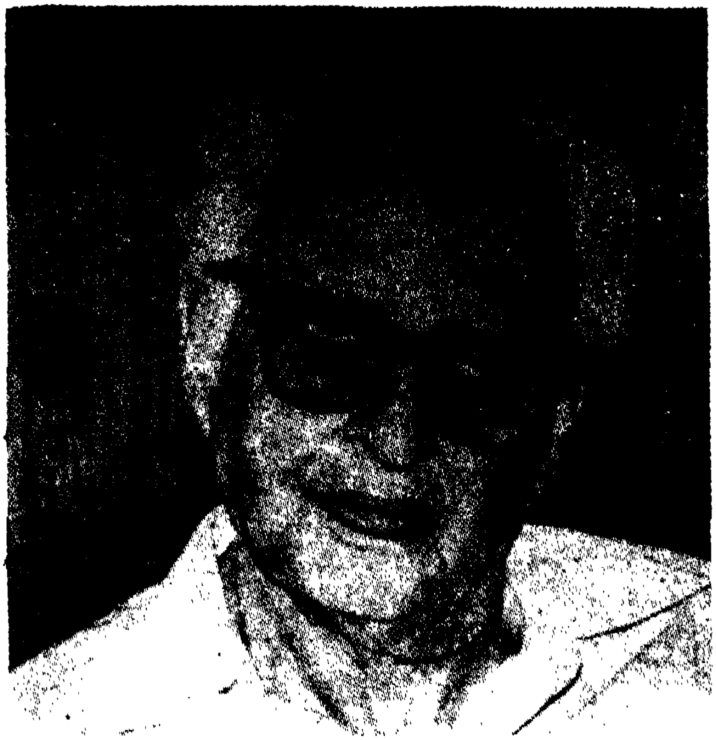
مرحوم دہلی اُردو اکادمی کی گورننگ کونسل کے سرکردہ ممبر اور سمینار و مشاعرہ کمیٹی کے چیرمین تھے۔ ابھی عہدے کی مدت پوری نہیں ہوئی تھی کہ ان کی زندگی کے دن پورے ہوگئے۔ ۸ر جنوری کو اکادمی کے دفتر میں تعزیتی جلسہ منعقد ہوا اور اس کے بعد مرحوم کے سوگ میں دفتر بند کر دیا گیا۔ جلسے میں درجِ ذیل قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی:

"جنابِ غلام ربّانی تاباں کی وفات ہمارے زمانے کا ایک بڑا ادبی سانحہ ہے۔ وہ کم و بیش گزشتہ پچاس سال سے شعر و ادب کی بے لوث خدمات انجام دے رہے تھے اور انھوں نے اپنی غزلوں اور نظموں سے اُردو شاعری کے سرمائے میں گرانقدر اضافے کیے ہیں۔

جنابِ غلام ربّانی تاباں قائم گنج کے ایک بڑے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے لیکن ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد جب انھوں نے آگرے کے سینٹ جانس کالج میں داخلہ لیا تو وہاں ان کے روابط کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ قائم ہوئے اور وہ مارکسی فکر سے گہرے طور پر متاثر ہوئے۔ بحیثیت قلمکار انھوں نے ادب کی ترقی پسند تحریک سے سرگرم وابستگی اختیار کی اور اپنی اس وابستگی کی قیمت دوبار، اولاً ۱۹۴۶ء میں اور پھر ۱۹۴۹ء میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل کر ادا کی۔ اس زمانے میں انھوں نے زیادہ تر نظمیں کہیں جن میں اپنے سیاسی نظریات کو وہ واشگاف انداز میں بیان کرتے تھے۔ بعد میں انھوں نے غزل گوئی کو اپنا شعار بنایا۔ ان کی غزلیں بھی ترقی پسندانہ خیالات کی حامل ہیں لیکن یہاں ان خیالات کا اظہار براہِ راست نہیں، تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں میں ہوا ہے اور لہجے میں وہ گہرائی اور تہ داری شامل ہوگئی ہے جو اچھی اور بڑی شاعری کا خاصّہ ہوا کرتی ہے۔ تہذیبِ فن کی جو پاسداری تاباں صاحب کی غزلوں میں ملتی ہے، اس سے ان کے شاعرانہ کمال کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

تاباں صاحب ایک باکمال شاعر تو تھے ہی، نثر نگاری سے بھی انھیں گہرا شغف تھا۔ اُردو کے علاوہ انھوں نے انگریزی میں بھی بہت سے مضامین لکھے جو ان کی روشن خیالی اور بالغ نظری کے مظہر ہیں۔ اُردو میں ان کی ریڈیائی تقریروں کا ایک مجموعہ "ہوا کے دوش پر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ انگریزی مضامین بھی کتابی صورت میں POETICS TO POLITECS کے عنوان سے مرتّب ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ تاباں صاحب نے کئی اہم کتابوں کے تراجم بھی کیے ہیں۔

تاباں صاحب کی شاعری کے چار مجموعے منظرِ عام پر آئے "سازِ لرزاں" "حدیثِ دل" "ذوقِ سفر" اور "نوائے آوارہ"۔ آخر الذکر مجموعے پر ۱۹۷۹ء میں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۸۱ء میں انھیں مودی غالب ایوارڈ پیش کیا گیا اور ۱۹۸۲ء میں اُتّر پردیش اُردو اکادمی نے انھیں اپنا خصوصی ایوارڈ پیش کیا۔ اس سے پہلے یہ اکادمی ۱۹۷۲ء میں "ذوقِ سفر" پر اور ۱۹۷۶ء میں "نوائے آوارہ" پر شاعری کے اوّل انعام دے چکی تھی۔ ۱۹۷۳ء میں تاباں صاحب کو سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ پیش کیا گیا تھا اور ۱۹۷۱ء میں ان کی شعری اور ادبی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ہند نے انھیں پدم شری کے اعزاز سے سرفراز کیا تھا جو ۱۹۷۸ء میں جنتا پارٹی کے زمانۂ اقتدار میں انھوں نے واپس کر دیا تھا۔ تاباں صاحب ان انعامات اور اعزازات کے نہ صرف یہ کہ بجا طور پر مستحق تھے بلکہ انھوں



نے انھیں قبول کرکے ان کی قدر و قیمت بڑھائی۔

اُردو اکادمی، دہلی کا یہ جلسہ "تاباں صاحب کے انتقال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ان کی وفات اکادمی کا ذاتی زیاں بھی ہے۔ وہ اکادمی کے معزز ممبر اور اب ہماری اشاعتی اور کلچرل کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے۔ ان کے مفید مشوروں سے ہم نے ہمیشہ روشنی حاصل کی۔ افسوس ہے کہ یہ روشنی ہم سے چھن گئی۔

ہم بارگاہ خداوندی سے مرحوم کی مغفرت کے طالب ہیں اور ان کے پس ماندگان کے لیے ہمت اور استقامت کے خواستگار۔ خدا انھیں صبر جمیل عطا کرے۔"

اس تجویز کو دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ پاس کیا گیا۔

یہ بھی طے ہوا کہ . . .

۱۔ اتوار مورخہ ۱۴ ؍ فروری ۱۹۹۳ء کو غالب اکیڈمی میں ایک بڑا تعزیتی جلسہ منعقد ہو جس میں دہلی کے تمام اُردو اور دوسرے کلچرل اداروں کو شامل کیا جائے۔

۲۔ جلد ہی آنجہانی بیدی صاحب اور تاباں صاحب کے نام سے وابستہ کرکے اُردو اکادمی، دہلی ایک سمینار کرے جس میں قومی یکجہتی اور سیکولرازم کے موجودہ مسائل اور CHALLENJES پر سیر حاصل بحث ہو کیوں کہ ان دونوں مرحومین کو یہ قدریں دل سے عزیز تھیں۔

انشاء اللہ ہم اگلے شمارے میں تاباں صاحب پر ایک خصوصی گوشہ شائع کریں گے۔

طفیل ہوشیارپوری بھی نہیں رہے

معروف شاعر، ادیب، فلمی نغمہ نگار اور ماہنامہ محفل لاہور کے چیف ایڈیٹر جناب طفیل ہوشیار پوری کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے لاہور میں ۵ ؍ جنوری کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔ انھیں ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور تین سوگوار صاحبزادیاں شامل ہیں۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ "رحمتِ یزداں" چند روز قبل ۳۰ دسمبر کو شائع ہوا تھا۔ کلام کے چھ مجموعے شائع ہوئے۔ جناب طفیل ہوشیار پوری نے متعدد فلموں کے گیت بھی لکھے۔

طفیل ہوشیار پوری ۱۹۱۴ء میں ہوشیار پور میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور کمال حاصل کیا۔ ان کی رُباعیات کا مجموعہ "جام مہتاب" غزلوں کا مجموعہ "شعلۂ جام" اقبال کی تضمین میں کہی گئی نظم "تجدیدِ شکوہ" ہندی غزلوں کا مجموعہ "سوچ مالا" ملّی نظموں کا مجموعہ "میرے محبوب وطن" اور سلام و مرثیے پر مشتمل مجموعہ "سلام و رثا" شائع ہوکر اپنی منفرد حیثیت منوا چکے ہیں۔ طفیل ہوشیار پوری ۳۸ سال تک ماہنامہ "محفل" کے مدیر رہے اور اس کے علاوہ ایک عرصے تک ہفت روزہ "صاف گو" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔

گرامی نامے

▷ جنوری ۹۳ء کا "ایوانِ اُردو" مطالعے میں ہے۔ "حرفِ آغاز" بہت خوب ہے۔ آپ نے بروقت اسے لکھ کر ایک اچھے انسان اور ایک محبِ وطن ہندستانی کا فرض ادا کیا ہے آپ کا یہ لکھنا حرف بہ حرف درست ہے کہ :

" ۶ دسمبر ۹۲ء کو ہندستان کے مقدس شہر اجودھیا میں صرف ایک قدیم مسجد کا انہدام نہیں ہوا بلکہ ہماری وہ تاریخ اور تہذیب بھی منہدم ہوگئی جس کی تشکیل و تعمیر میں صدیاں صرف ہوئی تھیں اور جسے بنانے سنوارنے کے عمل میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک رہے اور بدقسمتی سے یہ کام ان لوگوں کے ہاتھوں سرانجام ہوا جو خود کو ہندستان میں ایثار اور اخلاق کی روایت کے بانی شری رام کا خصوصی نام لیوا کہتے ہیں۔"

لیکن اس کے ساتھ اس مسجد کے منہدم کرنے کا انداز بھی کم عبرت ناک اور المناک نہیں ہے ــــ لاکھوں انسان تابناک سورج کی روشنی میں دُنیا کے کروڑوں انسانوں کو اعتماد میں لے کر دستورِ ہند کی بے حرمتی کرتے ہوئے اپنے افسوسناک ارادے میں اس طرح کامیاب ہوئے کہ عمارت کا وجود ہی ختم ہوگیا اور دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے رکھوالے اپنی بے خبری کا اظہار کرتے رہے اور سیکولر ہندستان کا بھرم ٹوٹتا رہا۔ اب ہم لوگ تلاش کرتے رہیں اور ایک دوسرے سے پوچھتے رہیں : "مجرم کون ہے؟"

فسادات کے سلسلے میں عام خیال ہے کہ اگر پولیس صرف اپنے فرائض ادا کرتی تو، یا تو فسادات ہوتے ہی نہیں یا اگر ہوتے، تو فوراً قابو میں آجاتے لیکن پولیس نے نہ صرف فرائض سے کوتاہی کی بلکہ وہ سب کچھ کیا جس سے خود درندگی شرماتی ہے۔

اس خونی حادثے کی وجہ سے ملک کی ایک بڑی آبادی کا حکومت پر سے اعتماد اُٹھ گیا ہے ایک سیکولر اور جمہوری ملک کے لیے یہ بات نہایت افسوسناک ہے۔

ہاں ہمیں اپنے ملک کے مختلف زبانوں کے صحافیوں اور دانشوروں کے ایک بڑے گروہ پر فخر ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے فرائض انجام دینے میں کوتاہی نہیں کی بلکہ انسان دوستی کا ثبوت ظالموں کو ظالم کہہ کر اور مظلوموں کے زخم پر مرہم رکھ کر دیا ہے۔ اس طرح انھوں نے عوام کا اعتماد حاصل کیا اور اپنا وقار بڑھایا ہے۔ کاش سارے ہندستانی اُن سے سبق لیں اور اپنے فرائض اور ذمے داریوں کو سمجھیں۔

اُردو کے ادیبوں کو بھی اس سلسلے میں غور و فکر کرنا چاہیے اور اپنی تخلیقات کے ذریعے ذہنوں کی تعمیر میں مدد کرنی چاہیے تاکہ ایک نیا غیر متعصب طاقتور ہندستان ابھر کر سامنے آئے۔

ــــ عبدالقوی دسنوی، بھوپال

▷ "ایوانِ اُردو" جنوری ۹۳ء کا شمارہ کافی تاخیر سے موصول ہوا۔ مجموعی طور پر کافی جاذب توجہ ہے اور اس کے کئی مشمولات قابلِ تعریف ہیں لیکن طوالت کے خوف سے میں صرف دو مشمولات پر اظہارِ خیال کروں گی۔ "حرفِ آغاز" میں آپ نے ایودھیا کے المیے اور حالیہ واقعات کے تعلق سے بے حد اہم سوالات اٹھا کر نہ صرف سبھی حساس اور معقول لوگوں کے جذبات اور ذہنی خلفشار کی ترجمانی کی ہے بلکہ اس بات کا اعادہ بھی کیا ہے کہ ادب ہو یا زندگی کا کوئی اور شعبہ انسانی اقدار کی پامالی اور انسانیت سوز مظالم کی طرف سے آنکھیں بند کرکے اپنا اعتبار قائم نہیں رکھ سکتا۔ اور اس بات کا بھی کہ ایک اہلِ قلم کے لیے حق کا اظہار اربابِ حل و عقد کی خوشنودی سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ صورتِ حال اس قدر سنگین ہے کہ اگر اس موضوع پر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا جائے تو بھی کم ہے۔ پھر بھی اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم آپ قومی اور بین الاقوامی سیاست میں زبان کے خطرناک اور ناجائز استعمال پر ایک مباحثے کا آغاز تو

گراہی سکتے ہیں کہ اس کا تعلق براہِ راست ادبی تخلیق کاروں سے بھی ہے ہمارے معاشرے میں زبان (اور دوسرے ترسیلی وسائل) اب حقیقت کے اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ حقیقت کے چہرے پر نقاب ڈالنے یا ذہنوں کو ماؤف کرنے یا نفرت، تعصبات، بربریت اور دہشت انگیزی کی چنگاریوں کو بھڑکانے کا وسیلہ ہیں جس کی شدت حالیہ برسوں میں اپنی انتہا کو پہنچی ہے اور جس کے ہلاکت خیز نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

دوسرا مسئلہ جس پر اظہارِ خیال ضروری ہے ابراہیم یوسف کا مضمون "اُردو میں ڈانس ڈراما" ہے جس میں انھوں نے رفعت سروش کے منظوم ڈراموں پر میرے مضمون کے سلسلے میں کچھ سوال اٹھائے ہیں اور یہی سوال انھوں نے کچھ عرصے پہلے اپنے ایک اور مضمون میں بھی اٹھائے تھے جو عمیر ہریانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس لیے ان کا جواب دینا میں اپنا ادبی فرض سمجھتی ہوں۔

ان دونوں مضامین میں ان کا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ میں نے رفعت سروش کے ڈراموں کی "صنف" کا تعین کیے بغیر ان کے موضوعات وغیرہ سے بحث کی ہے۔ تو اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ رفعت سروش کے منظوم ڈراموں کے سلسلے میں اوپیرا، ڈانس ڈرامے وغیرہ کی جو بحث چل رہی ہے وہ میرے خیال میں کافی غیر ضروری ہے۔ اگر مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ ان ڈراموں کو اوپیرا یا ڈانس ڈرامے کے طور پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے لیکن شائع شدہ متن کا اس حیثیت سے تجزیہ کرنا ممکن نہیں۔ اوپیرا کی تکمیل ساز اور آواز کے وسیلے سے ہوتی ہے۔ اس میں الفاظ کی حیثیت بالکل ثانوی ہو جاتی ہے اور وہ ماہرینِ موسیقی کا کارنامہ ہوتا ہے۔ ڈانس ڈرامے یا بیلے کی پیش کش رقص و موسیقی کے وسیلے سے ہوتی ہے اور اس میں الفاظ عام طور سے بالکل غائب ہو جاتے ہیں صرف کہانی باقی رہتی ہے اور یہ بنیادی طور پر ماہرینِ رقص و موسیقی کا کارنامہ ہوتا ہے۔ مغرب میں شیکسپیئر، شلر، گوئٹے اور دوسرے عظیم ڈراما نگاروں کے سینکڑوں شاہکار بیلے یا اوپیرا کے طور پر پیش کیے جا چکے ہیں۔ لیکن بذاتِ خود ان ڈراموں کے بیلے یا اوپیرا ہونے کا دعویٰ کسی نے نہیں کیا۔ اس لیے میں نے رفعت سروش کے منظوم ڈراموں میں "تمثیلی" "تاریخی" "موضوعاتی" اور "عصری" ڈراموں کی حیثیت سے امتیاز قائم کرتے ہوئے ان کا تجزیہ کیا ہے اور موضوعات کے علاوہ شعری اسلوب، ڈرامائی ساخت اور دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا اعتراض انھیں "عورت" نام کے ڈرامے کے تجزیے میں میرے لہجے کی تلخی پر ہے۔ ان کا یہ اعتراض مجھے قبول ہے اور میں نے اس مضمون کی اشاعتِ نو کے سلسلے میں (یہ میرے تنقیدی مضامین کے مجموعے میں شامل ہے) لہجے کی تلخی کو بہت کم کر دیا ہے گو کہ تنقیدی نقطۂ نظر میں جس سے ابراہیم یوسف صاحب خود بھی متاثر ہیں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

—— زاہدہ زیدی، علی گڑھ

▷ "ایوانِ اردو" پابندی سے مل رہا ہے جنوری، فروری کے اداریے آپ نے نڈر ہوتے تحریر کیے۔ فروری کے شمارے میں جن "علاّمہ" کے خط کا لب لباب پیش کیا ہے، وہ مجھے الف والے لگے۔ واقعی پڑھے لکھے ہوتے تو سومنات کے مندر کا بابری مسجد سے موازنہ ہی نہ کرتے۔ اب جب کہ موصوف نے یہ نیک کام انجام دے ہی دیا ہے تو میری ان سے درخواست ہے کہ سیکولر جمہوریہ ہند کو "دھارمک ریاست" گھوشت کروا دیں پھر اطمینان سے "تاریخ دہرائیں" کوئی سیکولر ذہن ہندو یا مسلمان تعرض نہ کرے گا۔

"گرامی نامے" کے ذیل میں خالد اشرف صاحب کا مکتوب پڑھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ جو کچھ موصوف نے تحریر کیا ہے۔ وہی 'بلٹز' کے کرنجیا بھی فرما چکے ہیں۔ کرنجیا کے بارے میں دنیا جانتی ہے کہ حضرت سوویت روس کے علمبردار تھے۔ خالد صاحب کی نظریاتی وابستگی کا مجھے علم نہیں ہے۔ اگر ہوتا تب بھی میں صرف ہنس کر رہ جاتا۔ کیوں کہ ہندستان کے خالص داخلی معاملے کو جس طرح حکومت ایک عالمی مسئلہ بن جانے کے بعد بھی داخلی مسئلہ تسلیم کرتے ہوئے اپنی ہر خامی کے جواز میں پاکستانی در اندازی کی تشہیر کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ اسی طرح برادرِ محترم نے بھی سبز مملکتوں کو موجودہ بحران کا ذمے دار قرار دیا ہے۔

ہماری جلتی بھنتی بمبئی میں ایک صاحب نے فرقہ وارانہ فسادات کو معاشی عدم مساوات کی دین قرار دیا ہے اب اُن "پڑھے لکھے" سیکولر ذہن مسلمان دانشور سے کون پوچھے کہ صاحب مسلمانوں میں، ڈالمیاؤں، برلاؤں، ہندوجاؤں اور ٹاٹاؤں کی نشاندہی فرمانے کے بعد ذرا یہ بتانے کی زحمت کریں کہ پارسیوں کے خلاف فساد کیوں نہیں ہوتے؟ بمبئی کے جھونپڑا واسیوں میں مسلمان سرمایہ دار کسی پڑھے لکھے سیکولر شخص کی آنکھیں ہی تلاش کر سکتی ہیں۔ خدارا! نوبل انعام تو آپ انھیں نہیں دلوا سکتے ساہتیہ ایوارڈ ہی دلوا دیجیے۔ بھاجپاؤں نے بڑی دوروں بینی کے بعد نتائج تلاش کیے ہیں۔

—— علی امام نقوی، بمبئی

▷ جنوری ۹۳ء کا شمارہ پڑھا۔ اِس بار "حرفِ آغاز" نے چونکا دیا۔ اداریے میں نہ صرف حق بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ بلکہ جرأت مندی کا بھی مظاہرہ کیا گیا ہے۔

—— پرویز اختر، چاندپور

▷ جنوری ۹۳ء کے "حرفِ آغاز" کا پیرہن خون آلود اور تار تار ہے۔ جمہوریت، سیکولرزم، وسیع النظری، بھائی چارہ، یکجہتی اور رواداری یہ سب مہذب انسانوں کی دُنیا کے چمکتے گوہر تھے۔ جنھیں کوتاہ بیں کوتاہ نظر بھیڑیوں نے سنگ ریزے سمجھ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ پتھر اور مٹی کے معبد پھر بنا لیے جائیں گے مگر ٹوٹے ہوئے دل کون جوڑے گا۔

ساجدہ زیدی نے :

عدوے دانش کو کس جفا کار مصلحت نے
کلید دانش سپرد کی ہے ——؟

کہہ کر جمہور کو متنبہ کیا ہے۔ اندر سروپ دت نادآں نے :

کھل رہی ہیں اُس کے حق میں
کھڑکیاں ہمدردیوں کی
اور دنیا جانتی ہے
کون لے جائے گا اس موسم کی بازی ؟

کہتے ہوئے دامنِ امید کو ارضِ ہندستان پر پھیلا دیا ہے۔ اور یہی اُمید اس چمنستان کی آبیاری کرنے میں ممد ہو سکتی ہے۔

شوکت حیات کے "پر کٹے پرندے" کا اقتباسیہ عبرتناک ہے۔ "مکان مکینوں سے ہے۔ جب مکیں نہ رہیں گے تو یہ شہر خموشاں ہوگا۔"

—— ابنِ اسحاق بنگلوری، چکمنگلور

▷ جنوری ۹۳ء کے "حرفِ آغاز" میں فرض شناس اور ایماندارانہ صحافت کی بازگشت ہے شعری حصے میں ساجدہ زیدی کی تاثر انگیز نظم ایک سوالیہ نشان قائم کرتی ہے تو اندر سروپ دت نادآں کی نظم میں ٹوٹتے آئینوں کی صدا تے کرب ہے۔ ظفر غوری، ملک نسیم، رئیس الدین رئیس اور شمیم امروہوی کی غزلوں میں بھی عصری حسیت کا نور ہے۔ تسنیم کوثر کا افسانہ "سلگتے لمحوں کا کرب" اور سربھجن سنگھ کی پنجابی نظم "گاؤں سے باہر" (مترجم شاکر پرشارتھی) اپنے پس منظر میں یاس و درد کی ایک ہی شاخ پر کھلے ہوئے دو پھول ہیں جن کی مہک براہِ راست ذہن و دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایوانِ اُردو کے صفحات میں ان کی ترتیب بھی آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کی مظہر ہے۔

ہری تیش رائے کا افسانہ "جو وہاں ہے وہ کہیں نہیں" (مترجم مینٹل آصف) میں ہمارے ملک کی سب سے اہم اور سب سے تلخ سچائی کا اظہار ہے جسے رمزیہ کی شان میں پیش کیا گیا ہے۔

—— انور شمیم انور، فیروز آباد

▷ جنوری ۹۳ء کا شمارہ پیشِ نظر ہے "حرفِ آغاز" کے تحت آپ نے نہایت محتاط انداز میں جرأت مندانہ اظہارِ خیال کیا ہے۔

مشمولات میں بلقیس ظفیر الحسن کی غزل خاص طور پر قابلِ داد ہے، البتہ عظیم اختر کی نام نہاد مزاحیہ تحریر (لندن) پڑھ کر طبیعت مکدّر ہو گئی، نہ کہیں بے ساختہ ہنسی آتی ہے اور نہ طنز میں کوئی لطیف پہلو ہے، بلکہ رونا اس بات پہ آتا ہے کہ ایسی پھُس پھُسی اور بے جان کاوشوں کو آپ طنزیہ و مزاحیہ سمجھ کر شائع کرتے ہیں۔ عظیم اختر جیسے قلمکاروں کو چاہیے کہ اُردو کے قارئین کی تعداد بڑھائیں قلم کاروں کی نہیں۔

—— سلمان غوری، نئی دہلی

▷ "حرفِ آغاز" مضمون "شیکھر یا اگیے: ایک زندگی"، طنزیہ "لندن واہ رے لندن"، افسانے "جو وہاں ہے وہ کہیں نہیں"، "سلگتے لمحوں کا کرب"، "پر کٹے پرندے" قابلِ قدر ہیں۔

—— نواز بوہیتیوی، کشن گنج

▷ جنوری کے شمارے میں "لندن لندن، واہ رے لندن" عظیم اختر کا طنزیہ بہت پسند آیا۔ سرورق بہت خوبصورت ہے۔

—— ظہیر افراز محمد حسین صندی، برہانپور

▷ گزشتہ کئی برسوں سے "ایوانِ اُردو" بغیر کسی تعطل کے زیرِ مطالعہ رہا ہے۔ "ایوانِ اُردو" نے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے کے بعد جو معیارِ ادب قائم کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے اس وقت اُردو کا کوئی بھی رسالہ پورے ملک میں ایسا نہیں ہے جو اس رسالے کی ہمسری کا مدعی ہو سکے اور اس دورِ انحطاط میں یہ معمولی بات نہیں۔ اِسی لیے ذوقِ سلیم دامنِ "ایوانِ اُردو" پر ہلکی سی شکن بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔

جنوری ۹۳ء کے شمارے میں محترمہ ساجدہ زیدی کی نظم "یہ کس کی سازش ہے ؟" کے عنوان کے تحت امتیازی شان کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس نظم کا آخری بند جو تین مصرعوں پر مشتمل ہے، اس کے پہلے مصرعے میں لفظ "شباں" شب کی جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے جو غلط ہے شب فارسی زبان کا لفظ ہے اور فارسی قاعدۂ جمع کے مطابق "شباں" کے بجائے شب کی جمع "شبہا" ہونا چاہیے اور شبانِ دیجور کے بجائے "شب ہائے دیجور" مستعمل ہونا چاہیے۔ پارس نژاد شعرا نے جہاں بھی "شباں" لفظ صرف کیا ہے صیغۂ واحد کے طور پر کیا ہے جس کی جمع "شبانان" پر بنائی ہے۔ انھوں نے یہ لفظ بالکل مختلف

معنی میں استعمال کیا ہے یعنی یہ لفظ "گڈریے" کے مفہوم میں مستعمل ہوا ہے۔ چنانچہ فارسی کا عظیم شاعر عرفی کہتا ہے :

بہ رو پیالۂ خونیں، بخرز قصابان
مشو گدائے شبانان کہ شیرمی دوشند

ازراہِ عنایت یہ مراسلہ شائع فرمادیں تاکہ محترمہ زیدی حقیقت سے مطلع ہوسکیں۔

—— احسان نانپاروی، لکھنؤ

◁ "ایوانِ اردو" کا تازہ شمارہ پڑھا۔ پروفیسر ساجدہ زیدی کی نظم بعنوان "یہ کس کی سازش ہے؟" حالاتِ حاضرہ کی عکاس ہے۔ جلیس نجیب آبادی کی نظم "جمود" نے بھی متاثر کیا۔

—— اسرار احمد دانش، سمستی پور

◁ سال کا پہلا شمارہ نظر کے سامنے ہے۔ نظم "کہانی" کے بارے میں مجھے کہنا ہے کہ یہ آپ کی بے دھیانی کی وجہ سے "ایوانِ اردو" میں شائع ہوگئی ہے! کیوں کہ نظم نگار نے مذکورہ نظم میں جن لوگوں کو اپنی آپ بیتی سنائی ہے وہ "امنگ" پڑھنے والے بچے تو ہوسکتے ہیں "ایوانِ اردو" کے ذہین اور باشعور قارئین نہیں! نظم کا مندرجہ ذیل ٹکڑا میری اس بات کی تائید کرتا ہے: "سنو بچو! تم اپنے ان کھلونوں کو حفاظت سے کہیں پر بند کردو . . ."

"گاؤں سے باہر" (پنجابی نظم) اچھی نظم ہے۔ مترجم نے سلیقے سے ترجمہ کیا ہے۔ دوسری زبانوں کی تخلیقات کا ہر مہینے ترجمہ چھاپا کریں۔ تاکہ "ایوانِ اردو" کے قارئین دوسری زبانوں کے ادبی مزاج سے بھی واقف رہیں۔

جناب شوکت حیات کی کہانی "پرکٹے پرندے" مجھے بہت پسند آئی۔ دلیپ سنگھ صاحب کی چوتھی قسط بھی مزے دار ہے۔ "اردو میں ڈانس ڈرامہ" مضمون بھی دلچسپ اور معلومات افزا ہے — "حرفِ آغاز" میں آپ نے جن خیالات کو پیش کیا ہے ان کی سچائی سے کون انکار کرسکتا ہے؟

—— محمد حامد، دربھنگہ

◁ "ایوانِ اردو" جنوری ۹۳ء میں جناب عقیل نعمانی (بریلی) کا خط شائع ہوا ہے۔ انھیں غالب کا مشہور شعر :

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے سے ہٹا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

غالب کے کسی دیوان میں نہیں ملا۔

مقام حیرت ہے — یہ مرزا کی مشہور غزل کا دسواں شعر ہے اور دیوانِ غالب، تاج ایڈیشن (مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور) کے صفحہ ۲۲۵ پر درج ہے۔ اس ایڈیشن کا نمبر ۱/۱۷۱ تاج ہے۔ اس ایڈیشن پر سنہ اشاعت درج نہیں۔ میں نے یہ کتاب آج سے تقریباً ۳۰ سال پہلے خریدی تھی اور میری ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔

—— شرون کمار ورما، امرتسر

◁ نئے سال کے شمارے میں ایک خط جناب عقیل نعمانی (بریلی) کا شامل ہے جس میں انھوں نے ٹی وی سیریل میں شامل غالب کی غزل کے ایک شعر پر سوال اٹھایا ہے۔ مذکورہ شعر کو تقریباً بیس سال قبل میں نے دوہے کے روپ میں پیش کیا تھا۔ ہندی میں "دیوانِ غالب" کے نام سے چھپی کتاب کے ناشر ہیں "دیہاتی پستک بھنڈار" اسے مرتب کیا ہے چین سکھ بیتاب نے۔ یہ دیوان جون ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں غزل کے سات شعر شامل ہیں جبکہ غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع کردہ "دیوانِ غالب" میں نو شعر ہیں۔ اگر جگجیت سنگھ نے شعر اسی طرح گا یا ہے جیسا کہ عقیل نعمانی صاحب نے سنا . . . تو غلط ہے ہندی کے دیوان میں پہلے مصرعے کا آخری لفظ 'ظالم' نہ ہوکر 'واعظ' درج ہے۔ شعر درجِ ذیل ہے :

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ کا اٹھا واعظ
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

—— بھگوانداس اعجاز، نئی دہلی

◁ جنوری کا شمارہ ملا۔ مضامین میں عبدالمغنی کا "غلام عباس کی فنکاری" محنت سے لکھا گیا ہے۔ غلام عباس سے متعلق کچھ نئی باتیں بھی معلوم ہوئیں۔ افسانوں میں شوکت حیات کا افسانہ "پرکٹے پرندے" بطور خاص پسند آیا۔ تسنیم کوثر کا افسانہ "سلگتے لمحوں کا کرب" بھی ٹھیک ہے۔ پر تیسرا افسانہ "جو وہاں ہے وہ کہیں نہیں" میں بات بن نہیں پائی۔ استعارہ، علامت جب تک فطری طور پر نہ آئیں، بات بن ہی نہیں سکتی۔ جذبات سے مغلوب ہوکر تقریر تو اچھی لکھی جاسکتی ہے افسانہ نہیں۔ شعری حصے میں کچھ غزلیں اچھی ہیں۔ نظموں میں محترمہ ساجدہ زیدی متاثر کرتی ہیں۔

—— شاہد اختر، کانپور

◁ جنوری ۹۳ء کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ عبدالمغنی صاحب نے "غلام عباس کی فنکاری" پر گہری تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ "شیکھریا ایچے : ایک زندگی" میں خالد اشرف نے ایک اہم انقلابی کردار والے شخص سے متعارف کرایا ہے۔ ساجدہ زیدی کی نظم موجودہ حالات پر بھرپور طنز ہے۔ افسانے شوکت حیات اور تسنیم کوثر کے پسند آئے۔

—— عبدالرحیم عبداللہ مالکی، بگڈہرہ

▷ جنوری کا شمارہ پڑھا۔ نثری عنوانات میں یاسر ملک (شاہجہاں پور) نے "کہانی تھیں لکھنے والی ہے" کو الیاس احمد گدی کا افسانہ قرار دیا ہے۔ جبکہ یہ مشترف عالم ذوقی کا کافی مشہور افسانہ ہے۔ یہ افسانہ اُردو کے علاوہ ہندی "ہنس" میں بھی پڑھ چکا ہوں۔ اور ساہتیہ اکادمی کی انگریزی میگزین پر اُترا میں بھی یہ YOU ARE GOING TO BE A PART OF THE STORY ضروری سمجھیں تو بھول سدھار لیں۔

—— جاوید اقبال چڑا آنوی، مونگیر

▷ دلیپ سنگھ کا سفرنامہ "آوارگی کا آشنا" بڑا پُر لطف ہے۔ مزاح کی چاشنی سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔

—— محمد طارق صدری سلفی، فاضل پور

▷ جنوری ۹۳ء کا "ایوانِ اُردو" نظر نواز ہوا۔ جن الفاظ میں بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

—— محمد رحمت اللہ، فاضل پور

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۳۲۷۶۲۱۱، ۳۲۶۳۴۴۸

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:
ایس۔ اشتیاق عابدی، مخمور سعیدی

جلد: ۶ — شمارہ: ۱۲	فی کاپی ۵۰/۳ روپے — سالانہ قیمت ۳۷ روپے	اپریل ۱۹۹۳ء

خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، دہلی — گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد
سرورق، عمل: ارشد علی خاں

ایس۔ اشتیاق عابدی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی ۲ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

کئی سو سال پہلے فارسی کے عظیم صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی نے کہا تھا:

تو برائے وصل کردن آمدی　　　نے برائے فصل کردن آمدی

یعنی تو اس دُنیا میں میل ملاپ قائم کرنے کے لیے آیا ہے، تفرقہ پیدا کرنے کے لیے نہیں آیا۔ یہ مولانا کی اس مشہور مثنوی کا شعر ہے جس کے لیے فارسی زبان کے ایک اور عظیم شاعر اور انشا پرداز شیخ سعدی نے کہا ہے:

مثنوی مولوی معنوی　　　ہست قرآں در زبان پہلوی

مندرجہ بالا شعر میں شاعر کا تخاطب کسی ایک فرد سے نہیں، پوری بنی نوع انسان سے ہے اور اس میں باہمی محبّت و مروّت کے جس اصول کی تلقین کی گئی ہے، اس کی پاسداری کے بغیر کرۂ ارض پر مہذّب انسانی معاشرے کے قیام کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا ـــــ یہ دنیا بہت وسیع و عریض ہے جس کے مختلف خطّوں کے جغرافیائی اور موسمی حالات جداگانہ ہیں اس لیے قدرتی طور پر ان الگ الگ خطّوں میں جو تمدّنی اور تہذیبی اکائیاں نمو پذیر ہوئیں ان میں بظاہر مماثلت کے کم اور اختلاف کے رنگ زیادہ ہیں لیکن قدرے گہرائی سے دیکھا جائے تو ہر تہذیب و تمدّن کی اساس انسان کی اس خواہش پر استوار نظر آئے گی کہ وہ آفاتِ ارضی و سماوی سے تحفّظ حاصل کرسکے، نیز اپنے ہم جنسوں کے ساتھ عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی پُرامن زندگی جی سکے۔ یہ انسانی جبلّت کی وہی ہم آہنگی ہے جسے صوفیا نے کثرت میں وحدت کی نمود سے تعبیر کیا ہے اور اس کی روشنی میں اختلافِ مذاہب و ملل میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن انسانوں کی گروہ در گروہ تنظیم سے جو صورتِ حال وجود میں آئی، اس کی تعبیر کچھ لوگوں نے دوسرے انداز میں بھی کی۔ انھوں نے مختلف تہذیبی اور تمدّنی تصوّرات میں پائی جانے والی باطنی ہم آہنگی سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ظاہری اختلافات کو زیادہ اہمیت دی اور جس عمل کا آغاز گروہی تنظیم سے ہوا تھا اسے گروہی تقسیم کا وسیلہ بنا دینا چاہا۔ یہیں سے اس ادّعائیت کا آغاز ہوا جو کسی ایک نقطۂ نظر یا طریقۂ کار کو واحد قابلِ قبول نقطۂ نظر یا طریقۂ کار مانتی بھی ہے اور منوا لینا بھی چاہتی ہے۔ مذہبی کٹّرپن ہو، سیاسی آمریّت پسندی ہو، نسلی فسطائیت ہو یا انفرادی برتری کا بےجا احساس، ان سب کی جڑیں اسی غیر روادارانہ ذہنی رویّے میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

یہ ذہنی رویّہ جہاں بھی پایا جائے اس کی حوصلہ شکنی ضروری ہے۔ تاریخ کے بیشتر ابواب جو خاک و خوں میں لتھڑے ہوئے اور ناانصافیوں کی گرد سے اٹے ہوئے نظر آتے ہیں وہ اسی غیر روادارانہ اندازِ فکر کے مرہونِ منّت ہیں جو انسانوں میں پورے عالمِ انسانیت کے تئیں ذمّے داری کے احساس کی بجائے نہ صرف یہ کہ گروہی جذبات پیدا کرتا ہے بلکہ اکثر صورتوں میں ذاتی خواہشات اور اُمنگوں ہی کو عمومیت کا رنگ دے دیتا ہے اور فتنہ و فساد کا موجب بنتا ہے۔

بقائے باہم کے جس اصول پر ہمارے زمانے کے بعض ذمّے دار سیاسی رہنما زور دیتے رہے ہیں، اب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے اُردو شاعر شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے، جو ہمارے ملک کے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ کے اُستاد بھی تھے، اس اصول کی وضاحت کتنے خوبصورت اور مؤثر لفظوں میں کی تھی:

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن　　　اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اس سچّائی کو سمجھنے اور اسے کھلے دل سے قبول کرلینے کی آج پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔

حسبِ اعلان اس شمارے میں جنابِ غلام ربّانی تاباںؔ پر گوشہ شامل ہے۔ سرورق کے آخری صفحے پر "سرودِ رفتہ" کے تحت تاباںؔ صاحب کی جو غزل دی گئی ہے، ان کی آخری غزل ہے جو انتقال سے چند دن پہلے انھوں نے بسترِ مرگ پر کہی۔ یہ غزل ہمیں بیگم ممتاز میرزا کی وساطت سے ملی ہے، جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔

ـــــ ادارہ

خالق باری

گیان چند
۹/۲۵، اندرا نگر، لکھنؤ (یو۔پی)

ملکوں کی سیاسی تاریخ کی طرح ادبی تاریخ میں بھی بعض ایسے دھندلے گوشے ہوتے ہیں جن کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دی جاسکتی۔ دیانت داری سے دو فریق ایک دوسرے سے مختلف موقف رکھ سکتے ہیں مثلاً شاہ میراں جی شمس العشاق کا سنہ ولادت و وفات کیا تھا؟ تاج الحقائق وجہی کی تصنیف ہے کہ نہیں؟ غالب ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوتے تھے کہ اس سے چند سال قبل؟ اُردو کا پہلا ڈراما اور پہلا ناول کون سا ہے؟ واجد علی شاہ رہس یا سبھا میں اداکاری کرتے تھے کہ نہیں؟ چھنولال دلگیر نے تبدیلیِ مذہب کی تھی کہ نہیں؟ مرزا دبیر کا اپنے اُستاد میر ضمیر سے من مٹاؤ ہوا کہ نہیں اور اگر ہوا تھا تو کس بات پر؟ طلسمِ ہوشربا سب سے پہلے اُردو میں تخلیق کی گئی کہ فارسی میں؟ اقبال کا سنہ ولادت ۱۸۷۳ء ہے یا ۱۸۷۷ء یا ان کے درمیان کچھ اور؟ انھیں متنازع مسائل میں ایک گرما گرم مسئلہ خالق باری کا ہے کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف ہے یا نہیں۔ آج کی صحبت میں اسی لاینحل مسئلے کے مختلف موقف پر غور کیا جاتا ہے۔

فارسی میں اہلِ مکتب کے افادے کے لیے منظوم لغات کا رواج قدیم سے ہے جس کی تقلید میں ہندستان کی کئی زبانوں میں اس قسم کی لغات لکھی گئیں۔ یہ منظوم اس لیے ہوتی تھیں تاکہ طفلانِ مکتب انھیں حفظ کرسکیں۔ ڈاکٹر صفدر آہ لکھتے ہیں کہ افغانستان میں ابو نصر فراہ نے ۶۱۷ھ میں عربی فارسی منظوم 'نصاب الصبیان' لکھا۔ ڈاکٹر صفدر آہ نے اس کا اور خالق باری کا ایک ایک مماثل شعر پیش کیا[۵]

اگر خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے تو اس کے بعد ڈھائی سو برس تک سناٹا نظر آتا ہے۔ اگلی نظم ایرانی حکیم یوسف ہراتی کی قصیدۂ لغتِ ہندی ۹۵۰ھ کی ہے — (ایضاً ص ۲۸) جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ قصیدہ ہے، باقاعدہ لغت نہیں۔ لغات کی پہلی مکمل کتاب اجے چند نامہ ہے جس کا مصنف اجے چند بھٹناگر متوطنِ سکندر آباد ضلع بلند شہر ہے۔ تاریخِ تصنیف ۹۶۰ھ۔ اس مثنوی کے دو نسخے ملتے ہیں۔ ایک مولوی عبدالحق کے پاس تھا جس میں اس کا نام مذکور نہیں۔ انھوں نے اس کا تعارف "مثلِ خالق باری ایک قدیم ترین کتاب" کے عنوان سے رسالہ اُردو جنوری ۱۹۵۲ء میں کرایا۔ "مثلِ خالق باری" جیسا عجیب نام مولوی صاحب نے ایک اور منظوم لغت مکتب نامہ عرف تجنیس اللغات کو دیا ہے۔ اس قسم کی نصابی لغات کے نام ان کے پہلے مصرعے کے پہلے دو الفاظ سے اخذ کیے جاتے تھے۔ مولوی صاحب اجے چند نامہ کو کوئی نام ہی دینا چاہتے تھے تو اس کے پہلے دو الفاظ باری تعالیٰ سے یہ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس نسخے کو افسر امروہوی نے مثلِ خالق باری کے نام سے رسالہ اُردو بابت جولائی ۸۳ اور اکتوبر ۱۹۸۳ء میں چھاپ دیا۔

دوسرا نسخہ ڈاکٹر نذیر احمد کو مولانا آزاد لائبریری بھوپال میں مل گیا اور انھوں نے اسے رسالہ غالب نامہ دہلی، بابت جنوری ۱۹۸۶ میں شائع کر دیا۔ رسالے کے ترقیمے میں اس کا نام 'اجے چند نامہ' دیا ہے۔ افسوس کہ ڈاکٹر نذیر احمد کو انجمن کے نسخے اور مولوی عبدالحق کے مضمون "مثلِ خالق باری" کا علم نہیں۔ انجمن کے نسخے میں ۳۷۵ شعر ہیں، نذیر احمد کے نسخے میں ۵۰۶ اشعار۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس نظم کے اور خالق باری کے بعض مماثل اشعار کو دکھا کر قیاس کیا ہے کہ بظنِ غالب خالق باری اس کے پیشِ نظر رہی ہے یا بصورتِ دیگر خالق باری کے شاعر نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ دونوں کے بعض مصرعے بالکل یکساں یا بے حد مماثل ہیں جس کے بعد شبہ نہیں رہتا کہ موخر شاعر کی نظر سے متقدم شاعر کا نسخہ گزر چکا ہے۔

اگر اجے چند نے خالق باری کو سامنے

ھا تو حیرت ہے کہ اس کا کہیں ذکر نہیں کیا۔
ں کی مثنوی کا پہلا مصرع 'باری تعالیٰ نام
سائی' ہے۔ خالق باری کی تقلید میں کتاب کا
م باری تعالیٰ رکھنا چاہیے تھا۔

فراہ کے نصاب الصبیان اور اجے چند
لغت کے بعد اس موضوع کی تیسری کتاب
ںبول صبیان (۹۹۰ھ) مخزونہ برٹش میوزیم
ہے۔ چوتھی کتاب کسی مجہول الاسم مصنف کی
مد باری (۱۰۲۸ھ) ہے۔ اس کو پاکستان
ڈاکٹر رانا احسان الٰہی نے آٹھ قلمی اور دو
طبوعہ نسخوں کی مدد سے چھاپ دیا۔ خود ان
نسخہ ۱۰۲۴ھ کا مکتوبہ ہے[۳] میں نے یہ کتاب
ہیں دیکھی۔ پانچویں لغت تجلّی کی اللہ خدائی
۱۰۰ھ کی ہے جس کا تعارف پروفیسر مسعود
سن رضوی نے رسالہ ہندستانی ۱۹۳۱ء میں
ایا۔ اس کا مصنف لکھتا ہے:

بہرِ مرغِ سخن نہادہ دام
مددے خواستہ ز روحِ نظام
شاید از لطفِ رحمتِ باری
روحِ خسرو نمایدم یاری

ن اشعار میں نظام سے مراد نظام الدین اور
سرو سے مراد امیر خسرو ہیں۔ یہ خالق باری کی
امت کا ایسا ثبوت ہے جو شک و شبہ سے
اتر ہے۔

محمود شیرانیؔ نے اپنی حفظ اللسان میں
رسی ہندی کی متعدد لغات کی فہرست دی ہے
ں میں اسمٰعیل کی رازق باری ۱۰۷۱ھ اور
مصطفیٰ کی رازق باری ۱۰۸۵ھ گیارہویں صدی
ری کی ہیں[۴]

اللہ خدائی میں محض خسرو اور نظام کی
ف اشارہ تھا۔ کتاب کا نثر میں واضح ذکر خان

آرزو (متوفی ۱۱۶۹ھ) نے اپنی تصنیف تصحیح غرائب اللغاتِ ہندی میں کیا۔ انھوں نے اسے 'رسالۂ منظومۂ امیر خسرو' کہا ہے۔ اس کے اور خالق باری کے اندراجات کا مقابلہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی مراد خالق باری سے ہے۔ اس کتاب کی ناقص زبان و بیان، فنّی اور معنوی اسقام کو دیکھ کر شیرانی سے پہلے بھی اس پر شبہ کیا جاتا تھا کہ یہ خسرو کی تصنیف ہے کہ نہیں۔ ۱۹۱۸ء میں جواہرِ خسروی میں مولانا محمد امین نے اسے محنت سے ترتیب دیا اور تمہید میں اس سے متعلق شبہات کی تردید کی۔ ۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی نے 'پنجاب میں اُردو' میں ثابت کیا کہ یہ کتاب امیر خسرو کی تصنیف نہیں۔

شیرانی نے اوّل محمد امین مرتبِ جواہرِ خسروی کے دلائل کی تردید کی۔ اس کے بعد اپنے دلائل دیے کہ خالق باری کیوں خسرو کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ ان کی دلیلوں کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ تاریخِ ادب میں اس کا ذکر نہیں آتا نہ خسرو کی تصنیفات کے ساتھ اس کا شمار ہوتا ہے نہ کوئی اسے جانتا ہے۔ اس کے جس قدر نسخے ملتے ہیں بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کے نوشتہ ہیں۔ صرف ایک نسخہ مخزونہ برٹش میوزیم گیارہویں صدی ہجری سے تعلّق رکھتا ہے۔

۲۔ عالمگیر کے عہد میں اُردو زبان کی طرف خاص توجّہ کی جاتی ہے۔ بارہویں تیرہویں صدی میں بچّوں کے لیے خالق باری کے انداز کی سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ ظاہر ہے کہ خالق باری بھی ان کے متصل زمانے میں لکھی گئی ہوگی۔ یہ قرینِ قیاس نہیں کہ خالق باری ۷۲۵ھ سے قبل لکھی گئی اور اس کے بعد پورے چار سو برس اہلِ قلم خاموش بیٹھے رہے۔

۳۔ اگر خالق باری خسرو کی تصنیف ہوتی تو اہلِ لغات اس سے استناد کرتے اور یہ کتاب مختلف فیہ لغات کے لیے ایک سند بن جاتی۔ آٹھویں سے دسویں صدی ہجری تک ہندستان کے فارسی فرہنگ نگاروں نے بڑی دقّت سے اپنی لغات ترتیب دی ہیں۔ کتابوں کے حواشی سے الفاظ لے رہے ہیں، اُستادوں سے پوچھ رہے ہیں، خطوط سے استناد کرتے ہیں۔ اگر خسرو جیسے اُستاد کا مجموعۂ لغات ہوتا تو اس سے استفادہ کیوں نہ کرتے۔

۴۔ داخلی حیثیت سے کتاب نہایت کمزور ہے۔ اس میں ہر قسم کی ترتیب کا التزام مفقود ہے۔ ہندی الفاظ کا صحیح تلفّظ نہیں۔ وزن کی غلطیاں ہیں۔ عربی فارسی کے مترادفات التزاماً نہیں دیے۔ بھرتی کے الفاظ کثرت سے ہیں۔

۵۔ بہت سے لفظوں کے معنی غلط ہیں۔ بعض اوقات کسی لفظ کے معنی ایک جگہ کچھ اور دوسری جگہ اور دیے ہیں۔ شیرانی نے بہت سے غلط معانی کی دریافت کی کہ وہ بعد کی لغات اداتُ الفضلا اور مویدُ الفضلا سے لیے گئے ہیں۔ مغل عہد کی لغات میں جو لغزشیں ملتی ہیں وہی خالق باری میں ہیں۔ مویدُ الفضلا ۹۲۵ھ کی تصنیف کہی جاتی ہے۔ اس میں بعض اوقات فارسی الفاظ کے ہندی مترادفات بھی دیے ہیں۔ شیرانی نے ہندی الفاظ کی زبان کا مقابلہ کرکے طے کیا کہ موید خالق باری پر مقدّم ہے۔ انھوں نے عہدِ عالم گیری کے عبدالواسع ہانسوی کی نصابِ سہ زبان یا صمد باری کے اندراجات کا خالق باری سے مقابلہ کرکے طے کیا کہ خالق باری نصاب سے چنداں متقدّم نہیں ہے۔

(پنجاب میں اُردو، لکھنؤ ۱۹۸۱ء، ص ۱۶۷ تا ۱۷۰)

محمود شیرانی نے ۱۹۴۴ء میں اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھ دی اور انجمن ترقیِ اُردو کے ایک مخطوطے کی بنا پر انکشاف کیا کہ اسے عہدِ جہانگیر کے ضیاء الدین خسرو نے ۱۰۳۰ھ میں تصنیف کیا۔ نسخے کی تاریخ کتابت ۱۱۸۷ھ ہے۔ اپنے مضمون مثلِ خالق باری میں مولوی عبدالحق نے اس تحقیق کو قبول کر لیا ہے۔

شیرانی کے جواب میں ڈاکٹر صفدر آہ نے اپنے مضمون "امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر" میں کچھ دلائل دیے۔ انھوں نے خالق باری کے دو مخطوطوں کا ذکر کیا۔

۱۔ نجیب اشرف ندوی کا نسخہ جس میں سالِ کتابت درج نہیں۔

۲۔ انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کا نسخہ مکتوبہ ۱۲۶۱ھ۔

ان دونوں کے آخر میں ایک مشترک قطعۂ تاریخ ہے جو یہ ہے:

چوں بگرفت ایں نسخہ طرزِ نوی
ز تصنیفِ آں خسروِ پہلویؒ   دہلویؒ
بہ تاریخ نیکو سرانجام یافت
نصابِ ظریفی نکو نام یافت
زہفت صد فزوں سی و شش سال بود
کہ طبع از خرد دست یاری نمود
کہ صبیاں برآئند از دامِ جہل
شود فیضِ الفاظ اشکال حل

(نوائے ادب، جنوری ۱۹۶۲ء ص ۳۸-۳۷)

ندوی کے نسخے میں 'خسروِ پہلوی' تھا، انجمن اسلام کے نسخے میں 'خسروِ دہلوی'۔ خسرو کا انتقال ۷۲۵ھ میں ہوا۔ ڈاکٹر صفدر آہ نے مندرجہ بالا قطعے سے نتیجہ نکالا کہ کوئی نسخہ ۷۳۶ھ میں لکھا گیا اور اس میں یہ قطعۂ تاریخ کتابت لکھ دیا گیا۔ بمبئی کے دونوں نسخے اسی نسخے کی نقل ہیں۔

واضح ہو کہ نسخۂ ندوی کب کا غائب ہو گیا۔ صفدر آہ نے نوائے ادب، جنوری ۱۹۶۲ء کے مضمون میں لکھا کہ یہ نسخہ کسی طرح نہیں مل سکا۔ مجھے پروفیسر عبدالستار دلوی نے بتایا کہ ندوی صاحب کے انتقال کے بعد ان کے مخطوطات ان کے فرزند امریکہ لے گئے۔ جہاں تک انجمنِ اسلام کے نسخے کا تعلق ہے وہ بھی اب غائب ہے۔ مجھے انجمن کے ڈائرکٹر نظام الدین گوریکر نے بتایا کہ اب وہ نسخہ کہیں موجود نہیں لیکن محمود شیرانی اپنی کتاب حفظ اللسان لکھنے سے پہلے پروفیسر ندوی کا نسخہ دیکھ چکے تھے۔ ان کے نزدیک مصنفِ قطعہ نے ۷۳۶ھ اپنے نسخے کی تاریخ کتابت بیان نہیں کی بلکہ اپنی دانست میں خسرو سے منسوب خالق باری کی تاریخ تصنیف درج کی ہے اور اس سلسلے میں اسے غلط فہمی تھی۔ شیرانی کی توجیہہ کا یہ جواز ہو سکتا ہے کہ پہلے شعر میں 'تصنیف' کا ذکر ہے، دوسرے میں کتاب کا نام ہے۔ مجھے مزید دو اعتراضات ہیں۔

۱۔ خسرو 'نصابِ ظریفی' جیسا لچر نام نہیں رکھ سکتے تھے۔

۲۔ قطعے میں تاریخ والا مصرع غیر موزوں ہے۔ 'ہفت صد' کی جگہ 'ہفصد' ہوتا تو درست ہو جاتا۔

لیکن میں یہ مانتا ہوں کہ شیرانی کی تاویل دور از کار ہے۔ دو نسخوں میں قطعے کی موجودگی سے لگتا ہے کہ یہ نصاب ۷۳۶ھ میں موجود تھا۔

خالق باری کے خسرو کی تصنیف ہونے کے ایک وکیل ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں جنھوں نے اپنی تاریخ ادب میں اپنی تائید میں دو منظوم لغات کا ذکر کیا ہے۔

اشرف بیابانی مصنفِ نوسرہار (۹۰۹ھ) کی واحد باری اور خسرو کی خالق باری کے آخر شعر یہ ہیں:

واحد باری ہوئی تمام
دنیا میں رہے اشرف کا نام

خالق باری ہوئی تمام
دو ہوں جگ رہیا خسرو نام

شیرانی نے پنجاب میں اُردو میں یہ شـ یوں دیا ہے:

دو جگ رہیا خسرو نام
خالق باری ہوئی تمام

جالبی کہتے ہیں کہ صاف ظاہر ہے اشرف بیا نے اپنا مقطع خالق باری کے مقطعے سے ما کیا ہے (تاریخ ادبِ اُردو جلد اوّل ص خسرو متقدم ہیں، اشرف موخر۔ ضیاء الدین خـ اشرف کے بھی بعد کے ہیں۔

واحد باری کے مصنف کے بارے م سب سے پہلے ڈاکٹر زور التباس کا شکار ہو ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد میں اس ایک نسخہ ہے۔ اس میں اشرف تخلص آیا ہ اپنی فہرست میں اس کا ذکر کرتے وقت ڈا زور اسے اشرف بیابانی سمجھ بیٹھے۔ (تذ اُردو مخطوطات ۱۹۴۳ء جلد اوّل ص ۲۸۴

اس کا ایک نسخہ سالار جنگ لائبریر میں بھی ہے۔ اس کی تفصیل دیتے ہو نصیر الدین ہاشمی نے واضح کیا کہ اس کا مصنـ اشرف بیابانی نہیں، آصفی دور کا ایک شـ

ہے جس کا نام اشرف الدین ہے اور جو سکندر جاہ کے عہد میں یہاں آیا۔

رئیس سردار سکندر جاہ
منیر روشن چندا ماہ

مثنوی کے آخر میں تاریخ ۹ رمضان ۱۲۲۶ھ بروز جمعہ دی ہے جو ہاشمی کے نزدیک تاریخِ تصنیف و تاریخِ کتابت دونوں ہے۔[5] میں نے بھی یہ مخطوطہ دیکھا ہے۔ اس کا نام واحد باری عرف فوائد الطلبہ ہے۔ اس میں یہ تین اشعار ہیں:

رئیس سردار سکندر جاہ
منیر روشن چندا ماہ
اشرف دیں سے واحد باری
ایسا نہیں کوئی جگ میں خواری
بانس بریلی وطن ہے میرا
حیدرآباد میں رہا بسیرا

مصنف کے بارے میں کچھ اور تفصیلات دیتے ہوئے ڈاکٹر حسینی شاہد نے بھی اس مغالطے کی طرف اشارہ کیا۔[6] ظاہر ہے پاکستان کے ڈاکٹر رانا احسان الٰہی کی واحد باری ۱۰۲۸ھ اس سے مختلف کتاب ہونی چاہیے۔

دوسری کتاب کسی صفی کی مطبوع الصبیان ہے۔ اس کا مخطوطہ انجمن ترقیِ اُردو پاکستان میں ہے۔ صفی نے اس کا نام یوں دیا ہے۔

"کتاب مطبوع الصبیان عرف خالق باری تصنیفِ امیر خسرو دہلوی قدس سرہٗ العزیز"

یہ نسخہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظر سے گزرا ہے (تاریخ جلد اوّل، ص ۳۲)۔ اس کا ایک دوسرا مخطوطہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد میں ہے اور ڈاکٹر زور نے اس کی تفصیلات دی ہیں۔ اس کی ابتدا میں ۲۸ فارسی اشعار کا ایک دیباچہ ہے جس میں کہا ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف تھی۔ اصلاً اس میں ۱۷۰ اشعار تھے۔ ان میں ۱۲۰ الحاقی اشعار شامل ہو گئے۔ ان کی میزان ۲۹۰ ہوتی ہے۔ آگے لکھتے ہیں:

چو بیتِ کہنہ و نو را کنی گنج
شوند سی صد دگر پنجاہ و ہم پنج

(تذکرۂ اُردو مخطوطات، جلد اوّل، ص ۹۷-۲۷۸)۔

جمیل جالبی کے مطابق مزید الحاق کے بعد تعداد ۳۵۵ ہوئی۔ ڈاکٹر زور بھی لکھتے ہیں کہ صفی نے خالق باری میں اشعار شامل کر کے اپنے نسخے کی تعدادِ ابیات ۳۵۵ بنا دی۔ ادارۂ ادبیات کا نسخہ نامکمل ہے۔ پاکستان کے نسخے میں فی الحال محض ۲۴۴ شعر ہیں حیدرآبادی نسخے سے معلوم ہوتا ہے کہ صفی نے صرف لغت کے اشعار کا اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ خواہ مخواہ عشقیہ اشعار شامل کر دیے ہیں مثلاً:

تن میں مرے فراق سوں تیرے رہا نہ پاس
دکھلا سجن اپس کا درس تا چھکے ہو لاس

مشتاق ہے وصال کا دن رات اے سجن
درسن دکھا کے مج سوں میٹھے بول دو بچن

نیز فارسی کے عروض کے متعلق اشعار کا اضافہ بھی کیا ہے۔ جالبی لکھتے ہیں:

"ضیاالدین خسرو نے 'خالق باری' کے ساتھ وہی عمل کیا جو صفی نے 'مطبوع الصبیان' میں کیا کہ 'خالق باری' کے اشعار میں اضافہ کر کے اسے ضرورتِ زمانہ کے مطابق نئی ترتیب اور اضافے کے ساتھ مرتب کر دیا۔ بنیادی طور پر 'خالق باری' امیر خسرو ہی کی تصنیف ہے جس میں زمانے کے ہاتھوں اتنی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ امیر خسرو کی اصل تصنیف کے حروف صدیوں کی گرد سے اٹ گئے ہیں۔ (جلد اوّل، ص ۲۴)

ڈاکٹر جالبی نے صفی کا زمانہ نہیں دیا۔ ڈاکٹر زور نے اس کی زبان کی بنا پر قبل ۱۲۰۰ھ لکھا ہے۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان میں صفی کی کتاب بدرِ انوار کا ایک مخطوطہ ہے۔ یہ مصنف کا نسخہ ہے جس میں اس کا نام صفی دکنی لکھا ہے اور تاریخ تصنیف ۱۱۶۳ھ۔[7] اس مثنوی کی زبان اور مطبوع الصبیان کی زبان میں مماثلت ہے۔ دونوں کتابوں میں ابیات کا شمار دیا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ دونوں کا مصنف ایک ہی صفی دکنی ہے۔ مطبوع الصبیان اپنی زبان کے لحاظ سے ۱۱۶۳ھ کے لگ بھگ ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت تک خالق باری کو خسرو سے منسوب کیا جا چکا تھا اس لیے صفی کی شہادت زیادہ وزن نہیں رکھتی۔

ڈاکٹر صفدر آہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے بعد محمود شیرانی کے موقف کے تیسرے زوردار مخالف ممتاز حسین ہیں جنھوں نے اپنی کتاب امیر خسرو دہلوی میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا (دہلی ایڈیشن، فروری ۱۹۸۲ء، ص ۳۴۸-۳۵۶)۔ ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ شیرانی لکھتے ہیں:

"تاریخِ ادب میں خالق باری کا کہیں ذکر نہیں آتا ہے۔ ۔ ۔ نہ کوئی اسے جانتا ہے اور نہ اس کے قدیم نسخے دستیاب ہوتے ہیں۔ جس قدر نسخے ملتے ہیں بارہویں تیرہویں صدی ہجری کے نوشتہ ہیں۔ صرف ایک نسخہ (ناقص) ایسا ہے جو گیارہویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے۔"

مسعود حسن رضوی نے رسالہ ہندستانی

۱۹۳۱ء میں اسی انداز کی ایک کتاب اللہ خدائی از تجلّی تصنیف ۱۰۶۰ھ کا تعارف کرایا۔ اس کا مصنّف لکھتا ہے :

بہرِ مرغِ سخن نہادہ دام
مددے خواستہ ز روحِ نظام
شاید از لطفِ رحمتِ باری
روحِ خسرو نمایدم یاری

ان اشعار میں نظام سے مراد حضرت نظام الدین اولیا اور خسرو سے مراد امیر خسرو ہیں۔ چوں کہ اللہ خدائی بھی منظوم نصابی لغت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خسرو مُصنّفِ خالق باری سے استمداد کر رہا ہے۔

۲۔ محمود شیرانی نے مطبوعہ حفظ اللسان کا متن تیار کرنے میں بقول ممتاز حسین ایک بیوند کاری کی ہے۔ انھوں نے اس میں دو نسخوں کو ملا دیا' ایک انجمن ترقّیِ اُردو یا مولوی عبدالحق کا تھا جس میں تمہید اور ترقیمہ دونوں تھے۔ اس کا نام حفظ اللسان اور مصنف کا نام ضیاالدین خسرو تھا۔ اس کا آخری شعر یہ ہے :

عاقبت انجام و آخر چھبیہ دیو را الفزام
کرد ایں حفظ اللسان را خسرو والسلام

(کذا)

اس کے ترقیمے میں ہے :

"لہٰذا بحفظ اللسان موسوم و در سال نصیف آخر تاریخ بدیہہ مرقوم گردید۔"

شیرانی نے نصیف آخر کو تاریخ مان کر اس سے ۱۰۳۰ھ تاریخ تصنیف برآمد کی۔ ممتاز حسین کے نزدیک یہ مادّہ تاریخ معلوم نہیں ہوتا بلکہ 'تصنیف' کو سہوِ کتابت سے 'نصیف' لکھ دیا گیا ہے۔ شیرانی کا دوسرا نسخہ انڈیا آفس لندن کا مخطوطہ نمبر ۲۲۳۵ ہے۔ اس میں نہ کوئی تمہید ہے نہ ترقیمہ۔ اس میں کہیں کتاب کا نام حفظ اللسان یا مصنّف کا نام ضیاآلدین خسرو نہیں دیا۔ اس کا آخری شعر یہ ہے :

خالق باری بھئی تمام
دو ہوں جگ رہیا خسرو نام

اس بیت کی وجہ سے شیرانی نے اس نسخے کو چھاپ دیا ہے لیکن اس پر انجمن ترقّیِ اُردو کے نسخے کی تمہید و ترقیمہ چسپاں کر کے اسے ضیاآلدین خسرو کی حفظ اللسان کہا ہے۔ دونوں نسخوں میں فرق ہے۔ انجمن کے نسخے میں ۲۱۸ شعر ہیں جن میں ۱۹ شعر لندن کے نیز مطبوعہ نسخے میں نہیں۔ لندن کے نسخے میں ۳۵ شعر ہیں جن میں سے ۲۸ شعر انجمن کے نسخے میں نہیں ہیں۔ اس اختلاف کی بنا پر دونوں نسخے دو علیحدہ کتابیں ہیں شیرانی کو لندن کے متن پر انجمن کے نسخے اور مُصنّف کا نام نہیں چپکانا چاہیے تھا۔

میں ممتاز حسین کی اس دلیل سے متفق نہیں کہ کچھ اشعار کی کمی بیشی کے باعث یہ دونوں نسخے دو الگ الگ مصنّفوں کی الگ الگ کتابیں ہیں۔ ان میں تقریباً ۲۰۰ اشعار مشترک ہیں۔ پھر یہ مختلف کتابیں کیوں کر ہوئیں۔ ممتاز حسین تدوین کے اس عام طریقے سے واقف نہیں کہ مختلف نسخوں کے متون کو ملا کر عطرِ مجموعہ تیار کیا جاتا ہے بشرطیکہ مدوّن کی رائے میں وہ تمام نگارشات واقعی مُصنّف کی ہیں۔ قدیم سنسکرت متون کی اسی طرح بازتشکیل کی جاتی ہے۔ ملّا داؤد کی ہندی نظم چنداین کے منتشر اوراق چھ مآخذ سے دستیاب ہوئے۔ انھیں ملا جُلا کر ترتیب دے کر کسی طرح چنداین کا ناقص نسخہ تیار کیا گیا۔

۳۔ ممتاز حسین صفی کی کتاب مطبوع الصبیان کا ذکر کرتے ہیں جس میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے ۷۰ اشعر خسرو کی خالق باری سے لیے ہیں بقیہ الحاقی ہیں گویا اس نے خالق باری میں حذف و اضافہ کے بعد اپنا نسخہ تیار کیا ضیاآلدین خسرو نے بھی یہی عمل کر کے خسرو کی خالق باری کی بنا پر حفظ اللسان تیار کی ہوگی

مطبوع الصبیان میں صفی نے لکھا ہے کہ اس میں کُل ۳۵۵ شعر ہیں جن میں محض ۷۰ اصل خالق باری کے ہیں۔ اس کے باوجود اس نے کتاب کو اپنی تصنیف یا تالیف قرار نہیں دیا۔ اس کے نسخے کا عنوان ہے :

"کتاب مطبوع الصبیان عرف خالق با[ری] تصنیف امیر خسرو دہلوی قدس سرہ' العزیز۔"

ممتاز حسین کو صفی کے زمانے کا علم نہیں تھا۔ وہ بارہویں صدی ہجری کے نصفِ دو[م] کا مصنّف ہے۔

۴۔ نجیب اشرف ندوی کے نسخے میں یہ نہیں کہا گیا کہ خالق باری ۷۲۶ھ میں تصنیف ہوئی۔ (خسرو کا انتقال ۷۲۵ھ میں ہوا) بلکہ کہ نصاب طریفی جو خسرو کے نسخے پر مبنی ہے ۷۲۶ھ میں تالیف ہوئی۔

اس کے قطعۂ تاریخ کے دو شعر ہیں :

چو بگرفت ایں نسخہ طرزِ نوی
ز تصنیفِ آں خسروِ پہلویؒ دہلو
بتاریخ نیکو سرانجام یافت
نصابِ طریفی نکو نام یافت

ان اشعار کے تین معنی ہو سکتے ہیں :

الف : یہ نسخہ خسرو کی تصنیف سے ہے۔ ج[س] اس نے نئی طرز کی بنیاد ڈالی . . .

محمود شیرانی نے مندرجہ بالا معنی مرا[د]

لے کر اسے مسترد کر دیا۔

ب : خسرو کی تصنیف سے ماخوذ ہو کر اس نسخے نے نئی طرز اختیار کی اور اس کا نام نصابِ ظریفی رکھا گیا۔

یہ معنی ممتاز حسین نے طے کیے ہیں۔

ج : خسرو کی خالق باری کی نئی نقل کی گئی اور اس کا نام نصابِ ظریفی رکھا گیا۔ تاریخِ کتابت ۱۰۳۶ھ۔

یہ معنی صفدر آہ نے لیے ہیں۔

۵۔ خان آرزو گوالیار کے متوطن تھے۔ ۱۱۶۹ھ میں انتقال کیا۔ وہ ۱۱۰۰ھ سے پہلے پیدا ہوئے ہوں گے (خان آرزو کا سنہ ولادت ۱۰۹۹ھ ہے۔ گیان چند)۔ اگر انھیں کے شہر میں ۱۰۳۰ھ میں ضیاء الدین خسرو نے خالق باری تصنیف کی ہوتی تو خان آرزو اسے امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب نہ کرتے۔ اسی طرح تجلی نے ۱۰۶۰ھ میں اپنی منظوم لغت اللہ خدائی لکھی۔ وہ امیر خسرو سے مدد طلب کرتا ہے۔ اگر یہ کتاب اس سے محض ۳۰ سال قبل کی تصنیف ہوتی تو اسے معلوم ہونا چاہیے تھا۔

ممتاز حسین کے آخری دو دلائل مضبوط ہیں۔ اس پہلو کو اہمیت نہ دیجیے کہ کسی مولف نے خالق باری کا نام 'نصابِ ظریفی' لکھا ہے۔ اس پر بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ ۱۰۳۶ھ تاریخِ کتابت ہے یا سہواً اسے تاریخِ تصنیف ظاہر کیا گیا ہے۔ اہم یہ ہے کہ ۱۰۳۶ھ میں امیر خسرو کو ایک منظوم اُردو لغت کا مؤلف قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ۱۰۶۰ھ میں تجلی نے اسے ایسی ہی لغت سے منسوب کیا۔

محمود شیرانی نے خالق باری کے مطالب پر جو سوالات اٹھائے ہیں وہ بھی اہم ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ خسرو نے خالق باری ضرور لکھی لیکن موجودہ نسخے کی ناقص فنی ہیئت، لسانی اغلاط اور ادبی کم مائگی کے پیشِ نظر موجودہ متن کو خسرو سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ جمیل جالبی کا موقف صحیح ترین ہے:

"بنیادی طور پر خالق باری امیر خسرو ہی کی تصنیف ہے جس میں زمانے کے ہاتھوں اتنی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ امیر خسرو کی اصل تصنیف کے حروف صدیوں کی گرد سے اُڑ گئے ہیں۔"

(تاریخِ ادبِ اُردو، جلد اوّل، ص ۳۴)

حواشی:

۱ ڈاکٹر صفدر آہ: امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر۔ نوائے ادب۔ جنوری ۱۹۶۲ء۔ ص ۲۸-۲۷۔

۲ صفدر آہ کی کتاب۔ امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر۔ بحوالہ ڈاکٹر نارنگ: امیر خسرو کا ہندی کلام مع نسخۂ برلن ذخیرۂ اشپرنگر۔ (شکاگو ۱۹۸۷ء) ص ۱۳۱۔

۳ ڈاکٹر معین الدین عقیل: پاکستان میں اُردو تحقیق، موضوعات اور معیار (کراچی ۱۹۸۷ء) ص ۴۰۔

۴ نذیر احمد: "اجے چند نامہ" مشمولہ غالب نامہ، دہلی۔ بابت جنوری ۱۹۸۶ء، ص ۹۵۔

۵ کتب خانۂ سالار جنگ کی اُردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست۔ حیدرآباد، ۱۹۵۷ء۔ ص ۳۵۵۔

۶ شاہ امین الدین علی اعلیٰ، حیات اور کارنامے۔ حیدرآباد، ۱۹۷۳ء۔ ص ۲۱۶۔

۷ فہرستِ مخطوطاتِ انجمن ترقی اُردو، پاکستان۔ جلد سوم۔ ۱۹۷۵ء۔ ص ۸۳۔

۸ Dr. Rehana Khatoon (editor), Introduction of Khan Arzu's Muthmir (University of Karachi 1991) P. 6

نظمیں

یہ اک لکیر

لکیر کھینچ رہا ہوں، نہ جانے کب سے میں
یہ اک لکیر جو ٹیڑھی ہے زندگی کی طرح
ہزار زاویے اور دائرے بناتی ہوئی
ورق ورق یہ نئے حرف اجال دیتی ہے
خیال و فکر کو شکلوں میں ڈھال دیتی ہے

کہیں یہ پھول، کہیں حرف اور کہیں تصویر
کہیں یہ اُلجھے خیالات کی نئی زنجیر
کہیں جنوں کی حکایت کی دل کشا تحریر

اس اک لکیر میں سو پیچ و خم معانی کے
بھرے جب اس کی رگوں میں شعور و فکر کے رنگ،
تو اس لکیر نے شکلیں بنائی ہیں کیا کیا
غزل کا ایک دبستاں کھلا بہ رنگِ بہار
ہر ایک پھول میں سو نکہتیں معانی کی
ہر اک شگوفے میں رنگینیاں جوانی کی
ہر ایک مصرعۂ تر ایک رازِ سربستہ
ہر ایک شعر میں نغمے کا اک جہاں آباد
سخنوری کی روایت کا بولتا جادو

یہی لکیر تخیل کا رنگ و نور لیے
بنی جو نظم تو پیدا ہوئے جہاں کیا کیا
بیانِ ارض و سما کے رموز کرنے چلی
دلوں کو شورشِ ہستی کا سوز و ساز دیا
جو اختیار کیا ہے کبھی شباب کا رنگ
ہر ایک لفظ سے پیدا ہوئی صدائے چنگ

بغاوتوں کا جنوں جب سما گیا سر میں
تو پیچ کھا کے اُٹھا انقلاب کا آہنگ
ہر ایک لفظ سے چنگاریاں سی اُڑنے لگیں
ہر اک صدا میں سمٹ آئی زلزلوں کی دھمک

اُتر گئی جو نہاں خانۂ تمدن میں
اس اک لکیر نے لکھے ہیں کتنے افسانے
کبھی کبھی تو زباں بن گئی ہے گونگوں کی
کسی کا حسنِ سماعت، کسی کی بینائی

یہ اک لکیر جو رقصاں ہے میرے ہاتھوں میں
جو میری نوکِ قلم پر چمکتی رہتی ہے
اس اک لکیر سے لکھی گئی کتابِ حیات
عطا ہوئی ہے مجھے کیسی بے بہا سوغات

میں لفظ لفظ 'اُجالا' میں حرف حرف کرن
مری صدا میں معانی کا بولتا ہے چمن

رفعت سروش

ٹرنک کال

دل وہ اُجڑا مکان تھا جس میں
صبح آتی تھی، شام غم لے کر
شام آتی تھی لے کے تنہائی
ٹوٹے پھوٹے تھے بام و در جس کے
کھو چکے تھے، تمام زیبائی
کوئی مہماں، اِدھر نہ آتا تھا
کوئی کرتا نہ تھا، پذیرائی

دُور نیلے سمندروں سے پرے
دفعتاً، خواب کے جزیروں سے
تیری آواز، اِس طرح آئی
ابر برسا ہو جیسے صحرا پر
پھول کھلتے ہوں لے کے انگڑائی
تیرا لہجہ، کھنکتے ساغر سا
جس میں شامل ہے تیری رعنائی
شہد گھلنے لگا ہے کانوں میں
دُور گونجی ہو جیسے شہنائی

دل جو سُونا مکان تھا کل تک
اُس میں رونق پلٹ کے پھر آئی
ریزہ ریزہ بکھر گیا ہے سکوت
ٹکڑے ٹکڑے ہے آج تنہائی

کرشن ادیب

۲-بی، پاکٹ سی، سدھارتھ ایکسٹنشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

ای-۸۹، کچلو نگر، لدھیانہ ۱۴۱۰۰۱ (پنجاب)

آدمی کو بھی میسّر نہیں

حسن جمال

پنّا نواس کے سامنے، لوہار پورہ، جودھ پور ۳۴۲۰۰۲ (راج)

جس وقت آر۔بی۔جوشی آئینے کے سامنے کھڑے تھے، کھڑکی کے باہر پیپل کے درخت پر چڑیاں بُری طرح شور مچا رہی تھیں۔ اور اس سے ذرا دُور شہر کی مصروف سڑک پر بھاگتی گاڑیوں سے نکلتا ہوا دھواں فضا کو گرد آلود کر رہا تھا۔ روز شام کو شہر کی ایسی حالت ہو جاتی تھی۔ اس زہر آلود فضا میں کوئی بھی باہر نکلنا نہیں چاہتا، اگر ضروری کام نہ ہو۔

مگر آر۔بی۔جوشی باہر جانے کے لیے آخری بار آئینے میں خود کو نہار رہے تھے۔ سر پر رکھی مخملی ٹوپی کو دو تین مرتبہ اِدھر اُدھر کھسکایا۔ ہر بار ان کی انگلیاں کنپٹی پر ٹھہر گئیں۔ ان کے بال تیزی سے سفید ہوتے جا رہے تھے۔ کیا اب انھیں ہیئر ڈائی استعمال کرنا شروع کر دینا چاہیے؟ — لیکن کس لیے؟ کل وہ ضرور رجن حجام کی دکان پہ جائیں گے۔ کئی دنوں سے وہ ٹالتے آرہے تھے۔ ایک بار بال سیٹ ہو جائیں تو دو تین ماہ تک سفید کنپٹیاں پریشان نہیں کرتیں۔ انھوں نے نکیلی مونچھوں اور داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور زیرِ لب مسکرائے۔ جب سے انھوں نے داڑھی رکھ لی ہے۔ ان کے چہرے کی رونق بڑھ گئی ہے۔ کھادی سلک کا چولا اور علی گڑھی پاجامہ ان پر خوب پھبنے لگا ہے۔ آرام دہ بھی بہت ہے۔ اور جب سے انھوں نے آنکھوں میں سرمہ لگانا شروع کیا ہے، ایک عجیب سی ٹھنڈک محسوس کر رہے ہیں اور روشنی کی لپک!

ہوائی اُتار کر انھوں نے خلیل میاں کی، پیار سے بنائی ہوئی جوتیاں پہن لیں۔ اب وہ تیار تھے۔

شوبھا کمرے میں داخل ہوئی۔ "آپ باہر جا رہے ہیں؟" یہ سوال بھی تھا اور تنبیہہ بھی۔

"ہاں بیگم، کچھ کام ہو تو فرمائیے؟" ایک نظر آئینے کی طرف، دوسری بیوی کی طرف کرتے ہوئے آر۔بی۔جوشی نے کہا۔

شوبھا نے نتھنے پھڑکائے۔ منہ بچکایا۔ اسے شوہر کے یہ چونچلے بالکل پسند نہیں ہیں کتنی بار ٹوک چکی ہے کہ اسے "بیگم" کا تخاطب پسند نہیں، عجیب سا لگتا ہے۔ وہ اپنا "شوق" اس پر کیوں لادتے ہیں؟

"معاف کرنا رانی! عادت پڑ گئی ہے۔ اچھا بھی لگتا ہے۔ پتہ نہیں، تمھیں کیوں نہیں لگتا؟" آر۔بی۔جوشی کھسیا کر بیگم عرف رانی کے مقابل کھڑے ہو گئے۔ "کیا شیرینی ہے اس زبان میں..."

"آگ لگے اس شیرینی۔ شیرنی کو معلوم ہے، شہر کی فضا کیسی ہو رہی ہے؟ لوگوں کو تو سانس لینا مشکل ہے اور آپ کو تفریح کی سوجھی ہے۔ کچھ دن باہر نہیں نکلیں گے تو آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا؟"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں بیگم — ساری! کل سے نہیں جاؤں گا۔ دراصل جب تک شام کو باہر نہ ہو آؤں، کھانا ہضم نہیں ہوتا۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو پارک میں گھوم آیا کیجیے۔ مگر وہاں کیوں جاتے ہیں!"

"کہاں؟"

شوبھا خاموش۔ آر۔بی۔جوشی دیر تک اسے تاکتے رہے۔ پھر بولے "دیکھو بیگم! ہم دو وجہوں سے وہاں جاتے ہیں۔ ایک تو ہمیں وہاں جانا اچھا لگتا ہے۔ دوسرے ہمارے اِدھر کے لوگوں کو جلانے کے لیے۔"

"ٹھیک ہی تو کہتے ہیں وہ۔"

"کیا خاک ٹھیک کہتے ہیں! آزاد ملک میں رہتا ہوں بھئی میں۔ مجھے حق حاصل ہے جس سے چاہوں ملوں۔ جیسا چاہوں پہنوں جو چاہوں کھاؤں۔ وہ کون ہوتے ہیں مجھے ٹوکنے والے! کیا میں نے کبھی ان کے کسی کام میں دخل دیا ہے؟"

شوبھا خاموش ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک بار جب جناب کا پارہ چڑھ جاتا ہے تو پھر اُترنے کا نام نہیں لیتا۔ یہ اپنے معاملے میں کوئی دلیل سننا پسند نہیں کرتے۔ پھر بھی وہ ٹوکنے سے باز نہیں آتی اور آخر کار خود ہی خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

"آپ سے کچھ بھی کہنا سننا بیکار ہے لیکن بھگوان کے لیے جلدی آ جیے گا۔"

"کیوں؟ کوئی خاص پروگرام ہے کیا؟"

آر۔ بی۔ جوشی شرارت سے مسکرائے۔

شوبھا نے جواب نہیں دیا اور چُپ چاپ لوٹ گئی۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

غالب کے اشعار گنگناتے ہوئے جوشی جی گھر کی سیڑھیاں اُترنے لگے۔ وہ کافی ہلکے موڈ میں تھے۔ شام کے وقت وہ ہمیشہ خوشگوار موڈ میں ہی رہتے جب دن بھر کا بوجھ سر سے اُتار کر باہر نکلا کرتے تھے ـــــ اپنے عزیز دوستوں سے ملاقات کرنے!

ان کے پڑوسی شرما جی، جو ایک ـــــ ہائر سیکنڈری اسکول میں ٹیچر تھے۔ چٹیا دھاری ٹائپ قسم کے، ابھی ابھی ٹیوشن سے لوٹے تھے۔ اپنی موپیڈ کو دیوار کے سہارے کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے کیوں کہ سڑک گاڑی اسٹینڈ کرنے کے قابل نہ تھی۔ جوشی جی کو دیکھتے ہی زہر آلود مسکراہٹ کے ساتھ بولے "سلے مالو کوم۔ مولی ساب!"

"لاحول ولا قوت!" جوشی جی ہمیشہ شرما جی سے بدکتے تھے۔ یہ آدمی قصداً اردو عربی کا ستیاناس کرتا ہے چڑھانے اور جلانے کے لیے۔

"وہ کیا ہے جوشی جی۔ یہ سسری اُردو ہماری زبان پر چڑھتی ہی نہیں۔ نخرے بہت دکھاتی ہے۔ پردیشی جو ٹھہری! آپ کی بات اور ہے۔ آپ تو دیوانے ہیں۔ کبھی فرصت میں ہمیں بھی سکھائیے نا اُرد رھات اُردو۔"

ان کی صاف منشا ہوتی تھی کہ جوشی جی کو بور کیا جائے "وہیں جا رہے ہیں نا، چنڈو خانے میں؟"

"نہیں شمشان جا رہا ہوں آپ کی استھیاں لینے۔" جوشی جی ڈھیر سارا تھوک نالی میں انڈیل دیتے۔ پتہ نہیں وہ تھوکتے تھے یا اپنی نفرت اگلتے تھے اس طرح ـــــ الٰہی! کیسے غیر مہذب لوگوں کو ہمسایہ بنایا ہے تو نے۔ انھیں نیک توفیق دے باری تعالیٰ!"

وہ گلی کے دہانے پر آئے جہاں سے بازار شروع ہوتا تھا۔ انھوں نے بھیڑ کا جائزہ لیا اور آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھائے۔ اسی وقت ایک آٹو رکشا نے ان کے سینے پر چڑھ کر ہارن دیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹے ورنہ ان کا پاؤں کچل جاتا۔ ڈرائیور نے سر باہر نکالا "سالے مسلّے! اندھا ہے کیا؟" اس کے ساتھ ہی اس نے ایکسی لیٹر دبا دیا ـــــ ڈھیر سارا دھواں چھوڑتے ہوئے۔

جوشی جی کا موڈ کرکرا ہوگیا۔ پتہ نہیں، گالی کھا کر خود کی غلط پہچان پر یا کڑوے دھویں کی وجہ سے! بے عزتی کا احساس لیے آگے بڑھے سامنے ہی ٹھا مرلی پان والے کا کیبن۔ کئی گھورتی آنکھیں جن میں حقارت نمایاں تھی۔

"دیکھنا اُدھر ہی جائے گا۔" ایک نے کالر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے نے گٹکے کی پیک نالی میں بیچ سے پھینکی "اپن کو کیا کرنا ہے؟"

"کرنا کیسے نہیں ہے؟" موٹر سائیکل کی سیٹ پر آرام سے پسرے تیسرے نوجوان نے نتھنے پھڑکائے۔ "دشمن کا جاسوس ہے۔ اِدھر کی اُدھر کرتا ہے۔"

"آدمی تو ایسا نہیں دِکھتا۔"

"چھوڑ یار۔ عورت کے چکر میں کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ سالا میاں "گھوڑی" بننے مسجد میں گھس جاتا ہے۔ روزے بھی رکھتا ہے۔ اس پر بیا باسس میں کوئی آشنا ہے اس کی بیوہ ـــــ سب چھان بین کر لی ہے میں نے۔ تھوڑا ماحول گرم ہونے دے۔ کاٹ کر نہ رکھ دیا تو میرا نام وجے نہیں۔"

"تو جب بھی سوچے گا مار کاٹ کی بات۔ یہ عشق کرے کہ نماز پڑھے، اپن کو اس سے کیا؟"

"نہیں، مطلب ہے۔ اب ہم ان لوگوں کو برداشت نہیں کریں گے۔ بہت ہو گیا۔ یہ جانب داری اب اور نہیں چلنے دی جائے گی۔ دیکھنا تھوڑے دنوں میں ہماری حکومت ـــــ آنے والی ہے۔"

"لیکن یہ تو براہمن ہے۔"

آر۔ بی۔ جوشی کو پتا تھا کہ ان گھورتی اور سلگتی آنکھوں کے ساتھ ہلتے ہوئے ہونٹوں کا تعلق ان سے صرف انھی سے ہے۔ وہ روز سوچتے تھے کہ کسی روز ان نوجوانوں کے قریب جائیں اور جم کر بحث کریں کہ ان کا سوچنا صحیح نہیں ہے۔ دراصل یہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر انھیں ورغلاتے رہتے ہیں۔ یہ سازش کے شکار ہیں اور انھیں معلوم نہیں ہے کہ یہ کسی کے ہاتھوں کا کھلونا بنتے جا رہے ہیں۔ لیکن ہر مرتبہ ان کے پاؤں سڑک پر چپک کر رہ جاتے تھے۔ ہر بار وہ سوچتے کہ اگلی بار وہ ان کے پاس جائیں گے اور حتی الامکان سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے کسی روز ان کے دماغ کے جالے صاف ہو جائیں۔

تنہائی میں وہ اکثر سوچا کرتے کہ ان کے اپنے لوگ کیوں ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں؟ وہ تو کسی کا بُرا نہیں سوچتے؟ نہ کسی کے کام میں دخل دیتے ہیں۔ نہ کسی کی غیبت یا تنقید

کرتے ہیں۔ پھر بھی سب ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ گویا اُردو بولنا، پڑھنا انھیں دوسروں سے الگ کردیتا ہے۔ یا مسلم دوستوں کی صحبت انھیں ہندو نہیں رہنے دیتی۔ اگر غلام رسول کے ساتھ کسی 'مدینہ' یا 'نگینہ' ہوٹل میں مرغی کی ران چبالی تو ان کے مُنہ کا ذائقہ کیوں خراب ہوگیا؟ اگر وہ کسی فٹ پاتھ پر کھڑے ہوکر کباب اڑائیں یا کسی مشاعرے میں بیٹھ کر داد دیں تو ان کو کیا؟ وہ تو کسی کو مجبور نہیں کرتے کہ آپ بھی ایسا کیجیے۔ یہ خواہ مخواہ کی عداوت ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ آپ چوری چھپے چاہے جو کریں، اپنے آدمی کو ویسا کرتے نہیں دیکھ سکتے۔ وہاں دھرم آڑے آجاتا ہے۔ نفرت ہے انھیں ڈبل اسٹینڈرڈ سے۔ وہ جو ان کی بیگم کے نام گمنام خط آتے ہیں، کیا یوں ہی ہیں؟ یہ تو غنیمت ہے کہ بیگم ان کی سمجھدار ہے ورنہ بیوہ عورت والا قصہ کسی چنگاری سے کم تھوڑے ہی تھا۔ اپنے کلیگ ماجد کی بے وقت موت پر اس کی اَن پڑھ بیوی کی پینشن وغیرہ کے سلسلے میں مدد کرکے انسانی فرض ادا کیا سو وہ بھی عشق ہوگیا! لعنت ہے ایسی سوچ پر جو ہمدردی کے جذبے کو بھی شک و شبہ کے ترازو میں تولنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے باس کو یہاں تک کہ ضلع کلکٹر کو ان کی شکایتیں پہنچانا، کیا شریف لوگوں کا کام ہے؟ میں پاکستان کے لیے جاسوسی کروں گا — میں؟ میرا تعلق کیا ہے پاکستان سے، کوئی بتائے تو سہی! کم ظرف بے حس لوگ۔

انھوں نے پھر تھوکا۔

چوک میں گہما گہمی تھی۔ معمول سے کچھ زیادہ۔ پہلے سوچا شاید ٹریفک جام ہوگیا جو اکثر ہوجاتا تھا۔ بے ترتیب تانگے، رکشے، ٹھیلے، تھڑی والے، ٹریفک تو جام تھا مگر انھوں نے غور سے دیکھا تو وجہ کچھ اور ہی نظر آئی۔ کچھ لوگ ایک ریہڑی والے کو بے رحمی سے پیٹ رہے تھے اور بھیڑ تماشا دیکھنے کے لیے جمع تھی۔ معلوم ہوا ریہڑی والے کی ایک ٹیکسی ڈرائیور سے معمولی بات پر تکرار ہوگئی تھی۔ اور تکرار مار پیٹ تک پہنچ گئی تھی۔

جوشی جی کو ایسی کسی تکرار میں دلچسپی نہیں رہتی۔ وہ آگے بڑھ گئے۔ انھیں پتہ نہیں تھا کہ وہ اپنے پیچھے ایک طوفان چھوڑ کر جارہے ہیں۔

جب وہ کالے خاں کے چائے خانے میں پہنچے تو وہاں چوک کا ہی ذکر چل رہا تھا۔ ان کے واقف کاروں میں صرف رحمان صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک اچٹتی سی نظر آر۔ بی۔ جوشی پر ڈالی۔ اس نظر میں روز مرّہ والی اپنائیت بالکل نہ تھی۔ آر۔ بی۔ جوشی اداس ہوگئے۔ محبت ہی انھیں یہاں کھینچ لاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا گویا وہ اپنوں کے درمیان آگئے ہوں۔ بجھے دل سے انھوں نے سوال کیا "غلام رسول صاحب تشریف نہیں لاتے؟"

دراصل وہ یہاں غلام رسول سے ہی ملنے آتے تھے۔ باقیوں سے تو خود بخود جان پہچان بڑھ گئی۔ غلام رسول سے مل کر جوشی جی دن بھر کی تھکان بھول جاتے۔ ان کی شیریں گفتگو کے جوشی جی اسیر تھے۔ کیوں کہ غلام رسول کا شعر و ادب میں بھی دخل تھا۔ آدمی تھے باغ و بہار۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جن سے ملنے کو، جن کے ساتھ رہنے کو بار بار جی چاہتا ہے — چاہے اس کا مذہب اس کی قوم۔ اس کی نسل کچھ بھی ہو۔

رحمان صاحب کی تیکھی نظر کے ساتھ کئی جوڑی۔ بیگانہ آنکھیں اور بھی ان کی طرف اٹھیں۔ اور ایک ہلکی سی "نہیں" کے ساتھ رحمان صاحب دوبارہ باتوں میں کھو گئے۔ ان کی یہ بے رخی جوشی جی کو ناگوار گزری۔ لیکن یہ بے رخی بے سبب نہ تھی۔ تین ماہ پہلے مندر مسجد کی آگ نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جیوتی اور دیے کی باتی سے کس طرح اندھیرا پھیلتا ہے، یہ لوگوں نے پہلی بار دیکھا۔ اس قیامت کو لوگ بھول جانا چاہتے ہیں۔ لیکن جب کبھی بازاروں، گلیوں، کالجوں، یا اسکولوں میں تصادم کے حالات بنتے ہیں تو آپ ہی آپ شٹر گرنے لگتے ہیں۔ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے ہیں لوگ۔ اب کوئی کسی کا بھروسا کرنا نہیں چاہتا۔ مٹیلا آکاش دہشت بن کر لوگوں کے سینے میں اُتر چکا ہے۔ سہمے ہوئے پرندے کی طرح ہوگیا ہے آدمی اور کچھ لوگ اِسے اپنی خوش نصیبی تصور کرتے ہیں اور کھیل جاری ہے۔

آر۔ بی۔ جوشی من مسوس کر تہہ کیا ہوا اُردو کا اخبار اُٹھا کر بے دلی سے پڑھنے لگے۔ من ہی من کوئی اور دن ہوتا تو یہ ہی لوگ ان سے اخبار باآواز پڑھنے کی فرمائش کرتے۔

جوشی صاحب! آپ اخبار کیا پڑھتے ہیں گویا پھول جھڑتے ہیں۔ آپ غلطی سے براہمن کے گھر میں پیدا ہوگئے۔

برہمن کہو میاں! جوشی خوش ہوکر اس کی غلطی سدھارتے۔ غلام رسول انھیں دیکھ کر جب کہتا کہ لو برہمن آگیا تو انھیں بہت اچھا لگتا۔

لیکن آج غلام رسول نہیں آتے تھے۔

شاید اب آتے ہوں۔ اخبار میں دل نہیں لگا۔ واپس تہہ کرکے رکھ دیا۔

"کالے صاحب! ایک چائے تو دیجیے بادشاہی ـــــ رحمان صاحب آپ لیں گے؟"

رحمان صاحب نے خفگی سے ان کی جانب دیکھا اور سر ہلا دیا۔ ان کی بے رُخی سمجھ سے بالاتر تھی۔ غلام رسول آجائیں تو بات بنے۔ وہ بے صبری سے انتظار کرنے لگے۔

لیکن غلام رسول کو آج نہیں آنا تھا، نہیں آئے۔ (وہ نہیں آتا جس سے ملنے کو دل بے چین رہتا ہے) اور، اور لوگ آتے رہے ـــــ چائے خانے کی فضا میں پُر اسرار گھٹن بڑھتی رہی۔ یہ پہلا موقع تھا جب سر آنکھ میں ایک سوال تھا کہ آپ یہاں کیوں ہیں؟ وہ بے چینی محسوس کرنے لگے۔

آخر رحمان صاحب ان کی طرف متوجہ ہوئے" جوشی صاحب! حالات اچھے نہیں ہیں۔ بہتر ہوگا آپ گھر تشریف لے جائیں۔ شہر میں پھر بلوا ہوا ہے۔ آپ کو نہیں پتہ؟ آپ چوک سے آئے ہوں گے۔ لگتا ہے، غلام رسول آج نہیں آئیں گے۔"

پھر زیر لب بڑبڑانے لگے "آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ پہلے سے تھا۔ یہ آدمی لڑنا کب چھوڑے گا میاں؟ ہزاروں صدیاں بیت گئیں۔ یہ تو اور وحشی ہوتا جا رہا ہے۔"

آر۔ بی۔ جوشی اس موضوع پر ان سے طویل گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ کسی قدر دونوں ہم خیال تھے۔ لیکن رحمان صاحب کی بے رُخی اور موقعے کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے بھاری دل سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

تبھی ایک شخص دوڑتا ہانپتا آیا اور ایک جملہ ہوا میں اُچھالتا ہوا اُلٹے پاؤں لوٹ گیا۔

"غلام رسول صاحب کو کسی نے چاقو مار دیا!"

"ہائے میرا یار!" آر۔ بی۔ جوشی تڑپے۔

"کہاں ہے وہ؟"

چائے خانے میں بھگدڑ مچ گئی۔

اب سرپٹ بھاگتے ہوئے لوگوں میں ایک آر۔ بی۔ جوشی بھی تھے۔

دفعتاً انھیں لگا کسی نرم سی ہتھیلی نے ان کا ہاتھ چھوا۔ اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ پھر ایک مانوس سی ملائم آواز نے انھیں رُکنے کے لیے مجبور کر دیا۔ ماجد کا لونڈا واجد تھا۔ شاید یہی نام تھا اس کا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ جاؤ گھر۔" انھوں نے نرمی سے گھرکا۔

واجد اداس تھا "بھائی جان صبح نکل گئے تھے۔ ابھی تک نہیں لوٹے۔ امّی پریشان ہیں۔ آپ کو بلایا ہے۔"

آر۔ بی۔ جوشی ٹھٹک گئے۔ حیران پریشان۔ ایسے وقت میں خود انھیں اپنے گھر میں ہونا چاہیے تھا۔ ادھر غلام رسول کی فکر۔ انسانی فرض ایسے حالات میں وہ کر ہی کیا سکتے ہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ ماجد کی موت کے بعد انھوں نے ایک سچّے دوست کی طرح اس گھر کا خیال رکھا ہے۔ ماجد کے بچّے جب تب اس مخصوص چائے خانے میں چھوٹے موٹے کاموں کے لیے بلانے آتے رہے ہیں اور انھوں نے انسانیت کی غرض سے وہ سب کیا بھی ہے۔ یہاں تک کہ بدنامی بھی برداشت کر رہے ہیں لیکن ایسا تو کبھی نہ سوچا تھا کہ ماجد کی بیوہ مکمل طور پر ان پر منحصر ہو جائے گی۔ کیا اور لوگ نہیں ہیں؟

واجد کی ہتھیلی اب گیلی ہو چکی تھی۔ انھوں نے واجد کے سہمے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور آبدیدہ ہو گئے۔ پھر بے اختیار ماجد کے گھر کی طرف بڑھ چلے جو چائے خانے سے کچھ ہی فرلانگ پر تھا۔ خالص مسلم علاقہ ـــــ اپنی مخصوص آوازوں اور بُو سے خیر مقدم کرتا ہوا۔

ماجد کی بیوی رو رہی تھی۔ انھوں نے دلاسا دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مطمئن ہو گئی جیسے جوشی جی سب ٹھیک کر لیں گے۔ اس کے آوارہ لڑکے کو ایسی افراتفری میں بھی کہیں سے ڈھونڈ نکالیں گے۔

رُقیّہ نے دھو پونچھ کر پانی کا گلاس ان کے سامنے رکھ دیا تھا اور پھر دیوار کے سہارے کھڑی ہو کر یوں ہی اپنے مرحوم ابّا کے ہمدرد دوست کی طرف تکنے لگی۔ جوشی جی کی نگاہ اُٹھی اور ماجد کا فکر مند چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ وہ تاب نہ لا سکے۔ آنکھیں پھیر لیں ـــــ خدا سب ٹھیک کرے گا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔

وہ جب اٹھے تو ان کے ہونٹوں پر یہی کلمہ تھا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔

واجد کب کا چھت پر جا چکا تھا۔ اپنے دوستوں کے درمیان۔ اس کے کھلکھلانے کی آواز ان کے کانوں میں آ رہی تھی۔

"کیوں میاں! اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے؟" وہ گلی بھی پار نہ کر پائے تھے کہ غازی پہلوان سے مڈبھیڑ ہو گئی "کیا چکر ہے؟ یہ شریفوں کا محلّہ ہے، سمجھے!"

غازی پہلوان سے اس مسئلے پر پہلے بھی کھٹ پٹ ہو چکی تھی۔ وہ جیسے چوکنّے کتّے کی طرح ہمیشہ ان کی تاک میں رہتا تھا۔ خاص طور سے اس لیے کہ وہ ماجد کا دور کا رشتے دار ہوا کرتا تھا۔ اور ماجد کی بیوہ اس سے نفرت کرتی تھی۔

"میں پہلے بھی آپ سے گزارش کر چکا ہوں کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کو پتہ ہے ساجد صبح سے غائب ہے۔ اس کی امّی پریشان ہے۔ مجھے تو بلوایا گیا تب پتہ چلا۔"

"ہاں، ہاں۔ ایک آپ ہی ہمدرد رہ گئے ہیں سارے شہر میں اس رانڈ کے۔ دفعہ ہو جاؤ میاں ایکدم یہاں سے ورنہ خون خرابہ ہو جائے گا قسم سے۔ آئندہ تمہاری شکل بھی اِدھر دکھائی دی تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔ غلام رسول کے دوست ہو اس لیے اس کا پاس ہے ورنہ۔۔۔" آگے کے الفاظ اس کے بھینچے ہوئے دانتوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔

تبھی کچھ نوجوان ہاتھوں میں ہاکی، اسٹک، زنجیریں اور ڈنڈے لہراتے ہوئے "یا علی" نعرۂ تکبیر اللہ اکبر" کی صدا بلند کرتے ہوئے تاریکی میں سے نمودار ہوئے۔

"استاد! کدھر چلنا ہے؟" کچھ آوازوں نے جوش میں پوچھا۔

اُستاد یعنی غازی پہلوان کی سلگتی ہوئی آنکھیں آر۔ بی۔ جوشی پر ٹِک گئیں۔ پھر وہ موٹی گردن کو خم دیتے ہوئے حقارت سے بڑبڑایا۔

"نہیں نہیں ـــ تم جاؤ میاں۔ تم غلام رسول کے دوست ہو۔"

"اُستاد، وہی ہے نا جس کا تم ذکر کیا کرتے ہو۔ کہو تو۔"

"خبردار! غازی دہاڑا" میں دوستی کی خاطر دشمن کو بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ سالے غلام رسول کو بھی کیا سوجھی؟ اور کوئی نہیں ملا؟ چلو میاں۔ دم دباؤ۔ میرے لونڈوں کا بھروسہ نہیں۔ ورنہ تو ٹھری ہو جاؤ۔"

سارے لڑکے آر۔ بی۔ جوشی کو گھیر کر کھڑے ہو گئے تھے۔ خوف کی ایک لہر سی جوشی جی کے سراپے میں اتر گئی۔ ان کا ڈگمگاتا قدم اُٹھا۔ پھر وہ تیز تیز چلنے لگے۔

عام شاہراہ پر آ کر انھوں نے لمبے سانس بھرے جیسے بڑی مشکل سے شیطان کی گرفت سے چھوٹے ہوں۔ سڑک سونی تھی۔ تاریکی میں ڈوبی ہوئی۔ ہیوی لوڈ کی وجہ سے اکثر و بیشتر بجلی کا گُل ہو جانا عام بات تھی اس شہر کے لیے لیکن یہ تاریکی نامانوس تھی۔ ہولناک سناٹا اور اندھیرا، دہشت کی زبان لپلپاتا ہوا۔

"اگر ٹیکسی کر لیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔" انھوں نے سوچا۔ بیگم کس قدر فکر مند ہوں گی۔ کاش! آج میں ان کی بات رکھ لیتا۔ یہ پریشانی تو نہ اٹھانا پڑتی۔

لیکن کوئی ٹیکسی نظر نہیں آئی۔ وہ اندھیرے میں بڑھتے چلے گئے۔ اچانک روشنی کو دیکھ کر ان کی امید جاگی۔ وہ لپکے۔

وہ ٹیکسی نہیں، ایک جیپ تھی۔ اور اس میں غازی پہلوان کے شاگردوں کی صورتوں والے نوجوان بھرے ہوئے تھے۔ ان کے ماتھے پر تلک تھا اور سر پر بھگوا رومال باندھے ہوئے تھے۔ آنکھیں جیپ کی روشنی سے بھی تیز ـــ گھورتی ہوئی۔

"دشمن ہے مارو سالے کو" ایک نے چیخ کر کہا۔

"دیکھیے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں تو برہمن ہوں آر۔ بی۔ جوشی۔ آپ کا اپنا آدمی ہوں بھئی۔ یہ دیکھیے جینو۔ یقین کرو۔ مجھ نہتے کو مار کر آپ کو کیا ملے گا؟"

آر۔ بی۔ جوشی نے اپنی شناخت کرانے کی ضرورت شدت سے محسوس کی مگر ایک خاص وقت میں مخصوص لوگوں کو کچھ بھی سنائی نہیں پڑتا ـــ سوا کچھ آوازوں کے۔۔۔ یہ آوازیں انھیں انسان نہیں رہنے دیتیں۔ بھیڑیوں میں بدل دیتی ہیں۔ وہ اپنی پہچان کے لیے اُدھار کی آوازوں کے محتاج ہو جایا کرتے ہیں۔

انھوں نے بھی کچھ نہیں سُنا۔ آر۔ بی۔ جوشی ایک شکار میں تبدیل ہو کر رہ گئے۔ اور اپنے شکار کو کوئی نہیں چھوڑتا۔ کسی نے ڈنڈے برسائے کسی نے گھونسا مارا۔ کسی نے لاتیں جمائیں۔

جینو دِکھا کر میاں بیوقوف بنانا چاہتا ہے۔ براہمن کو۔ برہمن کہتا ہے تو تو شکل سے ہی دشمن لگتا ہے، تیری تو۔۔۔"

یکبارگی تو جوشی جی نے سوچا کہ وہ سمجھانا چھوڑ فلمی ہیرو کی طرح ان لوگوں سے بھڑ جائیں۔ لیکن اگلے پل ہی خیال آیا کہ وہ اس جسم کے ساتھ ان وحشیوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ پھر ان کی جان صرف ان کی اپنی نہیں ہے۔ وہ شوبھا کی، بچوں کی۔ قوم کی۔ وطن کی امانت ہے۔ اسے فضول ضائع نہیں کر سکتے ـــ تو کیا بزدلوں کی طرح فرار ہو جائیں۔ صرف اس لیے کہ کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت آ گئی ہے۔ اور ان کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا؟ اس لیے کہ سب اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا حماقت ہے کہ مٹھی بھر لوگ اٹھتے ہیں اور لاکھوں انسانوں کی مجموعی طاقت کو آناً فاناً اپنی مٹھی میں قید کر لیتے ہیں۔ وہ بستیوں کو شمشان بنا دیتے ہیں اور اسے محض ایک خبر سمجھا جاتا ہے۔ مہذّب ہوتے ہوتے ہم کس مہیب غار میں پہنچ گئے ہیں!

اس تابڑ توڑ حملے سے ان کے کپڑے تار تار ہو گئے۔ وہ بار بار اٹھنے کی سعی کرتے مگر گر جاتے۔ دفعتاً اُن کی چھٹی حس بیدار ہوئی۔

اپنی تمام تر طاقت کو سمیٹتے ہوئے وہ اُٹھے اور بے تحاشا بھاگنے لگے کسی نے چاقو نکال لیا تھا۔ بس چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تھا ان کی زندگی اور موت کے درمیان۔

وہ بھاگتے رہے۔ ان کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ فلموں میں اکثر دیکھے ہوئے سین کے آج وہ خود ایک کردار بن کر رہ گئے تھے۔ تیز اور تیز تر۔ تعاقب کرتے قدموں کی زد سے بچنے کی جی توڑ کوشش۔

بھاگتے بھاگتے وہ ایک انجانی گلی میں گھُس گئے۔ تاریک و تنگ گلی میں۔ پھر دوسری۔ پھر تیسری گلی۔ وہ گلیوں کا بھنور تھا۔ اس بھنور میں حملہ آور قدموں کی آہٹ مدھم پڑتی گئی پھر بھی ہر سانس پہ آہٹیں پاس آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

آر۔ بی۔ جوشی پسینے میں لت پت بُری طرح ہانپتے ہوئے آخری پناہ کے لیے ایک مکان میں داخل ہو گئے۔ وہ مکان نہیں، ایک باڑا تھا۔ ان کے پاؤں کیچڑ میں دھنستے چلے گئے۔ ایسی خوفناک بدبُو سے کبھی ان کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے دو ڈگ چل کر ڈھیر ہو گئے۔ اور "کڑک کوں، کڑک کوں" کا شور مچ گیا۔ وہ مرغیوں کے ڈربے تھے۔ چھوٹے بڑے پتہ نہیں، مرغیاں ان کا خیر مقدم کر رہی تھیں یا احتجاج یا شاید انھیں بھی کوئی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس کسمپرسی کی حالت میں بھی جوشی جی ہلکے سے مسکرائے —— کیا فرق ہے آدمیوں اور ان مرغیوں میں؟ ایسے ڈربے تو پوری دنیا میں بکھرے پڑے ہیں۔ آدمی ڈربوں سے نکلتا کیوں نہیں؟ وہ نیم غشی میں خود کو پہچاننے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ انھوں نے کبھی تصوّر بھی نہیں کیا تھا کہ زندگی میں کبھی ایسی نامانوس جگہ پر ہوں گے ... ایسی حالت میں تار تار بے یار و مددگار۔

اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ وہ خوف سے سکڑتے چلے گئے۔ ایک مرغی کی طرح پنکھ سمیٹ کر۔ گویا وہ بھی ایک مرغی ہیں، اور کسی بلّی کی زد سے بچنے کی خاطر ڈربے میں گھس جانا چاہتے ہوں۔ اپنی عافیت کے لیے۔

ایک سایہ ان پر لہرایا۔ وہ ایک بڑھیا تھی۔ شاید اس گھر کی مالکن۔

"کون ہو میاں تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟ میری مرغیاں چُرانے آئے ہو کیا؟"

"پتہ نہیں امّاں! میں کون ہوں یہاں کیا کر رہا ہوں اور میری اس حالت کا ذمّے دار کون ہے؟" نیم بے ہوشی میں ان کے گلے سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی "گھبراؤ نہیں امّاں! میں چور نہیں ہوں!!"

"گھبرا تو تم رہے ہو۔" بڑھیا اور قریب آئی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس اجنبی شخص کے گلے سے غیر واضح الفاظ پھوٹ رہے ہیں اور گلے میں وَیسا ہی اُتار چڑھاؤ ہے جیسا مرغیوں کے کڑک کوں، کڑک کوں کرنے وقت ہوتا ہے!

غزلیں

نہائی کا زخم تھا کیسا سناٹوں نے بھرا نمک
یسا چھلکا زخم کر سارا پلکوں سے بہہ گیا نمک

لوے مانڈے سب میٹھے تھے کھا پی کر وہ بھول گیا
لخ عناصر پر مبنی تھا رگ رگ میں رہ گیا نمک

زخموں کے گل کیا دھوتے گی رت رسیا برسات جہاں
ہر موسم ہر آن بکھیرے ملتی پھرتی ہوا نمک

نگڑائی کی محرابوں میں رنگ دھنک کے کیوں نہ بھریں
ن کی ہر ہر بات رسیلی جن کی ہر ہر ادا نمک

بانے کیا کیا عکس اُگلتے کھل کر دھندلے آئینے
ٹے ہوئے زخموں پر راہی کون چھڑکتا کھرا نمک

رام پرکاش راہی

198، AGCR انکلیو، دہلی 110092

خلیل تنویر

وہی وقت صبحِ جلال کا
وہی وقت شامِ جمال کا

مرے ذہن میں نہ سما سکا
وہ چمن تھا اس کے خیال کا

اُسے چھو لیا تو لرز گئے
یہ سبب تھا اپنے زوال کا

شبِ تار میں بھی چمک اُٹھا
وہ اثر تھا رنگِ سفال کا

کبھی قربتیں کبھی دُوریاں
یہ سفر ہے ہجر و وصال کا

گورنمنٹ میوزیم، اودے پور 313001 (راجستھان)

روشنی ہوں نہ گھر نہ در میرا
ختم ہوتا نہیں سفر میرا

میں کسی بزم تک نہیں محدود
انجمن انجمن گزر میرا

لفظ کو چھو کے پھول کر دینا
ہے یہی فن، یہی ہنر میرا

آپ آئے تو سب کی نظروں میں
معتبر ہو گیا ہے گھر میرا

میرے شانے سے کٹ کے اے مہدی
بیش قیمت ہوا ہے سر میرا

مہدی پرتاپگڑھی

معرفت ایگزیکٹیو انجینئر، آری گیشن ڈویژن، پرتاپگڑھ (یوپی)

زیب النسا مخفی کا مقبرہ

طاہر اسلم

2236/x گلی ڈکوتان، ترکمان گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

"ایوانِ اُردو" نومبر ۱۹۹۲ء کے شمارے میں ڈاکٹر مجیب الاسلام کا مضمون بعنوان "اولین تذکرۂ شاعراتِ اُردو" نظر نواز ہوا۔ اس مضمون میں سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ زیب النسا المتخلص بہ مخفی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ جو اورنگ زیب عالمگیر کی بڑی بیٹی تھی اور ۱۰/ شوال ۱۰۴۸ھ میں دل رس بانو بنت شاہنواز خاں صفوی کے بطن سے پیدا ہوئی اور ۱۱۱۳ھ مطابق ۱۷۰۲ء میں جب اورنگ زیب دکن کی فتوحات کے سلسلے میں مصروفِ جنگ تھا، دہلی میں فوت ہوئی۔

مگر متذکرہ بالا مضمون میں فاضل مضمون نگار سے زیب النسا مخفی کے مقبرے کے بارے میں بڑی چوک ہوگئی۔ وہ لکھتے ہیں "دہلی میں ان کا انتقال ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق ان کو لاہور کے شاہی باغ میں دفن کیا گیا" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیب النسا مخفی کا مزار لاہور کے کسی شاہی باغ میں ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کیوں کہ اس کا مزار دہلی میں تھا جو اب بے نام و نشان ہوگیا ہے۔

"سیر المنازل" مصنفہ سنگین بیگ جو غالباً ۱۸۲۷ء میں چھپی اور دہلی کی اجمالی تاریخ پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے (اور جسے اب ڈاکٹر شریف الحسن قاسمی کی ترتیب و ترجمہ کے ساتھ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے از سرِ نو طبع کیا ہے) کے صفحہ ۴۶ پر یہ عبارت درج ہے:

"درمقابلِ کابلی دروازہ بر شارعِ عام، جانبِ شمال، تکیہ بھولو شاہ فقیر، ازاں پیش مقبرہ زیب النسا بیگم و مسجد سنگِ سرخ و دو حجر واقع، در حجر زیب النسا بیگم بر سنگ بالیں آں بخطِ ثلث ایں کتبہ کندہ۔"

اُردو ترجمہ:

"کابلی دروازے کے مقابل شارعِ عام پر شمال کی طرف تکیہ بھولو شاہ فقیر ہے۔ اس کے بعد زیب النسا بیگم کا مقبرہ اور سنگِ سرخ کی ایک مسجد ہے۔ یہاں دو حجرے ہیں، زیب النسا کے حجرے میں سرہانے کے پتھر پر خطِ ثلث میں یہ کتبہ کندہ ہے۔"

"آثار الصنادید" مصنفہ سر سید احمد خاں (مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، ناشر اُردو اکادمی دہلی، جلد اوّل، صفحہ ۳۵۳) پر یہ عبارت ملتی ہے:

مقبرہ زیب النسا بیگم

"شہر شاہجہاں آباد کے کابلی دروازے کے باہر یہ مقبرہ ہے۔ نواب زیب النسا بیگم بنت عالمگیر کا۔ ان کا انتقال جو بڑی بیٹی عالمگیر کی تھیں ۱۱۱۴ ہجری مطابق ۱۷۰۲ عیسوی کے ہوا اور عالمگیر کے عہد میں یہ مقبرہ اور مسجد بنی۔ ان کی قبر کے سرہانے کتبہ لگا ہوا ہے۔"

"آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں منظرِ عام پر آیا تھا، اس تحریر سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت تک یہ مقبرہ موجود تھا۔ سر سید نے لوحِ مزار کا فوٹو اور اس کی تحریر بھی نقل کی ہے جو اکادمی ایڈیشن کی جلد دوم کے صفحہ ۱۸۰ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ سر سید نے زیب النسا کا سالِ وفات ۱۱۱۴ھ تحریر کیا ہے۔ "واقعاتِ دارالحکومت دہلی" اور "سیر المنازل" میں سالِ وفات ۱۱۱۳ھ درج ہے۔

"آثار الصنادید" کے بہتّر سال بعد ۱۹۱۹ء میں جب "واقعاتِ دارالحکومت دہلی" مصنفہ بشیر الدین احمد جسے (اُردو اکادمی دہلی نے دوبارہ شائع کیا ہے) زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اہلِ نظر کے سامنے آئی تو یہ مقبرہ نہیں رہا تھا جس کے لیے بشیر الدین احمد صاحب نے زمانے کی غارت گری اور غفلت شعاری کا ماتم کیا ہے۔

"واقعاتِ دارالحکومت دہلی" جلد دوم صفحہ ۴۷۴ پر وہ رقمطراز ہیں:

"دلی شہر کے کابلی دروازے کے باہر

نواب زیب النساءَ بیگم عالم گیر بادشاہ کی بڑی صاحبزادی کا مقبرہ تھا۔ جن کا انتقال ۲۰/۶/۱۱۱۳ھ میں ہوا۔ یہ مقبرہ اور مسجد عالمگیر کے عہد میں بنی جو ریل کی سڑک میں آنے کی وجہ سے مسمار ہوگیا۔ افسوس اس زمانے میں عماراتِ قدیمہ کی حفاظت کا کوئی قانون نہ ہونے اور ریلوے والوں کی غفلت سے ناقابلِ تلافی نقصان ہوگیا۔"

جس وقت" واقعاتِ دارالحکومت دہلی" لکھی جا رہی تھی اور بشیر الدین احمد صاحب دہلی کے اس تاریخی سرمایے کو جو دہلی کے دامن پر جگہ جگہ بکھرا پڑا تھا یکجا کرنے میں مصروف تھے، یہ مقبرہ نہیں رہا تھا' اسی لیے بشیر الدین احمد صاحب نے اپنی کتاب میں زیب النساءَ کے لوحِ مزار کا فوٹو نہیں دیا اور صرف کتبے کی نقل درج کردی' جو "سیر المنازل" کے صفحات ۴۷ اور ۱۹۲ پر اور "واقعاتِ دارالحکومت دہلی" جلد دوم' صفحہ ۴۷۸ پر اس طرح ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کل من علیہا فان ھذا المرقد البنیت الکبرا ے للعبدہ' المذنبہ العامیہ وھی المحفوۃ برحمتہ الرحمٰن الکریم الحافظہ زیب النساء المرجوۃ من عباد اللہ الصالحین ۔ ان یدعوالہا بالغفران و رضوان و تاریخ فوتہا قولۃ وسبحانہ ودخلی جنّتی

۱۱۱۳ھ

(ودخلی)

و + د + خ + ل + ی

۶ + ۴ + ۶۰۰ + ۳۰ + ۱۰ = ۶۵۰

(جنّتی)

ج + ن + ت + ی

۳ + ۵۰ + ۴۰۰ + ۱۰ = ۴۶۳

(ودخلی جنّتی)۔۔ ۶۵۰ + ۴۶۳ = ۱۱۱۳ ہجری

میں سمجھتا ہوں کہ متذکرہ بالا مستند تحریری ثبوتوں کے بعد یہ بات پایۂ وثوق کو پہنچ جاتی ہے کہ زیب النساءَ مخفی کا مزار دہلی میں تھا۔ نہ کہ لاہور کے کسی شاہی باغ میں۔

کیس ٹریٹ

شاہد اخت

۲/۲۲۷، جوہی لال کالونی، کانپور ۲۰۸۰۱۴

سامنے دیوار کی طرف میری نظر بالکل غیر ارادی طور پر اُٹھی تھی۔ لیکن جب گھڑی میں سوئیوں کو بارہ بجانے کی کوشش کرتے ہوتے دیکھا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب مجھے سو جانا چاہیے۔ کتاب کا صفحہ کنارے پر تھوڑا سا موڑ کر کتاب کارنر ریکس پر رکھ دی اور سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ نیند کی پریاں میری آنکھوں کی زمین پر بہت آہستگی سے پر پھیلا رہی ہیں۔ سونے سے پہلے مجھے ٹیوب لائٹ بھی آف کرنی تھی لیکن اس وقت اُٹھ کر وہاں تک جانا مجھے بہت ناگوار لگ رہا تھا۔ گو کہ میرے پاس نائٹ لیمپ تھا لیکن کل وہ جلتے جلتے آپ ہی بجھ گیا۔ اُٹھنے سے پہلے میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ صبح سب سے پہلا کام لیمپ ٹھیک کروانا ہی ہے۔

میں اُٹھنے ہی والا تھا کہ کلاک ـــــ اور ٹیوب لائٹ کے بیچ کی خالی دیوار پر ایک بھورے رنگ کی چھپکلی سختی سے اپنے پنجے گڑائے ہوئے نظر آئی۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ مجھے ہی گھور رہی ہے لیکن جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ مجھے ہی گھور رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی سپاٹ آنکھیں مجھ میں خوف و ہراس پیدا کر گئیں پورے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ حالاں کہ میں جانتا تھا کہ میں اپنے گھر میں ہوں لیکن لوگ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ کبھی کبھی آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا بھی غلط ہوتا ہے۔ اس احساس کے ساتھ خوف میں مزید اضافہ ہی ہوا۔ میں نے دیکھا کھڑکی بند تھی دروازے بھی بند تھے مگر خوف کے قطرے تھے کہ ٹپ ٹپ میرے حواس پر گر رہے تھے۔ جی میں آیا کہ پاس سوتی ہوئی بیوی کو جگا دوں لیکن فوراً ہی یہ خیال ترک کر دینا پڑا۔ میں جانتا تھا کہ یہ جاگ کر بھی کیا کرے گی۔ چھپکلی کا نام سنتے ہی کراہیت سے جتنا خراب منہ بن سکتا ہے بنائے گی ویسے بھی جتنا اچھا ہے مجھے معلوم ہے۔ اور جب میں آنکھ کے اشارے سے مسلسل اپنی سمت گھورتی ہوئی چھپکلی دکھاؤں گا ایک زور کی چیخ مار کر میرے سینے سے لپٹ جائے گی یا میری باہنوں کے حصار میں اسے عدم تحفظ کا احساس ہوا تو کمبل میں گھس کر شور مچانا شروع کر دے گی ممکن ہے اس کا شور سن کر پاس پڑوس کے لوگ بھی اُٹھ جائیں اور انھیں جب یہ معلوم ہو کہ میں جو دن رات اس قدر خوفناک ـــــ کہانیاں لکھا کرتا ہوں محض ایک چھپکلی سے ڈر گیا ہوں۔ بات بہت صاف تھی لیکن اس کے باوجود مجھے اس بے باک کہانی کار پر بہت ترس آ رہا تھا۔

کچھ لمحے گزر جانے کے بعد میں۔ ایک بار پھر اس سے آنکھ ملانے کی جر کی وہ تو جیسے میرے علاوہ کچھ بھی نہیں چاہتی تھی بلکہ اس بار مجھے لگا کہ وہ مجھ کچھ کہنا بھی چاہ رہی ہے۔ اس کا بار کھلنا بند ہوتا ہوا منہ کسی شکایت کی غ کر رہا تھا۔ میں نے ذہن سے یہ تمام فضو نکال پھینکنے کی کوشش کی مگر مجھے لگا کہ س کی بھیڑ اس مصنف کے وجود کا حصہ اس سے اسے جدا کرنا ناممکن نہ سہی مشک ہے۔

"تو اب کیا کیا جائے...؟" یا خود سے ہی سوال کیا۔ خود کلامی کے ا میں کیے جانے والے سوالوں کے جواب خود ہی دینے ہوتے ہیں لیکن میرے پا کوئی جواب نہیں تھا۔ سوائے اس کے اُٹھ کر لائٹ آف کر دوں اور چپ چ کمبل اوڑھ کر اس عورت کی طرح بے خ سو جاؤں کیوں کہ جب تک میں جاگتا اس قسم کے خیالات سے نجات نہیں پا میں لائٹ آف کر کے کمبل میں ملفوف اور خاموشی سے آنکھیں بند کر لیں۔ جھین کی آواز اب اور تیز سنائی دے رہ دور کہیں بلی کے رونے کی آواز سے

بھی پُر اسرار ہوگیا۔ نیند کا کہیں دُور دُور
پتا نہیں تھا۔ چلتے ہوئے بھی میں مُنہ پر
بل نہیں ہٹا پا رہا تھا حالاں کہ مجھے بہت گرمی
رہی تھی مگر مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ بلی کہیں
نہیں میرے سرہانے اس انتظار میں بیٹھی ہے
یں کمبل ہٹاؤں اور وہ مجھ پر جھپٹے۔ اسی
ش و پنج میں پانچ سات منٹ اور گزر گئے۔
ں آیا کہ لائٹ جلا کر دیکھوں کہ چھپکلی ہے یا
ں۔ میں اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ چرچ میں
بجے کے گھنٹے بجنا شروع ہوئے۔ عام طور
مجھے رات میں پڑھتے ہوئے ان گھنٹوں کے
کا انتظار رہتا تھا۔ سامنے دیوار پر گھڑی
ود تھی لیکن جب سے بازار میں الکٹرانک
یوں کا دَور شروع ہوا پنڈولم ہماری مٹتی
ی تہذیب کی طرح اب کبھی کبھی ہی دکھائی دیتی'
پڑھنے میں اس قدر محو ہو جاتا ہوں کہ پھر
ب سے نگاہ ہٹانے کو دل نہیں چاہتا اور اکثر
رچ کے گھنٹے ہی میری سماعت پر دستک
کر مجھے وقت کا احساس دلاتے ہیں مگر آج
گھنٹوں کی آواز بھی بہت ہیبت ناک لگ
تھی۔ وجہ میں خود بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا یا
کر بھی انحراف کی ایک ناکام کوشش کر رہا تھا۔
ٹے بج کر خاموش ہو چکے تھے لیکن اس کی
از اب بھی کانوں کے آس پاس گونجتی ہوئی
وس ہو رہی تھی۔ کچھ لمحوں کے لیے میں چھپکلی
جاری اپنی آنکھ مچولی بھول کر بجتے ہوئے گھنٹوں
گم ہوگیا لیکن اس کے بند ہوتے ہی پھر
خوف کے عمیق غار میں جا گرا۔ جب مجھ سے
نہ بن پڑا تو استفہام کے ساتھ مجھے کمبل
نک کر اُٹھ ہی جانا پڑا۔ سوئچ پر انگلی پڑی
ٹیوب لائٹ روشن ہوگئی۔ میں نے دیکھا

دیوار پر اب آدھا درجن چھپکلیاں موجود تھیں۔ بھُوری، کالی، چتکبری اور بھی کئی رنگ کی۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی سب ایک لائن میں دیوار سے اس طرح لپٹی تھیں جیسے دوڑ کے مقابلے میں حصّہ لینے آئی ہوں اور بس ریفری کی سیٹی بجنے کا انتظار ہو۔

"یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے۔؟" میں بُدبُدایا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ قبل ازیں اس طرح کا کچھ ہُوا بھی تو نہیں تھا جو میں اس کے متعلق تشویش کا اظہار کرتا۔ میری نگاہیں تو آج پہلی بار یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر نظر دیوار کی طرف گھمائی۔ وہ ساری کی ساری اپنے سر اوپر نیچے کر رہی تھیں۔ اب آگے کچھ بھی دیکھنا میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں نے لپک کر لائٹ آف کر دی اور اس طرح چلتا ہوا جیسے چور چوری کے ارادے سے دبے پاؤں گھر میں داخل ہوتا ہے میں چھت پر نکل آیا۔ چھت پر خاصی ٹھنڈ تھی مگر میری رگوں میں تو شرارے اُبل رہے تھے ٹھنڈ کا احساس تک نہیں ہوا۔ میں جلدی میں سگریٹ بھی نیچے بھُول آیا تھا اور دوبارہ نیچے جا کر سگریٹ لانا بھی مجھے منظور نہیں تھا۔ حالاں کہ اس وقت مجھے سگریٹ کی بہت سخت ضرورت تھی مگر میں نے جان کی سلامتی کے لیے یہ ارادہ ترک کر دیا اور ہاتھ پیچھے کمر پر رکھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ رات کسی نئی نویلی دلہن کی طرح لجائی شرمائی پھر رہی تھی۔ جبیں پر چاند ستارے سے دمک رہے تھے۔ چھت پر آکر مجھے لگا کہ جھینگروں کی آواز بھی انھیں ستاروں کی لرزش سے آ رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد رگوں میں بھڑکتے ہوئے شرارے سرد ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اب مجھ میں تیخ پگھل رہی تھی۔ میں نے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو شبنم کے بے شمار قطرے مٹھی میں مقیّد ہوگئے۔ شاید میں اس کے بعد بھی ٹہلتا رہتا اگر مجھے بیوی کے جاگنے کی آہٹ نہ سُنائی دے گئی ہوتی۔ میرے زینے پر آنے سے پہلے اس نے آواز بھی لگا دی۔ مجھے مجبوراً اترنا پڑا۔ کمرے میں آکر میں نے اسے لائٹ آن نہ کرنے کا حکم دیا اس نے وجہ دریافت کی میں نے بات صبح پر ٹال دی اور مزید کوئی گفتگو نہ کرنے کی تاکید بھی کی۔ ممکن ہے میری بات اسے ناگوار بھی لگی ہو مگر اس وقت میں اس سے زیادہ چھپکلیوں کے متعلّق سوچنے پر مجبور تھا۔ میں چاہ کر بھی اس وقت اسے نہیں منا سکتا تھا بس کھلی اور تیخ بستہ آنکھوں سے مہیب منظر دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً بیوی کے خرّاٹوں نے مجھے اپنی سمت متوجّہ کر لیا۔ میں اس کی طرف کروٹ کرکے لیٹ گیا اور جاگتی آنکھوں سے سوتی بیوی کو دیکھنے لگا۔ سوتے میں عورت کا حسن واقعی دوبالا ہو جاتا ہے خواہ وہ عورت بیوی ہی کیوں نہ ہو۔ بیوی کے سینے پر سانسوں کا زیروبم دیکھتے دیکھتے کب مجھے نیند آگئی معلوم ہی نہیں ہوا۔

چھپکلیوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس گوہ کی صدارت میں منعقد ہوئی اس میں دُنیا کے تمام ملکوں کی چھپکلیوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ سب کی جبیں پر ایک سوالیہ نشان تھا اور اس سوالیہ نشان نے ہی ان کی راتوں کی نیندیں اور دن کا چین چھین لیا تھا سب کو بس یہی ایک فکر تھی کہ کسی طرح ان کے ماتھے پر کندہ یہ نشان مٹ جائے تاکہ وہ بھی راحت کی سانس لے سکیں۔ یہ بین الاقوامی اجتماع اسی افتاد سے نجات کی

کاوشوں کا نتیجہ تھا۔

سب سے زیادہ اضطراب اور بے اطمینانی ہندستان کے خیموں میں نظر آرہی تھی۔ کانفرنس کا پہلا دَور شروع ہوا۔ اس سے پہلے کہ کوئی مغرب کی چھپکلی کھڑی ہو ہندستان کی ایک سیاہ چھپکلی نے کھڑے ہوکر گمبھیر لہجہ میں بولنا شروع کیا ــــ "دوستو ہمارے یہاں جمع ہونے کا مقصد کوئی پکنک یا سیر سپاٹا ہرگز نہیں اور نہ ہی یہ سوال ہے کہ ہم جو عہد پارینہ میں جنگلوں میں مقیم تھے ہمیں جنگل بدر کیوں ہونا پڑا۔ ہمارے یہاں مل بیٹھنے کا مقصد یہ ہے کہ جنگل سے نکل کر ہم نے آدم زاد کی پناہ لی اور سال دو سال نہیں صدیوں ہم ایک دوسرے کے ساتھ اخوت اور محبّت سے رہے۔ یہ جان لینے کے بعد بھی کہ ہم میں کتنا زہر ہے ہمارے نام سے اس کا جی بُرا ہو جاتا ہے اور ہمارا تصوّر ہی اس کے لیے کراہیت آمیز ہے اس نے ہمیں کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔ برسوں ہم ایک چھت کے نیچے رہے ہم کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں ملا لیکن ادھر کچھ دنوں سے یہ ہمیں مارنے لگا ہے۔ ہمارے زہر کا جو خوف اس پر کبھی مسلط تھا ایمان و صداقت کی طرح اب دلوں سے ختم ہو چکا ہے ہم کو استعجاب ہے ہمارے قتل ہونے پر نہیں بلکہ اس بات پر کہ ہمیں جلا کہ ہماری راکھ سگریٹ میں بھر کر پینے لگا ہے اور کچھ نے تو اسے کمائی کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ ہمارا اور ہماری طرح متعدّد جانوروں کا زہر اس میں منتقل ہو چکا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے ایسے ایسے ہتھیار بنا لیے جو رحم مادر میں پل رہے اطفال تک کا لہو پی گئے۔ زہرہ اور مریخ کا سفر کرنے والا یہ بنی نوع آدم کرۂ زمین پر سب سے زیادہ زہریلی شے ہے ان دنوں۔

بس ان جملوں کے ساتھ میں اپنی بات ختم کرتی ہوں۔"

گوہ نے اپنی گردن اسٹینڈ پر رکھے ہوئے کمرے کی طرح بین کی۔

"اور کسی کو کچھ کہنا ہے ــ؟" ایک بھاری آواز مجمع کو سنائی دی۔

"ہم سب کا مسئلہ بھی یہی ہے جو ابھی ہماری ایک ساتھی نے مفصّل بیان کیا۔" مغرب کی سفید فام بوڑھی چھپکلی نے رُک رُک کر مودبانہ کہا۔ گوہ جو خاموشی سے سُن رہا تھا ٹوپی اُتار کر سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا "ساتھیو اچھّا ہوا کہ ابھی سے آپ سنجیدہ ہو گئے ورنہ مستقبل میں اس کے نتائج بہت خراب ہوتے، آنے والے دنوں میں آپ کی حیثیت ڈائنا سور سے زیادہ نہ ہوتی میرے ساتھ بھی کسی حد تک یہی ہوا اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں آج آدم زاد کو دیکھتے ہی حقارت سے تھوک دیتا ہوں۔ کبھی جو نفرت آدم زاد کے دلوں میں آپ کے لیے تھی میں دیکھ رہا ہوں وہی نفرت اب آپ کے دلوں میں گھر کر چکی ہے، لمبی چوڑی تقریر کرنا مقصد نہیں۔ بس اتنا کہنا چاہتا ہوں جس جگہ آپ سب آپہنچے ہیں وہاں سے بچ نکلنے کے صرف دو راستے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ آپ ریگستان کی طرف نکل جائیں یا پھر اپنی نسل کی افزائش روک دیں خواہ اس کے لیے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی نسل کو کیس ٹریٹ (CASTRATE) کیوں نہ کرنا پڑے ــ"

سارا ماحول چھپکلیوں کے غصّے اور غضب سے لرزنے لگا۔

صبح نو بجے میری آنکھ کھُلی تو سب سے پہلے میری نظر سامنے ٹیوب لائٹ اور گھڑی کے بیچ کی جگہ پر گئی۔ وہ جگہ خالی تھی میں نے دوبارہ اور بھی غور سے دیکھا لیکن وہاں یقیناً کوئی چھپکلی نہیں تھی۔

ایوانِ اُردو اور اُمنگ کی مجلّد فائلیں

ہمیں اکثر ایسے خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں "ایوانِ اُردو" یا "اُمنگ" کے پُرانے شمارے بھجوانے کی فرمائش ہوتی ہے ــــ ایسی فرمائشوں کی تعمیل کے لیے "ایوانِ اُردو" اور "اُمنگ" کے گزشتہ شماروں کی ایک ایک سال کی فائلیں مجلّد کرائی گئی ہیں۔ "ایوانِ اُردو" کی ایک سال کی مجلّد فائل کی قیمت ساٹھ روپے اور "اُمنگ" کی فائل کی قیمت پچاس روپے ہے ــــ یہ فائلیں محدود تعداد میں ہیں، خواہشمند حضرات فوراً رجوع کریں ــــ

اُردو اکادمی، دہلی ــــ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

دوھے

کوملتی ہاتھ سے، گجّر کُرڑی نہائے
ن کی وہ نّدی ہی، دُودھ کی بنتی جائے

ری جاتی کھیت کو، ہلکے ہلکے پاؤں
بچھے قدموں آ رہا، پاچھے سارا گاؤں

ن کسی کا باپ ہے، کون کسی کا پُوت
ب کاتیں سنسار میں، اَپنا اَپنا سُوت

لک سہیں اور شہد دیں، سارے بَن کے پھُول
ن تُو بھی کر کبھی، ایسی میٹھی بھُول

تن جی بولے مجھ سے، گھر ہوگے یا گھاٹ
انے کہا گھر ہی دِکے دو، یمنا جی کے پاٹ

رتن سنگھ

۲۲۔ آدرش نگر، نربدا روڈ، جبل پور

سیّد شکیل دسنوی

سُکھ تیری مُسکان ہے، دُکھ بھی ترا سروپ
تیرے رنگ ہزار ہیں، تیرے روپ انوپ

دل میں کتنا کھوٹ ہے، آنکھوں میں ایمان
آج بنا پُن پاپ میں، کیسا یہ انسان

دھوپ بھی ہوتی چھاؤں سی، دُکھ بھی آتے راس
مِل جُل کر سب جھیلتے، تم جو ہوتے پاس

میں منزل کی کھوج میں، رستہ ڈھونڈے پاؤں
چلتے چلتے عمر کٹی، مِلا نہ تیرا گاؤں

دُھندلی دھندلی شام ہے، پھیکا پھیکا رُوپ
یادوں کی کیا جوڑیے، ٹکڑے ٹکڑے دھوپ

حسن منزل، اُڑیا بازار، کٹک ۷۵۳۰۰۱ (اُڑیسہ)

پاپی ویسے تو میاں گنگا روز نہائے
لیکن اس کی آتما میلی ہی رہ جائے

خوشحالی کے کھیت میں محرومی بوئے
غلّوں کا سمراٹ یوں دانے کو روئے

بھور کی بیلا ہوگئی مُرغے نے دی بانگ
کاہل پن کو ترک کر ایشور سے کچھ مانگ

قسمت نے دھوکا دیا بیچ دیا گھر بار
اب تو اپنا شغل ہے خوابوں کا بیوپار

جیتے جی تو سنت بھی سہتے ہیں اپمان
مرنے کے ہی بعد کیوں ملتا ہے سمّان

نادانی پر پیٹتی ماں بچّے کو آج
تاکہ رکھ پائے سپوت کل ممتا کی لاج

ہو جائے گا امن سے تیرا گھر آباد
راشد تو بھی صبر کے پھل کا چکھ لے سواد

راشد انور راشد

۲۶۴، کاویری ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

آوارگی کا آشنا

دلیپ سنگھ
۴/۵۹، راجندر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰

(ساتویں قسط)

عشق کی داستانوں میں مَیں نے پڑھا ہے اور فلموں میں بہ نفسِ نفیس دیکھا ہے کہ ایک لڑکے نے ایک لڑکی کو دیکھا اور دونوں کو ایک دوسرے سے اتنی محبت ہوگئی کہ دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہوگئی۔ محبت تو مجھے بھی زندگی میں کئی بار ہوئی ہے لیکن اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے کبھی نہیں ہوئی۔ میری طرف سے تو اکثر فوراً ہو جاتی تھی لیکن دوسری پارٹی کو رضامند کرنے میں خاصی ریاضت کرنی پڑتی تھی۔ نصر ملک کے گھر میں داخل ہوتے ہی البتہ میری وہی کیفیت ہوئی جو فلموں میں ہوتی ہے۔ اس کے دوستوں کو دیکھا اور یوں لگا جیسے اِن سب سے میری کئی سال کی شناسائی ہے نہ کسی سے باقاعدہ تعارف ہُوا نہ کسی کو اس کے اور اپنے بزرگوں کی پُرانی دوستی کا ثبوت دینا پڑا۔ بس دیکھا اور میں اُن کی محبت کے رنگ میں رنگ گیا۔

اس وقت سعید انجم کو اور مجھے آرام کی سخت ضرورت تھی کہ صبح کے نکلے ہوئے تھے اور اب دوسری صبح جنم لے چکی تھی اور اس دوران ایک بار بھی آنکھ نہیں جھپکی تھی۔ لیکن محبت بھی تو ایک ٹانک ہے جو جسم کو طاقت اور دماغ کو تازگی بخشتا ہے۔ ہم دونوں بغیر کسی تکلّف کے اُن کی گفتگو میں ایسے شامل ہوتے جیسے کوئی ایکٹر اسٹیج پر اچانک چڑھ آئے، اپنے لیے رول خود منتخب کرے، اپنے لیے ڈائیلاگ گھڑے اور ڈرامے کا حصہ بن جائے۔

لطیفے گھڑے جا رہے ہیں، شعر سُنائے جا رہے ہیں، ادیبوں کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ جوش و خروش کا ایک ریلا تھا جس نے ہم سب کو لپیٹ میں لے لیا۔

صبح کاذب نمودار ہو رہی تھی تو کسی کو خیال آیا کہ دلیپ سنگھ کو شاید آرام کی ضرورت ہو۔ چنانچہ سب نے اصرار کیا کہ میں اس فلیٹ کے واحد بیڈ روم میں جا کر سو جاؤں۔ میں محفل سے اٹھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری وہی حالت ہے جو غالب کی ہوئی تھی جب اس کے ستم ظریف محبوب نے "غیر سے تھی" بزم کے ثبوت میں اُسے باہر بھجوا کر "یوں" کہا تھا۔ میں بستر پر دراز تو ہوگیا لیکن مجھے یقین تھا کہ ان کے شور و غل کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آئے گی۔

بہر حال میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ جب میری آنکھ کھلی تو دن کے دس بج رہے تھے۔ میں نے بیڈ روم سے باہر نکل کر دیکھا تو ڈرائنگ رُوم میں باقی لوگ اس طرح سو رہے تھے جیسے ہمارے ہاں ریلوے پلیٹ فارموں پر سوئے رہتے ہیں۔ مجھے احساس ہوا کہ رات ان لوگوں نے مجھے سونے کے لیے نہیں بھیجا تھا بلکہ اپنے سونے کے لیے حالات ہموار کیے تھے۔

ایک آدھ گھنٹے میں تیار ہو کر ہم لوگ سعید انجم کی کار پر کوپن ہیگن کی سیر کو نکل گئے۔ راستے میں جاند شکلا مشہور اور قابلِ دید مقامات کی نشاندہی کرتا رہا۔ ہم لوگ کہیں رُکے نہیں۔ جاند نے خاص طور پر ایک پارک کی طرف اشارہ کیا جس میں گاندھی جی کا بُت نصب تھا اور جسے گاندھی پارک کہتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ڈینش لوگ گاندھی جی کو عزّت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور انھیں اس عظیم انسان کی عظمت کا احساس ہے جب کہ ہم لوگ جو انھیں اپنی قوم کا "باپو" کہتے ہیں، زندگی میں ایسی ایسی حرکتیں کر رہے ہیں کہ اگر باپو دیکھ لے تو شاید اپنی سمادھی سمیت یہاں سے ہجرت کر جائے۔

گھومتے گھامتے ہم لوگ سمندر کے ساحل پر پہنچے۔ سمندر کے ساحل کے اس حصّے کو لانگے لیانئے کہتے ہیں۔ کوپن ہیگن میں کوئی سیاح آئے اور لانگے لیانئے نہ جائے یہ ممکن نہیں کیونکہ وہیں ننھی جل پری کا بُت نصب ہے کہ جس کے دم سے ڈنمارک کی شہرت ہے۔ ساحل کا یہ حصّہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ اس پر کئی پارک بنے ہوتے ہیں جن میں کئی بُت

سب ہیں۔ نیلگوں پانی میں جہاز اور کشتیاں برتی ہوئی بہت بھلی لگتی ہیں۔ ساحل پر بہت سے ریسٹورنٹ بھی ہیں۔ سیاح چاہے تو کئی ن اس خوبصورت علاقے کی سیر کرتے ہوئے زار سکتا ہے۔

میں نے جب ننھی جل پری کا بت دیکھا و مجھ پر وہ کیفیت طاری نہ ہوئی جو ایک خوبصورت مجسمے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ننھی ل پری اتنی ننھی بھی نہیں لگتی۔ اٹھارہ بیس سال ی اچھی خاصی دوشیزہ لگتی ہے۔ اس کی ایک معقول وجہ غالباً یہ ہے کہ اس بت کے خالق یڈورڈ ایریکسن نے اسے بنانے کے لیے اپنی بیوی کو ماڈل کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اور ڈنمارک میں بیویاں سات آٹھ سال کی نہیں ہوتیں۔ جل پری مجھے اتنی حسین بھی نہیں لگی کہ جتنی وگ کہتے ہیں۔ حالانکہ دوسروں کی بیویاں مجھے ہمیشہ حسین لگتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ خود میری آنکھوں میں حسن کو پرکھنے والی روشنی میں کمی آگئی ہو۔

میں نے بھی ہر سیاح کی طرح ننھی جل پری کے گلے لگ کر اپنی تصویر کھنچوائی۔

آپ کو اتنا تو پتا ہی ہوگا کہ ننھی جل پری بچوں کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب ہینس کرسٹیان اینڈرسن کی کہانی کا ایک کردار ہے۔ دیکھ لیجیے دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جہاں ادیبوں کی کہانیوں کے کرداروں کے مجسمے نصب ہیں اور ایک ہم ہیں کہ کسی ادیب کا مجسمہ بنا کر کھڑا کرنے کو بھی تیار نہیں۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ ہمارے کئی ادیب کم از کم مجسمے کی صورت میں خاصے حسین لگیں گے۔ میرے اپنے بارے میں کئی لوگوں کا خیال ہے کہ میں خاصا خوبصورت لگتا ہوں ——— اپنی تصویر میں۔

میں کچھ بھی کہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ننھی جل پری کوپن ہیگن آنے والے ہزاروں جہاز رانوں کے لیے ایک تاریخی نشان بن گئی ہے۔ ملاح اس پر پھول نچھاور کر کے اپنی دلی عقیدت اور پیار کا اظہار کرتے ہیں۔

لانجے لائنے کے قریب ہی شاہی محلات ہیں۔ بادی النظر میں ان میں محلات والی کوئی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے سادگی صرف باہر کی دیواروں تک محدود ہو۔ محل کا اندرونی حصہ آراستہ پیراستہ ہو۔ لیکن اندر تو مجھے کسی نے جانے نہیں دیا۔

صرف عمارتوں میں ہی نہیں شاہی خاندان کی کسی چیز میں وہ اکڑ فوں نہیں جو ہم اپنے ملک کے شاہوں کو دیکھ کر محسوس کرتے ہیں کہ ہونی چاہیے۔ ڈنمارک کی موجودہ حکمراں ملکہ مارگریٹے ثانی کے کئی رشتے دار آپ کو لانجے لائنے پر گھومتے نظر آجائیں گے۔ لیکن انھیں پہچاننے میں آپ کو تھوڑی دقت ہوگی کہ ان کے آگے پیچھے پولیس کے دستے نہیں ہوتے۔ ملکہ کے خاوند کو ہم نے دیکھا کہ وہ سمندر کے کنارے بیٹھا بیئر سے دل بہلا رہا تھا۔ دو ایک سیاحوں کو اس نے اپنے پاس بُلا کر بیئر کی پیش کش بھی کی۔ میں بھی دو ایک بار اس کے قریب سے گزرا لیکن مجھے اس نے درگزر کر دیا۔ شاید اُسے خفیہ پولیس نے پہلے سے خبردار کر دیا تھا کہ میں بیئر نہیں پیتا۔

ایک طرف وہ حاکم ہیں اور ایک طرف ہمارے یہاں کے حاکم ہیں کہ حالانکہ پبلک کے ووٹ پر حاکم بنے لیکن بننے کے بعد پبلک سے ناطہ توڑ لیا۔ صرف ڈنمارک میں ہی نہیں میں نے آسٹریا کی راجدھانی وی آنا میں دیکھا کہ اُن کا چانسلر اوپیرا دیکھنے آیا تو وہ عام لوگوں کی طرح اوپیرا ہاؤس میں پہنچا۔ عام لوگوں کی طرح ٹکٹ خریدا اور عام لوگوں کی طرح انٹرول میں پیسے دے کر کافی پی۔ اس کے آنے پر نہ پولیس نے رستے بند کیے اور نہ ہی موٹر سائیکلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔

ملکہ مارگریٹے ثانی نہ صرف یہ کہ اپنی رعایا میں مقبول ہیں بلکہ وہ اپنی رعایا کی چہیتی ہیں حکومت تو خیر وہ کرتی ہی ہیں کہ یہ ان کا پیشہ ٹھہرا۔ لیکن ان کی مصوری کے بھی بہت چرچے ہیں۔ ہم نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ اینڈرسن کی ایک کہانی کو فلمانے کے لیے ملکہ نے سیٹ اور ملبوسات بھی ڈیزائن کیے تھے۔ ہمارے یہاں بدقسمتی سے یہ رواج ہو گیا ہے کہ جو خود کام نہ کرے وہ حاکم۔ مجھے یاد ہے مجھے اپنی ملازمت کے دوران میں ایک دفعہ ایک اخبار کی ضرورت پڑی تو میں نے دوسرے کمرے میں اپنے ایک کولیگ سے فون پر درخواست کی کہ ذرا اخبار مجھے بھجوا دیجیے۔ دو، تین گھنٹے تک اخبار تو میرے کمرے میں نہ آیا لیکن کولیگ موصوف خود ٹہلتے ہوئے آنکلے میں نے شکایت کی کہ انھوں نے اخبار نہیں بھجوایا تو کہنے لگے کہ بھجواتا کیسے چپراسی ہی نہیں تھا۔

پوری شام ہم نے کوپن ہیگن کے بازاروں میں گھومتے گزار دی۔ اس سیر کے دوران نصر ملک نے ایک مکان کی نشاندہی کی جہاں ہانس کرسٹیان اینڈرسن نے بچوں کے لیے کہانیاں تخلیق کی تھیں۔ میں ایسی جگہوں کو ادیب کی زندگی میں بہت اہمیت دیتا ہوں کہ ادب کی تخلیق میں ماحول کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ کچھ دن پہلے جب میں ملازمت سے سبکدوش ہوا تو مجھے خیال ہوا کہ مجھے ایک دفتر سا خریدنا چاہیے جہاں

بیٹھ کر میں یکسوئی سے لکھ بھی سکوں اور گپ شپ کے لیے اپنے دوستوں سے بھی مل سکوں چنانچہ جیب میں اپنی پوری پونجی ڈال کر ایک پرا پرٹی ایجنٹ کے ساتھ کناٹ پیلیس میں جگہ کی تلاش کے لیے نکل پڑا۔ جو جگہ ایجنٹ نے مجھے دکھائی وہ ایک بڑی بلڈنگ کی دوسری بیسمنٹ یعنی نیچے کی طرف جائیں تو بلڈنگ کی دوسری منزل تھی کہ میری کُل پونجی میں یہی خریدی جاسکتی تھی۔ ہوا کا تو وہاں گذر ہی نہیں تھا لیکن فضا وہاں کی ایسی تھی کہ جیسے میں کسی گہرے کنوئیں میں گر پڑا ہوں اور کنوئیں کے اوپر کسی نے ڈھکنا رکھ دیا ہے۔ ایسی جگہ میں بیٹھ کر کوئی شخص جعلی نوٹ تو چھاپ سکتا ہے لیکن اَدب تخلیق نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں نے اسے خریدنے سے انکار کر دیا۔ انکار کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ میرے اس دُنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد جب غیر ملکی سیاح اردو طنز و مزاح کے عظیم ادیب دلیپ سنگھ کا وہ دفتر دیکھنے کے لیے آئیں گے جہاں بیٹھ کر وہ لکھا کرتا تھا تو شاید اتنی گہرائی میں پوشیدہ یہ جگہ ڈھونڈ ہی نہ پائیں۔

شام کو ہم سب نے ایک ہندوستانی ریستوراں میں کھانا کھایا۔ وہاں سے نصر کے دوسرے دوست تو اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن چاند شکلا ہمارے ساتھ نصر کے گھر آگیا۔

بطور تعارف میں چاند شکلا کے بارے میں کہہ دوں کہ وہ ڈنمارک کے ریڈیو سب رنگ کی ہندوستانی سروس کا سربراہ ہے اور ہندی میں چاند ہادی آبادی کے نام سے شاعری کرتا ہے۔

یہاں میں نصر ملک اور چاند شکلا کے تعلقات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ ان تعلقات کی مدد سے ہند و پاک کے تعلقات پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ میرے خیال میں یہ دونوں کوپن ہیگن میں قریب ترین دوست ہیں۔ چاند نصر کے گھر میں یوں دندناتا پھرتا ہے جیسے یہ گھر اُسی کی ملکیت ہو۔ نصر کا جو لباس اسے پسند آئے بغیر کسی تکلف کے پہن لیتا ہے۔ جو کھانا چاہے اپنے آپ فریج سے نکال کر کھا لیتا ہے۔ نصر کے مہمانوں کو وہ اپنے مہمان سمجھتا ہے۔ لیکن دن میں اگر کم از کم پانچ بار یہ لڑ نہ لیں تو دونوں کو چین نہیں پڑتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دونوں اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ لڑائی ایک طے شدہ حد کے اندر رہے۔ کوپن ہیگن میں میرے قیام کے دوران ایک دفعہ نصر نے چاند کی ڈیوٹی لگائی کہ مجھے شہر کی سیر کرا لائے۔ اس ڈیوٹی کو نبھاتے ہوئے چاند نے مجھے وہ گلی کوچے بھی دکھائے جہاں شریف آدمی جاتے تو ہیں لیکن کوشش ان کی یہ ہوتی ہے کہ دوسرے شریف آدمیوں کی نظران پر نہ پڑے۔ ایسی جگہ کی سیر میں کچھ زیادہ ہی وقت لگ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہم گھر پہنچے تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ اور نصر بے حد پریشان اپنے فلیٹ کے چکر کاٹ رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے چاند پر برسنا شروع کر دیا۔ چاند نے کوئی وضاحت نہیں کی۔ بس سر جھکائے اُس کی گالیاں سُنتا رہا۔ لیکن ایک مناسب وقت تک ڈانٹ کھانے کے بعد اُس نے چلّا کر کہا...

"نصر بہت ہو چکا۔ اب اگر ایک لفظ بھی تُو نے اور بولا تو زندگی بھر کے لیے تیرے میرے تعلقات ختم۔" نصر اس کے بعد واقعی ایک لفظ بھی نہ بولا۔

اگلی صبح ہمارا پروگرام نصر کے دفتر ریڈیو ڈنمارک جانے کا تھا۔ نصر جب تیار ہُوا تو اس نے نِکّر اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اپنے لباس کی طرف ہمیں متوجہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اگر میرا دفتر پاکستان میں ہوتا تو میں سوٹ پہنتا، ٹائی لگاتا، اور جوتا چمکاتا تاکہ صرف اپنے کام سے نہیں بلکہ شکل و صورت سے بھی افسر لگوں لیکن یہاں عہدے کے مطابق نہیں موسم کے مطابق لباس پہنا جاتا ہے۔ دفتر پہنچے تو برآمدے میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو صرف نِکّر پہنے ہوئے تھے۔ میں نے نصر سے کہا کہ یقیناً یہ شخص اس دفتر کا افسرِ اعلیٰ ہوگا۔ کہنے لگا: "بالکل... لیکن آپ نے کیسے پہچانا؟" میں نے جواب دیا: "اس کے لباس سے۔ ہمارے ہاں جُوں جُوں آدمی ملازمت میں ترقی کرتا ہے زیادہ کپڑے پہنتا جاتا ہے۔ یہاں لگتا ہے ترقی کے ساتھ ساتھ کپڑے اُترنے شروع ہو جاتے ہیں۔" نصر نے جب یہ بات اپنے افسر کو ترجمہ کر کے سُنائی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

نصر کو ڈنمارک کے اردو پروگرام کے سربراہ کی حیثیت سے جو پروگرام نشر کرنے ہوتے ہیں اس میں خبریں بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے اِن خبروں میں ہندوستان اور پاکستان کا خصوصی طور پر ذکر آئے گا۔ نصر کا یہ طریقۂ کار ہے کہ دفتر میں آتے ہی وہ اپنے کمرے میں لگے ہوئے کمپیوٹر سے اس دن پاکستان اور ہندوستان میں ہونے والے "حادثات" کا پتہ لگاتا ہے اور پھر ان سے ضروری خبریں چُن کر انھیں اُردو میں منتقل کر کے بُلیٹن تیار کرتا ہے جسے وہ خود اور اس کی دو ساتھی لڑکیاں ریڈیو سے نشر کرتی ہیں۔

ایک تو خیر سے "خبر" کہتے ہی آج کل اُسے ہیں جو اچھی نہ ہو۔ جب کوئی آپ سے کہتا ہے کہ سُنائیے کیا خبر ہے تو جواب میں یہ نہیں سننا چاہتا کہ سب ٹھیک ہے۔ وہ تو یہ سننے کے لیے بیتاب ہوتا ہے کہ یار کیا سناؤں بُرا حال ہے،

کل اماں غسل خانے میں گر گئیں۔ ۔ ۔ وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے نصر کو بھی ایسی ہی خبروں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اپنے دو ملکوں میں ہر روز ایسی حرکتیں ہوتی رہتی ہیں جنھیں سن کر ہمارے باہر بسے ہوئے ہم وطن شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ خبریں تو وہ بدل نہیں سکتے اس لیے غصہ نصر پر نکالتے ہیں۔ پاکستانی اسے ہندوستان کا ایجنٹ اور ہندوستانی اس کو ہندوستان کا دشمن کہہ کر فون پر گالیاں دیتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ قصور نصر کا نہیں کہ وہ خبریں خود نہیں گھڑتا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ دونوں ملکوں کے باشندے تخریبی کاموں سے توبہ کریں اور تعمیری کاموں میں جٹ جائیں تاکہ نصر کو سنانے کے لیے کوئی "خبر" نہ ملے۔ لیکن صرف میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔

اسی دن سعید انجم ناروے کے لیے روانہ ہو گیا۔

میں اور چاند ریڈیو اسٹیشن سے نکل کر چاند کے دفتر ریڈیو سب رنگ میں آگئے کہ وہ اپنے پروگرام کے لیے میرا انٹرویو لینا چاہتا تھا۔ وہاں سے اس نے ٹیپ ریکارڈر اٹھایا اور کہنے لگا کہ انٹرویو اسٹوڈیو میں نہیں بلکہ کسی اور مناسب جگہ پر ریکارڈ کریں گے۔

یہاں سے نکل کر ہم لوگ چاند کی دوست رگمور کو بیاک رسموتن کے گھر میں آگئے۔ رگمور ایک اعلیٰ پائے کی پینٹر اور فلم ساز ہے۔ ارادہ تو یہ تھا کہ ہم لوگ وہاں بیٹھ کر اپنا پروگرام ریکارڈ کریں گے لیکن میں تو جاتے ہی اس کی تصویروں میں کھو گیا جو اس کے چھوٹے سے فلیٹ میں بکھری پڑی تھیں۔ میری اپنے کام میں دلچسپی دیکھ کر اس نے تجویز کیا کہ ہم لوگ لنچ اس کے ساتھ کریں تاکہ اس سے تفصیلی گفتگو ہو سکے۔ بعد میں ہم لوگ اپنا پروگرام بھی ریکارڈ کر لیں۔ رگمور نے تجویز کیا کہ ہم لوگ تھوڑی دیر کے لیے کہیں گھوم آئیں تاکہ وہ کھانا بنانے پر مناسب توجہ دے سکے۔ گویا کھانا بنانے کو بھی وہ وہی توجہ دینا چاہتی تھی جو ایک تصویر کی تشکیل کے لیے ضروری ہے۔

ہم لوگ نکل رہے تھے کہ نصر کے پروگرام کے نشر ہونے کا وقت ہو گیا۔ چاند نے ریڈیو آن کیا تو ہم نصر کی آواز میں خبریں سننے لگے۔ خبروں کے خاتمے پر اس نے کہا: "اب ایک ضروری اعلان۔ اردو کے جانے پہچانے طنز و مزاح نگار اور حکومت ہند کی وزارت خارجہ کے ماہوار رسالے انڈیا پرسپیکٹوز کے چیف ایڈیٹر دلیپ سنگھ تین دن کے لیے ڈنمارک آئے ہوئے ہیں ان سے ملاقات کے خواہش مند فلاں فون نمبر پر اُن سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔"

نصر کی محبت سے سرشار اور ریڈ رم رگمور کے مکمل یک سوئی سے بنائے ہوئے لنچ کا تصور کرتے ہوئے میں چاند کو ساتھ لے کر وہاں سے نکلا اور ہندوستانی سفارت خانے کی طرف چل دیا کہ وہاں مجھے کچھ دوستوں سے ملنا تھا۔

(باقی آئندہ)

انتون چیخف

ترجمہ: انوار رضوی

۲۸-سی، پاکٹ اے - ۱۰، کالکاجی ایکسٹینشن، نئی دہلی ۱۹

انالواونا کو الڈینا، ایک ٹٹولر کونسلر[1] کی بیوی جہانِ فانی سے کوچ کر گئی تھی۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" پورے کنبے کے افراد جمع ہوتے تو آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔

"خاوند کو تو خبر کرنی ہی چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ساتھ نہیں رہ رہا تھا لیکن وہ مرحومہ کو بہت چاہتا تھا۔ ابھی اس دن کی بات ہے وہ آیا تھا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اسے بس یہی رٹ لگی رہی 'انا! میری اس عارضی بیوفائی کا قصور تم کب معاف کروگی؟' ایسی ہی پتہ نہیں کیا کیا باتیں کرتا رہا۔ اس کو اطلاع تو دینی چاہیے۔۔۔"

"ارسٹارکھ ایوانووچ!" آبدیدہ چچی صاحبہ نے کنبے کی اس مجلس میں موجود کرنل پسکاریف کو مخاطب کیا "دیکھو تم میخائل پیٹرووچ[2] کے دوست بھی ہو۔ ہم پر ایک مہربانی کرو تم ریلوے ہیڈ آفس میں اس کے پاس چلے جاؤ اور یہ بُری خبر اس کو بتا دو۔ البتہ ایک دم نہ بتا دینا۔ دیکھو دوست، اس کو دھچکا نہ لگنے پائے۔ کہیں اس کو کچھ ہو نہ جائے۔ اس کا دل بڑا نازک ہے۔ پہلے اس کو تیار کرنا اور پھر۔۔۔"

کرنل پسکاریف نے اپنی چھجے دار ٹوپی سر پر جمائی اور ریلوے ہیڈ آفس کی طرف چل پڑا جہاں وہ نیا نیا رنڈوا کام کرتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک گوشوارے پر جھکا ہوا ہے۔

"میخائل پیٹرووچ!" اس نے کوالڈن کی ڈیسک پر بیٹھ کر اور پسینہ پونچھتے ہوئے شروعات کی۔ "ہیلو، دوست! حد ہو گئی یار، گلیوں میں بلا کی خاک اُڑ رہی ہے۔ لکھتے رہو۔۔۔ لکھتے رہو بھئی۔۔۔ میں تمھارے کام میں ہرگز دخل نہیں دوں گا۔ بس گھڑی بھر کو ٹکوں گا اور اپنے راستے چلا جاؤں گا۔ ادھر سے گزر رہا تھا، اور مجھے ایک دم سے خیال آیا، ارے یہیں تو اپنا میشا بھی کام کرتا ہے! ذرا کی ذرا اس کو بھی دیکھتے چلیں۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی موٹی سی بات بھی ہے بتانے کی۔۔۔"

"ایک منٹ بیٹھو ارسٹارکھ ایوانووچ۔ بس ایک منٹ ٹھہرو۔ میں یہ کام ابھی ختم کیے لیتا ہوں، پھر ذرا جم کے گپ شپ لڑائی جائے گی۔۔۔"

"لکھتے رہو، لکھتے رہو، فکر مت کرو۔ میں تو ادھر سے گزر رہا تھا بس دو لفظ کہوں گا۔ سمجھے پیارے بھائی!"

کوالڈن نے قلم رکھ دیا اور سننے کو تیار ہو گیا۔ کرنل پسکاریف نے اپنی گُدّی کھجائی اور جاری رہا:

"بڑی امس ہے یہاں، باہر بالکل جنت کا مزہ آ رہا ہے۔ سنہری دھوپ، اور بڑھیا تازہ ہوا۔ چہچہاتے پرندے، بہار! ابھی فٹ پاتھ پر چل رہا تھا تو مزہ آ گیا۔ بھائی میرے، میں تو رنڈوا ہوں۔ جہاں چاہوں جا سکتا ہوں۔ اگر جی میں آ جائے تو سیدھا شراب خانے جا دھمکوں؛ اگر طبیعت میں آئے تو گھوڑے والی ٹرام پر سو دفعہ چڑھوں اور سو دفعہ اُتروں، کوئی مجھے روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ پیچھے گھر پر کوئی میرا نام لے لے کر لعنت نہ بھیج رہا ہوگا۔۔۔ نہیں، برادر، کنوارے کی سی زندگی سے بہتر کوئی زندگی نہیں ہے۔ آپ آزاد ہیں! آپ کا جو جی چاہیں کریں! آپ سانس لیتے ہیں اور آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ سانس لے رہے ہیں! میں گھر جاتا ہوں اور وہاں کوئی نہیں ہے۔۔۔ کوئی مجھ سے نہیں پوچھ سکتا کہ میں کہاں تھا۔ اپنا مالک و مختار میں خود ہوں۔ بہت سے لوگ گرہست زندگی کی تعریف کے پُل باندھتے ہیں، میرے دوست، لیکن مجھ سے پوچھو تو یہ قید بامشقت ہے

---

[1] انقلاب سے قبل روس میں سرکاری ملازمتوں کے لیے اٹھارہ عہدوں کی ایک جدول تھی جس میں یہ عہدہ نویں درجے پر تھا۔ (مترجم)

[2] روسی نام عموماً تین لفظی ہوتے ہیں۔ پہلا اپنا نام، دوسرا باپ کی نسبت سے یعنی پیٹر کا بیٹا پیٹرووچ اور تیسرا خاندانی نام مثلاً کوالڈن۔ (مترجم)

بدتر ہے۔ ابھی تمام طرح کی فیشن بازی، دنیاداری، ڈھکوسلے، ملنا ملانا، چیخم دھاڑ۔۔۔ ہر وقت مہمان داری کا چکر، بچے ہیں کہ ایک کے بعد ایک بلائے بے درماں کے مانند نازل ہوتے چلے جارہے ہیں۔ خرچ پر خرچ۔ توبہ توبہ!"

"میں ابھی ختم کیے دیتا ہوں، اور پھر۔۔"

کوالڈن نے یہ کہہ کر اپنا قلم اٹھالیا۔

"لکھے جاؤ۔۔۔ لکھے جاؤ۔۔۔ اگر آپ کی بیوی شیطان کا اوتار ہی نہ ہو تو پھر بھی ٹھیک ہے، لیکن اگر پیٹی کوٹ کے اندر خود ابلیس علیہ اللعنت ہیں تو کیا ہوگا؟ اگر صورتِ حال یہ ہوگئی، اگر وہ اس تماش کی نکل گئی کہ بڑ بڑانا شروع کیا تو دنوں بڑبڑاتے چلے جارہے ہیں؟ ارے بھائی کوئی بھی آدمی رو دے گا! اب تمھاری ہی مثال لیے لیتے ہیں۔ جب تم تنہا تھے، تو آدمی سے لگتے تھے، لیکن جب تمھاری شادی ہوگئی، تو بھائی تمھاری حالت خستہ ہوگئی۔ اچھے خاصے مالیخولیا کے شکار ہوگئے۔ پورے شہر کے سامنے اس نے تم کو ذلیل کیا، تم کو گھر سے باہر نکال کر پھینک دیا۔ اس میں کیا خوبی تھی؟ اب ایسی بیوی کے لیے کوئی کیا افسوس کرے گا۔"

"جھوٹ چھٹاؤ۔ میں دراصل سارا قصور میرا ہی تھا، اس کا نہیں،" کوالڈن نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"بند کرو، یار! میں جانتا ہوں اسس کو! فتنہ پرور، خر دماغ، مکار! اس کا ہر لفظ زہر بھری پھنکار، اس کی نظر گویا خنجر کٹار کا گھاؤ۔ اور اس قدر کینہ مرحومہ میں تھا کہ بیان سے باہر ہے!"

"کیا مطلب، مرحومہ؟" کوالڈن نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

"میں نے مرحومہ کہا تھا؟" پسکاریف نے خود کو سنبھالتے ہوئے اور شرم سے سرخ ہوتے ہوئے پوچھا "میں نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کہی ہے۔ واقعی، خدا میرا گواہ ہے! اور تم خواہ مخواہ سفید پڑے جارہے ہو! ہی، ہی! تمھارے کان بج رہے ہیں!"

"کیا تم آج انیوٹا کے یہاں گئے تھے؟"

"میں صبح ایسے ہی ادھر جا نکلا وہ لمبی دراز پڑی تھی۔۔۔ نوکروں پر حکم چلا رہی تھی۔۔۔ پہلے تو جو سودا وہ لاتے تھے وہ غلط لاتے تھے پھر وہ۔ ارے بھائی ناقابلِ برداشت خاتون ہے! میری سمجھ میں یہ نہیں آتا، تم آخر اس کی کس بات پر لہلوٹ ہو، خدا اس کو بہر حال اپنی امان میں رکھے۔ خدا کرے وہ تم کو آزاد کردے، بہت دکھی ہوگئے ہو تم۔ ذرا کی ذرا تم بھی آزاد رہ سکو اور دل کو خوش کر سکو۔ تم کسی اور سے بھی شادی کر سکتے ہو۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں خاموش ہوا جاتا ہوں۔ منہ مت بگاڑو بھائی! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ یہ سب تو مجھ بوڑھے کا اندازِ گفتگو ہے لیکن تم اسے اپنے طور پر سمجھ جاؤ۔ اگر چاہو تو بھلے ہی اس سے ضرور محبت کرو، اگر نہیں چاہتے تو زبردستی نہیں ہے۔۔۔ میں نے تو بھلے کو ہی کہا تھا۔ وہ تمھارے ساتھ رہتی نہیں۔ تمھارے بارے میں کچھ جاننا بھی نہیں چاہتی۔ یہ کس طرح کی بیوی ہوئی؟ بدشکل، بیماری زدہ۔۔۔ کینہ پرور۔ اور اس میں افسوس کرنے کی کیا بات ہے۔۔۔ اس کو کرنے دو۔۔۔"

"تم بڑی صاف بات کرتے ہو، ارسٹارکھ ایوانووچ!" کوالڈن نے لمبی سانس کھینچی۔

"محبت کوئی بال نہیں ہے، تم اتنی آسانی سے اس کو نکال نہیں سکتے۔"

"جیسے محبت کے لائق اس میں کوئی خوبی بھی تھی! لاکھ کھنگالو مگر کینہ پن کے سوا اس میں سے کچھ نہ نکل پائے گا۔ بھئی معاف کرنا، بوڑھا آدمی ہوں، لیکن مجھے وہ کبھی پھوٹی آنکھ نہیں بھائی۔ میں تو اس کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں تھا! اس کے گھر کے پاس سے میری گاڑی گزرتی تو میں آنکھیں بند کر لیتا، کہیں اس کی شکل نہ دکھائی پڑ جائے۔ خدا اس کو اپنی امان میں رکھے۔ اس کی روح کو بخشے۔۔۔ لیکن مجھ گنہگار کو کبھی ایک آنکھ نہ بھائی۔"

"سنو، ارسٹارکھ ایوانووچ۔۔۔۔"

کوالڈن کا چہرہ سفید پڑ گیا۔۔۔ "یہ دوسری مرتبہ تم نے زبان سے نکالا ہے۔۔۔ کیا وہ انتقال کر گئی؟ بولو؟"

"کیا مطلب، کون مر گیا؟ کوئی نہیں مرا ہے۔ بات محض اتنی سی ہے کہ مرحومہ مجھ کو ذرا نہیں اچھی لگتی تھی، ختم ہوا۔۔۔ میرا مطلب ہے مرحومہ، نہیں، لیکن وہ۔۔۔ تمھاری انیوتکا۔۔۔"

"لیکن کیا وہ انتقال کر گئی؟ ارسٹارکھ ایوانووچ، مجھ کو گودو نہیں! تم عجیب باتیں کر رہے ہو، ہر چیز کو خلط ملط کر دیا۔۔۔ تم تنہا زندگی کی تعریف کر رہے ہو۔۔۔ وہ انتقال کر گئی ہے؟"

"ارے وہ کیوں انتقال کرے؟" پسکاریف گلا صاف کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ "تم کیا کا کیا سمجھ رہے ہو۔۔ لیکن اب اگر وہ انتقال بھی کر گئی ہے، تو ہم سب بھی آخر کار مر ہی جائیں گے، اور شاید اس کے لیے مرنا ایک طرح کی ضرورت بھی تھی۔ ارے بھائی تم خود ایک دن مر جاؤ گے، اور میں بھی مر جاؤں گا۔"

کوالڈن کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اشک چھلکنے لگے۔

"کس وقت؟" اس نے خاموشی سے پوچھا۔

کسی وقت بھی نہیں۔ اب تم خواہ مخواہ برّا رہے ہو۔ اس کا انتقال نہیں ہوا ہے! تم سے کس نے کہا وہ مرگئی ہے؟"

"ارسٹارکھ ایوانووچ' میں.. تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں' میرے جذبات سے کھلواڑ مت کرو!"

"تم سے تو بات کرنا مشکل ہے— جیسے بالکل دودھ پیتے بچے ہو۔ کیا میں نے تم سے کہا ہے کہ وہ فوت ہوگئی ہے؟ بولو میں نے کہا ہے کیا؟ تم آخر کیا چاہ رہے ہو؟ جاؤ اور اس کا کلمہ پڑھو' وہ حیات ہے اور دھوم مچا رہی ہے! جب میں اس کے یہاں پہنچا تو وہ بچی صاحبہ سے دو دو ہاتھ کر رہی تھی... فادر مالوٹی تکفین و تجہیز کے فرائض انجام دے رہے تھے اور اس نے گلا پھاڑ پھاڑ کر سارے گھر کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔"

"تکفین و تابوت بندی کیسی؟ اس کی کیا ضرورت آپڑی؟"

"تجہیز و تکفین؟ نہیں بھائی... بس ایسے ہی انجیل خوانی سمجھو... لیکن کچھ تھا... کچھ بھی نہیں تھا۔"

ارسٹارکھ ایوانووچ اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی کی سمت مڑ کر کھنکھارنے لگا۔

"کھانسی ہوگئی' یار.. سمجھ میں نہیں آرہا یہ گلا کاہے سے خراب ہوا۔"

کوالڈن بھی کھڑا ہوگیا اور گھبرا کر اپنی ڈیسک کے قریب آگے پیچھے ٹہلنے لگا۔

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔" اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے اپنی داڑھی کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے کہا "اب میں سب سمجھ گیا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب حکمت عملی کیا اڑ رہی ہے؟ تم صاف کیوں نہیں کہہ دیتے؟ وہ مرگئی ہے' مرگئی ہے نا؟"

"اُفوہ... اب میں کس طرح تمھیں بتاؤں؟" پسکاریف نے اپنے شانے اُچکائے۔ "بات اتنی سی نہیں ہے کہ وہ فوت ہوگئی ہے۔ بلکہ... اب یہ دیکھو' تم نے رونا بھی شروع کردیا! ہم سب کو مرنا ہے' آخر کار۔ دنیا میں صرف وہی اکیلی فانی نہیں تھی' ہم سب بھی دوسری دنیا کے مسافر ہیں! لوگوں کے سامنے رونے دھونے سے کیا فائدہ؟ بہتر یہ ہوگا کہ تم اس کی یاد کی لاج رکھو۔ تم کو کراس بنانا چاہیے!"

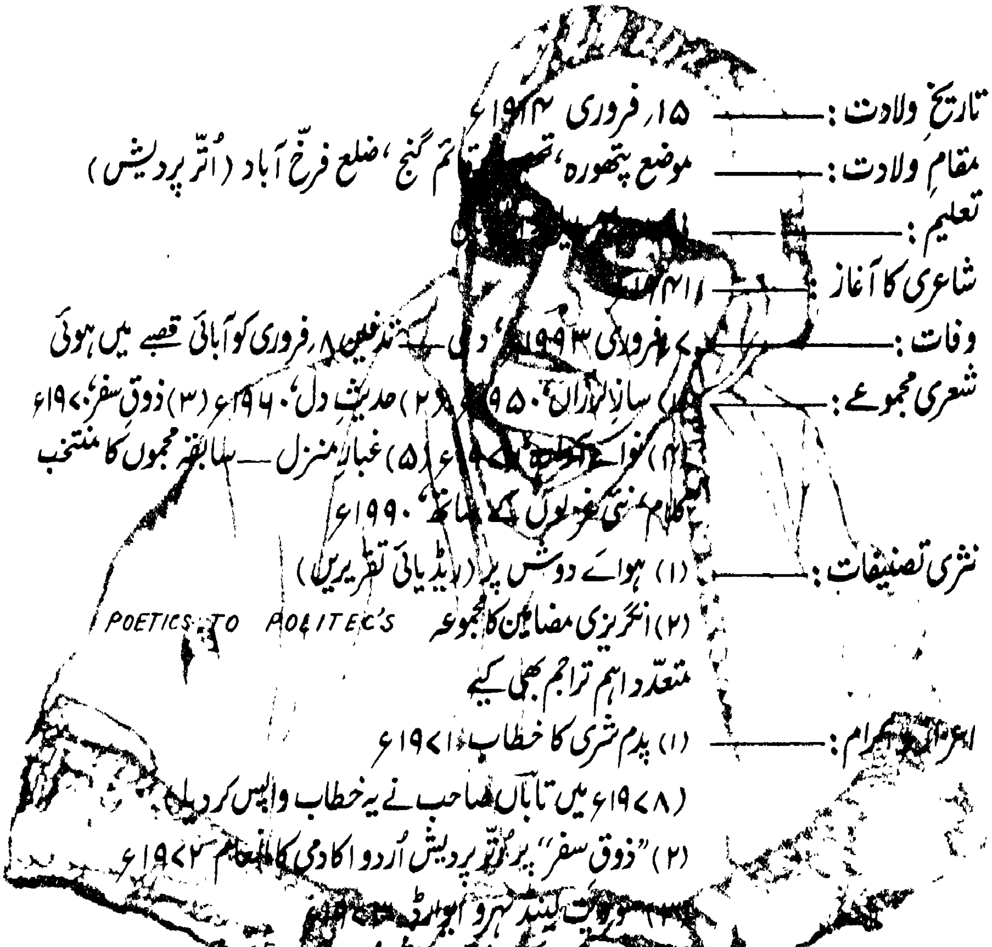
کوئی آدھے منٹ تک کوالڈن' پسکاریف کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہا' پھر اچانک اس کا چہرہ قطعی سفید پڑ گیا۔ وہ ایک آرام کرسی میں ڈھیر ہوگیا اور اس کی آنکھوں سے ہسٹریائی آنسوؤں کی گنگا جمنا بہنے لگی۔ اس کے ساتھی اپنی اپنی ڈیسکوں پر اچھل پڑے اور اس کی مدد کو دوڑے۔ پسکاریف نے اپنی گُدّی کھجائی اور چیں بر جبیں ہوگیا۔

"ان لوگوں سے تو ناک میں دم آگیا ہے' قسم خدا کی!" وہ بڑبڑایا۔ "اس کو دیکھو کیسا برّا رہا ہے... لیکن آخر کس بات پر برّا رہا ہے' میں پوچھتا ہوں؟ میشا' تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ میشا!" اس نے کوالڈن کو جھنجوڑنا شروع کیا "وہ ابھی فوت تھوڑا ہی ہوئی ہے! تم سے کس نے کہہ دیا کہ وہ انتقال کرگئی؟ اس کے برخلاف ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ابھی امید باقی ہے! میشا! ارے میشا! میں کہہ رہا ہوں نا وہ مری نہیں ہے! اس سے ملنے کے لیے میرے ساتھ چلنا چاہتے ہو؟ تدفین سے پہلے صحیح وقت پر پہنچ جائیں گے... میں کیا کہہ رہا ہوں؟ تدفین نہیں' ڈنر پر۔ میشا! میں تم کو یقین دلاتا ہوں وہ ابھی زندہ ہے! خدا مجھ کو غارت کردے! خدا کرے میرے دونوں دیدے پھوٹ جائیں! تم کو میری بات کا یقین نہیں آرہا؟ یہ بات ہے تو' چلو چلتے ہیں اور اسے دیکھ لیتے ہیں... تمھارا جو جی چاہے مجھے کہہ لینا اگر خدا نخواستہ... اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہاں سے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو خود اس مرحومہ کے مکان پر گیا تھا— میرا مطلب ہے' مرحومہ کے نہیں... لعنت ہے!"

کرنل نے ہاتھ نچایا' آخ تھو کیا اور ہیڈ آفس سے باہر نکل گیا۔ مرحومہ کے مکان پر آکر وہ صوفے پر ڈھیر ہوگیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"تم لوگ خود ہی جاؤ!" اس نے مایوس و بیزار لہجے میں کہا "تم خود اسے اس خبر کے لیے تیار کرو' لیکن میری جان چھوڑو! میرے بس کا نہیں ہے! میں نے مشکل سے دو لفظ منہ سے نکالے ہوں گے... ذرا سا اشارہ ہی کیا تھا اور دیکھو وہ کیا حال بنا رہا ہے۔ ارے بھائی مرا جا رہا ہے—! بے ہوش ہوا جا رہا ہے! میری تو توبہ ہے! چین کی اگر تمام چائے بھی مجھے دو تو میری طرف سے انکار رہے گا! تم لوگ خود جاؤ بھائی!"

گوشۂ غلام ربّانی تاباںؔ



تاریخِ ولادت : —— ۱۵ر فروری ۱۹۱۴ء

مقامِ ولادت : —— موضع پتھورہ، قصبہ قائم گنج، ضلع فرخ آباد (اُتر پردیش)

تعلیم : ——

شاعری کا آغاز : —— ۱۹۴۱ء

وفات : —— ۷ر فروری ۱۹۹۳ء دہلی — تدفین ۸ر فروری کو آبائی قصبے میں ہوئی

شعری مجموعے : —— (۱) سازِ لرزاں ۱۹۵۰ء (۲) حدیثِ دل ۱۹۶۰ء (۳) ذوقِ سفر ۱۹۷۰ء
(۴) نوائے آوارہ ۱۹۷۸ء (۵) غبارِ منزل — سابقہ مجموں کا منتخب
کلام مع نئی غزلوں کے ساتھ ۱۹۹۰ء

نثری تصنیفات : —— (۱) ہوائے دوش پر (ریڈیائی تقریریں)
(۲) انگریزی مضامین کا مجموعہ POETICS TO POLITEC'S
متعدد اہم تراجم بھی کیے

اعزاز و اکرام : —— (۱) پدم شری کا خطاب ۱۹۷۱ء
(۱۹۷۸ء میں تاباںؔ صاحب نے یہ خطاب واپس کر دیا)
(۲) "ذوقِ سفر" پر اُتر پردیش اُردو اکادمی کا انعام ۱۹۷۲ء
(۳) سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ۱۹۷۲ء
(۴) "نوائے آوارہ" پر اُتر پردیش اُردو اکادمی کا انعام ۱۹۷۸ء
(۵) "نوائے آوارہ" پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ۱۹۷۹ء
(۶) مودی غالب ایوارڈ ۱۹۸۱ء
(۷) اُتر پردیش اُردو اکادمی کا خصوصی ایوارڈ ۱۹۸۲ء

غلام ربّانی تاباں

چند تاثّرات

قمر رئیس

سی - ۱۴۶، وویک وہار، دہلی

۷ر فروری ۹۳ء کو تاباں صاحب بھی رخصت ہوگئے۔ ان کی کئی حیثیتیں تھیں۔ وہ معاصر غزل کے لہجے میں ایک نئی توانائی اور تازگی پیدا کرنے والے ممتاز شاعر تھے ___ فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف مسلسل جہاد کرنے والے نامور صحافی تھے۔ مکتبہ جامعہ جیسے بڑے قومی اشاعتی ادارے کے سربراہ کی خدمات بھی انھوں نے بڑی تن دہی اور کامیابی سے انجام دیں۔ اس کے علاوہ ملک میں ترقی پسند ادبی تحریک کے قافلہ سالاروں میں بھی ان کا شمار ہوتا تھا۔ ہندستان کی تمام زبانوں کے ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم "نیشنل فیڈریشن آف پروگریسو رائٹرس" کے صدر کے منصب پر وہ گزشتہ پندرہ سال سے فائز تھے۔ اس کی کانفرنسوں میں ہر بار ان کا انتخاب بغیر مقابلے کے ہوا۔ یہ حقیقت اس کا ثبوت ہے کہ ملک کی اہم زبانوں کے ترقی پسند ادیبوں کا اعتماد انھیں حاصل تھا۔ اس تحریک میں کئی گروہ اور کئی رجحانات رہے ہیں جو کبھی کبھی ایک دوسرے سے متصادم بھی ہوتے رہے ہیں۔ لیکن تاباں صاحب کی شخصیت ان تنازعات سے بلند تھی۔ ان کا احترام سب اس لیے بھی کرتے تھے کہ وہ ادب اور نظریے کے تعلق سے ایک متوازن رویّہ رکھتے تھے جس میں ہمواری ہی نہیں استواری بھی تھی۔ وہ ذاتی مصلحتوں اور سہولتوں کی ترغیب پر نہیں جھکتے تھے اور نہ نظریاتی طور پر کبھی کسی تذبذب کا شکار ہوئے۔ کئی مسائل پر راقم الحروف اور دوسرے ادیبوں سے ان کی گفتگو اور بحث کھُل کر ہوتی تھی۔ ہم دونوں اس امر پر متفق تھے کہ ہر ادیب یا تخلیقی فنکار کا پہلا منصب اپنے ضمیر اور اظہار کی آزادی کا تحفظ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کوئی ادیب کسی سیاسی جماعت کا رُکن نہ ہو جس کا نظامِ فکر و عمل حالات اور سیاسی کروٹوں کے تحت بدلتا رہتا ہے۔ اس لیے تاباں صاحب کبھی کسی سیاسی جماعت کے رُکن نہیں ہوئے۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہر ادیب اپنا ایک نظریہ ایک طرزِ فکر رکھتا ہے۔ جس کی تشکیل میں دوسرے نظریات کا دخل بھی ہوتا ہے۔ زندگی اور انسانیت کے تئیں اگر تاباں صاحب کے ذہنی رویے کو کوئی نام دیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ سائنٹفک سوشلزم اور سائنٹفک ہیومن اِزم (HUMANISM) میں یقین رکھتے تھے۔ وہ سوشلزم کو ظلم و استحصال کی طاقتوں سے دبے کچلے انسانوں کی نجات کا واحد راستہ سمجھتے تھے۔ اس نے انھیں تعقل پسندی کا وہ راستہ دِکھایا جو برطول بر بخت کی طرح انھیں روشن ضمیری، تنقیدی حقیقت شعاری اور سائنٹفک انسان دوستی تک لے گیا۔ تاریخ ہو یا سیاست، حقائقِ زندگی ہوں، یا روزمرّہ کی چھوٹی چھوٹی باتیں، وہ اپنے اسی ذہنی روّیے سے دیکھتے اور نتائج اخذ کرتے تھے۔ حریف طاقتوں سے ایسا سمجھوتہ ان کی شریعت میں ناجائز تھا جو ان کے سائنٹفک اور HUMANIST وژن کو مجروح کرے۔ وہ اسے انسانی وقار کا سوال سمجھتے تھے۔ مثلاً ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کے دَور میں نہ صرف اخبارات بلکہ کتابوں کی اشاعت پر بھی سخت سنسر لگا دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں ان کا چوتھا شعری مجموعہ "نوائے آوارہ" چھپ رہا تھا۔ سنسر آفیسر نے اس کے بہت سے اشعار مجموعے سے نکال دینے کی ہدایت کی۔ تاباں صاحب اس کا ایک مصرعہ بھی نکالنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ یہ تنازعہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ آخر وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کی مداخلت سے انھیں بغیر سنسر کے اپنا یہ مجموعہ شائع کرنے کی اجازت ملی۔ جس پر بعد میں ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ بھی ملا۔ زندگی میں اس طرح کے کئی معرکے انھوں نے سر کیے اور حالات کے جبر سے کبھی ایسی مفاہمت نہیں کی جو ان کے ضمیر پر بوجھ بنے یا جس پر انھیں شرمندگی ہو۔

فرقہ وارانہ تناؤ اور فسادات سے پیدا
ہونے والے المناک حالات سے وہ بہت دکھی اور
زمند رہا کرتے تھے۔ فرقہ پرستی کی مخالفت کو
ہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا۔
'MAIN STREA، سیکولر ڈیماکریسی اور
دوسرے انگریزی رسائل میں انھوں نے فرقہ پرستی
گمراہ کن نظریوں اور سازشوں کو بے نقاب کرنے
لیے بے شمار مضامین لکھے جن کا ایک انتخاب
POETICS TO POLITIC ۱۹۸۷ء
شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے سنجیدہ
ستدلال کے ساتھ لیکن اکثر طنز و مزاح
رتمثیل کے موثر ادبی پیرایے میں فرقہ پرستی
ے ہر پہلو پر حملے کیے۔ کئی مضامین میں انھوں
نے آر۔ ایس۔ ایس کے نظریہ سازوں مثلاً
HEDGEWA اور گروگولوالکر کے خیالات کا
زی فلسفے کے معمار ہٹلر کے نظریات سے
وازنہ کیا۔ اور علمی انداز سے بتایا کہ آر۔ ایس۔
یس جس راستے پر گامزن ہے وہ سیدھا
اشزم کا راستہ ہے۔ اس ہندو فسطائی فلسفے
یں جمہوریت، سیکولرزم، آزادانہ فکر و اظہار،
علیٰ انسانی اقدار اور آزادی کی کوئی گنجائش
ہیں۔ تاباں صاحب نے بتایا کہ جس طرح
یونسٹ اور یہودی ہٹلر کے فسطائی فلسفے میں
ندید نفرت کا نشانہ تھے اسی طرح آر۔ ایس۔
یس کی بنیاد مسلمانوں، دلت اور کمیونسٹوں
کے خلاف نفرت پر استوار ہے۔ انھوں نے
س کے خلاف انگریزی میں مضامین لکھ کر
سیکولر جمہوری طاقتوں کو بیدار اور خبردار
رنے کی کوشش کی۔ اور یہ سلسلہ زندگی کے
خری ایام تک جاری رہا۔ اپنے ایک مضمون
میں انھوں نے ایک مقولہ نقل کیا ہے

"THERE CAN BE NO COMPRO-
-MISE WITH THE DEVIL"

یہ ان کا عقیدہ بن گیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت سی قربانیاں بھی دیں۔ یہاں تک کہ اپنا "پدم شری" کا اعزاز بھی واپس کر دیا۔

اُردو دُنیا میں تاباں صاحب کی ہمہ گیر مقبولیت کا سبب ان کی شاعری ہے۔ عہدِ حاضر کے ایک ممتاز غزل گو شاعر کی حیثیت سے وہ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ "سازِ لرزاں" ۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے ہی متعارف ہوتے تھے۔ "سازِ لرزاں" کی نظمیں کم و بیش ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک کے زمانے کی تخلیقات ہیں۔ اس عہد میں وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے ایک سرگرم رُکن تھے اور زمیندار گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود فتح گڑھ کے مفلوک الحال کسانوں کی تحریک میں حصّہ لیتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں سوویت یونین کے ہاتھوں نازی جرمنی کی شکست، مشرقی یورپ میں نئی کمیونسٹ حکومتوں کا قیام، چین، کوریا، ہند، چین اور مشرق کے دوسرے ملکوں میں سامراج کے خلاف عوام کی انقلابی جدوجہد ـــــ ان حالات نے کمیونسٹوں کے حوصلے بہت بلند کر دیے تھے۔ ترقی پسند تحریک کی قیادت بھی اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لیے اس زمانے کے شعر و ادب میں بھی یہ انتہا پسندانہ جوش و خروش نظر آتا ہے۔ "سازِ لرزاں" کی نظموں میں بھی احتجاجی اور جوشیلی نظمیں زیادہ ہیں۔ جو دیرپا تاثر کی حامل نہیں تھیں۔ لیکن اس زمانے کی چند نظمیں ایسی ضرور ہیں جو شاعر کی شدّتِ احساس اور تخلیقی توانائی کی غمازی کرتی ہیں۔ نظم "ایشیا" میں وہ اس عہد کے حوصلہ خیز رجائی موڈ کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے آج مشرق میں
جو انقلاب کہ کل تک فقط تھا اِک نعرا
ادھر تو دیکھ خزاں کا وہ دَور ختم ہوا
چمن چمن ہے بہاروں کا شوخ نظارا
سوادِ مرگ میں آخر حیات ڈھونڈ ہی لی
گناہ گاروں نے راہِ نجات ڈھونڈ ہی لی

اس سے اہم نظمیں وہ ہیں جن میں انھوں نے ذاتی زندگی کی واردات کو شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ مثلاً "ایک نظم" "جیل میں کسی کا خط پاکر" "سحر" وغیرہ۔ ان نظموں میں جذبات کی سحر کاری نے تغزل کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

تاباں صاحب مزاجاً نظم کی تفصیل اور تعمیر کے بجائے غزل کے اجمال اور اس کی مینا کاری کے فنّی اسلوب سے زیادہ قریب تھے۔ اس لیے "سازِ لرزاں" کی اشاعت کے بعد کئی سال تک وہ کلاسیکی غزل کے مختلف نمائندہ شعرا کا مطالعہ کرتے رہے۔ شعر کی کلاسیکی بندش، وسیع تر مفاہیم کو ایمائی اظہار کے ذریعے مصرعوں میں سمونا، روایتی علائم کا استعمال، نئی تراکیب کی تراش، یہ ہنر تو انھیں آگیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ روایتی غزل کے نظام سے جڑے رہنے کے باوجود تقلیدی، پامال روش سے انحراف کیونکر ممکن ہو؟ وہ محض سائنسی فکر اور انقلابی حیثیت ہی نہیں، حسن و عشق کے تعلّق سے اپنے منفرد اور حقیقت پسندانہ تجربات کو پرانے سانچوں میں کیسے ادا کریں کر

وہ نئے اور اچھوتے معلوم ہوں۔ یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے اس پر قدرت حاصل کی۔ انھوں نے عشق و تصوّف کی لفظیات، بہار و خزاں اور شمشیر و سناں کی علامات اور مانوس تلمیحات کو اپنی ذات کے حوالے سے نئے سیاق و سباق میں برتا اور اس طرح اپنے لیے ایک نئی راہ نکالنے کا جتن کیا۔ وہ شعر بہت سوچ سمجھ کر کہتے تھے۔ ہر لفظ ہر بندش پر غور کرتے تھے۔ ایک غزل مکمل کرنے میں کبھی کبھی انھیں ہفتے لگ جاتے تھے۔ انھوں نے بعض ترقی پسندوں کے اس تصور کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا کہ غزل کو فکری اور جذباتی ریزہ کاری سے پاک کر کے ایک موڈ کا پابند کیا جائے۔ ان کی غزلوں میں حزن و یاس بھی ہے اور عزم و نشاط بھی۔ انسانیت پر اعتماد بھی۔ برہمی و احتجاج بھی۔ خوابوں کے دھندلکے بھی۔ حقیقت کی روشنی بھی۔ تنہائی اور یادوں کا عذاب بھی اور انسانوں کی قربت کا حوصلہ خیز احساس بھی۔ الغرض ان کی غزل میں ہر طرح کے تلخ و شیریں تجربات، اندیشے اور آرزو مندیاں، موج در موج اُٹھتے نظر آتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

دل کے لیے گداز تمنّا کہاں سے لاؤں
پگھلا دے ساغروں کو وہ صہبا کہاں سے لاؤں
مانا رہینِ یاس نہیں دل کی آرزو
لیکن میں عمرِ خضر و مسیحا کہاں سے لاؤں

جنوں وہ خام کہ جو بن جائے انجمن کا چراغ
ہوا کی زد پہ رہو شمعِ رہگذر کی طرح

ایسے لمحے بھی گزرتے ہیں تری یاد کے ساتھ
دل پہ کمبخت دھڑکنا بھی گراں ہوتا ہے

میری آشفتہ کلامی پہ بہت طنز نہ کر
دل کی ہر بات میں اک ربط نہاں ہوتا ہے

تری تلاش میں جس رہگذر سے گزرا ہوں
قدم قدم پہ فریبِ نظر سے گزرا ہوں
ملی ہے آبلہ پائی کی داد کانٹوں سے
چمن کھلائے ہیں میں نے جدھر سے گزرا ہوں

ان چند اشعار میں کلاسیکی شعری اسلوب سے وابستگی کے باوجود ایک خوشگوار تازگی اور تنوع کا احساس ہوتا ہے جیسے یہ اشعار فکر و احساس کے ایک درخشاں افق سے اُترے ہوں۔ یہاں قاری کو اس حقیقت کے ادراک میں بھی دشواری نہیں ہوتی کہ ان انفرادی تجربات میں ایک تعمیمی یا اجتماعی کیفیت بھی پنہاں ہے۔ شاعر نے اکثر اپنا تشخص بنی نوع انسان کے وجود میں تلاش کیا ہے۔ مثلاً آخری شعر میں شاعر انسان کی تخلیقی فتوحات اور اس کے لیے انساں کی بے کراں قربانیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ تاباں صاحب کے عہد کا درد و کرب جس کا زہر ان کے وجود میں جذب ہو چکا تھا، ان کی غزل میں منعکس نہ ہو۔ کم و بیش ہر غزل میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو اس عہد کے ابتلا اور آویزشوں کی سمت اشارہ کرتے ہیں۔ ان کے تئیں شاعر کی دردمندی اور احتجاج کا جذبہ ایمائی اور تخلیقی حُسن کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ صرف چند اشعار دیکھیے:

کتنی بے کیف ہیں ساحل کی فضائیں یارب
کوئی طوفان کا رُخ موڑ دے ساحل کی طرف

کہاں وہ ظرف جو لازم ہے تشنگی کے لیے
یہ میکدہ تو سنورنے کو کل سنور جائے

دلوں کا درد کبھی لب پہ آ ہی جاتا ہے
کسی پکار کی صورت کسی صدا کی طرح

اہلِ وفا سے رنجشِ بے جا کے ساتھ ساتھ
اہلِ ہوس کی مدح و ثنا اور بڑھ گئی

ترقّی پسند شعرا کے ہاتھوں غزل کا احیا دراصل ۱۹۵۲ء کے بعد ہوا جب فیض احمد فیض اور مجروح سلطانپوری کے مجموعے شائع ہوئے۔ اس سے قبل اسرار الحق مجاز، جذبی اور فیض کے جو مجموعے شائع ہوئے تھے ان میں غزلوں کی تعداد نسبتاً کم تھی اور وہ ترقی پسند احساس و شعور کے لحاظ سے کوئی ماڈل نہیں پیش کرتے تھے۔ چھٹی دہائی میں فیض، مجروح اور تاباں کی غزل نے اپنے نو کلاسیکی اسلوب اور فکر جدید کے لحاظ سے اہلِ نظر کو متوجہ کیا۔ تاباں صاحب کی غزلوں کا پہلا مجموعہ حدیثِ دل، ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا لیکن اس کی غزلیں رسائل میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ فیض احمد فیض کے لہجے کے تعیّن میں ان کے قید و بند کے تجربات اور ہجرت کی واردات کا نمایاں اثر رہا ہے۔ اس پر مستزاد ان کے رومانوی تخیل کی شادابی اور شگفتگی جو ان کے لہجے میں والہانہ پن پیدا کر دیتی ہے۔ مجروح نے غزل کے ڈکشن کو ترقی پسند فکر و احساس کی روح میں شرابور کر کے ایک نئے جذباتی اور جمالیاتی ذائقے سے آشنا کیا۔ عشقیہ شاعری کی لفظیات کو سیاسی فکر کے ایک وسیع تناظر میں استعمال کر کے انھوں نے غزل کو ایک

ادائے سرکشی بھی دی فیض اور مجروح کی طرح تاباں صاحب کی انفرادیت کے رنگ اتنے شوخ نہیں کہ بیک نظر اپنی طرف متوجہ کرلیں لیکن اچھی اور اہم نوکلاسیکی شاعری کی طرح ان کا شعری آہنگ بھی آہستہ آہستہ قاری کے حواس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ان کے اکثر شعروں میں احساس کی لو فروغ پاکر حسین معنی کا فانوس بن جاتی ہے۔ اس کے لیے وہ خوش آہنگ ترکیبوں سے کام لیتے ہیں جیسے رنگِ فریب کوش، خرابِ سعیِ طلب، بوئے گریز پا گلشنِ مژگاں، منصوبۂ بہارِ چمن، رہ و رسمِ طلب، موجِ شرر، سرِ رہگذر باد وغیرہ۔ تاباں صاحب کے یہاں تخیل کی شادابی کم سہی لیکن تجربات کی تازگی، تہ داری اور تنوع کسی معاصر شاعر سے کم نہیں۔ وہ بھی روایتی رموز و علائم کو نئے سیاق و سباق میں استعمال کرکے انھیں لسانی اور معنوی توسیع دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ اشعار میں، کہیں استفہامیہ لہجے سے اور کہیں ڈرامائی طرزِ بیان سے ایک تیکھی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً :

دشت و صحرا کے کچھ آداب ہوا کرتے ہیں
کیوں بھٹکتے ہو یہاں سایۂ دیوار کہاں ؟

غیر کا ذکر ہی کیا مفت میں الزام نہ دو
دل کی ہر بات میں تم سے بھی کہاں کہتا ہوں

چمن میں کس نے کسی بے نوا کا ساتھ دیا
وہ بوئے گل تھی کہ جس نے صبا کا ساتھ دیا

تاباں صاحب کے اشعار میں آوارگی، سفر، رہگذر، اور جستجوئے مسلسل کے پیکر اور تلازمات کثرت سے ملتے ہیں۔ جو ایک طرف ان کے تصورِ حیات اور نبی نوع انسان کے بارے میں ان کے جذباتی اور ذہنی رویّوں کی غمازی کرتے ہیں تو دوسری طرف یہ اشعار لہولہان انسانیت کے تئیں ان کے باطنی اضطراب کی گواہی دیتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے :

رہِ طلب میں کسے آرزوئے منزل ہے
شعور ہو تو سفر خود سفر کا حاصل ہے

غبارِ راہ چلا ساتھ ہیں یہ کیا کم ہے
سفر میں اور کوئی ہم سفر ملے نہ ملے

خرابِ سعیِ طلب ہوں مجھے قیام کہاں
صبا کی طرح میں ہر رہگذر سے گزرا ہوں

آوارگی میں جادۂ منزل کی قید کیا
اپنا سفر بھی ہے سفرِ باد کی طرح

جستجو ہو تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے
یوں تو ہر موڑ پہ منزل کا گماں ہوتا ہے

قدم قدم پہ سنا کر نوید منزل کی
فریب دے گی مسافر کو رہگذر کب تک

پائے شوق میں کب تک راستوں کی زنجیریں
صورتِ صبا چلیے، سیرِ چار سو کیجے

ان اشعار میں ایک ایسے انسانی وجود کا تصور ابھرتا ہے جس نے کائنات کی تزئین کاری اور انسان کی خدمت گزاری میں حسبِ استطاعت حصہ لیا ہے۔ لیکن اس کی اس تخلیقی شرکت کا محرک، اس کی اخلاقی حس اور اس کا باطنی کرب ہے۔ انسان کے لیے اس دنیا کو حسین تر بنانے کی بے اماں خواہش ہے۔ اس سفر کی کوئی منزل نہیں کوئی جادہ نہیں سبک رو صبا کی طرح یہ سفر خود سفر کا حاصل ہے۔ جو خوشبو بکھیرتا ہے پھول کھلاتا ہے۔ تاباں صاحب کی زندگی بھی اس سفر کا ایک استعارہ ہے۔ انسان سے ان کی بے لاگ محبت کی جمال آفریں خوشبو، فکر و عمل کے جھونکوں سے، شاعری کے لطیف جھروکوں سے دور دور تک پھیلتی رہی۔ وہ اپنی انسان دوستی اور تعقل پسندی پر ہمیشہ نازاں رہے۔ یہی تسکین آسودگی ان کے سفر کا حاصل تھی۔

"حدیثِ دل" پر ایک نظر

عارف نقشبندی

عارف منزل، بیکانیر

"حدیثِ دل" جناب غلام ربّانی تاباں کی اُن ۵۵ غزلوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۰ء تک کہی ہیں۔ ماہ و سنِ اشاعت، اکتوبر ۱۹۶۰ء ہے۔ حرفِ آغاز میں مُصنّف نے غزل کی بابت مختصر مگر جامع الفاظ میں اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں اور غزل کو بہترین صنفِ سخن کہتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ غزل رمز و ایمائی شاعری ہے اس کا اپنا آہنگ و مزاج اور مخصوص لب و لہجہ ہوتا ہے۔ جو شعر و شاعری کی دوسری صنفوں سے جدا ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ محض حسن و عشق ہی غزل کے موضوعات نہیں بلکہ اس میں وقتی تقاضوں اور عصری میلانات اور شاعر کے ماحول کی ترجمانی کی پوری صلاحیت ہے۔

"حدیثِ دل" کے مطالعے سے یہ بات فوراً واضح ہو جاتی ہے کہ مُصنّف نے جن خصوصیاتِ غزل کا ذکر "حرفِ آغاز" میں کیا ہے وہ اُن کی غزل میں بہ حسنِ تمام جلوہ گر ہیں۔ محبوب سے یا محبوب کے بارے میں باتیں کرنے اور وہ بھی دل کی باتیں کرنے کے لیے کس زبان، کس سلیقے، "کس رکھ رکھاؤ" اور احتیاط و شعور کی ضرورت ہے، وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھیں عشق کی عظمت اور حسن کے احترام کا احساس رکھتے ہوئے اپنے محبوب سے عرضِ نیاز کرنے یا شرفِ کلام حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ "حدیثِ دل" کے ان اشعار سے اندازہ کیجیے کہ تاباں کس لطیف احساس، شائستہ جذبے اور پاکیزہ پیرایۂ بیاں کے مالک ہیں:

فریب کھائے تری شوخیوں سے کیا پوچھیں
حیات و مرگ میں کس کی طرف اشارا تھا

دل کی جانب رازدارانہ نظر ہونے لگی
زندگی دشوار سے دشوار تر ہونے لگی

اللہ ری اس انجمنِ ناز کی رونق
فردوس کا نظروں میں سماں رہنے لگا ہے

پابندیٔ آدابِ محبت پہ یہ اصرار
فہمائشِ دزدیدہ نظر یاد رہے گی

تجھے خبر بھی نہیں ہے کہ دل کی دھڑکن نے
کہاں کہاں تری آوازِ پا کا ساتھ دیا

پائے طلب کو لغزشِ پیہم کے باوجود
وابستگی وہی ہے تری رہگذر کے ساتھ

شعلہ سا تہہِ زلف بھڑک جاتا تھا تاباں
ہر لمسِ نظر سلسلہ جنبانِ حیا تھا

ایک ایک ادا شوق کی تہذیب پہ مائل
ایک ایک نظر شوخیِ جذبات کی تنقید

رنگِ حیا میں ڈوبے عارض پر یوں زلفیں بکھری ہیں
شام کی گہری چھاؤں میں جیسے کوئی کنول جل جاتا ہے

ہمیں نہ کر سکے تجدیدِ آرزو ورنہ
ہزار بار کسی کے پیام بھی آئے

وارداتِ حسن و عشق کے علاوہ "حدیثِ دل" میں شاعر کے عہد اور ماحول کی پوری ترجمانی ہے۔ جو غزل کی نزاکت اور شعریت کو قائم رکھتے ہوئے کی گئی ہے۔

زبان، الفاظ، تراکیب، تشبیہات و استعارات، تلمیحات و اصطلاحات کے استعمال میں اُنھوں نے قدیم روایاتِ شعر و سخن کا احترام کیا ہے مگر ایک بالغ نظر اور چابکدست فنکار کی طرح ان کو نئے معنی دیے ہیں۔

جناب تاباں کے یہاں ساقی و میخانہ، ساغر و صہبا، صیّاد و گلچیں، گل و گلستاں،

قفس و آشیاں، دار و رسن، اپنے روایتی معنوں میں استعمال نہیں ہوتے ہیں۔ "حدیثِ دل" کے مصنّف کا یہی کمال ہے کہ انھوں نے غزل کی زبان اور انداز میں وہ مضامین ادا کیے جو ان حضرات کے نزدیک قلم و غزل سے خارج اور شعریت کے منافی ہیں جو غزل کو محبوب سے باتیں کرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ عصری میلانات، اور گرد و پیش کے حالات غزل میں کس حسن و خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں تاباں صاحب کے ان اشعار سے اندازہ فرمائیں:

کبھی جو چار قطرے بھی سلیقے سے نہ پی پائے
وہ رندِ خام ہے ساقی وہ ننگِ جام ہے ساقی

گلوں کے ساتھ اجل کے پیام بھی آئے
بہار آئی تو گلشن میں دام بھی آئے

چمن میں آگ نہ لگتی تو اور کیا ہوتا
کہ پھول پھول کے دامن میں اک شرارا تھا

بہار باعثِ جمعیتِ چمن نہ ہوئی
شمیمِ گل کی پریشانیوں کے دن آئے

اُدھر چمن میں زرِ گل لٹا اِدھر تاباں
ہماری بے سر و سامانیوں کے دن آئے

ماحول کی ابتری اور ماحول کی ناسازگاری کے باوجود تاباں مایوس و نا اُمید نہیں وہ حیات کی توانائی و حرکت اور اس کے نشو و نما پاتے رہنے پر ایمان رکھتے ہیں، زندگی کے منفی رُخ کے ساتھ ساتھ اس کے مثبت پہلو پر بھی اُن کی نظر ہے۔ جو لوگ جد و جہدِ حیات میں سرگرمِ عمل ہیں ان کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

چمن والوں میں اک ادراکِ نمو بڑھتا ہی جاتا ہے
مبارک ہو رواجِ رنگ و بو بڑھتا ہی جاتا ہے

سلاسل بھی ہیں زنداں بھی ہیں دیوانوں کی راہوں میں
مگر اے دوست شورِ ہاے ہو بڑھتا ہی جاتا ہے

جناب تاباں یہ جانتے ہیں:

غمِ زندگی اک مسلسل عذاب

مگر انھیں یہ بھی احساس ہے کہ:

غمِ زندگی سے مفر بھی نہیں

چنانچہ وہ ایک زندہ دل، بلند ہمّت اور اعلیٰ ظرف انسان کی حیثیت سے آلام و مصائبِ دنیا کو ہیچ سمجھتے ہوتے اپنے ہم مشربوں سے خطاب کرتے ہیں:

چھٹے غبارِ نظر بامِ طور آجائے
پیو شراب کہ چہرے پہ نور آجائے

مقامِ دار سے گزرو تو زندگی پاؤ
پیو جو زہرِ ہلاہل سرور آجائے

اُن کا عقیدہ ہے اور بالکل درست ہے:

زندگی ذوقِ نمو، ذوقِ طلب ذوقِ سفر
انجمن ساز بھی ہے گرمِ تگ و تاز بھی ہے

دلچسپ ہے نظارۂ گلشن نظر ہے شرط
کانٹے گلوں کے ساتھ ہیں شبنم شرر کے ساتھ

"حدیثِ دل" کے مطالعے سے یہ رائے بآسانی قائم کی جاسکتی ہے کہ جناب تاباں ایک پختہ کار شاعر ہیں۔ جو غور و فکر اور سمجھ بوجھ سے شعر کہتے ہیں۔ اُن کا شعور پختہ، فکر و خیال بلند، احساس لطیف اور جذبہ شائستہ ہے جن کو ان کے حسنِ بیان نے حسین تر بنا دیا ہے۔ دل کی دنیا کی سیر کرنے والوں اور دل کی زبان سننے والوں کے لیے "حدیثِ دل" کا مطالعہ سرمایۂ کیف و نشاط ہے۔



۲۳ جنوری ۱۹۹۰ء (مشاعرہ جشنِ جمہوریت) کی ایک یادگار تصویر

دائیں سے: کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، دہلی کے اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر جناب ارجن سنگھ اور جناب غلام ربانی تاباں

میڈیا نے غلام ربّانی تاباںؔ سے انصاف نہیں کیا

دہلی اُردو اکادمی کے تعزیتی جلسے میں شرکا کا اظہارِ خیال

ہمارے الیکٹرانک میڈیا نے اُردو کے نامور شاعر جناب غلام ربّانی تاباںؔ سے انصاف نہیں کیا۔ نہ صرف ان کی زندگی میں انھیں دُور درشن یا ریڈیو کے نیشنل پروگرام میں شامل نہ کیا گیا بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر کوئی خصوصی پروگرام پیش نہیں کیا گیا۔

اس خیال کا اظہار ۱۴ فروری کو دہلی اُردو اکادمی کے ایک تعزیتی جلسے میں اکادمی کے موجودہ اور سابق عہدیداروں نے کیا۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا کہ تاباں صاحب تحریکِ آزادی میں شرکت کی بنا پر جیل کاٹنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں دہلی آگئے تھے اور تقریباً ۴۳ سال تک یہاں اپنے فکر و قلم سے وطن کی تعمیر اور ترقی کی قدروں کو فروغ دیتے رہے۔ ان کے چھ مجموعے شائع ہوئے۔ انھیں ساہتیہ اکادمی، دہلی اُردو اکادمی، غالب انسٹی ٹیوٹ اور سابق سوویت روس کا نہرو ایوارڈ ملے لیکن ہمارے میڈیا نے ان کی وہ پذیرائی نہ کی جس کے وہ مستحق تھے۔ سیّد شریف الحسن نقوی نے کہا کہ تاباں مرحوم جو اپنے آخری برسوں میں اکادمی کی دو کمیٹیوں کے چیئرمین تھے، نہایت بے لوث اور انصاف پسند سماجی مجاہد تھے لیکن اپنا ہر کام خاموشی سے کرتے تھے۔ اکادمی نے ان کی حیات میں ان سے انٹرویو پر مبنی ایک فلم تیار کی تھی جو ادارے کی طرف سے صاحبانِ دُور درشن کو پیش کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی نے کہا کہ دہلی اُردو اکادمی کو تاباں مرحوم کی یاد میں لیکچروں کا ایک سلسلہ قائم کرنا چاہیے۔ اور ان لیکچروں کے ذریعے مرحوم کے سیکولر اور ترقی پسند نظریات کو فروغ دیا جانا چاہیے۔ اکادمی کے سیکریٹری ایس۔ اشتیاق عابدی نے میڈیا کی کوتاہی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اطلاعات و



دائیں سے: جناب مقیم الدین فاروقی، بیگم سعیدہ خورشید عالم خاں، جناب عبداللہ ولی بخش قادری، جناب شاہد علی خاں، جناب بھیشم شاہنی اور مائک پر سیکریٹری اُردو اکادمی ایس۔ اشتیاق عابد
(تصویر: سیّد فدا علی)

نشریات کے وزیرِ مملکت جناب کے. بی سنگھ دیو سے اس سلسلے میں نمائندگی کریں گے اور اکادمی کی فلم کو دُور درشن کے کسی آئندہ پروگرام میں شامل کروانے کی کوشش کریں گے۔ انھوں نے بتایا کہ اکادمی کے رسالے "ایوانِ اُردو" کے اگلے شمارے میں گوشۂ تاباںؔ شامل کیا جائے گا۔ عابدی صاحب نے مزید کہا کہ یادگاری لیکچر کی تجویز کو بھی اکادمی کی گورننگ کونسل کے سامنے رکھا جائے گا۔

مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں نے کہا کہ تاباں مرحوم سیدھے، سچے اور کھرے پٹھان تھے اور اپنے اعلیٰ اوصاف کے ساتھ وہ فرقہ پرستی کے خلاف جد وجہد کرتے رہے۔ وہ نعرے بازی نہیں کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں قلندری اور کردار میں روحِ جہاد تھی۔ ہندی کے ادیب جناب بھیشم ساہنی نے کہا کہ جب تاباں صاحب انجمن ترقی پسند مصنّفین کے صدر اور سیکریٹری تھے تو انھیں قریبا ۱۷ سال تک ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ مرحوم نے کبھی اپنی کسی ذاتی خواہش یا طلب کا اظہار نہ کیا بلکہ ہمیشہ خود اعتمادی سے ترقی پسند نظریات کو فروغ دیتے رہے۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے نیشنل سیکریٹری جناب مقیم الدین فاروقی نے کہا کہ وہ پارٹی کے ممبر نہیں تھے لیکن اس تحریک کی سیاست اور ادب کے درمیان ایک مخلص رابطہ تھے۔ وہ بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی پر بہت فکرمند رہے اور اس کا مقابلہ سیکولر طاقتوں کے اتحاد سے کرنے کے حق میں تھے۔

رسالہ جامعہ کے ایڈیٹر اور تاباں مرحوم کے منجھلے داماد سید جمال الدین نے کہا کہ ذہنی طور پر وہ ایک مجاہد تھے جو جوش و ہوش کے ساتھ ملک کے سیاسی عمل میں شریک رہے۔ مرحوم کی بھاوج بیگم خورشید عالم خاں نے کہا کہ وہ ایک خزانۂ علم و اخلاق تھے۔ ان کی مفارقت سے ان کا خاندان بہت نادار ہو گیا ہے۔ انسان دوستی ان کا خاص امتیاز تھی اور اسی نے انھیں فرقہ پرستی کے خلاف جد وجہد کرنے کی تحریک دی۔ غالب اکیڈمی کے سیکریٹری جناب ذہین نقوی اور جامعہ ملیہ کی ڈاکٹر صغرا مہدی نے بھی مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جناب ریاضت علی شایق اور جناب رفعت سروش نے منظوم گلہائے عقیدت پیش کیے۔ صدرِ جلسہ جناب عبداللہ ولی بخش قادری نے مرحوم کی زندگی کے چند واقعات کی مثالوں سے ان کے شخصی اوصاف کو نمایاں کیا اور کہا کہ وہ کم گو اور کم آمیز ضرور تھے لیکن ان کا سماجی شعور بڑا بیدار اور سرگرم تھا۔

جلسے کے اختتام پر دو منٹ کی دعائیہ خاموشی سے ایک تعزیتی قرارداد پاس کی گئی۔

کچھ اور تعزیتی جلسے

جناب غلام ربّانی تاباں کے سانحۂ ارتحال پر ہریانہ اُردو اکادمی میں ایک تعزیتی میٹنگ کی گئی جس میں تاباں صاحب کی خدمات کو یاد کیا گیا۔ اکادمی کے سیکریٹری کشمیری لال ذاکر نے کہا کہ تاباں صاحب ایک سیکولر شخصیت کے مالک تھے انھوں نے ہمیشہ ہندو مسلم ایکتا کے لیے کام کیا اور قومی یک جہتی کے فروغ کے کسی بھی موقع کو ضائع نہیں کیا۔ اپنی شاعری کے ذریعے تاباں صاحب نے ہندستان کی سیکولر اقدار کو پیش کیا اور غریب عوام کے لیے ہمدردی کے جذبے کو قائم رکھا۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ تاباں صاحب ایک وضع دار انسان تھے جو حالات کے بدلتے ہوئے تیوروں سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔

مکتبہ جامعہ کے زیرِ اہتمام اس کے کارکنوں، رفیقوں اور معاونوں کا ۱۲ فروری کو ایک ماتمی جلسہ ہوا جس کی صدارت مکتبہ جامعہ کے ڈائرکٹر جناب سیّد مجتبیٰ حسین زیدی نے کی۔ مجلّہ جامعہ کے ایڈیٹر سیّد جمال الدین نے جلسے کی نظامت کی۔

جامعہ ملیہ کے پروفیسر عنوان چشتی نے کہا کہ تاباں صاحب کا انسانی اتّحاد کا جذبہ اس قدر سرگرم تھا کہ وہ اپنے بسترِ مرگ سے بھی فرقہ واریت کے خلاف مضامین لکھتے رہے۔ وطن پرور خیالات کو مشن بنانے والوں میں ان کا مرتبہ منفرد ہے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے کہا کہ وہ اُردو زبان اور ادب کے سنجیدہ اور مخلص خادم تھے۔ جامعہ برادری میں ان کا مقام ایک مشفق اور خیراندیش کا تھا۔ جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر شمیم حنفی نے کہا کہ تاباں صاحب برسوں مکتبہ جامعہ کے سربراہ رہے اور ان کی قیادت میں اس ادارے نے پوری دُنیا میں اپنے لیے ایک مستقل اور منفرد حیثیت حاصل کر لی۔ جناب عبداللہ ولی بخش قادری نے کہا کہ تاباں صاحب کی مفارقت سے جامعہ کی ادبی اور سماجی فضا میں گہرا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ پروفیسر ضیا الحسن فاروقی نے تاباں صاحب پر اپنے ایک طویل مضمون سے کچھ اقتباسات سنائے جن میں مرحوم کے فکر و عمل کی عکاسی کی گئی تھی۔

مکتبہ جامعہ کے موجودہ جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں نے بتایا کہ وہ تاباں صاحب سے کچھ عرصے پہلے مکتبہ جامعہ میں شامل ہوتے تھے۔

لہٰذا انھوں نے ادارے کی ترقّی کے لیے تاباں صاحب کے انہماک اور خلوص کو نہایت نزدیک سے دیکھا اور اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ مرحوم نے نہ صرف اس ادارے میں ایک جدید پرنٹنگ پریس لگوایا بلکہ اسے درسی کتابوں کی اشاعت کا ایک اہم مرکز بنایا۔ شاہد علی خاں صاحب نے بتایا کہ ادارے کے کچھ کارکن تاباں صاحب کی منصوبہ بندی اور تدبیروں کو ناکام بنانے کی کوشش کرتے رہے لیکن مرحوم ان سے اُلجھے بغیر گہری قوت ارادی اور ثابت قدمی سے اپنی مساعی میں مصروف رہے۔ ان کی ذات و حیات ادارے کی بہتری اور ترقّی کے لیے وقف رہی۔ محترمہ میرا رضوی اور ڈاکٹر صغرا مہدی نے اپنے مقالوں میں تاباں صاحب کی شخصیت اور اپنے خاندان اور جامعہ برادری کے افراد سے ان کی گہری شفقت اور ہمدردی کے واقعات سنائے۔

آخر میں دو منٹ کی دعائیہ خاموشی کے ساتھ تعزیتی قرارداد پاس کی گئی۔

○

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں صدر شعبہ ڈاکٹر شمیم نکہت کے زیر صدارت ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا۔ ڈاکٹر شمیم نکہت نے کہا کہ ترقّی پسند تحریک کے معماروں میں سے ایک غلام ربّانی تاباں صفِ اوّل کے شاعر ہونے کے علاوہ ایک ممتاز دانشور اور مفکّر بھی تھے۔ انھوں نے فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف کھل کر جہاد کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر ظہیر احمد صدّیقی، پروفیسر فضل الحق، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر فرحت فاطمہ، ڈاکٹر ابن کنول اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے بھی مرحوم شاعر کو خراج عقیدت پیش کیا۔ تعزیتی جلسے کے شرکا نے مرحوم کے لیے مغفرت کی دُعا کرتے ہوئے سوگوار کنبے سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

○

شعبۂ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں غلام ربّانی تاباں کی وفات پر تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں تاباں صاحب کی سماجی، تہذیبی اور ادبی خدمات پر اساتذہ نے اظہار خیال کیا۔ تاباں صاحب کو یاد کرتے ہوئے کہا گیا کہ وہ ایک معروف شاعر اور سرگرم سماجی کارکن رہے۔ عرصہ دراز تک انھوں نے مکتبہ جامعہ کے سربراہ کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ وہ سیکولر مزاج رکھتے تھے اور فرقہ پرستی کے خلاف متواتر جدّوجہد کرتے رہے۔ تعزیتی قرارداد میں کہا گیا کہ اس وقت ان کا ہم سے بچھڑ جانا اُردو زبان و ادب اور سماجی زندگی کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس جلسے میں پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر حنیف کیفی، پروفیسر مجیب رضوی، پروفیسر شمیم حنفی اور ڈاکٹر جمال الدین نے تاباں صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں نیز ان کے ادبی مقام و مرتبے پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے تعزیتی قرارداد پیش کی۔

○

عالمی اُردو کانفرنس سکریٹریٹ میں جناب غلام ربّانی تاباں کے انتقال پر ایک تعزیتی نشست زیر صدارت مسٹر علی صدّیقی منعقد ہوئی جس میں مسٹر ابوالفیض سحر، چودھری ذوالنورین، مسٹر سلطان سلیم، مسٹر مخدوم زادہ مختار عثمانی اور مسٹر عارف مجتبیٰ نقوی کے علاوہ بہت سے ادب دوست اصحاب نے مرحوم تاباں صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مسٹر علی صدّیقی نے اپنی تقریر میں کہا کہ غلام ربّانی تاباں کے انتقال سے اُردو ادب کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تمام اُردو والوں خصوصاً دہلی کے اُردو عوام کا یہ فریضہ ہے کہ عظیم شاعر کے ادبی مرتبے کے شایانِ شان ایک یادگار شہر دہلی میں قائم کی جائے۔ انھوں نے کہا کہ اس نیک مقصد کے لیے آگے آنے والوں کے ساتھ عالمی اُردو کانفرنس پورا تعاون کرے گی۔

○

۱۱ فروری کو دہلی رائٹرز فورم کا ایک جلسہ شاہد صدّیقی، ایڈیٹر نئی دُنیا کی صدارت میں ہوا جس میں جناب غلام ربّانی تاباں کے انتقال پر گہرے دُکھ کا اظہار کیا گیا۔ شاہد صدّیقی نے تاباں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ کھلے دل اور صاف ذہن کے ساتھ عصری مسائل پر غور کرتے تھے اور اپنی بات بے خوف ہو کر کہتے تھے۔ انھوں نے زندگی کے آخری لمحوں تک ترقّی پسندی، سیکولرازم اور مساوات کا علم اُٹھائے رکھا اور اپنی شعری اور نثری تخلیقات کے ذریعے ہر طرح کی فرقہ پرستی، نفرت و تعصّب اور فسطائی ذہنیت کے خلاف پوری شد و مد کے ساتھ جنگ جاری رکھی۔ تاباں مرحوم کو ہم قلم کار بہترین خراجِ عقیدت اسی طرح پیش کر سکتے ہیں کہ انھوں نے ظلمت پسندی کے خلاف اپنی جنگ کو جہاں چھوڑا ہے اسے ختم نہ ہونے دیں اور اس وقت تک جاری رکھیں جب تک سیکولر طاقتیں بالادستی نہ حاصل کر لیں۔ اس موقع پر دہلی رائٹرز فورم کے جنرل سکریٹری پروانہ ردولوی نے تاباں مرحوم کی صحافتی دیانت داری کی چند مثالیں پیش کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنی تحریر میں اخبار کے ایڈیٹر کے ذریعے ایک حرف کی تبدیلی بھی گوارہ نہ کرتے تھے اور عصری مسائل

پر اپنے مضامین کو جُوں کا تُوں شائع کرنے پر اصرار کرتے تھے، یہ ان کے عقائد کی پختگی کا ثبوت ہے۔ جلسے میں ایک قرارداد منظور کرکے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذمّے داروں سے درخواست کی گئی کہ وہ جامعہ نگر میں تاباںؔ مرحوم کے شایانِ شان کوئی یادگار قائم کریں تاکہ آنے والی نسلیں ان کی قومی اور ادبی خدمات کو یاد رکھ سکیں۔ جلسے میں طارق انور، مخمور سعیدی، حیاتؔ لکھنوی، امیر قزلباش، اقبال عمر، قیس رامپوری، جمال فہمی، عقیدت اللہ قاسمی، ایم۔ ودود ساجد، صالح عبداللہ، ایس۔ ایم۔ سیف اللہ، صغیر کرمانی اور شاہانہ قزلباش نے بھی مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

○

ادبی، سماجی اور ثقافتی تنظیم میزان کے زیرِ اہتمام اوکھلا میں مرحوم غلام ربّانی تاباںؔ کی موت پر تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس میں تاباںؔ صاحب کو قومی یکجہتی کا علمبردار بتایا گیا۔ میزان کے جنرل سیکریٹری مسٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ تاباںؔ صاحب جہاں منفرد لب ولہجے کے شاعر تھے وہیں انھوں نے اپنی نثر اور نظم میں زمانے کے نشیب و فراز کی بھرپور نمائندگی کی۔ جامعہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے بھی تاباںؔ صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

○

جناب غلام ربّانی تاباںؔ کے سانحۂ ارتحال پر بتیا (بہار) کے معروف ادارے "اردو سوسائٹی" نے ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا جس کی صدارت جناب عزیز ربّانی نے کی۔ ادارے کے صدر اور ناظمِ جلسہ نسیم احمد نسیم نے تاباںؔ صاحب کی ادبی اور صحافتی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ اُردو کے ان عہد ساز شاعروں کی صف میں آتے ہیں جن کے نام سے ایک دور منسوب ہے۔ نظریاتی سطح پر وہ مارکس کے پیروکار تھے لیکن انھوں نے اپنے فن پر اپنے نظریے کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں نغمگی اور موسیقیت برقرار رکھی۔ ان کے یہاں سنجیدگی، متانت اور لہجے کا سبک اور دھیما انداز ہر جگہ ملتا ہے۔

جلسے کے شرکا میں حضرات ذاکر کمال، محمد اسلم، ابوالخیر نشتر، محمد مختار وفا، ظفر امام، گورکھ مستانہ، کشوری لعل، انشو مالی، اختر حسین اختر اور صدرِ جلسہ عزیز ربّانی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

○

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ کی شاخ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے جناب تاباںؔ مرحوم کے انتقال پر مقامی کتب فروشوں کو یکجا کرکے تعزیتی جلسہ منعقد کیا جس میں ایجوکیشنل بک ہاؤس، اُردو بک سینٹر، انوار بک ڈپو، فرینڈس بک ہاؤس کے اراکین نے شرکت کی۔ تاباں صاحب مرحوم کی ادبی اور قومی خدمات کا ذکر کیا گیا۔ اس کے بعد جملہ حاضرین نے سورۂ فاتحہ کا ثواب مرحوم کو بخشا۔

اطلاع نامہ بابت "ایوانِ اُردو دہلی"

بموجب

فارم-۴

مقام اشاعت	:	دفتر اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
وقفۂ اشاعت	:	ایک ماہ
پرنٹر	:	اشتیاق عابدی
قومیت	:	ہندستانی
پتہ	:	اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
پبلشر	:	اشتیاق عابدی
قومیت	:	ہندستانی
پتہ	:	اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
ایڈیٹر	:	اشتیاق عابدی
قومیت	:	ہندستانی
پتہ	:	اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
مالک	:	(کوئی حصے دار یا شیئر ہولڈر نہیں) گورنمنٹ آف نیشنل کیپٹل ٹیریٹری آف دہلی اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مَیں اشتیاق عابدی بہ قائمی ہوش وحواس اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

۱۰ مارچ ۱۹۹۳ء

دستخط

(اشتیاق عابدی)

غلام ربّانی تاباں

منتخب غزلیہ کلام

جنونِ خود نما خود نگر بھی نہیں
خرد کی طرح کم نظر بھی نہیں

نظر معتبر ہے خبر معتبر
مگر اس قدر معتبر بھی نہیں

کہاں جائیں تاباں گنہگارِ شوق
سزا بھی نہیں درگزر بھی نہیں

ہم بھی مسجد کے ارادے سے چلے تھے لیکن
میکدے راہ میں حائل تھے جدھر سے گزرے

کتنی امواجِ بلا پانْو کی زنجیر بنیں
کتنے طوفانِ حوادث تھے کہ سر سے گزرے

آج تاباں دلِ مرحوم بہت یاد آیا
بعد مدّت کے جب اُس راہ گذر سے گزرے

قصورِ عشق میں ظاہر ہے سب ہمارا تھا
تری نگاہ نے دل کو مگر پکارا تھا

ہوائے شوق نے رنگِ حیا نکھارا تھا
چمن چمن لب و رخسار کا نظارا تھا

چمن میں آگ نہ لگتی تو اور کیا ہوتا
کہ پھول پھول کے دامن میں اک شرارا تھا

نگاہِ حُسن خریداریوں پہ مائل ہے
متاعِ شوق کی ارزانیوں کے دن آئے

سروں نے دعوتِ آشفتگی کا قصد کیا
دلوں میں درد کی مہمانیوں کے دن آئے

اُدھر چمن میں زرِ گُل لُٹا اِدھر تاباں
ہماری بے سر و سامانیوں کے دن آئے

خیالِ یار ترا شکریہ، رہِ غم میں
بس ایک تو نے دلِ مبتلا کا ساتھ دیا

تجھے خبر بھی نہیں ہے کہ دل کی دھڑکن نے
کہاں کہاں تری آوازِ پا کا ساتھ دیا

اب اس سے آگے وہ مسجد یہ مےکدہ تاباں
یہاں تلک تو کسی پارسا کا ساتھ دیا

وہ سحرِ اشارات، وہ افسونِ کنایات
اک وہمِ تمنّا تھا مگر ہوش رُبا تھا

بربادیِ نکہت بہ تقاضائے نمو تھی
پھولوں کو مگر بادِ بہاری سے گِلا تھا

شعلہ سا تہِ زُلف بھڑک جائے تھا تاباں
ہر لمسِ نظر سلسلہ جنبانِ حیا تھا

دولتِ فکرِ رسا طبعِ رواں پائی ہے
غالبؔ و میرؔ کی ورثے میں زباں پائی ہے

جلوۂ حُسنِ فراواں پہ بجا اُن کا غرور
ہم بھی نازاں ہیں کہ چشمِ نگراں پائی ہے

کل جو تاباںؔ کے انھیں شعر سنائے تو کہا
ہائے کم بخت نے کیا طرزِ بیاں پائی ہے

بھولے تو جیسے ربط کوئی درمیاں نہ تھا
اتنے بدل بھی سکتے ہو، تم یہ گماں نہ تھا

اک بات تھی نمودِ سحر، سُن کے رہ گئے
اک ذکر تھا فروغِ وطن، ہو کے رہ گیا

عنواں ہوس کے روز بدلتے چلے گئے
عنوانِ شوق دار و رسن ہو کے رہ گیا

پر اپنے مغ'

اِک مسئلہ زبان کا تھا وہ بھی خیر سے
تاباں سخن برائے سخن ہو کے رہ گیا

دل وہ کافر کہ سدا عیش کا ساماں مانگے
زخم پا جائے تو کم بخت نمک داں مانگے

دستِ وحشت کے کوئی حوصلے دیکھے تاباں
جب بھی مانگے تو اُسی شوخ کا داماں مانگے

ترے خیال سے فرصت اگر کبھی پائی
بھری بھری سی یہ دُنیا تہی تہی پائی

سحر سے مل تو گیا سلسلہ اُجالے کا
حیاتِ شمع نے کہنے کو عارضی پائی

کبھی جو یادِ خرابات آرزو آیا
غمِ حیات کی تلخی میں کچھ کمی پائی

جبیں خراج اُسے دے تو ناروا بھی نہیں
وہ ایک شخص جو بُت بھی نہیں خدا بھی نہیں

کہاں کے لطف و کرم، کیسی دلدہی تاباں
مرے لیے تو ستم ہائے برملا بھی نہیں

بہ قدرِ ظرف انجمن میں سب کو جام مل گیا
نظر اُٹھی کرم کشی کا اذنِ عام مل گیا

وہ بال و پر کی شورشیں جو زندگی کے ساتھ تھیں
کبھی کبھی انھیں سکوں بھی زیرِ دام مل گیا

یہ میکدے کا راز ہے مغاں کو جس پہ ناز ہے
طلب کو پیاس مل گئی ہوس کو جام مل گیا

مزہ تو جب ہے کہ آوارہ گانِ شوق کے ساتھ
غبار بن کے چلے اور رہ گذر گُم ہو

تلاشِ دوست ہے دل کو مگر خدا جانے
کہاں کہاں یہ بھٹکتا پھرے کدھر گُم ہو

جھلملاتے نہیں بے وجہ تو محفل کے چراغ
اِک نظر دیکھ تو بو صاحبِ محفل کی طرف

یاد آتا ہے وہ اندازِ تجاہل اے دوست
بات اوروں سے مگر روئے سخن دل کی طرف

کبھی کبھی تو کسی کے غرور کا دامن
مچل گیا ہے مرے دستِ نارسا کے لیے

دل اگر دل ہے تو وابستۂ غم بھی ہوگا
نکہتِ گل بھی کہیں گل سے جُدا رہتی ہے

نُطق نا محرمِ اسرارِ جنوں ہے اے دوست
درد بن کر دلِ شاعر میں نوا رہتی ہے

حُسن کی سعیِ کرم وجہِ تسلّی نہ ہوئی
ایک بے نام خلش دل میں سدا رہتی ہے

حیات کہیے کہ طوفانِ آرزو کہیے
اُٹھے جو موج تو سر سے گزر گزر جائے

ہر ایک موڑ پہ جلتے ہیں منزلوں کے چراغ
تھکا ہوا یہ مسافر کدھر کدھر جائے

نظارے اور بھی ہیں عارض و جبیں کے سوا
اُٹھاؤ سر کہ ذرا دُور تک نظر جائے

تمام عمر کٹی ایک بے نوا کی طرح
چمن میں خاک اُڑاتے پھرے صبا کی طرح

دلوں کا درد کبھی لب پہ آ بھی جاتا ہے
کسی پکار کی صورت کسی صدا کی طرح

نشانِ راہ نہ پایا تو دشتِ غربت میں
ہم اپنی راہ بناتے چلے ہوا کی طرح

الٰہی غم کی ہوائیں کسی کے دامن تک
پہنچ نہ پائیں مرے دستِ نارسا کی طرح

غبارِ راہ چلا ساتھ یہ بھی کیا کم ہے
سفر میں اور کوئی ہم سفر ملے نہ ملے

خرد رقیبِ تماشا ہے، دل رہینِ جمال
وہ کشمکش ہے سکوں عمر بھر ملے نہ ملے

ہوس کو جلوۂ بارِ دگر کا شوق سہی
نظر کو فرصتِ بارِ دگر ملے نہ ملے

اہلِ سفر کو خوب جزائے سفر ملی
ہر رہ گذر کے بعد نئی رہ گذر ملی

پُرسانِ حال کون تھا غربت کی راہ میں
ہاں اک تمھاری یاد کہ ہر موڑ پر ملی

جذبات کے ہجوم میں الفاظ کھو گئے
اظہارِ مدّعا کی اجازت اگر ملی

کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا کرتے ہیں لوگ
خامشی بھی ایک طرزِ گفتگو ہے دوستو

ہر قدم پر جل رہے ہیں راہِ الفت میں چراغ
ہر قدم پر نقشِ پا ہے جستجو ہے دوستو

کوششِ عرضِ ہنر ظاہر ہیں تاباں کی غزل
اور در پردہ کسی سے گفتگو ہے دوستو

تھکے ہیں لاکھ مسافر، سفر ہے کیا کیجے
ابھی وہی کششِ رہ گذر ہے کیا کیجے

چمن میں کوئی نشیمن رہے رہے نہ رہے
بہار، موسمِ رقصِ شرر ہے، کیا کیجے

بڑا عجیب یہ آوارگی کا رشتہ ہے
غبارِ راہ سہی، ہم سفر ہے، کیا کیجے

پریشاں ہو گئے ہم صورتِ گردِ سفر آخر
کہاں تک ساتھ دیوانوں کا دیتی رہ گذر آخر

تری محفل کی خاطر، ربطِ ہر محفل سے توڑا تھا
یہاں سے اُٹھ کے اب جائیں تو ہم جائیں کدھر آخر

وہی دل ہے، وہی ہیں آرزوئے دل کے ہنگامے
کہاں سے لائیں تاباںؔ فرصتِ عرضِ ہنر آخر

رہِ طلب میں کسے آرزوئے منزل ہے
شعور ہو تو سفر خود سفر کا حاصل ہے

جہاں سے رکھتے ہیں ربطِ نیاز، رکھتے ہیں
جبیں جھکائیں ہر اک آستاں پہ مشکل ہے

جستجو ہو تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے
یوں تو ہر موڑ پہ منزل کا گماں ہوتا ہے

پھر بھی گُل حوصلۂ نشو و نما رکھتے ہیں
موسمِ رنگ اگرچہ گزراں ہوتا ہے

یہ مشورہ تھا خرد کا کہیں کے ہو جاؤ
بھروگے خاک اُڑاتے اِدھر اُدھر کب تک

جنوں کا درس مگر دل کو سازگار آیا
وہ دیر ہو کہ حرم، قیدِ بام و در کب تک

نہ جانے بادِ صبا کیا پیام لائی تھی
کہ پھول ہنس تو دیے پھر بھی مُنہ اُتر سا گیا

عشقِ آوارہ کہاں، قیدِ در و بام کہاں
بے نواؤں کے لیے سایۂ دیوار بہت

ایک دن وقت بتائے گا جنوں کی عظمت
یوں تو ہم لوگ ہیں رُسوا سرِ بازار بہت

تنہائیوں کی اب وہ حسیں محفلیں کہاں
دل سے کسی کی یاد بھی روٹھی ہوئی سی ہے

اُٹھنا تری محفل سے ابھی یاد ہے لیکن
پھر وقت گزارا تھا کہاں بھول گیا ہوں

نظر تو آتے ہیں صحرا میں زندگی کے نشاں
وہ کارواں نہ سہی کارواں کی گرد سہی

نصیب کچھ نہ ہوا دامنِ تہی کے سوا
ہزار بادِ صبا گلستاں نورد سہی

تم نے کب دیکھے وہ لمحے جو گزرتے ہی نہیں
درد کی رات کیسے کٹتے ہیں، تم کیا جانو

زخم بن جائے کبھی زخم کو مرہم بن جائے
راس آجائے تو کیا کیا نہ ترا غم بن جائے

محفلِ دوست میں چھلکے تو چھلکتا ہی رہے
جامِ مے آج مرا دیدۂ پُرنم بن جائے

عروجِ شوق کا موسم کہاں سے لاؤں میں
وہ ایک موج تھی دریا میں کھو گئی ہوگی

جدھر بھی جاؤ گے ٹوکیں گے شب کے سنّاٹے
کہاں کا قصد ہے، ہر راہ سو گئی ہوگی

نہ جانے کب مرے خوابوں کو جسم مل جائے
کوئی کمال مذاقِ ہنر سے دور نہیں

کبھی جلوہ جلوہ رُکی نظر، کبھی بام و در میں اُلجھ گئی
اُسے کون بادِ صبا کہے جو شجر شجر میں اُلجھ گئی

رہ و رسمِ شوق کی قید بھی بڑی خوشگوار سی قید تھی
مجھے یوں لگا کوئی شاخِ گل مرے بال و پر میں اُلجھ گئی

کوئی رنج ہے نہ ملال ہے، مجھے صرف اتنا خیال ہے
وہ عجیب دانشِ عصر تھی جو تلاشِ زر میں اُلجھ گئی

ہدفِ طنز کہ میں موردِ دشنام نہیں
پھر بھی خوش ہوں کہ ترے شہر میں گم نام نہیں

بات بھی کرتے ہیں فطرت کے مناظر تاباںؔ
چاندنی کیا ہے اگر چاند کا پیغام نہیں

آشوبِ روزگار کی تفسیر جانیے
حرفِ جنوں کو وقت کی تحریر جانیے

وہ حرفِ مدّعا جو زباں پر نہ آسکے
تاباںؔ اُسی کو حاصلِ تقریر جانیے

لذّتِ بیداد کے در خور کہاں تھا میرا شوق
دوستوں کی حوصلہ افزائیاں کہہ لیجیے

راستوں میں بے طرح اُلجھے ہوئے ہیں راستے
منزلیں کیا ہیں، قیاس آرائیاں کہہ لیجیے

مدّتوں کے بعد گہری نیند کا ٹوٹا طلسم
شورشوں کو، دہر کی انگڑائیاں کہہ لیجیے

حادثاتِ زندگی کی لاکھ تاویلیں، مگر
آپ میرے شوق کی پسپائیاں کہہ لیجیے

رہ گذر ہو یا مسافر، نیند جس کو آئے ہے
گرد کی میلی سی چادر اوڑھ کے سو جائے ہے

قربتیں ہی قربتیں ہیں، دوریاں ہی دوریاں
آرزو جادو کے صحرا میں مجھے دوڑائے ہے

میری آشفتہ سری وجہِ شناسائی ہوئی
مجھ سے ملنے روز کوئی حادثہ آجائے ہے

زندگی کی تلخیاں دیتی ہیں خوابوں کو جنم
تشنگی صحرا میں دریا کا سماں دکھلائے ہے

کھلیں کھلیں نہ کھلیں پھول دل کے صحرا میں
بڑی کشش ہے مگر انتظارِ فردا میں

خرد کے دور میں دیوانگی غنیمت ہے
بڑا سکون ملا شورشوں کی دُنیا میں

میں جی رہا ہوں کسی موجِ تہ نشیں کی طرح
مرے سکون کو تم اضطراب بھی سمجھو

نا امیدی سے جھلکتا رہے امّید کا رنگ
کون تھا جس نے یہ دلچسپ سزا دی ہے مجھے

میری آشفتہ سری ہے، میری آشفتہ سری
شہر کے دانش وروں سے لاکھ یارا نہ سہی

دہر میں تاباںؔ کی رسوائی کا باعث ہوئ
لاکھ فنِ شاعری فنِّ شریفانہ سہی

ہزار قربتیں جس میں ہوں، ایسی دوری کو
گریز کیسے کہوں اجتناب کیسے کہوں

مانا کہ عافیت ہے زندانِ بام و در میں
دیکھو تو رنگِ دُنیا گھر سے ذرا نکل کے

ہم بھی رفاقتوں کا خود کو فریب دے لیں
کچھ دیر ساتھ رہ کے، کچھ دُور ساتھ چل کے

مقصود ہے آسودگیِ ذوقِ تماشہ
یہ کس نے کہا حُسن کسی نام میں ڈھل جائے

اب کیا بتاؤں کیسے نظارے تھے راہ میں
ایسا لگا کہ عمرِ رواں بھی ٹھٹک گئی

اس دورِ کم خلوص میں کیا گفتگو کا لطف
الفاظ کے ہجوم میں گھٹنے لگا ہے دم

یوں تو سرمایۂ جاں ہے مجھے یاروں کا خلوص
دل دُکھا جاتی ہے ہر سعیِ کرم، کیا کیجے

چند لمحوں کو سہی، آتو گیا دل میں ملال
کُھل گیا دعویِ تمکیں کا بھرم، کیا کیجے

کون پا سکتا ہم آوارہ مزاجوں کا سُراغ
داستاں لکھتے گئے نقشِ قدم، کیا کیجے

اتفاقاتِ زمانہ ہیں، خزاں ہو کہ بہار
جو گزرنا ہے گزر جائے گی، غم کیا کیجے

بار بار انساں نے بُت نئے تراشے ہیں
کوئی دور ہو اس کو دورِ آذری کہہ دو

دیکھتے دیکھتے دُھندلا گئے منظر سارے
تیری زُلفوں کی طرح شام بکھرتی جائے

میں نے کب دعویِ الہام کیا ہے تاباںؔ
لکھ دیا کرتا ہوں جو دل پہ گزرتی جائے

میں کہ آوارہ کسی موجِ صبا کی صورت
مجھ سے منسوب کوئی راہ گذر بھی نہ ہوئی

دل کا کیا ذکر کہ معیار جُدا رکھتا ہے
مطمئن راہ کے جلووں سے نظر بھی نہ ہوئی

رات اُمڈی ہی چلی آتی ہے طوفاں کی طرح
بُجھ گئی درد کی قندیل بھی، اب کیا ہوگا

شیشہ نازک تھا، ذرا چوٹ لگی، ٹوٹ گیا
حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں، گِلا کیا کرتے

رات نے چھیڑ دیے بھولے ہوئے افسانے
جاگ کر صبح نہ کرتے تو بھلا کیا کرتے

تھی نہ کیا کیا ہوسِ سیر و تماشا، تاباںؔ
راستہ پاؤں کی زنجیر بنا، کیا کرتے

دامن ہو چاک اور مجالِ رفو نہ ہو
پھولوں کی طرح کوئی خرابِ نمو نہ ہو

محرومیوں کا ٹوٹ نہ جائے کہیں غرور
دل تیرے دورِ لطف میں بے آبرو نہ ہو

دل یوں بھی بے نیازِ کرم ہائے دوست تھا
کھا کر شکست اور بھی مغرور ہوگیا

دستِ طلب سے دور نہ تھا دامنِ کرم
لیکن میں پاسِ وضع سے مجبور ہوگیا

تمھی بتاؤ پکارا ہے بار بار کسے
عزیز رکھتے ہیں غم ہائے روزگار کسے

نسیمِ صبح کا غنچوں کو انتظار سہی
ہوائے دشت ہوں میں، میرا انتظار کسے

جراحتوں کے خزانے لُٹا دیے تاباںؔ
کیا ہے راہ کے کانٹوں نے اتنا پیار کسے

کون ہے جس کو مصیبت میں پکارا جائے
شہر تو کیا در و دیوار کا جنگل سا لگے

ذرا سی بات کی احباب سے شکایت کیوں
ہوا کے رُخ کی شہادت تھی بے رُخی کیا تھی

دوست بن کے دل میں آئی تھی سکوں کی آرزو
کس نے سوچا تھا کہ سب رونق چُرا لے جائے گی

شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتّوں کی آخر کیا بساط
جس طرف چاہے گی جنگل کی ہوا لے جائے گی

راس آئے یا نہ آئے مصلحت کی زندگی
دربدر رسوا کرے گی جا بجا لے جائے گی

چار تنکوں کی کسے فکر، رہیں یا نہ رہیں
ضمنِ گلشن میں مگر رقصِ شرر تو ہوگا

اگلے وقتوں سے یہی رسم چلی آتی ہے
شوق میں جی کا زیاں جاں کا ضرر تو ہوگا

اور کیا دامنِ صحرا میں ہے وسعت کے سوا
کوئی منظر سہی تا حدِّ نظر تو ہوگا

مشورہ دل کا ہے ہر تہمت گوارا کیجیے
ورنہ ہونٹوں کو ابھی یارائے گویائی بھی ہے

کیوں اکیلا جان کر تاباںؔ ترس کھاتے ہیں لوگ
میں کہیں جاؤں، مرے ہمراہ رسوائی بھی ہے

کوئی بھی موسم ہو اذنِ لب کشائی تو ملے
اک ذرا سی مہلتِ نغمہ سرائی تو ملے

سُنے گا کون ہماری، کہیں تو کس سے کہیں
کہ گردِ راہ دلیلِ سفر نہیں ہوتی

دریا تھا یا سراب دُھندلکوں میں کھو گیا
اک آسرا تھا وہ بھی سرِ شام سو گیا

پھر یوں ہوا کہ پھول کھلے دل کے آس پاس
ایسا لگا کہ دشت چمن زار ہوگیا

دیوار و در پہ لکھی ہیں کیا کیا کہانیاں
صدیوں کا درد شہر کی پہچان ہوگیا

تاباںؔ شراب خانے میں کچھ روشنی تو ہے
مسجد بھی سوگئی ہے، شوالا بھی سوگیا

پھر آج کسی سوچ میں ڈوبے ہیں در و بام
کیا جانیے کیا حادثہ بستی میں ہوا ہے

دیوار کا سایا نہ کسی پیڑ کا سایہ
صحرا کی کڑی دھوپ میں کچھ اور مزا ہے

وہ دن بھی آگیا ہر ہاتھ میں پتھر نظر آیا
بڑی مدت میں دیوانوں کو جینے کا ہنر آیا

یہ میخانہ ہے، پند و وعظ کی محفل نہیں زاہد
نہ کوئی راہ سے بھٹکا نہ کوئی راہ پر آیا

دل ہے تو وہی شوق کے انداز بھی ہوں گے
وحشت ہے تو صحرا کی طلب گار بھی ہوگی

بن پڑے جیسے بھی بستی میں گزارا کیجیے
اور کچھ دن قیدِ بام و در گوارا کیجیے

قربتوں میں دوریاں ہیں دوریوں میں قربتیں
کس کو اپنا جانیے کس سے کنارا کیجیے

کس نے کہا کہ جانبِ صحرا نہ جائیے
دیوار و در کا قرض تو پہلے چکائیے

یاروں کا التفات فراواں ہے ان دنوں
پتھر برس رہے ہیں ذرا سر بچائیے

اچھی سہی خراب سہی زندگی تو ہے
جیسے بنے یہ بارِ امانت اٹھائیے

دل کا معاملہ ہے ہوائے جنوں کے ساتھ
دامن بچائیے کہ گریباں بچائیے

عافیت سفینوں کی سیلِ آب میں معلوم
بات یہ ہے کچھ مانجھی سر پھرے بھی ہوتے ہیں

شہرِ آشنائی کی ریت کچھ نرالی ہے
قربتوں کے پیمانے فاصلے بھی ہوتے ہیں

گردِ رہگذر تاباںؔ ننگِ رہگذر کیوں ہو
گرد میں چھپے اکثر قافلے بھی ہوتے ہیں

قیدِ مکاں بھی، بے سرو سامانیاں بھی ہیں
دشواریوں کے ساتھ کچھ آسانیاں بھی ہیں

ساحل تمام دامنِ نادار کی طرح
دریا میں کشتیاں بھی ہیں طغیانیاں بھی ہیں

موجِ نشاط، موجِ صبا، موجِ گل کے ساتھ
موسم کی دین سوختہ سامانیاں بھی ہیں

تاباںؔ نویدِ غم کسی عنوان چاہیے
دل کو قبول لاکھ پریشانیاں بھی ہیں

رائگاں مشغلۂ کوچہ نوردی نہ گیا
دامنِ شوق کو کچھ گردِ ملامت تو ملی

زلف کی چھاؤں کہ دیوار کا سایہ کچھ تھا
دو گھڑی راہ میں دم لینے کی فرصت تو ملی

جہاں بھی ہوں گے اجالے لٹا رہے ہوں گے
یہ کیا ضرور چراغوں کو انجمن بھی ملے

کسے خبر ہے کہ تاریکیوں کے صحرا میں
کہیں بھٹکتی کوئی صبح کی کرن بھی ملے

اِدھر یہ حال کہ ہر آن بڑھ رہا ہے مرض
اُدھر دوا نہ دعا چارہ گر کے دامن میں

فلک نے جیسے خزانے لٹا دیے تاباںؔ
گرے تھے ڈھیر سے موتی سحر کے دامن میں

بات ہے اتنی نام بڑا ہے رنگ و بو کے موسم کا
یوں تو صحنِ باغ میں غنچے چٹکے بھی مرجھائے بھی

وہ حرفِ شوق جسے نطق کا بھرم کہیے
زباں پہ آکے بہت شرمسار ہوتا ہے

گلوں کی رت ہو کہ برق و شرر کا موسم ہو
کہیں سے تیر چلے دل شکار ہوتا ہے

——— انتخاب: مخمور سعیدی

دو نظمیں

جیل میں کسی کا خط پاکر

فصلِ بہار میں بھی اسیرِ قفس ہوں میں
گلزار کی فضا کو مرا انتظار ہے
رنگِ فریب کوش کو ہے میری جستجو
بوئے گریز پا کو مرا انتظار ہے
تکتے ہیں میری راہ خیابانِ کیف خیز
دشتِ جنوں فزا کو مرا انتظار ہے
جیسے فسردہ ہوگئی بزمِ صدا و ساز
یارانِ خوش نوا کو مرا انتظار ہے
سونے پڑے ہیں منبر و محرابِ مے کدہ
رندانِ باصفا کو مرا انتظار ہے
اے دوست غم کے گہرے اندھیرے میں آج بھی
اک اخترِ وفا کو مرا انتظار ہے
یہ اور بات ہے کہ وہ منہ سے نہ کہہ سکے
اُس پیکرِ حیا کو مرا انتظار ہے
ہیں میرے انتظار میں گیسوئے شام خیز
چشمِ سحر نما کو مرا انتظار ہے
اب بھی کھلا ہے بابِ ارم میرے واسطے
اب بھی مرے خدا کو مرا انتظار ہے

چاند اور مَیں

دلِ شاعر کی طرح چاند بھی ویران سہی
چاندنی اب بھی شبِ غم کو نکھارے گی ضرور
رات بھیگے گی تو مہکی ہوئی پُر نور فضا
ایک بے نام سا میخانہ سنوارے گی ضرور
چودھویں رات میں یادوں کی سجے گی محفل
آرزو عہدِ گذشتہ کو پکارے گی ضرور

چاند کی چھاؤں میں دل اب بھی خوشی پائے گا
چاندنی رات میں ارمان کھلیں گے اب بھی
جلوۂ ماہ سے بڑھ جائے گی دل کی دھڑکن
لب پہ اُس شوخ کے پیمان کھلیں گے اب بھی
روح کے زخم کسی باغ کے پھولوں کی طرح
نور برسے گا تو ہر آن کھلیں گے اب بھی

چاند سے اب بھی مرے دل کو وہی ہے نسبت
چاندنی رات میں کچھ درد سوا ہوتا ہے
جگمگاتے ہوئے لمحات میں پاتا ہے فروغ
جذبۂ شوق کہ پابندِ وفا ہوتا ہے
چاند کی سطح پہ ہوتا ہے نگاہوں کا وصال
اُن کی دوری میں بھی قربت کا مزا ہوتا ہے
چاند سے اب نہ حکایت نہ فسوں کا رشتہ
چاند صحرا ہے تو ظاہر ہے جنوں کا رشتہ

نئی مطبوعات

تلاشِ بصیرت

مصنف اور ناشر: ساجدہ زیدی

صفحات: ۱۷۸

قیمت: ۶۰ روپے

ملنے کا پتا: نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸ (یو۔پی)

پروفیسر ساجدہ زیدی کے تنقیدی مضامین کے اس مجموعے کا میں نے بڑے تپاک سے ساتھ استقبال کیا کہ یہ تنقیدی کاوشیں ایک فن کار نے پیش کی ہیں۔ میں تخلیق کار کو ہی تنقید کا سچا وارث سمجھتا ہوں۔ یہ بات کسی حد تک صحیح ہے کہ ایک تنقید نگار فن کار کے محسوسات و محرکات کو سمجھنے میں کسی قدر کامیابی حاصل کر لیتا ہے لیکن تخلیق کے پیچھے کرب سے صرف فن کار ہی پورے طور پر واقف ہو سکتا ہے۔ پھر الفاظ کی قدر و قیمت کا اندازہ جس طرح فنکار لگا سکتا ہے ناقد محض کے لیے ممکن نہیں۔

ساجدہ زیدی کی تخلیقی شخصیت کئی روشوں سے آشکار ہے، ناول نویس، ڈرامانگار اور شاعرہ۔ پُرشور شعری اظہارات کو انھوں نے فکر، نظر اور فلسفہ و ادراک کی لگام لگا کر ایک مخصوص لہجہ اپنایا ہے۔ ان کی شاعری کی زیریں احساسی لہر ایک متوازن فلسفیانہ آہنگ کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی قلب و نظر کو بھی شکار کرتی ہے اور ہوش خرد کو بھی۔

ساجدہ زیدی کی تخلیقی شخصیت کے انعکاسات ان کی تنقید میں بھی موجود ہیں۔ "تلاشِ بصیرت" کے مقالات اس دعوے کی دلیل ہیں۔ پیشِ نظر مجموعے میں اگرچہ چند تجزیاتی مقالات بھی ہیں لیکن نظریاتی تنقید سے متعلق مقالات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ تخلیق کے درمیان اٹھنے والے سوالات اور پھر ان سے پیدا ہونے والے نفسیاتی امور کی طرف ان کی خصوصی توجہ ہے۔ تجزیاتی تنقید کے ضمن میں آنے والے مقالات بھی محض عملی تنقید کے جامد طریقۂ عمل کے غماز نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں بھی جگہ جگہ تنقید نگار کے فکر و نظر کی شعاعیں روشن ہیں۔

ساجدہ زیدی نے اقبال سے بہت کچھ پایا ہے۔ زندگی کی سچائیوں کو سمجھنے، آرٹ کے مقاصد اعلیٰ کے حصول اور ادب اور زندگی کے رشتوں کی تفہیم میں جگہ جگہ اقبال ان کی رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ جھکاؤ ہو سکتا ہے ان کا غیر شعوری اور اضطراری عمل ہو اور وہ خود اس کی معترف نہ ہوں لیکن میرا تجزیہ مجھے اسی نتیجے تک پہنچاتا ہے۔ اقبال کی فکری و فلسفیانہ پہنائیوں کو سمیٹنا کسی ایک فرد کا کام نہیں ہے۔ وہ ایک بڑے عہد پر محیط ہیں اس لیے اقبال سے کچھ لینے والے بھی اس کے اجزا ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ بہتوں کے لیے یہ اجزا بھی اتنے بارگراں ہوتے ہیں کہ وہ انھیں سنبھال نہیں سکتے۔ ساجدہ زیدی نے اپنے عہد کی تفہیم، آرٹ کی جمالیات اور فن پاروں کی عصری معنویت کو تاریخ کے تناظر میں سمجھنا چاہا ہے اور اسی لیے انھیں اقبال سے مدد لینی پڑی ہے۔

فکشن اور شاعری کی تنقید و تفہیم سے متعلق ساجدہ زیدی کے دو مقالات بعنوان "اردو فکشن کی تنقید اور اس کے تناظرات" اور "تخلیق شعر اور ہم عصر اردو شاعری" خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اس بات سے بددل ہیں کہ ہمارے ناقدین نے فارمولا تراشی کو ادب کا منصب سمجھ لیا ہے۔ کچھ آگے بڑھ کر ناقدین نظریہ سازی کو منزلِ آخر سمجھ بیٹھے ہیں لیکن فلسفے کی یافت اور دریافت ان کا مطمع نظر نہیں رہا ہے حالاں کہ ادب کا وسیع ترین تناظر اسی نقطے پر نظر آتا ہے۔ وہ فلسفہ اور ادب کی مماثلت پر مصر ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

"اپنے عصر کے جن رجحانات اور تقاضوں کو فلسفہ عملی سطح پر مرتب کرتا ہے اسی

روح کو بیک وقت ادب عرفانی سطح پر پیش کرتا ہے۔"

یہاں اس کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ فلسفے کی جس سطح اور منزل کی وہ بات کرتی ہیں وہ نہیں ہے جس سے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مدنی نظریات مترشح ہوتے ہیں بلکہ ادب کی منزل وہ فلسفیانہ بلندی ہے جہاں روحانی ترفع اور لطیف ترین حسی شعور یا یوں کہیے کہ ETHE-RICAL SENSIBILITY- کا حصول ہو سکے۔

"تخلیق شعر اور ہم عصر اردو شاعری" میں ساجدہ زیدی نے تخلیقی عمل کا کامیاب تجزیہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ معروضیت اور موضوعیت کے مناقشے، تخلیقی عمل میں ذات اور کائنات کے ربط و تناسب، نئی جدیدیت، تخلیقی اجتہاد، تخلیقی تنہاروی، ترسیل و ابلاغ نیز زبان و بیان اور تخلیق کے رشتے — جیسے مسائل پر کھلے دل سے گفتگو کی ہے۔ عام تنقید نگاروں کی طرح انھوں نے اپنے تصورات کو مشرق و مغرب کے اربابِ فکر و نظر کے اقوال سے ثابت کرنے کی بجائے اپنی تنقید کو اپنی تخلیقی شخصیت سے ہم رشتہ کرتے ہوئے محسوسات و تصورات کی دوئی ختم کرکے ایک نئی تنقیدی فضا بنائی ہے۔

مقالہ "اقبال کی شاعری میں وجودی تصورات" میں ان کا زورِ بیان، استدلال، اور علمی محاکمہ زیادہ واضح ہے۔ اپنے ذہنی اور علمی تشخص میں وہ وجودیت، انسانی علو، اجتماعیت اور انفرادیت کے تناسب، عقل و عرفان کی پیکار میں عشق و عرفان کی بالادستی، عقلیت پرستی کے منفی آثار، عشق، انا، حرکت و تفاعل اور اس طرح کے جن عوامل کی پہچان دیتی ہیں ان کا منبع کہیں نہ کہیں اقبال کے فکری نظام سے علاقہ رکھتا ہے۔ اس طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ساجدہ زیدی کی تنقید مشرق و مغرب کے تنقید نگاروں کے کلیات و کلمات کی اسیر نہیں ہے بلکہ تخلیقی سالمات پر مبنی ہے۔ ناقدِ محض اور تخلیق کار ناقد میں یہی فرق ہوتا ہے۔

—— **علیم اللہ حالی**

وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

دریا رواں رہے

شاعر: حیات لکھنوی
صفحات: ۱۱۲
قیمت: ۵۰ روپے
ملنے کے پتے: (۱) محمد ظفر، ۵۔ امامیہ ہال، پنچکوئیاں روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
(۲) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
(۳) انجمن ترقی اردو (ہند)، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

حیات لکھنوی بڑے باپ (حضرت عزیز لکھنوی مرحوم) کے بیٹے ہیں۔ لکھنوی تہذیب و تمدن کے پروردہ ہیں۔ عرصے سے دہلی میں مقیم ہیں۔ کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ زبان و بیان پر قدرت رکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ دیگر اصنافِ سخن پر بھی استادانہ گرفت رکھتے ہیں۔ غزل کی روایت کے صحت مند عناصر کے ساتھ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے بھی باخبر ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے شعر کا DICTION بھی وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مجموعے کا نام — دریا رواں رہے — تمنائی بھی ہے دعائیہ بھی۔ دوسرے الفاظ میں فکر و فن اور شعر و ادب کا یہ دریا اسی طرح رواں دواں رہے۔ اس کے سوتے خشک نہ ہوں۔ اور ظاہر ہے ہر شاعر و فنکار کی یہ تمنا ہوتی ہے، یہی دعا ہوتی ہے۔ یہ دریا حیات لکھنوی کے فکر و فن اور شعر و نغمہ کی ہ علامت نہیں، وسیع تر معنوں میں یہ زندگی کا دریا ہے۔ اس دریا کی روانی تسلسلِ حیات کی بھی علامت ہے۔

"دریا رواں رہے" کا مقدمہ "آگہی نغمہ سرا" کے عنوان سے پروفیسر قمر رئیس کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے جو مختصر مگر جامع ہے۔ کمار پاشی نے حیات لکھنوی کو "خوشبو کا محافظ" شا قرار دیا تھا۔ قمر رئیس نے خوشبو کے علاوہ آ روشنی اور سورج کی علامتوں کی نشان دہ کرکے حیات کے رنگِ شاعری کو اجاگر کیا ہے حقیقت میں یہ رنگ اس دریا کی ترنگیں ہیں موجیں ہیں جو ابھرتی ہیں اور ڈوب جاتی ہیں اور پھر کروٹ بدلتی ہیں اور جھلملاتی ہوئی لہر ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ موجوں کے یہ رنگا تھپیڑے روانیِ دریا کا پتا دیتے ہیں۔ شا نے خوب کہا ہے کہ:

جو زندگی کی جھلک ایک ہو بیاں کردوں
ہزار رنگ تو اس کی ادا میں رکھے تھے

حیات لکھنوی اپنا "مقصد برائے فن" ان الفا میں بیان کرتے ہیں:

جو میرے دل پہ گزر جائے، وہ بیاں کردوں
حیات ہے یہی مقصد برائے فن میرا

در پردہ شاعر نے اہلِ دل ہونے کا اعلان کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غموں کے عکس بھی حسو بیان کی لطافتوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ نقطہ

نظر کیجیے :

حیاتؔ حسنِ بیاں کی لطافتوں میں ڈھلے
غموں کے عکس جو حرف و نوا میں رکھے تھے

یم مشکل و گرنہ گویم مشکل" کی کیفیت ذیل کے ار میں دیکھیے :

میں چُپ رہا تو زمانے کے طنز تھے مجھ پر
زبان کھولی تو بل پڑ گئے جبینوں پر

زباں کھولوں تو چنگاریاں فضا میں اُڑیں
جو چُپ رہوں تو سُلگنے لگے بدن میرا

ت لکھنوی نے "دریا رواں رہے" کا آغاز اس یہ شعر سے کیا ہے :

میری کشتی ہے تیرے حوالے خدا
ڈوبتا جا رہا ہوں بچالے خدا

وعے میں جگہ جگہ ایسے اشعار بھی مل تے ہیں :

یہ سمندر اسی کا ہوتا ہے
جس سفینے میں کچھ روانی ہو

سمندروں کا سفر ہے گزر کے جائے کہاں؟
کوئی بھی سطح سے اپنی اُبھر کے جائے کہاں؟

یہ زندگی کا سمندر تو پار ہو جائے
مگر کسی کو بھروسا نہیں سفینوں پر

جو بحرِ غم کے تھپیڑوں سے ہمکنار ہوا
وہ زندگی کا سفینہ ندی کے پار ہوا

ل میں سمندر اور دریا دو نہیں، ایک ہی یقت کے دو رُوپ ہیں۔ دریا بہتا نظر آتا ، سمندر کی روانی دکھائی نہیں دیتی۔ دریا روانی زمین پر ہے، سمندر کی آسمان پر۔ ندر بھی بہہ رہا ہے۔ وہ ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر آسمان کی پہنائیوں میں سفر کرتا ہے۔ سمندر ہی دریا کے منبع تک پہنچتا ہے اور جب زمین پر اُترتا ہے تو دریا کا رُوپ دھار لیتا ہے۔ اس طرح ایک مکمّل دائرہ بن جاتا ہے، جو دریا کی روانی میں مادّی اور سمندر کی روانی میں روحانی ہوتا ہے اور جو تسلسل کو قائم رکھتا ہے۔ تسلسل وحدت کا ہی دوسرا نام ہے۔ یہی تسلسل کثرت کی زنگارنگی سے گزرتا ہوا، حیات و کائنات کو محیط ہو جاتا ہے۔ حیاتؔ کے اس مقطعے کی معنویت پر غور کیجیے :

سارا کلام اس کے حوالے ہوا حیاتؔ
جس کا وجود خود بھی مکمّل کتاب تھا

مجموعے میں ۲۳ نظمیں ہیں، جن پر حیاتؔ نے اپنی مہر ثبت کر دی ہے۔ تغزل کی کارفرمائی یہاں بھی ملتی ہے۔ یہ نظمیں شاعر کے دل و ذہن پر مسلّط مختلف کیفیات کی غمّازی کرتی ہیں۔

چھ نظمیں اور "رفتید و لے نہ از دلِ ما" کے تحت ہیں۔ یہ رثائی نظمیں ہیں جو شخصی مرثیے کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان میں دل گداختگی اور نم دیدگی کی کیفیت بدرجۂ اتم ہے۔

—— جاوید وشِشٹ

وشِشٹ آشرم، فتح پور بلوچ، فرید آباد (ہریانہ)

نقشِ جاوداں

شاعر : تابشؔ امروہوی
صفحات : ۱۵۲
قیمت : ۲۵ روپے
ملنے کا پتا: شاکر علی جنرل مرچنٹ، بازار شفاعت پوتہ، امروہہ (یوپی)

"نقشِ جاوداں" کئی ذیلی عنوانات پر مشتمل ایک مسلسل نظم ہے جسے منظوم واقعہ نگاری کا اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ حمدِ خالقِ کائنات نبی کریمؐ اور صحابہؓ کے مراتب کا ذکر کرنے کے بعد شاعر عرضِ مدعا کرتا ہوا سیّد الشہدا کی سیرت و سوانح کو اس احتیاط سے شعری پیکر دیتا ہے جو موضوع اور فن کا تقاضا ہے۔ فکری افراط و تفریط سے دامن کشی اور مبالغہ آمیزی سے بچنے کی شعوری کوشش اس نظم کی ایک بڑی خوبی ہے۔

نظم میں سلاست و روانی کی فراوانی ہے۔ اور یہ شاعر کی وسعتِ مطالعہ، شعر گوئی کی مشق و مہارت اور موضوع سے مخلصانہ جذباتی لگاؤ کا پتا دیتی ہے۔

کئی سال قبل ایک کتاب کی تقریظ میں راقم الحروف نے لکھا تھا "واقعۂ کربلا دراصل رسولِ خدا کے پیغامات پر عمل درآمد کا ایک واضح اور روشن ترین نمونہ ہے۔ حسینؓ کا عمل خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹانے کی تلقین کے علاوہ سر کٹے تو نماز میں کٹے کا درسِ عظیم دیتا ہے۔" تابشؔ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس نظم میں واقعۂ کربلا کو آہ و بکا کا ذریعہ نہ بنا کر حسینی عمل کی راہ دکھائی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس فانی دنیا میں ایسی بہت سی شخصیتیں بھیجیں جو اپنے صالح اعمال، پاکیزہ افکار اور دیگر خوبیوں کے سبب دنیا سے اُٹھ جانے کے باوجود آج بھی زندہ اور مشعلِ ہدایت بن کر روشن ہیں۔ ان ہستیوں کی تعریف و توصیف نیز ان کی مبارک زندگیوں کا ذکر اگر شاعری کے وسیلے سے کیا جا رہا ہو تو اعتدال و توازن کا دامن اکثر چھوٹ چھوٹ

جاتا ہے لیکن تابش نے اپنی اس نظم کے ذریعے یہ بتا دیا ہے کہ شرعی حدود کا پاس و لحاظ پیشِ نظر ہے اور شعری اظہار کا ادراک ہو تو مبالغہ آرائی کے بغیر بھی متعلقہ شخصیتوں کے مبارک عمل اور قابلِ رشک صفات کی عکاسی کی جاسکتی ہے۔

—— عطا عابدی

۱۵۳/۲۲۔ ای، ذاکر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

رباب صحرا

شاعر : ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی

صفحات : ۱۱۲

قیمت : ۵۰ روپے

ناشر : توازن پبلیکیشنز، ۴۵۴، نیا پورہ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳

حنیف ترین کو شاعری کے میدان میں قدم رکھے ہوئے چھ سات سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا ہے، لیکن اس قلیل مدت میں ہی انھوں نے اپنا اولین شعری مجموعہ پیش کرکے ادب سے اپنی گہری دلچسپی کا واضح ثبوت دے دیا ہے۔

حنیف ترین بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اس مجموعے میں غزل کے سوا کسی اور صنفِ شاعری کا موجود نہ ہونا اسی کی نشاندہی کرتا ہے۔

حنیف ترین کے یہاں تجربوں کی گوناگونی نظر آتی ہے۔ ان تجربوں میں تہہ داری پیدا کرنا ان کا خاص وصف ہے اور بعض اوقات جب وہ خالص علامتی لہجہ اختیار کرتے ہیں تو ایسے اچھوتے شعر نکالتے ہیں کہ پیچ در پیچ معنی کی تہوں کو کھول کر دیکھنے سے ایک بالکل ہی نئی کائنات کا دیدار ہوتا ہے:

دیے کی روشنی سورج کے کام آئے گی
ہوا کے قتل کا جس روز فیصلہ ہوگا

بوسیدہ اچکنوں میں چھپی آن بان ہوں
میں بھی کسی عروج کا مٹتا نشان ہوں

زخمی ہے نیند کس لیے چمکیلے خواب سے
ہر رات دن کے خون سے کیوں تر ہے اندلوں

رنگوں کے رنگین جنوں میں چل کر حد سے پار نکل
لطف سوا ہو جاتا ہے جب درد کی دھار نکیلی ہو

حنیف ترین کہیں کہیں اپنی ہمت اور بے باکی کا مظاہرہ کھلے عام کرتے ہیں اس قسم کے اشعار بلاشبہ ایک ایسے میلان کو انگیخت کرتے ہیں جو موجودہ وقت کا تقاضہ ہے:

کوئی بھی شے یہاں مانگے سے کب ملے گی حنیف
جو تیرا حق ہے اسے چھین، کیوں جھجکتا ہے

حنیف ترین نے اپنی شاعری میں عام فہم الفاظ کو علامتوں اور استعاروں کے طور پر برتنے کی کوشش کی ہے۔ بظاہر معمولی سے یہ الفاظ کافی وسیع کینوس رکھتے ہیں:

زمیں سے جس کو میں لایا فلک کی منزل تک
مرا وجود اسی آنکھ میں کھٹکتا ہے

دل کی ڈالی پہ آرزو اس کی
پنچھیوں کی طرح چہکتی ہے

روایتی موضوعات کو جدیدیت کا جامہ پہنانے میں حالاں کہ حنیف ترین پوری طرح کامیاب دکھائی نہیں دیتے اور بعض جگہ ایسا ہوا ہے کہ معنی و مفہوم کی وضاحت کے لیے الفاظ ساتھ چھوڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ پھر بھی شاعر کی اس کوشش پر داد ملنی چاہیے کیونکہ مستقبل میں اس کے ذریعے خوش آئند امکانات روشن ہوں گے۔

مجموعے کا گٹ اپ عمدہ ہے۔ آغاز میں حنیف ترین کی شاعری سے متعلق نثار احمد فاروقی، حامدی کاشمیری اور مصور سبزواری کے مضامین ہیں۔

—— راشد انور راشد

۱۳۔ بی، جھیلم ہاسٹل، جے۔ این۔ یو، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

اتر پردیش میں اردو افسانہ: افسانہ نگاروں کی نظر میں

مصنف : ڈاکٹر عبید اللہ چودھری

صفحات : ۱۸۲

قیمت : ۴۰ روپے

ملنے کا پتا : نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ امین آباد، لکھنؤ (یو۔پی)

زیر تبصرہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے خاصی دلچسپ ہے۔ مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب میں وہ اطلاعات و تاثرات جمع کیے گئے ہیں جنھیں مصنف اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈگری کے مقالے "یو۔پی میں اردو افسانہ ۱۹۶۰ء کے بعد" میں شامل نہ کرسکے۔ اس کتاب میں بزرگ افسانہ نگار رام لعل سے لے کر اقبال مجید، نیر مسعود، علی امام نقوی اور محسن خاں تک یو۔پی کے ۳۲

نگاروں کا مختصر ذکر ہے۔ ہر افسانہ نگار
وری کوائف، اہم افسانوں کی نشاندہی اور
نگاری کے انفرادی رجحان کو دو سے چار
ت میں بیان کیا گیا ہے۔ آخری باب کتاب ہیں
افسانہ نگاروں کے ان جوابات پر مشتمل ہے
نف کے مقررہ سوالنامے کی روسے خود شمولہ
نگاروں نے لکھے ہیں۔ سوالنامے میں افسانہ
کے نام، ولدیت، تاریخ پیدائش، پہلا افسانہ
کب اور کہاں شائع ہوا، اپنے افسانوں میں کون سا افسانہ سب سے زیادہ پسند ہے، کن پیش رو یا ہمعصر افسانہ نگاروں سے متاثر ہوئے اور اُردو افسانے کا مستقبل کیسا ہے... وغیرہ سوالات شامل ہیں۔ یہ باب اس لیے سب سے اہم ہے کیوں کہ اپنے سوانحی کوائف کے سلسلے میں خود متعلقہ افسانہ نگار نے معلومات فراہم کی ہیں اور اس طرح محققین کا کام آسان ہوگیا ہے۔

یہ کتاب یو۔پی کی معاصر افسانہ نگاری کی بابت مرکزی رجحانات، میلانات اور فنی رموز پر روشنی نہیں ڈالتی لیکن یو۔پی کے معاصر افسانہ نگاروں کا مختصر اشاریہ ضرور پیش کرتی ہے۔ کتابت، طباعت عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔

—— ارشد عبدالحمید

اُستاد شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، اجمیر ۳۰۵۰۰۱

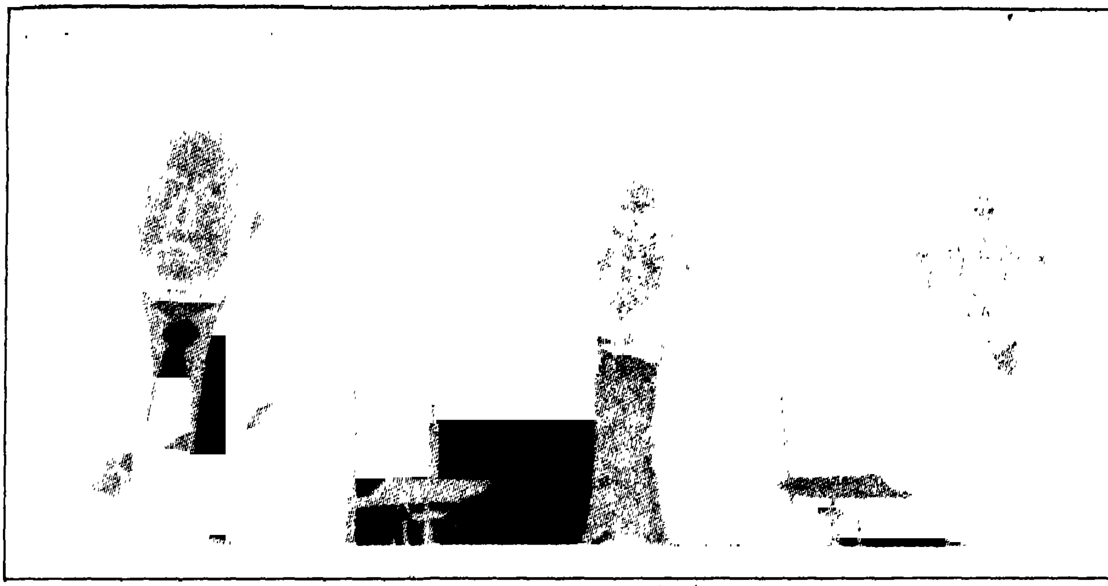
اُردو خبرنامہ

اُردو اکادمی، دہلی
ہونہار طلبا کی خدمت میں
تعلیمی مقابلوں اور انعامات کی
سہ روزہ تقاریب

اُردو اکادمی، دہلی کی طرف سے ہونہار طلبا کے لیے تقسیم وظائف و انعامات کی سہ روزہ تقاریب ۱۷ فروری ۹۳ء سے ۱۹ فروری ۹۳ء تک پیارے لال بھون، نئی دہلی میں کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئیں۔ ان تقاریب میں ۱۷ فروری کو درجہ ۴، ۶، ۸ اور ۱۰ میں اُردو کے ساتھ ایک مضمون میں اپنے اپنے اسکولوں میں اوّل آنے والے بچوں اور بچیوں کو علی الترتیب ۴۰، ۵۰، ۶۰ اور ۷۰ روپے ماہانہ کے حساب سے دو، دو سال تک کے لیے وظائف جاری کیے گئے۔ جن کی کُل رقم جاریہ مالی سال میں ایک لاکھ، ایک ہزار، چھ سو، چالیس روپے بنتی ہے۔ اسی طرح دوسرے دن ۱۸ فروری کو درجہ ۷، ۹ اور ۱۱ میں اوّل آنے والے اُردو طلبا کو فی طالب علم ۲۰۰ روپے کے حساب سے تیرہ ہزار، آٹھ سو روپے تقسیم کیے گئے۔ اور آخری امتحانات میں ٹاپرز یعنی فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے طلبا میں ایم۔ اے۔ کے ٹاپر میں فرسٹ پوزیشن والے کو مبلغ ۱۵۰۰ رو دوسری پوزیشن والے کو ایک ہزار روپے ا تیسری پوزیشن پر ساڑھے سات سو روپے انعام دیا گیا۔ بی۔ اے۔ آنرز یا پاس کورس کے پوزیشن ہولڈر طلبا کو علی الترتیب ایک ہ ساڑھے سات سو اور چھ سو روپے کے انعا دیے گئے۔ سینیئر سکنڈری، اور خود اُردو اکا



دائیں سے: جناب ہارون انور عارفی، محترمہ نورجہاں ثروت اور ایس۔ اشتیاق عابدی



دائیں سے : سیّد شریف الحسن نقوی، پروفیسر اسلم پرویز اور جناب آصف عابدی

...سے دہلی انتظامیہ کے ملازمین کے لیے چلائے ...اردو سرٹیفکٹ کورس، نیز ٹائپ اور ...ہنڈ کورسز میں پہلی تین پوزیشن پانے ...لبا کو علی الترتیب ۷۵۰، ۶۰۰ اور

۴۵۰ روپے کے انعامات دیے گئے۔ سکنڈری امتحان والوں کے لیے انعامات کی رقم ۶۰۰، ۴۵۰ اور ۳۰۰ روپے تھی۔ ایسے کُل ۴۱ انعامات کی مجموعی رقم ۲۹۹۵۰ روپے تھی۔ ۱۹ فروری کو

تیسرے اور آخری دن کی پہلی تقریب میں پرائمری زمرے کے تعلیمی اور کلچرل مقابلوں میں گیارہ ٹیم انعامات اور ۳۴ انفرادی انعامات۔ مڈل زمرے میں ۲۵ ٹیم انعامات اور ۵۱ انفرادی



وظائف اور انعامات پانے والوں کا ایک گروپ



اسکول کی بچیاں قوالی کا پروگرام پیش کر رہی ہیں

انعامات سہ پہری تقریب میں سکنڈری اور سینیئر سکنڈری زمروں میں ۴۳ ٹیم اور ۷۷ انفرادی گویا کل ۲۳۲ انعامات کی صورت میں کل ۷۸۵۰ روپے دیے گئے۔ اس طرح ان تین روزہ انعامی تقاریب میں کل دو لاکھ ۲۳ ہزار ۷ سو چالیس روپے کے انعامات، شیلڈ اور اسناد تقسیم کی گئیں جو اب تک اکادمی کا سب سے بڑا ریکارڈ ہے۔ آخری تقریب میں اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے اکادمی کے سیکریٹری پروفیسر اشتیاق عابدی نے بتایا کہ اس سال سے ٹیم کے انعامات کی رقم پہلے کے مقابلے دوگنی کر دی گئی اور آئندہ سال اس کی بھی کوشش ہوگی کہ مقابلوں میں مدرسوں اور دوسرے تعلیمی اداروں کو بھی شامل کرنے کے علاوہ نئے میدانوں مثلاً طنز و مزاح، تیز فہمی اور کچھ کھیلوں کو بھی شامل کیا جائے۔ ان چھ تقاریب میں علی الترتیب جناب ہارون انور عارفی ڈائرکٹر تعلیمات میونسپل کارپوریشن دہلی، جناب شکتی سنہا ڈائرکٹر تعلیمات دہلی انتظامیہ، ڈاکٹر آصف عابدی ڈائرکٹر سمندریات، جناب پی۔ ایم۔ نائر سیکریٹری تعلیمات دہلی انتظامیہ، سردار دلیپ سنگھ وزارت خارجہ اور جناب مکل واسنک ریاستی مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل مہمانِ خصوصی تھے۔ صدارت کے فرائض جناب ایس۔ آر۔ ہاشم، پروفیسر اسلم پرویز، مسز نور جہاں ثروت، جنابِ منصور عثمانی اور جامعہ ہمدرد کے پروفیسر سردار یار خاں نے انجام دیے۔ ہر تقریب کے بعد اُسی زُمرے کے بچوں اور بچیوں نے خوبصورت کلچرل پروگرام پیش کیے جو بہت پسند کیے گئے۔ ان پروگراموں کی کامیابی کے لیے سیکریٹری کے علاوہ مشیر سید شریف الحسن نقوی، ڈپٹی سیکریٹری مسٹر بی۔ ایس۔ گیرا اور پروگرام افسروں انیس احسن اعظمی، محمد شمیم اور مستحسن احمد کی کارکردگی قابلِ ستائش تھی۔

اُردو، ہندی اور پنجابی اکادمیوں کی جانب سے "جدید چیلنج اور قومی یکجہتی" پر مشترکہ سمپوزیم

۲۴ فروری ۹۳ء کو صبح ½۱۰ بجے سے شام ۴ بجے تک دہلی کی اُردو، ہندی اور پنجابی اکادمیوں کی طرف سے ایک فکر انگیز سمپوزیم کا انعقاد ہوا۔ سمپوزیم کا عنوان تھا "موجودہ چیلنج اور قومی یکجہتی"۔ جس میں جناب سدھیش پچوری، جنابِ شمس الزماں، جنابِ پریم بھاٹیہ، جنابِ ترلوک سنگھ کنور، پروفیسر قمر رئیس، جنابِ راج کشور، جنابِ بلونت سنگھ رامو والیہ، سید حامد، جنابِ نامور سنگھ، جنابِ امریک سنگھ، جنابِ نٹور سنگھ

پروفیسر ٹی۔ این۔ رستوگی نے فکر انگیز خیالات
ں کیے۔ صبح کے جلسے کی صدارت پروفیسر
رسنگھ نے اور دوسرے کی صدارت جناب
سنگھ نے کی۔ تینوں اکادمیوں کی طرف سے
رات کے نکات کا احاطہ کرتے ہوئے اُردو
می کے سیکریٹری ایس۔ اشتیاق عابدی نے
کر مہمان دانشوروں کو درج ذیل ۶ نکات
رکرنا چاہیے اور مثبت تجاویز پیش کرنی چاہیے۔
ں نے درخواست کی کہ آپ لوگ کھل کر بولیں۔

آیا ۶ دسمبر کو اجودھیا کا واقعہ ایک
ب سانحہ تھا یا وہ ایک منظم سازش کا مظہر
؟

آیا ہندستانی نظام حکومت کے دو
ی ستون یعنی سیکولر اور جمہوری ڈھانچے کے
آزادی اور مساوات کے بنیادی حق
شہریوں کو مساوی طور پر حاصل رہیں
نہیں؟

جنوری ۹۳ء میں بمبئی اور سورت کے
ات کو اچانک جذبات بھڑکنے سے ہونے والا فرقہ وارانہ فساد مانا جائے یا ایک فرقے کی نسل کشی کے لیے ٹھنڈے دل و دماغ سے بنایا ہوا منظم پلان مانا جائے جو آئندہ دوسرے علاقوں میں بھی چلتا رہے گا؟

۴۔ آیا ہندستان کا موجودہ دستور باقی رہے یا اس کے بنیادی ڈھانچے کو بدلنے کی ضرورت ہے؟

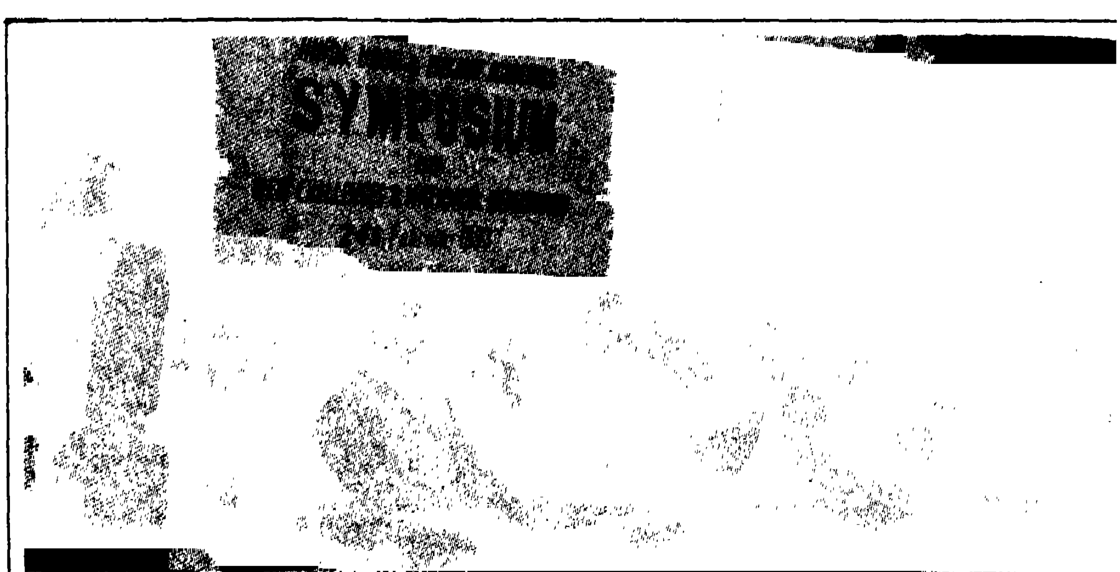
۵۔ موجودہ حالات کے پیشِ نظر میڈیا کا رول کیسا تھا اور کیسا ہونا چاہیے؟

۶۔ کیا قومی ہم آہنگی کے لیے اقلیتوں کو بھی اکثریت کی غلط فہمیاں دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اگر ہے تو کس طرح؟

جناب سُدھیش پچوری نے زور دار الفاظ میں کہا کہ موجودہ جنگ ہندستان کے سرمایہ دار اور نئے اجارہ دار طبقوں کی طرف سے اپنے مادی مفاد کے حصول کی ایک کوشش ہے جو نئے سمبل اور نئے نعروں کے ساتھ بظاہر کامیاب ہے۔ لیکن ہندوؤں کا فاشزم کامیاب نہیں ہو سکتا کیوں کہ فاشزم ایک بند سماج کے اندر ہی جہاں ذرائع ابلاغ قطعاً بے بس ہوں، پنپ سکتا ہے۔ ہندستان کھلا ہوا سماج ہے اور یہاں ذرائع ابلاغ کا بڑا حصہ اور خود ہندو قوم کا بڑا حصہ اس فاشزم کے خلاف ہے جو اُن کی فسطائی چالوں کا بھانڈا پھوڑ دے گا۔

جناب شمس الزماں نے فرقہ پرستی کو ملک کے لیے سب سے خطرناک نیا چیلنج قرار دیا اور کہا کہ اس سے لڑنے کے لیے ایک فعّال اور مربوط لائحہ عمل کی ضرورت ہے جس کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیکولر ذہن رکھنے والوں کو کھل کر سامنے آنا چاہیے۔

جناب پریم بھاٹیہ نے اور مقررین کی طرح اس سمپوزیم کو تینوں اکادمیوں کا ایک مستحسن اور ٹھیک وقت پر اٹھایا ہوا ٹھیک قدم قرار دیتے ہوئے کہا کہ ملک آج انتہائی زہریلی سیاست کی جکڑ میں ہے۔ سنگھ پریوار کے ہندوتو نعرے کو خطرناک بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ نعرہ ملک کو خانوں میں بانٹتا ہے۔ اس لیے غلط ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کے مقابلے میں ہمارا نعرہ ہونا



سے: سید حامد، سردار بلونت سنگھ رامو والیہ، مجتبیٰ حسین، ایس۔ اشتیاق عابدی، محمد شمیم، نامور سنگھ، بی۔ ایس۔ گیرا، سدھیش پچوری، کنور نٹور سنگھ اور دیگر حضرات
(تصاویر: سید فدا علی)

چاہیے "ہندستان ہمارا ہے یہ نہیں کسی کے باپ کا"۔ مسلمانوں کو ہمّت سے کہنا چاہیے کہ "ہم گیارہ بارہ کروڑ ہیں یہیں رہیں گے" اور فرقہ پرستوں سے پوچھنا چاہیے کہ آپ کون ہیں ہمیں نکالنے کی دھمکی دینے والے۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں ۳۰ سال سے قائم "قومی یکجہتی کونسل" کو نئی جہات میں کام کرنا چاہیے۔

پروفیسر قمر رئیس نے فاشزم کے خطرے کو سنگین بتاتے ہوئے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ فرقہ پرست طاقتیں ۴۰ سال سے لگاتار اپنی جڑیں مضبوط کرتی رہیں اور سیکولر طاقتوں نے ان پر توجّہ، وقت اور پہل نہ کرکے ایک موقع کھو دیا انھوں نے کہا کہ ایک "کلچرل قومیت" کا بی جے پی کا موجودہ نعرہ ۳۵ سال پہلے جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا مودودی کے نعرے کے مثل ہے جس سے فاشزم کی بُو آتی ہے۔ ان کے خیال سے مسلمانوں میں دانشوروں کے طبقے کو اب کُھل کر سامنے آجانا چاہیے تاکہ اقلیتوں کے جذبات کا استحصال کرنے والی لیڈرشپ کو کنارے لگا دیا جائے۔

راج کشور صاحب نے کہا کہ یہ چنوتیاں نئی نہیں ہیں ۱۰۰ سال پرانی ہیں اور ان پر ہندی ادب اور ہندو سماج میں کھل کر بحث ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتوں یا سیکولر طاقتوں کو خوف یا مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے پاس وسائل اور ذرائع ابلاغ کی کمی نہیں ہے اگر ضرورت ہے تو صرف دو باتوں کی (۱) فرقہ پرستوں کے نعروں کے جواب میں ہمارے نعرے کیا ہوں؟ اور (۲) ہمارے اندر بھی سیکولرزم کو بچانے کا وہی فعّال جذبہ ہونا چاہیے جو مبیّنہ سنگھ پریوار کے اندر ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ سیکولر اور جمہوری پارٹیاں یا حکومتیں خود کو اعتماد اور بھروسے کے لائق بنائیں جس کے لیے ضروری ہے کہ قانون کی عملداری ہو اور وفاقی نظام کو ہر جگہ ہر حالت میں یکساں اور ایمانداری سے لاگو کرکے رکھا جائے۔ انھوں نے وارننگ دی کہ بنگلہ دیشی گھس پیٹھیوں کا آج کا مسئلہ چار پانچ سال کے اندر ایک بڑا لاوا بن کر پھوٹ سکتا ہے۔ اس لیے ایک پکّا قومی شہری رجسٹر ضرور ہونا چاہیے تاکہ فرقہ پرست، بے بنیاد مسئلوں کو حقیقی اور جذباتی مسئلے بناکر گمراکن پروپیگنڈہ نہ کرسکیں۔ انھوں نے مُسلمانوں سے کچھ معاملات میں ضد چھوڑنے کی اپیل کی۔

اقلیتی کمیشن کے رکن رامو والیہ صاحب نے تینوں اکادمیوں کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ بنیادی مسئلے جن سے موجودہ خوفناک حالات پیدا ہوئے ہیں دو ہیں۔ اوّل یہ کہ سیاسی مفاد کے لیے مذہب کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ مذہب اور کلچر، کلچر اور تاریخ کو آپس میں غلط طریقے سے گڈمڈ کیا جا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ مختلف اوقات پر خود حکمراں جماعت نے فرقہ وارانہ کارڈ کھیلا۔ آج اس کا نتیجہ سامنے ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ وہ شخص جو سیاست کے لیے مذہب کا استعمال کرتا ہے وہ نہ سچّا مذہبی ہے نہ سچّا دیش بھگت۔ ذرائع ابلاغ کی تعریف کرتے ہوئے رامو والیہ صاحب نے کہا کہ اگر ۶ دسمبر کو بابری مسجد کی شہادت نے ہندستان کے ماتھے پر کلنک لگایا تو ۷ دسمبر کے بعد اب تک قومی میڈیا نے ہمّت کے ساتھ فرقہ پرستوں کو بے نقاب کرکے ملک و ملّت کے وقار کو بچا بھی لیا۔ انھوں نے اعداد و شمار کے ذریعے بتایا کہ اقلیتوں کی منہ بھرائی کا سنگھ پریوار کا پروپیگنڈہ اُتنا ہی جھوٹا اور بے بنیاد ہے جتنا کہ ان کا یہ پروپیگنڈہ کہ کشمیر میں ۳۷ مندروں کو توڑ دیا گیا لیکن رامو والیہ صاحب نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اقلیتوں کو بھی کھُل کر بنیاد پرست اور پاکستانی دہشت گردی کے خلاف بولنا چاہیے۔

سیّد حامد صاحب نے قومی میڈیا کے رول کو قابلِ تعریف قرار دیتے ہوئے کہا کہ ضرورت ہے کہ اقلیتیں اور سیکولر طاقتیں مدافعانہ کے بجائے جارحانہ لائحۂ عمل اپنائیں۔ انھوں نے کھیل کے میدان کی تشبیہہ دیتے ہوئے کہا کہ اپنی بےعملی اور غیرفعالیت کی وجہ سے ہی ملک کی صالح قوتوں نے بھاجپا کو گو یا واک اُوور دے دیا — ان کے خیال سے سنگھ پریوار کی کسی بات پر ہرگز بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان کے یہاں الفاظ کے معنی بدلتے رہتے ہیں۔ وہ کسی بات پر قائم نہیں رہتے۔ جناب رامو والیہ سے اتفاق کرتے ہوئے انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ کانگریس خود اس ملک میں فرقہ پرستی اور موقع پرستی کا لہجہ اور مزاج پیدا کرنے کی ذمّے دار ہے۔ اب اس بات کا فیصلہ اس ملک کو کرنا ہے کہ آیا مسلمان اس ملک میں تہ خانوں اور جھونپڑوں میں بند رہیں گے یا کھُلی فضا میں سانس لیں گے؟

نامور سنگھ صاحب نے نئے چیلنج کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ یہ نئے خطرناک میلانات دو طرح سے ظاہر ہو رہے ہیں ایک یہ کہ فرقہ پرستوں نے نازیوں کی طرح جھوٹ بول کر اور مجموعی طور پر عوام میں خوف پھیلا کر فاشزم کے لیے راہ ہموار کی ہے۔ ۱۹۸۴ء میں سکھوں کا قتلِ عام، بمبئی اور سُورت میں حالیہ منظم قتلِ عام، مدھیہ پردیش میں شنکر نیوگی کا قتل اور پس ماندہ اور درج فہرست ذاتوں کے کمیشن کے برہم دت شرما کو ذلیل کرنے کے اقدامات اسی ذہنیت کا مظہر ہیں — فرقہ پرست بھیڑ جمع کرتے ہیں اور بالکل جھوٹا

نعرہ لگا کر بھیڑ کی نفسیات کو بھڑکا کر خوف و دہشت کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ حکومت ہند ایسے حالات میں خود ہندو کارڈ کھیلنے کے لالچ میں نکمے پن کا مظاہرہ کرکے فرقہ پرستوں کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ انھوں نے آگاہ کیا کہ ہندستان کی موجودہ سیاست میں پھیلتی فرقہ پرستی اور ہندستان کے مشترکہ کلچرل ورثے پر فرقہ پرستوں کے حملوں کو مضبوط اور صالح ذرائع ابلاغ کے ذریعے فوری طور پر توڑنا چاہیے۔

امریک سنگھ صاحب نے کہا کہ آزادی کے بعد بڑھتی ہوئی بس ماندگی، اور روزگار کے مسئلے میں ہر جگہ پائے جانے والے کرپشن کے بعد جو خلا پیدا ہوا تھا سنگھ پریوار اُس خلا کو اپنی نئی زہریلی تحریکوں سے پُر کرنا چاہتا ہے اس کو توڑنے کے لیے ضرورت ہے کہ حکومت، حکومت کی طرح کام کرے اور ہمارا عدالتی نظام موثر ہو اور فوری طور پر قضیوں کا فیصلہ کرے۔ اس کے لیے انتخابی سسٹم کو اس طرح بدلنا چاہیے جس میں فرقے کی بنیاد پر کوئی پارٹی کسی طرح کا کارڈ نہ کھیلے۔

سابق وزیر کنور نٹور سنگھ نے کہا کہ آج کے سماج کا پہلا ناسور یہ ہے کہ اس میں گاندھی واد جیسی اخلاقی بنیادیں کمزور ہوگئیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے کرپشن سے آلودہ ہندستانی الیکشنی طور طریقوں اور جعلی اخراجات کا ذکر کیا۔ ۶ دسمبر کے حادثے کو انھوں نے ایک خط فاصل قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس تاریخ سے پہلے اور اس تاریخ کے بعد کے حالات اور کیفیات نفسیاتی طور پر ایک دوسرے سے بالکل جُدا ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان کی بقا کے لیے اور اقتصادی ترقی کے لیے لازم ہے کہ وہ دُنیا کے ۵۱ مسلم ملکوں کے ساتھ جن میں سے ۲۰ پٹرول پیدا کرنے والے ممالک ہیں، اپنا رشتہ بہتر کرے۔ انھوں نے مُسلم ممالک سے مُسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی تنظیموں کو ملنے والی امداد کو شر پیدا کرنے والی چیز قرار دیا۔

ہندی اکادمی کے سکریٹری وجے موہن سنگھ اور پنجابی اکادمی کے سکریٹری پریتم بترا نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

عبدالرحیم خانخاناں کی روایت کو زندہ کرنے کی ضرورت

سیمینار میں دانشوروں کا اظہارِ خیال

آج کے زخم خوردہ ماحول میں عبدالرحیم خانخاناں کے نظریات مرہم کا کام کرسکتے ہیں۔ ان کے کلام میں ہندستان کی قدیم اور حقیقی گنگا جمنی تہذیب کے عناصر روشن اور متحرک ہیں۔

اس خیال کا اظہار خانخاناں کے ادبی و ثقافتی کارناموں پر ایک خصوصی سیمینار میں کیا گیا۔ اس سیمینار کا اہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ ہندی اور عبدالرحیم خانخاناں میموریل سوسائٹی نے مل کر کیا تھا۔ پروگرام کے دو دَور ہوئے۔ افتتاحی دَور کی صدارت پروفیسر ایس۔ اے۔ آئی ترمذی نے اور دوسرے دَور کی صدارت مزاح نگار یوسف پاپا نے کی۔

مقررین نے سولہویں صدی کے اس ممتاز صاحبِ سیف وقلم کے عہد کے تہذیبی اور مذہبی منظرنامے کا بھی احاطہ کیا اور کہا کہ مغل حکمراں اکبر کے زمانے میں ہندستان کی مشترکہ تہذیب اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اس تہذیب کی اساس اس تصور پر تھی کہ ساری دُنیا ایک ہی خاندان ہے اور تمام مذاہب ایک ہی حقیقت کے مظہر ہیں اکبر کے زمانے میں مختلف مذاہب کے عملی احترام، سنسکرت اور فارسی کے ادبی سرمایے کے تبادلے اور دربار کے نورتنوں کے عوام دوست فکر و عمل سے یہ تہذیب اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اس عروج کی قیادت تو صلح کل کے نظریے کے مبلغ اکبر اعظم نے کی لیکن فنون وثقافت کے حلقوں میں اس کا مرکزی کردار عبدالرحیم خانخاناں تھے جن کا دربار نہ صرف اپنے ملک بلکہ غیر ممالک کے بھی دانشوروں کا ٹھکانہ تھا۔ خانخاناں ہند ایرانی تہذیب کے پروردہ تھے لیکن ہندی شاعری میں انھوں نے وہ عظمت حاصل کی کہ ان کی ایجاد بروے چھند کو ان کے ہم عصر اور دوست مہا کوی تلسی داس نے اپنی عظیم تخلیق رامائن کے لیے اختیار کیا۔

گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں لائبریری کا قیام

۲۰ فروری کو گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ایک شعبہ جاتی لائبریری کا قیام عمل میں آیا جس کا نام "مقبول لاری لائبریری" رکھا گیا۔ اس لائبریری کے قیام میں جناب مقبول احمد لاری صدر آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ نے خصوصی تعاون کیا، اس لیے یہ لائبریری انھیں کے نام سے منسوب کی گئی۔ گورکھپور شہر کے کچھ معززین نے بھی اس کے قیام میں مدد دی۔ جن میں حکیم ابوالکلام صدیقی، جناب محمد حامد علی اور ڈاکٹر عزیز احمد شامل ہیں۔

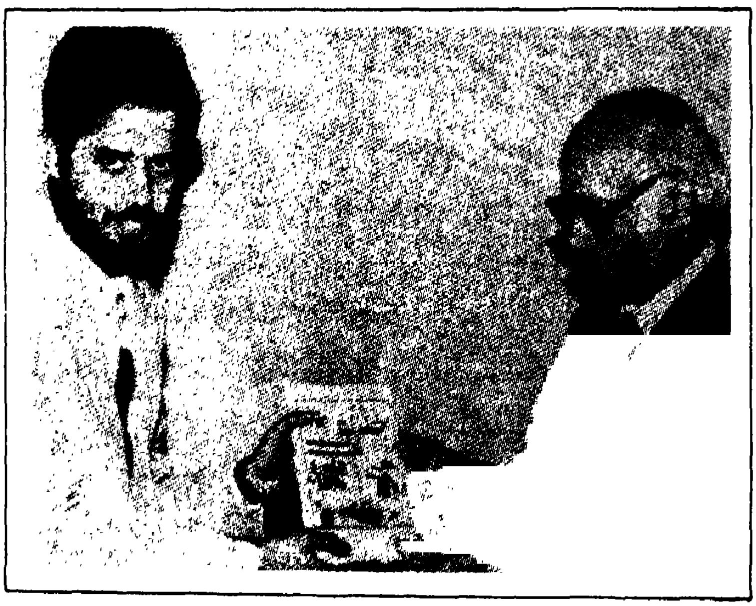


ذہنِ جدید اعتراف یافتگان ۹۲-۱۹۹۱ء، مجلسِ صدارت کے ارکان کے ساتھ

ذہنِ جدید اعتراف
ایک نئی روایت کا آغاز

سہ ماہی اُردو رسالے "ذہنِ جدید" نے اپنے پڑھنے والوں کی رائے کی روشنی میں ۱۹۹۱ء، ۱۹۹۲ء کے لیے ذہنِ جدید اعتراف کا جو اعلان کیا تھا اس کی تقسیم کی تقریب نئی دہلی کے تروینی کلا سنگم میں ۲۲، فروری کو منعقد ہوئی، جس میں اُردو کے اہم ادیبوں کے علاوہ ہندی، پنجابی، سندھی اور انگریزی کے ادیب بھی شریک تھے۔ ممتاز پینٹر اور تھیٹر سے وابستہ لوگ بھی موجود تھے۔ مجلسِ صدارت میں ستیش گجرال، قرۃ العین حیدر، راجندر یادو اور ستیندر سنگھ نور تھے۔ ذہنِ جدید کے مرتب زبیر رضوی نے شرکائے جلسہ کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کہا کہ ذہنِ جدید نے اپنے پڑھنے والوں کے خطوط کی روشنی میں اعتراف یافتگان کی فہرست مرتب کی ہے اور اس طرح قاری اور لکھنے والے کے درمیان ایک ربط اور پل بنانے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔ مدیرہ جمشید جہاں نے اعتراف یافتگان کے لیے توصیف نامے پڑھے اور مجلسِ صدارت کے ارکان سے باری باری یادگار ٹرافی پیش کرنے کی درخواست کی۔ افریقی شاعر گبریل اوکارا کا اعتراف نائجیریا کے ہائی کمشنر اور پاکستانی ادیبہ بانو قدسیہ کا اعتراف پاکستانی سفارت خانے کے مفتی جمیل احمد نے وصول کیا۔ ستیش گجرال نے مجلسِ صدارت کی طرف سے بولتے ہوئے ذہنِ جدید کو "غیر معمولی رسالہ" قرار دیا۔ اور خوشی ظاہر کی کہ اس رسالے نے فنونِ لطیفہ کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جتنی کہ ادب کو دی جاتی ہے۔

اعتراف لینے کے لیے ندا فاضلی بمبئی سے عابد سہیل لکھنؤ سے اور وحید اختر علی گڑھ سے خاص طور سے آئے تھے ان کے علاوہ اعتراف



مشہور افسانہ نگار جناب رام لعل نے ۷، فروری کو جناب طیب بخش بدایونی کی کتاب "ظریف شعرائے بدایوں" کی رسمِ رونمائی ادا کی۔

یا فنکگان میں غلام رسول سنتوش، سدھیر در، شاہی، دیوندر اسّر، بیگم کمار پاشی، دلیپ سنگھ، اجیت کور، مہندر سنگھ سرنہ بھی موجود تھے۔ وارث علوی کا اعتراف شاعر محمد علوی نے وصول کیا جب کہ سریندر پرکاش کا اعتراف محمود ہاشمی نے۔ آر کے لکشمن، کرشن راہی، یوسف ناظم، اصغر وجاہت، کرشن کھنہ، رنجیت کپور، وید راہی کا اعتراف بھجوایا جائے گا۔ بیگم ابراہیم القاضی نے القاضی کا اعتراف وصول کیا۔

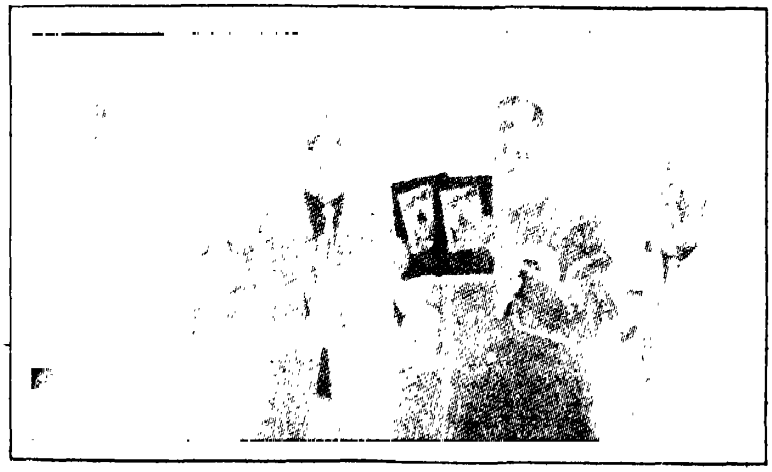


ڈاکٹر بشیر بدر کی صدارت میں پروین کمار اشک کی کتابوں کا اجرا ــــ تصویر میں دائیں سے: بیکل اُتساہی، پروین کمار اشک، افتخار امام، بشیر بدر، ناشر نقوی اور ندا فاضلی۔

ڈاکٹر شارب ردولوی کے پتے میں تبدیلی

ڈاکٹر شارب ردولوی اور ڈاکٹر شمیم نکہت (صدر شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی) نے اپنا مکان تبدیل کر لیا ہے۔ وہ اب ماڈل ٹاؤن کے بجائے مندرجۂ ذیل پتے پر رہ رہے ہیں۔ احباب و مخلصین اُن سے اِس پتے پر خط و کتابت کریں:

اے سی - ۳/۳۸ سی،
شالیمار باغ،
دہلی ۱۱۰۰۵۲



۵ فروری کو جناب آصف بریلوی کے مجموعۂ کلام "روشنی کا سفر" کی رسم اجرا اُتر پردیش کے گورنر جناب جی۔ ستیہ نرائن ریڈی نے انجام دی۔

گرامی نامے

◄ نومبر ۹۲ء کے ایوانِ اردو میں "گوشۂ کمار پاشی" نظر سے گزرا تھا۔ کم وقت میں آپ نے ان کی کئی گرانقدر شعری تخلیقات یکجا کر دی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کمار پاشی کے فن اور شخصیت کے تمام اہم پہلوؤں کے احاطے کے لیے ایک بھرپور نمبر کی ضرورت ہے۔ ان کی موت نے مجھے جس قدر صدمے سے دوچار کیا ہے، اس کا اظہار لفظوں کے ذریعے آسان نہیں۔ وہ میرے بڑے بھائی تھے۔ برابر شفقت سے پیش آتے۔ میں انھیں بھول نہیں سکتا۔ اردو ادب بھی ایسے شاعر و ادیب کو فراموش نہ کر سکے گا۔ وہ نہ صرف نئی نسل کے لیے مخلص تھے بلکہ اپنے ہمعصروں کے سلسلے میں بھی ان کا رویّہ دوستانہ تھا — آپ کے لیے ان کی ہمدردی بے مثال تھی۔ دہلی میں گوپی چند نارنگ کے زیرِ اہتمام منعقدہ افسانہ ورکشاپ ۱۹۸۵ء کے پانچ روزہ قیام کے دوران آپ کی بعض پریشانیوں کو لے کر انھیں فکر مند دیکھا تو اس بات کا اندازہ ہوا۔ محوِ حیرت ہوں کہ ریاکاری کے اس زمانے میں بھی ایسے وفادار اور ہمدرد دوست پائے جاتے تھے — آپ کی نظم "جلد باز" میں آپ کی محبت اور آنسو چھلکے پڑ رہے ہیں۔ آپ نے ادب اور زندگی کے تعلق سے کمار پاشی کی شخصیت اور فن کی ناگزیریت کو اُجاگر کیا ہے، وہ آپ کے فن کا جاندار حصّہ ہے۔

تعارف کے حصّے سے "تالیفات" کے کالم میں کمار پاشی کی اہم تالیف "نیا اردو افسانہ: انتساب و انتخاب" کا تذکرہ کرنا آپ بھول گئے جو پہلے سطور (سہ ماہی) کی یک موضوعی خصوصی اشاعت کے تحت مارچ، اپریل، مئی ۱۹۸۰ء کی جلد ۱۰ میں خاص نمبر کی صورت میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں (اپریل ۱۹۸۰ء میں) انھوں نے اسے موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی کے ذریعے کتابی شکل میں شائع کرایا تھا۔ یہ کتاب ۱۹۷۰ء کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں کے افسانوں کا اہم انتخاب تھی۔ جو نئے افسانوں پر کام کرنے والوں کے لیے تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے دیباچے میں کمار پاشی نے "نیا اردو افسانہ" عنوان کے تحت نئے افسانوں کے مختلف مسائل اور اس کی شناخت پر کھل کر یادگار بحث کی ہے — اپنے زمانے میں اس کتاب نے افسانے کی دنیا میں خاصی اُتھل پُتھل مچائی تھی۔ کافی چرچا بھی ہوا تھا اس پر۔ وارث علوی جیسے اہم ناقد نے اس پر اپنے شدید ردِّ عمل کا اظہار کیا تھا۔

کمار پاشی کی یہ کتاب ان کی زندگی کا ایک اہم کارنامہ تھی۔ تمام مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود انھوں نے ۱۹۷۰ء کے بعد کی پیڑھی کو ایک منچ پر اکٹھا کر دیا تھا۔ ہم ان کے تعلّق سے ان کی اس شاندار ادبی کارکردگی کو فراموش نہیں کر سکتے۔ ان کے تعارف میں اس کتاب کا تذکرہ ناگزیر ہے۔

—— **شوکت حیات، پٹنہ**

◄ فروری ۱۹۹۳ء کے "ایوانِ اردو" میں جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ کا مضمون "نئے جال لائے پرانے شکاری" نظر سے گزرا۔ موصوف اقبال کی اس نظم کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"لطف کی بات یہ ہے کہ علامہ کے انتقال کے بعد جو مجموعے متفرق کلام کے مرتب اور شائع ہوئے ان میں بھی یہ نظم نہیں آئی۔"

ایسی بات نہیں۔ باقیاتِ اقبال مرتبہ سیّد عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی طبع سوم لاہور ۱۹۷۸ء میں مخمس کے یہ دونوں بند صفحہ ۵۳۶ پر "غریبوں کا دنیا میں اللہ والی" کے عنوان سے شائع ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے مضمون "اقبال کا منسوخ اردو کلام" میں اس نظم پر تنقید کرتے ہوئے اس کا پہلا بند نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو (۱) رسالہ توازن مالیگاؤں شمارہ ۱۰، ۱۹۸۶ء (۲) اورینٹل کالج میگزین لاہور، شمارہ ۳، ۴، ۱۹۸۶ء (۳) نیز میرا مجموعۂ مضامین "پرکھ اور پہچان" دہلی ۱۹۹۰ء ص ۴۶۔

اس نظم میں پاٹھ شالے، گرجے، لالے

پنجابی بول چال کی جمع ہیں جو اُردو روزمرّہ کے مطابق نہیں۔ شاید اسی وجہ سے یہ نظم کسی مجموعے کے شایان نہ سمجھی گئی ہو۔

—— گیان چند، لکھنؤ

◄ "ایوانِ اُردو" کا مطالعہ اس کے پہلے شمارے سے برابر کر رہا ہوں۔ ابتدا ہی سے اس رسالے کا ایک خاص معیار اور مزاج رہا ہے جس کی وجہ سے اس کی ایک خاص پہچان بن گئی ہے۔ بلاشبہ آپ حضرات اسے مزید دلچسپ اور مفید بنانے کی کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔

اس کا اداریہ اگرچہ مختصر ہوتا ہے لیکن کسی نہ کسی اہم پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اس لیے نہایت مفید ہوتا ہے۔ جنوری ۹۳ء کا اداریہ بھی نہایت مفید اور بروقت تھا اور سچے انسانی جذبات سے لبریز تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۶ دسمبر ۹۲ء اور اس کے بعد کے واقعات نے ہمارے ملک کو مختلف انداز سے نقصان پہنچایا ہے ظلم و ستم، سفاکی اور حق تلفی مہذّب قوموں کے لیے نہایت شرمناک ہیں۔ عدالت کے فیصلے کا احترام نہ کرنا اور دستورِ ہند کے خلاف قدم اُٹھانا وطن دوستی نہیں ہے وطن دشمنی ہے۔ ہمیں ملک کی سالمیت اور ترقی عزیز ہے جن کے حصول کے لیے آپس میں اتحاد و اتفاق کی بڑی اہمیت ہے۔ اور اتحاد و اتفاق ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کے جذبات کا تقاضہ کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت پر یقین چاہتے ہیں ایک دوسرے کی امداد کا خاص خیال چاہتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے کی آرزو چاہتے ہیں۔

معاندانہ رویّہ، غیر منصفانہ عمل اور وحشیانہ تگ و دو کو انسانیت کے علم برداروں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ کچھ مفاد پرست وقتی طور پر اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب ہوسکتے ہیں اور خوش ہوسکتے ہیں لیکن یہ کامیابی غیر حقیقی اور خوشی محض وقتی ہوتی ہے۔ دیرپائی تو انسانیت، سچائی، ایمانداری اور نیکی کے ہی حصّے میں آتی ہے۔

اس لیے ہمیں سنجیدگی کے ساتھ اتحاد و اتفاق اور عدل و انصاف کا ہی راستہ اختیار کرنا چاہیے اس میں ملک کی بھلائی اور قوم کی بہبودی ہے۔

"ایوانِ اُردو" فروری ۹۳ء کے اداریے کو پڑھ کر بڑا رنج ہوا۔ ماضی کے مفروضہ حادثات اور واقعات کو بغیر سچائی کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھے ہوئے صحیح مان کر سینکڑوں سال بعد جبکہ دُنیا ترقی کی کئی منزلیں طے کرچکی ہے اور چاند تاروں پر کمندیں ڈال رہی ہے غیر منصفانہ عمل کو دُرست قرار دینا کہاں کی دانائی ہے۔

ایسے المناک حالات میں ضرورت ہے کہ دانشور آگے بڑھیں اور ذہنوں پر جمائے گئے تعصّب، ناانصافی اور ہٹ دھرمی کی گرد کو سنجیدگی کے ساتھ صاف کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ تعصّب اور ناانصافی کی کوئی حد نہیں ہے —— ملک ان برائیوں کی زہریلی فضا میں پروان نہیں چڑھ سکتا۔ ڈر ہے کہ کہیں بڑے خسارے میں ہم نہ آجائیں۔

دراصل ہمارے ملک کے اہم مسائل ہیں جہالت، غربت، بے روزگاری اور مہنگائی وہ لوگ جو عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہیں اور ان کے بچّے اعلیٰ تعلیم آسانی کے ساتھ حاصل کر رہے ہیں۔ انھیں کیا معلوم کہ ہمارے ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصّہ آج آزادی حاصل کرنے کے ۴۵ سال بعد بھی آزادی کی نعمتوں سے محروم ہے اور غربت، مجبوری، ذلّت اور اذیت کی بدترین زندگی گزار رہا ہے۔ اسے کھانے کو روٹی میسّر نہیں، رہنے کو جھونپڑا نہیں، پہننے کو کپڑا نہیں۔ وہ کپکپاتی سردیوں میں کھلے میدانوں میں کانپتی ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور چلچلاتی دھوپ میں تڑپتی ہوئی روح کے ساتھ محنت مزدوری کرنا اُن کی قسمت ہے۔

آزادی کے بعد بدقسمتی سے ہمارے ملک میں لیڈری کچھ ایسے لوگوں کے حصّے میں آتی آرہی ہے جو دولت مند ہیں اور عام لوگوں سے ان کا واسطہ یا تو نہیں رہا ہے یا برائے نام رہا ہے اس لیے عوامی مسائل سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایسے رہنما ہندستان کی تعمیر میں کیا حصّہ لے سکتے ہیں —— البتّہ بچپن میں سُنا تھا کہ انگریز لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کرتے رہے تھے۔ ہمارے مفاد پرست رہنما بھی وہی کر رہے ہیں اور خوش ہیں کہ مقصد میں کامیاب ہیں۔

میں نے یہ باتیں کوئی نئی نہیں لکھی ہیں لیکن جس راہ پر ہمارے کچھ رہنما اس ملک کو لگانا چاہتے ہیں اور ہندستان کے مستقبل سے کھیلنا چاہتے ہیں اس کے احساس سے بے چین ہوگیا اور اپنی باتیں بے اختیار لکھ گیا۔

جی چاہتا ہے کہ اُردو کے سارے دانشوروں سے درخواست کروں کہ اب وہ خاموش نہ بیٹھیں بلکہ اپنی تحریروں سے ہندستانیوں کے دلوں میں بسائے گئے تعصّب اور نفرت کے اثرات کو مٹادیں اور ان کی جگہ انسان دوستی، قومی یکجہتی اور حبّ الوطنی کے احساسات جگادیں اور ملک و قوم کے حقیقی مسائل اور ان کے فرائض سے باخبر کردیں —— یہی ملک و قوم سے محبّت کا تقاضہ ہے۔

—— عبدالقوی دسنوی، بھوپال

اس بار آپ کا اداریہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔ کئی سوال خود بہ خود جنم لے رہے ہیں۔ یہ آپ نے اچھا کیا کہ خط شائع نہ کرکے ان باتوں کو پیش کیا ہے، جو مکتوب نگار نے اپنے مراسلے میں تحریر کی ہوں گی۔

پروفیسر محمد علی صدیقی کا انٹرویو صرف پاکستان ہی نہیں ہندستان میں بھی اُردو کی راہ میں درپیش مسئلوں کا تجزیہ کر رہا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں موصوف نے اس بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ بہار سے آنے والی اُردو کی نئی کھیپ کے یہاں زبان کا عرفان مفقود ہے۔ میرا خیال ہے یہ سوچ درست نہیں۔ یو۔پی اُردو کی کوکھ ہے۔ اس نے زبان تو جنی مگر اس کی پرورش اب بہار کر رہا ہے۔

"ڈھلتی شام" کا انجم عباسی نے اچھا ترجمہ کیا ہے۔ قاسم خورشید کی کہانی "اندر آگ ہے" کی اشاعت آپ کی ناقص پڑتال کا ثمرہ ہے۔ پتہ نہیں یہ کہانی اور کتنی جگہوں پر پڑھنے کو ملے گی۔

—— **صغیر رحمانی**، آرہ

ایوانِ اُردو (فروری ۹۳ء) برادرم قیصر اقبال سے لے کر ایک نظر دیکھا۔ قاسم خورشید کا افسانہ "اندر آگ ہے" زبان و ادب (پٹنہ) میں پہلے ہی شائع ہو چکا ہے۔ ایک ہی تخلیق کو مختلف رسائل میں شائع کروا کے یہ افسانہ نگار کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

—— **اقبال حسن آزاد**، مونگیر

"ایوانِ اُردو" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اداریے میں ایک مکتوب کے حوالے سے آپ نے جو اظہارِ خیال کیا ہے، وہ صحیح فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔

—— **نسیم بن آسی**، مغل سرائے

فروری ۹۳ء کے "حرفِ آغاز" میں ایک گمنام مراسلے کا خلاصہ پڑھ کر افسوس ہوا۔ یہ سوچ انتشار پسند طاقتوں کی حوصلہ افزائی کے مترادف ہے کہ بابری مسجد کی شہادت تاریخ کے اپنے آپ کو دہرانے کے عمل کا نتیجہ ہے۔ حیرت ہے کہ بابری مسجد کے انہدام کو سومنات کی تباہی سے جوڑتے وقت حالات و واقعات، اسباب اور زمانوں کے نمایاں فرق کو کیسے نظر انداز کر دیا گیا۔ اس طرح کے خیالات کا اظہار اُس تصوّر کو بھی میلا کر رہا ہے جو شعرا، ادبا، اور صحافیوں کے تعلق سے پایا جاتا ہے۔ جن کا کام بلاتفریق مذہب و ملّت دلوں کو جوڑنے کا ہے نہ کہ توڑنے کا۔

—— **انور کمال انور**، فیروز آباد

"ایوانِ اُردو" بابت ماہ فروری ۹۳ء نظر نواز ہوا۔ "حرفِ آغاز" میں جس خط کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، اسے شائع نہ کرکے آپ نے ایک اچھے صحافی کا کردار ادا کیا ہے۔ اس سے آپ کے ظرف کا اندازہ ہوا کس خوبصورتی سے آپ نے اس مسئلے کو اُلجھانے کے بجائے سُلجھا دیا۔ حقیقی معنوں میں صحافت اسی کو کہتے ہیں۔ یہ وقت زخموں پر نمک چھڑکنے کا نہیں ہے۔

—— **راشد احمد راشد**، حیدرآباد

مشمولات کے حُسنِ انتخاب کے اعتبار سے بلاشبہ "ایوانِ اُردو" منفرد ہے لیکن فروری ۹۳ء کے شمارے میں قاسم خورشید کا افسانہ "اندر آگ ہے" دیکھ کر افسوس ہوا۔ یہ افسانہ کچھ ماہ قبل "زبان و ادب" میں شائع ہو چکا ہے البتہ کہیں کہیں جملوں کے علاوہ الفاظ بھی بدلے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں اس کے ذمے دار ایڈیٹر ہیں یا خود افسانہ نگار۔

—— **منظر مظفر پوری**، مظفر پور

فروری کا "ایوانِ اُردو" نظر نواز ہوا۔ اداریہ دیکھ کر ایک بار پھر مایوس ہونا پڑا۔ ایک ادبی جریدے کا اداریہ ایک غیر ادبی مسئلے پر لکھا جائے اس سے بڑھ کر افسوس ناک امر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اب کسی غیر ادبی تنازعے پر قلم سان کرنے کی زحمت نہ فرمائیں تو بہتر ہوگا۔

—— **توحید جوہر**، ٹکاری

فروری کا "ایوانِ اُردو" نظر نواز ہوا۔ اداریے میں ایک تکلیف دہ حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ روشن خیال لوگوں کے ذہن کی روشنی بھی مدّھم نظر آنے لگی ہے۔ خدا کرے نئی تابناک روشنی سے ایک بار پھر اذہان جگمگا اٹھیں اور باہمی رواداری کا دَور ایک بار پھر پلٹ آئے۔

—— **صدف جعفری**، کلکتہ

فروری کا "حرفِ آغاز" پڑھا۔ سومنات کے مندر کے انہدام کو بابری مسجد کے انہدام سے جوڑنا کسی طرح درست نہیں۔ تب کے اور آج کے حالات میں بہت فرق ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔ بے جا کام ہم کریں اور کہیں کہ تاریخ خود کو دہرا رہی ہے۔ غلط کام کی غیر مشروط مذمت ہونی چاہیے، انسداد اور تدارک ہونا چاہیے۔

—— **وشنو سروپ**، سنتا

فروری کے شمارے میں کچھ خاص ہی مزا آیا۔ اس بار تینوں افسانے اچھے ہیں۔ حضرت یکتا پر ماسٹر اختر کا انشائیہ بہت پسند آیا۔ پاکستان میں اُردو زبان کے حوالے سے اطہر فاروقی نے دلچسپ سوال کیے۔ غزلوں میں ادریس ضیا اور عذرا پروین کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ عذرا پروین کا لہجہ دوسری شاعرات سے مختلف ہے۔ آگے ان سے

اچھی امیدیں وابستہ ہیں۔ شمارے میں منظر مظفر پوری صاحب کا ایک خط بھی شائع ہوا ہے میں اب آئندہ ان سے پوچھ کر افسانے پر اپنی رائے لکھا کروں گا مگر اس سے پہلے وہ مجھے یہ بتادیں کہ اچھّے اور بُرے افسانے میں بنیادی فرق کیا ہے۔ یہاں بحث ممکن نہیں، ورنہ میں اس پر ضرور کچھ روشنی ڈالتا۔

—— شاھد اختر، کانپور

◀ ماہ فروری کا "ایوانِ اُردو" نظر نواز ہوا۔ شجاع خاور کی غزل بطور خاص پسند آئی۔ عذرا پروین کی غزل بھی اچھی ہے۔ سفر نامہ تھوڑا باتونی ہو چلا ہے اِس لیے کم مزہ دے رہا ہے۔

—— شہاب اختر شہاب، جھریا

◀ فروری کے شمارے میں ماسٹر اختر صاحب کا انشائیہ "حضرتِ یکتا" خوب ہے۔ ایسے ادیبوں اور دانشوروں کی کمی نہیں جو اُلٹے ہاتھ سے لکھنے کا اور سیدھے ہاتھ سے پبلسٹی کا کام خوب چلا رہے ہیں —— اطہر فاروقی صاحب کی معروف ناقد محمد علی صدّیقی سے گفتگو نے پاکستان میں اُردو کی صورتِ حال سے متعلّق معلومات میں اضافہ کیا۔

—— عقیل نعمانی، بریلی

◀ بلاشبہ "ایوانِ اُردو" دہلی کو عوام میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ اُردو کے طالب علموں کے لیے تو یہ ایک قیمتی تحفہ ہے لیکن ہمیں سرورق کے اندرونی صفحے کی تصویر کی مناسبت سے شعری اور نثری عنوان تجویز کرنے کا سلسلہ بند ہو جانے کا دلی افسوس ہے۔

—— معین الدین شمسی، گریڈیہہ

◀ فروری کا شمارہ بہت خوب رہا تقریباً سبھی تخلیقات معیاری تھیں لیکن افسانہ "ڈھلتی شام" کا کوئی جواب نہیں۔ ایسی تخلیق کا انتخاب کرکے آپ نے قارئین کے دل کو جیت لیا ہے۔ جناب عظیم الشان صدّیقی کا معلوماتی مضمون "میسور کی علمی و ادبی فضا" بھی پسند آیا۔ غزلیات کے تحت وسیم مینائی صاحب اور سیفی سرونجی صاحب کے کلام نے بے حد متاثر کیا۔

—— وِلس ڈیسوزا، دربھنگہ





پنے نواسے افضل (شانو) پر پیار نچھاور کرتے ہوئے۔ شانو کو
د میں لیے ہوئے ہیں تاباں صاحب کے داماد جمال الدین صاحب

تاباں صاحب اور بیگم حبیبہ تاباں



تاباں صاحب اپنی نواسی میرا کے ساتھ



بڑے داماد جناب مجیب رضوی کے ساتھ



جاں نثار اختر، مہندر ناتھ اور تاباں صاحب



شاخ سے ٹوٹے پتے ہوں یا شاخ سے ٹوٹے پھول
کل تک تھا آن کا جو بیش قیمت اب تو خاک اور دھول

دنیا والے جس کو سمجھے دل سے دل کی راہ
شاید تیری شوخ ادا تھی شاید میری بھول

شہر میں اپنے جشنِ بہاراں، پھولوں کے انبار
جنگل جنگل، صحرا صحرا، کہیں اڑتی دھول

کیسی خلوت، کیسی جلوت، ٹوٹے سارے خواب
کون بتائے سوزِ تمنا قاتل یا مقتول

لطف دکھایا جبر و ستم کا، چاہت کے دو بول
ایک ذرا سی بات کو تاباں کیوں دیتے ہو طول

جامعہ ملیہ کو اقلیتی ادارہ کی درجہ کی لڑائی میں اس کی حیثیت تسلیم

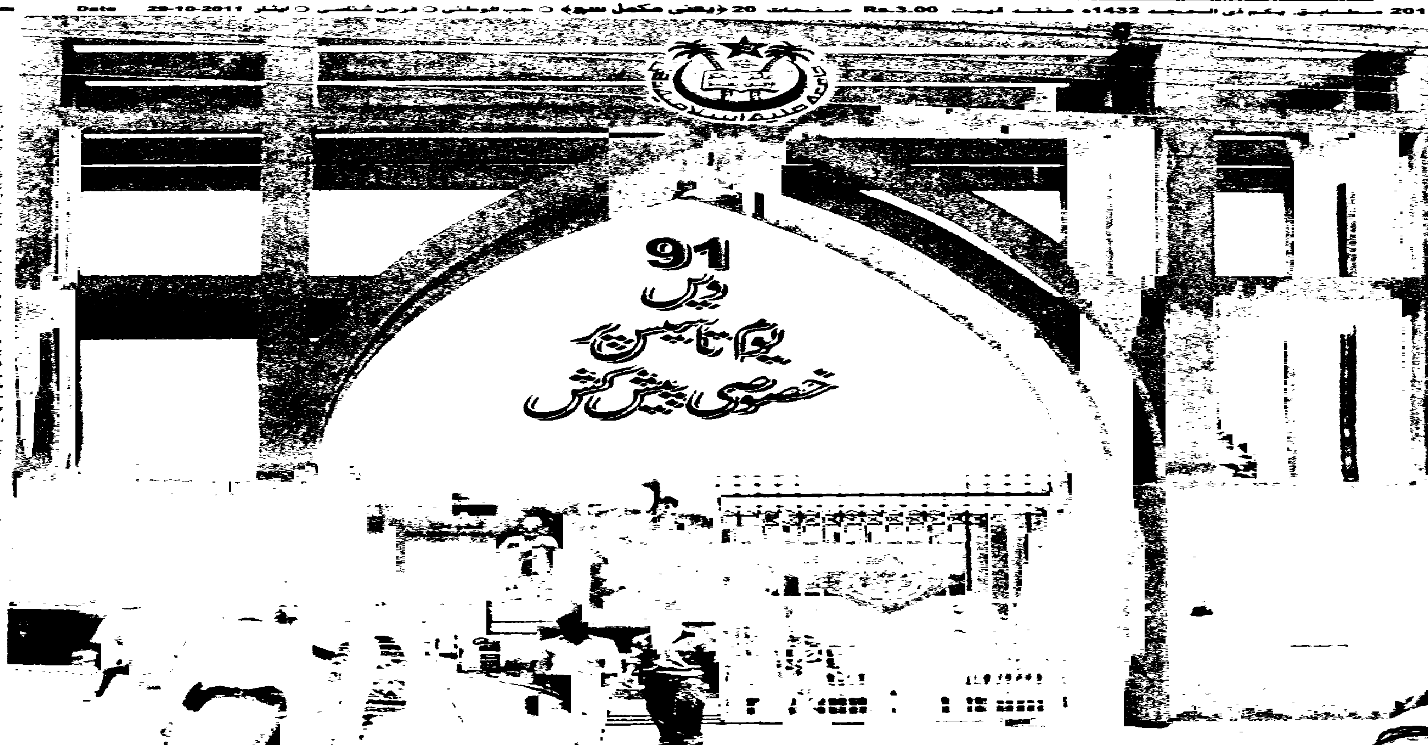
اقلیتی کردار سے ملت کو حوصلہ اور اعتماد حاصل ہوا: نجیب جنگ

روزنامہ راشٹریہ سہارا

NEW DELHI

نئی دہلی 29 اکتوبر 2011 مطابق یکم ذی الحجہ 1432ھ قیمت Rs.3.00 صفحات 20 (یعنی مکمل سیٹ) ○ حب الوطنی ○ فرض شناسی ○ ایثار 29-10-2011 Date

www.roznamasahara.com



91 ویں یوم تاسیس پر خصوصی پیش کش

دیار شوق میرا دیار شوق میرا
ہمہ آرزو میرا ہمہ آرزو میرا

ہوئے تھے آ کے یہیں خیمہ زن وہ دیوانے
یہیں سے شوق کی بے ربطیوں کو ربط ملا
یہیں سے لالۂ صحرا کو یہ سراغ ملا

اٹھے تھے سن کے جو آواز رہبران وطن
اسی نے ہوش کو بخشا جنوں کا پیراہن
کہ دل کے داغ کو کس طرح رکھتے ہیں روشن

دیار شوق میرا دیار شوق میرا

یہ اہل شوق کی بستی یہ سر پھروں کا دیار
یہاں کے رسم و رہ مے کشی جدا سب سے
یہاں پہ تشنہ لبی مے کشی کا حاصل ہے

یہاں کی صبح نرالی، یہاں کی شام نئی
یہاں کے جام نئے طرز رقص جام نئی
یہ بزم دل ہے یہاں کی صدائے عام نئی

دیار شوق میرا دیار شوق میرا

یہاں پہ شمع ہدایت ہے صرف اپنا ضمیر
سفر ہے دین یہاں، کفر ہے قیام یہاں
شعور کا تقاضہ ہے تو ہے تو طوفاں

یہاں پہ قبلۂ ایمان کعبۂ دل ہے
یہاں پہ راہ روی خود حصول منزل ہے
کنار موج میں، آسودگی ساحل ہے

دیار شوق میرا دیار شوق میرا

محمد خلیق صدیقی

خصوصی پیش کش
جامعہ ملیہ اسلامیہ کا 91واں یوم تاسیس


P.5
راجیو گاندھی کے قاتلوں کی سزا میں تخفیف کی مخالفت

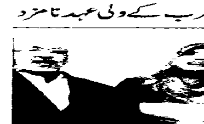

P.3
ٹیم انا کی کور کمیٹی میں توسیع کا اشارہ


منریگا پر سیاست کر رہے ہیں رمیش: نایاوتی


عبوری حکومت کی بدلی یورپا کی درخواست


P.5
پرنب مکھرجی کے بیان سے ڈر گیا تھا پاک: کنڈولیزا رائس


P.3
شہزادہ نائف سعودی عرب کے ولی عہد نامزد


P.5
تیونس میں اسلام پسندوں کی فتح

روزنامہ راشٹریہ سہارا
NEW DELHI
نئی دہلی، 29/اکتوبر 2011 مطابق یکم ذی الحجہ 1432ھ ہفتہ قیمت: Rs.3.00 صفحات 20 (بشمول مکمل سہ) ○ حب الوطنی ○ فرض شناسی ○ ایثار Date 29-10-2011 www.roznamasahara.com



پیغام

مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ جامعہ برادری نے حسن دستور سابق 29 اکتوبر کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جشن یوم تاسیس منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے منتظمین، اساتذہ، طلباء، ابنائے قدیم اور اراکین کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں اس طرح کے یادگاری جشن منانے کی رسم کوئی نئی نہیں ہے۔ بہت پرانی ہے جس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے آثار کی روشنی میں اپنی موجودہ زندگی کا جائزہ لیں اور آنے والی نسلوں کے لئے کچھ ایسے نقوش چھوڑ جائیں جو ملک و قوم کی تاریخ کے کسی گوشے میں جگہ پا سکیں۔

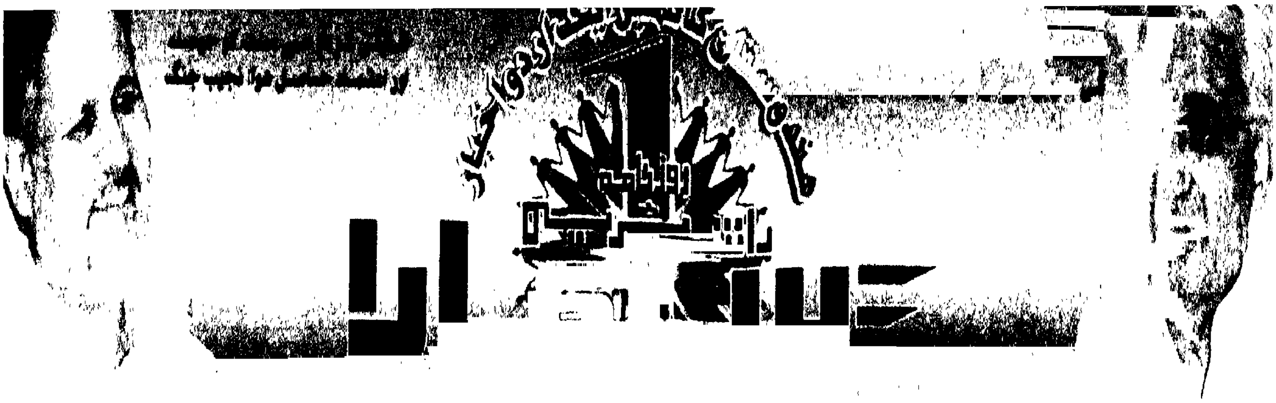
آج کا دن ہمیں یاد دلاتا ہے جب بیسویں صدی کے اوائل میں بعض دردمندان قوم نے ملت اسلامیہ ہند کے نونہالوں اور نوجوانوں میں اسلامی اقدار اور پاکیزہ اخلاق کے ساتھ ساتھ تعلیمی، سیاسی و سماجی شعور کو بیدار کرنے نیز معاشی استحکام و ترقی کے لئے جدید ٹیکنیکل سائنسی علوم کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا تھا۔ انہیں افکار کے مدنظر ان حضرات کی کاوشیں رنگ لائیں اور 29 اکتوبر 1920 کو شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے ہاتھوں علی گڑھ میں جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ حالات کے پیش نظر 1925 میں دہلی میں منتقل ہوئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی حضرات میں اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے علاوہ مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر، مسیح الملک حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور عبدالمجید خواجہ صاحبان کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہمارا تعلق بہت مضبوط اور قدیم ہے۔ اس تعلق کی بنیاد یہ ہے کہ جس ذات گرامی کے حکم سے مالٹا کی جیل میں رہتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد رکھی گئی انہی کے دست حق پرست سے چند ماہ کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی گئی۔ اس مجاہد، بطل حریت شخصیت کو دنیا شیخ الہند، اسیر مالٹا مولانا محمود حسن دیوبندیؒ شیخ الحدیث صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے نام نامی اور

راجیو گاندھی کے قاتلوں کی سزا میں تخفیف کی مخالفت
P_5

ٹیم انا کی کور کمیٹی میں توسیع کا اشارہ
P_3

منریگا پر سیاست کر رہے ہیں رمیش: نائیڈو
P_5



نئی دہلی، 29/اکتوبر 2011 مطابق یکم ذی الحجہ 1432ھ ہفتہ قیمت: Rs.3.00 صفحات 20 (یعنی مکمل نمو) ○ حب الوطنی ○ فرض شناسی ○ ایثار 29-10-2011 Date www.roznamasahara.com

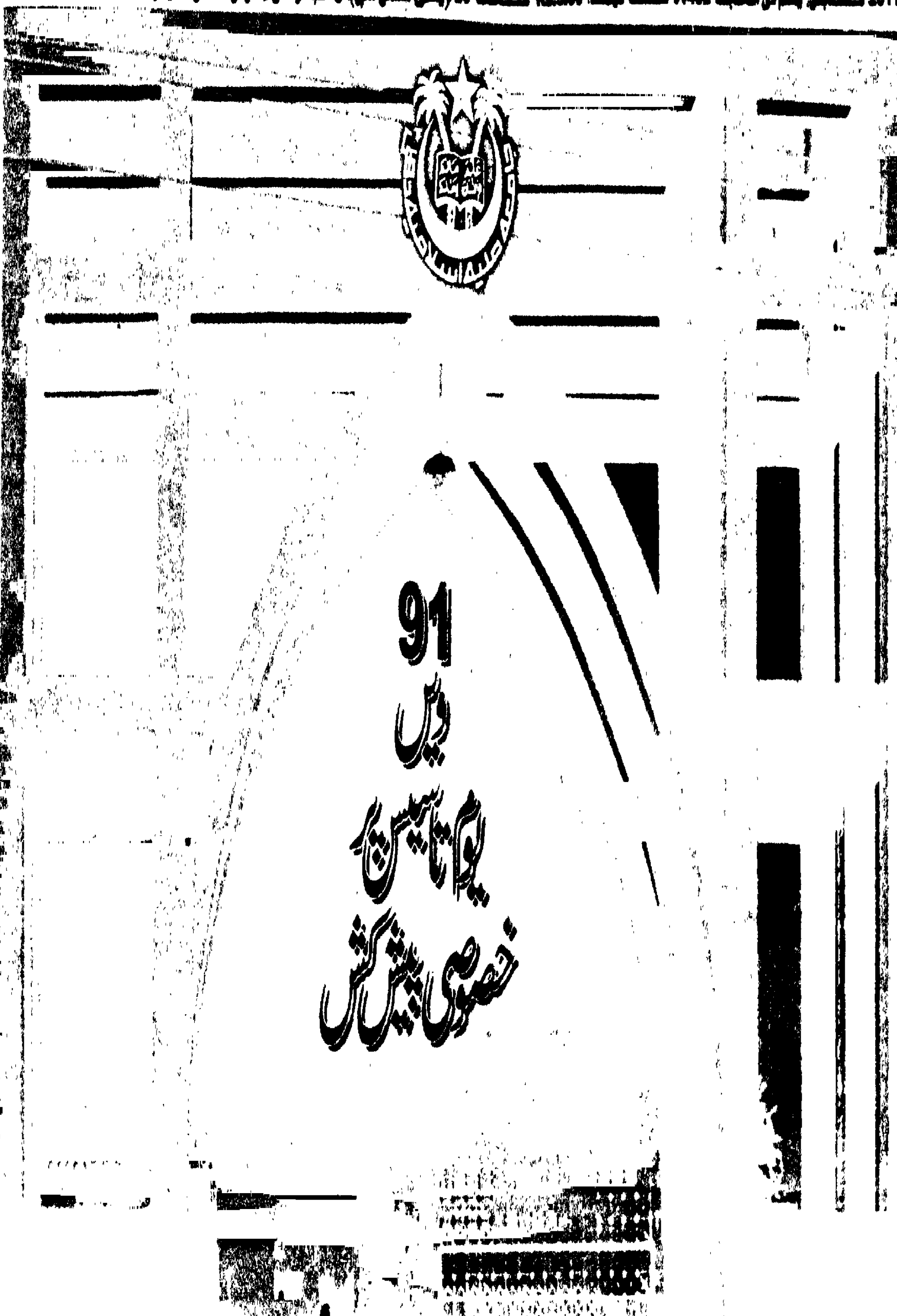


مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ جامعہ برادری نے حسن دستور سابق 29 اکتوبر کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جشن یوم تاسیس منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے منتظمین، اساتذہ، طلباء اور ابنائے قدیم واراکین کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں اس طرح کے یادگاری جشن منانے کی رسم کوئی نئی نہیں ہے۔ بہت پرانی ہے جس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے آثار کی روشنی میں اپنی موجودہ زندگی کا جائزہ لیں اور آنے والی نسلوں کے لئے کچھ ایسے نقوش چھوڑ جائیں جو ملک وقوم کی تاریخ کے کسی گوشے میں جگہ پا سکیں۔

آج کا دن ہمیں یاد دلاتا ہے جب بیسویں صدی کے اوائل میں بعض دردمندان قوم نے ملت اسلامیہ ہند کے نونہالوں اور نوجوانوں میں اسلامی اقدار اور پاکیزہ اخلاق کے ساتھ ساتھ تعلیمی، سیاسی وسماجی شعور کو بیدار کرنے نیز معاشی استحکام وترقی کے لئے جدید ٹیکنیکل سائنسی علوم کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا تھا۔ انہیں افکار کے مد نظر ان حضرات کی کاوشیں رنگ لائیں اور 29 اکتوبر 1920 کو شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے ہاتھوں علی گڑھ میں جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ حالات کے پیش نظر 1925 میں دہلی میں منتقل ہوئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی حضرات میں اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے علاوہ مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر، مسیح الملک حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور عبدالمجید خواجہ صاحبان کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہمارا تعلق بہت مضبوط اور قدیم ہے۔ اس تعلق کی بنیاد یہ ہے کہ جس ذات گرامی کے حکم سے مالٹا کی جیل میں رہتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد رکھی گئی اسی کے دست حق پرست سے جمعیۃ کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی گئی۔ اس مجاہد، عظیم حریت شخصیت کو دنیا شیخ الہند اسیر مالٹا مولانا محمود حسن دیوبندیؒ شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے نام نامی اور





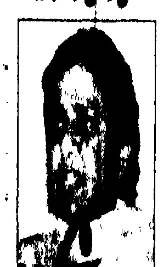
P_5

راجیو گاندھی کے قاتلوں کی سزا میں تخفیف کی مخالفت



P_3

ٹیم انا کی کور کمیٹی میں توسیع کا اشارہ



منریگا پر سیاست کر رہے ہیں رمیش ملہوترا

